جنوری ۱۹۹۲ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

مجلس ادارت

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے ۔ فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNBFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا ۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی ۔
  کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے ۔

جلد ۱۵۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۳ء عدد ۱

مضامین

شذرات ضیاء الدین اصلاحی ۲ - ۴

مقالات

میر محمد مومن عرشی اکبرآبادی پروفیسر نذیر احمد سرسید نگر علی گڑھ ۵ - ۲۶
کلمات نقشبندیہ ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبد القادر ندوی ۲۷ - ۴۷
لکچرار عربی تکمیل الطب کالج لکھنؤ۔
غبار خاطر۔ ایک تاثراتی جائزہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۸ - ۶۵
سابق پرنسپل جامعہ کالج نئی دہلی

معارف کی ڈاک

(۱) جناب محمد عبد الرحمن سعید صدیقی ۶۶
شکاگو۔ امریکہ
(۲) جناب عبد الرؤف خان اودی کلاں ۶۷
سوائی مادھوپور۔ راجستھان۔

باب التقریظ والانتقاد

علامہ حمید الدین فراہی۔ حیات وافکار (مقالات فراہی سیمینار) "ض" ۶۸ - ۷۶

ادبیات

سانحہ (بابری مسجد) ڈاکٹر بیگم افتخار صاحبہ صدیقی شعبہ اردو ذاکر حسین کالج دہلی ۷۷
مطبوعات جدیدہ ع۔ص۔ ۷۸ - ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستان کے مسلمان تیسرے درجہ کے شہری اور تعلیمی و معاشی اعتبار سے ہی پسماندہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ہر میدان میں مجبور اور بے بس ہوگئے ہیں۔ ملک میں ان سے زیادہ بے وزن اور بے قیمت کوئی طبقہ نہیں ہے۔ زبانی تو ان سے ہمدردی، رواداری اور برابری کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً ان کی جان، مال، عزت و آبرو سے مسلسل کھلواڑ ہو رہا ہے۔ ان کے ساتھ دوہرا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ ان کا امتیاز و تشخص ختم کرنے کے لیے اردو زبان کو مٹا دیا گیا اور ان کے اداروں کا اقلیتی کردار مسخ کر دیا گیا۔ ملک کے چپہ چپہ سے ان کی عظمت کی نشانیاں اور پُرفخر مذہبی، تہذیبی اور تعمیری یادگاروں کو معدوم کیا جا رہا ہے۔ اور اب فرقہ پرستوں سے ساز باز کر کے عظیم الشان بابری مسجد اور اس کی لپیٹ میں درجنوں مسجدوں کو زمیں بوس کر دیا گیا ہے؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا ؛ یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

اس پر بھی صبر نہیں ہوا تو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔

بابری مسجد کی شہادت حکومت کی سراسر نااہلی اور وزارت داخلہ کی عمداً چشم پوشی اور مسلمانوں کے معاملات میں دوہرا معیار اختیار کرنے کا نتیجہ ہے جس سے ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی ہیں۔ اور سارے عالم میں حکومت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ؛ کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا

مگر حکومت کے ذمہ دار نہایت بے شرمی سے اپنی بے گناہی کا اعلان کیے جا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اُس وقت اتر پردیش میں بی۔ جے۔ پی حکومت تھی لیکن مسجد کی جگہ پر مندر کی داغ بیل کب ڈالی گئی، اور اتر پردیش ہی نہیں پورے ملک میں جو خون ناحق بہہ رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔۔ بی جے پی حکومتوں کو برخاست کرنے والے بمبئی اور احمد آباد میں جنگل کے راج، غنڈوں کی حکومت اور وحشت کی درندگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں [illegible] " [illegible]

لکھتے ہیں: "یہ زمانہ ہم لوگوں کے لیے بہت بڑی گزرش تنہائی ہی میں سہنے کا ہے۔ یہاں کے حالات بھی تو خواب ہی ہیں بلکہ خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں .... خدا جانے اس ملک کا کیا انجام ہوگا۔" مگر اس کے باوجود ملک میں استحکام کے لیے حکومت کا باقی رہنا ضروری ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں کانپور کی مسجد کا معمولی اور جزوی حصہ شہید ہو گیا تھا تو پورے ملک میں کہرام مچ گیا تھا۔ آج بھی علامہ شبلی کی نظمیں ع ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں۔ اور ع

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں ٭ کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

فضا میں گونج رہی ہیں۔ لیکن قومی حکومت کے دور میں بابری مسجد کو ہضم کر لیا گیا اور مسلمان مجسم صبر و ضبط بنے رہے۔ کہیں کہیں کارسیوکوں اور شرپسندوں کی اشتعال انگیزی سے بعض نوجوانوں نے جوش و حمیت دکھائی تو وہی حکومت جو بابری مسجد کو "ڈائنامائٹ" سے اڑا دینے پر بھی چپ چاپ رہی تھی، سارے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لیے مستعد ہو گئی۔ درندگی پر آمادہ پولیس اور پی۔ اے۔ سی اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے کے لیے گھروں میں گھس کر ان کو لوٹنے اور مارنے لگی۔ آتش زنی کر کے ان کو اور ان کی املاک کو برباد کرنے اور عورتوں کی عصمت دری کرنے لگی۔ بی۔ جے۔ پی کی حکومت بھی ہوتی تو کیا اس سے زیادہ ظلم ڈھاتی ع بلا سے قزاق آ کے لوٹے، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے۔

اگر حکومت واقعی نیک نیت ہوتی تو وہ مسجد کی ازسرِ نو تعمیر کے لیے مخلصانہ قدم اٹھاتی اور تشدد پسندوں کے دباؤ میں نہ آتی، لیکن وہ تو قوت اور تشدد ہی کے سامنے سرنگوں ہونا جانتی ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ کتنا ہی جائز اور حق پر مبنی کیوں نہ ہو، وہ کمزور ہیں۔ اس لیے ان کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کی طفل تسلی کے لیے وہائٹ پیپر کی اشاعت اور سی۔ بی۔ آئی سے تحقیقات کرانے کا شوشہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس، ہندو پریشد اور بجرنگ دل پر دکھانے کے لیے پابندی عائد کی گئی، تو جماعت اسلامی ہند کو بھی اسی زمرہ میں شامل کر لیا گیا جس کا فرقہ واریت سے دور قریب کا بھی واسطہ نہیں، اس نے ہمیشہ ملک و قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھائی بھائی بن کر رہنے

ور خدا سے ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ آج تک کسی شر و فساد میں وہ ملوث نہیں رہی ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہر مظلوم کی مدد و حمایت کرتی رہی ہے۔ اور دوسری طرف بی۔ جے۔ پی اور شیوسینا کو ملک کا امن و امان درہم برہم کرنے کے لیے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ جبکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان ہی کی بدولت پانی سر سے اونچا ہوا۔ اور ملک کو یہ سیاہ دن دیکھنا پڑا۔

جس حکومت کے یہ کارنامے ہوں اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ بنوا دے گی ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

وہ تو مسجد کی جگہ مندر بنواکر رام للا کا درشن کرا رہی ہے اور پجاریوں کو سرد و گرم موسم سے بچانے کے لیے مزید تعمیرات کرا رہی ہے۔ وعدے سے کیا ہوا۔ وعدہ تو مسجد پر کوئی آنچ نہ آنے دینے اور انتخابی منشور میں سو دنوں میں مہنگائی پر قابو پانے کا بھی کیا تھا۔ جب وعدوں ہی سے کام چل جائے تو انھیں وفا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس حکومت کا معیار سراسر دُہرا اور جارحانہ ہو اور جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو نہ پورا کرے اس سے مسجد کی بھیک مانگنا ننگ ہے۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگیے اور اسی پر بھروسہ کیجیے، وہ اندھا بہرا نہیں ہے کہ اپنے گھر سے غافل ہو جائے اور اسے تباہ کرنے والوں کے کرتوت نہ دیکھے، وہ ظلم و ناانصافی کو برداشت نہیں کرتا۔ حق کبھی کبھی اوجھل ہو جاتا ہے لیکن مٹتا نہیں۔ مٹنا اور برباد ہونا تو باطل کا حصہ ہے: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جن مسلمانوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر مندر توڑے، ان کا فعل غیر اسلامی اور قابل مذمت ہے۔ ہم کو خوشی ہے کہ بعض مسلم ملکوں نے مسمار شدہ مندروں کو دوبارہ بنوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستان کی حکومت مسجد کو اپنا داخلی معاملہ کہہ کر دنیا کی زبان بند نہیں کر سکتی۔ اس نے خود دوسرے ملکوں میں مندر توڑے جانے پر احتجاج کیا ہے۔ طائم سنگھ یادو نے صحیح کہا کہ تم نے بابری مسجد کا تحفظ کر کے بہت سے مندروں کو بچا لیا تھا۔ اگر موجودہ حکمرانوں نے بھی عاقبت بینی سے کام لیا ہوتا تو ردعمل کا یہ سلسلہ شروع نہ ہوتا۔ ردعمل بجائے خود غلط ہے لیکن اس کا موقع بابری مسجد اور اجودھیا کی دوسری مسجدوں کو نہ بچا کر خود ہماری حکومت نے دیا۔

مقالات

میر محمد مومن عرشی اکبر آبادی

از پروفیسر نذیر احمد

(۲)

۷۔ **میر عرشی کا کلام** ۔ عرشی ایک پختہ کلام شاعر تھا، چنانچہ خود اس کی زندگی میں اس کا کلام مدون ہو چکا تھا، اس کے دیوان کا جو نسخہ سالار جنگ میوزیم زیر شمارہ ۱۹۵۵/۷۷۵ ہے، اس کی تاریخ کتابت ۱۰۷۳ ہجری ہے یعنی وفات سے ۱۸ سال قبل، کلیات کا جو نسخہ ایشاٹک سوسائٹی بنگال، ایونوف شمارہ ۹۱۰ ہے، ۱۰۸۲ ہجری میں استنساخ ہوا (وفات سے ۹ سال قبل) کلیات کے اجزا یہ ہیں:

۱۔ دیباچہ بقلم، میر مومن عرشی ۱-۶ ورق ۔ ۲۔ غزلیات بہ ترتیب تہجی ۶-۱۱۵ ورق

۳۔ قصائد ۱۱۵-۱۳۹ " ۔ ۴۔ ترجیع بند ۱۳۹-۱۴۳ "

۵۔ ترکیب بند ۱۴۳-۱۵۰ " ۔ ۶۔ مقطعات ۱۵۰-۱۵۷ "

۷۔ رباعیات ۱۵۷-۱۶۴ " ۔ ۸۔ ساقی نامہ ۱۶۴-۱۷۰ "

۹۔ کتاب شاہد عرشی ۱۷۰-۲۲۳ " ۔ ۱۰۔ مثنوی مہر و ماہ ۲۲۳-۲۸۹ "

دیوان عرشی سالار جنگ میوزیم کے اجزا یہ ہیں:

غزلیات بہ ترتیب تہجی ورق ۱-۱۰۳ ۔ قصائد ورق ۱۰۴-۱۳۸

ترجیع بند ۱۳۸-۱۴۸ " ۔ ترکیب " ۱۴۹-۱۵۳

رباعیات ورق ۱۵۴-۱۶۱ قطعات ورق ۱۶۱-۱۸۰

اس کا کاتب ابوالمعالی اور تاریخ کتابت ۱۴ رجادی الاول ۱۰۵۳ھ، اسی ابوالمعالی نے عرشی کے والد میر عبداللہ مشکیں قلم کی مثنوی گلشن اسرار (مخطوطہ نمبر ۱۸۴۷) کی کتابت تین سال پہلے کی تھی، اس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم میں ہے اور تاریخ کتابت ۱۴ صفر ۱۰۵۰ھ ہے،[1] دیوان کا ایک اور مختصر نسخہ اسی میوزیم زیر شمارہ ۱۹۵۶ ہے، جس میں کل ۸۴ اوراق ہیں، عرشی کے کلام کے اجزا یہ ہیں:

۱۔ غزلیات ۲۔ قصائد ۳۔ ترجیع بند ۴۔ ترکیب بند ۵۔ قطعات ۶۔ رباعیات ۷۔ مثنویات۔ ساقی نامہ شاہد عرشی مہر و ماہ۔

غزلیات۔ عرشی اصلاً غزلگو شاعر ہے، اس کی غزلوں میں سادگی، صفائی، سوز و گداز، جدت طرز، بلندی خیال کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں، چند مثالوں سے ان خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سرو در گلشن اگر یافتہ رعنائی را — قامت او علم آراستہ رعنائی را
در زمینی کہ شدہ کشت محبت سرسبز — نیم جو کس نخرد خرمن دانائی را
ای کہ پا می نہی اندر چمن عشق تبان — بر سر خویش نہ اول گل رسوائی را
عرشی از زمزمۂ سنجی سخنہائی بلند — بر سرم بام فلک داشتہ جہتائی را

در دور دو چشم تو بیدار کہ می باشد — در حلقۂ سرمستان ہشیار کہ می باشد
در آئینۂ چشمم بنگر تو بچشم خود — خونریز کہ می گردد خونبار کہ می باشد
با غم چو شد آمیزش اندیش کہ می پرسد — گر غم نخورد عاشق غمخوار کہ می باشد

[1] مخطوطہ ورق ۹۸

از عشق تو ابر جاست عرشی نظر نہان | چو جام مدام می سرشار کہ ہمی باشد (ورق ۱۰۵)

امشب بسر کوی تو خوش انجمنی بود | از زلف تو ہر گوشہ پریشان سخنی بود

زلف و رخ او در نظر مست تماشا | آویختہ در سنبل ثریا سمنی بود

آن لالہ نبودہ است پیراہن رنگین | بر شاخ ثمر آویختہ خونین کفنی بود

خوش وقت کہ در موسم آرایش گلشن | پیراہن گل جامۂ نازک بدنی بود

بوی گل گفتار شنیدیم درین باغ | در غنچہ تو گوئی کہ نشان دہنی بود

مستغنی نظارۂ آرایش گل را | از زلف و خط و خال رخ او چمنی بود

امروز چو عرشی نبود زمزمہ سنجی | زین پیش اگرچہ بہ نزاکت حسنی[۱] بود

سخن چون ہم سخن گردد در آید در سخن عرشی | سخن زیب از سخن گیرد چمن از چمن عرشی

مسیحا درس می گوید بہ مکتب خانہ روشن | ملایک جملہ می خوانند باہم شعر من عرشی

پر از لعل و جواہر میشود درج دہان من | زبان وقت سخن گردد چو در درج دہن عرشی

سواد کلک عنبر سای من گر نقطہ ریزد | تو گوئی نقش شد بر صفحہ از مشک ختن عرشی

نزاکت با متانت جمع کردہ نکتۂ موزون | بود حسن اگر گوئی تو بر طرز حسن[۱] عرشی

ہزاران آفرین گفتی بانصاف سخن سنجی | اگر قدسی ہمی بودی بدین طرز سخن عرشی

کہن را تازہ می سازند وزدان سخن سنجان | بتو شد تازہ گوئی ختم در دور کہن عرشی (ورق ۱۰۳)

ذیل میں صاحب گلشن کے انتخاب کے اشعار درج کیے جاتے ہیں:

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است | کلید قفل دل ما تبسم یار است

۱۔ اشارہ ہے حسن دہلوی کی طرف جن کی زمین میں عرشی نے غزلیں لکھیں۔ مطالعے کا یہ اچھا موضوع ہے۔

سیاہ بختی پروانہ بیشتر زین نیست — کہ روی شمع نماید و سوختن ندہد

چہ آگہیست سینہ را کہ بوقت رفو زدن — صد قطرۂ خون ز دیدۂ سوزن فرو چکید

اگر صد تیشہ آید بر سرش آسان بود عرشی

ازان پرسش کہ از پرویز بر فرہاد می آید

خدنگ غمزۂ او را است بر دلم آمد — چو طایری کہ کند قصد آشیانۂ خویش

بنمای جمال خود ورنہ ز سر مستی — بہتری ز دہان توی گویم دمی قسم؟

می بیایم افتم واو در کنارم می کشد

من درین وادی ترقی از تنزل دیدہ ام

قصائد:- میر مومن عرشی کے اکثر قصیدے مذہبی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرشی کو خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی، عرشی کے بڑے بھائی میر صالح کشفی ولائے اہل بیت میں شاید سب سے بڑھے تھے، اسی جذبہ کے تحت انھوں نے مناقب مرتضوی جیسی ضخیم کتاب لکھی، غالباً انہیں وجوہ سے ان پر رفض کا الزام لگایا گیا، انھوں نے نہایت پُر زور انداز میں ثابت کیا ہے کہ محبتِ اہل بیت ایمان کا جزو ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

منم پاک و پیرو شرع رسول اللہ — ز عشق مرتضیٰ نادان بہ رفضم متہم دارد

اگر عشق علی رفض است پس رفض است ایمانم — خدا زین شیوہ در محشر مرا بس محترم دارد

امیر المومنین حیدر علی ابن ابی طالب — چو دارد حامی خود کشفی از دشمن چہ غم دارد

عرشی اس معاملے میں اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلے اور اگرچہ ان کے یہاں اہل بیت سے بے پناہ محبت کا جذبہ موجود ہے لیکن اس جذبے میں وہ شدت نہیں

جو کشفی کے یہاں ملتی ہے۔ بہرحال عرشی کے بیشتر قصائد مذہبی ہیں، ان میں اہل بیت کی مدح ملتی ہے، دو قصیدے شاہجہان کی مدح میں ہیں اور دو عالمگیر کی، حسب ذیل پانچ قصیدے حمد اور نعت میں ہیں :

دل بود آئینہ و آئینہ دان او جہان
آن جہان بینی اگر بیرون کنی ز آئینہ دان

قد الحمد کہ از لطف عمیم داوار	کہ بود ہر دو جہانش اثری از آثار
ای قد موزون تو سرو ریاض صفا	چشم سیاہت بود نرگس باغ حیا
ای شدہ رخسار او از دود آہم پر غبار	گر نگردی اشک طوفان موج می بردی گذار
توسن مہر زیر ران دارم	سیر بر اوج آسمان دارم

یہ قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔

ای صبح از خیال رخت در بر آفتاب	وی تنگ جامہ صبح ز شوقت بر آفتاب

در منقبت امام حسن :

بباغ حسن تو یک گل بود ہزار چمن	بہر چمن گل خورشید و ہر گلی روشن

در منقبت امام حسین :

ز فرقت بود داغ بر جگر لالہ	شدہ بداغ جگر در جہان سمر لالہ

در مدح امام باقر :

ز چشم مست تو دارد بجان کشان نرگس	شدست چشم و چراغ چمن از آن نرگس

در مدح امام جعفر :

گر بہا فروزد ببزم بوستان رخسار گل	مرغ را پرواز سازد بر سر دیدار گل

در منقبت امام :

اگر ز روی دلم غمگسار پوشد چشم — چنان بود که ز گلشن بہار پوشد چشم

در مدح امام علی بن موسیٰ رضا :

زہی بزم و آن بادۂ مہتاب — کہ از بوی او جان و دلہا خراب

در مدح امام عسکری :

ہمگنان در قال اگر دارند با من ہمسری — لیک در حال سخن دارم از ایشان برتری

در مدح جعفر طیار :

ہر کرا لب خشک از دود دل و چشم ترست — می نوازد گوش شاہی گوشہ بحر و براست

اگرچہ عرشی نے قصیدہ نگاری پر بڑا زور صرف کیا ہے، لیکن ان کے قصیدوں میں غزل گوئی کی صفت پیدا ہو گئی ہے، حضرت امام حسینؓ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اسمیں وہ زور و جوش نظر نہیں آتا ہے جو فارسی قصیدہ نگاری کا امتیازی وصف ہے البتہ شاعر نے نئے نئے شاعرانہ نکتے پیدا کر کے اس نظم کو کافی موثر بنایا ہے، یہ قصیدہ نہیں بلکہ مرثیہ ہے ۔

ز فرقت تو بود داغ بر جگر لالہ — شدہ بداغ جگر در جہان سمر لالہ

ز گریۂ شب و روز است عاشقان ترا — گہی بچشم سمن گاہ در نظر لالہ

چو غنچہ در دل خود داشت داغ عشق نہان — چو گل شگفت و عیاں ساخت بر جگر لالہ

نبود ز آتش عشقت خبر کہ اندر باغ — ز دود غم جگر افروخت بی خبر لالہ

بباغ ہر شجری را بود ثمر پیدا — ز داغ یافت بگلزار از دل ثمر لالہ

اگرچہ در چمن آید بجامۂ گلگون — ز باد حادثہ ہا ہست در خطر لالہ

شہید گشتہ و خونین کفن بسر دارد | بجنگ دشمن دین بستہ بُد کمر لالہ
شہید دشت محبت شدہ امام حسین | ازان بجامۂ خونین شدہ سمر لالہ
چکیدہ خون شہیدان کربلا بزمین | زجای خاستہ خونین کفن بسر لالہ

امام باقر کی مدح میں جو قصیدہ ہے وہ عرفی شیرازی کے جواب میں ہے، دونوں ایک ہی زمین میں ہیں اور دونوں کی ردیف نرگس ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ عرشی کے قصیدہ میں غزل کی شان پیدا ہوگئی، دونوں شاعروں کے چند اشعار بالمقابل درج کیے جاتے ہیں:

عرشی نے انوری کی زمین[1] میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو حقیقۃً میر صالح کشفی کی مدح

---

[1] عرشی کا یہ قصیدہ دراصل اس کے بھائی میر صالح کشفی کی مدح میں ہے، جس کے متعدد اشعار کشفی کے ذیل میں نقل ہو چکے ہیں، شروع کے چند اشعار میں ہندی، فارسی، عربی زبانوں کا مختصر ذکر ہے، قرآن فارسی میں ہے، یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے:

عربی فارسی و پس ہندی | اصطلاح جہانیان باشد
ترجمہ شد بہ فارسی قرآن | فارسی را قبول ازان باشد
ہندی از فارسی شود چون بیش | بر سر ہر زبان روان باشد

آگے کے دو شعروں میں اپنے وطن خراسان کی یاد تازہ کرتا ہے، واضح رہے کہ ترمذ خراسان میں شامل سمجھا جا سکتا ہے، مگر یہ شہر اس کے اجداد کا مسکن تھا، اس سے آتی گئی کیونکہ زیادہ متعلق نہیں

ما فراموش چون کنیم وطن | تو امان با وطن کہ جان باشد
از خراسان چو دل بیاد آرد | فاتحہ خوان سیدان باشد

(سیدان سے مراد شاہ طیب اور شاہ نعمت اللہ ولی ہوں گے)

میں ہے، اس کے کچھ اشعار کشفی کے ذیل میں نقل کیے جا چکے ہیں، چند اشعار عرشی اور انوری کے ایک دوسرے کے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں:

عرشی دیوان ۱۳۳ ب	انوری دیوان ص ۱۳۵
تا زبان در دہان روان باشد	گر دل و دست بحر و کان باشد
وصف تو بر سر زبان باشد	دل و دست خدایگان باشد
من سپہرم جہان معنی را	شاہ سنجر کہ کمترین بندہ اش
لفظ من وسعت جہان باشد	در جہان پادشہ نشان باشد
گرچہ من پیر گشتہ ام از فکر	پادشاہ جہان کہ فرمانش
سخن من ولی جوان باشد	بر جہان چون قضا روان باشد
تازہ گوئی بسی کند طبعم	آنکہ با داغ طاعتش زاید
گر سخن فہم در جہان باشد	ہر کہ زا بنای انس و جان باشد
من چہ گویم سخن کہ اہل زمان	وانکہ با مہر خازنش زاید
گر نفہمند بیم آن باشد	ہر چہ از اجناس بحر و کان باشد
سخنم جان بود بجان سخن	دستہ خنجرش جہانگیر است
سخن تازہ موج جان باشد	گرچہ یک مشت استخوان باشد
ما ہمہ خضر و آب ما سخن است	عدلش ار بازمین بخشم شود
سخن ما حیات جان باشد	امن بیرون آسمان باشد
ما ہنر را چگونہ بفروشیم	قہرش ار سایہ بر جہان فگند
ہنر ارزان و زرگران باشد	زندگانی در آن جہان باشد

نغمۂ ہندی[1] سر زبان گیرد　　مرگ را دایم از سیاست او
فارسی در تہ زبان باشد　　کی تب لرز اندر استخوان باشد

عرشی کا ایک ترجیع بند خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اول یہ کہ اس میں ۲۸ بند ہیں، دوم یہ میر صالح کشفی اور سعدی شیرازی کے ترجیعات کے جواب میں لکھا گیا، سعدی کا ترجیع اتنی شہرت رکھتا ہے کہ متعدد شعرا نے اس کے مقابل میں ترجیع بند لکھے ہیں، ذیل میں سعدی، کشفی اور عرشی کے ترجیع بندوں کے ایک ایک بند درج کیے جاتے ہیں:

سعدی　　کلیات ص ۶۵۱

سعدی کے ترجیع میں ۲۱ بند ہیں، پہلا بند یہ ہے:

ای سرو بلند قامت دوست　　وہ وہ کہ شمایلت چہ نیکو است
دریای لطافت تو میرود　　ہر سرو سہی کہ بر لب جو ست
نازک بدنی کہ می نگنجد　　در زیر قبا چو غنچہ در پوست
مہ پارہ ببام اگر بر آید　　کہ فرق کند کہ ماہ یا او ست؟
آن خرمن گل نہ گل کہ باغست　　نہ باغ ارم کہ باغ مینو ست

---

[1] حکیم رکنای کاشی نے شاہجہاں کے جلوس کی تاریخ میں جو قطعہ لکھا ہے وہ بھی اسی زمین میں ہے:

پادشاہ زمانہ شاہ جہان　　خرم و شاد و کامران باشد
حکم او بر خلائق عالم　　ہمچو حکم خدا روان باشد
بہر سال جلوس شہ گفتم　　در جہان باد تا جہان باشد

(عمل صالح ج ۱ ص ۱۹۱)

آن گوی معنبرست در جیب | با بوی دہان عنبریں بوست
در حقہ صولجان ز لفش | بیچارہ دل افتادہ چون گوست
می سوزد و ہمچنان ہوا دار | می میرد و ہمچنان دعاگوست
خون دل عاشقان مشتاق | در گردن دیدۂ بلاجوست
من بندۂ لعبتان سیمین | کاخر دل آدمی نہ از روست
بسیار ملامتم بکردند | کاندر پی او مروکہ بدخوست
ای سخت دلان سست پیمان | این شرط وفا بود کہ بی دوست

بنشینم و صبر پیش گیرم
دنبالۂ کار خویش گیرم

میر صالح کشفی نے مجموعۂ راز کے نام سے ایک ترجیع بند لکھا تھا جو چھپ چکا ہے اور جس کے نسخے مل جاتے ہیں، اس کا[1] پہلا بند یہ ہے :

ای دوست بہ عاشقان شیدا | بنما ی جمال عالم آرا
ای از تو شدہ ظہور کونین | اسرار نہان ز تو ہویدا
از نور تو روز و شب منور | عکس تو ز مہر و ماہ پیدا
بردا ز تو جمال روی یوسف | آتش ز تو در دل زلیخا
خود آئینہ جمال پیشہ گشتی | خود چشم شدی و ہم تجلی
ارنی گفتی و لن ترانی | ہم طور شدی و ہم تجلی
پس بوالعجبی چگویم از تو | ہم کام بگوی ہم تمنا

---

[1] نسخۂ علی گڑھ ورق ۲ ۔

وصفت تو چنان بشرح آدم — کز فکرت من بود مبرا
دل بی تو مدام باد پیماست — با دل سوی تو بادہ پیما

بنشینم و جام عشق نوشم
کونین بجرعۂ فروشم

عرشی کا پہلا بند یہ ہے:[1]

ای جلوہ فروز یوسفستان — خورشید نمای چشم حیران
بر لخت دلم شدست ظاہر — لعلت نمکی کہ کردہ پنہان
آن جنبش زلعت مشکبویت — داند دل عاشقان پریشان
بر گریۂ زخم سینۂ چاک — از خندہ لب نمک بیفشان
یوسف بدر آمدہ ست از چاہ — این مژدہ برید سوی کنعان
آتش چو فرو گرفت در شمع — پس شعلہ کند چگونہ پنہان
من لالہ نیم کہ داغ سینہ — ظاہر سازم بہ صحن بستان
من غنچہ نیم کہ از نسیمی — بیہودہ شوم بہ باغ خندان
من مرغ چمن نیم کہ ہر دم — از سینہ کشم ہزار افغان
پروانہ ام و بلند ہمت — خود را بزنم بشمع تابان
تن سوختہ عین شمع گردم — تا شعلہ کشم سر از گریبان
ای دوست تبسمی کہ تاکی — در موسم نو بہار خندان

---

[1] دیوان ورق ۱۳۰ ب، ترجیع بند کا ایک الگ نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے دیکھئے فہرست ج ۵ مخطوط نمبر ۱۸۵۵۔

بنشینم وردی زعفرانی
بشویم بسرشک ارغوانی

سعدی کے ترجیع بند کے مطالعے کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب وہ سارے ترجیعات جو اس کے جواب میں لکھے گئے ہیں حاصل کیے جائیں اور انکا باہمی مقابلہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ خود ایک بڑا اور دلچسپ موضوع ہے اور الگ سے فرصت چاہتا ہے۔

عرشی کے مقطعات بعض اہم معلومات کا خزانہ ہیں، اگرچہ ان کی تعداد میرے مطالعے کے نسخے میں زیادہ نہیں، پھر چند کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں دو تین قطعے[1] حکیم رکنائے کاشی کی مدح میں ہیں، حسب ذیل قطعے میں حکیم کی فضیلت حکمت، شعر اور خطاطی بتائی گئی ہے:

اگر تمام جہانست مست بادۂ لاف — حکیم رکن فضیلت جہان انصافست
بحسن طبع فلاطون بعلم لقمانست — کہ صیت فطرت و فضلش ز قاف تا قافست
بنظم دلکش او نظم ہیچکس نرسد — ہمان حکایت زردو زد و بوریابافست
بکام طبع جہان خوشگوار از ان نطقش — کہ لفظ و معنی او ہمچو بادہ صافست
اصول مردم پیش است ور خطش پیدا — چہ شد اگر خط بی مغز دیگران صافست
چو منصفانہ سخن می سرائی ای عرشی — بگو بگو کہ حکیم جہان با نصافست

---

[1] ورق ۱۷۳ و، ۱۷۷ اب، ۱۷۸ اب، ۱۷۹ و، یہ آخری قطعہ درج نہیں کیا گیا۔ حکیم رکنا کاشی۔ جہانگیر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا اور اسکے اطبا میں داخل ہوا، شاہجہان کا بھی شاہی طبیب رہا، ۱۰۴۲ میں مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا، ۱۰۷۶ میں اسکا ایران میں انتقال ہو گیا۔

ایک اور قطعہ حکیم کی مدح میں یوں ہے:

ای بحکمت درین زمان رکنا — وی بہ دانش ارسطوی زمان
وای ترا آفتاب شش جہت ست — طبع تو ماہتاب چار ارکان
از تو دریافت رنگ لالۂ دل — وز تو دریافت بوی گلشن جان
این دوائی کہ بہر من کردی — از تو خوشنود سرور مردان
بینظری ازان بدہر ترا — برگزیدہ است پادشاہ جہان
لالۂ آفتاب در دستت — سمی مہ ترا بجیب نہان
نفست روح پروردلہاست — تو ز حکمت شدی مسیح زمان
ہرچہ باشد نہان بہ طبع مریض — طبع تو مردرا نمودہ عیان
صاحب حکمتی بطبع درست — مومن صادقی و با ایمان
از برای شفا و راحت خلق — خلق کردہ ترا خدای جہان
حقہ ہای کہ ہست درپیشت — ہمہ پرگشتہ از مفرح جہان

چند قطعات میں خود اپنی خطاطی اور شاعری کی تعریف ہے، ایک قطعے میں اپنے پھوپھی زاد بھائی میر شریف کی تاریخ وفات[1] ہے، ایک قطعہ میں دیوان حافظ[2] کا ذکر ہے، ایک قطعہ خود اپنی مثنوی "نسخۂ مہر و وفا" کی تاریخ[3] پر ہے، ایک قطعہ دو شعری میں میر علی کے کمال کا ذکر اس طرح[4] کیا ہے:

---

[1] نسخۂ دیوان سالار جنگ میوزیم حیدرآباد ورق ۱۴۷ و۔ تاریخ ۴۰ھ خوشنویسی بود سے نکلتی ہے۔ [2] ایضاً ۵۵ ب تیسرا بیت قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے: چو حافظ کس برون نامد ز شیراز مگر سعدی کہ استاد جہان است۔ [3] ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ورق ۴، اب نسخۂ مہر و وفا تاریخ ہے جس سے ۱۰۴۳ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ [4] ورق ۱۷۲ اب۔

مرقعی کہ درو نیست خط میر علی | چو مجلس است کہ بی یار خوش لقا ہیچ است
خطی کہ نیست در و ہیچ بہرۂ ز اصول | اگر ہزار کنی خدشہ طلا ہیچ است

مثنویات:۔ عرشی کی تین مثنویاں موجود ہیں، ان میں سے ایک بطرز ساقی نامہ ہے از کلیات[1] کے کلکتہ کے نسخے میں شامل ہے، دوسری مثنوی شاہد عرشی ہے، جو کلیات کے[2] نسخے کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتابخانے[3] میں موجود ہے اور تیسری نسخۂ مہر و وفا کے نام سے کلکتہ کے نسخے میں موجود ہے، یہ مثنوی بھی عارفانہ رنگ میں ہے، راقم الحروف ساقی نامہ اور نسخہ مہر و وفا سے ہنوز استفادہ نہیں کر سکا ہے، البتہ شاہد عرشی اس کے مطالعے میں ہے جس کی کسی قدر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مثنوی شاہد عرشی ۱۰۷۹ھ[4] میں مکمل ہوئی، مختصر مقدمے، حمد، مناجات، منقبت امام حسن منقبت امام حسین کے بعد سبب نظم کے ذیل میں لکھتا ہے:

از شبی گویم کہ خورشید و قمر | بود در بزمش چو شمعی جلوہ گر
آمد الہامی بدل از ملک غیب | کہ میرا لوح تو از حرف عیب
تا بکی در بند کثرت ماندۂ | دور از انوار وحدت ماندۂ
مثنوی درد صفت حق آغاز کن | ناہدان را مطلع بر راز کن

---

[1] فہرست مخطوطات فارسی ایوناف مخطوطہ نمبر ۱۹۷۱، ورق ۲۲۴ ب [2] ورق ۱۰۰ ب [3] یونیورسٹی فارسی ۷-۸-۲، اوراق ۷۷، سطور ۱۹، خط نستعلیق بدون تاریخ [4] فہرست مخطوطات، مخطوطہ شمارہ ۱۹۷۱، ورق ۱۹۴ ب [5] شاہد عرشی بود جمال کمال تاریخ ہے جس سے سنہ ۱۰۷۹ھ نکلتا ہے۔ (نسخۂ شاہد عرشی، علی گڑھ، ورق ۵ ب)

عالم افسردہ اندر جوش آر	شاہد اسرار در آغوش آر
از سر تو تازہ کن باغ کہن	سر فروزان شمع وحدت از سخن
لطف معنی در اشارت آمدہ	در اشارت صد بشارت آمدہ

(و۔ق ۹ ب)

ظہور انوار عشق کے ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

این سخن نوریست از خورشید جان	این سخن آمد فرود از آسمان
این سخن از داستان دیگر ست	این سخن کو از جہان دیگر است
جلوہ گاہ این سخن عرش برین	منزل این رحمۃ للعالمین

عشق و شوق کا بیان:

عشق را یک گام بر عرش استواست	گام دیگر من نمی دانم کجا ست
عشق را عالم بود مانند تن	آسمان بر قامتش یک پیرہن
عشق می گوید کہ مجنون بودہ ام	در جہان دل جگر خون بودہ ام
عشق می گوید زلیخا از من است	عشق می گوید کہ سودا از من است
عشق می گوید کہ یوسف من بدم	چون زلیخا خود بخود عاشق شدم
عشق می گوید کہ سبحان از من است	عشق می گوید کہ قرآن از منست
عشق می گوید محمد آمدم	آفتاب بخت سرمد آمدم
عشق می گوید ظہورم مرتضی است	لافتی در پل از [illegible] نما ست
عشق می گوید کہ عیسیٰ آمدم	عشق می گوید کہ موسیٰ آمدم
خود بخود بر خود تجلی کردہ ام	جان عاشق را تسلی کردہ ام
خود بخود زلف پریشان خودم	خود بخود کفر خود ایمان خودم

مرحبا ای عرشی شیرین کلام   مرحبا ای سید عالی مقام

خوش بالہام سخن گویا شدی   حمد گوی عالم الاسما شدی

شوق افروزد دولت را چون چراغ   شوق بنماید ز حق در تو سراغ

شوق بنماید ترا رہ اندرون   شوق بنماید ترا حسن بطون

شوق در لمحہ برد بر اوج عرش   عرش را سازد برایت ہمچو فرش

شوق افروزد چراغ جان تو   شوق آراید رخ ایمان تو

شوق سازد قالبت را گلشنی   دل درو سازد چراغ روشنی

ورق ۱۳-۱۷ب

اہل ظاہر و اہل باطن کا بیان :-

اہل ظاہر جملہ در آب و گل اند   اہل باطن جملہ در قید دل اند

اہل ظاہر زین سخنہا بی خبر   جملہ در آخور غفلت ہمچو خر

اہل ظاہر گنج در خود مار خود اند   خود بخود در سینہ آزار خود اند

اہل ظاہر از خدا بیگانہ اند   سر بسر در قید آب و دانہ اند

اہل ظاہر جملہ تن پرور بوند   سر بسر چون کار خود ابتر بوند

اہل ظاہر را بود شیطان ندیم   می نماید راہ را سوی جحیم

اہل ظاہر جملہ غرق غفلت اند   یکسرہ افگندہ سر در خجلت اند

اہل ظاہر جملہ نفسانی بود   اہل باطن جملہ روحانی بوند

اہل باطن را بود سیر بطون   اہل ظاہر را بود سیر برون

اہل باطن سر بسر چون آفتاب   خود بخود از جلوۂ خود کامیاب

اہل باطن جنت حق آمدند   شاہباز اوج مطلق آمدند

اہل باطن زمزمہ آرای جان — نغمہ زن در مجلس روحانیان
شامہ شان مست بوی کبریا — چشم شان حیران روی کبریا
جان ایشان از تجلی حضور — سر بسر ریزد بدل نور سرور
گوش شان مست کلام معنوی — جوش زن چون مولوی در مثنوی
(ورق ۱۸ ب جد)

حدیث حضرت رسول اکرمؐ: المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کے تحت پھر عشق کا بیان ہے:

عشق ظاہر رہنمای باطنست — عشق ظاہر روی افزای تن است
عشق ظاہر چشمہ فیض و سخاست — رہنما تا بارگاہ کبریاست
عشق ظاہر مردہ دل زندہ کند — چون مسیح و خضر پاینده کند
عشق ظاہر زینت باغ درون ست — خضر آسا تا بہ بیرون رہنمون ست
عشق ظاہر صیقل مرآت جانست — عشق ظاہر آبروی عاشقانست
عشق ظاہر عین آب زندگیست — نور شمع محفل پایندگیست
عشق ظاہر خسرو ملک بقاست — عشق ظاہر عین عشق کبریاست
(ورق ۹۲۶)

حدیث رسول اکرم: الفقر فخری کے تحت فقر کا بیان دیکھیے:

گفت پیغمبر کہ شان انس و جانست — زیب بخش باغ و بستان جانست
فخر من فقر آمد از لطف خدا — بین چہ فرمودہ ست آن خیرالورا
فقر گلزار جہان عزت است — فقر روشن ساز شمع رحمتست
فقر شمع محفل روحانیانست — ماہ شب افروز بزم عاشقانست
فقر گلشن طریقت آمدہ — نور خورشید حقیقت آمدہ
فقر خورشید جہان معنویست — فقر زیب بوستان معنویست

فقر عنوان کتاب راز جانست	شرح متن مصحف آزادگانست
فقر خضر راہ عاشق آمدہ	جلوہ گر در جان صادق آمدہ
فقر روشن ساز انوار دلست	فقر آگہ ساز اسرار دلست
اہل فقر از فقر شاہی می کنند	خضر آسا رہنمائی می کنند
اہل فقر از بند تن آزادہ اند	آستین بر ہر دو کون افشاندہ اند

(ورق ۳۵ و)

(۳۶ و) توکل تاج آرای مسند نشین تجمل است

بر توکل گر دلت شد مستقیم	نعمت الوان رسانیدت نعیم

(ورق ۴۱ ب) تفضیل عشق بر عقل معاد و تفضیل معاد بر عقل معاش

علم عشق اندر کتاب عقل نیست	در کتاب عشق باب عقل نیست

(۶۲ ب) آیہ[1] ۔ قُلْ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى الخ

[آپ ان سے یوں کہیے کہ میں تم سے کچھ مطلب نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے۔]

اس کے تحت لکھتے ہیں:

جملہ گفتندش کہ ای خیر البشر	از ذوی القربای خود بردہ خبر
گفت اول مرتضی را بنگرید	بعد از وبس فاطمہ را بشمرید
پس حسن وانگہ حسین است ای مہاں	حب ایشان فرض شد بر امتان
ہر کہ دارد دوست ایشان را ز دل	او برون آرد دل خود ز آب و گل
حب ایشان مایۂ ایمان بود	اہل دین را حجت و برہان بود
حب ایشان مژدۂ جنت بود	بر سر دل افسر رحمت بود

[1] قرآن سورہ ۴۲ آیت ۲۳۔

حب ایشان صدرجنت سازدت   پس لوای معرفت افرازدت

(۶۶۴) آیۃ۔ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا الخ کے ذیل میں یہ اشعار ملتے ہیں:

ای کہ ایمان باخدا آوردہ اید   از ہمہ سو رو بیک سو کردہ اید

آنچنان ایمان تان گردد قبول   رو نہید از راہ دل سوی رسول

ہست این ایمان اول ای فتی   اینچنین آمد خبر زاوج سما

دوستی اہل بیت مصطفےٰ   بر تو آمد فرض از حکم خدا

(۶۶۵) امیر المومنین علی کی منقبت اور رویت ذوالجلال کا بیان:

چون محمد گوئی از صدق و صفا   دلنشین آید علی گفتن ترا

مولوی خوش گفتہ در مدح علی   افتخار ہر نبی و ہر ولی

مصرعۂ موزون بمدح بوتراب   ہست افزون تر ز صد باب کتاب

ہر ولی کز حب او باشد تہی   او نمی بیند دگر روز بہی

بی ولای او ولی نتوان شدن   عارف حق جز علی نتوان شدن

پھر رویت کا بیان ہے:

(۶۶۶) بشنو از من حال رویت راعیان   دل مکن از جہل غفلت تیرہ دان

ذات پاکش از جہت گرچہ برون ست   تازہ از فیض درون وہم برونست

طالبی کو از جہت آید برون   سیر آرد بی جہت در اندرون

بی جہت بیند جمال کبریا   می شود چشم دگر از جانش دا

ملہ قرآن سورہ ۴ آیت ۱۳۶ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ اے ایمان والو تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اسکے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں۔

(ورق ۶۲) فرید الدین گنج شکر کی کرامات نقل کی ہے۔ جو مولانا روم کی مدح پر ختم ہوتی ہے۔

بود سیاح جہان معنوی ‌ ‌ ‌ سیر او از خلق بوده منزوی
در ہوای سیر شد شہباز جان ‌ ‌ ‌ شد گذر او را بہ شہر مولتان
رفت اندر خانقاه شیخ شہر ‌ ‌ ‌ کہ بہار الدین است نام او بدہر
خوش نشستہ بود پیر شیخ و شاب ‌ ‌ ‌ بر سر کرسی چو بر چرخ آفتاب
شد مقابل با بہار الدین فرید ‌ ‌ ‌ آن بہار را این ہما بر سر رسید
گفت پیر مولتان ای شاه باز ‌ ‌ ‌ تا کجا کارت رسیده گوی راز
گفت مخدوما برین کرسی کہ ہست ‌ ‌ ‌ جای تو چون پادشہ داری نشست
گر بگویم می شود اندر ہوا ‌ ‌ ‌ از زمین خیزد نشیند بر ہوا
این نگفتہ بود کان کرسی ز جا ‌ ‌ ‌ رفت و شد با پیر ملتان بر ہوا
زد بکرسی پیر ملتان باز دست ‌ ‌ ‌ از ہوا کرسی بجای خود نشست...
عارفان دانند اسرار درون ‌ ‌ ‌ عارفان فہمند رمز اندرون
عارفان دانند رمز از کجاست ‌ ‌ ‌ عارفان دانند کاین سر خداست
عارفان مستند در بزم درون ‌ ‌ ‌ ساقی ایشان است معشوق بطون
گوش شان مست از کلام معنوی ‌ ‌ ‌ زین سخن آگاه باشد مولوی
مولوی در مثنوی استاد من ‌ ‌ ‌ کرد از فیض سخن ارشاد من
نیک گفت از ذوق جان بابای من ‌ ‌ ‌ روشنی افزای شمع رای من
مولوی را شاعر ماضی مدان ‌ ‌ ‌ آفتاب جان شناس و جان جان
مولوی آئینہ ذات خداست ‌ ‌ ‌ خود بخود بینای نور کبریاست

خوش بگفت آنکس بشرح آفتاب — نیست پیغمبر ولی دارد کتاب
مولوی را معنوی شد قافیہ — معنوی را مولوی شد قافیہ ...

مثنوی شاہد عرشی میں شاعر نے اپنے اجداد اور خاندان کے بعض افراد کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں شاہ طیب ہیں (جو بقول میر صالح کشفی ماں کی طرف سے چوتھے جد تھے)، شاہ نعمت اللہ ولی، مظہر الآثار سید ہاشمی، عبداللہ ترمذی ص ۶۶ اور بھائی میر صالح بیٹے محمد عارف ہیں۔ شاہ طیب کا بیان کئی حکایتوں[1] کے ضمن میں ہوا ہے، شاہ نعمت اللہ ولی اور سید ہاشمی کا ذکر ایک ایک بار بیٹے[1] کی نصیحت کے ضمن میں اور عبداللہ ترمذی کے لیے ایک[2] بڑی داستان کے علاوہ ایک آدھ جگہ اور ذکر آیا ہے[3] میر صالح کشفی کی مدح میں ایک باب ہے اور بیٹے[4] کی نصیحت میں خاندان کے مختلف افراد کا ضمنی ذکر آگیا ہے۔

شاہد عرشی کے خاتمہ میں میر مومن عرشی نے اپنے شاعرانہ نقطۂ نظر کے ساتھ اس مثنوی کے اغراض و خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چند اشعار نقل ہو چکے[5] چند اشعار اور نقل کیے جاتے ہیں:

شکر آرایم کہ از گلزار ناز — شاہد آوردم در آغوش نیاز
شکر آرایم کہ از بستان غیب — مثنوی کردم برون چوگل ز جیب
شست و شوی لب دہم از شکر لب — کہ کتاب معنوی خوانم سبق
چون دل من شکر را در بر کشید — شاہد عرشی در آغوشم کشید
شاہدی چہرہ رشک آفتاب — خود بخود از جلوۂ خود کامیاب
شاہدی کو را مکان در لامکانست — حال او بیرون ز تقریر و بیانست

۱؎ ۳۵ب، نصیحت پسر ورق ۱۰۷، ۲؎ ورق ۷۶ب ورق ۲۴۳ و ۳؎ ۲۶۸ و ۲۷۹ب ۵؎ ۷۰ و ۱۰۱ب۔

شاہد عرشی است در آغوش من | مست گشت از عطر نقش بوستان
شاہد عرشی ندارد ہیچ عیب | یافتہ آرایش از تنزئین غیب

اسکے بعد اپنے کو دوسرے شاعروں سے اس لحاظ سے ممتاز کیا ہے کہ دوسرے شعراامرا اور شاہان کی مدح کرتے ہیں اور انکے مقاصد دنیاوی اغراض پر محمول ہوتے ہیں لیکن عرشی شاعر رحمان ہے، وہ مولوی معنوی کا مقلد اور انکے طرز کا پیرو ہے، آخر میں شاہد عرشی کا امتیاز چند اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے :

شاہد عرشی است نام این کتاب | می شود از بارپایش فتح یاب
معنی این مثنوی فہمد و لی | کز محبت کردہ باشد حاصلی
آنچہ با من گفت دل می گفتہ ام | گوہر راز حقیقت سفتہ ام
ہر کسی کز صدق خواند این کتاب | گردد از راز حقیقت بہرہ یاب
خواہم از لطف خداوند کریم | باسط و باری و غفار و رحیم
تا کند مقبول طبع خاص و عام | این کتاب مثنوی را والسلام ۹۰۵

یہ مقالہ اکبرآباد میں مقیم ترمذی سادات کے خاندان پر جسکے سب سے ممتاز رکن میر عبداللہ مشکین قلم (م: ۱۰۳۵) تھے تیسرا مقالہ ہے پچھلے دو مقالے بالترتیب مشکین قلم (معارف اپریل ۱۹۹۱) اور میر صالح کشفی (مجلہ علوم اسلامیہ علیگڑھ ج ۱۶ نمبر ۱-۲) پر شایع کیے جاچکے ہیں اس خاندان کے دو ایک فرد کا نام اس مقالے میں آیا ہے، کوشش ہو تو بخوبی ممکن ہے کہ انکے کارنامے سامنے آجائیں، اس خاندان سے متعلق ایک قلمی رسالہ انڈین کانونسل آف کلچرل ریلیشنز کے کتابخانے میں ہے لیکن وہ نہ مل سکا، مل جاتا تو یقیناً کچھ اور مفید اطلاعات بہم پہنچتیں یہ اگرے کے نہ جانے کتنے علمی خانوادے ہماری توجہ کے محتاج ہیں ہمارے محققین و مورخین کا فرض ہے کہ ان علمی خانوادوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو تاریخ ہماری اس کوتاہی کو معاف نہیں کرے گی۔

کلمات نقشبندیہ

از ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبدالقادر ندوی

اسلامی تصوف کا سلسلہ عالیہ نقشبندیہ حضرت خواجہ بہاء الحق والدین محمد بن محمد البخاری معروف بہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۷۱۸ھ وفات دوشنبہ ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ/۱۳۹۰ء[1]) کی نسبت سے "نقشبندی" سلسلہ کہلاتا ہے۔

ہندوستان میں اس سلسلہ کی مستحکم بنیاد حضرت خواجہ محمد رضی الدین عبدالباقی باقی باللہ بیرنگؒ (ولادت ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ/۱۵ جولائی ۱۵۶۴ء بمقام کابل وفات ۱۰۱۲ھ/۳ دسمبر ۱۶۰۳ء بمقام دہلی) نے رکھی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسے آپ کے خلفائے کبار کے علاوہ آپ کے صاحبزادگان حضرت خواجہ محمد عبیداللہ معروف بہ خواجہ کلاںؒ اور حضرت خواجہ محمد عبداللہ معروف بہ خواجہ خوردؒ اور چند دیگر خلفائے شیخ تاج الدین سنبھلی، شیخ الہ داد، خواجہ محمد ... حسام الدین احمد وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے واسطوں سے آپ کا سلسلۂ طریقت عام ہوا اور مقبولیت تمام سے سرفراز ہوا[2]۔

اس سلسلہ عالیہ کی ظاہری خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تمام ہو کر واصل بہ ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے جبکہ دیگر سلاسل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ پر تمام ہوتے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ

مرفوع ہے جبکہ خواجہ حسن بصریؒ کے واسطے سے جو سلاسل مذکور ہیں وہ مرسل ہیں اس لیے کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے ثابت نہیں ہے۔

علامہ عبدالرحمن جامیؒ نے نفحات الانس میں خواجہ نقشبندؒ کے مندرجۂ ذیل اقوال نقل فرمائے ہیں جن سے اس سلسلہ عالیہ کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) پرسیدند کہ در طریقۂ شما ذکر جہر و خلوت و سماع می باشد فرمودند کہ نمی باشد

لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کے طریقہ میں ذکر جہری، خلوت اور سماع ہے؟ فرمایا کہ نہیں ہے۔

(۲) گفتند کہ بنا ر طریقۂ شما بر چیست؟ فرمودند کہ خلوت در انجمن بظاہر با خلق ہستند و بباطن با حق سبحانہ و تعالیٰ

عرض کیا کہ آپ کے طریقہ کی بنا کیا ہے فرمایا کہ خلوت در انجمن بظاہر مخلوق کے ساتھ رہے اور بباطن حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ۔

(۳) اہل حقیقت ایمان را چنیں تعریف کردہ اند کہ الایمان عقد القلب بنفی جمیع ما توجہت القلوب من المنافع والمضار سوی اللہ تعالیٰ و می فرمودہ اند طریقۂ ما صحبت است و در خلوت شہرت است و در شہرت آفت است خیریت در جمعیت است و جمعیت در صحبت بشرط نفی بودہ۔

اہل حقیقت نے ایمان کی تعریف یوں کی ہے کہ ایمان نام ہے قلب کو مضبوط کر لینے کا اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام نفع بخش اور ضرر رساں ذرائع کی نفی پر جنکی طرف دل جھک جاتے ہیں نیز فرمایا کہ ہمارا طریقہ صحبت ہے اور خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت ہے، خیریت جمعیت میں ہے اور جمعیت صحبت میں بشرط نفی ہوتی ہے۔

(۴) در جمیع احوال قدم بر جادۂ
امر و نہی و عمل بعزیمت و سنت
بجائے آری واز رخصت ہا و بدعت ہا
دور باشی و دائما احادیث مصطفیٰ را
پیشوائے خود سازی و متفحص و
متجسس اخبار و آثار رسولؐ و
صحابۂ کرامؓ باشی۔

ہر حال میں امر و نہی کی راہ پر قدم
جمائے رہے اور عزیمت و سنت پر عمل
کرتا رہے، رخصتوں اور بدعتوں سے
دور رہے اور ہمیشہ احادیث مصطفیٰ
کو اپنا پیشوا بنائے رہے اور اخبار
و آثار رسولؐ و صحابہؓ کی تلاش و جستجو
میں فکر مند رہے۔

اس سلسلہ کی خصوصیت شیخ محمد اکرام مرحوم نے "رود کوثر" میں اس طرح بیان کی ہے۔

" عہد اکبری میں علما و مشائخ کی کمی نہ تھی۔ مورخین عہد نے ان کی جو طویل فہرستیں دی ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علم اور تصوف کا عہد زریں سمجھنا چاہیے۔ لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہد اکبری کی مذہبی بوالعجبیوں کو روکنے کے لیے کوئی موثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے تبعین وغیرہ) وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریک کار ہو گئے، جو شیخ عبد الحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ تنہائی میں اللہ اللہ یا درس و تدریس کرنے لگے، مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی صدر الصدور کو آپس کی مخالفتوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا، جونپور کے ملا محمد یزدیؒ اور پنجاب کے علما اکبر کی تعزیری کوششوں کا شکار ہو گئے۔ فتنہ کا سد باب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا جنھوں نے حصول فیض اور ارشاد

وہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراء النہر گئے اور نقشبندیہ سلسلہ میں منسلک ہونے کے بعد عہد اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد انہیں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہیں ہوا لیکن اپنی روحانی پاکیزگی اور سربلندی سے انھوں نے اکبر کے ارکین سلطنت (مثلاً شیخ فرید، قلیج خاں، صدر جہاں) اور علماء و مشائخ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ) کو اس طرح مسخر کیا اور بالجملہ ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑا دی اور اکبر کی براہ راست مخالفت کیے بغیر اس طرح ایک نئی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہوگیا۔"

"خواجہ باقی باللہؒ کا طریق کار وقت کی ضرورت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہے۔ چشتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشۂ تنہائی میں یاد خدا کرنے کی ہیں۔ لیکن اسوقت دربار شاہی سے بدعت و تجدد کی لہریں آرہی تھیں اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا تھا بعض درباریوں کے طور طریقے بگڑ گئے تھے اسوقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ارباب فیض دربار شاہی اور ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشی بدعتوں نے پیدا کردی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریقۂ کار کے سب سے پُرزور ترجمان نقشبندی حضرات ہیں، جکے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبیداللہ احرارؒ کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے کئی مکتوبات میں نقل ہوا ہے:

"اگر ما شیخی ی کردیم، دریں روزگار ہیچ شیخ مرید نیافت، لیکن ما را کارِ دیگر فرمودہ اند کہ مسلمانان را از شرِ ظلم نگاہداریم، بواسطۂ ایں بپادشاہاں بالیست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسطِ ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن"۔

"ہندوستان میں جس بزرگ نے اس اصول پر سب سے پہلے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امراء و اکابر سے اختلاط پیدا کرکے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار افراد کا محاذ قائم کیا وہ حضرت باقی باللہ بیرنگ تھے۔ جنھیں حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے سلسلۃ الاحرار کے نام سے جو رباعیات لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

ایں سکہ کہ من زدم، بنام فقر است | وین روشنی از نور تمام فقر است
برخیز و رہِ خواجۂ احرار بگیر | کاں راہ ز سرحد مقام فقر است"

یہی خواجہ عبید اللہ احرار رحمہ اللہ (ولادت ۸۰۶ھ/۱۳۹۱ء وفات ۸۹۵ھ/۱۴۸۳ء) ہیں جن کے تعلق سے اقبالؒ نے حضرت مجددؒ کی بابت فرمایا ؎

جس کے نفس گرم میں ہے گرمیٔ احرار

شیخ محمد امین الکردی الاربلی الشافعی (وفات ۱۳۳۲ھ) نے اپنی کتاب "تنویر القلوب فی معاملۃ علام الغیوب" میں حضرت ابو سعید خرازؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

لیس الکامل من صدر	کامل وہ نہیں ہے جس سے طرح طرح کی
عنہ انواع الکرامات، وانما	کرامتوں کا ظہور ہو، کامل تو بس وہ
الکامل الذی یقعد بین الخلق	ہے جو مخلوق کے درمیان بیٹھے ان سے
یبیع ویشتری معھم ویتزوج	خرید و فروخت کرے اور لوگوں سے
ویختلط بالناس ولا یغفل	میل جول رکھے اور اللہ سے ایک پل
عن اللہ لحظۃ واحدۃ۔	بھی غافل نہ ہو۔

اتباع واحیائے سنت اور اجتناب ورد بدعت اس طریقہ کا امتیاز ہے، اس سلسلہ کے مشایخ احکام شریعت کے اس قدر پابند ہوتے تھے کہ چودھویں صدی کے اس سلسلہ کے امام اور یس زماں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (ولادت ۱۲۰۸ھ وفات ۱۳۱۳ھ) نے ارشاد فرمایا: "غوث ہو یا قطب جو خلاف شرع کرے وہ کچھ بھی نہیں" ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا "اتباع سنت ہی غوثیت اور قطبیت ہے"

حضرت گنج مرادآبادیؒ اذکار و اوراد میں بھی سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے خلیفہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ لکھتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت قبلہؒ نے یہ دعا پڑھی:

اللّٰھم اغفر لی ذنبی ووسّع	اے اللہ! میرے گناہ بخش دے اور
لی فی داری وبارک لی	میرے گھر کو میرے لیے کشادہ کر دے
فی رزقی۔	اور میری روزی میں برکت عطا فرما۔

اور ارشاد ہوا کہ "وضو کے اندر اسی دعا کا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے اور کسی دعا کا پڑھنا حدیث میں نہیں آیا ہے"

مولانا جذب و شوق میں جو اشعار پڑھا کرتے تھے ان میں سنائی کا یہ شعر بھی تھا۔

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سخن

اس سلسلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ذکر جہری کے بجائے ذکر خفی سری قلبی کی تلقین کی گئی ہے اور سالک کو اپنی ذاتی تربیت پر زور دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ ذکر قلبی کے سلسلے میں نقشبندی بزرگ شیخ محمد امین الکردیؒ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم ان الذکر نوعان: قلبی و	جان لو کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: قلبی اور
لسانی ولکل واحد منهما	لسانی اور دونوں میں سے ہر ایک کے
شواهد من الکتاب والسنة	لیے کتاب و سنت کے شواہد موجود ہیں۔
فالذکر اللسانی باللفظ المرکب	پس ذکر لسانی جو اصوات و حروف پر
من الاصوات والحروف لا	مشتمل الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے ذاکر
یتیسر للذاکر فی جمیع الاوقات	کے لیے جملہ اوقات میں آسان نہیں ہے
فان البیع والشراء ونحوهما	اس لیے کہ خرید و فروخت اور اس کے
یلهیان الذاکر عنه البتة	جیسے افعال ذاکر کو ذکر سے غافل کرتے
بخلاف الذکر القلبی فانه بملاحظة	رہتے ہیں، برخلاف ذکر قلبی کے کہ وہ
مسمیٰ ذالک اللفظ المجرد عن	اس لفظ کے مسمیٰ کا دھیان کرکے ہوتا
الحروف والاصوات واذاً	ہے جو حروف و اصوات سے خالی ہوتا ہے
فلا شیٔ یلهی الذاکر عنه	اور تب کوئی چیز ذاکر کو غافل نہیں کرسکتی۔
بقلب فاذکروا الله خفیا	خاموشی سے اللہ کا ذکر کرو مخلوق سے
عن الخلق بلا حرف وقال	بغیر حرف و قال کے ہٹ کر، یہ ذکر
وهذا الذکر افضل کل ذکر	تمام اذکار سے افضل ہے بزرگوں نے

بهذا قد جرى قول الرجال۔
ولذلك اختار ساداتنا
النقشبندية الذكر القلبي
ولان القلب محل نظر الله
الغفار وموضع الايمان ومعدن
الاسرار ومنبع الانوار وبصلاحه
يصلح الجسد كله وبفساده
يفسد الجسد كله كما بينه
لنا النبي المختار صلى الله عليه وسلم
ولا يكون العبد مومنا الا
بعقد القلب على ما يجب الايمان
به ولا تصح عبادة مقصودة
الا بنية فيه وقد اجمع
الائمة على ان افعال الجوارح
لا تقبل الا بعمل القلب وان
عمل القلب يقبل بدونها،
ولو لم تقبل اعمال القلوب لما
قبل الايمان لان الايمان
هو التصديق بالقلب۔

ایسی ہی بات فرمائی ہے۔
اور اسی لیے ہمارے نقشبندی بزرگوں
نے ذکر قلبی کو اختیار کیا ہے اور اسلیے بھی
کہ قلب اللہ غفار کی نظر کا مقام ہے،
ایمان کی جا ہے، اسرار کی کان اور
انوار کا سرچشمہ ہے، اسکی درستگی
پورے بدن کی درستگی کا باعث ہے
اور اسکے بگاڑ سے پورے بدن کا
بگاڑ ہے ایسا ہی ہم سے نبی مختار نے
بیان فرمایا ہے۔ اور نیت کے بغیر کوئی
عبادت درست نہیں۔ ائمہ کا اجماع
ہے کہ اعضاء و جوارح کے افعال عمل
قلب کے بغیر مقبول نہیں جب کہ
عمل قلب بغیر ان کے مقبول ہے،
اور اگر اعمال قلوب مقبول نہیں
تو ایمان مقبول نہیں اس لیے کہ
ایمان تصدیق بالقلب کا نام
ہے۔

اس سلسلہ میں شیخ صاحب موصوف کے مندرجہ ذیل فقرے بھی لائق ذکر ہیں:

واما السادة النقشبندية فقد قالوا: بعد ما يتوجه المريد الى التصفية والتوجه الى الحق بالصدق يحصل له من التزكية بامداد (جذبة من جذبات الرحمن) في ساعة ما لا يحصل لغيره من الرياضات في سنين — فاول قدم يضعونه في الذكر القلب وهو المرتبة الثانية من مراتب الذكر في سائر الطرق — قال الشيخ الاكبر (السيد محمد بهاء الدين نقشبند) قدس سره (بداية طريقتنا نهاية سائر الطرق) وهي طريقة الصحابة رضي الله عنهم باقية على اصلها لم يزيدوا ولم ينقصوا۔	نقشبندی بزرگوں نے فرمایا ہے کہ مرید جب صدق دل سے تصفیہ اور توجہ الی الحق پر متوجہ ہوتا ہے تو اسکو جذبہ رحمانی کی امداد سے وہ تزکیہ ایک گھڑی میں حاصل ہو جاتا ہے وہ دوسری ریاضتوں سے برسوں میں نہیں حاصل ہوتا — پس وہ پہلا قدم ذکر میں قلب پر رکھتے ہیں حالانکہ دوسرے تمام طریقوں میں مراتب ذکر کا دوسرا مرتبہ ہے — شیخ اکبر سید محمد بہاء الدین نقشبند قدس سرہ نے فرمایا (ہمارے طریقہ کی ابتدا دوسرے تمام طریقوں کی انتہا ہے) اور یہی صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے جو بے کم و کاست اپنی اصل پر باقی ہے۔

اشغال نقشبندیہ | نقشبندیہ تین اشغال کی تلقین کرتے ہیں:

(۱) ذکر (۲) مراقبہ (۳) رابطہ بالشیخ۔

ذکر دو طرح کا ہے: نفی اثبات، اثبات مجرد۔

نفی اثبات | حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنی کتاب "القول الجمیل" میں تحریر فرماتے ہیں:

قالوا: طرق الوصول الی اللہ	نقشبندیہ نے کہا کہ اللہ تک پہنچنے
ثلاث احدھا: فمنه النفی والاثبات	کی تین راہیں ہیں (ایک تو ذکر ہے)
وھو الماثور عن متقدمیھم	سو منجملہ ذکر کے نفی اور اثبات ہے
وصفته ان ینتھز فرصة من	اور وہی منقول ہے متقدمین نقشبندیہ
التشویشات الخارجیة کالاستماع	سے اور طریقہ نفی اثبات کے ذکر کا
الی احادیث الناس والداخلیة	یہ ہے کہ فرصت کو غنیمت جانے
کالجوع المفرط والغضب والالم	تشویشات بیرونی سے چنانچہ
والشبع المفرط ثم یذکر الموت	لوگوں کی گفتگو سننا اور تشویشات
ویحضرہ بین یدیه ویستغفر اللہ	اندرونی سے چنانچہ گرسنگی زائد اور
تعالی مما صدر عنه من المعاصی	غضب اور درد اور سیری مفرط پھر
ثم یضم شفتیه ویغمض عینیه	موت کو یاد کرے اور تصور میں اسکو
ویحبس نفسه فی بطنه ویقول	اپنے آگے سامنے کرے اور اللہ تعالیٰ سے
بالقلب "لا" یخرجھا من سرته	مغفرت چاہے ان گناہوں کی جو اس سے
الی الایمن ویمدھا حتی یصل	صادر ہوئے پھر دونوں لبوں اور
الی منکبه ثم یحرک منکبه الی	دونوں آنکھوں کو بند کرے اور
راسه فیقول "اله" ثم یضرب	دم کو اپنے پیٹ میں حبس کرے اور
فی قلبه بالشدة "الا اللہ" قالوا:	دل سے کہے "لا" اس کو اپنی ناف
لحبس النفس خاصیة عجیبة	سے داہنی طرف نکالے اور کھینچے یہانتک

فی تسخین الباطن وجمع العزیمة
وهیجان العشق وقطع احادیث
النفس ویتدرج فی الحبس
لئلا یثقل علیه، والمراد
بالحبس غیر المفرط فبینه
وبین ما یأمر به الجوکیة
بون بائن وکذالك لعداد
الوتر خاصیة عجیبة فیقول
اولا هذه الکلمة مرة فی
نفس واحد ثم یقول
ثلث مرات فی نفس واحد
وهکذا یتدرج حتی یصل
الی احدی وعشرین مع المراعاة
علی عدد الوتر والشرط الاعظم
ملاحظة نفی المعبودیة
والمقصودیة او الوجود من
غیر اللّٰه تعالیٰ واثباتها
له تعالیٰ علی وجه التاکید
واجتماع الخاطر لا کما یفعله

کہ اپنے مونڈھے تک پہونچے پھر مونڈھے
کو سر کی طرف جھکاوے اور ہلاوے
اور کہے "اللہ" پھر ضرب لگاوے اپنے
دل میں سختی سے "الا اللہ" کی نقشبندیہ
نے فرمایا کہ حبس نفس یعنی دم روکنے
کی عجیب خاصیت ہے باطن کے
گرم کر دینے اور جمعیت عزیمت
اور عشق کے ابھارنے اور
وساوس کے قطع کرنے میں اور
بتدریج اندک اندک حبس دم کی
مشق کرے تاکہ اس پر گراں نہ ہو
جاوے اور خشکی کی بیماری نہ پیدا ہو جاوے
اور حبس دم سے حبس غیر مفرط مراد ہے
جسکی نوبت حصر نفس تک نہ پہونچے تو
نقشبندیہ کے حبس دم میں اور اس حبس دم
میں جو جوگی بتاتے ہیں فرق بعید ہے اور
حبس دم کی مانند شمار طاق کی بھی عجیب
خاصیت ہے تو اول اس کلمۂ توحید کو
ایکبار ایک دم میں کہے، پھر تین بار ایک

فی النفس من الخطرات
والاحادیث ومن بلغ
الی احدی وعشرین مرۃ
ولم ینفتح لہ باب من الجذب
والانصراف الباطن
الی اللہ تعالیٰ وجب الاشتغال
باسمہ والنفرۃ
عن الاشتغال الاخری
فلیعرف ان عملہ لم یقبلہ
فلیستأنف بعدہ الشروط
من الثلثۃ الی احدی
وعشرین۔

میں کہے اسی طرح درجہ بدرجہ چند روز
کی مشق میں اکیس بار تک پہونچے طاق عدد
کی مراعات کے ساتھ یعنی اول بار ایک بار
اور دوسری بار تین بار اور تیسری بار
پانچ بار اور چوتھی بار سات بار وعلیٰ ہذا
القیاس اور شرط اعظم نفی اثبات کے ذکر
میں ملاحظہ کرنا ہے نفی معبودیت یا نفی
مقصودیت یا نفی وجود کا غیر اللہ سے
اور اثبات معبودیت وغیرہ کا حق تعالیٰ
کے واسطے بر وجہ تاکید اور اجتماع خاطر
نہ اوسطرح جیسے دل میں خطرات اور
باتوں کے خیالات گھومتے پھرتے ہیں
اور جو شخص کہ اکیس بار تک پہونچا اور
اسکے واسطے جذب یعنی کشش ربانی اور
خدا کی طرف گردش باطن کا دروازہ
نہ کھلا تو اسکو اسکے اسم کی مشغولی واجب
ہوئی اور نفرت اور اشتغال سے لازم
آئی تو چاہیے کہ وہ معلوم کرے کہ اسکا
عمل مقبول نہ ہوا تو بشروط مذکورہ اسکو

پھر شروع کرنا چاہیے اکیس بار تک۔

شیخ محمد امین الکردی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

وفی آخر کلمة التوحید عند الوقوف علی عدد الوتر یتخیل (محمد رسول اللہ) من القلب الی ما تحت الثدی الیمین ویرید بذالک اتباع النبی صلی اللہ علیہ وسلم والمحبة له۔

عدد وتر پر پہونچ کر کلمۂ توحید کے آخر میں قلب سے داہنی چھاتی کے نیچے تک (محمد رسول اللہ) کا خیال کرے اور اس سے اتباع و محبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کرے۔

اثبات مجرد | شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

الاثبات المجرد کانہ لم یکن عند المتقدمین وانما استخرجه خواجہ محمد باقی او من یقرب به فی الزمان واللہ اعلم۔ وصفته ان یخرج لفظة "اللہ" من سرته بالشد التام ویمدها حتی یصل الی ام دماغه مع الحبس والتدرج فی الزیادة حتی ان منهم من یقولها فی نفس واحد الف مرة۔

اور منجملہ ذکر کے اثبات مجرد ہے یعنی فقط اللہ کا ذکر کرے بدون نفی اور اثبات وغیرہ کے اور گویا کہ یہ ذکر متقدمین نقشبندیہ کے نزدیک نہ تھا اسکو تو خواجہ محمد باقی یا انکے کسی قریب العصر نے نکالا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور طریقہ اثبات مجرد کا یہ ہے کہ اللہ کے لفظ کو اپنی ناف سے بشدت تمام نکالے اور اسکو کھینچے یہانتک کہ دماغ کی جھلی تک پہونچے حبس دم کے ساتھ اور اندک اندک زیادہ کرتا جاوے یہانتک کہ

بعضے نقشبندی ایک دم میں اسکو
ہزار بار کہتے ہیں۔

اس ضمن میں مولانا بلھوریؒ نے یہ فائدہ نقل کیا ہے: " مولانا نے فرمایا کہ اثبات مجرد شریعت میں کہیں ثابت نہیں اس واسطے کہ ذات بحت کا تصور عوام کو ممکن نہیں بلکہ شرع میں اسم ذات بعض صفات یا بعض محامد کے ساتھ یا بعض ادعیہ کے ساتھ وارد ہوا ہے"۔

مراقبہ | شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وثانیها المراقبة، وصفتها	اور دوسرا طریقہ وصول الی اللہ کا مراقبہ
ان یحبس النفس تحت	ہے اور طریقہ مراقبہ کا یہ ہے کہ دم کو بند
السرة حبساً یسیراً ثم یتوجه	کرے ناف کے نیچے تھوڑا سا پھر اپنے
بجامع ادراکه الی المعنی المجرد	جمیع حواس مدرکہ سے متوجہ ہو معنی
البسیط الذی یتصوره کل	مجرد بسیط کی طرف جس کو ہر شخص اللہ
احد عند اطلاق اسم الله	کے نام بولنے کے وقت تصور کرتا ہے
ولاکن قل من یجرده عن	ولیکن ایسے لوگ کم ہیں جو اس معنی
اللفظ فلیجتهد هذا الطالب	بسیط کو لفظ سے خالی کر سکیں تو طالب
ان یجرد هذا المعنی عن الفاظ	کوشش کرے کہ اس معنی بسیط کو
ویتوجه الیه من غیر	الفاظ سے جدا کرے اور اسکی طرف
مزاحمة الخطرات والتوجه	متوجہ ہو بلا مزاحمت خطرات اور
الی الغیر ومن الناس من	التفات ماسوا اللہ کے اور بعضے
لا یمکنه هذا النحو من الادراک	لوگوں سے اس قسم کا ادراک نہیں

فمن المشائخ من یامرہ مثل ھذا	ہوسکتا ہے سو بعض مشائخ تو ایسے شخص
بالدعاء وصفتہ ان لا یزال	کو اس طرح کا دعا بتاتے ہیں اور طریقہ اس
یدعو اللہ بقلبہ یقول :	دعا کا یہ ہے کہ ہمیشہ دل سے دعا کرے
یارب انت مقصودی قد	یوں کہے کہ اے رب! تو ہی میرا مقصود
تبرأت الیک عن کل ما	ہے۔ میں بیزار ہو آیا تیری طرف تیرے
سواک ونحو ذالک من المناجاۃ	ماسوا سے اور مانند اسکے اور کوئی مناجات
ومنھم من یامرہ بتخیل الخلاء	کرے اور بعضے مشائخ شخص مذکور کو خلاء
المجرد او النور البسیط	مجرد یا نور بسیط کے خیال کرنے کو فرماتے
فیتدرج الطالب من ھذا	ہیں تو طالب اس تخیل سے توجہ مذکور کی
التخیل الی التوجہ المذکور۔	طرف بتدریج پہونچ جاتا ہے۔

مولانا بلہوریؒ اس مقام پر مزید لکھتے ہیں: "مترجم کہتا ہے خلاء مجرد سے یہ مراد ہے کہ سارے عالم کے مکان کو جمیع اجسام سے خالی تصور کرے [illegible] عبارت ہے۔"

12.3.6.49
7.3.95

رابطہ باشیخ | شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وثالثھا الرابطۃ بشیخہ و	اور تیسرا طریقہ وصول الی اللہ کا رابطہ
شرطھا ان یکون الشیخ	اور اعتقاد کامل بہم پہونچانا ہے اپنے
قوی التوجہ دائم الیاد	مرشد کے ساتھ اور رابطہ مرشد کی
داشت فاذا صحبہ خلی نفسہ	شرط یہ ہے کہ مرشد قوی التوجہ
عن کل شیئ الا محبتہ و ینتظر	ہو یادداشت کی مشق دائمی رکھتا ہو
لما یفیض منہ و یغمض عینیہ	پھر جب ایسے مرشد کی صحبت کرے تو

او يغمضهما وينظر بين عيني الشيخ فاذا افاض شيئ فليتبعه بمجامع قلبه وليحافظ عليه واذا غاب الشيخ عنه يتخيل صورته بين عينيه بوصف المحبة والتعظيم فتفيد صورته ما تفيد صحبته۔

اپنی ذات کو ہر چیز کے تصور اور خیال سے خالی کر ڈالے سوا اسکی محبت کے اور اسکا منتظر رہے جبکا اسکی طرف سے فیض آوے اور دونوں آنکھیں بند کر لے یا انکو کھول دے اور مرشد کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں ٹکٹکی لگا دے پھر جب کسی چیز کا فیض آوے تو اسکے پیچھے پڑ جاوے اپنے دل کی جمعیت سے اور چاہیے کہ اس فیض کی محافظت کرے اور جب مرشد اسکے پاس نہ ہو تو اسکی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے درمیان خیال کرتا رہے بطریق محبت اور تعظیم کے تو اس کی خیالی صورت وہ فائدہ دے گی جو اسکی صحبت فائدہ دیتی تھی

رابطہ بالشیخ کے سلسلے میں مولانا خرم علی بلہوریؒ نے دو فوائد تحریر کیے ہیں:

(۱) "مولانا نے فرمایا حق یہ ہے کہ سب راہوں سے یہ راہ زیادہ تر قریب ہے، اگا ہے مرید میں قابلیت نہیں ہوتی تو اسکی مزید محبت سے مرشد اس میں تصرف کرتا ہے۔ مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ اللہ کے ساتھ صحبت رکھو سو اگر تم سے نہ ہو سکے تو ان کے ساتھ صحبت رکھو جو اللہ کے ساتھ صحبت رکھتے ہیں اور اس آیت قرآنی میں (کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ) یعنی سچوں کے ساتھ رہو ایک طرح کا اشارہ ہے رابطہ مرشد کا"

(۲) "مولانا نے فرمایا مرشد کی شرط یہ ہے کہ واصل بمقام مشاہدہ ہو اور نورانی بتجلیات ذاتیہ ہو جسکے دیکھنے سے ذکر کا فائدہ حاصل ہو بموجب اس حدیث کے کہ ھم الذین اذا رأوا ذکر اللہ یعنی اولیاء اللہ وہ ہیں جنکے دیکھنے سے خدا یاد پڑے اور جنکی صحبت فوائد صحبت کی مفید ہو بموجب اس حدیث کے کہ ھم جلساء اللہ کہ اولیاء اللہ جلیس ہیں خدا کے، اور بمقتضائے اس حدیث معتمد کے کہ ھم قوم لا یشقیٰ جلیسھم اولیاء اللہ ایسی قوم ہیں جن کا جلیس اور ہم صحبت بدبخت نہیں ہوتا۔"

ان فوائد کے بعد مولانا بلھوری نے اپنی رائے ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:

"خلاصہ یہ کہ جسکی صحبت سے دنیا سرد ہو اور ہر طرف [illegible] سے متعلق ہو جاوے تو اسکی صحبت اور محبت اکسیر اعظم ہے اور جب دنیا دل سے نہ منقطع ہوئی تو تضییع اوقات ہے اسکی صحبت سے تو تنہائی بہتر ہے تو واجب ہے کہ غلو عوام سے دھوکا نہ کھاوے، ہر شخص سے بیعت نہ کرے بلکہ طریقت کی بیعت اس مرشد کامل مکمل سے کرے جسکی ولایت کی علامات ظاہر اور باہر ہوں۔ مولوی روم علیہ الرحمہ نے فرمایا ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔۔۔ پس بہر دستے نشاید داد دست

اعتقاد اور محبت مرشد کی عمدہ چیز ہے لیکن افراط اور تفریط ہر امر میں معیوب ہے ایسی افراط بھی بہتر نہیں جس میں صورت پرستی کی نوبت پہونچے اور شریعت محمدیہ کی مخالفت ہو جاوے حق تعالیٰ ہر امر میں صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین۔"

کلمات نقشبندیہ | یہ فارسی کے گیارہ کلمات ہیں۔ ان میں سے آٹھ یعنی ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یاد کرد، بازگشت، نگاہ داشت، یادداشت حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے ماثور ہیں اور باقی تین یعنی وقوف زمانی، وقوف قلبی، وقوف عددی

حضرت خواجہ نقشبندؒ سے ماثور ہیں ملا حسینؒ خبازؒ نے اول الذکر آٹھ کو ہشت شرائط نقشبند سے موسوم کیا ہے اور فارسی میں اس طرح نظم کیا ہے :

ہشت شرط است در رہِ حق اے حسین	گر نگہ داری شوی فارغ از یں
ہوش در دم ہم نظر اندر قدم	خلوت در انجمن شد دم بدم
ہم سفر اندر وطن باید ہمے	یادکرد و بازگشت در ہر دمے
پس نگاہ داشت باید یادداشت	شغل داری صبح و شام و شب و چاشت

اس کے بعد ملا صاحب نے بشمول آخر الذکرتین کے ہر ایک کو مفصل بیان کرتے ہوئے انکے عام و خاص معانی بیان کیے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے القول الجمیل میں (ص ۵۷ تا ۶۴) اور شیخ محمد امین الکردیؒ نے تنویر القلوب (ص ۵۰۶ تا ۵۰۸) میں انکی تفصیل درج کی ہے۔ شیخ کردی نے شاہ صاحب اور ملا صاحب کے مقابلہ میں اختصار و جامعیت سے کام لیا ہے اسلیے ہم ہر ایک کی تفصیل ان ہی کے حوالہ سے نقل کریں گے اس کے بعد دیگر حضرات کے ضروری اضافات بھی شامل کر دیں گے۔

ہوش در دم | شیخ کردی فرماتے ہیں :

معناہ حفظ النفس من الغفلۃ	اس کے معنی یہ ہیں کہ دم کے آتے جاتے
عند دخولہ وخروجہ وبینھما	وقت اور اسکے درمیانی وقفہ میں تمام
فی جمیع الانفاس لان کل نفس	انفاس میں اسکی غفلت سے حفاظت کی
یدخل ویخرج بالحضور فھو حی	جائے اسلیے کہ ہر سانس جو حضوری کے
موصول باللہ وکل نفس یدخل	ساتھ آتی جاتی ہے وہ زندہ ہے اور
ویخرج بالغفلۃ فھو میت مقطوع	واصل بہ حق سبحانہ ہے اور جو غفلت

عن اللہ۔	کے ساتھ آتی جاتی ہے وہ مردہ ہے اللہ سے کٹی ہوئی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

معناه التيقظ في كل نفس فلا	ہوش دردم کے معنی ہوشیاری اور
يزال متيقظا متفحصا عن نفسه	بیداری ہے ہر دم کے ساتھ، تو ہمیشہ
في كل نفس هل هو غافل او ذاكر	بیدار اور متجسس رہے اپنی ذات سے،
هذا الطريق التدريج الى	ہر سانس میں کہ وہ غافل ہے یا ذاکر اور
دوام الحضور وهذا للمبتدى	یہ طریقہ ہے بتدریج دوام حضور کے
فاذا توسط في السلوك فليكن	حاصل کرنے کا اور اس طرح کی ہوشیاری
متفحصا عن نفسه في كل	مبتدی کے واسطے مخصوص ہے پھر جب
طائفة من الزمان مثل	آگے بڑھے اور سلوک کے درمیان میں
ان يتامل بعد كل ساعة	آوے تو چاہیے کھوج کرتا رہے اپنی
هل دخلت عليه فيها غفلة	ذات کا تھوڑی تھوڑی مدت میں اس طرح
اولا فان دخلت غفلة	کہ تامل کرے ہر ساعت کے بعد کہ اس
استغفر وعزم على تركها	ساعت میں غفلت آئی کہ نہیں سو اگر
في المستقبل وهكذا حتى يصل	غفلت آگئی ہو تو استغفار کرے اور
الى الدوام ويسمى هذا الاخير	آئندہ کو اسکے چھوڑنے کا ارادہ کرے
بوقوف زمانی واستخرجه	اسی طرح مدام تفحص کرتا رہے یہاں تک
خواجه نقشبندؒ لما رأى ان	کہ دوام حضور کو پہونچ جاوے اور

التوجہ الی علم العلم فی کل نفس یشوش حال المتوسط فانما اللائق بہ الاستغراق فی التوجہ الی اللہ بحیث لا یزاحمہ علم ھذا التوجہ۔	یہ پچھلا طریق کی ہوشیاری مسمی بہ وقوف زمانی ہے اسکو خواجہ نقشبندؒ نے استوارع کیا اس واسطے کہ انھوں نے معلوم کیا کہ متوجہ ہونا علم العلم کیطرف یعنی دانست کو دریافت کرنا ہردم میں سالک متوسط کے حال کو پریشان کرتا ہے اسکے مناسب تو استغراق ہے توجہ الی اللہ میں اس طرح پر کہ اسکو اپنے متوجہ ہونیکی دانست بھی مزاحم حال نہ ہو۔

یہاں مترجم مولانا بلھوریؒ نے یہ فائدہ درج کیا ہے :

"مترجم کہتا ہے ہر ہردم کا محاسبہ عبارت ہے ہوش دردم سے سو یہ مبتدی کے مناسب ہے نہ متوسط کے اور قدرے مدت کا محاسبہ جسکا نام وقوف زمانی ہے لائق بہ مرتبہ متوسط ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ وقوف زمانی کو صوفیہ محاسبہ کہتے ہیں۔ حدیث وارد ہے کہ ہوشیار وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو دبایا اور مابعد موت کے واسطے عمل کیا اور امیر المومنین عمر فاروقؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ اپنی جانوں کا محاسبہ کرو قبل اسکے کہ تم سے حساب لیا جاوے اور انکو وزن کرو قبل اسکے کہ وزن کیے جاؤ اور مستعد ہو جاؤ عرض اکبر کے واسطے یعنی خدا کا سامنا جو قیامت میں ہوگا اس دن تم سامنے کیے جاؤ گے تمھاری کوئی چیز نہ چھپ سکے گی۔"

ملا عبادؒ نے ہوش دردم کے عام معنی تو وہی لکھے جو اوپر مذکور ہوئے۔ صرف اتنا اضافہ ہے کہ "ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے اور ربطے قلب حاصل کرے"۔ (بین السطور لطے یعنی نور) اور خاص معنی یہ بتاتے ہیں کہ "ہر ایک دم میں غیر کی نفی اور حق کا اثبات کرے"۔

حواشی

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے : انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (۱۹۳۰ء) ۸ : ۸۸۷، ایضاً ۱۰ :
۴۲، نفحات الانس ۔ عبدالرحمٰن جامی (نولکشور ۱۹۱۵ء) : ۳۴۵ ومابعد، انوار العارفین ۔
حافظ محمد حسین (۱۲۹۰ھ) ۲ تفصیل کے لیے دیکھیے : رود کوثر شیخ محمد اکرام (دہلی ۱۹۸۰ء) :
۱۹ ومابعد ۳ ایضاً ص ۳۴۵ ۔ ۳۴۶ ۴ ایضاً ص ۱۹۰ ۔ ۱۹۱ ۵ ترجمہ : اگر ہم شیخی کرتے تو
کوئی پیر مرید نہ پاتا لیکن ہم کو دوسرے کام کا حکم ہوا ہے کہ مسلمانوں کو ظلم کے شر سے محفوظ رکھیں
جس کے لیے بادشاہوں سے ملنا جلنا اور ان کے دلوں کو مسخر کرنا اور اس طرح مسلمانوں کے عمل مقصود
حاصل کرنا ہوگا ۶ مطبوعہ مکتبہ اشاعت اسلام دہلی : ۵۰۵ ۷ تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن
گنج مرادآبادیؒ از : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ بار اول : ۵۰ ۸ ایضاً : ۲ ۹ مصدر
سابق : ۵۰۸ ۔ ۵۰۹ ۱۰ ایضاً : ۵۰۴ ۔ ۵۰۵ ۱۱ مطبوعہ مع اردو ترجمہ مولانا خرم علی
بلہوریؒ موسومہ بہ "شفاء العلیل" (مطبع محمدی ۱۳۲۹ھ) : ۵۰ ومابعد عربی عبارت کا ترجمہ
مولانا خرم علی صاحب ہی کا کیا ہوا ہے ۔ آگے بھی شاہ صاحبؒ کی عبارتوں کے ترجمے انہی سے لیے گئے ہیں۔
۱۲ مصدر سابق : ۱۴ ۱۳ مولانا بلہوری نے شفاء العلیل کے مقدمہ میں وضاحت کی ہے کہ
اور جو حواشی مصنف قدس سرہ اور ان کے خلف الرشید علامہ عصر مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ
نے اس کتاب پر لکھے تھے برائے مزید توضیح اور تکثیر فوائد کے واسطے ان کا ترجمہ بھی ذیلی فوائد میں مندرج
کر دیا ۔ جہاں کہیں "مولانا" کا لفظ آوے تو مولانا شاہ عبدالعزیزؒ مراد ہوں گے ۔
۱۴ سورۂ توبہ : آیت ۱۱۹ ۱۵ دیکھیے رسالہ ہشت شرائط مطبوعہ مع ترجمہ اردو از ملک
فضل الدین ککے زئی ۔ نولکشور ۔ لاہور بار اول ۔

(باقی)

غبار خاطر (ایک تاثراتی جائزہ)

از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ایک محقق نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد احمد نگر کے قید خانے میں کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی مربوط سلسلہ نہ تھا، یہ کہ عین ممکن ہے کہ انہیں اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال فرانس کے مشہور مصنف مون ٹسکیو کے فارسی خطوط (Persian Letters) کے مطالعے سے آیا ہو۔ فارسی خطوط کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا تھا، عربی میں بھی ہوا تھا۔ اس بات کی تائید میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے کہ مولانا آزاد نے یہ عربی ترجمہ پڑھا ہوگا۔ فارسی اور اردو میں مکتوب نگاری کی شاندار روایت پہلے سے موجود تھی، جس سے مولانا آزاد واقف بھی ہوں گے اور متاثر بھی۔

مون ٹسکیو کے فارسی خطوط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ اس سے مولانا آزاد جیسا عبقری جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی راہ آپ نکالنے کا شیدائی تھا اس قدر متاثر ہو۔ یہ خطوط فارسی اس لیے ہیں کہ یہ خط و کتابت ہے چند ایرانیوں کے مابین جو یورپ کی سیاحت پر نکلے ہیں۔ یہ بھولے بھالے ایرانی سیاح مون ٹسکیو کے ذہن کی پیداوار ہیں، ایک نئی طرز کی فکشن کے کردار جن کی زبان سے ان خطوط کا مصنف اٹھارویں صدی کے یورپ کی معیشت و معاشرت پر تنقید اور بعض روایتی اداروں پر طنز کرتا ہے۔ ان خطوط کا لہجہ اور ان کے موضوعات کا رنگ بالکل مختلف ہے۔ ہم نے اس کتاب کا انگریزی

ترجمہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ غبارِ خاطر اور اس میں کوئی مماثلت نہیں۔

غبارِ خاطر ایک دوسری نوعیت کی کتاب ہے۔ یہ بالکل واقعاتی نہیں ہے۔ اس کا لہجہ فارسی خطوط کے برخلاف سنجیدہ اور مفکرانہ ہے اور اس کی زبان اور اسلوب بیان میں علم و ادب کی فنکارانہ گھلاوٹ ہے جس کی وجہ سے مولانا آزاد کی یہ تصنیف اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ غبارِ خاطر کے خطوط، چند کو چھوڑ کر، نجی خط و کتابت کی نوعیت کے نہیں ہیں۔ انھیں جیل کی تنہائیوں میں مولانا آزاد نے اپنے سکونِ خاطر کے لیے لکھا ایسے متفرق عنوانات پر جو ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا موضوع تھے یا رہ چکے تھے۔ اور انھوں نے کچھ نتیجے نکالے تھے۔ شاید انھیں یہ خیال بھی ہو کہ جب کبھی یہ خطوط پڑھے جائیں گے تو پڑھنے والوں کو ان سے کچھ نہ کچھ بصیرت حاصل ہوگی اور غالباً اسی لیے انھوں نے اپنی عالمانہ دانشوری کی تابانیوں کو جستہ جستہ کر کے فکر و نظر کی راہوں میں بکھیر دینا چاہا ہوگا۔

قلعۂ احمد نگر میں مولانا آزاد کے سامنے سوال یہ رہا ہوگا کہ وہ قید خانے میں اپنا وقت کیسے گذاریں، ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام وہاں ہو نہیں سکتا تھا، اسی طرح بیشتر ان ہی اسباب کی بنا پر ان کے لیے کوئی تحقیقی اور علمی تصنیف ممکن نہیں تھی، ہاں وہ اپنے حافظہ کی مدد سے ایک حد تک اپنے سوانح حیات یا اپنے میموائرس قلم بند کر سکتے تھے۔ وہ یہ کام کر جاتے تو بڑا کام ہو جاتا، آزاد کی کہانی خود انھیں کے قلم سے، لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا، البتہ قید خانے کی تنہائی میں اپنی افتادِ طبع کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو کر انھوں نے اپنی زندگی کے بیتے دنوں کی کچھ یادوں کو تازہ کیا اور ماضی کی کئی باتوں کو کئی خطوط میں، کہیں مربوط اور کہیں جستہ جستہ، ایک خاص ادبی اسلوب میں پیش کیا اور اسی کے ساتھ

بعض خطوط میں انھوں نے اہم موضوعات سے متعلق اپنا مبہم تفکر احد اپنے تاثرات بیان کیے۔ ان میں ایک خاص موضوع خود زندگی ہے، بلکہ اس بات کو یوں کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ غبارِ خاطر کے متفرق موضوعات کا اصل سر رشتہ زندگی ہی ہے اپنی پیچیدگیوں، نیرنگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس فیصلے میں دیر نہیں لگی ہو گی کہ زنداں کی (بقول مولانا) ان دراز نفسیوں کا مخاطب کون ہو۔ کاروانِ خیال کا پہلا خط (مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۲ء) صاف بول رہا ہے کہ غبارِ خاطر کے خطوط کا مخاطب کون ہو سکتا تھا۔ اس کا ایک ٹکڑا دیکھیے۔

"اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں ؎

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم | بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

یہ ساری دراز نفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا، آپ یاد آگئے، ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزو مندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ امید نیست | فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ غالباً ۱۹۲۰ء میں۔ حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دہلی میں۔ میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے، دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا، مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی ؎

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود | ز زہد ہمچو توئی یا بہ فسق ہمچو منی"

انسان پر، خصوصاً ایک حساس انسان پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں، آرٹسٹ بھی حساس انسانوں ہی کی ایک نوع ہے۔ مولانا آزاد کی شعر و ادب کی فطری

فنکارانہ صلاحیت کا یہ کمال تھا کہ وہ اپنی گہری شخصیت کو اپنے ہر احساس و جذبے، ہر موڑ، ہر کیفیت کے سچے اظہار و بیان میں ایک حسن تناسب کے ساتھ پوری کی پوری سمو دیتے تھے، آپ ان کے علم و ذوق کے تنوعات کو سامنے رکھیے پھر انکے طرز بیان پر نظر رکھیے، آپ دیکھیں گے کہ ان کے اسلوب بیان اور موضوع و مضامین میں کامل ہم آہنگی ہے ضروری نہیں کہ صحافت نگاری، دینی و علمی مباحث اور ادب و انشاء کے میدانوں میں مولانا کی نگارشات سے اقتباس پیش کیے جائیں۔ اہل علم اس سے واقف ہیں۔

غبار خاطر کے خطوں میں مولانا آزاد نے کچھ سنجیدہ فلسفیانہ سوال اٹھائے ہیں، زندگی کیا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کے وجود اور انسانی زندگی میں مذہب کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ ان خطوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عام انسانی فہم و عقل سے ماورا ایک بلند تر مقام سے ان کا فکر اور ان کی آگہی آشنا ہے اور یہ آگہی ہمیں بھی اس مقام سے باخبر ہونے کے روحانی تجربے میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہے، ایسے خطوں میں مولانا کا ذہنی کرب جو ایک حساس عالم و مفکر بڑے ادیب اور عظیم فنکار کا مقدر ہوتا ہے، ذاتی نہیں رہ جاتا، آفاقی بن جاتا ہے اور اپنے احساسات و تصورات کی دنیا میں، ہم پر بھی رنج و الم کے کیف، تنہائی کے حسن اور انسانی زندگی کی اہمیت کے معنی کچھ کچھ کھلنے لگتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس طلسم ہستی کے معمے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمے کا حل ڈھونڈھ رہا ہے۔ لیکن اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق اس طرح کھو گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی نہ اسی کا سراغ ملتا ہے کہ ختم

کہاں جاکر ہوگی اور کیونکر ہوگی ؟

اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست"

مولانا فلسفہ اور سائنس کی بعض ممتاز شخصیتوں اور ان کے نظریوں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ عقل اور علم کے سہارے ہم نے فکر و نظر کی راہوں میں بڑی مسافتیں طے کی ہیں، لیکن طلسم ہستی کا معمہ جوں کا توں باقی ہے اور ہمیں اس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ "روشنی گل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں" لیکن جیسے ہی ہم یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کائنات کے پس پردہ ایک صاحب ادراک و ارادہ قوت موجود ہے، تو تاریکی چھٹ جاتی ہے اور چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔

اس کے بعد مولانا ایک جرمن فلسفی ریحل (Riehl) کے حوالے سے اپنی اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ :

"انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہونچ کر نشو و ارتقا کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہونچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوق سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے، جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔۔۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کیلئے

لے انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اسکے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے، وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اوپر کر سکتا ہے۔" (ریحل)

کچھ بھی باقی نہیں رہے گا[1]

پھر مکتوب نمبر ۱۲ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں مولانا نے اس مسئلہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے اور خدا کے صفاتی اور غیر صفاتی تصور سے متعلق کچھ باتیں کی ہیں جو مسئلہ کا ایک اذعانی و اعتقادی حل ہے۔ اس موقع پر انہوں نے ترجمان القرآن جلد اول میں تفسیر سورہ فاتحہ کے بعض مباحث کی طرف توجہ دلائی ہے یہیں یہ بات بھی کہدی جائے تو مناسب ہے کہ ترجمان القرآن کی بعض عبارت اور اسلوب کے نقوش غبار خاطر کے بعض مقامات پر صاف نظر آتے ہیں۔

محض استدلالی ذریعۂ علم سے وہ بلند مقام نظر جو مناسب کو اپنی جارحیت کے ظلم و انضباط سے حاصل نہ ہو سکا، کشف و مشاہدہ کی داخلیت سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے،

"لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنا چاہتے، جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں۔" (غبار خاطر، مکتوب نمبر ۱۲)

مولانا آزاد کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ بے موسم کا پھل ہیں، انکے خیال میں انکی منفرد طبیعت ناوقت کی طبیعت تھی جسکی وجہ سے زندگی میں انہیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جن سے کم شخصیتوں کو سابقہ پڑتا ہے

---

[1] غبار خاطر، ساہتیہ اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۳ء، مکتوب نمبر ۱۲۔ اس مکتوب کے شروع میں مولانا نے صدیق مکرم کو لکھتے ہیں، "آج بھی جا چھوہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے لیکن جام میں جو کچھ انڈیل رہا ہوں اسکی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پائیے گا، ع از مے دوشین قدسے تند تر۔ یا یہ خیال ہے کہ ہم قصدا کی [illegible] کا اقرار کریں پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کیا کریں؟ ہستی کے معمے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا [illegible] ایک حل کی طلب ہو جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے۔

زمانے کی عام طبیعتوں سے میل نہیں کھاتیں۔ اس لیے اگرچہ زمانے کے لیے وہ اجنبی رہتی ہیں۔ پھر بھی ان کی قدر و قیمت ہمیشہ بلند اور گراں رہتی ہے۔ حکیم صدرائے شیرازی کا یہ شعر وہ اکثر پڑھا کرتے تھے:

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار ست　　گوئی ثمر بیشتر از باغِ وجودم

لکھتے ہیں:

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے ..... مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا ..... جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی ؎

آں نیست کہ من ہمنفساں را بگزارم　　با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز ست"[1]

جس مکتوب کا یہ اقتباس ہے اس کی سوانحی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے بچپن کے حالات، اپنی تعلیم و تربیت کے مختلف مرحلوں، درس نظامی کی خوبیوں اور کمزوریوں اور اپنے موروثی عقائد و رسوم کی تقلید کے خلاف اپنے دل کی چبھن کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں کیا ہے۔ یہ مکتوب اچھی نثر بلکہ اچھی علمی و ادبی نثر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

ایک اور خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے سے انھیں فلسفے سے دلچسپی تھی۔ عمر کے ساتھ یہ دلچسپی بڑھتی گئی لیکن آخر میں وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ زندگی کے عملی تجربوں میں یہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح سائنس مادی زندگی کے اصولوں اور فارمولوں سے ہمیں باخبر بناتا ہے

[1] غبارِ خاطر، ساہتیہ اکادمی اڈیشن مکتوب نمبر ۱۱۔

لیکن روحانیات و اخلاقیات کی دنیا سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ہم زندگی کی الجھنوں میں ایجابی تسکین اور سہارے کے لیے کدھر دیکھیں؟ :

"ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے..... بلاشبہہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی افوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے..... فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ مگر مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔"[1]

حکایت بادہ و تریاک ہو یا حکایت زاغ و بلبل، چائے نوشی کا کیف اور چائے کی کیف آور تاریخ و تذکرہ ہو یا پھولوں کی مختلف قسموں کا ذکر اور ان کے کھلنے اور مرجھانے کا بیان مولانا کا علم، مشاہدہ اور اسلوب نگارش دامن فکر و دانش کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

حکایت زاغ و بلبل کے وہ مقامات جہاں بعض طائران خوش نوا و بدنما کا ذکر ہے مولانا کے

---

[1] غبار خاطر، ساہتیہ اکادمی اڈیشن مکتوب نمبر ۲ -

لطیف ذوقِ نغمہ کے ترجمان اور خوبصورت انشا پردازی کے اچھے نمونے ہیں۔ خاص طور پر وہ مقام جہاں طوطا، مینا، کوئل، ہندوستان کی پہاڑی بلبل اور ایران کی بلبل ہزار داستان کا ذکر ہے یہاں انھوں نے حافظ شیرازی کے اشعار سے موسم بہار کی آتش ریزی اور مرغان باغ کی قافیہ سنجی کے بیان کو کچھ اس طرح سے سنوارا ہے کہ یہ بیان خود ایک بہاریہ غزل بن گئی ہے۔ طوالت کے ڈر سے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ نوائے بلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے، جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر! پت جھڑ اور ہندستان کی برفباری کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ وصحرا پر چھا جاتی ہے تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہوگئی ...۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگائیے تو نغمے کی جاں نوازی ہے، سونگھیے تو سرتا سر بو کی عطر بیزی ہے ؎

صبا بہ تہنیت پیر مے فروش آمد	کہ موسم طرب و عیش و نائے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ گشا	درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنور لالہ چناں برفروخت بادِ بہار	کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بجوش آمد

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود ساز فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اس وقت انسانی احساسات میں جو

تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے اس کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ و بو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھے گا پھر کود پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم ٭ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش ٭ کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم"

چڑیا چڑے کی کہانی (۱۷ اور ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء) کے خطوط میں ایک نقاد کو مولانا آزاد ایک فرار کی ذہنیت رکھنے والے سیاست داں نظر آئے تھے۔ یا ایک ایسی شخصیت جو اپنی شکست کی آواز بن کر رہ گئی تھی۔ اور اس کہانی کو انھوں نے حیات کے ضعف اور ولولہ ہائے زندگی کی غنودگی کی ترجمانی تصور کیا تھا، کیسی ستم ظریفی ہے یہ! مولانا آزاد اور فرار؟ مولانا آزاد اور ضعف حیات؟۔ حقیقت یہ ہے کہ چڑیا چڑے کی کہانی جہاں ایک طرف زبان و بیان پر اس کے مصنف کی بے مثال قدرت کا اظہار ہے۔ وہیں مجاز کا وہ پردہ بھی ہے جس کے پیچھے ایک بڑی حقیقت جلوہ گر ہے۔ قلعۂ احمد نگر کی چڑیوں کی اس بستی میں ماحولیاتی مناسبت اور ظاہری حسن و صورت کے پیش نظر مولانا نے ایک کا نام قلندر اور ایک دوسرے کا موتی رکھا۔ ایک اور کا نام ملّا رکھا اور ایک کا صوفی۔ یہ چڑیا اور چڑے خوبصورت تمثیل ہیں انسانوں کی بستی کے ان ناموں سے وابستہ کرداروں کی۔ مولانا نے اپنے زور بیان سے اپنے مشاہدے اور تجربے کی کیسی سچی تصویر پیش کی ہے اس کہانی میں چڑیا کا بچہ جو ابھی ابھی گھونسلے سے نکلا ہے کیسا بے بس ہے۔ ابھی اڑنا نہیں جانتا، ڈرتا ہے۔ ماں اسے اکساتی رہی لیکن وہ زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ جا سکا۔ لیکن ایک دن یکا یک وہ اڑتا ہے اور فضائے بسیط میں بعد بہت دور بلندیوں پر جا کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا ؎

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشت بیکراں
گامے نہ رفتہ ایم و بہ پایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا۔ زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا.... جوں ہی (چڑیا کے اس بچے کی) "خود شناسی" جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوگیا کہ "میں اڑنے والا پرندہ ہوں"۔ اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی!"

اور پھر مولانا نے یہ حکیمانہ نکتہ بیان کیا کہ "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہوگیا۔ غور کیجئے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے۔" انسان کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک لمحہ جب اس کی خودشناسی بیدار ہوتی۔ اور اس کے اندر کا عرفان جاگ اٹھتا ہے اس کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور وہ ایک ہی جست میں افلاک کی رفعتوں کو چھو لیتا ہے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

مولانا آزاد کی منفرد شخصیت کا عکس ہم غالب کے اس شعر میں دیکھ سکتے ہیں ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفت سنگِ خارہ ایم

اور ان کی یہ شخصیت جلال و جمال دونوں کے ایک حسین اور خوشگوار امتزاج کی صورت میں غبارِ خاطر میں نمایاں ہے۔ جہاں اس کی تب و تاب سے ان کی تحریر کا ہر فقرہ روشن ہے۔ اور ان کے اسلوب کی شعری لطافت ایک موج زیریں کی طرح ہر سطر میں رقص کناں ہے۔ اور شاید اسی لیے غبارِ خاطر کے خطوط بعض لوگوں کے نزدیک مکتوب نگاری سے زیادہ انشائیہ نگاری کی روایت کی خوش آیند توسیع ہے۔

غبار خاطر کے بعض خطوط میں ہمیں منظر نگاری کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک چیز ہوتی ہے داخلی منظر نگاری یعنی خیال منظر نگار، ادیب کی داخلی دنیا میں پہلے الفاظ کی معنویت کے ساتھ مل کر ایک سماں پیدا کرتا ہے۔ پھر خود الفاظ اس سماں کو تجسیم کے عمل سے خارجی دنیا میں لے آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کو اس طرح کی منظر نگاری پر قدرت حاصل تھی۔ صرف ایک اقتباس مگر قدرے طویل:

" رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردوں سے ستارے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم ٭ کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا، چاند بڑھنے لگتا یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے، درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب

کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے ؎

تو مپندار کہ این قصہ ز خود می گویم ٭ گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

مولانا کا یہ مکتوب سب سے زیادہ طویل ہے۔ اس کا خاص موضوع موسیقی اور خود ان کا ذوقِ موسیقی ہے۔ پورا مکتوب ادبی انشا پردازی اور تاریخ نویسی کے دلکش اسلوب کا خوبصورت نمونہ اور اردو میں جدید نثر نگاری کی اچھی مثال ہے۔ اس سے فنِ موسیقی سے متعلق مولانا کے گہرے مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا علم بھی کہ موسیقی کے فنِ لطیف کی ترقی میں ہندوستانی مسلمانوں کا کیا حصہ ہے۔ آخر میں مولانا لکھتے ہیں :

"اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہاء نے سدِ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا۔ اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ باب تشریع سے ..... لیکن یہ بحث میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جا رہی ہے وہ دوسرا ہے۔"

کیا اچھا ہوتا کہ مولانا نے کوئی رسالہ یا مقالہ اس موضوع پر لکھا ہوتا۔

غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے اور صحیح ہی کہا جاتا ہے کہ اس کے اشعار کے حسن اور اس کے تخیل کی بلندی میں دوسرے رنگوں کے ساتھ صنعتِ تضاد کی خوش رنگی بھی شامل ہے۔ جس طرح 'اشیا' اپنے اضداد سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ اسی طرح شاعری، مصوری اور موسیقی کے شاہکاروں میں بھی تضاد سے ایک حسن اور ایک آہنگِ خوش پیدا ہوتا ہے۔ آپ ذرا اپنے حافظہ پر زور دیجیے آپ کو غالب کے ایسے دسیوں اشعار یاد آجائیں گے۔ غبارِ خاطر میں مولانا آزاد نے

---

[1] غبارِ خاطر، ساہتیہ اکادمی ایڈیشن مکتوب نمبر ۲۴۔

غالباً سبھی خطوط کے مختلف پیراگرافوں میں صنعت تضاد سے کام لے کر اپنی ادبی نثر کو ایسے مقام بلند تک پہونچا دیا ہے کہ مولانا کی یہ تصنیف اردو ادب میں ایک امتیازی شان کی حامل بن گئی ہے۔

مولانا آزاد نے غالب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے غالب کی شخصیت کے ایک خاص پہلو سے متعلق غالب سے اپنی مماثلت بھی تلاش کر لی تھی۔ ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما"

اپنی دوسری تحریروں کی طرح غبار خاطر میں مولانا آزاد نے غالب کے اشعار اور مصرعے خاصی تعداد میں استعمال کیے ہیں۔ اور انھوں نے غالب سے ترکیبیں بھی مستعار لی ہیں۔ بلکہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں دونوں شخصیتوں کے ادبی شعور میں ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ صنعت تضاد سے کام لینے کی ایک مثال:

"رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا، کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا تو دوسرا تخریب کی برہم زنی ؎

بیداریِ میانِ دو خواب است زندگی ۔ گردِ تخیل دو سراب است زندگی
از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است ۔ یعنی طلسمِ نقش بر آب است زندگی

غالب کے تعلق سے ایک اور مثال:

"مرزا غالب نے رنجِ گراں نشین کی حکایتیں لکھی تھیں۔ صبرِ گریز پا کی شکایتیں کی تھیں ؎

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے ✽ کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے جو ناصر علی نے اس کے تمام کلام میں سے چنا تھا ؎

من ازیں رنجِ گراں بار چہ لذت یابم ✽ کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند"[1]

غبارِ خاطر کو پڑھ کر بعض لوگوں کا خیال اس طرف جاتا ہے کہ ان خطوط میں مولانا آزاد نے صنعت گری، تصنع، خود نمائی اور اپنے ایگو کا بے پناہ اظہار کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ خطوط خود کلامی کا اچھا نمونہ ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ خود کلامی کے دوران لکھنے والے کو یہ خواہش بھی ہے کہ کوئی اور بھی اس کی باتیں سنے[2]۔ جہاں تک 'ایگو' کے اظہار اور اس خواہش کا تعلق ہے کہ خود کلامی کی آواز دوسروں تک پہونچے' یہ تو بقول مولانا "انانیتی ادبیات" کی خصوصیت ہے۔ اور بقول مولانا:

"انانیتی ادبیات سے مقصود اس طرح کی تمام خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا ایغو (Ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اٹھاتا ہے۔ مثلاً خود نوشت سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، مشاہدات و تجارب، شخصی اسلوبِ نظر و فکر۔ میں نے نمایاں طور کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا،

---

[1] غبارِ خاطر خط نمبر (۸) ۱۹ اگست ۱۹۴۲ء۔ [2] کسی کا قول ہے کہ تنہائی اچھی چیز ہے لیکن کوئی ایک ایسا تو ضرور ہونا چاہیے جس سے کہہ سکیں کہ تنہائی اچھی چیز ہے۔

کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنّفات میں مصنف کی انانیت ابھر سکتی ہے۔ اور ابھرتی رہتی ہے۔ اگر اس اعتبار سے صورت حال پر نظر ڈالیے تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچالے جاسکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ساتھ جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو در اصل ہماری خود پرستیوں سے ہی پیدا ہوتی ہیں!"

۹ رجنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں مولانا نے انانیتی شعور کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کی اعلیٰ وارفع صورت وہ ہے جہاں بوجھل مصنفانہ وضعیت کے بجائے بےتکلفانہ واقعیت ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے مغرب و مشرق کے ادبیات سے کئی ادیبوں اور مصنفوں کے کام اور تصنیفی نام کو بطور مثال پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مستثنیات ہیں اور ایسی شخصیتیں ہیں جو کبھی کبھی دنیا کے مسرح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ "ان کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود انھیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔" یہ عبارت لکھتے وقت یقیناً مولانا کی اپنی شخصیت بھی ان کے سامنے ہوگی کیونکہ اس کے بعد انھوں نے جن سطروں کو قلمبند کیا ہے ان کی گونج ان کے بعض دوسرے نثرپاروں میں بھی ہمیں سنائی دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا چاہیے۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جاسکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں اپنے کلیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" ان کی ہر 'وہ' اور 'تم' سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے"

اب اس کے بعد یہ بات کہ غبار خاطر کے بعض خطوط میں صنعت گری اور خود نمائی کے آثار ملتے ہیں تو ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور جن لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے ان کی آنکھیں شاید ان کے اپنے عہد میں اس ایک شخص کے رنگ بہ رنگ کمالات کی تابانیوں سے خیرہ ہو جاتی ہیں جس کا نام ابوالکلام آزاد تھا۔ غبار خاطر کے خطوط زندگی کی جس منزل میں لکھے گئے، اس وقت وہ اتنے بڑے اور مشہور ہو چکے تھے کہ شہرت اور عظمت انھیں خود تلاش کر رہی تھی۔ اب کسی صناعی اور خود نمائی کی ضرورت انھیں نہ تھی۔ علم و عمل اور فکر و نظر کی بلندیوں نے ان کی شخصیت کو اتنی حسین اور عظیم بنا دیا تھا کہ اسے تکلف و تصنع سے کسی بناؤ سنگار کی ضرورت نہ تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس عہد سے تعلق رکھتے تھے اس کے علمی و تعلیمی ماحول کی تشکیل میں درس نظامی کے لبرل عناصر کے ساتھ عہد جدید کے تعلیمی نصاب کی لبرل ازم کا بھی ایک خاص عنصر شامل تھا۔ اسی لیے اس عہد کے ادیبوں، مورخوں، مصنفوں اور شاعروں کے یہاں ہمیں دانشوری کی یک رخی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہتی روایت ملتی ہے۔ ان کی دلچسپیوں کے دائرے وسیع تھے اور ان کا موضوع بیک وقت علم، ادب، مذہب اور سیاست غرض سب کچھ تھا۔ مولانا شبلیؒ اور مولانا آزادؒ علم و دانش اور تصنیف و تالیف کی اس ہمہ گیر روایت کے بہترین نمونے تھے۔ دونوں کے اسلوب میں ہمیں اردو ادب پر فارسی زبان و ادب کے گہرے اثر کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

جس معاشرے میں شعر العجم جیسی کتاب لکھی اور پڑھی جائے اس میں ادبی نگارشات تغزل کے اثر سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتیں۔ استعارے، تشبیہیں اور تلمیحیں ان نگارشات کو رعنائی فکر و اظہار بخشتی ہیں۔ اسی طرح اردو نثر میں اشعار کے استعمال کی بھی ایک روایت ہے۔ اور یہ ہمارا مزاج بن گئی ہے۔ ہم گفتگو بھی اشعار کے سہارے کے بغیر نہیں کر سکتے۔ غزل کے اشعار کی اشاریت اور علامتیت سے اپنی بات کو موقر اور موثر بنانے کا یہ رجحان اردو والوں کی

خصوصیت رہا ہے۔ مولانا آزاد نے اس عمل کو ایک فن بنا دیا۔ غبار خاطر اس کا بیّن ثبوت ہے اگرچہ کبھی کبھی اس سے عبارت کی روانی مجروح ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر اشعار مولانا کی نثر کا جزو لاینفک بن کر اس طرح معنی خیز بن جاتے ہیں جیسے کہ بقول صدیق الرحمٰن قدوائی " وہ مولانا کی نثر میں آنے سے پہلے خود اپنے معنی کی تلاش میں تھے .... ظاہر ہے کہ جس نثر میں منطق اور شعریت کی یہ سنگت ہو وہ اپنے پڑھنے والوں سے ادبی مذاق کی ایک اعلیٰ سطح کا تقاضا کرنے میں حق بجانب ہوگی۔"

مشہور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی کی یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ غبار خاطر "تصنیف" نہیں بلکہ "ادبی اختراع" ہے۔ غبار خاطر کا ابوالکلام واعظ او خطیب نہیں ہے۔ یہاں ایک خاص رچاؤ سے اس کی شخصیت کا داعی اور اپدیشک فلسفی اور حامیٔ مذہب، ادیب اور شاعر، مصور اور مغنی ایک اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غبار خاطر ایک ایسا پردہ ہے جس پر ابوالکلام کی روح پورے طور پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس لیے اسے محض خطوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھنا بھی صحیح نہیں ہے .... جس طرح مکالمات افلاطون پڑھتے وقت ہم مکالمے کے وہ معنی نہیں لیتے جو ڈرامے میں لیتے ہیں۔ اسی طرح غبار خاطر میں ہم مکتوب نگاری کے عام اسلوب یا معیار کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ یہاں ورائے شاعری چیزے دگر ہست والی بات ہے۔

افسوس کہ مولانا آزاد کی نثر بھی ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔ کیونکہ ان کی نثر ان کی شخصیت تھی۔ اور یہ شخصیت جس سانچے میں ڈھلی تھی وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

معارف کی ڈاک

شکاگو

۱۵ر دسمبر ۱۹۹۲ء

(۱)

مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب! تحیۂ مسنونہ

گرامی نامہ ملا۔ بابری مسجد کا سانحہ بہر حال پیش آگیا۔ اس کی ذمہ داری اغیار سے زیادہ خود ہماری ہے۔ ہم نے حکومت، عدالت، ہندو لیڈروں کے مواعید پہ بھروسہ کیا اپنی قوت عمل کا مظاہرہ نہ کیا، مسلمانوں کا جو خون مختلف شہروں میں بہہ رہا ہے وہ اجودھیا کی سرزمین پر اس وقت بہنا چاہیے تھا جبکہ فیض آباد کے مجسٹریٹ نے قانون کے سارے اقتضاآت کو فراموش کر کے مسجد ہندوؤں کے حوالہ کی اور اسی وقت سے مسجد مندر میں تبدیل ہوگئی اسی دن سے مسلمان بابری مسجد کا کیس ہار گئے۔ اب شور و ہنگامہ بے سود ہے ؎

فراق یار میں اب تو نصیر رو یا کر　　　گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

آپ کے شذرات کا منتظر ہوں۔ امید کہ جناب مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔

مخلص

سعید صدیقی

(۲)

ٹونکی کلاں۔ سوائی مادھوپور (راجستھان)

مکرم و محترم جناب مولانا اصلاحی صاحب! سلام و رحمت

نامۂ مکتوبہ مورخہ ۳۰/ دسمبر ۱۹۹۲ء مجھے ۸/۱ کو مل گیا تھا۔ زیراکس کے لیے نہایت شکرگزار ہوں۔ ۲۹/۱ کو معارف بھی ملا۔ شذرات نے بے حد متاثر کیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے پیغام بھی ہے اور حالات سے عبرت بھی۔ سوئے حرم کی آخری قسط بھی بڑی موثر اور رواں دواں ہے۔ ص ۷۴ پر مولانا حالی کے مصرعہ کا نثر میں استعمال برمحل ہے۔ جس سے متاثر ہو کر بابری مسجد کی شہادت کا سال برآمد کیا ہے۔ چونکہ شاعری نہیں کرتا اس لیے اشعار تو مناسب نہیں تاہم قطعۂ تاریخی پیش خدمت ہے:۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے		مسجد ہی رہی باقی نہ ملبہ ہی رہا ہے

افسردہ و مغموم تھا اس سانحے پہ جب		ناگاہ مجھ سے آ کے یہ ہاتف نے کہا ہے

آقاؔ کو سنا سال یہ حالیؔ کی زباں سے

"امت پہ تری آہ بُرا وقت پڑا ہے"

۴۴۱ + ۱۵ + ۶۱۰ + ۶ + ۲۰۳ + ۵۰۶ + ۲۰۳ + ۱۵ = ۱۹۹۱ + ۱ = ۱۹۹۲ء

دیگر۔ اک خادم مسجد نے نصیحت یہ سنائی		ہیں شیخ و برہمن بھی اس ملک میں بھائی

تب دل نے کہا اس سے ذرا یہ تو پوچھیے		"تھا بر یہ بتا شمع حرم کیوں ہے بجھائی"

[illegible] = ۱۴۱۳ - ۱ = ۱۴۱۲ھ

اس میں تعمیہ یہ ہے کہ شمع یا اس کی لَو جو بشکل الف ہوتی ہے اور جس کی عددی قدر ایک ہے، بجھ گئی تو ایک عدد از خود کم ہو گیا۔

فن تاریخ گوئی کی صنائع کا شمار نہیں، عجیب پیچیدہ فن ہے مگر نہایت دلچسپ۔

الحمدللہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ جے پور وغیرہ میں بھی حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں تاہم دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ امید ہے انشاء اللہ آپ مع اہل خانہ و رفقاء عافیت سے ہوں گے۔ بشرط سہولت سبھی حضرات کی خدمت میں بعد از سلام مسنون دعاؤں کی درخواست ہے۔ میرا ایک اور عریضہ خدمت اقدس میں پہنچا ہوگا۔ فقط والسلام

طالب دعا: عبدالرؤف خاں

علامہ حمید الدین فراہیؒ حیات و افکار (مقالاتِ فراہی سمینار)

مرتبہ پروفیسر عبید اللہ فراہی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۹۲ مجلد

مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر،

اعظم گڈھ، یو پی (۲) مکتبہ فراہی جی ۱۰، ۱ے، ابو الفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ پر جو سمینار ہوا تھا، یہ اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جسکو خوش سلیقگی اور اہتمام سے شایع کیا گیا ہے، شروع میں لایق مرتب کی وضاحتی تحریر، ڈاکٹر اشتیاق ظلی کا خطبۂ استقبالیہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے افتتاحی، علامہ فراہیؒ کے تلمیذ مولانا نجم الدین اصلاحی کے صدارتی اور مولانا سید محمد عبد الغفار ندوی مجددی کے تاثراتی کلمات درج ہیں اور آخر میں سمینار کے پروگرام کی تفصیل اور اس کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں شایع ہونے والی رپورٹ کے حوالے دیے گئے ہیں، درمیانی حصہ مقالات پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۲۸ ہے، اس کی ابتدا ڈاکٹر ظفر الاسلام کے مختصر سوانحی مقالہ سے کی گئی ہے۔

اس مجموعہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی دفعہ مولانا فراہیؒ کے افکار و خیالات زیر بحث آئے ہیں، مقالات متنوع ہیں اس لیے ان کو مختلف عنوانات کے تحت دیا جانا چاہیے تھا۔ جیسے ایک حصہ میں ان کے اصول تاویل و طریقہ تفسیر سے متعلق مضامین دیے جاتے، دوسرے میں حدیث و سنت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جاتی علیٰ ھذا

[illegible]

[illegible] ایک سا نہیں اور معیار کے نہیں ہیں، تاہم بعض خوب ہیں، خصوصاً

[illegible] کی تحقیق کا طرز [illegible] حدیث و سنت کے بارے

میں مولانا کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا ہو گیا ہے۔ ان کا مضمون "امام فراہی کے نزدیک

حکمت کا مفہوم" بھی قابل ذکر ہے۔ ادب، بلاغت اور زبان و اسلوب کے لحاظ سے

جو مضامین مولانا کی تصانیف کے جائزہ پر مشتمل ہیں ان میں "علامہ فراہی اور مفردات قرآن

کی تحقیق (مولانا آفتاب عالم ندوی)" "قرآن مجید کے بعض اسالیب سے متعلق مولانا فراہی کی

توضیحات۔ ایک مطالعہ" (مولانا نعیم الدین اصلاحی) "مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات

جمہرۃ البلاغۃ کی روشنی میں" (پروفیسر محمد راشد ندوی) مولانا فراہی اور شعریات مشرق

(ڈاکٹر عبدالباری) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی نے بڑی کد و کاوش سے مولانا کی

تصنیفات کا پتہ لگا کر ان کا تعارف کرایا ہے، اس کے حواشی میں ایک جگہ مولانا کی تصنیف

حکمۃ القرآن کے مرتب ہونے کے باوجود اسے شایع نہ کیے جانے کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں

مولانا بدر الدین اصلاحی مدظلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں اور حکمت پر تدبر میں شایع ہونے

والے مضمون میں فرق ہے اس لیے وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے پاس موجود نسخے کے حصول

کی فکر میں ہیں۔ اس مجموعہ کا بڑا قیمتی مضمون "عقاید و شرائع میں نظم کے بعض پہلو۔ فکر فراہی

کی روشنی میں" (پروفیسر عبید اللہ فراہی) ہے، اس سے اور بعض مضامین پر ان کے مفید حواشی

سے ان کی تحقیق و جستجو اور اچھی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی یہ وسیع النظری بھی قابل داد

ہے کہ سمینار میں پڑھے گئے ان مضامین کو بھی بجنسہ شایع کر دیا ہے جن میں مولانا کے افکار پر

قصور فہم اور قلت تدبر کی وجہ سے بعض نامناسب اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن ان مضامین کو

باب التقریظ والانتقاد

علامہ حمید الدین فراہیؒ حیات وافکار (مقالات فراہی سیمینار)

مرتبہ پروفیسر عبید اللہ فراہی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۹۲ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ، یوپی (۲) مکتبہ فراہی جی ۵، ۱۱ے، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

انجمن طلبہ قدیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ پر جو سمینار ہوا تھا، یہ اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جسکو خوش سلیقگی اور اہتمام سے شایع کیا گیا ہے، شروع میں لایق مرتب کی وضاحتی تحریر، ڈاکٹر اشتیاق ظلی کا خطبۂ استقبالیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افتتاحی، علامہ فراہیؒ کے تلمیذ مولانا نجم الدین اصلاحی کے صدارتی اور مولانا سید محمد عبد الغفار ندوی مجددی کے تاثراتی کلمات درج ہیں اور آخر میں سیمنار کے پروگرام کی تفصیل اور اس کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں شایع ہونے والی رپورٹ کے حوالے دیے گئے ہیں، درمیانی حصہ مقالات پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۲۸ ہے، اس کی ابتدا ڈاکٹر ظفر الاسلام کے مختصر سوانحی مقالہ سے کی گئی ہے۔

اس مجموعہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی دفعہ مولانا فراہیؒ کے افکار وخیالات زیر بحث آئے ہیں، مقالات متنوع ہیں اس لیے ان کو مختلف عنوانات کے تحت دیا جانا چاہیے تھا۔ جیسے ایک حصہ میں ان کے اصول تاویل وطریقہ تفسیر سے متعلق مضامین دیے جاتے، دوسرے میں حدیث وسنت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جاتی علیٰ ھذا

القیاس ہر پہلو سے متعلق مضامین الگ الگ دینے کی ضرورت تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مضامین یکساں سطح اور معیار کے نہیں ہیں، تاہم بعض خوب ہیں، حدیث وسنت کی تحقیق کا فراہی منہاج (خالد مسعود) خاص طور پر اہم ہے اس سے حدیث وسنت کے بارے میں مولانا کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا ہو گیا ہے۔ ان کا مضمون "امام فراہی کے نزدیک حکمت کا مفہوم" بھی قابل ذکر ہے۔ ادب، بلاغت اور زبان و اسلوب کے لحاظ سے جو مضامین مولانا کی تصانیف کے جائزہ پر مشتمل ہیں ان میں "علامہ فراہی اور مفردات قرآن کی تحقیق (مولانا آفتاب عالم ندوی)" "قرآن مجید کے بعض اسالیب سے متعلق مولانا فراہی کی توضیحات۔ ایک مطالعہ" (مولانا نعیم الدین اصلاحی) "مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات جمہرۃ البلاغۃ کی روشنی میں" (پروفیسر محمد راشد ندوی) مولانا فراہی اور شعریات مشرق (ڈاکٹر عبدالباری) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی نے بڑی کد و کاوش سے مولانا کی تصنیفات کا پتہ لگا کر ان کا تعارف کرایا ہے، اس کے حواشی میں ایک جگہ مولانا کی تصنیف حکمۃ القرآن کے مرتب ہونے کے باوجود اسے شایع نہ کیے جانے کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مولانا بدر الدین اصلاحی مدظلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں اور حکمت پر تدبر میں شایع ہونے والے مضمون میں فرق ہے اس لیے وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے پاس موجود نسخے کے حصول کی فکر میں ہیں۔ اس مجموعہ کا بڑا قیمتی مضمون "عقاید و شرائع میں نظم کے بعض پہلو۔ فکر فراہی کی روشنی میں" (پروفیسر عبید اللہ فراہی) ہے، اس سے اور بعض مضامین پر ان کے مفید حواشی سے ان کی تحقیق و جستجو اور اچھی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی یہ وسیع النظری بھی قابل داد ہے کہ سمینار میں پڑھے گئے ان مضامین کو بھی بجنسہ شایع کر دیا ہے جن میں مولانا کے افکار پر قصور فہم اور قلت تدبر کی وجہ سے بعض نامناسب اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن ان مضامین کو

شایع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی جن میں مولانا کے افکار کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے بلکہ مضمون نگاروں نے اپنے ذاتی آرا و نظریات کو مولانا کی جانب منسوب کرنے کی کوشش کی ہے گو لایق مرتب کے عالمانہ حواشی میں دونوں طرح کے مضامین کا تشفی بخش جواب دیدیا گیا ہے اس لیے ان سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں تاہم بعض مزید نکتوں کی جانب ذیل میں اشارات کیے جاتے ہیں۔

ایک مضمون میں مولانا کے حوالہ سے کچھ اقتباسات نقل کرکے ان سے کچھ نتائج نکالے گئے ہیں اور پھر یہ فیصلہ صادر کیا گیا ہے کہ "مولانا فراہیؒ فہم قرآن میں روایات سے استفادہ کے قائل نہیں ہیں" (ص ۱۰۳ تا ۳۰۳) جب کہ مولانا کا یہ خیال بھی نقل کیا گیا ہے کہ "پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے اس کے بعد نبیؐ اور آپؐ کے اصحاب کا فہم ہے" غالباً جس اقتباس سے یہ اشتباہ ہوا ہے وہ یہ ہے:

"یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن اپنی تفسیر کے لیے ان فروع [یعنی احادیث، قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ واقعات اور گزشتہ انبیا کے محفوظ صحیفے] کا محتاج نہیں ہے وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی، لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان و اطمینان میں اضافہ ہوگا" (ص ۳۱)

مولانا کا مقصد بالکل واضح ہے کہ تفسیری ماخذ میں سب سے اول درجہ قرآن مجید کو دیا جائے گا، احادیث کا درجہ اس کے بعد ہوگا، یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام مسائل میں اولین مرجع قرآن مجید قرار پائے گا، احادیث اور دوسرے ماخذ پر اسے ترجیح حاصل ہوگی اس لیے مولانا کے نزدیک اگر حدیث قرآن مجید کے منطوق کے خلاف ہوگی تو ایسی صورت میں قرآن مجید

حکم قرار پائے گا کیونکہ وہ قطعی الدلالت ہے دوسرے ماخذ مثلاً احادیث ہی کیوں نہ ہوں وہ یا تو ظنی الدلالت ہیں یا ان کی وہ حیثیت نہیں ہے جو قرآن مجید کی ہے۔ پتہ نہیں اس واضح اور صاف مسئلہ کو کیوں پیچیدہ بنا کر مولانا کو حدیث کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

ص۲۲۳ پر مولانا کی تفسیر سورۂ لہب کے ایک اقتباس کی مثال غلط دی گئی ہے مقالہ نگار کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا زمانۂ نزول سے متعلق روایات قبول نہیں کرتے جبکہ اقتباس میں اس کا ذکر ہے کہ اس سورۂ لہب کے زمانہ نزول سے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی"۔

ص ۴۱۹ تا ۴۲۱ پر سیرۃ النبیؐ حصہ اول کی بحث ایلاء و تخییر.. کا موازنہ مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ تحریم سے کیا گیا ہے، اس میں بحث و تحقیق کا یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ دونوں کتابوں کی تالیف کے سنین کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

ص ۴۲۳ پر سورۂ برأت کے تعلق سے درج ہے کہ "اور نہ ہی ان (مولانا فراہیؒ) کی تفسیر میں اس موضوع پر کوئی واضح بحث ہے"۔ یہ صحیح ہے کہ سورۂ برأت کی تفسیر مولانا نے نہیں لکھی لیکن تحقیق متقاضی تھی کہ اس بارے میں مولانا کے خیالات ان کے حواشی قرآن مجید سے معلوم کیے جاتے یا ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر دیکھی جاتی۔

اسی مضمون میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے حکم کے سلسلے میں جو معترضانہ بحثیں کی گئی ہیں فاضل مرتب نے ایک حد تک ان کا جواب دیدیا ہے، البتہ قربانی سے متعلق آیات کا جو مفہوم مضمون نگار نے بیان کیا ہے وہ چونکہ ان کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا اس لیے وہ آیات کے کسی دوسرے مفہوم کو مستبعد خیال کرتے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر خالی الذہن ہو کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نکتہ پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ کتب مقدسہ میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔

ص ۴۳۳ کے ایک حاشیہ میں ہے "انہیں (منشی امین زبیری کو) علامہ شبلیؒ سے گہری عقیدت تھی" لیکن یہ عقیدت بعد میں نفرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"حساس نگاہی اور علامہ فراہیؒ" کا عنوان عجیب سا ہے، یہ مضمون عموماً حوالے سے خالی ہے، اس کے آخری حصہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"علامہ کی حساس طبیعت یک رخی ہرگز نہ تھی کہ قرآن کے دیے ہوئے اصل پروگرام اور نصب العین سے وہ باخبر (غالباً بے خبر) ہی رہتے یا وہ اس کو نظر انداز کر کے گزر جاتے اور ان کے فکر و فلسفہ میں اسے کوئی مقام حاصل نہ ہو سکتا" (ص ۱۲۰)

آگے مولانا کی کچھ تحریریں پیش کر کے دکھایا ہے کہ قرآن مجید کا اصل پروگرام و نصب العین "غلبہ حق" ہے کیا یہ یک رخا تجزیہ نہیں ہے؟ لیکن اس کی ذمہ داری نہ مولانا فراہیؒ پر ہے اور نہ قرآن مجید پر۔

ص ۴۶ اپر "ایک بزرگ عالم دین" پر نازیبا انداز میں طنز کیا گیا ہے۔

مولانا کی تصنیف ملکوت اللہ پر دو مضامین درج ہیں، دونوں میں اور باتوں سے قطع نظر مقالہ نگاروں نے اپنے مزعومہ خیالات و تصورات کو مولانا فراہیؒ پر تھوپنے کی کوشش کی ہے مثلاً

ص ۴۵۰ تا ۴۵۹ پر "اسلامی حکومت کی قانونی بنیادیں" کے زیر عنوان جو آیتیں نقل کی گئی ہیں وہ آیتیں اور یہ عنوان اولاً تو ملکوت اللہ میں درج ہی نہیں ہیں ثانیاً ان سب آیتوں کو صرف سیاسی امور یا اسلامی حکومت کی قانونی بنیادوں سے متعلق قرار دینا محض کھینچ تان ہے۔

ص ۴۶۳ پر درج آیت سے ص ۴۶۴ پر جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ بھی خود مقالہ نگار کے ہیں۔ مولانا کی کتاب ان سے خالی ہے۔

ص ۴۶۶ و ۴۶۷ پر ملکوت اللہ کے عنوان بناء الخلافۃ علی المعاهدۃ سے ایک عبارت نقل کی گئی ہے اس میں نہ اس نتیجہ کا کوئی ذکر ہے کہ "اس مقصد پاک کی خاطر لوگوں کو آپس میں ایک ایسی ٹھوس اور مضبوط تنظیم قائم کرنی چاہیئے اور نہ اس کی تردید کی گئی ہے کہ "حکومت الٰہیہ کے قیام کو ایسا انعام تصور نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین دارانہ زندگی گذارنے کے صلے میں عطا ہو جاتی ہے" (صفحہ ۴۶۶)

مولانا کی تحریر کا مستفاد یہ ہے کہ "خلافت کی بنیاد معاہدہ پر ہوتی ہے اور اس کی غرض و غایت لوگوں کو نقطہ وحدت اور مرکزیت پر اکٹھا کرنا ہے تاکہ افراد میں مکمل اتحاد و ہم آہنگی رہے اور ان میں کوئی اختلاف و تصادم نہ رہ جائے، ان کا وجود ساری دنیا کیلئے رحمت بن جائے نیز خلافت کے معاہدہ و نظام کو درہم برہم ہونے اور اسے قائم و برقرار رکھنے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے، اس سلسلہ میں اپنی عزیز ترین آزادی و خودداری کو بھی قربان کر دینا چاہیے۔

اس بحث کو سمجھنے کے لیے مولانا کی تفسیر سورۂ والشمس کا مطالعہ کرنا چاہیئے اس میں خلافت کو باقی رکھنے کے لیے حضرت عثمانؓ کی سعی بلیغ اور جان سے ہاتھ دھونے کا ذکر ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ دیندارانہ زندگی کے بغیر محض جوش اور نعرے سے حکومت الٰہیہ قائم نہیں ہو سکتی۔

کہیں کہیں مقالہ نگار مولانا کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے ہیں جیسے:-

و کماات الحاکم علیہم مت هو	جس طرح امت کا خلیفہ وہ ہوگا جو
خیرهم اعلمهم بالتدابیر	ان میں سب سے اچھا، سب سے زیادہ

واتقاهم لله واقواهم في العزم فكذلك الذين يعينونه بالمشورة ويساعدونه بانفاذ الامور

(ملكوت الله ص۲۳)

انتظامی صلاحیت والا اور سب سے زیادہ تقوی والا اور سب سے زیادہ باعزم و ہمت ہو، اسی طرح وہ لوگ بھی ہونے چاہییں جو اس کو اپنے مشورہ کے ذریعہ مدد دیتے ہیں اور معاملات کو نافذ کرنے میں ان کے لیے قوت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ (ص۲۶۵)

اعلمهم بالتدبیر ... دراصل خیرهم کی توضیح و بیان ہے جس کی رعایت ترجمہ میں نہیں کی گئی ہے، فكذلك سے جو عبارت شروع ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ ہی کی طرح اس کے مشیر و معاون کو بھی مدبر، متقی اور قوی العزم ہونا چاہیے۔

ولا يكون احد من اولي الامر الا بما ظهر من صالح اعماله

(ملكوت الله ص۲۴)

کوئی آدمی حاکم اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی طرف اعمال صالحہ ظاہر ہوں (ص۲۶۶)

بات اہل الحل والعقد یعنی اولوالامر کی ہو رہی ہے لیکن اسے حاکم سے متعلق کر دیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولوالامر سے حاکم مراد لیا جا رہا ہے۔

فجعلوه وكيلا في اكبر الامور

(ملكوت الله ص۲۵)

اور اسے اپنے اکثر و بیشتر معاملات کا اپنا ذمہ دار بناتے ہیں (ص۲۶۶)

اکبر الامور سے اکثر و بیشتر معاملات مراد نہیں ہیں بلکہ سب سے بڑا اور اہم معاملہ یعنی انتخاب امیر مراد ہے۔

وکما ان اللہ تعالیٰ یعذب القوم المعجوس او یومنوا (ملکوت اللہ صفحہ ۳۴)	جس طرح اللہ تعالیٰ مغضوب اقوام کو عذاب دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۹۹)

او یومنوا کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا اور مجوس کا ترجمہ مغضوب محل نظر ہے، کیونکہ یہ ہجرت کے اصطلاحی لفظ سے مفعول کا صیغہ ہے۔

بعض جگہ ادھوری عبارت نقل کی ہے مثلاً

ووجب علیھم ان یعطوا لھا اکرم وانفس مالدیھم (ملکوت اللہ صفحہ ۳۱، مقالہ ص ۲۶۴ و ۲۶۸) یہاں اکرم و انفس کی توضیح کرنے والے بعد کے الفاظ وھو الحیاۃ والانفۃ کو معلوم نہیں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

اب دوسرے مقالہ کو لیجیے اس میں جابجا مولانا کے افکار کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

"مولانا کا کہنا ہے کہ کوئی امت جب بنیادی صفات سے محروم ہو جائے تو اس کے درمیان کسی بادشاہ کا پیدا ہو جانا بھی گرچہ وہ ظالم اور جبار ہو، اللہ کی رحمت کا مظہر ہے (صفحہ ۲۹۰)"

یہ مولانا کے ان الفاظ کی ترجمانی ہے فمن رحمۃ اللہ ان یتیح لھم ملکا یزعھم عن الفساد فی الارض وان کان جبارا (ملکوت اللہ صفحہ ۲۶)

مولانا نے صرف جبار کہا تھا مگر ترجمانی میں وہ ظالم و جبار ہو گیا، مصنف نے بادشاہ کی یہ اہم خصوصیت بتائی تھی کہ وہ لوگوں کو فساد فی الارض سے روکتا ہے، لیکن اس موقع پر اسے نہ پیش کر کے مولانا کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔

آگے لکھا ہے "مولانا کا استدلال یہ ہے کہ "بادشاہوں کے وجود کو ارباب دانش گوارا کر لیتے ہیں اور جبری حکومت کی اطاعت کرنے لگتے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ

نظر نہیں آتا" (ص ۴۹۶)

مولانا فراہیؒ کی اصل عبارت یہ تھی ولذلك (ای ومنع الملك عن الفساد) یرضی بھا (ای بالملکیۃ) اھل العقل منھم فیطیعون الحکومۃ الجبریۃ وبعض امرنا اللّٰہ ورسولہ (ملکوت اللّٰہ ص ۲۶)

مولانا گوارا کر لینے کے بجائے بادشاہت کو پسند کرنے کی بات کہتے ہیں، انھوں نے چارہ نظر نہ آنے کی بات بھی نہیں کہی ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ وازع فساد جبری حکومت کی اطاعت کرنے کا حکم خدا اور رسولؐ نے دیا ہے، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی بنا پر مقالے میں مولانا پر تاریخ اسلام کی روایات سے انحراف، مفاہمت ناروا اور اسلام کے انقلابی پیغام سے میل نہ کھانے والی بات کرنے کا الزام لگایا ہے اس کا اور عدم تدبر کی وجہ سے بعض دوسرے اعتراضات کا جواب فاضل محشی نے دیدیا ہے، اس لیے ان سے تعرض نہیں کیا جا رہا ہے۔

ایک اور جگہ لکھا ہے:

"مولانا فراہیؒ کا یہ انقلابی نظریہ بھی لائق مطالعہ ہے کہ معاشرہ میں بنیادی مسئلہ حریت اور عدل و قسط کا قیام ہے اور انتخاب امیر کی آزادی اس کی علامت ہے" اگر یہ بنیادی قدریں موجود نہ ہوں تو بادشاہ کی ذاتی نیکی اور اس کا تقویٰ مطلوب و محمود نہیں ہے، مولانا کا کہنا ہے کہ اصل مطلوب نظام کی تبدیلی ہے محض ہاتھ کی تبدیلی سے معاشرہ میں کوئی خوشگوار اثر رونما نہیں ہوگا" (ص ۴۹۸ و ۴۹۹)

مولانا کے اس انقلابی نظریہ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اپنے مزعومات ان کی جانب منسوب کر دیے گئے ہیں۔ "ض"

ادبیات

سانحہ

از ڈاکٹر افتخار بیگم ۔ دہلی ۔

یہ سانحہ تو زمانہ کی آنکھ نے دیکھا ۔۔۔ جو میرے معبد دیریں پہ آج گزرا ہے

مگر کسی کو خبر کیا کہ آج جو عالم ۔۔۔ دل شکستہ و قلب حزیں پہ گزرا ہے

مجھے یہ غم ہے کہ رسوا ہوئی زمانے میں ۔۔۔ زمین ہند کی عظمت کی داستان کہن

خود اپنے دیس کے کچھ سورماؤں کے ہاتھوں ۔۔۔ ملی ہے خاک میں اس طرح آبروئے وطن

جو سرزمین کہ تھی گہوارہ امن و الفت کا ۔۔۔ جہاں کو جس سے ملا تھا سبق محبت کا

کبیر و نانک و چشتی کی سرزمین ہے جو ۔۔۔ وہیں یہ کھیلا گیا تانڈو ناچ نفرت کا

مگر یہ کالی گھٹائیں جو آج چھائی ہیں ۔۔۔ ہمارے عزم سے محنت سے چھٹ بھی سکتی ہیں

دلوں میں دیپ محبت کے پھر اگر جل جائیں ۔۔۔ اندھیری راتیں یہ نفرت کی کٹ بھی سکتی ہیں

چلو کہ عشق کی رسم کہن کو تازہ کریں ۔۔۔ دلوں کے زخموں پہ پھر رکھ دیں پیار کا مرہم

قدم ملا کے چلیں پھر سے جانب منزل ۔۔۔ جو ماں کے دودھ کا ہے قرض یوں چکا دیں ہم

مطبوعات جدیدہ

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ از جناب مولانا فرید الوحیدی،

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، اعلیٰ کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۵۶، قیمت ۲۵۰ روپے

پتہ: قومی کتاب گھر ۱/۴ ذاکر نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ علم و عمل، اخلاق و کردار، عزیمت و حمیت اور جرأت و جہاد میں سلف صالحین کا نمونہ اور اسلامی تعلیمات کی مجسم تصویر تھے، ان کی کتاب حیات کا ہر نقش ملت خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آج بھی شمع راہ ہے۔ مولانا کے سوانح اور ان کی ملی و ملکی خدمات پر ان کی آپ بیتی کے علاوہ اب تک کئی اور عمدہ کتابیں شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب مولانا کے حقیقی برادرزادہ اور مولانا سید وحید احمد مدنی مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سید فرید الوحیدی نے محنت و کاوش اور ذاتی معلومات اور معاصر شہادتوں اور دستاویزوں کی مدد سے مرتب کی ہے، قریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات کے اس تذکرہ میں انھوں نے مولانا مدنی کے نسب، خاندان، مدینہ میں قیام، مالٹا کی اسیری، ہندوستان واپسی، دارالعلوم دیوبند اور سلہٹ کی مسند حدیث پر رونق افروز ہونے، جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے وابستگی، جنگ آزادی، سیاسی فکر و مسلک اور انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ملک کے المناک حوادث اور وفات تک کے حالات کا احاطہ کیا ہے۔ خاص طور پر خاندانی پس منظر، خاندان کے دوسرے افراد کے حالات، مدینہ طیبہ کے قیام اور مالٹا کی اسیری کی داستان میں جزئیات تک کو

تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سوا دو سو صفحات اسی کی نذر ہو گئے ہیں بعد کے صفحات میں انگریس اور مسلم لیگ کی گویا مکمل تاریخ آگئی ہے۔ البتہ ہٹلر اور اتحادی فوجوں کی اس درجہ تفصیل کی ضرورت نہیں تھی، سیاسی جماعتوں کی آویزش، کیبنٹ مشن، ڈائرکیٹ ایکشن وغیرہ کی تفصیل وطوالت سے کتاب کے حجم میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس سے اس دور کی مکمل تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔ البتہ مولانا مدنی کی علمی و روحانی اور تدریسی و تربیتی زندگی کا پہلو تشنۂ تکمیل رہ گیا فاضل مولف کو اس کا احساس ہے اور اس کے لیے ان کے قلم سے کتاب کے دوسرے حصہ کی تکمیل کی خوشخبری بھی ہے۔ مولانا مدنی کے عزیز قریب اور معتقد ہونے کے باوجود ان کے سیاسی مسلک کی عمدہ شرح و ترجمانی کی ہے اور تجزیہ و محاکمہ میں اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، تاہم اپنے ممدوح کے فضل و کمال کو ثابت کرنے کے لیے امت کے اور مشاہیر کا استہزا و استخفاف ضروری نہیں تھا۔ مثلاً "سرسید کی تحریک سے لے کر انگریزوں کے زمانہ کی انتہا تک ایسے ہزاروں مولوی، مولانا، علماء، فضلاء، مرشدین و واعظین، مدرسین و مصنفین تھے جن کو حکومت برطانیہ نے یونیورسٹیوں، ریاستوں، وظیفوں، خطابوں، علی گڑھ، حیدرآباد، انعامات اور ممبریوں کے ناموں سے خرید کر بالکل خاموش اور ساکت و جامد کر دیا تھا۔" خیالات میں بھی کہیں کہیں ناہمواری ہے، مثلاً ایک جگہ سرسید اور آغا خاں (سہو کتابت سے آغا جان) پر سخت طنز و اعتراض ہے لیکن بعد کے صفحات میں سرسید کی تعریف بھی ہے۔ شرفائے قدیم کے طور طریقوں کا ذکر کئی بار کیا گیا ہے جو کہیں کہیں قطعی بے محل ہے جیسے "اس وقت تک شرفاء کے طبقہ کی شادی بیاہ میں اس بات کا لحاظ باقی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو شادی اپنے ہی خاندانوں اور عزیز داروں میں کی جائے" حالانکہ "غیر شرفا" میں بھی اس شریفانہ عمل کا چلن تھا۔ واقعات کی تکرار کے ساتھ

الفاظ و مترادفات میں فراخدلی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو" لوگ عوام، خواص، علماء، صلحاء، اتقیاء، رؤسا، امراء اور اہل کاران حکومت، معتقدوں، مداحوں اور مستفیدوں کے زمرہ میں شامل ہو رہے تھے" نیز ذکر و شغل، مراقبہ، تصوف، پاس انفاس اور تنزکیہ نفس" بعض تعبیرات اور الفاظ کا استعمال بھی کھٹکتا ہے جیسے" کافی سے بہت زیادہ ہے" " لحاظ ملاحظہ" " آنچ سلگ رہی تھی" " عالم باعمل اولاد شیخ کامل کے خصوصی شاگرد اور صحبت یافتہ لڑکے" " اب کسی دینی اشغال میں کوئی رکاوٹ نہ تھی" " فرمایشات" " ایک مرتبہ راستہ کھل جاتا تو کیسی کیسی شانیں، راحتیں اور آسائشیں ملتی تھیں" " مولویانہ و مولانانہ" بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ ظفر لکھا گیا ہے۔ شرعی حیثیت کے علاوہ کیا واقعۃً وہ شہنشاہ کہلانے کے مستحق تھے ؟" عیسیٰ مسیح تو صلیب ہی پر چڑھتے ہوئے سجتے تھے" اس جملہ کی کیا ضرورت تھی ! ان کے بعض خیالات محل نظر ہیں مثلاً " جمعیۃ علمائے اسلام کے بزرگوں کا برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ تھا" کتاب میں مولانا مدنیؒ کی بعض اہم تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات بھی جمع کیے گئے ہیں جو آج بھی دعوت فکر و نظر دیتے ہیں، ایک سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے فرمایا تھا" مسلمان اپنے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کرسکتے ہیں نہ کہ کانگریس اور انگریزوں کے وعدوں سے"۔

کھٹی میٹھی باتیں از جناب حیدر بیابانی، متوسط تقطیع مجلد مع گرد پوش، صفحات ۹۶، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: حیدر بیابانی، اچلپور شہر ضلع امراوتی، مہاراشٹر۔

بدار کے ایک نوجوان شاعر حیدر بیابانی نے اس سے پہلے بچوں کی نظموں اور گیتوں پر ایک مجموعہ کلام شائع کیا تھا، اس مجموعہ میں انکی چند غزلیں اور گیت ہیں گیتوں میں نسوانی جذبات کی اچھی عکاسی ہے، ہر صفحہ پر اشعار کی روح کو دیدہ کے قابل بنانے کا مصورانہ تجربہ بھی ہے جو کہیں کہیں طبع لطیف پر گراں گزرتا ہے۔

(ع۔ص)

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۲ - ۸۴

مقالات

مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ — جناب مولوی محمد اکرم ندوی آکسفورڈ — ۸۵ - ۱۰۳

کلمات نقشبندیہ — ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبدالقادر ندوی لکچرر تکمیل الطب کالج، لکھنؤ — ۱۰۴ - ۱۱۷

اقبال کا "مرد قلندر" — جناب محمد بدیع الزمان صاحب ہارون نگر۔ فرسٹ سیکٹر۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ — ۱۱۸ - ۱۲۷

عربی، فارسی، اردو میں سکھ گوروا ور پوتھیاں — جناب رام لعل نابھوی صاحب محلہ دیوان۔ نابھا۔ پنجاب — ۱۲۸ - ۱۴۵

معارف کی ڈاک

۱) جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور — ۱۴۶

۲) جناب محمد عبدالرحمن سید صدیقی۔ شکاگو۔ امریکہ — ۱۴۷

۳) جناب حکیم محمد مختار اصلاحی۔ اصلاحی دواخانہ۔ نفیسی محل۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی — ۱۴۸ - ۱۴۹

۴) پروفیسر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی — ۱۵۰

۵) جناب محمد ایوب واقف صاحب اندھیری۔ بمبئی — ۱۵۱

۶) جناب محمد خالد ٹیل صاحب۔ بھیونڈی۔ بمبئی — ۱۵۲ - ۱۵۳

۷) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی — ۱۵۴

وفیات

مولوی نور عظیم ندوی — "ض" — ۱۵۵

ادبیات

غزل — جناب عروج زیدی بدایونی مرحوم رام پور — ۱۵۶

مطبوعات جدیدہ — "ع۔ ص" — ۱۵۷ - ۱۶۰

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات ضیاء الدین اصلاحی ۸۲ - ۸۴

مقالات

مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ جناب مولوی محمد اکرم ندوی آکسفورڈ ۸۵ - ۱۰۳

کلمات نقشبندیہ ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبد القادر ندوی ۱۰۴ - ۱۱۷
لکچرر تکمیل الطب کالج. لکھنؤ

اقبال کا "مرد قلندر" جناب محمد بدیع الزمان صاحب ۱۱۸ - ۱۲۷
ہارون نگر. فرسٹ سیکٹر. پھلواری شریف. پٹنہ

عربی، فارسی، اردو میں سکہ گردوارہ پوتھیاں جناب رام لعل نابھوی صاحب ۱۲۸ - ۱۴۵
محلہ دیوان. نابھا. پنجاب

معارف کی ڈاک

(۱) جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا. پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۴۶

(۲) جناب محمد عبد الرحمن سید صدیقی. شکاگو. امریکہ ۱۴۷

(۳) جناب حکیم محمد مختار اصلاحی. اصلاحی دواخانہ. نفیسی محل. محمد علی روڈ. بمبئی ۱۴۸ - ۱۴۹

(۴) پروفیسر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی ۱۵۰

(۵) جناب محمد ایوب واقف صاحب اندھیری. بمبئی ۱۵۱

(۶) جناب محمد خالد پٹیل صاحب. بھیونڈی. بمبئی ۱۵۲ - ۱۵۳

(۷) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی. ذاکر نگر. نئی دہلی ۱۵۴

وفیات

مولوی نور عظیم ندوی "ض" ۱۵۵

ادبیات

غزل جناب عروج زیدی بدایونی مرحوم رام پور ۱۵۶

مطبوعات جدیدہ "ع. ص" ۱۵۷ - ۱۶۰

شذرات

مسلمانوں کی مسجد تو شہید ہوئی ہی تھی جس کے صدمے سے وہ تڑپ رہے ہیں لیکن اب خود ان کی بھی خیر کہاں ہے۔ یہ ہندوتو انھیں وحشت و درندگی کا طوفان ہے۔ اور رام کے بھیس میں راونوں کا لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے امنڈ پڑا ہے۔ حکومت ہی کہاں ہے۔ اور اگر ہے تو اس نے وحشیوں اور درندوں کو صلائے عام دے دی ہے کہ مسلمانوں کا خون خرابہ کریں۔ انھیں اور ان کی املاک کو پھونک دیں۔ اور ان کی عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کریں جنگل کے اس راج میں شرپسندوں اور غنڈوں کو من مانی کرنے اور مسلمانوں کو "سبق" دینے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔

حکومت کے اشارے یا اس کی کمزوری سے شیطانی رقص کرنے والوں کو مسلمانوں کو یہ بتادینا چاہیے کہ اس درندگی سے نہ ان کو معدوم کیا جاسکتا ہے اور نہ نورِ خدا کو ظلم و تشدد کی آندھی سے بجھایا جاسکتا ہے ؎

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم ؛ سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

زور زبردستی اور ظلم و دھاندلی سے مسجد بھلے ڈھادی گئی اور مسلمانوں کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر وہاں مندر بھی بنایا جاسکتا ہے لیکن وہ اپنی مسجد کے مطالبے سے کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے۔ آج حکومت کو اور ہندوستان کے لوگوں کو حق و انصاف کا پاس و لحاظ نہیں ہے۔ اور مسلمان بھی مجبور ہیں لیکن آیندہ ان کی جگہ لینے والے اس طرح مجبور نہیں ہوں گے اور وہ وہیں مسجد بنائیں گے جہاں تھی۔ حکومت و اقتدار کے بل پر حق کو دبایا جاسکتا ہے، مٹایا نہیں جاسکتا۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ؛ بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حکومت کا معیار اکہرا ہوتا اور وہ نیک نیت اور انصاف پسند ہوتی تو مسلمانوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں ملتی اور ان کے ساتھ جارحیت اور تشدد کا مظاہرہ کرنے والوں کو کھلی چھوٹ کس طرح ملتی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی تضاد بیانی، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کی بڑی ماہر ہے۔ پہلے ان کے چوٹی کے لیڈروں نے مسجد ڈھائے جانے کو غلط اقدام کہا۔ اسی بنا پر یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ اور مسٹر اڈوانی اپنے اپنے عہدوں سے

مستعفی ہوگئے تھے۔ مگر اب حکومت کی ڈھیل سے یہی لوگ اجودھیا کے واقعہ پر فخر کرنے اور ۶ر دسمبر کو قومی انقلاب کا دن کہنے لگے ہیں۔ اور وزیر اعلیٰ صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس واقعہ پر نہ انھیں ملال ہے اور نہ پچھتاوا" ع چہ دلاورست دزدے کہ بہ کف چراغ دارد۔ یہی وزیر اعلیٰ عدالت میں کچھ اور بیان دیتے ہیں۔ کسی اور کا کیا شکوہ خود وزیر اعظم صاحب شروع میں یہ تکرار اپنے کو بے خطا کہنے کے علاوہ مسجد کی از سر نو تعمیر کی بات بھی کرتے تھے۔ مگر اب یہ سب بھول کر ان کو صرف اپنے اقتدار کے تحفظ کا ایک نکاتی پروگرام ہی یاد رہ گیا ہے اور فرمانے لگے ہیں کہ "مندر مسجد کا معاملہ چار سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے"۔ ملک کی عجیب بدقسمتی ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس پر مسلط ہو گئے ہیں۔ اور کس کس طرح کے لوگ اس پر مسلط ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ زبانِ حال سے ضرور کہتا ہوگا ع ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔

مسلمان اچھی طرح سمجھ لیں کہ نہ انھیں کوئی سبق دے سکتا ہے اور نہ مزہ چکھا سکتا ہے۔ سبق دینے اور مزہ چکھانے والے خود اپنے کرتوتوں کی سزا پا کر رہیں گے۔ کیونکہ اس دنیا کی باگ ڈور اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو ظلم و ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے جور و تشدد پر آمادہ افراد ہوں یا جماعتیں اور حکومتیں ان کی بدمستی کا دور ختم ہوگا اور وہ قدرت کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ لیکن اس کی یہ غیر مبدل سنت ہے کہ ع اعمال بگڑتے ہیں تو آتی ہے تباہی۔ مسلمان خود اپنے موجودہ حالات کے ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ اپنے اعمال و کردار درست کر لیں تو خدا کی نصرت کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔ ایک شریف ہندو شاعر جگن ناتھ آزاد نے انھیں یہ ولولہ بخش پیام دیا ہے

قرآن کی تعلیم سے پھر درسِ بقا لے　　پھر روح میں پیغامِ محمدؐ کو بسا لے

گزرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بُلا لے　　روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے

ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انساں

بھارت کے مسلماں

اللہ کے قہر و غضب کی پروا کیے بغیر جو لوگ قوت کے گھمنڈ اور حکومت کے نشے میں اس کے مقدس گھر کو برباد کرنے کیلئے اُٹھ دوڑے۔ ان کے لیے اس گھر کے اصل محافظ کی تلوار ضرور بے نیام ہوگی۔ اصحاب فیل نے

بیت اللہ کی تخریب کی سازش کی تھی اور ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر کے خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اللہ نے اسے اور اس کے لشکر کو تباہ کیا اور حرم کے ساتھ گستاخی کی سزا دی۔ یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے کے معابد تباہ کیے اور بیت المقدس میں ذکر و عبادت سے روکنے کے لیے خوں ریز لڑائیاں کیں تو انھیں یہ وعید سنائی گئی کہ "اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد میں اس کا ذکر کیے جانے سے منع کرے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو۔ مساجد کی حرمت کا اقتضا یہ ہے کہ لوگ ان میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں اور ان کے تقدس کو پامال نہ کریں۔ ورنہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے" اسلام نے تو حالت جنگ میں بھی غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو ڈھانے یا ان کی توہین کرنے سے روکا ہے ایسی صورت میں راون کا کردار ادا کرنے والے رام بھگت اپنے کو رسوائی سے کیسے بچا سکتے ہیں۔ ان کی رسوائی کا ڈنکا تو ساری دنیا میں بج رہا ہے۔ دوسری طرف سچے مسلمانوں کے لیے اللہ کے دریائے رحمت کے جوش و طغیانی میں کمی نہیں آئی ہے۔ ؎

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان ست　　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اس طرح کے حالات و مسائل سے نہ زندہ قوموں کا شیرازۂ ہستی درہم برہم ہوتا ہے، اور نہ ان کا نظام حیات بے کیف اور مضمحل ہوتا ہے۔ وہ ناکامی کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشار آرزو رہتی ہیں۔ راہ طلب کی دشواریاں ان کا عزم و حوصلہ بڑھاتی ہیں، مشکلات اور صعوبتیں ان کے گام شوق کو تیز کر دیتی ہیں۔ ان کے جوش عمل کو پُرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے۔ اور طوفان برق و باد میں ان کے بال و پر کی نشو و نما ہوتی ہے۔ سرفروشی، جاں بازی اور قربانی ان کا وطیرۂ حیات بن جاتا ہے جس کے بعد شکست و ہزیمت بھی فتح و ظفر میں تبدیل ہو جاتی ہے ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے،
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

مقالات

مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ

از جناب مولوی محمد اکرم ندوی لندن

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ اسلام کی ان چند مایہ ناز شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کتاب الٰہی میں تدبر و تفکر کے لیے وقف کر دی تھی، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اجتہادی صلاحیت، اصابت رائے، دقیقہ رسی، سلامت فکر اور حقیقت فہمی کی صفات سے نوازا تھا، ان کی علمی جلالت پر اتفاق کے ساتھ ان کے معاصرین ان کے تقویٰ، ورع، سنت نبویؐ کی پیروی اور خوف خدا جیسی علمی اور باطنی خوبیوں کے معترف اور مداح نظر آتے ہیں، حقیقتاً علم کی گہرائی اور تقویٰ کی جامعیت ہی وہ بنیادی وسائل ہیں جو انسانی عقل کو کسی قسم کے زیغ و انحراف سے روک سکتے ہیں، تفسیر قرآن کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میدان میں جب بھی کوئی انحراف پر آیا ہے اس کی بنیادی وجہ یا تو علم کی کمی یا تقویٰ سے تہی دامنی رہی ہے جسے بالعموم جہل اور ہویٰ کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں تفکر و تدبر کا وہ جوہر خالص جو اس امام عظیم نے اپنی طویل علمی زندگی کی یادگار کے طور پر مختلف کتابچوں اور رسالوں کی شکل میں چھوڑا تھا، ابھی تک علمی دنیا میں اس کا تعارف نہیں ہو سکا، ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے افکار کا پوری طرح عالم اسلام اور عالم عرب میں تعارف ہو تاکہ مولانا کی بعض متفرق تحریروں کی وجہ سے جو شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان کا سد باب ہو سکے۔

قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں اسلامی قانون کا سرچشمہ ہیں، ان میں سے کسی پر کلی انحصار اور دوسرے سے اعراض دونوں سے انحراف کے مرادف ہے، اسلامی تاریخ کے ہر دور میں علمائے امت نے ان کج فہم افراد اور گمراہ کن تحریکوں کا سختی سے محاسبہ کیا ہے جو کتاب الہٰی اور سنت نبویؐ کے درمیان کسی تفریق اور امتیاز کے روادار رہے ہیں۔ کتاب الہٰی اور سنت نبویؐ کے درمیان جو ربط ہے اسکی نزاکت سمجھنے میں ہمیشہ افراط و تفریط کو راہ ملی ہے، صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی مقدس جماعت کے علاوہ ائمہ اربعہ، فقہائے محدثین، مجددین اور مصلحین نے ان دونوں سرچشموں کی اہمیت اور ان کے آپس کے تعلق کو پوری طرح واضح کرنے اور افراط و تفریط کی راہ سے آنے والے زیغ و انحراف کی پردہ دری کی کوشش کی ہے تاکہ امت کی زندگی اس شاہراہ سے منحرف نہ ہو جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو چھوڑا تھا۔

ساتھ ہی یہ بھی اسلامی تاریخ کا ایک المیہ رہا ہے کہ اسی مقدس جماعت پر کبھی سنت سے انحراف اور کبھی کتاب الہٰی سے روگردانی کا الزام لگایا گیا۔

مولانا فراہیؒ پر حدیث کے باب میں کوتاہی یا سنت کی مخالفت کے جو الزامات لگائے گئے ہیں اور جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے وہ اسی تاریخ الزام تراشی یا احسان ناشناسی کا ایک حصہ ہیں جس کے نمونے ہر دور میں نظر آتے ہیں، اس مضمون میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ جمہور علمائے امت کی آراء کے پس منظر میں حدیث سے متعلق مولانا کے نقطۂ نظر کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بحث کا زیادہ حصہ تفسیر کے باب میں احادیث کے کردار سے ہوگا، کیونکہ اصل اعتراضات مولانا کے طریقۂ تفسیر سے متعلق ہیں۔

قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کا باہمی تعلق | قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جو ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر

یہ کتاب نازل کی، آپؐ نے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے بندوں کو پہنچائی، اس کے احکام نافذ کیے، اسکی روشنی میں پوری امت کی تربیت کی، اس کی تشریح اور توضیح کی اور امت کی رہنمائی کے لیے اپنی زندگی کا نمونہ چھوڑا، آپ کی ان ذمہ داریوں پر درج ذیل آیتیں شاہد ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ[1]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، ان کی تربیت کرتا ہے، اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ[2]

جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اسکے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کیجیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[3]

تمھارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور پوری حفاظت میں ادا کیا، اللہ تعالیٰ خود آپؐ کے قول و عمل کی پاکیزگی کی شہادت دیتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى[4]

وہ اپنی من مانی بات نہیں کرتے جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ وحی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[5]

بے شک آپؐ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر آپؐ کی اطاعت اسی طرح فرض کی ہے جس طرح اپنی اطاعت

فرض کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ [۵]	رسول کی اطاعت کرو۔

بلکہ اطاعتِ رسولؐ کو خود اپنی اطاعت قرار دیا ہے:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ [۶]	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انی قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما: کتاب اللہ وسنتی [۷]	بے شک میں نے تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں، جن کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے، اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

ان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ [۸]	بے شک جو چیز اللہ کے رسول نے ناجائز کی وہ ایسی ہی ہے جیسے اللہ نے ناجائز کی۔

ایک شخص نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا، آپ نے اسکے سوال کا جواب دیا، اس نے کہا کہ آپؐ اللہ کی کتاب کے حوالہ سے جواب دیں، نہ کہ کسی اور چیز کے واسطے سے، آپؓ نے فرمایا تم بیوقوف ہو، کیا اللہ کی کتاب میں یہ موجود ہے کہ ظہر کی نماز چار رکعت ہے سری قرأت سے؟ پھر آپ نے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں اسی طرح کی مثالیں دے کر پوچھا کہ اللہ کی کتاب میں تم اس کی تفصیل پاتے ہو؟ [۹]

امیہ بن عبداللہ بن خالد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے عرض کیا کہ نماز حضر

اور نماز خوف تو قرآن میں موجود ہے لیکن سفر کی نماز قرآن میں نہیں ہے، آپ نے فرمایا میرے بھتیجے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درمیان مبعوث فرمایا جبکہ ہمیں کسی چیز کا علم نہیں تھا، ہمارا عمل وہی ہے جیسا ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے پایا ہے۔[۱۱]

ایک شخص نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں کہا کہ ہم سے صرف قرآن کی بات کیجئے، آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم ہم قرآن کی جگہ کوئی اور چیز نہیں چاہتے، لیکن ہم اسکی طرف رجوع کرتے ہیں جسے قرآن کا علم ہم سے زیادہ تھا۔[۱۲]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیزوں کے متعلق جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہیں تھا جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ہی فرمایا ہے۔"[۱۳]

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قرآن کریم سے مسائل کے استخراج میں صرف قرآن پر انحصار صحیح نہیں ہے، اس کی تشریح و تفسیر یعنی سنت پر بھی نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔"[۱۴]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کی جامعیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائیگی کے لیے انہیں لوگوں کو چنا ہے جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے لحاظ سے نقطۂ کمال پر رہے ... حضرت سرور کائنات کی نسبت فرمایا: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔"[۱۵]

حدیث قرآن کا بیان ہے

امت کا اس پر اجتماع ہے کہ صحیح حدیث قرآن سے متعارض نہیں ہوسکتی۔ حدیث کے ذریعہ اگر کہیں قرآن کے کسی عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید ہو رہی ہے تو اسکی حیثیت

بیان کی ہے، کیونکہ عام بول کر خاص مراد لینا اور مطلق بول کر مقید مراد لینا اہل زبان کے نزدیک عام ہے، اس طرح کی احادیث کو ایک جماعت نے قرآن پر اضافہ سے تعبیر کیا ہے، یہ تعبیر کسی قدر غیر محتاط ہے، حقیقتاً یہ احادیث کسی قسم کا اضافہ نہیں ہیں، بلکہ اس تخصیص یا تقیید کو بیان کر رہی ہیں جس کا احتمال کلام میں پہلے سے موجود تھا۔

محتاط علماء کی جماعت کی رائے ہے کہ تمام احادیث قرآن کا بیان ہیں کسی حدیث سے قرآن پر کوئی بنیادی اضافہ نہیں ہوتا، جو اضافہ بظاہر نظر آ رہا ہے اس کی حیثیت تشریح کی ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سنت کی ہر چیز کا بیان اللہ کی کتاب میں موجود ہے"[۱۲]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"علماء کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ ہر سنت کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن میں ضرور موجود ہے"[۱۳]

امام شاطبی فرماتے ہیں:

"سنت کی اصل کتاب ہے، سنت کتاب الٰہی کے اندر موجود اجمال کی تفصیل، ابہام کی وضاحت اور اختصار کی تشریح ہے، کیونکہ سنت قرآن کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ، تمھیں سنت میں کوئی ایسا حکم نہیں ملے گا جو قرآن میں اجمالاً یا تفصیلاً موجود نہ ہو"[۱۴]

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"میں یقین رکھتا ہوں صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے"[۱۵]

ایک دوسری جگہ مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"حدیث نے قرآن پر کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ آیت کے اس ابہام کو واضح کیا ہے جو غور نہ کرنے پر مخفی رہ سکتا تھا۔"[۲۰]

مولانا امین احسن اصلاحی حدیث نبویؐ سے مولانا فراہیؒ کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انھوں (مولانا فراہیؒ) نے حدیث کی تمام کتابوں کو نہایت تحقیق و تنقید کے ساتھ پڑھا تھا وہ بیشتر احادیث کو قرآن سے مستنبط سمجھتے تھے اور اپنے اس سلسلہ کی تحقیقات ہمارے سامنے بھی بیان فرماتے تھے۔"[۲۱]

قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے، اس حیثیت سے دونوں کا مطالعہ کرنے سے جہاں ایک طرف قرآن کی صحیح تفسیر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے وہیں قرآنی آیات کی روشنی میں حدیث کے اجمال یا ظاہری تعارض کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"میں نے دیکھا ہے کہ کتنی روایتیں بظاہر متضاد ہیں، لیکن قرآن کی روشنی میں سمجھنے سے ان کا تعارض دور ہو گیا، قرآن کی حیثیت مرکز کی ہے، جس کی طرف حدیثیں مختلف پہلوؤں سے لوٹتی ہیں، اس کی تفصیل تمھیں ہماری کتاب احکام الاصول باحکام الرسول میں ملے گی۔"[۲۲]

احادیث کا ثبوت | مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسولؐ کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی، بلکہ رسولؐ کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، فرق صرف ثبوت کا ہے، قرآن کریم کا ثبوت متواتر ہے، قرآن کریم کی ہر آیت قطعی الثبوت ہے، جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ثبوت کے لحاظ سے مختلف درجوں پر

ہیں، جن لوگوں نے براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے انھوں نے آپؐ کے ارشاد کو قرآن کی طرح قبول کیا، اگر تمام احادیث قرآن کی طرح متواتر ہوتیں تو ان میں اور قرآن میں چاہے درجہ و مرتبہ کے لحاظ سے فرق ہوتا مگر عملاً کوئی فرق نہ ہوتا، لیکن چونکہ ثبوت کے لحاظ سے احادیث کے مدارج مختلف ہیں اس لیے ائمہ نے ہمیشہ اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے[۲۳]

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فروع کے درجہ میں نہ رکھتے، بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے"[۲۴]

تفسیر بالماثور کے مدارج | تفسیر بالماثور کے تین مدارج ہیں:

۱۔ تفسیر قرآن بالقرآن ۲۔ تفسیر قرآن بالحدیث ۳۔ اقوال صحابہ سے تفسیر قرآن۔

علمائے تفسیر اور ماہرین اصول اس پر متفق ہیں کہ قرآن کی تفسیر سب سے پہلے قرآن سے کی جائے گی، پھر سنت رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا، اس کے بعد صحابۂ کرام کے اقوال سے استفادہ کیا جائے گا۔

علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں:

"علماء نے کہا ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی تفسیر کرنا چاہے، پہلے خود قرآن کی طرف رجوع کرے،... اگر قرآن میں اس کی نظیر نہ ہو تو پھر سنت کی طرف رجوع کرے، کیونکہ سنت قرآن کی تشریح و تفسیر ہے، ... اور اگر سنت سے وضاحت نہ ہوتی ہو تو پھر صحابہ کرام کے اقوال کی طرف رجوع کرے، کیونکہ قرآن کے سب سے زیادہ

عالم وہی تھے۔[۲۶]

علامہ سیوطی کا یہ قول نقل کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کا فہم ہے، پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو۔"[۲۷]

مولانا فراہیؒ ایک دوسری جگہ اس ترتیب کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تعلیم اللہ تعالیٰ سے حاصل کی ہے، پھر آپؐ نے امت کو اس کی تعلیم دی، بلاشبہ آپؐ تمام انسانوں میں سب سے بہتر ہیں، پھر وہ لوگ جنھوں نے آپؐ سے اخذ کر کے بعد والوں کو سکھایا۔"[۲۸]

۱۔ تفسیر قرآن بالقرآن | مفسرین اور عام علماء یہ کہتے آئے ہیں کہ قرآن کریم کی آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں، اسی لیے تفسیر میں سب سے پہلا درجہ خود قرآن کریم کو حاصل ہے۔[۲۹]

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"ہمیشہ سے علماء یہ بات کہتے آئے ہیں کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے، کیونکہ قرآن کریم چیزوں کا تذکرہ مختلف انداز سے کرتا ہے کبھی کسی بات کو اجمال سے بیان کرتا ہے اور کبھی تفصیل سے، جو چیز ایک جگہ رہ جاتی ہے دوسری جگہ واضح ہو جاتی ہے، قرآن کریم نے اپنا یہ وصف متعدد جگہوں پر بیان کیا ہے، یہ ایک مضبوط اصول ہے۔"[۳۰]

۲۔ تفسیر بالحدیث | احادیث دو طرح کی ہیں: الف۔ متواتر و مشہور ب۔ اخبار آحاد۔

الف: عملی متواتر سنتیں | ہم نے قولی متواتر احادیث کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ انکے وجود کے سلسلہ میں علماء میں شدید اختلاف ہے، جو لوگ اس کے قائل ہیں انکے نزدیک بھی تعداد بہت کم ہے، یہ متواتر احادیث ایسی ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا عمل ہمیشہ ان پر رہا ہے، متواتر سنتیں سب عمل سے متعلق ہیں، ان کے بغیر قرآن کریم کا سمجھنا ناممکن ہے، احکام سے متعلق قرآن کریم کی ہر آیت کی تشریح اس عمل نبویؐ کی محتاج ہے جسے امت نے بالتواتر قبول کیا ہے، ان متواتر سنتوں سے انکار یا اعراض پورے دین سے انکار اور اعراض کے مرادف ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الا انی اوتیت القرآن ومثله معه"[۳۰] — مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

"علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین"[۳۱] — میرے طریقہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ پر مضبوطی سے قائم رہو۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"کتاب الٰہی سنت نبویؐ کی اس سے زیادہ محتاج ہے جتنا کہ سنت کتاب الٰہی کی۔"[۳۲]

حافظ ابن عبدالبر اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی مراد ہے کہ سنت قرآن کی توضیح اور تشریح کرتی ہے۔"[۳۳]

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تعبیر پر ہمیشہ علماء کی ایک جماعت کو تردد رہا ہے، اس کی تشریح وہی ہے جو حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، لیکن چونکہ تعبیر بظاہر غیر محتاط ہے اس لیے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس کے متعلق سوال کیا گیا

تو فرمایا:

"میں اتنی بڑی جرأت نہیں کر سکتا، البتہ میں کہتا ہوں کہ سنت کتاب کی تفسیر اور تشریح کرتی ہے"[۳۴]

مولانا امین احسن صاحب مولانا فراہیؒ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جہاں تک قرآن کی اصطلاحات۔ مثلاً صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، قربانی۔ کا تعلق ہے وہ (مولانا فراہیؒ) ان کی تفسیر سو فیصدی سنت متواتر کے مطابق کرتے تھے اور اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے"[۳۵]

ب۔ اخبار احاد | جمہور امت کا مسلک ہے کہ خبر واحد ظنی الدلالہ ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے بشرطیکہ خبر واحد کسی آیت یا سنت سے متعارض نہ ہو، تعارض کے بعد اگر تطبیق کی کوئی شکل نکلی تو تطبیق کی جائے گی، ورنہ خبر کے بارے میں توقف کیا جائے گا، خود صحابہ کرام نے تعارض کے وقت حدیث کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے، چنانچہ جب فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ حدیث پیش کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے لیے نہ رہائش کا فیصلہ کیا اور نہ ہی نان نفقہ کا، تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہم اپنے رب کی کتاب اور نبی کی سنت ایک عورت کے کہنے پر نہیں چھوڑ سکتے، معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا بھی کہ نہیں[۳۶]

امام شاطبی فرماتے ہیں:

"اگر حدیث قرآن اور سنت سے متعارض ہو تو حدیث کا رد کرنا واجب ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہے، ..... ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث اس وقت صحیح سمجھی جائے گی جب قرآن کے مطابق ہو اور مخالف نہ ہو"[۳۷]

بیشتر اخبار احاد قرآن کریم کے احکام کی تائید کرتے ہیں، ان کے اندر مزید کوئی تفصیل نہیں ہے،

ایسی روایتیں مولانا نے عام طور سے چھوڑ دی ہیں کیونکہ ان سے صرف تکرار ہوتی ہے، اس کے قطعاً معنی یہ نہیں ہیں کہ مولانا ان کے منکر ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :

"میرے پیش نظر تو ایک ایسی کتاب کی تالیف ہے جو بنیاد اور مرکز کا کام دے اور جو نقطۂ اعتدال اور قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہو، اس لیے میں نے صرف اتنے ہی پر اکتفا کیا ہے جتنا قرآن میں ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا منکر ہوں، امام بخاری نے اپنی کتاب میں صرف وہ روایتیں جمع کی ہیں جو ان کے اصول پر پوری اتری ہیں اور بہت سی صحیح روایتیں چھوڑ دی ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ انکے منکر ہیں"[۳۸]

خبر واحد کے سلسلہ میں ائمہ کی آراء حنفیہ کے نزدیک خبر واحد پر اس وقت عمل کیا جائے گا جب اس کے اندر تین شرطیں پائی جائیں :

۱۔ قرآن کریم کے کسی حکم کی مخالف نہ ہو۔

۲۔ سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ اور ظاہر کے خلاف نہ ہو[۳۹]

امام مالک کے نزدیک خبر واحد قبول کرنے کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ عمل اہل مدینہ کے خلاف نہ ہو[۴۰]

ابن قاسم اور ابن وہب نقل کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا ہے کہ امام مالک حدیث سے زیادہ عمل اہل مدینہ کو بیان کرتے تھے اور ان تک دوسروں کے واسطہ سے حدیثیں پہنچی تھیں تو کہتے تھے کہ ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں لیکن عمل اس پر نہیں رہا ہے[۴۱]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن ابی بکر بن عمر بن حزم کو دیکھا ہے کہ وہ مدینہ کے

قاضی تھے اور ان کے بھائی عبداللہ ایک ثقہ اور سچے محدث تھے، جب محمد بن حزم کوئی ایسا فیصلہ کرتے جو حدیث کے خلاف ہوتا تو عبداللہ ان سے باز پرس کرتے اور فرماتے کہ کیا اس سلسلہ میں فلاں حدیث نہیں وارد ہے؟ وہ فرماتے کہ ہاں وارد ہے، اس پر عبداللہ بن حزم فرماتے کہ پھر آپ اس کے مطابق فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ اہل مدینہ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں[42]

ابن ماجشون سے سوال کیا گیا کہ آپ لوگ حدیث روایت کرتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے، ایسا کیوں ہے؟ انھوں نے فرمایا تاکہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ہم نے ناواقفیت کی وجہ سے حدیث نہیں چھوڑی ہے[43]

امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں:

"اہل مدینہ کا سابق عمل حدیث سے بہتر ہے"[44]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فقہاء کو جمع کرکے ان سنتوں اور فیصلوں کے بارے میں سوال کرتے تھے جن پر عمل ہوتا رہا ہے، ان کو باقی رکھتے تھے اور جن پر عمل نہیں رہا ان کو منسوخ کر دیا کرتے تھے خواہ روایت ثقہ سے ہو[45]

خبر واحد اور مولانا فراہیؒ کا مسلک | مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں:

"اخبار احاد کے بارے میں وہ مالکیہ اور حنفیہ کے مسلک کو ترجیح دیتے تھے، جس طرح حنفیہ عام ضرورت کے مسائل میں اور مالکیہ صحابہ کے عام عمل کے مقابلہ میں اخبار احاد کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے اسی طرح مولانا فراہیؒ بھی مذکورہ صورتوں میں اخبار احاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے"[46]

عام تفسیری روایات کی حیثیت | روایتوں میں وضع و تحریف بہت ہوئی ہے، تاہم اس امت کے

اللہ تعالیٰ کا خاص فضل رہا ہے کہ فقہائے عظام نے ایسے رہنما اصول اور ضوابط مقرر کیے جنکے نتیجہ میں وضع کی ساری سازشوں اور کوششوں کا پردہ چاک ہو گیا، وضع کا یہ کام دین کے ہر شعبہ میں کیا گیا، خاص طور سے تفسیر کا باب اس سے زیادہ متاثر ہوا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"تین قسم کی روایتوں کی کوئی اصل نہیں اور وہ تفسیر، مغازی اور حروب کی روایتیں ہیں"[47]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ اصول تفسیر میں اس کی صراحت کی ہے کہ تفسیر کے باب میں وضع کا عمل زیادہ ہوا ہے اور تائید میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے[48]

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"تفسیر ماثور کا اکثر حصہ راویوں کے پاس زنادقہ، یہود، ایرانیوں اور نومسلم اہل کتاب کے واسطہ سے پہنچا ہے"[49]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر کے باب میں صرف سو حدیثوں کے قریب ثابت ہیں"[50]

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے میسرہ بن عبدربہ سے سوال کیا کہ سورتوں کے فضائل میں تمھارے پاس اتنی کثرت سے روایتیں کیسے آگئیں، اس نے جواب دیا کہ میں نے ترغیب کی خاطر خود وضع کی ہیں[51]

اسی طرح کا ایک سوال نوح ابن ابی مریم سے کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے دیکھا کہ

لوگ قرآن چھوڑ کر ابوحنیفہ کی فقہ اور ابن اسحاق کی مغازی میں لگے ہوئے ہیں اس لیے میں نے ثواب کی نیت سے یہ حدیثیں وضع کر لیں[۱۰]

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"ہم خلاف ظاہر قرآن کی تاویل کرنے میں کسی ضعیف حدیث پر اعتماد نہیں کر سکتے ہم ظاہر قرآن ہی کو حجت سمجھیں گے[۱۱]"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"تفسیر کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف توجیہ کرنا تحریف کی راہ ہموار کرنے کے مرادف ہے[۱۲]"

مولانا نے جو بات یہاں کہی ہے اس کے وزن سے کون انکار کر سکتا ہے، میری خواہش تھی کہ باطل فرقوں کی تفسیر کے کچھ نمونے پیش کر دوں تاکہ اندازہ ہو کہ قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف توجیہ کن خطرناک اور گمراہ کن نتائج کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، مگر خوف طوالت سے اور اس وجہ سے کہ اہل علم پر یہ پہلو مخفی نہیں ہے اس وقت اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حدیث کے سلسلہ میں اسلاف کی احتیاط اسلام دشمن عناصر کے لیے یہ تو ناممکن تھا کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی ترمیم کریں، کیونکہ یہ کتاب براہ راست حفاظت خداوندی میں ہے، ان عناصر کو یہ راستہ ضرور مل گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے گمراہیوں کو مسلمانوں میں رواج دیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت پر اپنے خاص فضل کی وجہ سے بالکل شروع میں ہی ائمۂ اسلام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب احادیث کے سلسلہ میں بصیرت افروز اصولوں کی رہنمائی کی اور حدیثوں کی جانچ کے لیے رجال کا عظیم فن وجود میں آیا جس کی کسی قوم میں کوئی نظیر نہیں ہے اور اس کے ساتھ علمائے اسلام نے روایتوں کی تحقیق کے لیے روایت

و درایت کے رہنما اور معیاری اصول طے کیے اور اس فن سے اشتغال، عقل و فکر کی پختگی اور غیر معمولی تقویٰ اور احتیاط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ملکہ عطا کر دیا تھا کہ رطب و یابس مجموعوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کر لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، ان کی مہارت کے یہ واقعات حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں، ہم ان واقعات کو یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں، البتہ بعض اقوال پیش کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ حدیث کے باب میں سلف کس قدر احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض جماعتوں کی جانب سے حدیث کے نام پر رطب و یابس قبول کرنے کے رجحان کی تحریک دین الٰہی کے ساتھ زبردست خیانت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دین کو کمزور بنیادوں پر قائم نہیں کیا ہے۔ اس کے اصول نہایت ہی مستحکم ہیں، اسی لیے صحابہ کرام کے زمانہ سے یہ طرز عمل چلا آرہا ہے کہ حدیث اسی وقت قبول کی جائے گی جب قرآن کریم اور مسلمانوں میں مشہور و معروف سنتوں سے متعارض نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ایک وقت ہمارا یہ حال تھا کہ جب ہم کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کرتے ہوئے پاتے تھے تو ہماری نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتی تھیں، کان اس کی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے لیکن جب سے لوگوں نے رطب و یابس کی آمیزش شروع کر دی ہے اس وقت سے ہم صرف وہی چیز قبول کرتے ہیں جس سے ہم واقف ہیں[۳۵]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں نقل نہیں کرتے جس طرح فلاں صاحب اور فلاں صاحب کر رہے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ سنو اسلام لانے کے بعد سے میں ہمیشہ اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہوں، لیکن میں نے آپؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، جو میری طرف قصداً کوئی بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے"[۵۶]

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" یہ علم دین ہے، اس لیے یہ دیکھ لیا کرو کہ تم کس سے دین اخذ کر رہے ہو"[۵۷]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ اسی احتیاط کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" جرح و تعدیل کے وسائل کے ضعف کی وجہ سے اسلاف کی ایک جماعت ہمیشہ محتاط رہی ہے، مجتہدین صحابہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے روایتوں کے مقابلہ میں قرآن کریم سے وابستگی کو زیادہ محفوظ سمجھا"[۵۸]

رمی جمرہ کی حقیقت کے سلسلہ میں وارد ضعیف روایتوں پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں:

"لیکن صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے، اگر اس کے متعلق کوئی بات صحیح روایات سے ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی تھی، لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے، اور دین کا معاملہ نہایت اہم ہے، اس وجہ سے اس کے معاملہ میں ہر قسم کی روایات پر اعتماد کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سن پائے اسکو بیان کرنے لگ جائے"

(باقی)

حواشی

[۱] قرآن کریم، سورہ آل عمران ۳: ۱۴ [۲] قرآن کریم، سورہ مائدہ ۵: ۴ [۳] قرآن کریم، سورہ احزاب ۳۳: ۲۱ -

۷ قرآن کریم، سورہ نجم ۳، ۴ ۸ قرآن کریم، سورہ قلم ۴ ۹ قرآن کریم، سورہ نساء ۵۹ ۱۰ قرآن کریم،
سورہ نساء ۸۰ ۱۱ حاکم نیشاپوری: المستدرک ۳/۹۳ ۱۲ امام ابوداؤد: السنن ۴/۲۰۹، امام ترمذی:
السنن ۵/۴۵، امام ابن ماجہ: السنن ۱/۶ ۱۳ حافظ ابن عبدالبر: جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۹۱
۱۴ امام نسائی: السنن ۳/۱۱۷، امام ابن ماجہ: السنن ۱/۳۴۹، حاکم نیشاپوری: المستدرک ۱/۸۰ ۱۵
حافظ ابن عبدالبر: جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۹۱ ۱۶ امام شافعی: الرسالہ ۸۰ ۱۷ امام
شاطبی: الموافقات ۳/۲۶۹ ۱۸ مولانا فراہیؒ، تفسیر نظام القرآن: ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی
۵۰ ۱۹ امام شافعی: الرسالہ ۳۳ ۲۰ امام شافعی: الرسالہ ۹۲ ۲۱ امام شاطبی: الموافقات
۴/۱۲ ۲۲ مولانا فراہیؒ: تفسیر نظام القرآن، مقدمہ، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی ۳۷ ۲۳ مولانا
فراہیؒ: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل ۲۵ ۲۴ مولانا امین احسن اصلاحی:
مقدمہ تفسیر نظام القرآن ۱۷ ۲۵ مولانا فراہی: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل
۳۱ ۲۶ امام ابوبکر سرخسی: اصول السرخسی ۱/۲۹۸ ۲۷ مولانا فراہی: تفسیر نظام القرآن،
مقدمہ، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی ۴۹ ۲۸ علامہ بدرالدین زرکشی: البرہان فی علوم القرآن
۲/۱۷۵-۱۷۶، علامہ جلال الدین سیوطی: الاتقان فی علوم القرآن ۲/۲۷، نیز دیکھئے حافظ
ابن کثیر: تفسیر ۱/۳ ۲۹ مولانا فراہی: تفسیر نظام القرآن، مقدمہ، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی
۳۵ ۳۰ مولانا فراہی: رسائل الامام الفراہی، دلائل النظام ۲۰ ۳۱ دیکھئے: علامہ بدرالدین زرکشی،
البرہان فی علوم القرآن ۲/۵، ۳۲ مولانا فراہی: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل
۴۲ ۳۳ امام ابوداؤد: السنن ۴/۲۰۹ ۳۴ امام ابن ماجہ: السنن ۱/۱۰ ۳۵ حافظ ابن عبدالبر:
جامع بیان العلم وفضلہ ۲/۱۹۱ ۳۳ ایضاً ۳۷ امام شاطبی: الموافقات ۴/۲۶ ۳۸ مولانا امین احسن
اصلاحی: مقدمہ تفسیر نظام القرآن ۱۸ ۳۹ امام مسلم: الجامع الصحیح ۱۰/۵۵ ۴۰ امام شاطبی: الموافقات ۴/۳۳

۳۸؎ مولانا فراہیؒ: تفسیر نظام القرآن، مقدمہ، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی ۳۷ ۳۹؎ امام ابوبکر سرخسی: اصول السرخسی ۱/۲۷۲-۲۷۹ ۴۰؎ قاضی عیاض: ترتیب المدارک ۱/۶۶ ۴۱؎ ایضاً ۴۲؎ ایضاً ۴۳؎ ایضاً ۴۴؎ ایضاً ۴۵؎ ایضاً ۱/۶۷ ۴۶؎ مولانا امین احسن اصلاحی: مقدمہ تفسیر نظام القرآن ۱۸ ۴۷؎ علامہ بدرالدین زرکشی: البرہان فی علوم القرآن ۲/۱۵۶ ۴۸؎ امام ابن تیمیہ: مقدمۃ فی اصول التفسیر ۹۵ ۴۹؎ شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی: مناہل العرفان ۲/۱۳ ۵۰؎ ایضاً ۲/۱۷ ۵۱؎ امام ابن حبان: کتاب المجروحین ۱/۶۲ ۵۲؎ امام ابن جوزی: الموضوعات ۱/۱۳۹ ۵۳؎ مولانا فراہیؒ: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل ۲۲۵ ۵۴؎ ایضاً ۵۵؎ امام مسلم: الجامع الصحیح ۱/۱۹۵ ۵۶؎ امام بخاری: الجامع الصحیح ۱/۶۳ ۵۷؎ امام مسلم: الجامع الصحیح ۱/۱۹۹ ۵۸؎ مولانا فراہیؒ: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل ۲۳۲ ۵۹؎ مولانا فراہیؒ: تفسیر نظام القرآن، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی ۳۴۔

کلماتِ نقشبندیہ

از ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبد القادر ندوی

(۲)

نظر بر قدم | شیخ رقمطراز ہیں :

معناه ان السالک یجب علیه ان لا ینظر فی حال مشیه الا الی قدمیه ولا فی حال قعوده الا بین یدیه فان النظر الی النقوش والالوان یفسد علیه حاله ویمنعه مما هو بسبیله لان الذاکر المبتدئ اذا تعلق نظره بالمبصرات اشتغل قلبه بالتفرقة الحاصلة من النظر الی المبصرات لعدم قوته علی حفظ القلب۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک پر واجب ہے کہ چلتے وقت اپنے دونوں قدموں کے سوا اور بیٹھے ہوئے اپنے آگے کے سوا کسی اور طرف نہ دیکھے اس لیے کہ نقوش اور رنگوں کی طرف نظر کرنے سے اس کا حال فاسد ہو جائے گا اور اس کو اس کے راستے سے روک لے گا اس لیے کہ مبتدی ذاکر کی نظر جب قابل دید چیزوں پر اٹکتی ہے تو قلب کی حفاظت پر قوت کی کمی کی وجہ سے یہ نظر اس کے قلب کو پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے:

وفی حکمہ الاستماع الی اصوات الناس واحادیثھم۔	اور اسی حکم کے تحت لوگوں کی آوازوں اور انکی گفتگو کی طرف کان لگانا بھی آتا ہے۔
سمعت سیدی الوالد یقول ھذا بالنسبۃ الی المبتدی اما المنتھی فیجب علیہ ان یتامل فی حالہ علی قدم ای نبی ھو؟ اذ من الاولیاء من یکون علی قدم محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام ولہ الجامعیۃ التامۃ ومنھم من یکون علی قدم موسیٰ علیہ السلام وعلی ھذا القیاس فاذا عرف متبوعہ فلتکن احوالہ وواقعاتہ مناسبۃ لواقعات متبوعہ واللہ اعلم۔	اپنے والد مرشد سے میں نے سنا فرماتے تھے کہ یہ یعنی نظر کو نیچے رکھنا بہ نسبت مبتدی کے ہے اور منتہی پر تو واجب ہے کہ تامل کرے اپنے حال میں کہ وہ کس نبی کے قدم پر ہے اس واسطے کہ بعض اولیاء سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم پر ہوتے ہیں اور ان کو پوری جامعیت کمالات کی حاصل ہوتی ہے اور بعض ولی موسیٰ علیہ السلام کے قدم پر ہوتے ہیں پھر جب منتہی اپنے پیشوا کو پہچان لے تو چاہیے کہ اس کے حالات اور واقعات اپنے پیشوا کے ساتھ مناسب ہوں واللہ اعلم

ملا خبازؒ نے عام وخاص معنیٰ اس طرح بیان کیے ہیں: عام معنیٰ یہ ہیں کہ سالک ہمیشہ چلتے وقت دائیں اور بائیں نہ دیکھے اور اپنے پاؤں کی پشت کی طرف دیکھتا رہے،

یعنی غیر حق کو اپنے پاؤں کے نیچے لائے اور تواضع، حلم، نرمی اور عاجزی سے راستہ طے کرے جیساکہ ولا تمش فی الارض مرحاً (اور نہ چل زمین پر اتراتا) سے یہی مراد ہے چنانچہ بزرگوں نے فرمایا یکرھون فضول النظر کما یکرھون فضول الکلام (وہ فضول نظر کو ویسا ہی ناپسند کرتے ہیں جیسا فضول بات کو) اور خاص معنیٰ یہ ہیں کہ سالک جب معرفت کے رستے کو طے کرنا چاہے تو معرفت گوناگوں میں قدم مارے کیونکہ معرفت کی کوئی انتہا نہیں اور ترقی حاصل کرے۔ چنانچہ حضرت رسالت پناہ ہر روز ستر مرتبہ استغفار اور توبہ کرتے یعنی ہر روز ستر مقام طے کرتے اور قدم اٹھاتے تھے اور مقام گذشتہ سے توبہ کرتے۔"

سفر در وطن | شیخ کا ارشاد ہے:

معناہ الانتقال من الصفات	اسکے معنیٰ یہ ہیں کہ پست بشری صفات سے
البشریۃ الخسیسۃ الی الصفات	اعلیٰ ملکوتی صفات کی طرف منتقل ہونا پس
الملکیۃ الفاضلۃ فیجب علی	سالک پر واجب ہے کہ اپنے بارے میں
السالک ان یتفحص عن نفسہ	کھوج کرے کہ کیا اسکے دل میں کچھ مخلوق
ھل فی قلبہ بقیۃ حب الخلق؟	کی محبت باقی ہے پس اگر ایسا سمجھے تو اسکو
فاذا عرف شیئا عن ذالک	زائل کرنے کی کوشش کرے۔
اجتھد فی زوالہ۔	

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ اضافہ فرمایا ہے:

فاذا عرف شیئا من ذالک	پھر جب اس کو جا دے تو سر نو سے توبہ
استانف التوبۃ وعلم ان	کرے اور جانے کہ یہ میرا بت ہے اس
ذالک صنمہ ثم یقول لا الٰہ	واسطے کہ جو تجھکو خدا سے باز رکھے وہ

الا اللہ یعنی نفیت عن قلبی	فی الواقع تیراب ہے پھر کہے لا الٰہ
الشیٔ الفلانی واثبت حب اللہ	الا اللہ، لا الٰہ سے ارادہ کرے
مکانہ وذالک لان عروق المحبۃ	کہ میں نے فلانی چیز کی محبت کو نفی کر دیا
فی داخل القلب کثیرۃ خفیۃ	اور الا اللہ سے قصد کرے کہ اللہ کی
لایمکن ان یستخرج الا بالتفحص	محبت میں نے اسکے مقام پر ثابت کر دی
البالغ، ویجب علیہ ان یتفحص	اور وجہ اسکی یہ ہے کہ غیر خدا کی محبت
ھل فی قلبہ حسد لاحد، او	کی رگیں دل کے اندر بہت چھپی ہوئی ہوتی
حقد، او اعتراض فلیکسرہ	ہیں، ان کا نکالنا ممکن نہیں مگر کمالِ
بمداومۃ ھذہ الکلمۃ	تفحص اور تلاش سے۔ اور سالک پر
	واجب ہے کہ تلاش کرے کہ آیا اس کے
	دل میں کسی کا حسد یا کسی کا کینہ یا اعتراض
	موجود ہے تو اس کو توڑا کرے اس کلمہ
	کی مداومت سے۔"

اس موقعہ پر مولانا بلھوریؒ نے یہ فائدہ درج کیا ہے: "صدیق اکبرؓ نے فرمایا جس نے اللہ کی محبت کا خالص مزہ چکھا تو اس نے اس کو طلب دنیا سے باز رکھا اور سب لوگوں سے اس کو وحشی کر دیا۔"

ملا خبازؒ نے اس کے عام و خاص معنیٰ یوں بیان کیے ہیں: "عام معنیٰ یہ ہیں کہ سالک طبیعت بشری میں سفر کرے یعنی چوپایوں کی خصلت سے انسانی خصلت میں اور انسانی سے فرشتوں کی خصلت میں اور بری خصلتوں سے نیک خصلتوں میں انتقال کرے یعنی روح

جو اس کا لطیفہ [۱] ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا مظہر ہے اور خدا کا خلیفہ ہے کہ (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً [۲] اس کی ذات میں ہے ، انسانی صفتوں سے روحانی صفتوں میں بدل جائے اور نفس کو عین روح بنائے اور روح کو عین مجروح کرے اور مجروح کو عین مفتوح کرے ۔ اور معنیٰ خاص یہ ہیں کہ سالک ناسوت ، ملکوت ، جبروت اور لاہوت کا سفر کرے [۳]

خلوت در انجمن | فرماتے ہیں :

معناہ الخلوۃ فی الجلوۃ والمراد	اس کے معنیٰ جلوت میں خلوت کے ہیں
ان یکون قلب السالک حاضراً	اور مراد یہ ہے کہ سالک تمام حالات
مع الحق فی الاحوال کلھا غائباً	میں حق کے سامنے حاضر رہے اور لوگوں
عن الخلق مع کونہ بین الناس	کے درمیان ہوتے ہوئے بھی مخلوق سے
والخلوۃ نوعان : (الاول) الخلوۃ	غائب رہے ، خلوت کی دو قسمیں ہیں ۔
من حیث الظاھر وھی اختلاء	ایک تو یہ کہ سالک کسی گھر میں جو لوگوں
السالک فی بیت خال عن الناس	سے خالی ہو خلوت نشینی کرے ، دوسرے
و (الثانی) الخلوۃ من حیث الباطن	باطنی خلوت ، وہ یہ ہے کہ باطن اسرار
وھی کون الباطن فی مشاھدۃ	حق کے مشاہدہ میں مشغول رہے اور بظاہر
اسرار الحق والظاھر فی	مخلوق کے معاملات میں مصروف ۔
معاملۃ الخلق ۔	

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :

قال خواجہ نقشبندؒ : والیہ	خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا کہ اسی طرف

الاشارة فی قوله عز من
قائل رجالٌ لا تُلهیهم تجارةٌ
ولا بیعٌ عن ذکر الله واقام الصلوٰة
وایتاء الزکوٰة) بل الحق ان
المتوسم بزی الفقراء ودوام
التعلق بالله یکون غالباً
مظنة للریاء والسمعة
فالاولی ان یکون الزی زی
العلم والدیانة والاجتهاد
فی الطاعات ویکون القلب
مع الحق دائماً قال الخواجه
علی الرامیتنی بالفارسیة:
از دروں شو آشنا و ز بروں بیگانه شو
این چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

اشارہ ہے حق تعالیٰ کے قول میں کہ مردانے
وہ لوگ ہیں جن کو سوداگری اور خرید
وفروخت ذکر اللہ (اور نماز قائم رکھنے
اور زکوٰۃ دینے) سے غافل نہیں کرتی۔
مترجم کہتا ہے "دل بیار و دست بکار"
گویا اسی کا ترجمہ ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ
لباسِ فقرانشانند ہونا اور ہمیشہ
بذکر خدا رہنا اس طرح پر لوگوں پر
مخفی نہ رہے اس میں اکثر دکھانے اور
سنانے کا مظنہ ہے تو بہتر یہ ہے کہ وضع
اور لباس تو علم اور دیانت اور اجتہاد
فی الطاعات کا لباس ہو اور دل ہمیشہ
حق جل شانہ کے ساتھ رہے۔ چنانچہ خواجہ
علی رامیتنیؒ نے یہی مضمون فارسی کی بیت
میں ادا کیا یعنی اندر سے آشنا رہ اور
باہر سے بیگانہ کی مانند ایسی پیاری چال
کمتر ہے جہاں میں۔"

اس مقام پر مولانا بلہوریؒ نے یہ فائدہ تحریر کیا ہے: "مترجم کہتا ہے مصنف حقانی
نے حق فرمایا کہ اس زمانے میں دفع ریاکاری کے واسطے اس سے بہتر کوئی وضع نہیں باخدا

کے واسطے کہ علماء کی وضع اور لباس اختیار کرے اور باحق رہے اکثر عوام کو اس کے ساتھ عقیدت نہ ہوگی یہی گمان کریں گے کہ یہ ملا ہیں کتاب کے کیڑے ان کو درویشی اور ولایت سے کیا نسبت بخلاف لباس فقرا کے یا مطلق ترک لباس کے"۔ اس کے بعد یہ حکایت تحریر کی ہے کہ "ایک شخص نے خواجہ نقشبندؒ سے پوچھا کہ کاروبار کی عین مشغولی میں توجہ الی اللہ رکھنا اور غافل نہ ہونا کیونکر متصور ہو اور اس پر کیا دلیل ہے خواجہ علیہ الرحمہ نے اس آیت سے استدلال کیا کہ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔"

ملا خیازؒ نے عام معنیٰ کے ضمن میں یہ واقعہ درج کیا ہے: "چنانچہ قطب الاقطاب خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی عمر میں ایک جوان کو دیکھا، میں فخر کرتا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں اس جوان کی طرح ہوتا۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ مینا بازار میں ہزار اشرفی کا سودا کر رہا تھا لیکن ایک دم بھی خدا کی یاد سے غافل نہ تھا"۔

اس کے بعد ملا صاحبؒ نے خاص معنیٰ یوں بیان کیے: "اور خاص معنیٰ یہ ہیں کہ چونکہ روح خدا کا خلیفہ ہے اور اس کی صفات کا عرش ہے اس لیے اس میں طرح طرح کے جنگل اور عجیب و غریب مجلسیں ہیں ان کی طرف ہرگز خیال نہ کرے اور خدا وند تعالیٰ کے مشاہدہ سے باز نہ رہے اور مشاہدہ کے عجائب و غرائب میں خوشحالی رہے اور روح جو کہ حرم خدا ہے اور مظہر جمال اللہ ہے، حرم سے حریم کی طرف رستہ معلوم کرے اور غیر کو حرم میں دخل نہ دے۔"

یادکرد فرماتے ہیں:۔

معناه تكرار الذكر على الدوام	اس کے معنیٰ دائمی تکرار ذکر کے ہیں۔
سواء باسم الذات او النفي	برابر ہے کہ ذکر اسم ذات کا ہو یا نفی اذ

والاثبات الی ان یحصل له الحضور بالمذکور۔	اثبات ہو۔ بہرحال ایسی تکرار ہو کہ مذکور کی حضوری نصیب ہو جائے۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

معناہ ذکر الله تعالیٰ اما بالنفی والاثبات او بالاثبات المجرد کما مر تفصیله۔	یادکرد سے مراد ذکر اللہ ہے یا بنفی و اثبات یا باثبات مجرد چنانچہ اس کی تفصیل مذکور ہو چکی۔

ملا خواجہؒ لکھتے ہیں: "یادکرد سے مراد ذکر لسانی اور قلبی ہے۔ اس کے بھی دو معنیٰ ہیں ایک عام دوسرے خاص، عام تو یہ ہیں کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے اس کا اثر دل پر لیا جائے اور اسکا حظ اٹھائے اور خاص معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ دل سے خدا کی یاد کرے زبان کو اس سے ناآشنا بنائے اور اپنے اندر خیال کر کے صحرائے دل کی سیر کرے"۔

بازگشت | شیخ ارقام فرماتے ہیں:

معناه رجوع الذاکر فی النفی والاثبات بعد اطلاق نفسه الی المناجاة بهذه الکلمة الشریفة (الٰهی انت مقصودی ورضاک مطلوبی) وملاحظتها توکد النفی والاثبات وتورث فی قلب الذاکر سر التوحید الحقیقی حتی یغنی عن نظره وجود	اس کے معنیٰ ہیں کہ نفی اور اثبات میں اپنے دم کو چھوڑنے کے بعد ذاکر اس کلمہ شریفہ کی مناجات کی طرف رجوع کرے کہ اے اللہ تو ہی میرا مقصود اور تیری رضامندی ہی میرا مطلوب ہے، اس کا دھیان رکھنے سے نفی و اثبات موکد ہوتا ہے اور ذاکر کے قلب میں توحید حقیقی کے اسرار کا مورث ہے حتیٰ کہ اس کی

جمیع الخلق۔ | نگاہ میں تمام مخلوق کا وجود فنا ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

معناہ ان یرجع بعد کل طائفۃ من الذکر ثلث مرات او خمس مرات الی المناجاۃ فیدعو اللہ عزوجل بمجامع ھمتہ یارب انت مقصودی ترکت الدنیا والآخرۃ لک اتمم علی نعمتک وارزقنی وصولک التام؛ سمعت سیدی الوالد قدس سرہ یقول: ھذا شرط عظیم فی الذکر فلا ینبغی ان یغفل السالک عنہ فانا لم نجد ما وجدنا الا ببرکۃ ھذا۔

اور بازگشت یعنی رجوع کرنا اور پھرنا اس سے عبارت ہے کہ قدرے ذکر کے بعد تین بار یا پانچ بار مناجات کی طرف رجوع کرے سو یوں دعا کرے اللہ عزوجل سے بحضور دل کہ اے میرے رب تو ہی میرا مقصود ہے میں نے دنیا اور آخرت کو چھوڑا تیرے ہی واسطے اپنی نعمت کو مجھ پر پورا کر اور پورا وصال اپنا مجھ کو نصیب فرما۔ والد مرشد قدس سرہ سے میں نے سنا فرماتے تھے کہ یہ شرط عظیم ہے ذکر میں تو لائق نہیں کہ سالک اس سے غافل ہو اس واسطے کہ جو ہم نے پایا اسی کی برکت سے پایا۔

ملا خبازؒ لکھتے ہیں: "بازگشت یہ ہے کہ ذکر سے مراد مذکور کی جانب بازگشت ہو اور اس کے بھی دو معنی ہیں ایک عام اور دوسرے خاص۔ ان کو ان دو آیتوں سے سمجھ لینا چاہیے عام یہ ہیں: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا[۱] یعنی اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرا اور تمام مخلوقات سے پورے طور پر کنارہ کش ہو یعنی ہر حالت میں خدا کی طرف متوجہ

اور خاص یہ ہیں: واذکر اسم ربک اذا نسیت[۲۲] یعنی اپنے پروردگار کو اس وقت یاد کر جبکہ تو اپنے آپ کو بھلا دے۔ کیونکہ ذکر کا مذکور میں فنا ہو جانا دوسری حقیقت ہے یعنی نفی سے تو وجود بشری فنا ہو جائے گا اور واجب الوجود کے اثبات سے تو بقا حاصل کرے گا۔"

نگاہ داشت | شیخ رقمطراز ہیں:

معناہ ان یحفظ المرید قلبہ	اس کے معنی یہ ہیں کہ مرید اپنے دل کو
من دخول الخواطر ولو لحظۃ	خطرات کے داخل ہونے سے بچائے
فانہ امر عظیم عند السادۃ	چاہے ایک پل کے لیے ہی۔ اس لیے یہ
النقشبندیۃ قال الشیخ ابوبکر	نقشبندی بزرگوں کے یہاں بڑا اہم ہے
الکتانی قدس سرہ: کنت	شیخ ابوبکر کتانی قدس سرہ نے فرمایا میں
بوابا علی قلبی اربعین سنۃ	چالیس سال تک اپنے دل کا دربان رہا
وما فتحتہ لغیر اللہ تعالیٰ	اور میں نے اس کو غیر اللہ کے لیے وا نہ
حتیٰ صار قلبی لا یعرف غیر اللہ	کیا یہاں تک میرا دل ایسا ہو گیا کہ اللہ
سبحانہ وتعالیٰ وقال بعضھم	سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی کو پہچانتا نہیں
حرست قلبی عشر لیال	اور بعض نے فرمایا کہ میں نے اپنے دل کی
فحرسنی قلبی عشرین سنۃ۔	پہرہ داری دس راتیں کی تو میرے
	دل نے میری پہرہ داری بیس برس
	تک کی۔

شاہ صاحبؒ نے اس ضمن میں خواجہ نقشبندؒ کی یہ ہدایت نقل کی ہے۔

ینبغی ان یصدھا السالک فی	سالک کو لائق ہے کہ خطرے کے اپنے دل میں

اول مایظھر لانھا اذاظہرت	نہ چھوڑے اس کے ابتدائے ظہور میں
مالت الیھا النفس واثرتھا	اس واسطے کہ جب ظاہر ہوچکے گا تو نفس
فیعسر ن والہا۔	اس کی طرف مائل ہوجاوے گا اور وہ
	نفس میں اثر کرے گا پھر اس کا دور کرنا
	مشکل ہوگا۔"

ملا خیاذؒ نے اس کے عام و خاص معنی اس طرح بیان کیے ہیں: "عام یہ ہیں کہ مراقبہ اس طرح کرے کہ اپنا تمام ظاہر و باطن خداوند کی طرف لگائے جیسا کہ بلی چوہے کے سوراخ میں چوہے کو حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے اور خاص یہ ہیں کہ نہ ظاہر ہی رہے نہ باطن اور نہ مراقبہ رہے نہ غیر۔"

یادداشت | شیخ کردی ارقام فرماتے ہیں:

معناہ التوجہ الصرف المجرد	اس کے معنیٰ ہیں ذات یکتا کے انوار کے
من الالفاظ الی مشاھدۃ	مشاہدہ کی طرف وہ خالص توجہ جو الفاظ
انوار الذات الاحدیۃ،	سے خالی ہو اور حق یہ ہے کہ یہ استقامت
والحق ان لا یستقیم الا بعد	فنائے تام اور بقائے کامل کے بغیر نصیب
الفناء التام والبقاء السابغ۔	نہیں ہوتی۔

شاہ صاحبؒ نے خط کشیدہ عبارت کی جگہ المجرد عن الالفاظ والتخیلات الی حقیقۃ واجب الوجود (خالی الفاظ اور تخیلات سے واجب الوجود کی حقیقت کی طرف) تحریر فرمایا ہے باقی عبارت یکساں ہے۔

ملا خیاذؒ لکھتے ہیں: "یادداشت جو کہ تمام عبادتوں کا مقصود ہے۔ مراد از روے

ذوق کے آگاہی دوام ہے۔ اس کے بھی دو معنیٰ ہیں عام اور خاص۔ عام یہ ہیں کہ ہمیشہ توحید اور معرفت میں مستغرق رہے اور ذوق دائمی حاصل کرے اور بے عقل و ہوش نہ ہو جائے اور اگر ہو جائے تو طریقت کا نقصان ہے اور آہ و بقا نہ کرے اگر کرے گا تو طریقت کا خون کرے گا۔ خاص معنیٰ یہ ہیں کہ توحید اور معرفت کے استغراق میں جو اسرار الٰہی معلوم کرے انہیں پر اکتفا نہ کرے تازہ بتازہ اسرار حاصل کرے اور ان کو ظاہر نہ کرے۔

وقوف زمانی | کلمہ اولیٰ "ہوش دردم" کی جو وضاحت شاہ ولی اللہؒ کی مذکور ہوئی تھا اس میں وقوف زمانی کی تفصیل آگئی ہے یہی تفصیل شیخ کردی نے علیحدہ عنوان کے تحت تحریر کی ہے

وقوف عددی | کے معنیٰ شاہ صاحبؒ اور شیخ کردی دونوں کے بیان یہ ہیں کہ ذکر میں عدد وتر کا لحاظ رکھا جائے اور اس کی محافظت کی جائے۔

وقوف قلبی | شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ معناہ التوجہ الی القلب الذی ھو موضوع الی الجانب الایسر تحت الثدی (اس کے معنیٰ اس قلب کی طرف توجہ مرکوز کرنے کے ہیں جو چھاتی کے نیچے بائیں جانب موجود ہے)

شیخ امین کردی نے اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے:

معناہ کما قال الشیخ عبیداللہ	اس کے معنیٰ جیسا کہ فرمایا شیخ عبیداللہ
الاحرار قدس سرہ ان	احرار قدس سرہ نے کہ وقوف قلبی
الوقوف القلبی عبارۃ عن	عبارت ہے حق سبحانہ کے ساتھ
حضور القلب مع الحق سبحانہ	حضوری قلب سے اس طور پر کہ قلب
علی وجہ لا یبقی للقلب۔	کا کوئی مقصود غیر حق سبحانہ باقی نہ رہے

مقصود غیر الحق سبحانہ ولا
ذھول عن معنی الذکر وھو
من شرط الذکر التی لابد
منھا (وقال ایضا فی تفسیر
الوقوف القلبی: ھو کون الذاکر
واقفا علی قلبہ وقت الذکر
بحیث یتوجہ الی قلبہ ویجعلہ
مشغولا بلفظ الذکر ومعناہ
ولا یترکہ غافلا عنہ وذاھلا
عن معناہ ۔ قال صاحب الرشحات
وھو احد تلامیذ مولانا عبید اللہ
احرار قدس سرھما ۔
(ولم یجعل الخواجہ بہاء الدین
قدس سرہ حبس النفس
ورعایۃ العدد لازما فی الذکر
واما الوقوف القلبی فجعلہ مھما
بمعنییہ وعدہ لازما فان
خلاصۃ الذکر والمقصود منہ
ھو الوقوف القلبی ۔

اور نہ ہی ذکر کے معنی سے غفلت ہو اور
ذکر کی لابدی شرائط میں سے ہے (اور
نیز فرمایا وقوف قلبی کی تفسیر میں کہ وہ
یہ ہے کہ ذاکر اپنے قلب کی واقفیت
کے ذکر کے وقت اس طرح کہ اپنے قلب
پر متوجہ ہے اور اس کو ذکر کے الفاظ
ومعانی میں مشغول رکھے اور اس کو غافل
نہ چھوڑے اور نہ معانی سے اسکو غافل
رکھے ۔ مصنف رشحات جو مولانا عبید اللہ
احرار قدس سرہما کے شاگرد ہیں نے
فرمایا (کہ خواجہ بہاء الدین قدس سرہ
نے حبس دم اور عدد وتر کی رعایت کو
ذکر میں لازم نہیں قرار دیا ہے البتہ
وقوف قلبی کو دونوں معنوں میں اہم
بتلایا ہے اور اس کو لازم قرار دیا ہے
اس لیے کہ ذکر کا خلاصہ اور اس کا
مقصود وقوف قلبی ہی ہے ۔)

وقوف زمانی | ملا خبازؒ نے آخرالذکر تینوں کلمات کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں:
اپنے آپ کو ہمیشہ زمانہ گذشتہ کی غفلت اور نسیان کے سبب شرمندہ کرتا رہے۔

وقوف عددی | اپنی حالت کی طرف نگاہ کرے اور دیکھے کہ حالات میں ترقی ہوئی یا نہیں۔

وقوف قلبی | نفس کو پاک کرے اور دل کو صاف کرے اور روح کو جلا دینے میں ہر روز زیادہ کوشش کرے۔

حواشی

۱۷ سورہ بنی اسرائیل: آیت ۸۵ ۱۸ صوفیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان میں ۶ لطائف پیدا کیے ہیں۔ روح بھی ان میں سے ایک لطیفہ ہے، طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حوالے سے لطائف کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے، بائیں چھاتی سے دو انگل نیچے لطیفۂ قلب، دائیں چھاتی سے دو انگل نیچے لطیفۂ روح، بائیں چھاتی سے دو انگل اوپر لطیفۂ سر، دائیں چھاتی سے دو انگل اوپر لطیفۂ خفی، دونوں چھاتیوں کے درمیان دھک دھکی کے پاس لطیفۂ اخفیٰ اور پیشانی پہ دونوں ابرو کے درمیان لطیفۂ نفس ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے لطائف کو "حقائق مفرزہ" (حقائق جدا جدا) بتایا ہے۔

۱۹ سورۂ بقرہ: آیت ۳۰ ترجمہ: مجھکو بنانا ہے زمین میں ایک نائب ۲۰ ناسوت: عالم اجسام کہ مراد اس سے دنیا اور یہ جہاں ہے اور کبھی مجازاً بمعنی شریعت اور عبادات ظاہری کے بھی؛ ملکوت: عالم فرشتوں کا اور صوفیوں کے نزدیک عالم ارواح کہتے ہیں اور بعضوں نے بمعنی عالم غیب کے لکھا ہے۔ جبروت: جلال خدا کا اور وحدت؛ لاہوت: عالم ذات الٰہی کا جس میں سالک کو مقام فنافی اللہ کا حاصل ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ مرتبہ صفات کو جبروت اور مرتبہ اسماء کو ملکوت کہتے ہیں۔ (کشوری) ۲۱ سورۂ نور: آیت ۳۷ ملا خبازؒ نے آیت کا بین القوسین جز بھی نقل کیا ہے۔ جبکہ شاہ صاحبؒ نے ذکر اللہ تک ہی نقل کیا ہے۔

۲۲ سورۂ مزمل: آیت ۸ ۲۳ سورۂ کہف: آیت ۲۴۔

اقبال کا "مردِ قلندر"

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

اقبال اپنے نصب العین انسان کو کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں جن میں ایک اصطلاح "مردِ قلندر" بھی ہے۔ اس انسان کے لیے ان کے نظامِ تسمیہ میں دیگر نام بھی ہیں۔ جیسے "مردِ حُر"، "مردِ درویش"، "مردِ خدا"، "مردِ کامل" وغیرہ جو سب مرادف اصطلاحیں ہیں لیکن یہ سارے کے سارے نام ایک ہی تصوراتی پیکر سے وابستہ ہیں اور وہ مثالی پیکر اقبالیات میں "مردِ مومن" ہے جو "صاحبِ خودی" ہے گرچہ اقبال کے یہاں فقر اور عشق کے امتزاج سے جو ہیئتِ ترکیبی بنتی ہے وہی "بندۂ مومن" ہے۔ اسلامی روایات اور تاریخی پس منظر میں اقبال کو اپنے اشعار کے موضوع کی مناسبت سے اپنے نصب العینی انسان کے لیے جو نام بھی شایانِ شان معلوم ہوئے وہ اسے اسی نام سے اس شعر میں پکارتے ہیں۔ یہ سب کے سب "مردِ مومن" کے احوال و مقامات کی مختلف شانوں کے غماز ہیں اور کبھی کبھی ان علامتوں میں "مردِ مومن" کی پوری شخصیت کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔

قلندر کی اصطلاح اقبال نے فارسی زبان سے لی ہے اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں اس خیال کے ہیں کہ قلندر کی اصطلاح میں ایک رومانی پیکر کی جھلک نظر آتی ہے اور اس طرح قلندر انسانِ کامل کے روحانی پہلو کی نمود کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اقبال کے

تصورات میں "مردِ قلندر" خودی کا جوہر یعنی آزادی کا مظہر ہے۔ یہ وجود کی آخری منزل نہیں کیونکہ خودی یا وجود کی اعلیٰ ترین منزل مردِ کامل یا انسانِ کامل کا مقام ہے اس لیے "مردِ قلندر" مردِ مومن کی تکمیلِ ذات کا ایک مرحلہ ہے، منزل نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مردِ مومن کی طرح "مردِ قلندر" کی فراست بھی قرآنی ہے اور وہ اس کی سند قرآن کریم سے حاصل کرتا ہے اور شریعت کا رہینِ منت بھی ہے۔

اقبال کے تصورات میں قلندری ایک علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۲۷ میں کہتے ہیں ؎

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری، کہ حیات خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

اقبال کے نزدیک اس علم قلندری کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ روح خدنگِ جستہ ہے یعنی کمان سے نکلا ہوا تیر ہے مگر کمان سے دور نہیں۔ مطلب یہ کہ روح اگرچہ خدا نہیں ہے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہے اس لیے اپنی اصل کے لحاظ سے روح ازلی صفات باری کا پرتو ہے کیونکہ خدا نے انسان کے جسم میں خود اپنی روح پھونکی ہے۔ ان باتوں کی وجہ سے "مردِ قلندر" کو اپنی ذہنی نشو و نما کے ہر مرحلے میں اپنی ذات کے احساس کے ساتھ ذات حق کا تصور دامنگیر رہتا ہے اور جب اپنی خودی کی نشو و نما کے تمام مراحل سے گزر کر اسے اپنی انا کا مکمل شعور حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی قلندرانہ شان سے سرشار ہو کر اپنے اندر خدائی صفات جذب کر لیتا ہے۔ کیونکہ خود میں خدا کی صفات پیدا کرنے اور اپنے کو خدا کے رنگ میں رنگ لینے کی تاکید سورہ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیت ۱۳۸ میں فرمائی گئی ہے کہ:-

"(اے نبیؐ) کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَةَ اللّٰهِ) اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔"

فقیری اگر مومن کی شان ہے تو قلندری اس کا انداز زیست ہے جس کا پیدائشی حق آزادی اور نیابت اس کا مقدر ہے۔ علاوہ ازیں اکملیت اس کا مقصد ہے اور بزرگی اس کی شان ہے۔ قلندری فقر سے مماثل مرد مومن کی ایک صفت ہے۔ مگر قلندر کا انداز، فقر کی بہ نسبت، کسی حد تک زیادہ روحانی ہے۔ درویشی اور قلندری مکمل انسانیت کی دو منزلوں کے نام ہیں۔ اقبال کے یہاں قلندری عمل کا مقام ہے۔ "مرد قلندر" درویشی کو ایک خارجی شکل دیتا ہے۔ درویشی کے مرحلے پر ایک درویش انسان کے لیے جو جہانِ نو تعمیر کرتا ہے قلندری کے مقام پر یہ دنیا خارجاً صورت پذیر اور متشکل ہو جاتی ہے۔ اس طرح قلندری کا تعلق عمل اور متعلقہ کوائف سے ہو جاتا ہے۔

اقبال کا "مرد قلندر" وفور حیات سے سرشار ہے اور اس کے نظریات میں جب ذوق نمو پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے عمل کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ محض تخیلی پیکر کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوتا بلکہ عملی کردار کا نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔ کیونکہ اس کے نظریۂ حیات میں عمل کی تجسیم ہے اور اس کے بعد وہ اپنی خودی اور جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر جہاں میں تیشہ بدست پھرتا ہے اور غیر اللہ کو اپنی قلندرانہ شان سے پسپا کرتا ہے۔ یہ پیکر توحید الٰہی سے محبت سرمدی رکھتا ہے اور خدا مست ہے۔ وہ اپنی بے پناہ قوت کو خدا آشنا عقل و دانش کا پابند بنا لیتا ہے۔

چونکہ "مرد قلندر" توحید الٰہی سے محبت سرمدی رکھتا ہے اس لیے مرد مومن کی ذات میں جب قلندرانہ شان جلوہ گر ہو جاتی ہے تو وہ عملی دنیا میں قانون الٰہیہ کے "لَآ اِلٰہَ" کے پہلو پر پورے عزم و یقین کے ساتھ کاربند ہو جاتا ہے۔ "لَآ اِلٰہَ" پر یہ مکمل ایمان اس کی خارجی زندگی میں کام آتا ہے جس کی بدولت وہ بے باکانہ قدم اٹھا کر خود میں

سروری کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے "بال جبریل" کی غزل ۸ کے اس شعر میں ذہن نشین کرایا ہے ؎

قلندر جز دو حرفِ لَآ اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

کلمہ طیبہ کے دو حصے ہیں۔ لَآ اِلٰہ اور اِلَّا اللہ۔ ایک سلبی ہے یعنی اس امر کا یقین اور اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے جسے اپنا آقا تسلیم کیا جائے یا جسے اپنی حاجات کا قبلہ تصور کیا جائے "مرد قلندر" نفی کے اس پہلو کو جو اس کے ذہن میں موجود تھا پہلے مٹا دیتا ہے اور تب اِلَّا اللہ کے ایجابی پہلو کی غلامی اختیار کرتا ہے اور اس طرح خدا اور بندے کا براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

اقبال نے "ضرب کلیم" کی درج ذیل نظم: "قلندر کی پہچان" میں قلندر کی صفات کا مجمل خاکہ اس طرح پیش کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اس پیکر کو "درویش جوانمرد" کے لقب سے بھی نوازا ہے :۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا

ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

اس نظم میں مرد مومن کی ذات میں قلندرانہ شان کے جلوہ گر ہو جانے اور

عملی دنیا میں قدم رکھ کر زمان و مکان پر حکمراں ہونے کی صفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال کا "مردِ مومن" خلیفۃ الارض ہے کیونکہ اس کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اس لیے وہ زمانہ کی پیروی نہ کرکے خود زمانہ پر حکمراں ہو جاتا ہے۔ یہی ہے "مردِ مومن" کا قلندرانہ بانکپن۔ اقبال نے اس نظم میں قرآن میں نبیوں اور رسولوں کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات اور ان کی قلندرانہ شان سے باطل کو زیر کرنے پر اور زمانہ پر فتح کرنے کی باتوں کو گوش گزار کرایا ہے۔ جو زمانہ سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی قلندرانہ شان سے زمانہ کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کیا۔

"مردِ قلندر" کو یہ درک ہے کہ زمانہ دراصل اس کی حیات کے تسلسل ہی سے وابستہ ہے۔ اس لیے وہ زمانے کی ہر لہر کو اپنی مٹھی میں تھام کر زمانے کے سیل کو پی جاتا ہے اور حیات کا ہر لمحہ عمل کی زنبیل میں ڈال دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کے عوامل کی یہی لامتناہی تراکیب و تنظیم اس کی حیات بن جاتی ہے۔ قلندر زمانہ کو متنبہ کرتا ہے کہ تو تاریخ کو نہیں جھٹلا سکتا۔ تو جان لے کہ میرے اندر تیری برداشت کی حدوں سے زیادہ قوت موجود ہے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی باطل نے سر اٹھایا ہے تو قلندر نے اسے زیر کرکے حق کا پرچم بلند کیا ہے کیونکہ قلندر کی نگاہ محض اس مادی کائنات تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ستاروں کے آگے کے جہانوں کا بھی وہ محاسبہ کرتا ہے۔ وہ زمانے کا کھلونا نہیں بنتا بلکہ خود راکب بن کر زمانہ کو اپنے اشارے پر چلاتا ہے اور اس کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اس عمل میں اس کا ہر فعل مشیتِ ایزدی پر ہوتا ہے اور اس کی قوت و فراست شریعت کی پابند ہوتی ہے۔ اس عمل میں اس کی سربلندی کا پس منظر اطاعتِ خدا اور عشقِ رسول ہے

وابستہ رہتا ہے۔

اقبال کا "مردِ قلندر" صاحبِ خودی ہے۔ وہ اللہ کے علاوہ کسی ہستی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا کیونکہ جو شخص غیر اللہ کی اطاعت کرتا ہے، وہ روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں سے اس کا غلام ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس پیکر کی اسی خودداری ذہنیت کی نشاندہی "بالِ جبریل" کی غزل ۲ کے اس شعر میں کی ہے ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

یہاں بھی "مردِ قلندر" لَآ اِلٰہ کے سلبی پہلو پر ایمان رکھتا ہے یعنی اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں سوا اللہ کے کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ وہ محض ایک قادرِ مطلق کو جانتا ہے جو اس کائنات کا مالکِ حقیقی ہے اور جو ساری قوت کا سرچشمہ ہے۔ اس موڑ پر رضائے الٰہی کے سوا اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس کا ہر فعل خدائے واحد کی رضامندی کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ تسلیم و رضا اسی کا نام ہے۔

اس "مردِ قلندر" کی ایک اور صفت اس کی بے خوفی و بے باکی بھی ہے۔ جب اقبال اس کی صفت کی یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
(بالِ جبریل۔ غزل ۱۱)

تو ان کے "مردِ قلندر" کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے اور حضرت موسیٰؑ کا بے ساز و یراق فرعونِ سرکش کے دربار میں، ایک ملزم کی حیثیت ہونے کے باوجود، جاکر دعوتِ اسلام دینے کی مثالوں کے ساتھ عشقِ رسولؐ میں سرشاری کی حیدرِ کرارؓ کی شانِ قلندرانہ پیشِ نظر رہتی ہے۔ جن کے پس منظر میں اطاعتِ الٰہی اور ضبطِ نفس کے ذریعہ وہ خوف و ہراس پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ "بندۂ آزاد" ہے۔

حق گوئی اور بیباکی اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کی زبان پر وہی حق بات آتی ہے جو اس کا "دل بیدار" کہتا ہے۔ اس قلندرانہ شان کو اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۴۳ کے اس شعر میں ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا ہے ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس "مرد قلندر" کی ایک اور صفت قید و بند سے نفرت کی ہے جس کی وجہ سے اسے مرقد کا شبستاں تک راس نہیں آتا۔ اس کے انداز آفاقی ہیں اور اسکا زاویۂ نگاہ بہت وسیع ہے۔ قید و بند سے یہ نفرت صفات الٰہی کے پرتو کی وجہ سے ہے، اللہ کی یہ صفت ہے کہ وہ غیر محدود اور لانہایت ہے اس لیے قلندری میں بھی یہی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اس کی اس صفت کو شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے؛

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائیٔ افلاک نہیں ہے
(ضربِ کلیم۔ قبر)

اقبال نے اپنے "مرد قلندر" کو "مردانِ خدا" کے لقب سے بھی نوازا ہے اور "ضربِ کلیم" کی درج ذیل نظم "مردانِ خدا" میں قلندروں کی شان واضح کی ہے:

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انھیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

اس نظم میں اقبال کی مراد یہ ہے کہ احرار کی فطرت میں ہمیشہ دو شان کارفرما رہی ہے۔

ایک قلندری کی شان اور دوسری کلہ داری کی۔ بالفاظ دیگر علی الترتیب درویشی اور سلطانی کی۔ مردِ حر کی ضرب کاری ان ہی شانوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ چنگاری جسے زمانہ آفتاب کی طرح چمکاتا ہے ان ہی کی خاک میں پوشیدہ ہے۔

اقبال مسلمانوں کے زوال کو بھی ان میں شانِ قلندری کے نہ ہونے پر ہی محمول کرتے ہیں۔ "ضربِ کلیم" کی نظم: "مسلمان کا زوال" میں وہ شانِ قلندری کو شانِ فقر کا مترادف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات — جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور — قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

یہاں شانِ قلندری سے مراد بہادری، غیرت مندی، بے جگری اور غیرتِ دینی ہے۔ "مردِ قلندر" اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے سب سے پہلے مقصد کا تعین کرتا ہے اور یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے دنیوی بادشاہت اور شان و شوکت نہیں چاہیے۔ اس طرح ایک راستہ انتخاب کر لینے کے بعد وہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی قوت صرف کر دیتا ہے۔ اسی حصول کو "گوہر یک دانہ" قرار دیتے ہوئے اقبال مسلمانوں کو "بالِ جبریل" کی غزل ۴۹ میں پہلے اپنی زندگی کا مقصد متعین کرنے کی صلاح ان اشعار میں دیتے ہوئے کہتے ہیں :۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ — یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہاں گیری　　یا مرد قلندر کے اندازِ ملوکانہ

جہانگیری سنجر و طغرل کی بھی ہے اور "مرد قلندر" کی بھی مگر دونوں کے مقاصد اور حصول کے طریقہ کار میں بین فرق ہے۔ بادشاہوں کی طرح دنیا کو تہ و بالا کرنا "مرد قلندر" کی نگاہ میں صرف ناپسندیدہ ہی نہیں ممنوع ہے۔ وہ نیابت الٰہی پر فائز ہو کر اپنی آئین جہانگیری کا لائحہ عمل قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کرتا ہے۔ اسکے اندازِ ملوکانہ میں ذاتی غرض و غایت مقصود نہیں بلکہ ناموس دین کی حفاظت ہے۔ ایسے فتح مندی برائے فتح مندی پسند نہیں البتہ آئین الٰہیہ کے نفاذ میں وہ طاقت استعمال کرنے کا مجاز اپنے کو ضرور سمجھتا ہے۔ اس کی غرض و غایت خدا کی دنیا اور نوعِ انسانی کی فوز و فلاح ہے نہ کہ بادشاہوں کی طرح تباہی و بربادی۔ اس کے اندازِ ملوکانہ سے سارا معاشرہ منقلب ہو جاتا ہے اور وہ خود آفاق میں جذب ہونے کی بجائے آفاق کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے جسے اقبال "جذب قلندرانہ" کا نام دیتے ہیں۔

یہ ہے مختصر سا اجمالی خاکہ اقبال کے "مرد قلندر" کا جو نہ تو گیٹے کا "فاؤسٹ" ہے اور نہ نطشے کا "فوق البشر"۔ بلکہ عام انسانوں کی طرح گوشت پوست کا انسان ہے فرق یہ ہے کہ اس نے تزکیہ نفس کے ذریعے اپنی خودی کی تکمیل کی اور انسان کو خلیفۃ الارض کا جو منصب تفویض کیا گیا ہے اس منصب جلیل کے لیے احکام الٰہی کے نفاذ کو اپنا مقصدِ حیات سمجھا۔ تاریخ اسلام نے ایسے ہی گوشت پوست والے عظیم انسانوں کی ایک جماعت پیدا کی۔ حقیقی دنیا کے ایسے تاریخی انسانوں کی شان قلندری کے قصے ہم کتابوں میں پڑھتے اور آئے دن جمعہ کے خطبوں، میلاد کے جلسوں اور دینی اجتماع میں سنتے ہیں اور سب کچھ سننے کے بعد اس مخصوص کردار کی فعالیت ایک پیکر محسوس کے مانند ہمارے ذہن میں

رہ جاتی ہے۔ اکثر ایسے کرداروں کی، جو بالخصوص شعر کے قالب میں ڈھلتے ہیں، گرفت نسبتاً زیادہ مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے سامنے ان کے ہلکے نقوش ہی یادوں میں رہ جاتے ہیں جو چند مخصوص رجحانات کی غماری کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی انہی رجحانات کی روشنی میں ہم اپنا دائرۂ عمل متعین کر کے الفاظ کی دنیا سے نکل کر میدانِ عمل میں آسکتے ہیں۔ "مردِ قلندر" اور اس جیسی دیگر اصطلاحیں اسلامی تصوف میں پہلے سے موجود تھیں مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ عجمی تصوف نے ان پیکروں کے قُوا کو مضمحل اور دل میں عمل کے رجحانات کو مردہ کر دیا۔ اقبال نے، وقت کے اقتضا کے مطابق، ان پیکروں میں نئی جان ڈالی اور مقصدِ حیات سامنے لا دیا۔ اس لیے رموزِ قلندری کے حقائق و معارف بیان کرنے کی وجہ وہ خود یہ بتاتے ہیں ؎

کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے　　کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ سے ہو آزاد

رموزِ قلندری فاش کر کے اقبال "بالِ جبریل" ہی کی غزل ۳۲ کے اس شعر میں ہمارے حوصلے یہ کہہ کر بڑھاتے ہیں ؎

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے　　کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ
(بالِ جبریل غزل ۔ ۵۰)

اقبال کامل

(از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم)

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے انکی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر انکے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور انکے کلام کی ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں پھر انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف یعنی عورت، فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔　　قیمت ۴۰ روپیے

عربی۔ فارسی۔ اردو میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں

از جناب رام لعل نابھوی صاحب

"ہمارے لائق دوست جناب رام لعل نابھوی اردو کے اچھے اہل قلم ہیں جو فارسی پنجابی اور سنسکرت زبان سے بخوبی واقف ہیں، وہ ایک محب وطن ہیں اس لیے مسلم فرقہ واریت کی طرح ہندو فرقہ واریت سے بھی نفرت کرتے ہیں، قومی یکجہتی کو تقویت پہنچانے کے لیے ان پر جو جنون سوار ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے مشترکہ کام کو نمایاں کرنے کے لیے مسلسل مضامین لکھ رہے ہیں، یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔" (معارف)

ایک عرصہ سے سننے میں آرہا ہے کہ پنجابی زبان کو Persianised اور Sanskritised کیا جارہا ہے۔ ٹیلیویژن پہ۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر محفلوں میں۔ سیمیناروں میں یہ آواز برابر سنی جارہی ہے۔

سکھ گورو اور سکھ پوتھیوں کا تعلق پنجاب سے ہے لیکن ان کا ذکر۔ ان کا فکر پنجاب میں تو ہونا ہی تھا، پنجاب سے باہر بھی ہوا ہے۔ جو پنجاب کے باشندے غیر ممالک میں جا بسے ہیں انھوں نے بھی سکھ گوروؤں اور سکھ پوتھیوں پر کتابیں چھوڑی ہیں۔ وہ فارسی میں بھی ہیں۔ پنجاب میں فارسی کا چلن تو مدتوں رہا۔ اردو کے زمانے میں ہر مضمون اردو میں ہوتا تھا۔ عربی لکھنے والے۔ جاننے والے اور سمجھنے والے بھی تھے۔ آج بھی پنجاب کے رہنے والے

ہندو، مسلمان ۔سکھ ۔سکھ گوروؤں اور سکھ پوتھیوں کو عربی ۔ فارسی ۔ اردو میں لکھتے ہیں۔
اس کی کچھ جھلک منسلکہ گوشوارہ سے مل جائے گی ۔ اس میں پہلے عربی پھر فارسی اور اردو
کی سکھ پوتھیوں کا ذکر ہے ۔سنسکرت میں ۔ ۶ سے اوپر ہونے والے کام میں نے تلاش
کر لیے ہیں، جو محض سکھ گوروؤں اور سکھ پوتھیوں سے متعلق ہیں ۔ ان میں مخطوطات بھی ہیں
اور بہت پرانی کتابیں بھی ہیں ۔ چونکہ اس مضمون کا تعلق عربی ۔ فارسی ۔ اردو سے ہی ہے
اس لیے سنسکرت کتابوں پر مضمون اور گوشوارہ الگ سے چھپوایا جا رہا ہے ۔

بتانے کا مقصد یہ ہے کہ سکھ گورو صاحبان نے فارسی ۔ اردو، سنسکرت ۔ برج
بھاشاؤں میں بھی لکھا ہے اور ان بھاشاؤں کو جانے بغیر نہ سکھ گورو سمجھ میں آسکتے ہیں
اور نہ سکھ پوتھیاں ۔ پنجابی زبان اور سنسکرت زبان پر برابر عبور رکھنے والے زیادہ تر
ملا سادھو تھے ۔ اداسی سادھو تھے ۔ سکھ گوروؤں اور سکھ پوتھیوں سے انہیں بے حد عقیدت
تھی ۔ دور دراز جگہوں پر مثلاً بنارس ۔ ہردوار میں نرملے سنتوں اور اداسی سنتوں کے
ڈیرے تھے ۔ یہ ڈیرے پنجاب میں بھی ہیں ۔ میں سنسکرت کی کتابوں کی تلاش میں
پنجاب کے کچھ پرانے ڈیروں میں بھی گیا ۔ اسی طرح عربی ۔ فارسی ۔ اردو میں سکھ گورو
اور سکھ پوتھیاں تلاش کرنے کے لیے میں پنجاب میں بہت جگہوں پر گیا ۔ یونیورسٹیوں کی
لائبریریاں کھنگالیں ۔ جو کچھ اور جتنا جلدی جلدی میں فراہم ہو سکا وہ ایک نقشے کی شکل
میں شامل کر دیا ہے ۔ یہ کل اثاثہ پنجاب کا ہی نہیں پوری دنیا کا مشترکہ ہے ۔ پنجابی کو
آج کون Persianised یا Sanskritised کرے گا کیونکہ ان
دونوں تینوں زبانوں پر بیک وقت عبور حاصل ہونا ضروری ہے اور پھر گرامر کی واقفیت
از بس ضروری ہے ۔ برج جانے بغیر گورو گوبند سنگھ کی تحریریں کیسے سمجھ میں آئیں گی ۔

آج پنجابی نہ Persianised ہو رہی ہے نہ Sanskritised نہ پہلے ہوئی۔ نہ آیندہ ہو گی۔

ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام

اس مضمون سے اور منسلکہ گوشوارہ لکھنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم مل کر پھر سے عربی۔ فارسی۔ اردو اور سنسکرت۔ برجی کا چلن پیدا کریں۔ زبان کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ زبان سیکھنے پر کوئی رکاوٹ نہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ زبان سیکھنے سے آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کھان۔ خان خاناں، جائسی اور بھیت کا کام نہایت احترام سے پڑھا جاتا ہے۔ گلے لگایا جاتا ہے اور ایک عجوبہ مانا جاتا ہے۔

پنجاب میں سات زبانوں کا چلن عام تھا یعنی سنسکرت۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ہندی۔ پنجابی۔ انگریزی۔ ان میں ہر اردو کتابیں لکھی گئی ہیں آج بھی لکھی جا رہی ہیں۔ ان سب زبانوں کے علاوہ ملک کی دوسری زبانیں بھی ہماری ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ سکھ گوروؤں کے کارنامے اور سکھ پوتھیاں ملک کی ہر زبان میں لکھی جائیں۔ امید ہے پنجاب کے رہنے والے غور فرمائیں گے۔ اکادمیاں۔ انجمنیں۔ ادارے۔ بیورو۔ یونیورسٹیاں انسٹی ٹیوٹ توجہ دیں گے۔

یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ پنجاب میں اور پنجاب سے باہر ہر گوروپر برابر رسائل اور اخباروں کے خصوصی نمبر نکلا کرتے تھے مثلاً "آج کل" کا گورونانک نمبر" اور "نگ" ٹپنہ کا گورونانک نمبر آج بھی نکلتے ہیں۔

اب وہ نقشہ ملاحظہ ہو جس سے عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں سکھ گوردوار اور سکھ پوتھیوں کا خاکہ سامنے آئے گا۔

عربی میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱	مرقات العرفات جپ جی	گور دیال سنگھ مجذوب دہلی	کتابی سائز ۴۰ صفحات چھپی ہوئی ہے۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲	طمانینۃ النفس سکھ منی صاحب	ایضاً	مخطوطہ۔ ابھی چھپی نہیں۔ کچھ صفحات مخطوطہ کے نابھوی کے پاس ہیں۔
۳	حضرت بابا نانک سے وابستہ چند عکسی تصویریں	ایضاً	چھپی ہوئی۔ ۱۴ عربی قطعات ہیں۔

فارسی میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱	سحر سرود	گلونت سنگھ	ترجمہ جپ جی متن پنجابی در نثر فارسی۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲	ظفر نامہ		محکمہ السنہ بیت کتابی سائز ۱۴۴ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۳	در مدح گورو صاحبان	منشی گوبند رام	گل گشتی کتاب میں شامل ہے۔
۴	ظفر نامہ گورو گوبند سنگھ سپاہی زادہ منظوم	خوشی رام عارف	دیکھیے ترجمہ ہائے فنون فارسی زبان ہا پاکستان مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۵	جنم ساکھی		دیکھیے کیٹلاگ پرشین مخطوطات علیگڑھ مسلم یونیورسٹی صفحہ ۱۱۹
۶	رسالہ نانک شاہ	بدھ سنگھ کھتری	" " " " صفحہ ۱۱۰
۷	جنم ساکھی	خواجہ عبدالحکیم	گنڈا سنگھ کلکشن۔ ببلیوگرافی مرتبہ گنڈا سنگھ صفحہ ۱۳۴۱
۸	جامع التواریخ	فقیر محمد	نولکشور پریس کانپور ببلیوگرافی (گنڈا سنگھ) صفحہ ۱۶
۹	ظفر نامہ	مرتب مرزا خورشید عالم	کواپریٹو سٹیم پرنٹنگ پریس لاہور۔ ۱۶ صفحات کتابی سائز۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۰	ظفر نامہ	مترجم نانک چند ناز	نابھوی کے پاس ہے۔ ڈیمائی سائز۔ ۱۴۲ صفحات۔
۱۱	گنج آسائش		ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۱۲	محیط اعظم ترجمہ پوتھی جنم ساکھی براحوال گورو نانک	راجس کھتری	دیکھیے فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان۔ جلد اول صفحہ ۳۶۰ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۳	نغمہ عرفان ترجمہ جپ جی صاحب	نہال سنگھ عفیف	نمبر ۴۰۲ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۱۴	ظفر نامہ گورو گوبند سنگھ	خوشی رام عارف	چھاپ لاہور مطبع قومی پنجاب ۱۲۳۲ ہجری۔ دیکھیے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
			ترجمہ ہائے متون فارسی زبان ہائے پاکستان مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
۱۵	جنم ساکھی۔ گورو نانک دیو		کیٹلاگ پرشین مخطوطات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صفحہ ۱۱۹ نمبر ۴۶۸ نستعلیق
۱۶	سوانح عمری گورو نانک دیو	خواجہ عبدالحکیم	مخطوطہ، ۱۶ A bibliography of Pli by Dr. Gonda singh..
۱۷	تاریخ گوبند سنگھی		فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد دہم صفحہ ۷۴۵ نمبر ۱۹۸۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔
۱۸	دیوان نند لال گویا	نند لال گویا	اس کتاب میں گورو صاحبان کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔
۱۹	جپ جی صاحب	لکشبیر سنگھ مضطر تابھوی	یہ کتاب ایران میں چھپی۔ سائز "۶ x "۹ ۱۹۶۵ء ۲۷۵ صفحات۔ اشعار ۷۵۰
۲۰	بحر طویل	سری گورو بابا نانک صاحب	فہرست مشترک خطی ہائے فارسی جلد چہارم مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نمبر ۳۸۸۲
۲۱	جامع التواریخ	فقیر محمد	نولکشور پریس کانپور ۱۸۸۵ء۔ اس میں گورو گوبند سنگھ کے کارنامے درج ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
			دیکھیے صفحہ ۷۱ A descriptive bibliography of Guru Govind singh.
۲۲	ترجمہ جپ جی صاحب	لکشبیر سنگھ مضطر نابھوی	در نثر فارسی۔ معہ دیباچہ مختصر در فارسی ۱۹۶۵ء / ۱۹۶۹ء
۲۳	ترجمہ منظوم سکھ منی صاحب	do	۱۹۵۴ء
۲۴	فرہنگ جپ جی صاحب	do	معہ اصطلاحات و معانی و تشریح بزبان فارسی ۱۹۶۹ء
۲۵	سنگورنامہ	do	از سنہ ۱۹۵۴ تا سنہ ۱۹۶۳ ۔ ۴۰ نظمات در مدح گورو صاحبان
۲۶	سنگورنامہ	do	۶ اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء ۵۶ نظمات معہ مثنوی جمال و اجمال گورو صاحبان
۲۷	سنگورنامہ	do	۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۵ء معہ ایثار شہادت و تراجم و اقتباسات
۲۸	مدحت سنگورو و جنگ نامہ بھگانی	do	۱۹۷۳ء ۱۴۰۰ اشعار
۲۹	قصیدہ مرصع در مدحت سنگورو	do	دریک قافیہ ۱۲۵۲ اشعار ۸" x ۱۰" سائز

اردو میں سکھ گوردوار سکھ پوتھیاں

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱	گورو گرنتھ صاحب	بھائی جوہر سنگھ گیانی	۱۹۰۶ء نولکشور پریس لاہور جہازی سائز ۲۲۲۰ صفحات، نابھوی کے پاس ہے۔
۲	گورو دسم گرنتھ صاحب	پنڈت سکھ لال	۱۹۷۱ بکرمی ۔ جہازی سائز ۸۲۹ صفحات نابھوی کے پاس ہے ۔
۳	پوتھی سکھ منی صاحب		مطبع مصطفائی لاہور متن بڑا سائز ۴۸ صفحات، سال درج نہیں ۔ نابھوی کے پاس ہے ۔
۴	پوتھی رہراس		مطبع مصطفائی لاہور ۱۸۸۱ء متن بڑا سائز ۱۶ صفحات نابھوی کے پاس ہے ۔
۵	پوتھی جپ جی صاحب		مطبع مصطفائی ۱۸۸۱ء متن بڑا سائز ۱۲ صفحات نابھوی کے پاس ہے ۔
۶	پوتھی آنند جی		مطبع مصطفائی لاہور ۱۸۸۱ء متن بڑا سائز ۱۲ صفحات نابھوی کے پاس ہے ۔
۷	پوتھی سدگوشت		مطبع مصطفائی ۱۸۸۱ء متن بڑا سائز ۱۶ صفحات، نابھوی کے پاس ہے۔
۸	پوتھی سکھ منی		مفید عام پریس ۱۸۹۵ء متن بڑا سائز ۴۴ صفحات، نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
	پوتھی آساوی وار		مطبع مصطفائی لاہور ۱۸۸۱ء بڑا سائز متن صفحات ۱۶ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۰	دیکھو جپ جی		مطبع وکٹوریہ پریس ۱۸۸۸ء بڑا سائز، متن صفحات ۱۲ ــ نابھوی کے پاس ہے
۱۱	امیائے سعادت یعنی ضمیمہ و شرح و ترجمہ جپ جی صاحب	سردار گورمکھ سنگھ	مطبع راجندر پریس پٹیالہ ۱۹۰۸ء بڑا سائز متن صفحات ۱۹۷ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۲	وچنڈ ناٹک	"	چھوٹا سائز متن ۸۰ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۱۳	جپ جی شبد ہزارے	"	" ۲۵۳ صفحات "
۱۴	سندر گٹکا	"	بڑا سائز متن ۷۶ " "
۱۵	جپ جی صاحب	بھائی ناہر سنگھ	
۱۶	جپ جی صاحب	بخشی گورچرن سنگھ	اکتوبر ۱۹۲۳ء بڑا سائز۔ ۱۰۰ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۱۷	جپ جی صاحب	سید حبیب	یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو لکھی گئی۔ ڈیمائی ۵۲ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۱۸	جپ جی صاحب	خواجہ دل محمد	ڈیمائی "
۱۹	سکھمنی صاحب	"	" "
۲۰	گورو گھر کی رام بھگتی	کنور رام ناتھ موہن	۱۹۳۳ء ۱۶ صفحات ـ راولپنڈی "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۲۱	جپ جی صاحب	زبیدہ بیگم	پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ بڑا سائز ۱۶۰ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۲۲	جپ جی سکیٹ	پنڈت نرائن سنگھ گیانی	بڑا سائز ۳۰۹ صفحات نابھوی کے پاس ہے۔
۲۳	شبد شلوک قانوری محلہ		" ۹۶ " "
۲۴	شری گورونانک درشن	سومناتھ مہتہ	نومبر ۱۹۶۹ء چھوٹا سائز ۸۰ صفحات۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۵	سچے بول	گوپال متل	۱۹۸۷ء بڑا سائز۔ اردو اور ہندی دونوں میں ۷۰ صفحات، نابھوی کے پاس ہے۔
۲۶	پوتھی نادون اکھری		مطبع مصطفائی لاہور ۱۸۸۱ء صفحات ۱۶، نابھوی کے پاس ہے۔
۲۷	نانک چرتر	ملکراج بھلہ	۱۹۶۱ بکرمی۔ کتابی سائز ۲۷۴ صفحات۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۸	گورونانک		۸۸ صفحات کتابی سائز کپور اینڈ سنز لاہور، نابھوی کے پاس ہے۔
۲۹	یگ پرش گوروگوبند سنگھ	رنبیر سنگھ	۲۵۶ صفحات ڈیمائی سائز نابھوی کے پاس ہے۔
۳۰	گوروگوبند سنگھ جی کا جیون چرتر	دولت رائے	۱۹۰۱ء لاہور رفاہ عام پریس ڈیمائی سائز ۲۹۶ صفحات، نابھوی کے پاس ہے۔
۳۱	اہنسا کا اوتار گورو تیغ بہادر صاحب	نظر سوہانوی	ڈیمائی سائز بھائی ویر سنگھ سدن دہلی میں ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۳۲	گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کی نظم سوانح عمری	دوارکا پرشاد افق	ڈیمائی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن دہلی میں ہے
۳۳	تذکرہ گورو نانک	لچھمی نرائن	دیکھیے لچھمی نرائن شفیق از ساجد زیدپوری صفحہ ۱۰۱ نابھوی کے پاس ہے۔
۳۴	جپ جی آدگورمانی	کرتار سنگھ دت	۱۰۳ صفحات کتابی سائز بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۳۵	پیغام صدق وصفا	خواجہ محمد عبدالحی علیگ	۲۱۱ صفحات ڈیمائی سائز بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۳۶	رہنمائے دیدار حق حصہ اول	بابا ہری سنگھ	۳۰۴ صفحات ڈیمائی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۳۷	جپ جی صاحب	گنڈا سنگھ مشرقی	۲۳۲ صفحات ڈیمائی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۳۸	وردِ حق۔ جپ جی صاحب	لال سنگھ آنند خالص	۸۸ صفحات کتابی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۳۹	گنج ستائش	نہال سنگھ عفیف	۱۰۶ صفحات کتابی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۰	بابا نانک کی سوانحعمری	شیخ محمد یوسف	۱۶۰ صفحات ڈیمائی سائز۔ بھائی ویر سنگھ سدن نئی دہلی۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۴۱	جپ جی و شبد ہزارے	ہیرا سنگھ	۱۸۴ صفحات کتابی سائز۔ بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۲	گورو گوبند سنگھ جی کا کلام متبرک	ہیرا سنگھ	۱۴۴ صفحات کتابی سائز۔ بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۳	نانک منظوم سوانح گورو نانک دیو	از منتظر گوجرانوالہ[1]	۱۳۵۹ ہجری ۔۔۔ ۲۰۰ صفحات کتابی اردو بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۴	صراط مستقیم ۔ راہ راس اور کیرتن سوہلا	مولانا منظور احسن صاحب	۱۹۲۷ء ۔ ۵۲ صفحات کتابی سائز بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۵	ذکر نانک	اندرجیت گاندھی	۱۳۵ صفحات ڈیمائی سائز۔ بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۶	پیغمبروں کے سرتاج کلغی دھر مہاراج	بھائی سیوا سنگھ	۸۷ صفحات ڈیمائی سائز۔ بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۷	دشمش تپا	الفت امین آبادی	۲۵۵ صفحات کتابی سائز۔ بھائی دیر سنگھ سدن نئی دہلی۔
۴۸	سکھمنی صاحب	الفت امین آبادی	۲۲ صفحات بڑا سائز۔ "
۴۹	قصیدہ در توصیف شری گورو نانک	مہاتما نرنجن داس	نابھوی کے پاس ہے

[1] رام لعل صاحب خط شکست لکھنے کے عادی ہیں اس لیے بعض کتابوں اور مصنفین کے نام نہیں پڑھے جا سکے اور ممکن ہے کہ بعض غلط لکھ گئے ہوں۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلف	کیفیت
۵۰	جپ جی صاحب کا بھاشہ	فقیر سرداری لال	۱۱۱ صفحات چھوٹا سائز تر بھون لائبریری میں ہے۔
۵۱	تیسری پادشاہی کی جنم ساکھی		۴۶ صفحات کتابی سائز ۱۹۰۹ء رام دتا مل اینڈ سنز پنجاب یونیورسٹی ریفرنس میں ہے۔
۵۲	گٹکا سکھ منی صاحب		۱۱۲ صفحات چھوٹا سائز ۱۹۳۵ء بھائی تارا سنگھ اینڈ سنز پنجاب یونیورسٹی ریفرنس میں ہے۔
۵۳	ترجمہ جپ جی صاحب	ماسٹر بھگت سنگھ گیانی	صفحات ۷۶ ڈیمائی سائز ویدپرکاش ایجنسی امرتسر پنجاب یونیورسٹی Ref سکشن میں ہے۔
۵۴	پیام نانک	مہدی نظمی	۱۲۷ صفحات ڈیمائی سائز۔ پنجابی یونیورسٹی میں ہے۔
۵۵	گورو گوبند سنگھ	از ہربنس سنگھ مترجم ڈاکٹر محمد حسن	۲۳۸ صفحات بڑا سائز پنجابی یونیورسٹی میں ہے۔
۵۶	گورونانک پرکاش		مطبع آفتاب لاہور ۱۸۹۱ء حجازی سائز صفحات ۳۰۲ ڈسٹرکٹ لائبریری سنگرور
۵۷	نذر نانک	مہدی نظمی	۲۲۲ صفحات کتابی سائز پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۵۸	گورو نانک درشن	پنڈت دواس قمر	لاجپت رائے بھون لائبریری
۵۹	بابا گورو نانک	تاجور نجیب آبادی	" "
۶۰	سکھ منی صاحب	بسمل دہلوی	" "
۶۱	گورو گرنتھ صاحب اور اردو	عباد اللہ گیانی	پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔ گنڈا سنگھ کلکشن
۶۲	سوانح عمری گرو نانک دیوجی	دیارام عاکف	" "
۶۳	رہ نجات منظوم ترجمہ جپ جی	سادھو سنگھ سادھو	۱۹۳۹ء گنڈا سنگھ کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۶۴	پہلی پادشاہی کی جنم ساکھی	دیارام	"
۶۵	جنم ساکھی شری گورو نانک دیوجی	دولت رائے	۱۹۰۱ء "
۶۶	سکھ قوم اور اس کے بانی کی نسبت مسلمانوں کی محبت آمیز رائے	حسن نظامی	خواجہ پریس ۱۹۲۲ء "
۶۷	جیون چرتر۔ گورو تیغ بہادر	پنڈی داس	۱۹۲۳ء "
۶۸	گورو صاحب اور دھم		وزیر ہند پریس امرتسر "
۶۹	جنم ساکھی گورو گوبند سنگھ		"

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۷۰	گوربلاس		لاہور گنڈا سنگھ کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۷۱	جنم ساکھی۔ گورونانک صاحب		"
۷۲	جپ جی صاحب		۵۰ صفحات "
۷۳	روح مقدس عرف کلغی دھر گورو گوبند سنگھ کی مکمل و جامع سوانح حیات	بسمل آر۔ پی	"
۷۴	ارض دیو۔ گورو گنج آسایش		طہران "
۷۵	گورونانک	ہربنس سنگھ	"
۷۶	بابانانک کا مذہب	محمد یوسف	۱۹۱۶ء "
۷۷	حق سرہ۔ یعنی کلیات تیغ بہادر	منظور حسن مترجم	۱۹۳۰ نمبر ۵۹ بھائی دت سنگھ۔ بھائی تخت سنگھ کلکشن۔ پنجابی یونیورسٹی
۷۸	نیا نذر اگیں مسدس در مدح مبارک حضرت باباگورونانک صاحب		بہ نمبر ۱۴۴ اشوک کلکشن "
۷۹	سرباز ازرا ہد گورو گوبند سنگھ	نہال سنگھ عفیف	بہ نمبر ۴۰۰ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۸۰	شہیدان معصوم	نہال سنگھ عقیف	بہ نمبر ۱۸۰ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۸۱	گورو نانک	منتظر	〃 〃
۸۲	گورو نانک ہندو نہیں تھے تو سکھ کیسے ہونگے؟		کراچی بہ نمبر ۳۰۵ 〃 〃
۸۳	دعائے سحری ٹیکہ جپ جی صاحب	کرتار سنگھ مترجم	بہ نمبر ۲۷۹ 〃 〃
۸۴	گورو نانک دیو کا فلسفۂ توحید		بہ نمبر ۲۲۱ 〃 〃
۸۵	ہمارا نانک	عباد اللہ گیانی	بہ نمبر ۲۲۲ 〃 〃
۸۶	گورو نانک جی	〃	بہ نمبر ۲۲۵ 〃 〃
۸۷	جپ جی صاحب	چھٹن لال	بہ نمبر ۱۱۷ 〃 〃
۸۸	جپ صاحب	سوکتری	حیدرآباد سندھ میں چھپی۔ بہ نمبر ۱۰۵ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۸۹	وردنجات		شلوک محلہ نواں اور اس کا آسان ترجمہ۔ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی
۹۰	حمد نانک	بلونت سنگھ فیض	〃 〃
۹۱	ارض دیو گورو۔ کلام حقانی سکھ منی صاحب کا ترجمہ		نمبر ۱۹ 〃 〃

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۹۲	ارض دیو گورو گوبر احت منظوم ترجمہ سکھ منی صاحب		بہ نمبر ۲۰ اشوک کلکشن پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ
۹۳	جیون چرتر گورو گوبند سنگھ	آنند کشور مہتہ	ودمن اینڈ کمپنی لاہور صفحہ ۱۷۲ A.bibliography of Pb. by Gonda singh.
۹۴	پنج شہید	بھگوان سنگھ عارف	سادھو آشرم بھلوول صفحہ ۱۷۵ A.bibliography of Pb. by Gonda singh.
۹۵	گورونانک دیوجی کی سوانح عمری	حکیم رام کشن لاہور	A.bbliography of Pb. by Gonda singh.
۹۶	جپ جی ۔ جنم ساکھی اور گوربلاس	ہر سکھ رائے گوبند سہائے	صفحہ ۱۸۰ A.bibliography of Pb. by Gonda singh
۹۷	جپ جی ترجمہ	مدھوسودن سنگھ	صفحہ ۱۸۲ " " "
۹۸	سری گورو گوبند سنگھ کے نونہال	شمشیر سنگھ	پستک بھنڈار لاہور ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۸۷ A.bibliography of Pb. by Gonda singh.
۹۹	تحفہ پرمانندی ۔ گہری تحقیق ESSAYS ON Guru Nanak.		گوپال کرشن اینڈ کمپنی ملتان صفحہ ۲۴۲ A.bibliography of Pb. by Gonda singh

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۰۰	نانک۔ سوانح گورونانک	محمد عبداللہ منتظر	A.bibliography of Pb. by Gondasingh.
۱۰۱	ترجمہ جپ جی صاحب	منشی گنڈا سنگھ	بھائی دیا سنگھ اینڈ سنز لاہور
۱۰۲	بہارا المواج دشہادت بچگان گورو گوبند سنگھ	انصاری محمد علی خاں	Guru Govind singh a de-scriptive bibliography Page-147
۱۰۳	تاریخ دسم گورو صاحبان	للت سنگھ گیانی	چتر سنگھ جیون سنگھ امرتسر Guru Govind singh a descriptive bibliography page 95
۱۰۴	گورو گوبند سنگھ جنم ساکھی	رام کشن حکیم	لاہور۔ پرکاش سٹیم پریس ۱۹۱۹ صفحہ ۸۹ Guru Govind singh a descriptive catlogae
۱۰۵	سکھ گورو	رادھا کرشن پنڈت	سال ۱۸۶ء گوشہ پنجاب لاہور۔ مفتی محمد دین صفحہ ۸ سے ۲۲۔ do
۱۰۶	حدیقۃ القلم	مرتضیٰ حسین اللہ یار عثمانی	نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۱۴۸۔ do.

(باقی)

معارف کی ڈاک

دفتر اردو دائرہ معارف اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی لاہور

۲۶-۱۲-۹۲ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

گرامی نامہ پرسوں ملا تھا۔ حالات سے اطلاع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

لاہور کی تمام مسجدوں میں نمازوں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت اور سلامتی و عافیت کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے خلاف ہمارے ہاں جو ردّ عمل ہوا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو آپ کے ہاں بلاوجہ ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ہوا۔ ہمارے ہاں سب سیاسی اور دینی جماعتوں نے مندروں کے توڑنے کی مذمت کی ہے کیونکہ ان مندروں میں مدارس و مکاتب قائم تھے اور بعض غریب غربا بھی وہیں رہایش رکھتے تھے۔

ہمارے وزیر اعظم نے مندروں کی دوبارہ تعمیر اور مرمت کا اعلان کیا ہے۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی چھ جلدوں کی اصل قیمت تقریباً چودہ سو روپیے ۱۴۰۰ اور رعایتی آٹھ سو ۸۰۰ روپیے ہے۔ یہ رعایت صرف یونیورسٹی استادوں کو ملتی ہے۔

اگر آپ کے ہاں سے کوئی شخص یہ جلدیں لے جا سکتا ہے تو یہ عین مناسب ہوگا جیسا کہ صباح الدین مرحوم لے گئے تھے۔ معمولی ڈاک سے بھیجنا کار دشوار ہے۔

لاہور آنے سے ایک ہفتہ پیشتر مجھے اطلاع دیں تاکہ میں یہ جلدیں رعایتی قیمت پر خریدنے کا انتظام کرسکوں۔

آپ کے نیازمندوں[1] کا دھیان ہر وقت آپ کی طرف رہتا ہے اور سب آپ کی سلامتی کے لیے دعاگو ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم[2] صاحب کل ہی آپ کا ذکر خیر فرما رہے تھے۔ انھوں نے معارف کا سالانہ چندہ بھیج دیا ہے۔ اگر مولانا حبیب الرحمن اعظمی مرحوم کے بڑے بیٹے مولوی رشید احمد صاحب آپ کو ملیں تو میری طرف سے سلام کہیے۔ فقط والسلام

نیازمند نذیر حسین

(۲)

شکاگو (امریکہ)

۱۴ جنوری ۱۹۹۳ء

محترمی و مکرمی جناب اصلاحی صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب گرامی مورخہ ۲۸ دسمبر وصول ہوا، شکریہ۔

اکتوبر ۱۹۹۲ء کے معارف میں "اندلس کی اسلامی میراث" خصوصی شمارہ فکر و نظر پر تبصرہ دیکھا تھا۔ میری ایک رشتہ دار اسلام آباد گئی تھیں۔ ان سے اسے منگوانے پر معلوم ہوا کہ پرچہ ایک ہزار کی تعداد میں شایع ہوا تھا، اسٹاک ختم ہوچکا ہے۔ طبع ثانی کی معلوم ہوتا ہے نوبت نہیں آئی۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ کیا آپ کی جانب سے طبع ثانی کی تجویز پیش کی جاسکتی ہے۔ میری جانب سے کوئی تجویز موثر ثابت نہ ہوگی۔

---

[1] یہ شیخ صاحب کی خورد نوازی اور عزت افزائی ہے ورنہ خاکسار تو خود ان کا نیازمند ہے [2] شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کے خویش۔

ڈاکٹر غازی[1] آج کل شکاگو سے باہر ہیں۔ غالباً دو تین ہفتوں کے بعد واپس ہوں گے۔

حکومت ہند کے متضاد بیانات نے مسجد کے تنازعہ کو عقدۂ لاینحل بنا دیا ہے، فریقین کے نزدیک اب یہ وقار کا مسئلہ ہے جس کا حل بعید سے بعید تر ہوتا جا رہا ہے۔ حکومت کا ناخنِ تدبیر ان حالات میں نزاع کی گرہ کشائی سے عاجز ہے۔ تحقیق مزید کی یہ تجویز کہ بابر نے ایودھیا میں رام مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کی ہے حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ آپ کو علم ہے کہ کم و بیش (۲۰) ہندو محققین اور مورخین نے متحدہ طور پر اس عنوان پر تحقیق کی ہے اور نتیجۂ تحقیق شایع کیا کہ سرے سے ایودھیا رام چندر جی کی جنم بھومی نہیں رہا اور نہ وہاں کوئی مندر تھا جس کو منہدم کر کے بابر کو مسجد تعمیر کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس کے ایک فوجی افسر میر باقی نے مقامی باشندوں کے لیے کھلی اراضی پر مسجد بنائی۔ واقعہ یہ ہے کہ راشٹر پتی بھون سے لے کر ناکہ کے ایک پولیس کانسٹبل تک اسلام دشمنی میں متحد ہیں۔ اسلام کے بر درج مشیدہ پر اس نوع کے بہت دور گزر چکے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہے۔

اب صرف ان کی ہمت کا امتحان ہے جو اس کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں۔

مخلص سعید صدیقی

(۳)

اصلاحی دواخانہ۔ بمبئی۔

۲ فروری ۱۹۹۳ء

برادر عزیز سلام مسنون

عنایت نامہ جس پر کوئی تاریخ درج نہ تھی ملا اور سکونِ قلب کا باعث بنا۔ ہمارا شرط کی یہ واحد یونانی فیکٹری طب دشمنوں اور شرپسندوں کی نظروں میں عرصہ سے کھٹک رہی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر عبید اللہ غازی جو مولانا حامد الانصاری غازی کے بڑے فرزند اور شکاگو میں مقیم ہیں۔

اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے، ہم بھی ایک سال سے اس جگہ کو بدلنے کی کوشش میں لگے تھے لیکن کہیں قریب میں اتنی بڑی جگہ نہ مل سکی۔ لیکن اسی خطرہ کے پیش نظر ۱۲-۱۳ کباٹوں میں بھری ہوئی اپنی کتابیں دوا رکاپوری کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایک سال پہلے ہی اٹھا لائے تھے کہ اور نقصانات کی تلافی تو آسانی سے ہو سکے گی لیکن عمر بھر کی اس کمائی کی تلافی اب آخر عمر میں ممکن نہیں۔ دشمنوں نے ۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو نہایت منصوبہ بند طریقے سے فیکٹری کو لوٹا۔ پہلے الکٹرک لائن، پائپ لائن اور ٹیلی فون لائن کاٹی۔ بڑے پھاٹک توڑے اور اندر کے اکثر دروازے کھول کر اٹھالے گئے جب فیکٹری ہر طرف سے کھل گئی تو پولیس کی نگرانی میں جس کا جو جی چاہا اٹھالے گیا۔ پنکھے۔ ٹیوب لائٹ۔ ہر طرح کے برتن۔ شہد۔ شکر۔ دوائیں۔ چھوٹی مشینیں۔ میز اور کباٹ وغیرہ یہ سب نہایت اطمینان سے گاڑیوں پر لاد کر لیجائے گئے۔ وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ اور پولیس کمشنر سب کو اطلاع دی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا، احمد ذکریا اور وزیر ہاؤسنگ جاوید خاں کے ساتھ وزیر اعلیٰ کے گھر گئے۔ ساری صورت حال بتائی لیکن سب بے سود۔ ایسا محسوس ہوا کہ ظالم شیوسینکوں کے سامنے سب بے بس و مجبور ہیں۔ ۲۰ دسمبر کو چالیس پچاس ہزار لگا کر نئی موٹریں وغیرہ خریدیں تاکہ دوا سازی کا کام پھر سے شروع ہو سکے۔ ۷ جنوری کو جب دوسری بار فساد شروع ہوا تو شرپسندوں نے اندر گھس کر فیکٹری میں آگ لگادی اور جو کچھ بچ گیا تھا اسے بھی جلا دیا۔

حکیم محمد ضیاء[1] کے بڑے لڑکے حکیم محمد سعید اسی موقع پر فیکٹری گئے تو ان پر شیوسینکوں نے تلوار سے قاتلانہ حملہ کیا۔ زخمی حالت میں بھی انھوں نے دشمن سے تلوار چھین لی اور اس کو بھی زخمی کیا تو وہ سب بھاگ گئے ورنہ بچنا مشکل تھا۔ خون میں لت پت یہ ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ بہت زیادہ خون چڑھایا گیا تو حالت سنبھلی اور خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔

---

[1] حکیم صاحب کے بڑے صاحبزادے۔

اور زخم تو بھر گئے لیکن ہاتھ کا زخم جو گہرا تھا وہ ابھی بھر نہ سکا۔ ان کی اہلیہ حیدرآباد تھیں اس لیے وہ حیدرآباد چلے گئے۔ تقریباً دو ماہ سے فیکٹری کے کارکنان بیکار بیٹھے ہیں۔ کوشش میں ہیں کہ فیکٹری دوبارہ کھلے اور کام شروع کیا جائے۔

انشاء اللہ آپ جیسے مخلصین کی دعائیں رنگ لائیں گی۔ حالات خوشگوار ہوں گے اور ظالموں کو ان کے ظلم کا بدلہ ملے گا۔ گھر کے لوگ سلام کہتے ہیں۔ ٹیکیسی منس کالونی کے لوگ اور مولانا مستقیم وغیرہ بخیریت ہیں۔ البتہ حاجی شمس الدین صاحب بھنور کی فیکٹری کو زیادہ نقصان پہنچا۔

خیر اندیش مختار

(۴)

دہلی یونیورسٹی۔ ۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء

محب مکرم، سلام مسنون

۵ دسمبر کا لکھا ہوا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ جواب میں ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا، سارے ملک میں جو شیطان کا رقصِ عریاں ہوا ہے اس کی مذمت کے لیے کسی قاموس میں کوئی لفظ نہیں مل سکتا۔ اللہ منتقمِ حقیقی ہے، اسی سے ہماری التجا ہے۔

آپ کا مضمون تصاویر کے انتظار میں رکا ہوا ہے۔ خطاطی کے نمونے تو بہت سے مل سکتے ہیں' حیات شبلی' کی تلخیص شایع ہوگئی ہے، اس کی رائلٹی کا چیک دارالمصنفین کے نام سے بھجوایا گیا ہے ملا ہوگا۔

معارف کے لیے کوئی مضمون جلد بھیجوں گا۔ انشاء اللہ۔

کتاب " نقد ملفوظات " کا ایک نسخہ اور بھیج دوں گا۔ آپ اس پر قدرے تفصیل سے تبصرہ کر دیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ والسلام والاکرام۔

مخلص نثار احمد فاروقی

(۵)

اندھیری۔ بمبئی۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۳ء

محترمی! السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بڑی ڈھارس بندھی۔ سننے اور پڑھنے میں تو یہ آیا ہے کہ تقسیم کے دوران غارتگری، قتل اور لوٹ پاٹ کا بازار گرم ہوا اور حیوانیت انسانیت پر غالب آگئی تھی لیکن ۷ جنوری سے لے کر ۱۳ جنوری تک ہم نے بمبئی میں جو کچھ دیکھا وہ یقیناً تقسیم کے دنوں سے بہت زیادہ تھا۔ مولانا اب کیا بتائیں کہ ہم پر اور بال بچوں پر کیا بیتی۔ فساد کا جھونکا گھر کے دروازے تک تھا۔ گھر میں بند اللہ اللہ کرتے، صبح سے شام اور شام سے صبح کیا، بچ گئے اسے خدا کا کرشمہ ہی کہنا چاہیے۔ ویسے کہنے کو تو امن ہے لیکن ایک عجیب طرح کا خوف دل پر چھایا ہوا ہے۔ دونوں طبقوں کے درمیان خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے اس خلیج کو پاٹنے کا کام تو اب خدا ہی کر سکتا ہے۔

بچے بہت پریشان ہیں۔ کہتے ہیں بس اب ایک دن بھی بمبئی میں نہیں رہنا ہے۔ لیکن ملازمت چھوڑی نہیں جاتی آخر روزی روٹی کا معاملہ جو ٹھہرا۔ بچوں کی تعلیم ادھوری رہ جائیگی۔ کسی طرح دو تین سال اور گزر جاتے تو بہتر تھا۔ لیکن اب ہندوستان میں کون سی جگہ محفوظ ہے۔ فساد کے شعلے کب کہاں بھڑکائے جائیں گے کچھ کہا نہیں جا سکتا پورا ملک بوسنیا کے انداز پر گامزن ہے۔ بچے آپ کو سلام عرض کر رہے ہیں گھر میں سب کو میرا اور اہلیہ کا سلام عرض کر دیجئے اور ادارے کے تمام حضرات کو بھی سلام کہیں۔

نیازمند

محمد ایوب واقف

بھیونڈی۔ تھانہ۔ بمبئی۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۲ء

(۶)

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نومبر ۹۲ء کے معارف میں مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے مکاتیب شایع کیے گئے ہیں۔ اس میں صفحہ ۳۸۰ پر "سیر اعلام النبلاء" سے امام ذہبی کی جو عبارت نقل ہوئی ہے، اس میں امام ذہبی نے سجدۂ قبر کو "فعل حسنا و سیئا" (اچھا اور برا کام) لکھا ہے[1]۔ جبکہ قبر کو سجدہ

---

[1] امام ذہبی کی عبارت پر سیاق و سباق کی روشنی میں مزید غور کرنے کی ضرورت ہے، انھوں نے پہلے ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جو حجرہ مقدسہ کے پاس جا کر بارگاہ نبوی میں مشروع طریقہ پر صلوٰۃ وسلام پیش کرتا ہے اور کسی خلافِ شریعت امر کا مرتکب نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کے متعلق امام صاحب کا ارشاد ہے کہ فیا طوبیٰ لہ فقد احسن الزیارۃ واجمل فی التذلل والحب مزید فرمایا کہ اس شخص کی عبادت اس شخص سے زیادہ ہے جو اپنی سرزمین ہی میں رہ کر آپ کی بارگاہ میں درود وسلام بھیجتا ہے، اس بنا پر کہ زائر کو روضۂ مبارک کی زیارت کا بھی اجر ملے گا اور درود وسلام پیش کرنے کا بھی۔ اس کے مقابلہ میں جو لوگ وہاں جانے کے بجائے اپنے اپنے شہروں سے آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں انھیں صرف اسی کا اجر ملے گا اور وہ اجر زیارت سے محروم رہیں گے۔

اس کے بعد وہ دوسرے شخص کا تذکرہ کرتے ہیں جو غیر مشروع طور پر زیارت کرتا ہے چنانچہ امام موصوف نے اس کے تین غیر شرعی اعمال بیان کیے ہیں واساء ادب الزیارۃ او سجد للقبر او فعل مالا یشرع، تو اسی کے بارے میں فرماتے ہیں فھذا فعل حسنا و سیئا یعنی اس نے اچھا اور برا دونوں کام کیا، قرآن مجید میں ہے وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ پر)

کرنا بالاتفاق شرک جلی ہے جس کے بارے میں قرآنی فیصلہ یہ ہے کہ "جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا اس پر اللہ نے جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے" (سورۂ مائدہ ۷۲) نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے (بخاری، کتاب الجنائز) پھر ایسے فعل قبیح کے مرتکب کو محب اللہ و محب رسول کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ رہا حضرت علیؓ کے پوتے حسن بن حسن کے ایک زائر پر نکیر کرنے کا واقعہ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ تقریباً ایسا ہی واقعہ حافظ ضیاء المقدسی نے اپنی کتاب "المختارۃ" میں درج کیا ہے:

عن علی بن الحسین رضی اللہ	حضرت علی بن حسین (امام زین العابدینؒ)
عنه انه رأی رجلا یجیئ الی	سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو
فرجة کانت عند قبر النبی	دیکھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر
صلی اللہ علیه وسلم فید خل	کے پاس موجود ایک سوراخ کے پاس
فیها فیدعو، فنهاه وقال: الا	آتا اور اندر داخل ہو کر دعا کرتا ہے
احدثکم حدیثا سمعته من	تو انھوں نے اسے منع کیا اور فرمایا: کیا
ابی عن جدی عن رسول اللہ	میں تمھیں ایک حدیث نہ سناؤں جو

(بقیہ) وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (توبہ: ۱۰۲)

مطلب یہ ہے کہ نفس زیارت کر کے اس نے اچھا کام کیا مگر سوئے زیارت یا سجدہ قبر یا غیر مشروع عمل کر کے وہ (فعل سیئ) کا مرتکب ہوا اس لیے آگے فرمائے میں فیصلہ بہ رفق واللہ غفور رحیم یعنی اسے ہلکی تنبیہ کی جائے گی کیونکہ وہ ناواقفیت اور جوش محبت میں یہ سب کر گیا ہے، جیسا کہ آگے اس کی مزید توضیح کی ہے (ص)

صلی اللہ علیہ وسلم ، قال :
"لا تتخذوا قبری عیدا، ولا
بیوتکم قبورا، فان تسلیمکم
لیبلغنی اینما کنتم"۔

مجھ سے میرے والد (حضرت حسین) نے
میرے دادا (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
سے سن کر بیان کی ہے ، وہ کہتے تھے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

میری قبر پر جمگھٹا نہ کرنا اور نہ اپنے گھروں کو قبریں بنانا، اس لیے کہ تم جہاں سے بھی مجھ پر سلام بھیجو گے مجھے پہنچ جائے گا"۔

یہ حدیث متصل الاسناد اور مرفوع ہے اور الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب زیارۃ القبور میں بھی موجود ہے۔ لہذا یہ سمجھنا کہ حضرت حسن بن حسن بن علی کی متابعت نہیں ہوئی صحیح نہیں ہے۔ والسلام

محمد خالد پٹیل

(۷)

ذاکر نگر، دہلی۔ ۲ فروری ۱۹۹۳ء

عزیز محترم و مکرم جناب ہلالی صاحب! سلام و رحمت۔

گرامی نامہ ملا۔ یہاں شہر میں Tension بہت ہے اور کرفیو معمول کی بات، اسکا خراب اور مضر اثر روزمرہ کی زندگی پر بری طرح محسوس ہو رہا ہے لیکن فتنہ گروں کی فتنہ سامانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب ہمارا علاقہ بھی ملک و ملت دشمن عناصر کی نظروں میں ہے، دعا فرمایئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر کڑا وقت آپڑا ہے، ہماری زندگی، آبرو، شعائر اسلامی اور ثقافت اسلامی کے آثار و باقیات سبھی کچھ خطرے میں ہے، فاشزم کی بھیانک شکل مختلف صورتوں میں دکھائی پڑنے لگی ہے، ان حالات کا مقابلہ تو بہرحال کرنا ہے۔ لیکن کیسے کیا جائے، یہ ابھی ہماری قوم طے نہیں کر پا رہی ہے، سیاسی جماعتوں کا اصل کھیل 'انتخابی' ہے، انکی نظر الیکشن اور کرسی پر ہے، مسلم اقلیت کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ زندہ رہنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، بھنور میں پھنسی ہے، کشتی اور ناخدا دونوں مفقود ہیں، ایک خدا کا سہارا ہے کہ اسکے فضل و کرم سے کوئی مرد غیب آئے اور اسکا بیڑا پار ہو، یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا مگر شاید عشق کے اور امتحانوں کے بعد۔

آپ کا مخلص، ضیاء الحسن فاروقی

وفیات

آہ! مولوی نور عظیم ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق فرزند اور ہونہار استاد مولوی نور عظیم ندوی چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

وہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے مصر گئے، اردو کی طرح عربی لکھنے اور بولنے کی اچھی مشق تھی اور درس و تدریس کے ساتھ ہی تقریر و تحریر میں بھی اپنا جوہر دکھاتے تھے، جلسوں کی نظامت بڑی خوبی اور سلیقہ سے کرتے تھے، جس سیمینار کی کارروائی وہ چلاتے وہ ضرور کامیاب ہوتا۔ پڑھنے لکھنے کا اچھا ذوق تھا اور اسی میں ان کا سارا وقت گزرتا، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے اردو اور عربی جرائد میں ان کے مضامین وقتاً فوقتاً چھپتے تھے۔ ایک زمانہ میں ندائے ملت کے عملاً وہی اڈیٹر تھے، تعلیم اور دوسرے موضوعات پر اس کے خاص نمبر بھی نکالے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی سرپرستی میں رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے روح رواں مولانا سید محمد رابع ندوی کے یہی دست راست اور رابطہ کے ترجمان کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کے پاس بعض اشخاص اور اکیڈمیوں کے مسودے تبصرے یا اصلاح کے لیے آتے تھے جن کو بڑے غور و توجہ سے پڑھتے، تحریر کی خوبیوں اور خرابیوں پر ان کی نظر فوراً پڑتی۔ اس معاملہ میں مولانا علی میاں مدظلہ بھی ان پر اعتماد کرتے تھے۔

ان کا وطن ضلع بستی تھا اور وہ مسلکاً اہل حدیث تھے لیکن ندوۃ العلماء میں شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے تھے، بڑے خاموش طبع، کم سخن، خلیق اور متواضع تھے، انکی عمر پچاس کی رہی ہوگی، آیندہ ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن ابھی اپنی چمک دمک بھی نہیں دکھانے پائے تھے کہ وقت موعود آگیا۔ ع

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے اور انکے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے آمین! "ض"

ادبیات

غزل

از حضرت عروج زیدی مرحوم

"حضرت عروجؔ زیدی مرحوم کی چھٹی برسی پر انکے خلف اکبر جناب عرفان زیدی بدایونی نے مرحوم کی بیاض سے یہ غیر مطبوعہ غزل بھیجی ہے۔ جو ان کے شکریہ کیساتھ نذر قارئین کی جاتی ہے۔ مرحوم نے ۴ فروری ۱۹۸۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔"

وہ شبِ غم سہی کوشش سے اجالا ہوگا
رات کا خون چراغوں میں جلانا ہوگا

میں بھی کہتا ہوں کہ بکھرا ہوا چہرا ہوگا
آپ نے ٹوٹا ہوا آئینہ دیکھا ہوگا

بزمِ دنیا کو میں خود کار نہیں کہہ سکتا
انجمن ہے تو کوئی انجمن آرا ہوگا

دل کی بے تابیٔ پیہم پہ زباں کیا کھولوں
تم نے پارہ تو کبھی آگ پہ دیکھا ہوگا

انقلاباتِ زمانہ کو نہ محدود سمجھ
دیکھ اے چشمِ تماشا! ابھی کیا کیا ہوگا

میں بدلتے ہوئے حالات سے یہ سمجھا ہوں
وہ جیے گا جسے جینے کا سلیقہ ہوگا

آج کے دور میں یہ حرفِ غلط ہیں تو عروجؔ!
گھر کے طاقوں میں اصولوں کو سجانا ہوگا

کلیاتِ شبلی

مولانا شبلیؒ کے اردو کلام کا مجموعہ۔

قیمت۔۔ ۲۵

مطبوعات جدیدہ

اسلام میں سائنس اور تہذیب از جناب ڈاکٹر سید حسین نصر، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و اعلیٰ طباعت، صفحات ۴۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی - ۱۸

ایران کے مشہور صاحب علم و نظر ڈاکٹر سید حسین نصر اپنے بلند پایہ علمی و سائنسی مقالات و تصنیفات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، مستشرقین کے بعض شکوک و شبہات کے رد و ابطال میں ان ہی کے معیار و انداز میں ڈاکٹر صاحب کی تحریریں خاص طور پر بڑی قابل قدر ہوتی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کا اصل مقصد اسلامی علوم کے بعض پہلوؤں کو اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کرنا ہے، فاضل مولف نے تیرہ ابواب میں علم کائنات، طبیعیات، ریاضی، ہیئت، طب، علوم انسانی، علم کیمیا، فلسفہ و کلام اور تصوف جیسے موضوعات کا جائزہ لیا ہے ان کے بقول "ایک ایسی تہذیب کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی روحانی اقدار، ریاضی اور اعلیٰ قسم کی مابعد الطبیعیات سے جکڑی ہوئی ہیں"۔ اسلامی تہذیب پر جمود و تعطل کے مستشرقانہ الزامات کے جواب میں انھوں نے لکھا ہے کہ "گذشتہ تہذیبی میراث اور خود اپنی اختراعی قابلیت سے اسلام نے ایک واضح تہذیب کا تصور پیش کیا جس کے بعد رفتہ رفتہ تبدیلی اور تصرف سے دلچسپی باقی نہیں رہی"۔ اور علوم و فنون میں ایک استحکام پیدا ہو گیا اور یہی وہ استحکام ہے جسے اب جمود اور بانجھ کہا جاتا ہے، کتاب کا ایک اہم باب اسلام کے نظام تعلیم کے متعلق ہے، اس میں فارابی اور ابن خلدون کے نظریات

سے اخذ واستفادہ کے علاوہ شیعہ اور سنی مدارس میں منہج تعلیم کے فرق و امتیاز اور اس کے اسباب پر عمدہ بحث ہے، فلسفہ کے باب میں بھی شیعہ اور سنی انداز فکر کا بنیادی فرق جس پس منظر میں بیان کیا گیا ہے وہ بے حد دلچسپ ہے۔ علمی و سائنسی مباحث کی دقت پسندی کے باوجود مترجمین نے ترجمہ میں سلاست باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، تاہم بعض عبارتوں کو مزید واضح کر دیا جاتا تو کتاب کا نفع بڑھ جاتا مثلاً "اسلام کا مقدس فن ایک تجریدی فن ہے، جس میں لکیر کی لچک کے ساتھ نقش اول پہ زور دیا گیا ہے" "علم ریاضی کی خیالی صورت نے وہ پل باندھ دیا جو مسلمان کثرت اور وحدت کے درمیان تلاش کر رہے تھے"۔ "طریقت ایک ایسا طریقۂ زندگی ہے جو ذاتی اور غیر منظم رابطہ کی سطح پر قائم کیا گیا ہے"۔ "طریقت اور حقیقت کی تہہ میں ایک مابعد الطبیعاتی وجدان ہے جس سے ایک علم کائنات نکلتا ہے اور ایک علم نفس و علم ریاضی" وغیرہ، شروع میں بعض نامور حکمائے اسلام کے حالات و افکار کو بڑی جامعیت سے پیش کیا گیا ہے، حکیم محمد سعید نے بجا طور پہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ہماری تاریخ علم و حکمت کا مظہر و عکاس ہے اور ایک دعوت فکر و عمل بھی ہے، اس بلند پایہ کتاب کو اردو دنیا سے روشناس کرانے کے لیے حکیم صاحب اور ان کا ادارہ لائق مبارکباد ہے۔

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟ از مولانا محمد شہاب الدین ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، کل صفحات حصہ اول و حصہ دوم ۲۵۵، قیمت بالترتیب ۳۰ و ۳۵ روپیے پتہ: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ ۱۶۵، واسرلی، بنگلور، ۵۶۰۰۵۶۔

مولانا شہاب الدین ندوی کا اصل موضوع قرآن اور سائنس ہے لیکن وقتاً فوقتاً وہ بعض فقہی مسائل پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں، چند سال پہلے انھوں نے اسلام میں زکوٰۃ کے

نظام پر ایک مفصل تحریر سپرد قلم کی تو اس میں یہ سوال اٹھایا کہ فی سبیل اللہ کے تحت مدرسوں کو دی جانے والی زکوٰۃ کے مستحق کیا علمی و اشاعتی ادارے بھی ہو سکتے ہیں؟ مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی تحدید و تعمیم میں جمہور فقہا کے مسلک کے علی الرغم ماضی و حال کے بعض فقہاء کے شذوذ میں وسعت و تعمیم کی گنجائش ہے، لائق مولف کی رائے بھی تعمیم کے حق میں تھی، جس پر بعض اہل علم نے ان سے اختلاف ظاہر کیا، زیر نظر کتاب کے دونوں حصوں میں انھوں نے اپنے مسلک کی تائید و اثبات میں مزید دلائل پیش کیے ہیں اور اختلافی تحریروں کا جائزہ لے کر شد و مد کے ساتھ اہل حل و عقد کے سامنے صرف دو راستے رکھے ہیں' ۱۔ یا تو وہ فی سبیل اللہ کی عمومیت کا اعلان کریں ۲۔ یا پھر مدرسوں کو مقفل کردیں، ایک علمی مسلک میں یہ انتہا پسندی محمود نہیں ہو سکتی، جذبہ کی شدت میں ان کے قلم سے مسلک ثانی کے بعض قائلین کے متعلق ایسے سخت اور تیز و تند بلکہ رکیک جملے بھی نکل گئے ہیں جو شائستگی اور متانت و سنجیدگی کے خلاف اور صاحب قلم کا وزن و وقار مجروح کرنے والے ہیں

نواب عظم و مثنوی اعظم نامہ

از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال متوسط تقطیع اور کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۵ روپیے۔ پتے کئی ہیں جن میں مشہور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی' ۲۵ ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں اسلامی عظمت رفتہ کی آخری شمعیں جن ایوانوں میں روشن تھیں ان میں ارکاٹ مدراس کا والا جاہی خاندان بھی شامل ہے، ان علم نواز نوابوں نے محدود وسائل کے باوجود علم و فن خصوصاً اردو زبان کی سرپرستی سے تاملستان کے مدراس کو دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کی صف میں لا دیا تھا۔ زیر نظر کتاب

میں اس خاندان کے آخری نواب محمد غوث خاں اعظم کے سوانح اور علمی کارناموں کی داستان کے علاوہ انکے درباری شاعر قادر حسین جوہر کی نایاب مثنوی اعظم نامہ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے اس مثنوی میں نواب اعظم کے حالات کو اس سلیقہ سے نظم کیا گیا ہے کہ انکے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں، زبان میں دکنی اثرات کی آمیزش نے اسکے لطف کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

مفتی قاضی محمد حبیب اللہ از جناب عبید اللہ، ایم اے متوسط تقطیع اور عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مدرسہ محمدی، باغ دیوان صاحب، زائی چیٹ، مدراس ۶۰۰۰۱۴۔

جنوبی ہند کے مسلمانوں میں نوائط علم ومذہب اور تجارت میں بہت نمایاں ہیں، خاص طور پر مدراس میں باغ دیوان صاحب کا خاندان صدیوں سے اپنی دینی وملی خدمات کے لیے معروف ہے، اسی خاندان کے ایک بزرگ، قاضی محمد حبیب اللہ علوم ظاہری کے ساتھ باطنی معارف میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، وہ مدراس کے قاضی تھے اور انہیں بڑی مرجعیت ومقبولیت حاصل ہوئی، شمالی ہندوستان کے علماء سے بھی ان کا گہرا ربط وتعلق تھا، اس رسالہ میں انکے سوانح اختصار اور سلیقہ سے جمع کر دیے گئے ہیں جو سبق آموز ہیں۔

چند بزرگوں کے خطوط از مولانا عثمان احمد قاسمی جونپوری، چھوٹی تقطیع، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۰ روپے، پتہ: علمی کتاب گھر، شاہ گنج، جونپور۔ یوپی۔

اس مجموعہ مکاتیب کے مکتوب الیہ جناب مولانا عثمان احمد قاسمی، علم ومذہب کے ایک خاموش وفعال خدمت گزار ہیں، انہیں شعر وادب کے پاکیزہ ذوق کے ساتھ علماء وصلحاء سے ربط ونسبت کی نعمت بھی حاصل ہے، اس مختصر مجموعہ میں مولانا قاری محمد طیب، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا سید محمد میاں، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور دوسرے کئی حضرات کے خطوط شامل ہیں، ان مکاتیب کی اشاعت فائدہ سے خالی نہیں۔

(ع۔ ص)

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

　　　　　　　　　　بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔　حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا ۔ [illegible] رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۳ء عدد ۳

مضامین

مضمون	مصنف	صفحات
شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

مضمون	مصنف	صفحات
مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ	مولوی محمد اکرم ندوی آکسفورڈ	۱۶۵-۱۷۴
ملا محمد صوفی مازندرانی	ڈاکٹر نورالسعید اختر مہاراشٹر کالج بمبئی	۱۷۵-۱۹۰
امام ابو عیسیٰ ترمذی	جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۱-۱۹۸
خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم مخطوطات	پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خان کلکتہ	۱۹۹-۲۰۶
بائبل میں قدیم ہندوستانی ثقافت کے اثرات	جناب گوردیال سنگھ مجذوب رانی باغ۔ دہلی	۲۰۷-۲۱۰
عربی، فارسی، اردو میں سکھ گورو اور پوتھیاں	جناب رام لعل نابھوی۔ محلہ دیوان نابھا۔ پنجاب۔	۲۱۱-۲۲۴
اخبار علمیہ	ع۔ص	۲۲۵-۲۲۶

معارف کی ڈاک

نمبر	مکتوب نگار	صفحات
(۱)	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی	۲۲۷-۲۳۰
(۲و۳)	پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شیروانی۔ حبیب منزل۔ میرس روڈ علی گڑھ۔	۲۳۰-۲۳۲
(۴)	پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی وایڈیٹر ثقافۃ الہند عربی۔	۲۳۳-۲۳۴

ادبیات

مضمون	مصنف	صفحات
تاریخ ہند کا ایک واقعہ	پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب گاندھی نگر۔ جموں	۲۳۵
قطعۂ تاریخ شہادت بابری مسجد	جناب عبدالرؤف اروی کلاں۔ راجستھان	״
مطبوعات جدیدہ	ع۔ص	۲۳۶-۲۴۰

شذرات

گزشتہ تین مہینوں سے ان صفحات میں ہم مسلسل بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد رونما ہونے والی وحشت و درندگی پر اشکباری کر رہے ہیں۔ کیا کریں؟ آنسوؤں کا طوفان رکتا ہی نہیں۔ ایک بابری مسجد ہی کا غم ہوتا تو شاید وقت اسے مندمل کر دیتا۔ لیکن اس کے ڈھائے جانے کے بعد سے مصائب و آلام کا سیلاب امنڈ پڑا ہے مسلمانوں کی جان مال، عزت آبرو، تشخص، امتیاز، قومیت، مذہب، عقیدہ، ایمان اور تہذیب و تمدن کوئی چیز بھی سلامت نہیں ہے۔ مساجد، معابد، مآثر اور مقابر سب ہی زمیں بوس ہو رہے ہیں۔ ایک زخم بھرتا نہیں کہ دوسرا اس سے کاری زخم لگا دیا جاتا ہے۔ ایسے میں بابری مسجد کا غم کیسے فراموش ہو سکتا ہے ؎

فلم تنسنی اوفی المصیبات بعده ؛ ولکن نکء القرح بالقرح اوجع

(ترجمہ) اوفیٰ کے مرنے کے بعد کے مصائب اس کے غم کو بھولنے نہیں دیتے۔ کیونکہ زخم پر زخم کی رگڑ بڑی تکلیف دہ ہے۔

ایک غم ہو تو اس کا مداوا ڈھونڈا جائے اور ایک درد ہو تو اس کا درماں تلاش کیا جائے۔ لیکن یہاں تو ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

حالات کی اس شدت و پیچیدگی میں بظاہر مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کے راستے مسدود نظر آتے ہیں۔ لیکن فلسفہ تاریخی کا یہ ایک راز ہے کہ صبر و ابتلا کے کٹھن دور کے بعد سہولت اور آسانی کا دور آتا ہے۔ اور تاریک و مہیب رات کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ قوموں کی تعمیر و ترقی اور کامیابی و کامرانی کے امکانات بظاہر معدوم ہو گئے ہیں۔ لیکن اسی نازک گھڑی میں ان کے عزم و حوصلہ، ہمت و بہادری اور محنت و جفاکشی نے تخریب کو تعمیر سے اور ناکامی کو کامرانی سے بدل دیا ہے۔ مسلمان بھی ایسے ہی نازک موڑ پر آ گئے ہیں جہاں اگر وہ سنبھل گئے تو تخریب کے پردے سے تعمیر کا راستہ نکل آئے گا۔ اور دشواریوں اور مشکلات کے طوفان میں بھی وہ ساحل مراد سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

زندہ اور بہادر قوموں کا عزم سفر سنگلاخ زمینوں کو بھی عبور کر لیتا ہے۔ اور چٹانوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اب بھی وہ ٹھوکریں کھاتے اور مایوسی و بزدلی کا شکار رہے تو ان کی تعمیر و ترقی کی راہ باز نہیں ہو سکے گی۔ اور ناکامی و نامرادی ہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ کوئی معجزہ اور کرامت بھی انھیں قوت و توانائی نہیں بخش سکے گی۔

اس موقع پر ہم بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کا حوالہ دینا چاہتے ہیں۔ جس کا ذکر تورات (صحیفۂ سموئیل) اور قرآن مجید (سورۂ بقرہ) دونوں میں ہے۔ حضرت موسیٰ کے خلفاء کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود نہایت ذلیل و خوار ہو گئے تھے۔ شرک و بدعت کے اثر و نفوذ کی وجہ سے ان کی دینی و اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور اجتماعی تنظیم نہ ہونے کی بنا پر ان کی سیاسی حالت بھی ابتر تھی۔ ان کے انتشار اور پراگندگی نے ان کے دشمنوں کو اس قدر ڈھیٹ بنا دیا تھا کہ وہ بلا خوف و خطر ہر چہار جانب سے ان پر یورش کر رہے تھے۔ اور ان پر ایسا خوف و ہراس اور دہشت و مرعوبیت طاری تھی کہ دشمنوں کے مقابلے کی کوئی ہمت اور سکت ان میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ فلسطینی ان کے شہروں سے انھیں نکال رہے تھے اور ان کا قتل عام کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ خدا کا مقدس صندوق بھی ان سے چھین لے گئے۔

صندوق کا چھن جانا بنی اسرائیل کی عزت و حشمت چھن جانے اور ان کی اخلاقی و ایمانی موت کے مرادف تھا۔ قرآن مجید نے بھی ان کی اس بزدلی کی زندگی کو موت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی ذلت و نکبت، مجبوری و بے بسی اور پسپائی و پامالی کی آخری حد تھی۔ صندوق کی حیثیت یہود کے یہاں قبلہ کی تھی جس کو وہ اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی و کاہن غیبی رہنمائی کے لیے اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور میدان کارزار میں یہی تابوت بنی اسرائیل کا عزم و حوصلہ قائم رکھنے میں معاون ہوتا۔ اس میں تبرکات اور صحرائی زندگی کے دور کی بعض یادگاروں کے علاوہ

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ اور ان کے خاندان کے کچھ تبرکات محفوظ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ان کے خداوند کی جانب سے وہ سامانِ تسکین و اطمینان تھا جو پُر خطر حالات اور جنگ کے مصائب ان کے لیے موجب قرار و حوصلہ تھا۔

بیس برس تک بنی اسرائیل پر ذلت و نامرادی کی یہ کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد حضرت سموئیل کی پیغمبرانہ دعوت سے ان میں بیداری پیدا ہوئی۔ ان ہی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں سے وہ شرک و بدعت سے باز آئے۔ گناہوں اور معصیتوں سے تائب ہوئے اور اپنے افتراق و انتشار کو دور کرکے دوبارہ منظم و متحد ہوئے۔ غرض جب انھوں نے اپنے حالات و معاملات درست کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اپنا فضل کیا اور انھیں از سرِ نو زندگی بخشی۔ چنانچہ ان میں فلسطینیوں سے مقابلہ کی قوت و ہمت پیدا ہوئی۔ جس کے بعد انھوں نے ان سے اپنے چھینے ہوئے شہر واپس کرا لیے۔ اور اپنی عزت و حشمت بھی دوبارہ حاصل کر لی۔ یعنی خدا کا صندوق کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد سے ان کو دوبارہ مل گیا۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا بھی اسے ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔ مسجد کا چھین جانا مسلمانوں کی عزت و حشمت کا خاک میں مل جانا ہے جس کے بعد سے وہ مسلسل سنگین حالتوں سے دوچار ہیں۔ لیکن زندگی و موت کے اس دوراہے پر وہ کدھر جائیں۔ اس کا فیصلہ ان ہی کو کرنا ہے۔ اگر موت سے ڈر کر انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو انھیں موت سے کوئی چیز بچا نہیں سکے گی اور اگر وہ موت سے نڈر اور بے پروا ہو کر ایمان و اسلام کی زندگی اختیار کرنے کا عزم مصمم کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو باعظمت زندگی اور آخرت میں حیات جاودانی سے سرفراز فرمائے گا۔

مقالات

مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ

از

مولوی محمد اکرم ندوی آکسفورڈ

(۲)

۳۔ صحابۂ کرام کی تفسیر | تفسیر بالماثور میں قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کے بعد صحابۂ کرام کی تفسیر تیسرے درجہ پر ہے، علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی کے حوالہ سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ یہی علماء کا مسلک رہا ہے، مولانا فراہیؒ کا قول بھی نقل ہو چکا ہے کہ وہ صحابۂ کرام کی تفسیر کو تیسرے درجہ پر مانتے ہیں، ذیل میں مولانا کی بعض دیگر تصریحات نقل کی جاتی ہیں، مولانا فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ متعدد اسباب کی بنا پر فضلائے صحابہ بلکہ صحابۂ کرام کی عام جماعت قرآن کریم کے سب سے زیادہ عالم تھے اور ان کو دوسروں کے مقابلہ میں قرآن کریم کی بصیرت اور فہم بھی زیادہ حاصل تھی" [۵۹]

ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ بہت سے صحابۂ کرام جس وقت قرآن کریم کی تفسیر بیان فرماتے تھے، ان کی مثال موجیں مارنے والے سمندر اور موسلا دھار بارش برسانے والے بادل کی ہوتی تھی، وہ اپنے سامعین اور مخاطبین کے سینوں کو علم و دانائی سے بھر دیتے تھے" [۶۰]

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ اور ان کے خاندان کے کچھ تبرکات محفوظ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ان کے خداوند کی جانب سے وہ سامان تسکین و اطمینان تھا جو پرخطر حالات اور جنگ کے مصائب میں ان کے لیے موجب قرار و حوصلہ تھا۔

بیس برس تک بنی اسرائیل پہ ذلت و نامرادی کی یہ کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد حضرت سیموئیلؑ کی پیغمبرانہ دعوت سے ان میں بیداری پیدا ہوئی۔ ان ہی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں سے وہ شرک و بدعت سے باز آئے۔ گناہوں اور معصیتوں سے تائب ہوئے اور اپنے افتراق و انتشار کو دور کر کے دوبارہ منظم و متحد ہوئے۔ غرض جب انھوں نے اپنے حالات و معاملات درست کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اپنا فضل کیا اور انھیں از سر نو زندگی بخشی۔ چنانچہ ان میں فلسطینیوں سے مقابلہ کی قوت و ہمت پیدا ہوئی۔ جس کے بعد انھوں نے ان سے اپنے چھینے ہوئے شہر واپس کرا لیے۔ اور اپنی عزت و حشمت بھی دوبارہ حاصل کر لی۔ یعنی خدا کا صندوق کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد سے ان کو دوبارہ مل گیا۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا بھی اسے ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔ مسجد کا چھن جانا مسلمانوں کی عزت و حشمت کا خاک میں مل جانا ہے جس کے بعد سے وہ مسلسل سنگین حالتوں سے دوچار ہیں۔ لیکن زندگی و موت کے اس دوراہے پر وہ کدھر جائیں۔ اس کا فیصلہ ان ہی کو کرنا ہے۔ اگر موت سے ڈر کر انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو انھیں موت سے کوئی چیز بچا نہیں سکے گی اور اگر وہ موت سے نڈر اور بے پروا ہو کر ایمان و اسلام کی زندگی اختیار کرنے کا عزم مصمم کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو باعظمت زندگی اور آخرت میں حیات جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔

مقالات

مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ

از

مولوی محمد اکرم ندوی آکسفورڈ

(۲)

۳۔ صحابۂ کرام کی تفسیر | تفسیر بالماثور میں قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کے بعد صحابۂ کرام کی تفسیر تیسرے درجہ پر ہے، علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی کے حوالہ سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ یہی علمار کا مسلک رہا ہے، مولانا فراہیؒ کا قول بھی نقل ہو چکا ہے کہ وہ صحابۂ کرام کی تفسیر کو تیسرے درجہ پر مانتے ہیں، ذیل میں مولانا کی بعض دیگر تصریحات نقل کی جاتی ہیں، مولانا فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ متعدد اسباب کی بنا پر فضلائے صحابہ بلکہ صحابۂ کرام کی عام جماعت قرآن کریم کے سب سے زیادہ عالم تھے اور ان کو دوسروں کے مقابلہ میں قرآن کریم کا بصیرت اور فہم بھی زیادہ حاصل تھا۔" [۱]

ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ بعث سے صحابۂ کرام جس وقت قرآن کریم کی تفسیر بیان فرماتے تھے، ان کی مثال موجیں مارنے والے سمندر اور موسلا دھار بارش برسانے والے بادل کی ہوتی تھی، وہ اپنے سامعین اور مخاطبین کے سینوں کو علم و دانائی سے بھر دیتے تھے" [۲]

مولانا فراہیؒ اور احادیث و آثار سے استدلال کی مثالیں | ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے واضح ہوگا کہ مولانا نے تفسیر میں اخبار احاد اور صحابہ کرام کے اقوال سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں نماز کے اندر اس سورہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عملی اور قولی تواتر مثلاً حدیث "خداج" اور حدیث "قسمت الصلاۃ بینی و بین عبدی" سے یہ ثابت ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز کی سورہ ہے۔"[۶۲]

سورہ ذاریات کی آیت "وبالاسحار ھم یستغفرون" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"صحیح حدیثوں میں بھی استغفار کے لیے اس وقت کی موزونیت کا ذکر ہے۔"[۶۳]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"وبالاسحار" میں جو واو ہے اس سے حضرت حسن نے ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ان کے نزدیک یہ واو متقین کی دونوں صفتوں کے اتصال کی دلیل ہے، یعنی یہ متقین نماز میں ایسے مستغرق اور منہمک ہوتے ہیں کہ سحر کے استغفار کا وقت آجاتا ہے، آیت کے لفظوں کا ظاہر مطلب تو یہ نہیں ہے لیکن نکتہ ہے لطیف۔"[۶۴]

ایک جگہ دین فطرت کی صفت اعتدال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں اس حقیقت کی توضیح فرمائی ہے کہ دین فطرت اور صراط مستقیم سراسر اعتدال اور میانہ روی ہے۔"[۶۵]

سورہ تحریم کی تفسیر میں حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کی خیانت کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک یہ تمام باتیں حضرت ابن عباس کی مستحسن استنباطات میں سے ہیں۔

اس بارہ میں آنحضرتؐ سے کوئی صحیح قول مروی نہیں ہے۔"[۷۲]

اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ فقہاء اور محدثین کی جماعت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صحابۂ کرام کے اجتہادی قول اور منقول قول کے درمیان تفریق کا ہمہ وقت احساس رکھتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عظیم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب فرض رسالت کی ذمہ داریوں کے لیے عمل میں آیا۔"[۷۳]

وادی محسر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صحاح میں روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے نہایت وقار و سکون کے ساتھ چلے اور دوسرے لوگوں کو بھی سکون کے ساتھ چلنے کا حکم دیا لیکن جب وادی محسر میں پہنچے تو آپ نے رفتار تیز کردی۔"[۷۵]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اس کی تائید امام شافعی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو کتاب الام وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر بطن محسر میں سواری تیز کردیا کرتے تھے۔"[۷۶]

کوثر کی تفسیر میں مختلف روایتوں کو جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اب قرآن اور حدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لیے یہ کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے

اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں عطا فرمایا ہے، وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہوگی۔[۵۱]

مزید فرماتے ہیں:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ارایتم لوان نهرا بباب احدکم یغتسل فیه خمسا[۵۲]

اس کے بعد حوض اور کوثر کی تشریح کے لیے متعدد روایتیں ذکر کی ہیں۔

سورۂ کافرون کی تفسیر میں مولانا نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ ہجرت جنگ اور برات کا اعلان ہے، اس کی تائید کے لیے متعدد روایتیں ذکر کی ہیں۔[۵۳]

یہ چند مثالیں ہیں کہ مولانا نے اپنی تفسیر میں اخبار اور آثار سے کس قدر استفادہ کیا ہے، آیتوں کے پس منظر اور مختلف متعلق چیزوں کی وضاحت کے لیے انھوں نے بار بار روایات کی طرف رجوع کیا ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ جس پر یہ کتاب نازل کی گئی ہے اس کی سیرت کی روشنی کے بغیر سمجھ لی جائے، پوری کتاب چھوڑیے صرف نماز کو لیجیے، کیا سنت سے اعراض کر کے تنہا کتاب الٰہی سے نماز کو سمجھا جا سکتا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں کی صحیح ادائیگی سینکڑوں احادیث پر عمل کرنے کے بعد ہی ممکن ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہ پر یہ الزام ہے کہ ان کو صرف سترہ احادیث معلوم تھیں، یہ الزام کس قدر مضحکہ خیز ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو جانتا ہے کہ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور صرف عمل کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

احتیاط کے اسباب | لیکن مولانا نے روایات کا انبار لگانے میں احتیاط برتی ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ صحیح تفسیری روایات بہت کم ہیں، صحیح مسلم میں تفسیر کا باب بہت مختصر ہے،

بخاری شریف میں بھی تفسیر سے متعلق صحیح احادیث بہت کم ہیں، امام بخاری نے حسب معمول اپنے استنباط سے کام لے کر اس باب کو کچھ طول دینے کی کوشش کی ہے، اس میں شک نہیں کہ تفسیر کے علاوہ دوسرے ابواب میں موجود احادیث کے ذخیروں سے تفسیر میں مدد ملتی ہے اور ہمیشہ علماء نے ان احادیث سے استفادہ کیا ہے، مولانا فراہیؒ نے بھی بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کیا ہے، جس کی مثالیں اوپر آچکی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ روایتوں کی کثرت قرآن فہمی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور تربیت و تزکیہ نفوس جیسے اعلیٰ مقاصد پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کا قول ہے:

> "تفسیر ماثور کے باب میں مروی اکثر احادیث یا ان کا بیشتر حصہ قرآن فہمی کے لیے ایک حجاب ہے اور اس سے قاری کی توجہ نفوس بشری کو پاکیزہ بنانے والے اور انسانی عقول کو بصیرت عطا کرنے والے اعلیٰ قرآنی مقاصد سے ہٹ جاتی ہے، تفسیر بالماثور کو ترجیح دینے والی ان روایتوں کی بھرمار سے لوگوں کی توجہ قرآن کریم کے اعلیٰ مقاصد سے دور کر دیتی جن روایتوں کی سند کے لحاظ سے نہ کوئی قیمت ہے اور نہ موضوع کے اعتبار سے۔"[۵۸]

ساتھ ہی اس کا بھی ذکر ضروری ہے کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ بھی امت کے دوسرے مفسرین اور علمائے مجتہدین کی طرح ایک انسان ہیں، ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ علمی بنیادوں پر مولانا کی رائے سے اختلاف کرے، مولانا خود بھی اس نزاکت کو محسوس کرتے ہیں اس لیے اسلاف کے طرز پر چلتے ہوئے مولانا اپنے ذاتی اجتہاد کو کبھی قطعیت کا درجہ نہیں دیتے، ہماری پوری تاریخ میں کوئی مجتہد ایسا نہیں گزرا ہے جس سے اختلاف نہ کیا گیا ہو۔

محدثین کا اتفاق ہے کہ روایتوں کی تصحیح اور تضعیف ایک اجتہادی امر ہے، کتنی روایتیں ہیں کہ کسی کے نزدیک معمول بہ ہیں اور کسی کے نزدیک متروک، لیکن ان مثالوں کی وجہ سے انکار حدیث یا حدیث سے اعراض یا حدیث کے باب میں کوتاہی کا الزام لگانا صحیح ہوگا اگر اس کا دروازہ کھل گیا تو بتایا جائے کہ اس الزام سے سعید بن مسیب، امام عطاء بن ابی امام ابراہیم نخعی، امام عامر شعبی، امام ربیعۃ الرای، امام ابوحنیفہ، امام عبدالرحمٰن بن مہدی سفیان ثوری، امام وکیع بن جراح، امام اوزاعی، امام مالک، امام لیث بن سعد، امام شافعی امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور دیگر ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے کون محفوظ رہ سکا ہے؟ کسی جزئی واقعہ یا مثال میں تو ایک مجتہد دوسرے کی رائے سے اختلاف کر سکتا ہے لیکن کلی طور پر کسی کو مطعون کرنا ایک ایسی جرأت ہے جس کی نظیریں صرف باطل فرقوں کے یہاں مل سکتی ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی شہادت مولانا کے مسلک کی وضاحت یا تو ان کی تحریروں ہو سکتی ہے یا پھر مولانا کے براہ راست شاگرد کر سکتے ہیں، مولانا کی تحریروں کے حوالے آ چکے ہیں، ذیل میں مولانا کے مشہور و معروف شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت نقل کی جاتی ہے:

"میں نے چھ سال ان کی صحبت میں رہ کر حدیث کے متعلق ان کا نقطۂ نظر جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سنت کو قرآن کے بعد اسی طرح دین کا دوسرا ماخذ سمجھتے ہیں جس طرح سارے صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں، البتہ وہ علمائے محققین کی طرح روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، تفسیری روایات کے بارے میں وہ خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ محتاط تھے، ان روایات کو وہ ہرگز نہیں

قبول کرتے جو صریحاً قرآن کے خلاف پڑتی تھیں۔[۴]

ایک جگہ کچھ زیادہ وضاحت سے فرماتے ہیں:

"میں پورے چھ سال ان کی صحبت میں شب و روز رہا ہوں، اس چھ سال کی صحبت میں شاید ہی کوئی صبح و شام ایسی گذری ہو جس میں مجھے علمی و مذہبی اور ادبی و سیاسی مسائل پر ان سے کھل کر بحث کرنے اور ان کے خیالات معلوم کرنے اور اپنے شبہات ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہ ملا ہو، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے کبھی ان کی صحبت میں یہ گمان بھی نہیں گذرا کہ مولانا حدیث کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے کوئی مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو محققین امت کا ہے۔"[۵]

مولانا فراہیؒ اور عملی زندگی میں سنت کی پیروی

مولانا امین احسن صاحب فرماتے ہیں:

"عمل میں بھی وہ نہایت سخت متبع سنت تھے میں ان کی صحبت میں اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ عملی مسائل میں علامہ ابن قیم کی زاد المعاد زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں، مولانا کا طرز فکر بالکل حکیمانہ تھا، اس وجہ سے سابقہ پڑنے سے پہلے میرا گمان ان کے بارے میں یہ تھا کہ وہ کم از کم فروعی مسائل میں زیادہ جزرسی اور خردہ گیری سے کام نہ لیتے ہوں گے، لیکن اتباع سنت کے معاملہ میں وہ اپنا اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کا تو جزئیات پر بھی احتساب کرتے تھے، بعض مرتبہ نئے تعلیم یافتہ حضرات سے اس طرح کے معاملات میں بدمزگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔"[۶]

سنت پر احتساب کی ایک مثال

مولانا امین احسن صاحب اپنا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

"ایک مرتبہ وہ (مولانا فراہیؒ) خود مجھ پر اس بات کے سبب سے معترض ہوئے کہ میرے پائینچے ٹخنوں سے نیچے تھے، میں اس زمانہ میں اس طرح کے اعتراضات کو مولویانہ خوردہ گیری

خیال کرتا تھا، چنانچہ میں نے مولانا جیسے حکیم کی طرف سے اس اعتراض کو کچھ عجیب سا محسوس کیا اور اپنے اس احساس کو مولانا پر بھی ظاہر کر دیا، گفتگو کچھ بڑھی اور وہ حدیثیں زیر بحث آگئیں جو اس بارہ میں وارد ہیں، میں نے ان احادیث سے متعلق اپنا نقطۂ نظر پوری قوت کے ساتھ پیش کیا لیکن مولانا نے جواب میں ایک حکیمانہ بات فرمائی جو میرے دل میں اتر گئی تھی میں نے فوراً عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اس پر نہایت خوشی سے راضی ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے میرے پائینچے اتنے کاٹ دیں جتنے حدود شرع سے زائد ہیں، مولانا نے فوراً ہنستے ہوئے قینچی منگوائی اور فی الواقع اپنے ہاتھ سے میرے پائینچے اتنے کاٹ دیے جتنے ٹخنوں سے نیچے تھے۔[۸۴]

مولانا امین احسن صاحب نے داڑھی سے متعلق بھی ایسا ہی ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ کو سنت کا کس قدر اہتمام تھا۔[۸۵]

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا کے تقویٰ اور اتباع سنت کے اہتمام کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا (فراہیؒ) کی مذہبیت اور عبادت قابل دید تھی، نماز کی اولیت کا جو اہتمام رکھتے ایسا اہتمام میں نے ایک ہی جگہ اور دیکھا ہے اور وہ شخصیت حضرت اکبر الہٰ آبادی کی تھی، مولانا خود ہی سرگرم نمازی نہ تھے، دوسرے بھی ان کی ہیبت سے نمازی بن جاتے، جب تک مولانا کا قیام رہتا احاطہ دار المصنفین کے اندر نماز کا خوب چرچا رہتا۔"[۸۶]

حرف آخر | یہ رجحان بہت ہی خطرناک ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے احسانات، ان کے کارناموں اور ان کی کوششوں کو سراہنے کے بجائے ان پر الزام تراشی اپنا پیشہ بنا لیں، مولانا فراہیؒ کی تصنیفات ناپید نہیں ہیں، مولانا کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد بکثرت

موجود ہیں ان سے تحقیق کی جا سکتی ہے، جس طرح احادیث کا انکار ایک فتنہ ہے اسی طرح حدیث کے نام پر ہر رطب و یابس کو دین میں رواج دینا فتنہ عظیم ہے، اہل سنت والجماعت کا مسلک ہمیشہ اعتدال کا رہا ہے، اسلاف اخبار احاد کے بارے میں بہت محتاط تھے، کیا خبر واحد کو قبول کرنے میں احتیاط کرنا حدیث سے انکار کی دلیل ہے؟ کیا خود شارع علیہ السلام نے احتیاط کی تعلیم نہیں دی؟ کیا خلفائے راشدین اور مجتہدین صحابہ نے احادیث کے بارے میں احتیاط سے کام نہیں لیا؟ پھر مولانا فراہیؒ تو صرف اس وقت خبر واحد کے بارے میں توقف کرتے ہیں جب وہ قرآن یا سنت سے معارض ہو، کیا یہ دین میں کوئی بدعت ہے؟ کیا قرآن سے تعارض حدیث کے ضعف کی دلیل نہیں ہے، کیا حدیث کے ذخیروں میں پائی جانے والی ہر حدیث پر عمل کرنا اسلاف کی سنت ہے؟ کیا امام ترمذی اپنی کتاب میں بار بار علماء کے مسلک نقل نہیں کرتے کہ کس حدیث پر کس کا عمل ہے اور کس پر کس کا؟ کیا خود امام ترمذی کا یہ بیان نہیں ہے کہ ان کی کتاب میں دو حدیثیں ایسی ہیں جن پر کسی کا عمل نہیں ہے؟ آخر کس امام کا یہ مسلک ہے کہ تصحیح و تضعیف کے سلسلہ میں ائمہ و محدثین کے اصول نص قطعی کا درجہ رکھتے ہیں؟ اور کیا ان اصولوں میں اور رجال کے نقد کے سلسلہ میں ائمہ میں شدید اختلاف نہیں ہے؟ جرح و تعدیل کے مراجع دیکھئے کیا بڑے بڑے ائمہ مجروحین کی صف میں نظر نہیں آتے؟ کیا جمہور امت کا مسلک یہ نہیں ہے کہ خبر واحد ظنی ہے؟ ذرا انصاف کیجئے کہ اس قدر ظنی بنیاد پر الزام تراشی کہاں تک دفاع عن السنۃ کے خانہ میں آتی ہے؟

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

وکم من عائب قولاً صحیحاً وآفتہ من الفھم السقیم

(صحیح بات پر تنقید کرنے والے کتنے ایسے ہیں کہ ان کی مصیبت خود انکی بیمار سمجھ ہے)

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

اذا لم تر الهلال فسلم لاناس رأوه بالابصار

(اگر تمہیں ہلال نظر نہیں آتا تو ان کی بات مان لینی چاہیے جنہوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے)۔

---

۲۰ مولانا فراہیؒ: رسائل الامام الفراہی، التکمیل فی اصول التاویل، ۲۲۰ ۲۱ ایضاً ۲۳۱، ۲۳۲ ۲۲ مولانا فراہیؒ: تفسیر نظام القرآن ترجمہ، مولانا امین احسن اصلاحی ۴، ۲۳ ایضاً ۱۰۴ ۲۴ ایضاً ۱۰۷ ۲۵ ایضاً ۱۷۵ ۲۶ ایضاً ۱۸۵ ۲۷ ایضاً ۲۵ ۲۸ ایضاً ۲۰۵ ۲۹ ایضاً ۴۰ ۳۰ ایضاً ۴۱ ۳۱ ایضاً ۴۱۹ ۳۲ ایضاً ۴۱ ۳۳ شیخ محمد عبد العظیم زرقانی: مناہل العرفان ۲/۲۵ ۳۴ مولانا امین احسن اصلاحی: مقدمہ تفسیر نظام القرآن ۱۸ ۳۵ ایضاً ۱۶ ۳۶ ایضاً ۱۶/۱۷ ۳۷ ایضاً ۱۷ ۳۸ مولانا عبد الماجد دریابادی: معاصرین ۱۲۲۔

فارم ۱۷

(دیکھو رول نمبر ۸)

معارف پریس اعظم گڑھ

نام مقام اشاعت	: دار المصنفین اعظم گڑھ	پتہ	: دار المصنفین اعظم گڑھ
نوعیت اشاعت	: ماہانہ	نام پبلشر	: " "
نام پرنٹر	: عتیق احمد	ایڈیٹر	: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	: ہندوستانی	قومیت	: ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دار المصنفین

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عتیق احمد۔

ملا محمد صوفی مازندرانی

از ڈاکٹر نور السعید اختر، بمبئی،

شہنشاہ اکبر کے یگانۂ روزگار نورتن ابوالفضل علامی نے "آئینِ اکبری" میں عہدِ اکبر کے جن شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں مازندران کے یہ دو شاعر بھی ہیں، صوفی مازندرانی اور قاسمی مازندرانی۔

مازندران کے علاوہ صوفی کی نسبت کئی شہروں سے ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس عہد میں صوفی تخلص کے متعدد شعراء گذرے ہیں۔ تذکرۂ صحفِ ابراہیم میں حسب ذیل چھ شعراء کا ذکر ہے۔

۱۔ صوفی مازندرانی ۲۔ صوفی شیرازی ۳۔ صوفی کرمانی ۴۔ صوفی اردستانی ۵۔ صوفی آملی ۶۔ صوفی ہمدانی۔

نام، لقب اور وطن | ملا محمد صوفی کے نام، لقب اور وطن کی بابت فارسی تذکروں میں اختلافات ہیں۔ آذر نے ملا محمد صوفی کو اصفہانی بتایا ہے۔ عرفاتؔ کے مولف نے صوفی کو سہواً استرآبادی لکھا ہے۔ میر حسن دوست سنبھلی نے تذکرۂ حسینیؔ میں ملا محمد صوفی مازندرانی کا نام مولانا یوسف صرفی مازندرانی درج کیا ہے۔ معتمد خان بخشی نے "اقبال نامۂ جہانگیری" میں عہد جہانگیر کے جن شعراء کی فہرست دی ہے اس میں چوتھے نمبر پر ملا محمد صوفی کا ذکر پایا جاتا ہے۔

ملا محمد صوفی کے نام، لقب اور وطن کی بابت رضا قلی خاں ہدایت مولف تذکرہ ریاض العارفین[۲] کی مندرجہ ذیل عبارت قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسمش ملا محمد، ملقب بصوفی، اصل از مازندران بہشت نشان ... صاحب آتشکدہ لقبش را تخلص دانستہ او را اصفہانی خواندہ خاوری ہروی جامی شمردہ وچنین نیست باسم (محمد[۱])، تخلص می کرد و مازندرانی است۔"

بندرابن داس خوشگو نے کسی تسامح کے باعث صوفی کو عوفی لکھ کر چند غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں جس کا ازالہ گلچین معانی نے تاریخ تذکرہ ہای فارسی[۵] میں کر دیا ہے۔

صوفی مازندرانی کی نایاب مثنوی صوفی نامہ کے کاتب فاضل بیگ[۶] نے سرورق پر تحریر کیا ہے کہ:

"صوفی نامہ از نتیجۂ افکار حضرت ملا محمد صوفی کہ بسلطان صوفی معروف بود، اصلش از کرمان است، و مولودش شیراز، مدتے سر و پا برہنہ در عالم سیاحت بردہ و بمراتب اعلیٰ رسیدہ الحق صفا کشان صومعہ و علمی و تدبیر اعلیٰ دارد۔"

اورنٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری کے مصنف تھامس ولیم بیل[۷] اور مفتاح التواریخ[۸] کے مصنف نے صوفی کو آملی قرار دیا ہے۔ طاہر نصر آبادی نے[۹] صوفی کو کرمان سے منسوب کیا ہے۔

دیوانِ مولانا محمد صوفی کے مرتب سید محمد طاہری شہاب[۱۰] کتاب کے تعارفی صفحے پر صوفی کے نام کے ساتھ مازندرانی لکھتے ہیں لیکن تذکرۂ میخانہ[۱۱] کے مولف کے بیان کا حوالہ پیش کرتے ہوئے اس امر کے معترف نظر آتے ہیں کہ صوفی کا وطن مالوف آمل تھا۔

---

[۱] صوفی نے غزلوں میں "محمد" اور قصائد و رباعیات میں صوفی تخلص استعمال کیا ہے۔

طاہری شہاب[۱۴] کا اعتراف ہے کہ:

"محمد صوفی مازندرانی کہ در شعر بنام (محمد) و (صوفی) تخلص دارد ۔ طبق شرحی کہ صاحب تذکرۂ میخانہ ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی نوشتہ اند: در شہر آمل بدنیا آمدہ، در ایام جوانی ۔ از موطن خود خارج و مدتی را در ری و اصفہان رحل اقامت افگندہ و سالک وادی عرفان و تصوف گشت و بریاضت و تہذیب نفس پرداخت و بعلت تمایل بمسالک درویشی شعرگوئی را آغاز و منظومات عارفانہ و صوفیانہ می سرود"۔

دیوانِ صوفی کے صفحہ نمبر ۱، پر طاہری شہاب تذکرہ نویسوں کے اشتباہات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بانکی پور پٹنہ[۱۵] کے فہرست نگار نے مولانا محمد صوفی کی دو رباعیوں کا حوالہ دیا..... اس بنا پر:

"این گونہ اشتباہات را سائر تذکرہ نویسان ہم در حق ملا محمد صوفی مرتکب شدہ چنانکہ بعضی او را کرمانی و برخی ہمدانی و دستۂ دیگر اردستانی و کاشمری دانستہ حتیٰ لطفعلی بیگ آذر، در تذکرہ آتشکدہ وی را جزو شعرا اصفہان بقلم آوردہ است و اشعاری را کہ بنام صوفی کرمانی ہمدانی، اردستانی کہ کاشمری، شیرازی، اصفہانی یادداشت کردہ اند"۔

دراصل ملا محمد صوفی کو ان کے وطن کے سلسلے میں دس شہروں[۱۶] سے منسوب کیا گیا ہے حالانکہ ان کا براہ راست تعلق صرف تین شہروں سے تھا۔ داخلی شہادتوں کی روشنی میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ملا محمد صوفی آملی، صوفی شیرازی اور صوفی مازندرانی علیحدہ نہیں ہیں بقیہ ہم تخلص شاعروں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صوفی کے مندرجہ ذیل اشعار اس امر کی تائید کرتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

مرا گجرات از آن گشت مسکن — کہ از مازندرانم یادگار است[19]

بشیرازم نمی بلا آب روئی — ازآں گہ خاک و آب دیگر ہستم

مبادا منقطع از خاک شیراز — سر شک ماد فیض ذوالجلالی[20]

صوفی اپنے تخلص "محمد" سے کم اور اپنے لقب (صوفی) سے زیادہ معروف ومقبول تھے۔ انھوں نے غزلوں میں محمد اور رباعیات میں صوفی تخلص استعمال کیا ہے (تذکرہ منتخب اللطایف اتنا بیانی ہے "القصہ او صوفی و محمد ہر دو تخلص می نماید" ص٢٤٢)

تاریخ ولادت | ملا محمد صوفی مازندرانی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں تمام تذکرے ساکت ہیں۔ صوفی کے دیوان کے مطالعہ سے چند اندرونی شہادتیں میسر آتی ہیں جن سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ صوفی نے ستر[21] برس سے زیادہ عمر پائی تھی چنانچہ کہتے ہیں:

دل از وصلِ جوانان شاد دارم — اگرچہ عمر بہ ہفتاد دارم[21]

گشت قامت دوتا و با من گفت — کہ ببی زیر خاک باید خفت

(صوفی کا خط بنام غازی خان)

صوفی کی وفات کے تاریخی مادوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ١٠٣٥ھ مطابق ١٦٢٥ء میں بقیدِ حیات نہیں تھے[22] لہٰذا اگر ١٦٢٥ء مطابق ١٠٣٥ھ سے ستر برس گھٹا دیے جائیں تو ٩٦٥ھ مطابق ١٥٥٥ء سن برآمد ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی سن کے آس پاس صوفی کا پیدا ہونا قرینِ قیاس ہے جبکہ بلنیڈ (B/٢/١٢)[23] نے جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن (ج٢ ص١٦٥) میں لکھا ہے کہ صوفی ١٠٣٦ھ/١٦٢٨ء تک گجرات میں زندہ تھے۔ بقول المقتدر ص١٤ تذکرہ ریاض الشعراء میں صوفی کی تاریخ وفات موجود ہے۔

صوفی کے طول العمری کی طرف داخلی اشارے ملاحظہ کیجیے۔

مرا در سختی و در محنت و رنج　　جوانی رفت و پیری در گذشت[۲۲]

خشک حکایتی است من سال خوردہ را[۲۳]

نوبہار حیات من گذشت　　این زمان وقت برگ ریزان است[۲۴]

موی چون برف در دی پنبہ زار شدہ　　روی چون پشت سوسمار شدہ[۲۵]

پیری سپر راہ ناصواب دارد　　گلنار ز غم برنگ آبی دارد[۲۶]

بام و در چار رکن دیوار وجود　　لرزان شدہ روی در خرابی دارد

وطن سے محبت | صوفی کو اپنے وطن مازندران (ایران) سے حد درجہ محبت تھی، وطن میں ناقدری اور نامساعد حالات نے انہیں ہجرت کے لیے مجبور کر دیا تھا، صوفی نے تحفظ کی خاطر ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ تاہم وطن کی یاد ہمیشہ ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

بند این جسم بگسلم از خویش　　تا برد باد سوی ایرانم[۲۷]

ایران و عراق کی سرزمین ان کی آرزوؤں اور خوابوں کا مسکن تھی، چنانچہ ہوا کے دوش پر عراقی دوستوں کو خیر و عافیت کا پیغام بھیجتے ہیں

اگر ای باد بگذری بعراق　　باز گو حال من بیارانم[۲۸]

بالآخر صوفی نے جب گجرات (احمد آباد) کو اپنا مسکن بنا لیا تو انہیں وطن کی یاد لیے آئی

مرا گجرات از آن گشت مسکن　　کہ از مازندرانم یادگار است[۲۹]

حالات | صوفی کے حالات سے متعلق ان کے دیوان میں چند داخلی اشارے پائے جاتے ہیں۔ متعدد تذکروں اور کتابوں کی چھان بین کے بعد مزید حوالے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود، صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی عرصہ قبل پی ایچ ڈی کے

مقالہ کے لیے صوفی کا دیوان مرتب کر چکے ہیں۔ اس کے کچھ سال بعد ڈاکٹر پروفیسر محمد صدیقؔ کی نگرانی میں پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد قیس نے صوفی پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا، افسوس ہے کہ راقم کی رسائی ان مقالوں تک نہ ہو پائی، نومبر ۱۹۶۳ء میں 'جامعہ' دہلی کے شمارے میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی کا مقالہ شایع ہوا۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی کی ایما پر راقم نے نیشنل میوزیم دہلی سے صوفی کے دیوان کا عکس حاصل کیا۔ اسی دوران استاد گرامی ڈاکٹر نذیر احمد نے راقم کی توجہ صوفی کی نایاب مثنویوں کی جانب مبذول کرائی جو کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کی مخزونہ ہیں۔ راقم نے بہرصورت ان مثنویوں کی نقول اور عکس حاصل کیا۔ ایران کے سفر کے دوران راقم نے تہران اور دوسرے کتب خانوں میں ان مثنویات کے دیگر قلمی نسخوں کی جستجو کی۔ جرمنی اور انگلینڈ کے کتب خانوں کی فہرستوں کو دیکھا لیکن ان نایاب مثنویوں کا کہیں سراغ نہیں لگا۔ دراصل یہ مضمون ان مثنویات کے تفصیلی و تحقیقی مطالعہ کا مقدمہ ہے۔ ایران میں راقم کو سید محمد طاہری شہاب کا مرتب کردہ دیوان مولانا محمد صوفی مازندرانی بھی مل گیا۔ اس دیوان میں بھی ان مثنویوں کا حوالہ نہیں ہے۔ راقم نے صوفی مازندرانی سے متعلق ایرانی کتب خانوں میں پائے جانے والے تمام حوالے نقل کر لیے جنکی تفصیل مقالہ کے آخر میں دے دی گئی ہے۔

صوفی اسم بامسمیٰ اور باکمال شاعر تھے۔ ایران کی سیر و سیاحت کے بعد صوفی آذربائیجان و عراق (عجم) کے شہروں سے ہوتے ہوئے فارس پہنچے اور ایک عرصہ تک شیراز میں قیام پذیر رہے۔ یہاں کے اکثر لوگ، اصحاب سلوک تھے۔ لہذا انھوں نے صوفی کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ صوفی کے زیادہ اوقات مدرسوں میں

گذرتے، مریدین اور معتقدین ان سے روحانی فیض حاصل کرتے تھے۔ سرزمین فارس کی آب وہوا ان کے فطری ذوق شعری کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد نقطوی عقاید[۳۱] کی بنا پر ایرانی عالموں اور فاضلوں نے ان کو دہریہ قرار دے دیا۔ چنانچہ بقول ڈکٹر سید علی رضا نقوی[۳۲] ؎

(۱) علما رو فضلا بسوء اعتقاد و زندقہ وروش الحاد متہم گشتت۔

(۲) امّا چون خیلی آزاد منش بود عدہ ای بر مخالفت وی کمر بستند۔

صوفی کو ترکِ تعلق اور گوشہ نشینی کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس بدنامی کے باعث وہ بادشاہ وقت کو کیا منہ دکھاتے۔ لہٰذا انھوں نے شیراز کو خیرباد کہا اور نئی منزلوں کی طرف نکل پڑے۔ کازرون پہنچ کر صوفی نے ایک مدت تک وہاں قیام کیا۔ یہیں پر انھوں نے ردیف 'سخن' میں ایک شاندار قصیدہ شیخ المحققین ابوالقاسم[۳۳] کی مدح میں کہا۔ شیخ نے بھی ملا محمد صوفی کی تعریف میں قصیدہ[۳۴] تحریر کیا تھا۔ صوفی کے قصیدے[۳۵] کے ابتدائی اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

خدا گواست کہ در کازرون برای سخن ظہور کرد درین روزہا خدای سخن

خدایگانِ جہانِ سخن ابوالقاسم کہ عقلِ کل سر دش کمترین گدای سخن

اسی اثنا میں ملا محمد صوفی کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ شاہ عباس بزرگ صفوی کے ابتدائی عہد سلطنت (۹۹۶ھ تا ۱۰۳۸ھ) میں صوفی نے ایران سے رختِ سفر باندھا اور مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں عقائد کی آزادی کی خاطر (۹۶۳ھ ۱۰۱۴ھ) ہندوستان پہنچے۔ صوفی ہندوستان میں قیام کے دوران کشمیر[۳۵]، احمد آباد، سورت (گجرات[۳۶]) میں سکونت پذیر رہے۔ صوفی پندرہ سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ

میں گذار چکے تھے اور متعدد بار حج بیت اللہ کی زیارت سے سرفراز ہو چکے تھے[۳۷] بقول شاہنواز خاں صوفی اس فریضہ سے عہد جوانی اور ہندوستان جانے سے پہلے سبکدوش ہو چکے تھے[۳۸ الف]

شعراء کے دواوین کی ورق گردانی اور ان کے جواہر پاروں کا انتخاب صوفی کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ نہایت لگن کے ساتھ منتخبہ اشعار کی کتابت کرتے اور فرصت کے لمحات میں سیر و تفریح[۳۸ ب] کے علاوہ نرد، کمانداری اور کتابت[۳۹] کے شغل سے دل بہلاتے تھے۔ صوفی کا کشکول[۴۰] اور تذکرۂ بتخانہ[۴۱] ان کے فن انتخاب پر دال ہیں۔ علم و ادب کے تشنہ حضرات صوفی سے ملاقات کو سعادت تصور کرتے ان خوش نصیب لوگوں میں تذکرۂ عرفات کا مولف تقی اوحدی[۴۲] اور تذکرۂ میخانہ کا مولف عبدالنبی بھی[۴۳] تھے۔

یہ لوگ صوفی کی رفاقت کو ایک گرانقدر عطیہ سمجھتے تھے۔ صوفی اپنے قدر دانوں سے نہایت عاجزی، انکساری، تپاک، خلوص اور فقیرانہ شان کے ساتھ ملتے تھے وہ صوفیہ اور سالکین کی روش اپناتے اور غرور و نخوت کا اظہار تو کیا گمان تک نہیں ہونے دیتے تھے۔ گجرات کی صوفیہ نواز سرزمین میں اجمیر سے واپسی پر ۱۰۲۲ھ کے لگ بھگ[۴۴] صوفی کی ملاقات میر سید جلال صدر، متخلص بہ رضائی بخاری جیسی جلیل القدر شخصیت سے ہوئی میر سید جلال عہد شاہجہانی میں شش ہزاری منصب پر فائز تھے۔ میر سید جلال متوفی ۱۰۵۷ھ کو ۱۰۵۲ھ میں دہلی کی صدارت بھی تفویض ہوئی تھی۔ شاہنواز خان نے مآثر الامراء[۴۵] میں ساری تفصیلات بیان کی ہیں۔ درحقیقت صوفی نے فن شعرگوئی میں کسب نور[۴۶] سنائی متوفی ۵۲۵ھ / ۱۱۳۱ء کے "شعلۂ شعر" سے حاصل کیا تھا۔ بقول صوفی[۴۷] سہ

تا نہ پنداری کہ روشن از خود ست اینک بہ بین   کسب نور از شعلۂ شعر ثنائی میکنم

البتہ شاہ نواز خاں کا بیان ہے کہ صوفی نے براہ راست میر سید جلال بخاری کو اپنا استاد گردانا تھا۔

"میر سید جلال صدر بخاری تعلق خاطر بہم رسانیدہ تعلیم او نمود"

ایک طرف گجرات کا گورنر سیف خاں صوفی کا معتقد اور قدردان تھا، دوسری طرف شہنشاہ جہانگیر کی جانب سے ٹھٹھہ اور قندھار کا حاکم مرزا غازی ترخاں متخلص بہ وقاری (متوفی ۱۰۲۱ھ) صوفی کا شیدا تھا۔ یہ شخص اپنی ہنرمندی، سخاوت، خوش طبعی، معارف پروری اور خوش روی کے لیے مشہور تھا۔ صوفی کو مرزا غازی خاں نے قندھار مدعو کیا تھا لیکن وہ بڑھاپے اور طویل سفر کے باعث اس کی دعوت قبول نہ کر سکے۔ صوفی نے جواب میں مرزا کے نام ایک مراسلہ ارسال کیا جس کو پڑھ کر صوفی کی علمی و ادبی استعداد، مرتبہ اور شگفتہ نویسی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے لیکن طوالت کی وجہ سے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔[۴۹]

۱۰۲۱ھ کے بعد سیلانی طبعیت صوفی دوبارہ خواجہ اجمیری کے روضہ پر حاضر ہوئے۔ ۱۰۲۲ھ ہجری میں تذکرۂ میخانہ کا مولف عبدالنبی صوفی سے اجمیر میں متعارف ہوا تھا۔ اس نے صوفی سے دوسری ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔[۵۰]

تقی الدین اوحدی مولف تذکرۂ عرفات نے بھی احمد آباد میں صوفی سے ملاقات کی بابت لکھا ہے۔[۵۱]

احمد آباد (گجرات) کی ادبی محفلوں میں اکثر مذاکرات اور بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مذاکرے میں صوفی اور نظیری نیشاپوری جو ہم عصر شاعر تھے ایک

دوسرے سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور ان کی برسوں کی دوستی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ نظیری نے ایک غزل میں کنایتہً یہ شعر کہا ؎

آرائش برون چہ کنی پشم گو سفند گر گی کہ در درونست ترا گو سفند کن[۵۳]

یہ ذاتی پرخاش اتنی بڑھی کہ صوفی نظیری کی عیادت کے لیے نہیں گئے۔ لیکن سن ۱۰۲۳ھ میں صوفی نظیری کے جنازے میں شریک تھے۔ ۱۰۲۵ھ میں تقی الدین اوحدی[۵۴] صوفی سے آخری بار اجمیر میں ملا تھا۔ جہاں صوفی قطب المحققین خواجہ معین الدین چشتی کے مرقد مبارک کی زیارت کے لیے پہنچے تھے۔

اس امر کی تائید میں تذکرۂ صبح صادق کا مولف[۵۵] رقمطراز ہے کہ "درآن آوان مولانا محمد صوفی بہ بندر سورت رسید"

مزاج ومشرب | صوفی کے مزاج اور مشرب سے متعلق مختلف تذکرہ نویسوں کی رائیں ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) "جامع خصائل نیکو وحاوی خصائل دلجو"۔ ریاض العارفین[۵۶]

(۲) "مرد صافی مشرب عالی ہمتی بودہ، بلندی استغنای او اوج دماغ متکبر آن زمان بچندین پایہ گذشتہ .... ملا محمد چون مردی خالی از حدت مزاجی نبوذ نتوانست درایران بسر بردہ در گجرات می بودہ"[۵۷] لطائف الخیال۔

(۳) "مولانا محمد..... از مشاہیر روزگار است، صوفی مشرب، تند خوو درشت گو بود و با مردم کم اختلاطی می کردہ"[۵۸]

(۴) "ملا محمد صوفی چون مرد آزاد روشی بودہ بسیار وارستہ وقانع وپرہیز گار وصوفی مشرب زندگی می نمودہ است لذا برخی از معاصرانش وی کافری دانستہ اند"[۵۹]

ان حقائق کے پیشِ نظر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ:

" غالباً اسی تند طبعی اور درشت گوئی کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض کی صوفی نے ہجو بھی کی ہے۔ صوفی پر آزاد خیال دہریہ اور لا مذہب ہونے کا الزام بھی لگایا گیا تھا"[۶۰]

صوفی نے اپنے دیوان میں ان الزامات کی تردید کی کوشش کی، چنانچہ لکھتے ہیں ؎

من ترکِ رہِ گناہ و طاعت کردم	منزل بسر کوی قناعت کردم[۶۱]
در خاکِ وجودِ خویش وز دانۂ دل	با چشمۂ دیدگان زراعت کردم
گر نادانی کینہ بورزد با من	نہ شادی از آن فزوده گردد نہ حزن
خورشیدِ بلند را چہ نقصان چہ کمال	گر شب پرہ دوستش بود یا دشمن
ای آنکہ ہمہ بد (محمد) گوئی	عیبی کہ مراست ہر یکی صد گوئی
من آئینہ ام تو زشت رو مرد کنہ	در من خود را بہ بینی و بد گوئی

تذکرہ نگار رضا قلی خاں ہدایت[۶۲] نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ صوفی نے ہندوستان کی مذمت کی ہے چنانچہ بقول ہدایت: "بعضی اشعار در مذمتِ ہند دارد" [روضۃ الصفا]

صوفی کے "آفتابی مزاج" "انجم سوز رویہ" اور "آتش باز طبیعت" کا علانیہ اعتراف مندرجہ ذیل اشعار میں ملتا ہے ؎

آفتابیست مرا یم انجم سوز	آسمانیست طبعم و آتش باز[۶۳]

دیوانِ صوفی میں "نصیرا" نامی[۶۴] شخص کی ہجو کے علاوہ ایسی رباعیاں ملتی ہیں جو شخصی اور ہندوستان کی برائیوں سے مملو ہیں:۔ مثال کے طور پر:۔

(۱) نصیرا کی ہجو :- نصیرا بس از محنت و بدگوار است — چو باد مهرگان ناسازگار است

خوش آواز است و بد ذات و گزندہ — چو مار مهر دار و زهر دار است

(اشعار دیوان ص۱)

(۲) در هند بسی که رای رایان دیدم[65] — در صورت بندگان خدایان دیدم

در کسوت مرد دیده ام زن بسیار — با طبل و علم بسی گدایان دیدم

(۳) صوفی زاہد بسی تنگ حوصلہ است — از صحبت ما دو رنصد مرحلہ است

معنی بلند گوش او نشنیدست — با آنکہ درا ز گوش این قافلہ است

(از خیابانِ عرفان سید محمد حسن بلگرامی ص۳۰۲ حیدرآباد ۱۹۲۴ء)

اصحاب کمال سے تعلق | مختلف حوالوں کی چھان بین کے بعد پتہ چلتا ہے کہ صوفی کے مندرجہ ذیل سربرآوردہ لوگوں سے گہرے مراسم تھے۔

(۱) عسکری کاشانی[66] (۲) آوجی کشمیری[67] (۳) تذکرۂ صبح صادق کے مولف کے دادا[68] (۴) نظیری نیشاپوری[69] (۵) تقی الدین اوحدی مولف تذکرۂ عرفات[70] (۶) عبدالنبی مولف تذکرۂ میخانہ[71] (۷) سیف خاں صوبہ دار گجرات[72] (۸) میر سید جلال صدر رضائی (۹) میرزا غازی خان ترخان و تاری حاکم قندھار[73] (۱۰) شیخ المحققین ابوالقاسم[75] (۱۱) شیخ ابو حیان طبیب شیرازی ملا[76] (۱۲) حسن علی یزدی[77]۔

مرتب دیوانِ صوفی سید محمد طاہری شہاب[78] نے غنی[79] اور آذر[80] و ہدایت[81] کے بیانات کو مشکوک قرار دیا ہے۔

محرومی و ناقدری | صوفی کے دیوان کے عمیق مطالعہ کے بعد جو داخلی شہادتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفی کو ان کی عارفانہ طبیعت اور فقیرانہ مزاج نے دربار و سرکار سے دور رکھا۔ اپنے قدردان میرزا غازی ترخان[82] کی دعوت پر وہ

قندھار جانے سے معذور رہے اور جب زندگی کے آخری لمحات میں شہنشاہ جہانگیر (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء) نے انہیں طلب کیا تو زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔[۴۳]
صوفی ان تلخ حقائق کے ازحد قائل تھے۔ بقولِ صوفی ؎

۱۔ نہ مرا حاجتی بدادۂ شاہ — نہ مرا دغبتی بہزادۂ امیر[۴۴]
۲۔ چو من با فقر و فاقہ خو گرفتم — مرا با مردم دنیا چہ کاراست
۳۔ ندید مہر بکارت بجای خود آن روز — طلاق دادۂ محمد عروس دنیا را
۴۔ ہوسِ نعمتِ جہان نکنم — زحمت خلق بوا لعجب نکشم

یوں محسوس ہوتا ہے کہ زمانے نے صوفی کے ساتھ ہمیشہ کج روی اختیار کی۔ وہ تمام عمر پریشانیوں کا شکار رہے۔ چنانچہ اپنی حالت زار کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں ؎

۱۔ مرا در سختی و محنت و رنج — جوانی رفت و پیری گذشت[۴۵]
۲۔ من بدین مرستی نیم راستی — زندگانی ہمی کنم ناچار
۳۔ تو یوسفؑ و زمانہ ماہی — تو یوسفؑ در وزگار زندانی[۴۶]
۴۔ چنان خوار و زارم درین روزگار — کہ گوئی مرا نیست پروردگار

(باقی)

حوالہ جات

[۱] فیضی، قاسم کاہی، غزالی مشہدی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی، شکیبی اصفہانی نظیری نیشاپوری، صالحی، مظہری مشہدی، صبوحی چغتائی، قراری گیلانی، عتابی نجفی، وقوعی نیشاپوری، غیرتی، سنجر کاشانی، کامی سبزواری، فسونی شیرازی، نوعی مشہدی، قاسمی مازندرانی، صوفی مازندرانی (۲۰ شعراء) (آئینِ اکبری، مترجمہ از بلاک مین ص ۶۵۹: ۱۹۲۵ء)

۲؎ تذکرۂ صحف ابراہیم از ابراہیم خاں خلیل ص۲۳۵ : ۱۹۶۳ء ۳؎ تذکرۂ آتش کدہ آذر، آذر ص۱۸۵ ۴؎ تذکرۂ عرفات العاشقین از تقی اوحدی، بحوالہ مقالہ عابدی، جامعہ دہلی ۱۹۶۳ء ۵؎ تذکرۂ حسینی، حسین سنبھلی ص۱۸۶ ۶؎ اقبال نامۂ جہانگیری، معتمد خاں بخشی ص۲۳۰ ۷؎ تذکرہ ریاض العارفین (روضہ اول) مولفہ رضا قلی خاں ہدایت ص۲۱۰ ۱۲۶۰ھ ۸؎ فرہنگ سخنوران از خیام پور ص۳۴۳/ ص۳۴۲/ ص۲۱۱ بحوالہ میخانہ مرتبہ گلچین معانی (جلد اول) چاپ احمدی، بار دویم، طہران ۹؎ مجموعہ مثنویات، صوفی نامہ از صوفی مازندرانی، کاتب : فاضل بیگ، سرورق/ ۱۲۵۶ء جلد پنجم۔ مخطوطہ نمبر ۱۷۲۲ : سالار جنگ حیدر آباد ۱۰؎ اورینٹل بایو گرافیکل ڈکشنری از بیل ۱۱؎ مفتاح التواریخ مترجمہ ہنری جارج کین (سی آئی ای) ص۲۳۸ ۱۲؎ تذکرہ نصر آبادی طاہر نصر آبادی ص۲۱۰/ ۱۳۰۶ھ ۱۳؎ دیوان مولانا محمد صوفی، مازندرانی، تصحیح و تحشیہ، سید محمد طاہری شہاب، ۱۳۴۷ شمسی، تہران ۱۴؎ ایضاً ص۳ ۱۵؎ عبد المقتدر، مرتب فہرست کتابخانۂ بانکی پور، پٹنہ، ہندوستان ۱۶؎ تذکرۂ عرفات العاشقین از تقی اوحدی (صوفی استرآبادی) تذکرۂ ید بیضا، آزاد بلگرامی (صوفی ساوجی/صوفی نصرآبادی) تذکرۂ مجمع النفائس از آرزو (صوفی شیرازی) ۱۷؎ دیوان صوفی۔ مرتبہ طاہری شہاب۔ تہران۔ ۱۸؎ ایضاً ۱۹؎ ایضاً ۲۰؎ تذکرۂ نشتر عشق و مخزن الغرائب کے مطابق ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء تک صوفی زندہ تھے۔ بحوالہ فہرست نگار المقتدر، بانکی پور پٹنہ ص۱۶۱ نمبر ۳۰۱ ۲۱؎ بلینڈ (Bland) جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن IX ص۱۳۶ ۲۲؎ دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب تہران۔ ۲۳؎ ایضاً ۲۴؎ ایضاً ۲۵؎ مراسلہ صوفی بنام غازی خاں ۲۶؎ ایضاً ۲۷؎ دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب ۲۸؎ ایضاً ۲۹؎ ایضاً ۳۰؎ محمد بستی خاں کی تحریک (قرآن حکیم کی روح حرفوں اور نقطوں میں ہے۔ اس میں سب سے اہم بسم اللہ کے "ب" کا نقطہ ہے) مراتب الوجود مولفہ

محمد نورالدین حمدونی شیرازی نے "فرقہ حمدونی" پر مفصل لکھا ہے۔ یہ کتاب حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔ بحوالہ ڈاکٹر نبی ہادی و ظیفہ یاب، صدر شعبۂ فارسی۔ علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ، راقم نے اس کتاب کی زیراکس حاصل کرنے کی بیشتر کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا ۳۱؎ تذکرہ نویسی فارسی، ہند و پاک از دکتر سید علی رضا نقوی ص ۱۳۵/ ۱۳۷ ۳۲؎ دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب ص ۲۱ ۳۳؎ شیخ المحققین ابوالقاسم نے مندرجۂ ذیل اشعار صوفی کی تعریف میں کہے تھے۔

دمید صبح و شب من زمن کنار نکرد — جہان شگفت و گلستان من بہار نکرد
شنا و مدح برآمد دوبارہ گرد جہان — بجز (محمد صوفی) کس اختیار نکرد

(بحوالہ دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب ص ۹۲) ۳۴؎ دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب ص ۲۱ ۳۵؎ تذکرۂ ریاض العارفین از ہدایت "صوفی۔ مدتی در کشمیر بودہ" ص ۲۱۷ ۳۶؎ تذکرۂ روز روشن از صبا "شہر گجرات را خوش کردہ و در آنجا اقامت گزید" ص ۴۱۵ [تذکرۂ صبح گلشن از منشی عبدالعزیز "در ہندوستان رسیدہ" گلزمین کشمیر خوش کردہ توطن اختیار نمود بھوپال ص ۳۷۸ تذکرۂ صبح صادق: بحوالہ میخانہ (گلچین معانی) "در گجرات مقیم گشت و سالہا درین دیار ماند" ص ۴۷۶ ۳۷؎ بحوالہ میخانہ از احمد گلچین معانی ص ۲۴۸ تاریخ نظم و نثر فارسی، نفیسی ص ۵۳۷ ۳۸؎ ماثر الامرا از شاہنواز خاں "ملا محمد صوفی مازندرانی در جوانی از ایران آمدہ اکثر ممالک ہندوستان را بقدم سیر و سیاحت پیمودہ" ۳۹؎ تذکرۂ عرفات العاشقین از تقی اوحدی۔ دیکھیے محمد صوفی "ص ۱۰۷ ۴۰؎ دیوان صوفی (کشکول) نیشنل میوزیم دہلی، نمبر ۱۴۳/۵۶ زیراکس مملوکہ راقم ۴۱؎ تذکرۂ بتخانہ از صوفی مازندرانی (دیکھیے تصانیف صوفی) ۴۲؎ تذکرۂ عرفات العاشقین از تقی اوحدی ۴۳؎ تذکرۂ میخانہ از عبدالنبی ص ۲۴۶

امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ

احوال و آثار

از
جناب شیخ نذیر حسین صاحب، لاہور

"راقم السطور نے معاصر ترک فاضل فواد سیزگین کی شہرۂ آفاق کتاب "تاریخ التراث العربی" کا مفصل تعارف معارف (جون ۱۹۹۰ء) میں کرایا تھا۔ موصوف کو علم حدیث سے بڑی دلچسپی ہے، بالخصوص علم حدیث میں اسناد کی اہمیت ان کا محبوب موضوع ہے، انھوں نے کتاب مذکور کی دوسری جلد "کتاب علوم القرآن والحدیث" میں سنن ترمذی، اس کی شروح، حواشی اور مختصرات کا شرح و بسط سے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ امام ترمذیؒ کی دوسری کتابوں کا بھی بیان ہے، موضوع کی اہمیت کے پیش نظر سنن ترمذی سے متعلق باب کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ راقم کو جہاں اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہے ان کو قوسین [ ] میں لکھ دیا ہے۔" (نذیر حسین)

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ السلمی الترمذی ۲۱۰ھ/۸۲۵ء میں بوغ کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بوغ ترمذ کے نواح میں دریائے جیحون کے کنارے واقع ہے۔ منجملہ دیگر اساتذہ کے امام بخاریؒ بھی امام ترمذیؒ کے استاد تھے۔ جن کی وفات کے بعد امام ترمذیؒ کا خراسان میں شہرہ بلند ہوا۔ افسوس ہے کہ ہم امام ترمذیؒ کی زندگی کے

بیشتر واقعات سے بے خبر ہیں۔ یہاں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ آخری عمر میں نورِ بصارت سے محروم ہوگئے تھے۔ انھوں نے ترمذ میں ۲۷۹ھ/۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ان کی اہم ترین تالیف جامع الترمذی ہے جس میں وہ سلسلۂ سند کی کیفیت کے علاوہ مختلف فقہاء کے مذاہب اور ان کے اختلاف پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے جامع الترمذی کو صحاح ستہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ امام صاحب کے حالات کے مآخذ و مصادر حسب ذیل ہیں:-

(۱) ابن الندیم، الفہرست، ص ۲۳۳؛ (۲) السمعانی، کتاب الانساب، ص ۱۰۶؛
(۳) ابن خلکان، وفیات (طبع بولاق)، ۱: ۶۱۲ تا ۶۱۳؛ (۴) الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ص ۶۳۳ تا ۶۳۵؛
(۵) الذہبی، میزان الاعتدال، ۳: ۱۱۷؛ (۶) الصفدی، الوافی بالوفیات، ۴: ۲۹۴ تا ۲۹۶؛
(۷) ابن حجر، التہذیب، ۹: ۳۸۷ تا ۳۸۹؛ (۸) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۱: ۶۶ تا ۶۷
(۹) ابن العماد، شذرات الذہب، ۲: ۱۷۴ تا ۱۷۵؛ (۱۰) الزرکلی، الاعلام، ۷: ۲۱۳؛
(۱۱) الکحالہ (معجم المولفین) ۱۱: ۱۰۴ تا ۱۰۵
(۱۲) (مولوی) محمد یوسف بنوری (الترمذی صاحب الجامع فی السنن) در مجلۃ المجمع العلمی العربی السوری (دمشق)، ۱۹۵۷ء، ج ۳۲، ص ۳۰۸ تا ۳۲۶۔

اُردو کتب

[(۱۳)] شاہ عبدالعزیز دہلوی (بُستان المحدثین، اردو ترجمہ، ۲۸۹ تا ۲۹۵) مطبوعہ کراچی۔
[(۱۴)] مولوی ضیاء الدین اصلاحی (تذکرۃ المحدثین) ج ۱، ص ۳۱۴ تا ۳۴۴، مطبوعہ اعظم گڈھ

ان کے علاوہ وسٹن فیلٹ، گولٹ تسیہر اور روبسن نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی و جرمن ایڈیشن) اور دوسرے علمی رسائل میں امام ترمذی اور جامع ترمذی پر مقالات لکھے ہیں۔

تالیفات و تصانیف | ۱۔ الجامع الصحیح الجامع الترمذی کے مطالعات و دراسات

ابو القاسم عبید بن محمد بن عباس .... المتوفی ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء

(فضائل الکتاب الجامع)، قلمی نسخہ انقرہ میں ہے۔

الجامع الترمذی کے قلمی نسخے مشرق و مغرب کے تمام کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بارہا قاہرہ، دہلی اور لکھنؤ اور کراچی میں چھپ چکا ہے۔ اس کی بہترین طباعت قاضی احمد محمد شاکر کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔ (قاہرہ، ۱۹۳۰ء)

جامع الترمذی کی شروح

(۱) ابوبکر محمد بن العربی المعافری، المتوفی ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء

(عارضۃ الاحوذی) کان پور اور قاہرہ میں چھپ چکی ہے۔

(۲) حسین بن مسعود البغوی، المتوفی ۵۱۰ھ/۱۱۱۷ء (شرح الترمذی) آخری جلد کتاب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ میں ہے۔

(۳) ابو الفتح محمد بن محمد بن سید الناس، المتوفی ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء (شرح الترمذی) استانبول میں ایک جلد ہے۔

(۴) زین الدین عبد الرحیم بن الحسینی العراقی، المتوفی ۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء (شرح الترمذی) انھوں نے دو شرحیں لکھی تھیں

(ا) ابن سید الناس کی شرح کا تکملہ، اس کے نسخے اسکوریال اور مدینہ منورہ میں ہیں۔

(ب) یہ شرح انھوں نے متعدد عنوانوں کے تحت لکھی تھی، اس کی صرف ساتویں جلد کا نسخہ استانبول میں ہے۔

(۵) جلال الدین السیوطی (قوت المغتذی) (استانبول میں چند اجزا ہیں۔ اسکا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ چکا ہے، مطبوعہ کان پور ۱۲۹۹ھ۔

(الف) علی بن سلیمان الدمنی البجمقوی، المتوفی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء

(نفع قوت المغتذی) یہ قوت المغتذی کا انتخاب ہے، مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۸ھ
اور دہلی کی اشاعت کے حاشیہ پر بھی چھپ چکا ہے۔

(۶) سراج احمد سرہندی (شرح الترمذی) فارسی، مطبوعہ کان پور ۱۲۹۹ھ۔

(۷) محمد بن الطیب السندی المدنی، المتوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء (شرح) مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں چند اجزا ہیں۔ یہ بھی شروح اربعہ میں شامل ہے۔

(۸) اشفاق الرحمٰن کاندھلوی (الطیب الشذی علی جامع الترمذی) مطبوعہ دہلی ۱۹۴۳ء۔

(۹) عبدالرحمٰن احمد بن رجب الحنبلی، المتوفی ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء (شرح علی کتاب الجامع الترمذی) استانبول اور قاہرہ میں چند اجزا ہیں۔

(۱۰) عبدالقادر بن اسماعیل الحسنی القادری (شرح الجامع الترمذی) دارالکتب قاہرہ میں تین جلدیں ہیں۔

(۱۱) (مولانا) محمد انور شاہ، المتوفی ۱۹۳۳ء (العرف الشذی علی جامع الترمذی) طبع دہلی ۱۳۴۳ھ۔

(۱۲) مولانا رشید احمد گنگوہی: (الکوکب الدری) یہ مولانا گنگوہی کی درسی تقریر ہے جسے پہلے مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور بعد ازاں مولانا محمد زکریا سہارنپوری المتوفی ۱۹۸۲ء نے اپنے افادات کے ساتھ دہلی سے شایع کیا۔

(۱۳) مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (تحفۃ الاحوذی) یہ جامع الترمذی کی جلیل القدر شرح ہے جو لطیف نکات اور مفید تحقیقات پر مشتمل ہے اور ایک ہندوستانی محدث کا عظیم القدر کارنامہ ہے، یہ پہلے دہلی اور بعد ازاں بیروت سے چھپ کر

شایع ہوچکی ہے اور عرب ممالک میں بے حد مقبول ہوئی ہے۔ حال ہی میں اس کا خوبصورت ایڈیشن ۹ جلدوں میں قاہرہ سے شایع ہوا ہے، اس کا مقدمہ بہت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

(۱۴) محمد یوسف بنوری عربی، شرح ترمذی کی صرف تین جلدیں شایع ہوسکی ہیں۔

(۱۵) محمد تقی عثمانی (درس ترمذی اردو) دو جلدیں مطبوعہ کراچی۔

(۱۶) مولوی محمد چراغ (گوجرانوالہ) المتوفی ۱۹۹۰ء انھوں نے بعض مشکل احادیث کی شرح لکھی ہے]۔

جامع الترمذی کے مختصرات | (۱) نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی بن عبدالکریم بن سعید البغدادی المتوفی ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء (مختصر من جامع الصحیح) دارالکتب قاہرہ میں ایک جلد ہے۔

(۲) محمد بن عقیل البالسی، المتوفی ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء (مختصر من جامع الصحیح) پیرس میں دو جلدیں ہیں۔

(۳) ابوالفضل محمد تاج الدین عبدالمحسن القلعی (مختصر من جامع الصحیح) تالیف ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء قاہرہ اور موصل میں بعض اجزا ہیں۔

ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا حاشیہ بہت نفع بخش ہے اور اہل علم میں مقبول ہے۔

۲۔ کتاب الشمائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارک، حلیہ مبارک، آپؐ کے عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، ساز و سامان اور روزانہ معمولات کے متعلق احادیث امام ترمذی نے کتاب الشمائل میں جمع کردی ہیں، یہ کلکتہ، دہلی اور قاہرہ میں بارہا چھپ چکی ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ ڈاکٹر ہدایت حسین

(کلکتہ) نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں کئی اقساط میں شایع کرایا تھا۔

[اردو ترجمہ خصائل نبوی کے نام سے مولانا محمد زکریا سہارن پوری (المتوفی ۱۹۸۲ء) نے کیا تھا، جو دہلی اور کراچی سے کئی بار شایع ہو چکا ہے]

[مولانا نورالحق بن شاہ عبدالحق دہلوی نے شمائل کی شرح فارسی میں لکھی تھی جسکا قلمی نسخہ رام پور میں ہے]

شمائل کی بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ابراہیم بن محمد بن عرب شاہ، المتوفی ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء اس کے نسخے استانبول اور دمشق میں ہیں، اس کا فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲) احمد بن حجر الھیثمی، المتوفی ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء (اشرف الوسائل) استانبول قاہرہ اور انگلستان کے بہت سے کتاب خانوں میں قلمی نسخے ہیں۔ اس کا اختصار محمد بن احمد الخریشی نے کیا تھا اور اس پر حواشی احمد بن محمد المنہوری علی نورالدین الشبرا ملسی المتوفی ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء نے لکھے تھے، چند اجزا الجزائر میں ہیں۔

(۳) ملا محمد الشروانی البخاری، زمانۂ حیات دسویں صدی ہجری شرح کا قلمی نسخہ تونس میں ہے۔

(۴) راجی حاجی الحرمین، تلمیذ علی ہمدانی — ۹۷۸ھ (حاشیہ فارسی)

(۵) ملا علی القاری الھروی، المتوفی ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء (جمع الوسائل) استانبول میں یہ شرح چھپ چکی ہے۔

(۶) محمد بن قاسم ابی عبداللہ الجسوس، المتوفی ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۴ء (الفوائد الجلیلہ البہیتہ) قاہرہ میں یہ شرح ۱۳۰۶ھ میں چھپی تھی۔

(۷) عبدالرؤف المناوی، المتوفی ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء (شرح الشمائل) مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۱۷ھ۔

(۸) ابراہیم بن ابراہیم اللقانی، المتوفی ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء (بہجۃ المحافل و اجمل الوسائل) مختلف اجزاء الجزائر، برلن اور اسکندریہ میں ہیں۔

(۹ الف) سلیمان بن عمر الجمل، المتوفی ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۸ء، المواہب المحمدیہ، چند جلدیں استانبول اور بانکی پور میں ہیں۔

(۹) ابراہیم بن محمد الباجوری، المتوفی ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء (المواہب اللدنیہ علی شمائل المحمدیہ) قاہرہ میں بارہا چھپ چکی ہے۔

(۱۰) ابوالقاسم بن ابی البرکات بن احمد بن عبدالملک بن مخلص (انجح الوسائل) رباط، طنجہ اور فاس میں نسخے ہیں۔

(۱۱) ابو عبداللہ محمد بن احمد بنانی فرعون، المتوفی ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء، رباط میں بعض اجزا ہیں۔

(۱۲) مولوی شمس الدین محمد عاشق بن عمر الحنفی، مکتوبہ ۹۳۵ھ۔ بانکی پور میں ۱۲۵ اوراق ہیں۔

(۱۳) حاجی محمد کشمیری، المتوفی ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء (شرح فارسی) بانکی پور میں ناقص نسخہ ہے۔

(۱۴) ابوالخیر فضل اللہ بن روزبہان (نشر الفضائل فی شرح الشمائل) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) میں ۱۵۳ اوراق، مکتوبہ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء ہیں۔

(۱۵) مصلح الدین محمد اللاری المتوفی ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء (شرح الشمائل) بہت سے

نسخے استانبول میں ہیں۔

(۱۶) ابراہیم بن مصطفےٰ الواحدی، المتوفی ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء (شرح) استانبول میں چند اوراق ہیں۔

(۱۷) عبداللہ الحموی المدرونی الازہری (شرح) مولفہ ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء کتبخانہ الظاہریہ (دمشق) میں ۸۹ اوراق ہیں۔

(۱۸) اسماعیل مفید آفندی الاستنبولی، المتوفی ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء (شرح شمائل) ۱۴۲ اوراق استانبول میں ہیں۔

(۱۹) سید بابا القادری الحیدر آبادی بن محمد یوسف القادری (سراج النبوۃ) اردو شرح جو ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں لکھی گئی، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں قلمی نسخہ ہے۔

(۲۰) ابو عبداللہ محمد بدرالدین بن شاذلی بن احمد الحسنی، المتوفی ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء (وسیلۃ الفقر المحتاج فی شرح شمائل صحیح اللواء والتاج) رباط (مراکش) میں ایک جزء ہے۔

(۲۱-۲۲) بعض نامعلوم شارحین نے بھی شمائل کی فارسی میں شرحیں لکھی ہیں۔

(۲۳) اسحاق خواجسی احمد آفندی، المتوفی ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء (اقوم الوسائل فی ترجمۃ شرح الترمذی) ترکی ترجمہ جو استانبول میں ہے۔

۳۔ تسمیۃ اصحاب رسول اللہ، استانبول میں چند اوراق ہیں۔

۴۔ کتاب العلل یہ علل حدیث پر مختصر رسالہ ہے، استانبول میں ۷۷ اوراق ہیں۔ اس کی شرح عبدالرحمن بن احمد ابن رجب الحنبلی، المتوفی ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء استانبول اور قاہرہ میں اس کے نسخے ہیں۔ بروکلمان کے مطابق یہ کتاب جامع الترمذی کی شرح ہے۔

خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم مخطوطات

از پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں کلکتہ

بعض عرب اہل دل اور اہل خیر کی مالی امداد سے تین سال قبل لندن میں الفرقان اسلامی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کا ایک اہم اور بنیادی کام دنیا میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو اسلامی مخطوطات کا تفصیلی جائزہ لینا ہے، اس فاؤنڈیشن کا افتتاحی جلسہ گذشتہ نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں لندن میں منعقد ہوا تھا اور اس موقع پر ایک بین الاقوامی سیمنار کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، یہ مقالہ اسی میں انگریزی میں پیش کیا گیا تھا، جس کا اردو ترجمہ قارئین معارف کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

قرآن مجید کی پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا" (سورہ علق: آیت ۱-۴) ہے۔ یعنی لکھنے کا فن قرآن کی پہلی آیت کے ساتھ ہی مقدس قرار پایا، اسی لیے مخطوطات کی کتابت، نقل، تنزئین اور نقاشی اسلامی تہذیب کا ایک بہت ہی اہم کارنامہ تصور کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی کتابت پر مکمل توجہ دی گئی اور اس کی ہر جلد کی نقاشی اور تزئین پر تمام کوششیں صرف کی گئیں۔ اس طرح تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مخطوطات کی تزئین اور نقاشی پر بھی توجہ کی جاتی رہی۔

مخطوطات کی نقل اور تزئین میں اس غیر معمولی دلچسپی کے تمام اسباب کا احاطہ

ممکن نہیں لیکن یہاں چند وجوہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مسلمان قرآن مجید کو ایک الہامی کتاب تصور کرتے اور نمازوں میں اس کی تلاوت کرتے ہیں اس لیے قرآن مجید سے ان کی دلچسپی والہانہ ہے۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کا سلسلہ قرآن، حدیث اور دیگر اسلامی موضوعات کی خواندگی سے شروع ہوتا ہے عالم اسلام کی درسگاہوں میں خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی رفتہ رفتہ عربی خط جس میں فارسی زبان بھی لکھی جاتی ہے پیشہ ور اور ماہر خطاطوں کے ذریعہ جمالیاتی سطح پہ ارتقا اور تکمیل کی جانب بڑھتا رہا۔

اسلامی فنون میں ایک اہم فن خطاطی بھی ہے۔ چونکہ اسلام میں مصوری اور بالخصوص انسانی جسم کی نقاشی کی ممانعت تھی اس لیے مسلمانوں نے تمام تر توجہ خطاطی پہ مرکوز کی اور اسے زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کی کوشش کی۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کی تحریروں میں عربی فارسی اور ترکی خط کے کچھ نمونے دنیا کی خوبصورت تحریروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تمام عالم اسلام میں کتب خانوں کے قیام نے بھی خطاطوں کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور مخطوطات کی ذخیرہ اندوزی کے رجحان کو فروغ ملا۔ شاہی کتب خانے قائم ہوئے اور حکمرانوں نے مخطوطات کا ذخیرہ جمع کیا۔ شاہی کتب خانوں کے علاوہ لوگوں نے اپنے ذاتی ذخائر کو عوامی کتب خانوں میں وقف کر دیا۔ ان ذاتی کتب خانوں کی وجہ سے مخطوطات کی طلب اسلامی موضوعات پہ بہت بڑھ گئی۔ راقم الحروف کو اب تک یہ معلوم نہیں ہے کہ عالم اسلام کے علاوہ بھی کسی قوم نے مخطوطات کی تزئین اور نقاشی میں اتنی دلچسپی اور محنت سے کام لیا ہو۔

تمام اہم شہروں میں جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے مخطوطات کے ذخیرے اور کتب خانے موجود ہیں۔ انتہائی نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ کتابت

کرنے والے پیشہ ور اور ماہر خطاطوں کی موجودگی نے بھی مسلمانوں کی دلچسپی مخطوطات میں کافی بڑھا دی ہے۔ حکمرانوں، امراء بلکہ عوام نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح کتابوں کے بازار سوق الورّاقین وجود میں آئے جہاں دلکش اور خوبصورت مخطوطے کی زیادہ سے زیادہ قیمت دی جاتی تھی۔ عالم اسلام کے دارالسلطنت میں کتابوں کے بازار کے متعلق معلومات عصری تاریخ اور سوانح کی کتابوں میں موجود ہیں۔ مخطوطات کی کتابت ایک اہم ذریعہ معاش تھا اور مخطوطات کی خرید و فروخت نفع بخش کاروبار۔

خطاطی کی تربیت | خطاط اسلامی سماج کا ایک ذی عزت اور باوقار فرد ہوا کرتا تھا۔ جیسے قرآن مجید کی صحیح اور خوبصورت کتابت کے لیے خدا سے خاص انعام پانے کی آرزو تھی۔ عام طور پر کاغذ ساز اور کتب فروش پیشہ ور کاتب ہوا کرتا تھا۔ کاتبوں کو کچھ اصولوں کی پابندی کرنا پڑتی تھی کیونکہ وہ کتابیں جن پر وہ کام کرتے تھے مقدس ہوا کرتی تھیں اور کتابوں کی نقل کرنے کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ کاتبوں کو اسی لیے مقررہ اصول اور ادب کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ مذہبی ادب کا تقاضہ تھا کہ کاتبوں کی نیت صالح ہو کتابت کے وقت وہ طہارت میں ہو، قبلہ رو ہو کر بیٹھے اور پاک و صاف کپڑے پہنے اور اپنا کام بسم اللہ، حمد الٰہی خدا کی توصیف اور تصلیہ (آنحضرتؐ اور ان کے خاندان کی توصیف) سے شروع کریں۔ اگرچہ یہ چیزیں اصل مخطوطے میں نہ بھی موجود ہوں تب بھی اس کا اہتمام کریں۔ کاتبوں کو ایک اور بنیادی کام یہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ مخطوطے کو ترتیب دیا کرتے تھے۔

ان بنیادی معروضات کے بعد ہم ہندوستان میں اسلامی مخطوطات خاص کر عربی و فارسی مخطوطات کے موضوع پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں اردو مخطوطہ

بھی خاصی تعداد میں ہیں لیکن تر کی مخطوطات نایاب ہیں۔ اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان[1] کے مسلمان بھی مخطوطات میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، ماضی میں شاہی کتب خانے، عوامی کتب خانے اور ذاتی کتب خانے موجود تھے، مسلم حکمراں بالخصوص مغل تاجدار مخطوطے کی کتابت اور نقاشی میں کافی دلچسپی لیتے تھے اور انہیں خرید کر اپنے کتب خانوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں صرف قدرداں نہ تھے بلکہ مخطوطات جمع کرنے میں کافی دلچسپی لیتے تھے، ان لوگوں کے مخطوطے کی کتابت اور نقاشی کے لیے اپنا عملہ تھا جس میں وقت کے مانے ہوئے خطاط اور نقاش ملازم تھے۔ ان کو کارخانہ کہا جاتا تھا۔ ایسے بہت سے مخطوطوں پر ان بادشاہوں کے دستخط اور حاشیے موجود ہیں جن کی قرأت ان بادشاہوں نے کی۔ شاہی کتب خانوں میں ان مخطوطات کے داخلے کی تاریخ یا خواندگی کی تاریخ بھی تحریر کردہ ملتی ہے۔ اکبری عہد میں ایسے دو[2] مخطوطات جن کی تزئین اور نقاشی بے مثال ہے حمزہ نامہ اور رزم نامہ ہے جو مہابھارت اور رامائن کا فارسی ترجمہ ہے۔

جنوب کی آزاد ریاستوں کے فرمانروا جیسے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے کتبخانے بھی معروف ہیں۔ عوامی کتب خانے بھی قائم تھے اور خصوصی ذاتی لائبریریاں بھی عام تھیں۔ شاہی کتب خانوں کے کچھ مخطوطات ایشیاٹک سوسایٹی بنگال نیشنل لائبریری کلکتہ، خدابخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان لائبریری، رضا لائبریری رامپور، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز لائبریری نئی دہلی، سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد، اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری، مدراس اور دوسری جگہوں[3]

---

[1] حاشیہ صفحہ ۲۰۳ پر ملاحظہ ہو۔

پر محفوظ ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے سبب خاکسار یہاں صرف دس[1] اہم مخطوطات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

۱۔ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ ہے جو خط غبار میں ہے اور خفی حرفوں میں لکھا گیا ہے۔

۲۔۳۔ خدابخش لائبریری میں قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کا کتابت کردہ ہے۔ یہاں ابن مقلہ کا کتابت شدہ قرآن مجید کا ایک نسخہ بھی موجود ہے جو نسخ میں ہے۔

۴۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ہجرت کے دن تک مکہ کی تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے ایک واحد نسخہ ہے۔

۵۔ نیشنل لائبریری کلکتہ میں تاریخ ہرات کا ایک بے بہا نسخہ موجود ہے۔ اس میں ۱۲۲۱ سے ۱۳۳۱ تک کی ہرات کی تاریخ ملتی ہے۔ یہ مخطوطہ شایع ہو چکا ہے۔

۶۔ ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ میں بادشاہ نامہ کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں شاہجہاں کے عہد کی تاریخ درج ہے یہ نسخہ خطاطی کا عمدہ نمونہ ہے اس پر شاہجہاں کا دستخط موجود ہے۔

۷۔ ایشیاٹک سوسایٹی میں شہزادی زیب النساء مخفی کا دیوان موجود ہے۔ شہزادی مخفی اورنگ زیب کی بیٹی تھی۔ یہ مخطوطہ بھی خطاطی اور نقاشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

---

[1] معارف: انھی جگہوں میں دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کا کتب خانہ بھی ہے، جس میں مخطوطات کا ذخیرہ بہت زیادہ تو نہیں ہے تاہم بعض بہت قیمتی نوادر ہیں۔ مقالہ نگار کا انتخاب کلکتہ اور پٹنہ ہی کے مخطوطات تک محدود ہے۔

۸۔ ایشیاٹک سوسائیٹی میں ابو علی ہارون کی کتاب التعلیقات والنوادر کا نادر مخطوطہ موجود ہے۔ دنیا کے کسی بھی کتب خانے میں اس کی کوئی کاپی موجود نہیں ہے۔

۹۔ علم نجوم پر ایک اہم مخطوطہ ہے جس میں بہت سارے گوشوارے ہیں۔ اس کے مصنف کا نام اشرالدین المفضل ابن عمر الابہری ہے۔ مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظلِ شاہی کی تلخیص ہے۔

۱۰۔ خدابخش لائبریری میں تاریخ خوارزم شاہی کا ایک نسخہ ہے یہ کتاب طب پر ہے اور مصنف کی موت کے . برسوں بعد ۱۱۴۵ میں نقل کی گئی۔

عام اندازے کے مطابق دنیا میں ۳۰ لاکھ مخطوطات ہیں جن میں اب تک ۶ لاکھ کی فہرست تیار کی جاسکی ہے اور انتہائی قلیل تعداد میں مرتب کیا جاسکا ہے۔ یہ مخطوطات عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں ہیں۔ علاقائی زبانوں میں موجود اسلامی مخطوطات پر ہنوز توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلامی مخطوطات کے جائزے پر اب تک پوری توجہ نہیں دی جاسکی ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ مذکورہ بالا چار زبانوں میں کل کتنے مخطوطات ہیں۔

میرے اس نامکمل جائزے سے اسلامی مخطوطات سے متعلق ایک اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف کتب خانوں کا جائزہ لینے اور وسیع تحقیق کی ضرورت ہے جو سردست ممکن نہیں ہو سکا۔ ذاتی ذخائر پر بھی کئی دشواریوں کی بنا پر توجہ نہیں دی جاسکی۔ ایسے کچھ خاندان جو زیادہ تر اتر پردیش اور جنوبی ہند کے ہیں اپنے ذخیروں کو دکھانا پسند نہیں کرتے۔ ایسے ذخائر کی فہرست بھی تیار نہیں۔

ان ذخائر میں کیسے کیسے نایاب موتی پوشیدہ ہیں کسی کو خبر نہیں۔ مثال کے طور پر تاملناڈو کے آرکاٹ کے نواب کا ذخیرہ جس میں کئی نادر مخطوطے ہیں۔

ایسے کچھ ذاتی ذخیرے بڑے بڑے کتب خانوں مثلاً مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ مولانا آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، خدا بخش لائبریری پٹنہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز لائبریری نئی دہلی، رضا لائبریری رامپور وغیرہ کو دیدیے گئے ہیں ان میں کچھ ذخائر کی فہرست شایع ہو گئی ہیں اور کچھ باقی ہیں الفرقان فاونڈیشن لندن کے مقاصد میں ایک مقصد ہندوستان میں ذاتی ذخائر میں اسلامی مخطوطات کا جائزہ بھی ہونا چاہیے۔

ایسے تمام اسلامی مخطوطات جو علم میں آچکے ہیں ان کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ہندوستان میں ایسے بہت سے کتب خانے ہیں جنکی فہرست تیار کی گئی ہے۔ لیکن شایع نہیں ہو سکی۔ ان کی اشاعت مفید ہوگی۔ ایسی فہرستیں جو جملہ فارم میں ہیں ان سے مخطوطے کی اہمیت واضح نہیں ہوتی اسی لیے وہ زیادہ مفید نہیں ہیں۔ فہرستیں ایسی مرتب کرنی اور شایع کی جانی چاہئیں جن سے مخطوطے کی اہمیت اور افادیت کی وضاحت ہو اور اس کا پتہ بھی چلے کہ یہ واحد نسخہ ہے یا دوسرا کوئی نسخہ کسی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ترقیمہ بھی ضرور درج کیا جانا چاہیے تاکہ اندازہ لگ سکے کہ اس کی عمر کیا ہے۔ سائنسی موضوعات پر خاص کر ریاضی، نجوم اور طب کے مخطوطات کی فہرست مخصوص طریقہ پر تیار کی جانی چاہیے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ ناقابل لحاظ ہے جو درست نہیں۔ چونکہ سائنس کے موضوعات پر مخطوطات کی فہرست سازی

نہیں ہوئی ہے اور خال خال مخطوطات کو مرتب اور شایع کیا جا سکا ہے۔ اس لیے اس میدان میں مسلمانوں کی کاوشوں کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے۔ الفرقان فاؤنڈیشن سائنسی موضوعات پر مخطوطات کو مرتب کروانے اور شایع کروانے کا پروجکٹ تیار کرسکتی ہے۔ ایسے مخطوطات پر تنقیدی نوٹ ہونا چاہیے اور متن کی صحت کا خیال رکھا جائے نیز انگریزی میں ان پر مقدمہ اور اس کی تلخیص بھی شامل ہو تاکہ مسلم سائنس دانوں کی خدمات کا اعتراف ہوسکے۔ جب مسلمانوں کے لکھے ہوئے مخطوطات کی خاصی تعداد شایع ہوگی تب ہم اطمینان بخش طریقے پر سائنسی موضوعات پر مسلمانوں کی خدمات کی تاریخ لکھنے کے لایق ہو پائیں گے۔

الفرقان اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن کا قیام ایک عمدہ اقدام ہے اور تمام دنیا میں اسلامی مخطوطات کا جائزہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اس کی ابھی ابتدا ہوئی ہے۔ ہمیں طویل مسافت طے کرنی ہے راستہ طویل ہی نہیں دشوار بھی ہے۔ لیکن محنت اور خدا پر بھروسہ انشاء اللہ کامیابی عطا کرے گا۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے فن تعمیر، رفاہِ عام کے کام، شہروں اور گاؤں کی آبادی، باغات، حیوانات، ترقی تعلیم، کاغذ سازی، کتب خانے وغیرہ کا مفصل تذکرہ اور تیموری عہد کے فن خطاطی پر شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی سیر حاصل تحریر بھی ہے۔

قیمت ۴۰ روپیے۔

"منیجر"

بائبل میں قدیم ہندوستانی ثقافت کے اثرات

از جناب گوردیال سنگھ مجذوب، دہلی

ہندوستانی ثقافت دنیا کی قدیم ترین ثقافت خیال کی جاتی ہے۔ اس کا ادب بہت وسیع اور جامع ہے۔ جس کا نشان یونان، مصر، روم اور ایران کے مختلف قدیم آثار اور تحریری نقوش میں ملتا ہے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ فاتح قوموں کا اثر مختلف حیثیتوں سے مفتوح اقوام پر پڑتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مفتوح قومیں فاتح اقوام کی زبان، ان کے الفاظ بلکہ ان کے ناموں کو بھی اپنا لیتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو یہاں کے باشندوں نے اپنے عقیدہ پر رہتے ہوئے غیر ملکی اثرات قبول کر کے اس طرح کے نام اختیار کر لیے۔ اقبال سنگھ، زورآور سنگھ، فتح چند، خوب چند، خوش وقت سنگھ، بختاور سنگھ، مختار سنگھ، عجائب سنگھ وغیرہ۔

راقم کو خود ایک فارسی کتاب کے مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ ایران میں اب تک صحرائے ارجن موجود ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ مصر کا نام دراصل "مشتر" تھا جو سنسکرت کا ہی لفظ ہے بعد میں یہی لفظ شہر کے معنیٰ میں عربی لغت میں داخل ہو گیا اور تو اور مصر میں ایک جگہ کا نام "سوھاج" ہے یہ لفظ میری حقیر رائے میں "سوھاج" نہیں بلکہ "سوہاگ" تھا۔ اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شطرنج جس کو ساری دنیا میں

رواج نصیب ہوا۔ یہ ہندوستانی ثقافت ہی کی دین ہے لیکن اس لفظ کی شکل بدل چکی ہے۔ کیونکہ اس کی ہیئت "چترانگ" تھی۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ عربی زبان میں کئی حروف تہجی ہندوستانی لہجے کو ادا نہیں کر پاتے اس لیے ان کو بدل دیا جاتا ہے جیسے "چ" عربی زبان میں ادا نہیں کیا جا سکتا اسے "ش" میں بدل دیتے ہیں اور "گ" کو "ج" میں تبدیل کر دیتے ہیں بلکہ آج کل تو "ج" کو "غ" میں بدلنا بھی شروع ہو گیا ہے۔ پہلے "گیتا" لفظ کو "جیتا" لکھتے تھے اب "غیتا" بھی بولنے اور لکھنے لگے ہیں۔

مجھے عربی زبان میں بائبل کے مطالعہ کا موقع ملا تو عہد نامہ قدیم میں بہت سے ایسے نام ملے جو قدیم ہندوستانی ثقافت و تہذیب کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس زمانہ کے عام لوگوں ہی نے نہیں بلکہ حکمرانوں اور بادشاہوں نے بھی ہندوستانی نام اسی طرح اپنا لیے تھے جس طرح خود اہل ہند اسلامی تہذیب سے متاثر ہو کر اس کے الفاظ کو اپنا چکے ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ کئی حروف تہجی کی شکل و صورت انگریزی زبان میں اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی ہے۔ عموماً بائبل میں حرف "ی" "ج" میں بدل دیا گیا ہے اس کی مثال نیچے دی جا رہی ہے۔

عربی زبان میں شکل	انگریزی زبان میں تبدیل شدہ حالت
ایوب	JOB
یونس	JONA
یسوع	JESUS
یحییٰ	JOHN

JACOB	یعقوب
BENJAMIN	بنیامین

یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام تھا جس کی صحیح صورت بنی آمین ہونا چاہیے۔ اسی طرح کئی جگہ "تھ" کو عربی میں حرف "ث" سے بدل دیا گیا ہے جیسے "ایلزبیتھ" کو "ایلزبث" اور حرف "واؤ" کو حرف "ب" میں "دیو" کی جگہ "دیب"

ان مثالوں کو اس لیے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ بائبل میں درج نام کی اصل ہیئت پورے طور پر واضح ہو سکے۔ ورنہ ہم کو اصلاً لفظ "رام" پر بحث و گفتگو کرنی ہے جس کو قدیم ہندوستانی ثقافت اور الٰہیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں ایک جگہ کا نام "رام اللہ" ہے جو مغربی جارڈن (یردن) میں یروشلم کے شمال میں واقع ہے اور ابھی تک قائم دائم ہے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت عربی میں کتاب مقدس کا وہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ یہاں اسی کے صفحوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

متن میں موجود لفظ	صفحہ	ملاحظات
ھُورام	۶۸۲	X
ھَدورام	۶۹۹	X
یَھُو رام	۷۰۳-۷۰۶	اس کی اصلی شکل "بجے ہورام" ہو سکتی ہے "ج" کو "ی" میں بدل دیا گیا۔
یورام	۷۱۱	"جیورام" ہو سکتا ہے "جیم" کو "یا" میں بدل دیا۔
ترشاثا	۷۴۱	"ترِی شاسن" ایک ہی وقت میں تین جگہوں پر شاسن چلانے والا۔

متن میں موجود لفظ	صفحہ	ملاحظات
یوذاباد	۷۵۴	غالباً اصلی شکل میں "جودھاپد" یا "یودھاپد" ہونا چاہیے۔
شتربوذنای	۷۴۴	چتربدھ نیائے تھا کیونکہ لارڈ بدھا کو عربی والے بدھ کی بجائے "بوذا" لکھتے ہوئے "دھ" کو یا تو "ذ" یا "ز" میں بدل دیتے ہیں۔
زاموث	۷۵۴	"رام متھ" تھا۔
ناثان	۷۵۴	"ناتھن" تھا۔ "تھ" کو "ث" میں بدل دیا گیا۔
شارَائی	۷۵۴	"شری" ہو سکتا ہے۔
یَدُو	۷۵۴	"جودھو" ہو سکتا ہے جو یودھا کی بگڑی شکل ہے۔
یُوناثان	۷۷۴	"جے ناتھن" تھا۔
یُویادَاع	۷۷۴	"یودھا" تھا اصل شکل میں!
مَھُومان	۷۷۹	"مہامان" ہو سکتا ہے۔
کرشنا	۷۸۰	"کرشنا" لارڈ کرشنا پر دلالت کرتا ہے۔
دشیثار	۷۸۰	دراصل یہ "دِ چتر" تھا کیونکہ عربی والے کبھی کبھی "ت" کو "ث" میں بدل دیتے ہیں، جیسے عربی والوں نے گیتار GUITAR کو "قیثارہ" کر کے "ت" کو "ث" میں بدلا ہے۔

اردو میں سکھ گوروٗ اور سکھ پوتھیاں

از

جناب رام لعل نابھوی صاحب

(۲)

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۰۷	گورو گوبند سنگھ	آنند کشور مہتہ	ورمن ۱۹۲۴ء ۲۸ صفحات Guru Govind Singh. A descriptive catlogue
۱۰۸	سوانح گورو گوبند سنگھ		فوٹو سٹیٹ کاپی لاہور سے لائی گئی ہے Guru Govind Singh. A descriptive Catalogue
۱۰۹	گورو گوبند سنگھ کی زندگی کے حالات	عنایت اللہ	
۱۱۰	سکھ گورو	غلام علی خاں	نولکشور کانپور ۱۸۶۴ صفحہ ۲۰۵ Guru Govind Singh. A descriptive Catalogue

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۱۱	گورو گوبند سنگھ		دیکھیے مرکز تواریخ سلطان امرتسر سکھ ہسٹری سوسائٹی ۱۹۶۹ء Guru Govind singh. A descriptive Catalogue
۱۱۲	گورو گوبند سنگھ دنیا کے توہماں پرشش	دیوان چند	بیدی داس پستک بھنڈار۔ Guru Govind singh. A descriptive catalogue
۱۱۳	گورو گوبند سنگھ چمکور کی جنگ	رادھا کرشن	گوشۂ پنجاب لاہور۔ پنجابی پریس ۱۸۷۱ Guru Govind singh. A descriptive catalogue
۱۱۴	منتخب اللباب۔ گورو گوبند سنگھ	محمد ہاشم مفتی خاں	صفحہ ۳۱ " " " "
۱۱۵	گورو گوبند سنگھ	بھائی پرمانند	تاریخ پنجاب لاہور۔ لاجپت رائے اینڈ سنز صفحات ۳۱۰/۳۲۱ Guru Govind singh. A descriptive Catalogue
۱۱۶	مفتاح التواریخ	دانشور منشی	نولکشور پریس کانپور ۱۸۷۶ صفحہ Guru Govind singh ۴۲۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
			A descriptive catalogue
۱۱۷	جوہر تیغ	محمد الغنی مرزا	گوردوارہ پربندھک کمیٹی سکھ ریفرنس لائبریری ۱ ۲۷۵
۱۱۸	بھینٹ سری گورو گوبند سنگھ	روشن لال چودہری	گوردوارہ پربندھک کمیٹی ۱۹۴۴ ۲۴۱ء
۱۱۹	جنم ساکھی سری گورو	محمد یوسف مسافر	۔ ملک منشی محمد الدین مالک کتبخانہ امرتسر
۱۲۰	جپ جی صاحب ۔ ست دہرم پرکاش	ساتوں رام لالہ	گوردوارہ پربندھک کمیٹی مفید عام پریس لاہور
۱۲۱	گورمریادہ حصہ اول گوروؤں کی شادیاں	کشن سنگھ سردار	سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی نمبر ۴۴۲۰ ۔
۱۲۲	گورو دیوا کال دشری گورونانک دیو	گورداس سنگھ اداسی	سکھ ریفرنس لائبریری دیوان چند مالک کتبخانہ ۴۴۱۵ ۔ ۱۹۱۲ء
۱۲۳	شہید گنج	ملکھراج بھلہ	سکھ ریفرنس لائبریری بہ نمبر ۴۴۴۴ سٹوڈنٹس اون ایجنسی لاہور ۱۹۵۲ بکرمی
۱۲۴	شہید کام سری گورو گوبند سنگھ کے چھوٹے صاحبزادوں کا		سکھ ریفرنس لائبریری بدھ سنگھ منیجر گورو گوبند سنگھ پریس ۔ بہ نمبر ۴۴۱۲

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۲۵	سوانح عمری سری گوروگوبند سنگھ	گورمکھ سنگھ سردار	سکھ ریفرنس لائبریری نیو اورینٹل بک ڈپو لاہور بہ نمبر ۴۴۰۱
۱۲۶	جنم ساکھی گوروگوبند سنگھ		سکھ ریفرنس لائبریری ملکراج تاجر کتب بہ نمبر ۴۴۰۸
۱۲۷	سوانح عمری گوروگوبند سنگھ	ایم۔ ایس۔ جوہر	صلہ بھائی دیا سنگھ تاجر کتب لاہور بہ نمبر ۴۴۰۷
۱۲۸	آخری پیت دا عیو آخری پیغمبر گوروگوبند سنگھ	راجندر سنگھ بابو	سکھ ریفرنس لائبریری منیجر گوروگوبند سنگھ پریس سیالکوٹ نمبر ۴۴۰۶۔
۱۲۹	شری گورو تیغ بہادر	پنڈی داس	سکھ ریفرنس لائبریری منیجر لیتک بھنڈار لاہور سنہ ۱۹۱۴ء بہ نمبر ۴۴۰۵
۱۳۰	گوروکا سکھ گورو ہرگوبند صاحب کی سوانح		سکھ ریفرنس لائبریری رامدتامل و محمد علی تاجران کتب سنہ ۱۹۰۳ء بہ نمبر ۴۴۰۴
۱۳۱	گوروکا سکھ۔ گورو رام داس جی کی سوانح		سکھ ریفرنس لائبریری رامدتامل و محمد علی تاجران کتب بہ نمبر ۴۴۰۳
۱۳۲	گوروکا سکھ۔ گورو امرداس جی کی سوانح		سکھ ریفرنس لائبریری رامدتامل و محمد علی تاجران کتب بہ نمبر ۴۴۰۲
۱۳۳	گوروکا سکھ۔ گوروآنند دیو کی سوانح		سکھ ریفرنس لائبریری رامدتامل و محمد علی تاجران کتب سنہ ۱۹۰۳ء بہ نمبر ۴۴۰۱
۱۳۴	کرامات نانک تاریخ	سوامی دیال برہمن	سکھ ریفرنس لائبریری حسن ابدال بہ نمبر ۴۴۰۰

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
	پنجہ		
۱۳۵	گورونانک دیو کی سوانح عمری	دیارام لالہ	" " رام تا مل و محمد علی تاجران کتب ۱۹۰۰ء بہ نمبر ۹۹ ۴۲
۱۳۶	ضمیمہ جپ جی صاحب و ترجمہ و شرح	گوبند رام ایڈیٹر رسالہ ست رنگ	سکھ ریفرنس لائبریری منیجر ست سنگھ امرتسر جولائی ۱۹۲۷ء ۵۲ ۴۲
۱۳۷	سکھمنی صاحب سٹیک	ہیرا سنگھ ماسٹر مترجم ہوشیار پور	سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۳۴۹ ۴۳
۱۳۸	نانک شاہ سنگورو جپ جی قلمی		سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور ۱۸۱۶ء قلمی
۱۳۹	گورو گوبند سنگھ	درلبھ سنگھ	سکھ ریفرنس لائبریری بہ نمبر ۳۰۳۴
۱۴۰	حیات گورو نانک	حبیب مولانا	" "
۱۴۱	شہید بلاس۔ گورو گوبند سنگھ کے معصوم بچوں کی قربانی	شمشیر سنگھ	" " بھائی جیتر سنگھ جیون سنگھ تاجران کتب لاہور بہ نمبر ۲۰۴۴
۱۴۲	سیا بلیدان۔ گورو تیغ بہادر جی کی دہرم پر قربانی	گوپال سنگھ	سکھ ریفرنس لائبریری مطبوعہ آنند پرکاش پریس امرتسر
۱۴۳	سوانح عمری ستی گرو	لچھمن سنگھ بھائی	سکھ ریفرنس لائبریری بھائی دیا سنگھ تاجر

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
	گوبند سنگھ صاحب		کتب لاہور بہ نمبر ۳۲۴۵
۱۴۴	سوانح عمری گورو نانک دیو جی	دیا رام عاکف	سکھ ریفرنس لائبریری لاہور بہ نمبر ۲۳۰۴
۱۴۵	جپ [illegible] پرمارتھ اچھر [illegible] گوربلاس [illegible] وال نورین پادشاہی	پرسکھ رائے گوبند سہائے	سکھ ریفرنس لائبریری بہ نمبر ۲۵۷۷
۱۴۶	سکھ منی صاحب معہ ارتھ		سکھ ریفرنس لائبریری بہ نمبر ۲۱۷۵
۱۴۷	گوربانی یا شہیدتے شلوک جلد ۹	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۱۴۱۰
۱۴۸	خالصہ شہیدوں کا بلیدان	رام سروپ کوشل	سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۱۴۸۸
۱۴۹	گورو گوبند سنگھ	پریم چند مرحوم	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۱۴۲۴
۱۵۰	جگت گورو شری گورو گوبند سنگھ کا امرت	جگت سنگھ	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۱۰۹۴
۱۵۱	گورو نانک پوتھی پنج گرنتھی قلمی کرتارپور		فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی بہ نمبر ۷۵۳
۱۵۲	وقایع بابا نانک		قاموس الکتب اردو انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی بہ نمبر ۱۴۱۷

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۵۳	جپ جی صاحب سٹیک	منی سنگھ	۱۸۵۴ء صفحہ ۹۶ بہ نمبر ۱۱۷۴۰
۱۵۴	سوانح عمری شری گورو گوبند سنگھ	لچھمن سنگھ	do صفحہ ۷۵ بہ نمبر ۱۱۷۳۹
۱۵۵	مختلف پوتھیاں		do بہ نمبر ۱۱۷۴۳
۱۵۶	پوتھی سکھ منی صاحب	مترسین سوامی	do پریم بلاس پریس گوجرانوالہ ص ۲۰ بہ نمبر ۱۱۷۲۵
۱۵۷	پوتھی راہ راست	do	do گردھر سٹیم پریس لاہور ۱۹۲۳ء بہ نمبر ۱۱۷۲۴
۱۵۸	آسا دی وار	do	do گردھر سٹیم پریس لاہور ۱۹۲۵ء بہ نمبر ۱۱۷۲۳
۱۵۹	سری جپ جی صاحب سٹیک	do	do ہندوستانی پریس لاہور صفحہ ۱۱۹ بہ نمبر ۱۱۷۳۲
۱۶۰	گورو ارجن دیو کی سوانح عمری		do نولکشور پریس ص ۷۸ بہ نمبر ۱۱۷۳۰
۱۶۱	سپا بلیدان	گوپال سنگھ	do آنند پرکاش امرتسر ص ۳۶ بہ نمبر ۱۱۷۲۹
۱۶۲	نانک پرکاش	گورا کر سنگھ	do آفتاب پنجاب پریس لاہور ۱۸۸۴ء
۱۶۳	شری گرنتھ صاحب کا اردو ترجمہ		do بہ نمبر ۱۱۷۲۸ ص ۴۸۰
۱۶۴	سرور روحانی۔ گورو نانک دیو جی سکھ منی صاحب		قاموس الکتب اردو جلد اول انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی بہ نمبر ۱۱۷۲۶
۱۶۵	گورو نانک دیو جی		do صفحہ ۱۷۶ بہ نمبر ۱۱۷۲۵
۱۶۶	اختصار گرنتھ صاحب و ترجمہ جپ جی صاحب قلمی	عطر سنگھ سردار	do بہ نمبر ۱۱۷۳۳

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۶۷	عطر ردعانی ترجمہ جپ جی	عطر سنگھ سردار	قاموس الکتب اردو جلد اول انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی صفحہ ۴۷ بہ نمبر ۱۱۷۲۲
۱۶۸	جنم ساکھی بھائی بالا والی	مالک دیا رام	do مرکز ہند پریس لاہور بہ نمبر ۱۱۷۲۱
۱۶۹	جپ جی سٹیک	do	do بہ نمبر ۱۱۷۲۰
۱۷۰	پوتھی سکھ منی سٹیک		do ۱۹۱۳ء نولکشور پریس بہ نمبر ۱۱۷۱۹
۱۷۱	پوتھی پنج گرنتھی	do	do ص ۲۴۶ بہ نمبر ۱۱۷۱۸
۱۷۲	وقایع بابا نانک	سورج بھان	۱۸۷۰ء بہ نمبر ۱۱۷۱۷
۱۷۳	ساکھی گورو نانک شاہ	سنسگت پرشاد	do نولکشور لکھنؤ ص ۷۴۰ بہ نمبر ۱۱۷۱۶
۱۷۴	سری آدگرنتھ		do گیانی پریس گوجرانوالہ ص ۱۴۴ بہ نمبر ۱۱۷۱۵
۱۷۵	جپ پرمارتھ		do do ص ۳۲ بہ نمبر ۱۱۷۱۱
۱۷۶	پوتھی شبد	تیجا سنگھ سوڑھی	do ص ۱۴ بہ نمبر ۱۱۷۱۰
۱۷۷	گورو نانک	تاجور نجیب آبادی	do ص ۷۲ بہ نمبر ۱۱۷۰۹
۱۷۸	پوتھی اونکار		do ۱۹۲۶ء ص ۱۱۸ بہ نمبر ۱۱۷۰۸
۱۷۹	چیلی پشاوری	بابا برج بلب سنگھ	do مفید عام پریس لاہور ص ۸۰ بہ نمبر ۱۱۷۰۷
۱۸۰	سری جپ جی صاحب منظوم ترجمہ	اکشیا لالہ	do ۱۸۶۶ء سیالکوٹ ص ۲۰ بہ نمبر ۱۱۷۰۹
۱۸۱	گورو گوبند سنگھ کے بچوں کا قتل	گیانی واحد حسین صاحب	ریفرنس سیکشن۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی امرتسر صفحات ۳۸۔

نمبر	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۸۲	جپ		پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ
۱۸۳	خالصہ شہیدوں کا بلیدان	پروفیسر رام شرپ	گنڈا سنگھ کلکشن پنجابی یونیورسٹی صفحات ۷۰ ستمبر ۱۹۲۲ء
۱۸۴	سری گورو گوبند سنگھ مہاراج	پنڈت آنند کشور	do صفحات ۲۷۴ سال ۱۹۲۰ء
۱۸۵	گورو تیغ بہادر جیون چرتر		do ۱۹۲۳ء بندے ماترم سٹیم پریس لاہور
۱۸۶	حقائق المعانی - جپ جی ٹیکا	منشی گنڈا سنگھ	گوبند سنگھ لائبریری صاحب کے پاس ہے۔ سال ۱۹۰۰ درج ہے۔ باقی پھٹا ہوا ہے۔ لاہور میں چھپی۔
۱۸۷	نانک جوگ	شوبرت لال ورمن	گنڈا سنگھ کلکشن پنجابی یونیورسٹی ۳۰ صفحات چھوٹا سائز
۱۸۸	رہبر نجات شری جپ جی صاحب	سردار سادھو سنگھ سادھو	do ۸۰ صفحات نومبر ۱۹۳۶ء منظوم
۱۸۹	گورو گوبند سنگھ کی سوانح عمری جنم ساکھی	حکیم رام کشن	do ۱۹۱۹ء ۔ دیمائی سائز ۲۰۰ صفحات مطبع پرکاش سٹیم پریس
۱۹۰	دیوان نانک شاہ ترجمہ سکھ منی صاحب	امراؤ سنگھ شیر گل	do مئی ۱۹۳۵ء ۱۱۲ صفحات ڈیمائی سائز
۱۹۱	نغمۂ دیدار الہٰی ۔ جپ جی صاحب	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	do ۴۷ صفحات چھوٹا سائز
۱۹۲	جپ جی صاحب کا اردو ترجمہ	مولانا منظور حسن	do ۳۰ صفحات چھوٹا سائز ۱۸ جون ۱۹۳۳ء
۱۹۳	جپ جی اردو سٹینک	کرتار سنگھ دت	do ضلع گورداسپور چھوٹا سائز صفحات ۱۰۳

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۱۹۴	شری گورو گرنتھ صاحب	اودہم سنگھ گرنتھی مترجم	سکھ ریفرنس لائبریری ۱۹۱۶ء۔ یونین سٹیم پریس لاہور
۱۹۵	جپ جی و سید ہزارے		do ہرشی الیکٹرک پرنٹنگ پریس ہوشیارپور ۱۴۲ صفحات
۱۹۶	خمسۂ آدمیت و سرچشمۂ حقیقت بابا نانک	کالا سنگھ بلای	do بھاشا وبھاگ ۱۹۷۱ء
۱۹۷	بابا نانک سے چند وابستہ تحریریں	گوردیال سنگھ مجذوب	اس میں ۱۴ قطعات عربی کے ہیں جن کا نثری ترجمہ مجذوب صاحب نے کیا ہے۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۹۸	تاریخ گوبند سنگھ کی	وزیری مل کھتری	دیکھیے صفحہ ۲۰۳۴ نسخہ ہائے خطی کتابخانہ گنج بخش
۱۹۹	آدی گرنتھ صاحب اردو ترجمہ	رائے دیوان چند	۹۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جہازی سائز ہے۔ رفاہ عام پریس سیالکوٹ میں چھپا۔ مسٹر سریندر بتہ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۰۰	کلام نانک	ڈاکٹر ستنیل سنگھ	۹۹۰ صفحات۔ جہازی سائز۔ بھاشا وبھاگ نے شایع کیا۔
۲۰۱	وردحق سری جپ جی صاحب	ماسٹر لال سنگھ	اردو ترجمہ منظوم۔ ۹ صفحات۔ دوارکاداس لائبریری چنڈی گڑھ میں ہے۔
۲۰۲	سرتاج شہید شری گورو گوبند سنگھ	روشن لال ایم۔اے	چھوٹا سائز۔ نثر۔ پنجابی یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۲۰۲	جپ جی صاحب یا ذکر الٰہی	محمد اجمل خاں	شیر خاں انسٹی ٹیوٹ مالیرکوٹلہ میں ہے۔ صفحات ۲۶ کتابی سائز
۲۰۲	جوہر تیغ	ارشد گورگانی	یہ مسدس نظم ہے۔ در مدح گوبند سنگھ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۰	تواریخ خالصہ حصہ اول	مشرقی	نظم اور نعت در مدح گورو گوبند سنگھ درج ہے۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۰	تواریخ گورو خالصہ حصہ اول و دوم	گیان سنگھ گیانی	"
۲۰	جنم ساکھی سری گورو گوبند سنگھ	ملک راج	سکھ ریفرنس لائبریری۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی فہرست کتب اردو پنڈت ملک راج تاجر کتب لاہور۔
۲۰	کلام حقانی	بسمل دہلوی	نابھوی کے پاس ہے۔
۲۰	جنم ساکھی		"
۲۱	گورو تیغ بہادر		کتابی سائز۔ سال ۱۹۴۳ء۔ میونسپل لائبریری پٹیالہ میں ہے۔
۲۱۱	گورو گوبند سنگھ		کتابی سائز ایضاً
۲۱۲	جپ		۵۰ صفحات ڈیمائی سائز۔ نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۲۱۳	محیط اعظم	۔۔ محسن کھتری	پوتھی جنم ساکھی گورو نانک دیو۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان حصہ اول صفحہ ۱۰۳
۲۱۴	تیسری پادشاہی کی جنم ساکھی یعنی گورو امرداس کی سوانح عمری		ریفرنس سیکشن پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ کتابی سائز ۴۶ صفحات۔ ۱۹۰۹ء رام دتا مل اینڈ سنز لاہور
۲۱۵	گنگا سکھ منی صاحب		ریفرنس سیکشن پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ ۱۹۳۵ چھوٹا سائز صفحات ۱۱۲۔ بھائی تارا سنگھ تاجر کتب
۲۱۶	سری گورو گوبند سنگھ جی کا جیون چرتر		ریفرنس سیکشن پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ ۱۹۳۸ء بڑا سائز صفحات ۳۰۴۔ حیدرآباد سندھ میں چھپی۔
۲۱۷	ترجمہ جپ جی صاحب	ماسٹر جگت سنگھ گیانی	صفحات ۵۶ ڈیمائی سائز۔ امر پرکاش ایجنسی امرتسر۔
۲۱۸	خالصہ نامہ سکھ نامہ	بخت مل	۱۲۲۱-۲۲ ہجری۔ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی کتابخانہ دانشگاہ پنجاب لاہور۔ گنجینہ آذر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۴۰۳
۲۱۹	تاریخ دسم گورو صاحبان	منت سنگھ گیانی	چتر سنگھ جیون سنگھ امرتسر۔
۲۲۰	گورو رام داس جی کی سوانح عمری	گورمکھ سنگھ	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی۔ رام دتا مل کتب تاجر لاہور ۱۹۰۳

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۲۲۱	گورو کا سکھ۔ گورو ہرگوبند جی کی سوانح عمری		فہرست کتب اردو۔ سکھ ریفرنس لائبریری۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی۔ رامدتامل کتب تاجر لاہور ۱۹۰۳ء
۲۲۲	رسالہ نانک شاہ	بدھ سنگھ کھتری	دیکھیے کیٹلاگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مخطوطات صفحہ ۱۱۰۔
۲۲۳	پستک خورشید خالصہ سوانح از سری سوم تا سری آٹھویں پادشاہ و سفرنامہ نہم پادشاہ	نہال سنگھ گورکھ باوا	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی۔ یہ کتاب جلد اول و دوم میونسپل لائبریری پٹیالہ میں بھی ہے۔
۲۲۴	خونی قطرے شہیدی گوردوارہ دیوو نظم ہندی شری ہرگوبند صاحب	دہنونت سنگھ آزاد	فہرست کتب اردو سکھ ریفرنس لائبریری گوردوارہ پربندھک کمیٹی۔
۲۲۵	امرتسر مہاتم منظوم	سنگت پرشاد ساطع	پنجابی یونیورسٹی لائبریری ریفرنس سکشن۔
۲۲۶	رسالہ سدھا ساگر		یہ رسالہ گورمکھی اور اردو میں بیک وقت درگا پریس نابھا سے چھپتا تھا۔ ایک کاپی ۳۰ رسالوں ۱۹۵۱ء کی ریفرنس سکشن پنجابی یونیورسٹی میں ملی۔
۲۲۷	گورو نانک نرنکاری		
۲۲۸	گورو گوبند سنگھ اور بھنگانی کی جنگ	لدھا سنگھ	مرشی الیکٹرک پرنٹنگ پریس ہوشیارپور ۱۴۸ صفحات Guru Gobind singh - A descriptive Catalogue دسمبر ۴۹ ۱۹۶۵ء۔ پربجات۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مولف	کیفیت
۲۲۹	مقدس چولا	عباداللہ گیانی	سکھ ریفرنس لائبریری امرتسر میں ہے۔
۲۳۰	دردحق۔ سری جپ جی	لال سنگھ آنند خالص	ایضاً
۲۳۱	جاپ صاحب کلام گورو گوبند سنگھ جی	ہیرا سنگھ سود	ترنتارن۔ سکھ ریفرنس لائبریری امرتسر میں ہے۔
۲۳۲	گوروگوبند سنگھ صاحب کی سوانح عمری	امر سنگھ منصور	دیکھیے شیر پنجاب کا گورونانک میموریل۔ ۱۴۶۹ - ۱۹۶۹۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۲۳۳	گورو تیغ بہادر کی سوانح عمری۔	do	
۲۳۴	گوروارجن مہاراج کی سوانح عمری	do	
۲۳۵	دس گوروں کے سوانح حیات	do	
۲۳۶	گوروگوبند سنگھ کے بچوں کی شہادت	do	
۲۳۷	ترجمہ وتفسیر جپ جی صاحب	do	
۲۳۸	ترجمہ وتفسیر سکھمنی صاحب	do	
۲۳۹	ترجمہ وتفسیر جنتوں دی وار	do	
۲۴۰	شہید گنج	do	
۲۴۱	مثنوی مہر ووفا اور سنگوروں کے منظوم کوائف	do	
نوٹ	اور بہت کچھ ملنے کی امید ہے	تلاش جاری ہے۔	

اخبار علمیہ

شہد کی مکھیاں بھی انعام فطرت اور نشان عبرت ہیں جو سائنسدانوں کی دلچسپی اور تحقیق کا مسلسل موضوع رہی ہیں، حال ہی میں برطانیہ کے سائنسی مجلہ 'نیو سائنٹسٹ' میں آسٹریلیا کے سائنسداں ڈاکٹر ایرول حسن اور ان کے ایک شاگرد اینڈریو کانیسیا نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شہد تلاش کرنے والی مکھیاں کبھی کبھی بعض نشہ آور رس کی وجہ سے مخمور و مدہوش ہو جاتی ہیں اور چھتہ کی جانب واپسی میں وہ حادثات کا شکار ہو جاتی ہیں، اگر یہ چھتہ تک پہونچ بھی جاتی ہیں تو اس کے اندر کام کرنے والی شہد کی مکھیاں انہیں خانہ زنبور میں داخل نہیں ہونے دیتیں اس طرح یہ مخمور مکھیاں بہت جلد مرجاتی ہیں، یہ تحقیق اس وقت سامنے آئی جب یہ دونوں محققین کینیا میں شہد کی پیدائش و افزائش کے موضوع پر کام کر رہے تھے، کینیا خشک خطہ ہے جہاں سال میں صرف ایک بار پھول کھلتے ہیں، گرم علاقہ اور بلند درجہ حرارت کی وجہ سے شگوفوں کے رس میں جوش اٹھتا ہے اور ایک قسم کا نشہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح بعض مرتبہ ان مکھیوں کے لیے تیار کیے گئے مصنوعی محلول میں بھی نشہ آجاتا ہے۔
ان سائنسدانوں نے یورپ کی شہد کی مکھیوں کی ایک ایسی قسم کا بھی جائزہ لیا تھا جو ایسے رس کی زیادہ رسیا ہیں جن میں شکر کی مقدار ۴۰ سے ۵۰ فیصد تک [illegible] تجربہ سے پتہ چلا کہ جوش دیے ہوئے محلول کی بہ نسبت اس قدرتی رس میں الکوحل

کی مقدار زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد ہوتی ہے ، یہ بھی معلوم ہوا کہ شہد کی مکھیاں جب چھتہ سے پھولوں تک کا سفر کرتی ہیں تو ایک نہایت حیرت انگیز کیمیائی رطوبت کے اخراج سے ایک لکیر سی بن جاتی ہے اور اسی کی بو سے وہ اپنی راہ سے اس طرح واقف ہوتی ہیں کہ بھٹک نہیں سکتیں ۔ اس تحقیق میں یہ بھی بتایا گیا کہ جو مکھیاں زیادہ مخمور ہو جاتی ہیں ان کو اپنے عمل میں سخت دشواری پیش آتی ہے ، کیونکہ ان کا اعصابی نظام بہت کمزور ہے ، چنانچہ کچھ تو فوراً گر پڑتی ہیں اور پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اڑنا نہیں چاہتیں یا پھر اڑ نہیں سکتیں ، ایک بات اور سامنے آئی کہ رس کے حصول کے لیے جو مکھیاں جاتی ہیں ان کی ایک خاص علامت ہوتی ہے جو چھتہ میں رہ کر شہد بنانے والی مکھیوں میں نہیں ہوتی ، یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کسی طرح بعض شرابی مکھیاں چھتہ میں پہونچ بھی جائیں تو ان کی غیر معتدل حرکات کی وجہ سے اندر کی مکھیاں ان کو بالآخر چھتہ سے باہر کر دیتی ہیں اور اس جلاوطنی کے بعد وہ اس قدر کمزور اور غیر محفوظ ہو جاتی ہیں کہ سردی یا بھوک سے ختم ہو جاتی ہیں یا پھر شکاری کیڑوں کا نشانہ بن جاتی ہیں ، چنانچہ جب شرابی مکھیوں کی خاصی تعداد ضایع ہو جاتی ہے تو پھر پورے چھتہ کی طاقت میں کمی آنے کی وجہ سے شہد کی پیداوار بھی متاثر ہوتی ہے ، اس لیے اب ان سائنسدانوں نے گرم علاقوں کے لیے خاص طور پر ایسے مصنوعی ڈبے بنانے کا فیصلہ کیا ہے جن میں موجود رس جوش کھانے اور نشہ آور ہونے سے محفوظ رہے گا ۔

(ع ۔ ص)

معارف کی ڈاک

(۱)

۲۸۹ - ذاکر نگر، نئی دہلی

۹۳ء، ۲، ۱۷

میرے محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے مزاج عالی بخیر ہوں گے۔

ان دنوں یہاں دہلی میں BJP کی ۲۵ فروری کی ریلی موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے، یقیناً وہاں بھی یہی صورت ہوگی، اس لیے کہ دہلی کے علاوہ ملک میں کہیں بھی کوئی خراب صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ اسٹیٹ اور جمہوری اداروں کا جو کچھ انحطاط نگاہوں کے سامنے ہے، وہ بڑا حوصلہ شکن ہے، حکمراں جماعت (کانگریس) اندر سے جس طرح ٹوٹ رہی ہے، وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اندرونی اختلافات، مہاراشٹر اور اڑیسہ میں کانگریس والوں کی باہم "جوتم پیزار" میں عیاں ہو کر اس کی رسوائی کا سبب بن رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نرسمہا راؤ ہوں، پوار یا چوان ہوں سب کو ملک، جمہوریت اور سیکولرزم سے کوئی تعلق نہیں، صرف اپنی ذات کی پروا ہے۔ ملک و ملت دونوں کو کیسی بے بسی کا سامنا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سہارا ہے اور اسی کے سہارے گھور (घोर) قنوطیت سے بچے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ کسی سے آپ کو ڈاکٹر معظم صاحب کا حال معلوم ہوا یا نہیں، وہ قلب کی تکلیف میں مبتلا ہوئے اور ہولی فیملی اسپتال میں داخل ہوئے، اسی کے ساتھ

ایک تکلیف اور تھی، انیڈری سائنس کی، پیشاب میں بڑی دقت ہوتی تھی اور اس کا اثر قلب اور سارے سسٹم پر پڑتا تھا، اب اس کا آپریشن ہوا ہے، بہت کمزور ہو گئے ہیں، باتیں بہرحال خوب کرتے ہیں، چند روز میں انشاء اللہ وہ اسپتال سے آجائیں گے۔ آپ کو سلام لکھنے کو کہا تھا اور دعا کی درخواست بھی کی تھی۔

جنوری ۱۹۹۳ء کے معارف میں آپ نے ازراہ کرم میرا مضمون غبار خاطر پر چھاپ دیا، بہت بہت شکریہ، اچھا صاف چھپا ہے۔ لیکن کتابت و تصحیح کے اچھے ہونے کے باوجود چند غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ ان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں:

۱۔ صفحہ ۴۹، نیچے سے تیسری سطر، ہم آہنگ کے بعد 'ہو کر' کے بجائے الٹا کاما (،) ہونا چاہیے۔

۲۔ صفحہ ۵۱، دوسری سطر کے شروع ہی میں 'موڑ' کے بجائے 'مُوڈ' ہوگا۔

۳۔ صفحہ ۵۳، دوسرے پیراگراف کی پہلی سطر: "... وہ بلند مقام نظر جو سائنس کو اپنی جارحیت کے علم و انضباط سے حاصل نہ ہو سکا" اس میں خط کشیدہ الفاظ کے بجائے "سائنس کو اپنی خارجیت" ہونا چاہیے۔

۴۔ صفحہ ۵۴، تیسری سطر، شعر میں 'بیشتر' کے بجائے جس سے شعر بے معنی ہو جاتا ہے 'پیشتر' ہونا چاہیے۔

۵۔ صفحہ ۶۵، دوسری سطر، 'ادبی تخلیق' کے بجائے 'ادبی اختراع' کر دیا گیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں اس کی ضرورت نہ تھی کہ یہ خلیل الرحمن اعظمی کے الفاظ تھے کاماز کے اندر، مضمون نگار کے نہ تھے اور نہ ایڈیٹر کو خلیل الرحمن اعظمی کے نقطہ و قول کی ایڈیٹنگ کی ضرورت تھی کہ اس کے لیے عنداللہ وہ خود جوابدہ ہوں گے۔ پھر

میرے خیال میں 'اختراع' میں طنز کا ایک پہلو ہے جو لکھنے والے کی منشا نہ تھی[1]

۶۔ صفحہ ۲۰۵، اسی اختراع والے پیراگراف میں تیسری سطر میں 'مصور' سے لے کر پیراگراف کے آخر میں 'بات ہے' تک سب کا مازمیں ہونا تھا' مسودہ کے مطابق' کہ یہ اعظمی مرحوم کے الفاظ ہیں' میرے نہیں ہیں۔۔

سوچتا ہوں کہ میں نے اس سلسلے میں آپ کا خاصا وقت لیا، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا آزاد پر میرا کام' ناساعد حالات کے باوجود' رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے' کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ سب کہیں سعی نامشکور نہ ہو کہ آج کے حالات میں مولانا آزاد کے سیاسی افکار بے وقت کی راگنی محسوس ہوتے ہیں، کہیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟ کیا خیال ہے اس کام کو آگے بڑھاؤں یا چھوڑ دوں؟

چند روز میں رمضان شریف کی برکتیں اترنے والی ہیں' ان کا انتظار ہے شبلی اکادمی کی پرسکون فضا میں تراویح کا لطف دو بالا ہو جاتا ہوگا، رفیق مکرم حافظ عمیر الصدیق صاحب ماشاء اللہ پڑھتے بھی خوب ہیں' یہ میں نے سنا ہے۔ دیکھئے مجھے بھی کبھی ان سے تراویح میں قرآن سننے کا موقع ملتا ہے یا نہیں! ان کی خدمت میں میرا سلام عرض ہے، امید ہے کہ وہ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔

ہلالی صاحب کو میں نے ایک تفصیلی خط لکھا تھا، اس کے بعض ٹکڑے آپ کو

---

[1] فاضل مکتوب نگار کا خیال صحیح ہے گو خلق و تخلیق اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے' معارف کو اسی لیے اس کے سوا کسی اور کی جانب ان کی نسبت کرنے سے احتراز ہوتا ہے۔ باقی غلطیوں کے سلسلہ میں خود مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسودے صاف بھیجیں تاکہ کاتب کو پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔ جن مضامین میں فارسی اور عربی کے اقتباسات ہوں انہیں بلا اردو ترجمہ نہ بھیجا جائے۔

سنانے کے لیے بھی تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بخیر و عافیت رکھے، ذہنی یکسوئی عطا فرمائے کہ شبلی اکادمی کی علمی خدمات کا تقاضا ہے۔ اس ادا اصل کام تو اللہ تعالیٰ اب آپ سے لے گا، انشاء اللہ۔

دعاؤں میں مجھے یاد رکھیے، خط طویل ہو گیا، معاف فرمایئے۔ ہلالی صاحب اور دیگر ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام

آپ کا مخلص

ضیاء الحسن فاروقی

حبیب منزل علی گڑھ

۲۳-۲-۹۳ء

(۲)

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

بابری مسجد سے متعلق آپ کے جنوری اور فروری ۱۹۹۳ء کے دونوں ادارے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کی دلی ترجمانی کرتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان میں کمی بیشی کی گنجائش بہت کم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف جرأت و ہمت اور دوسری طرف عقل و دانش کی یکساں ضرورت ہے۔ ہمارے کئی علماء اور دانش ور جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس میں بالعموم ان دونوں میں سے ایک چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے "معارف" کے اداریے اس نقص سے مبرا ہیں جس کے لیے آپ موجب تہنیت ہیں

میرا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کی اس وقت سب سے زیادہ صحیح رہنما مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی قیادت میں ا

دے رہا ہے۔ اس لیے مسلمان ہند کو کم سے کم اس بارے میں اس کی رہنمائی قبول کرنے پر متحد ہو جانا چاہیے۔

آخر میں میں ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ممکن ہے مسلم پرسنل لا بورڈ کے موقف میں بھی شامل ہو اور آپ کے اداریوں میں بھی اس طرف کسی حد تک توجہ دلائی گئی ہو لیکن میرے خیال سے یہ بات زیادہ واضح طور پر کہنے کی ضرورت ہے اور شاید اتنے واضح طور پر کسی طرف سے کہی نہیں جا رہی ہے۔ جیسا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے بجا طور پر بابری مسجد کی فقہی پوزیشن کی وضاحت کی ہے اس کی رو سے اجودھیا میں اگر بابری مسجد کہیں دوبارہ تعمیر ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے تو اسی مقام پر جہاں وہ پہلے واقع تھی اور یہی اعلان ۷ دسمبر ۱۹۹۲ء کو وزیر اعظم نے دوردرشن پر کیا تھا۔ لیکن اب اس سلسلے میں مرکزی حکومت مسلمانوں کو ایک جال میں پھانسنا چاہتی ہے اور وہ جال یہ ہے کہ دو بورڈ مقرر کیے جائیں گے، ایک اجودھیا میں مندر کی تعمیر کے لیے اور دوسرا مسجد کی تعمیر کے لیے، میرا کہنا ہے کہ کسی مسلمان کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حکومت کے مقرر کردہ اس بورڈ میں ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ اس کے ساتھ کسی نوعیت کا تعاون کرنا چاہیے اس کا بانگ دل اعلان بہت ضروری ہے۔

نیاز مند

ریاض الرحمٰن شروانی

(۳)

حبیب منزل علی گڑھ

۹۳-۳-۶ء

سنانے کے لیے بھی تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بخیر و عافیت رکھے، ذہنی یکسوئی عطا فرمائے کہ شبلی اکادمی کی علمی خدمات کا تقاضا ہے۔ اس ادارے کا اصل کام تو اللہ تعالیٰ اب آپ سے لے گا، انشاء اللہ۔

دعاؤں میں مجھے یاد رکھیے، خط طویل ہو گیا، معاف فرمایئے۔ ہلالی صاحب اور دیگر ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص

ضیاء الحسن فاروقی

حبیب منزل علی گڑھ

۲۳-۲-۹۳ء

(۲)

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

بابری مسجد سے متعلق آپ کے جنوری اور فروری ۱۹۹۳ء کے دونوں اداریے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کی دلی ترجمانی کرتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں ان میں کمی بیشی کی گنجائش بہت کم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف جرأت و ہمت اور دوسری طرف عقل و دانش کی یکساں ضرورت ہے۔ ہمارے کئی علماء اور دانشور جو کچھ لکھ رہے ہیں۔ اس میں بالعموم ان دونوں میں سے ایک چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ "معارف" کے اداریے اس نقص سے مبرا ہیں جس کے لیے آپ موجب تہنیت ہیں۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کی اس وقت سب سے زیادہ صحیح رہنمائی مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی قیادت میں انجا

دے رہا ہے۔ اس لیے مسلمان ہند کو کم سے کم اس بارے میں اس کی رہنمائی قبول کرنے پر متحد ہو جانا چاہیے۔

آخر میں میں ایک بات ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ممکن ہے مسلم پرسنل لا بورڈ کے موقف میں بھی شامل ہو اور آپ کے اداریوں میں بھی اس طرف کسی حد تک توجہ دلائی گئی ہو لیکن میرے خیال سے یہ بات زیادہ واضح طور پر کہنے کی ضرورت ہے اور شاید اتنے واضح طور پر کسی طرف سے کہی نہیں جارہی ہے۔ جیساکہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے بجا طور پر بابری مسجد کی فقہی پوزیشن کی وضاحت کی ہے اس کی رو سے اجودھیا میں اگر بابری مسجد کہیں دوبارہ تعمیر ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے تو اسی مقام پر جہاں وہ پہلے واقع تھی اور یہی اعلان ، دسمبر ۱۹۹۲ء کو وزیراعظم نے دوردرشن پر کیا تھا۔ لیکن اب اس سلسلے میں مرکزی حکومت مسلمانوں کو ایک جال میں پھانسنا چاہتی ہے اور وہ جال یہ ہے کہ دو بورڈ مقرر کیے جائیں گے، ایک اجودھیا میں مندر کی تعمیر کے لیے اور دوسرا مسجد کی تعمیر کے لیے، میرا کہنا ہے کہ کسی مسلمان کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حکومت کے مقرر کردہ اس بورڈ میں ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ اس کے ساتھ کسی نوعیت کا تعاون کرنا چاہیے اس کا ببانگ دل اعلان بہت ضروری ہے۔

نیازمند

ریاض الرحمٰن شروانی

(۳)

حبیب منزل علی گڑھ

۶-۳-۹۳ء

مکرمی و محترمی! وعلیکم السلام

یکم مارچ کے عنایت نامے کا شکر گزار ہوں۔

آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ اب لکھنا لکھانا بے کار ہی محسوس ہوتا ہے، بس وہی خود اپنے دل کو تسلی دینے والی بات ہے۔ میرے خیال سے یہ معاملہ محض اردو اور مسلمانوں کا نہیں ہے، صحیح بات کسی بھی زبان میں اور کسی کے بھی قلم سے قطعاً بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب صرف ایک چیز کی اہمیت باقی رہ گئی ہے۔ طاقت، خواہ یہ طاقت گولی اور لاٹھی کی ہو یا تعداد کی۔ ہاں اب بھی اگر ہم اپنے اندر اخلاقی طاقت پیدا کر لیں تو شاید کسی قدر موثر ہو سکتے ہیں۔

مسلمان اور ملک دونوں ہی کا حشر سخت تشویش ناک محسوس ہوتا ہے۔ بابری مسجد میری ناچیز رائے میں اس امر کی علامت بن گئی تھی کہ مسلمان اس ملک میں سر اٹھا کر رہ سکتے ہیں یا نہیں اور یہ ملک سیکولر رہ سکتا ہے یا نہیں۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کو اجودھیا میں یہ ثابت ہو گیا کہ یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں۔ زیادہ افسوس اس کا ہے کہ یہ ثابت کرنے میں جتنا حصہ ہندو فرقہ پرست جماعتوں کا ہے اس سے کم حصہ مرکز میں برسر اقتدار کانگریس اور اس کے وزیر اعظم کا نہیں ہے۔ ساتھ میں ہمارے نام نہاد موجودہ قائدین کی جماعتوں کو بھی شامل کر لیجئے اب اس ملک میں مسلمانوں کو دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنا ہوگا اور یہاں روایات گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کی نہیں بلکہ شری ساورکر اور ان کے پیروؤں کی پنپیں گی۔

گاندھی جی، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی کانگریس کو تو آنجہانی اندرا کی صاحبزادی نے اپنے دور حکومت ہی میں دریا برد کر دیا تھا وہ اپنے باپ کا بالکل الٹ تھیں۔

جو رہی سہی کسر تھی ان کے نادان صاحبزادے نے پوری کر دی اور اب یہ بڑے میاں جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو آپ اور میں دیکھ ہی رہے ہیں۔

میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مسلمان اجودھیا میں دوسرے مقام پر مسجد کی تعمیر میں حکومت ہند کے ساتھ ہرگز اشتراک عمل نہ کریں۔ وہ کم سے کم اتنی حمیت اور خودداری کا ثبوت تو ضرور ہی دیں۔

میں ۱۶ر جنوری کو حبیب منزل ہی کے برآمدے میں گر گیا تھا جس سے میرے الٹے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یونیورسٹی ہسپتال میں داخل ہوا اور وہاں آپریشن ہوا۔ ۳ر فروری کو گھر واپس آیا۔ اب چھڑی کی مدد سے چلتا ہوں لیکن ابھی گھر سے باہر نہیں نکلتا ہوں، دیکھئے سفر کے قابل کب تک ہوتا ہوں۔ ٹرین میں تو شاید ابھی بہت مدت تک سفر نہ کر سکوں کیونکہ اکثر اسٹیشنوں پر پل پر چڑھنے اترنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ دارالمصنفین کی میٹنگ میں پچھلی مرتبہ بھی شرکت نہیں کر سکا تھا۔ دیکھیے اس سال بھی اس قابل ہوتا ہوں یا نہیں۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ نیازمند

ریاض الرحمٰن شروانی

(۴)

نئی دہلی

غرہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ / ۲۳ر فروری ۱۹۹۳ء

محب گرامی، سلام مسنون

نوازش نامہ (۱۰ر فروری) ملا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں جنوبی ہند کے سفر پر گیا ہوا تھا مدراس یونیورسٹی میں لکچر بھی دینا تھا۔

آج کل ملک کے سیاسی حالات نے پراگندہ خاطر کر رکھا ہے، خاطر جمعی سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

معارف (شمارہ فروری ۱۹۹۳ء) کا اداریہ بہت پسند آیا۔ یہ تلخ نوائی ہی کا وقت ہے۔ اسی سے شاید کچھ "کار تریاکی" ہو سکے۔ معارف کی اشاعت کتنی بھی مختصر سہی، مگر اس کا ایک ایک شمارہ محفوظ رکھا جاتا ہے اور پڑھنے والوں کا حلقہ بھی منتخب ہے جن میں اکثریت اہل فکر و صاحبان علم کی ہے۔ ایسے موضوعات پر پوری وضاحت کے ساتھ آیندہ نسلوں کے واسطے ریکارڈ محفوظ کر دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔ تاریخ نے اپنے اوراق پلٹے ضرور ہیں مگر آخری بار نہیں پلٹے ہیں!

میری تجویز یہ بھی ہے کہ ایسے اہم اداریوں کو ہندی یا انگریزی میں منتقل کرا کے اس کی کاپیاں ارباب اقتدار اور دوسرے معاصر صحافیوں کو بھی ضرور بھجوا دیا کیجئے تاکہ انہیں بھی اندازہ ہو کہ مسلمانوں کا ایک علمی طبقہ کیا سوچ رہا ہے۔

بہر حال اقوام عالم پر اس طرح کے آزمائشی لمحات آتے ہی رہتے ہیں پھر اس خاکستر سے کوئی شرر خرمن سوز بھی نکل آتا ہے۔

والسلام

نثار احمد فاروقی

ادبیات

تاریخ ہند کا ایک واقعہ

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب

مسجد جامع دہلی کی ہے تعمیر کا دن — سنگ بنیاد کے رکھنے کا ہے درپیش سوال

یہ وہ موقع ہے کہ خود شاہ جہاں ہیں موجود — جن کی شاہی پہ ہو قربان فقیری کا جلال

کر کے مجمع سے خطاب آپ یہ فرماتے ہیں — سنگ بنیاد رکھے اس کا وہی نیک خصال

جس نے اک شب نہ قضا کی ہو تہجد کی نماز — جس کے ایماں میں اک لحظہ نہ آیا ہو زوال

جمع ہر سمت مسلماں ہیں مگر سب ہیں خموش — کہ نہیں ایک بھی اس طرح کی موجود مثال

بات اتنی سی ہے لیکن ہیں سبھی مہر بہ لب — سنگ بنیاد رکھے کون پریشاں ہیں خیال

اس پہ خود ہاتھ میں بنیاد کا پتھر لے کر — رکھتے ہیں آپ شہنشاہ بہ شاہانہ جلال

رمز درویشی و شاہی نہ سمجھنے والے! — دیدۂ دل سے ذرا دیکھ فقیری کی مثال

قطعۂ تاریخ شہادت بابری مسجد ۱۹۹۲ء

از جناب عبدالرؤف خاں صاحب

شہر اجودھیا میں ہوا جب کہ رونما — مسجد کے انہدام کا سنگین واقعہ

قبل قیامت ایک قیامت گزر گئی — لیکن نہ پست کر سکی ملت کا حوصلہ

آیا خیال دل میں کہ اس واقعے کا سال — موزوں کروں بقاعدۂ زر و بینہ

فوراً کہا بطور بشارت سروش نے — قائم کیا جب اس سے طبیعت نے رابطہ

قدرت لگائے گی سر اعدا پہ ضرب ضرور — "تعمیر ہوگی بابری مسجد اسی جگہ"

۱۹۹۳-۱ = ۱۹۹۲ء

مطبوعات جدیدہ

اسیز آن اسلام ESSAYS ON ISLAM (FELICITATION VOLUME IN HONOUR OF DR. M. HAMIDULLAH) از جناب حکیم محمد سعید، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، اعلیٰ طباعت، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، صفحات ۳۴۶، قیمت ۳۰۰ روپیے، پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰ پاکستان۔

انگریزی زبان میں علوم اسلامیہ پر مسلم اور غیر مسلم اہل علم و قلم کی قابل قدر اور عمدہ تحریروں کی اشاعت کے لیے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے 'بیت الحکمت' کا ترجمان مجلہ 'ہمدرد اسلامیکس' عالمی علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، اپنے لائق و فعال سرپرست جناب حکیم محمد سعید کی نگرانی میں اس نے قلیل مدت میں صاحبان نظر سے داد تحسین حاصل کی ہے، مجلہ کے اہم مقالات کو مزید افادہ کی غرض سے کتابی شکل میں شایع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی پیش کش ہے، اس میں سیرت، فقہ و علم کلام اور ادب پر رو جر'ارٹم، لطفی ابراہیم، محمد یوسف حسین، ڈی ایم ڈنلپ، پروفیسر فضل الرحمن، ڈبلو مانٹگمری واٹ، جان بو مین، ظفر اسحاق انصاری اور فاضل جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ وغیرہ علما و محققین کی نگارشات شامل ہیں، چوبیس مقالات میں اکثر کا تعلق مطالعہ سیرت نبوی سے ہے، موطائے امام مالک کے علاوہ امام ماتریدی، زمخشری و بیضاوی کے نظریات و خیالات پر بھی مضامین ہیں، فاضل مرتب نے ان

مجموعہ مضامین کی ہر جلد کو دنیائے علم کی کسی نامور و مقتدر ہستی کے نام معنون کرنے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ اس اولین جلد کا انتساب ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرانسوی کے نام ہے اور یہ .... خود فاضل مرتب کی خوش مذاقی کا شاہد ہے

بیت الحکمت کی طبی خدمات از جناب وسیم احمد اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۶۰ قیمت ۱۲۰ روپیے، پتے: (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی (۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ علی گڑھ وغیرہ۔

عہد عباسی کے زریں و تابناک نقوش میں "بیت الحکمت" کی فتوحات کی بازگشت آج تک علمی دنیا میں سنائی دیتی ہے، اس کے خزینۃ الکتب، دارالترجمہ والتالیف اور رصدگاہوں اور ان سے وابستہ علماء و حکماء کے کارنامے قرطبہ و غرناطہ کی جلیل و جمیل عمارتوں کی مانند قابل فخر ہیں، زیر نظر کتاب کا مقصد "بیت الحکمت" کے آثار و مشاہد کا تذکرہ اور اس کے ایوان طب کی سیر ہے، جس میں پہلے طب کی قدیم تاریخ، اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں اس کے رواج اور پھر عہد نبویؐ سے عباسی دور کے آغاز تک عربوں میں اس فن کے بتدریج ارتقا کا جائزہ لیا ہے، انھوں نے بعض محققین کے برخلاف بیت الحکمت کی تاسیس ہارون الرشید کے زمانہ میں بتائی ہے، یہی خیال علامہ شبلی نعمانی وغیرہ کا بھی ہے، بیت الحکمت کے حکماء و اطبا اور طبی تصانیف کے مولفین و مترجمین کے سوانح اور ان کی کتابوں کا تعارف و استقصا محنت سے کیا گیا ہے، سہولت کی خاطر ہندوستانی، ایرانی، مسلم و غیر مسلم مترجمین کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، ابو یوسف یعقوب الکندی کی

مطبوعات جدیدہ

اسیز آن اسلام ESSAYS ON ISLAM (FELICITATION VOLUME IN HONOUR OF DR. M. HAMIDULLAH) - از جناب حکیم محمد سعید، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ، اعلیٰ طباعت مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، صفحات ۳۴۶، قیمت ۳۰۰ روپیے، پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰ پاکستان۔

انگریزی زبان میں علوم اسلامیہ پر مسلم اور غیر مسلم اہل علم و قلم کی قابل قدر اور عمدہ تحریروں کی اشاعت کے لیے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے 'بیت الحکمت' کا ترجمان مجلہ ہمدرد اسلامیکس عالمی علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، اپنے لائق و فعال سرپرست جناب حکیم محمد سعید کی نگرانی میں اس نے قلیل مدت میں صاحبان نظر سے داد تحسین حاصل کی ہے، مجلہ کے اہم مقالات کو مزید افادہ کی غرض سے کتابی شکل میں شایع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی پیش کش ہے، اس میں سیرت، فقہ و علم کلام اور ادب پر رو جر ای ٹم، لطفی ابراہیم، محمد یوسف حسین، ڈی ایم ڈنلپ، پروفیسر فضل الرحمن، ڈبلو مانٹگمری واٹ، جان برٹن، ظفر اسحاق انصاری اور فاضل علیم ڈاکٹر محمد حمید اللہ وغیرہ علما و محققین کی نگارشات شامل ہیں، چوبیس مقالات میں اکثر کا تعلق مطالعہ سیرت نبوی سے ہے، موطائے امام مالک کے علاوہ امام ماتریدی، زمخشری و بیضاوی کے نظریات و خیالات پر بھی مضامین ہیں، فاضل مرتب نے ان

مجموعہ مضامین کی ہر جلد کو دنیائے علم کی کسی نامور و مقتدر ہستی کے نام معنون کرنے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ اس اولین جلد کا انتساب ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرانسوی کے نام ہے اور یہ .... خود فاضل مرتب کی خوش مذاقی کا شاہد ہے

بیت الحکمت کی طبی خدمات از جناب وسیم احمد اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۷۰ قیمت ۱۲۰ روپیے، پتے: (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی (۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ علی گڑھ وغیرہ۔

عہد عباسی کے زریں و تابناک نقوش میں "بیت الحکمت" کی فتوحات کی بازگشت آج تک علمی دنیا میں سنائی دیتی ہے، اس کے خزینۃ الکتب، دار الترجمہ والتالیف اور رصدگاہوں اور ان سے وابستہ علماء و حکماء کے کارنامے قرطبہ و غرناطہ کی جلیل و جمیل عمارتوں کی مانند قابل فخر ہیں، زیر نظر کتاب کا مقصد، بیت الحکمت کے آثار و مشاہد کا تذکرہ اور اس کے ایوان طب کی سیر ہے، جس میں پہلے طب کی قدیم تاریخ، اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں اس کے رواج اور پھر عہد نبوی سے عباسی دور کے آغاز تک عربوں میں اس فن کے بتدریج ارتقا کا جائزہ لیا ہے، انھوں نے بعض محققین کے برخلاف بیت الحکمت کی تاسیس ہارون الرشید کے زمانہ میں بتائی ہے، یہی خیال علامہ شبلی نعمانی وغیرہ کا بھی ہے، بیت الحکمت کے حکماء و اطبا اور طبی تصانیف کے مولفین و مترجمین کے سوانح اور ان کی کتابوں کا تعارف و استقصا محنت سے کیا گیا ہے، سہولت کی خاطر ہندوستانی، ایرانی، مسلم و غیر مسلم مترجمین کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، ابو یوسف یعقوب الکندی کی

تصانیف کو "فلسفہ، نجوم، منطق و ہندسہ" وغیرہ کے ذیلی عنوانوں میں شامل کیا گیا ہے،
اس میں علم نفس کو نفسانیات سے تعبیر کیا ہے، اس کی صحیح تعبیر نفسیات سے ہو سکتی تھی۔
طب اسلامی کے شیدائی کے قلم سے یہ جملہ باعث حیرت ہے کہ "یہ حقیقت ہے کہ
یونانیوں کے عہد زریں ہی میں طب کو مذہب کی گرفت سے نجات ملی" آخر میں عہد
عباسی کے مجموعی تراجم کی ایک فہرست بھی دی ہے، کتاب کی کتابت معیاری نہیں ہے۔
شروع میں حکیم سید ظل الرحمٰن کے قلم سے ایک جامع مقدمہ بھی ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف از جناب مولانا عتیق احمد قاسمی، متوسط تقطیع،
عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۰، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: مکتبہ حراء،
پوسٹ بکس ۳۷، ندوہ روڈ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷۔

نظام زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر علماء و فقہاء نے اس کے مسائل پر اس طرح
سیر حاصل بحث کی ہے کہ معمولی جزئیات تک واضح اور روشن ہو گئے ہیں، آیت زکوٰۃ
کے آٹھ مصارف کو حصر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس میں 'فی سبیل اللہ' کے مصرف کا
مصداق عام طور پر مجاہد فی سبیل اللہ سمجھا گیا ہے، البتہ بعض فقہاء نے حاجیوں کو بھی
اس میں شامل کیا ہے، زیر نظر کتاب میں فاضل مولف نے ان دونوں کے علاوہ
اس مصرف میں اور وسعت و عموم کے قائل بعض مفسرین و فقہاء کی تحریروں کا
جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ جمہور فقہا کا مسلک ہی درست ہے۔ مگر ان کا یہ
منہج صحیح ہے کہ "مال زکوٰۃ صرف کرنے میں اسی روش پر چلنا سلامتی ہے جس پر امت
مسلمہ چودہ سو سال تک چلتی رہی، شاذ اقوال کی پیروی اور شریعت کی عام شاہراہ
سے انحراف میں خطرات ہیں" لیکن بدلے ہوئے حالات میں غیر منصوص امور میں

یکسر جمود بھی محمود نہیں ہے۔ تقریباً نصف کتاب میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں عموم و وسعت کے پُر جوش موید مولانا محمد شہاب الدین ندوی کی کتاب "زکوٰۃ کے مستحق کون ؟" کے بعض مباحث کا رد ہے۔

۴۰ سالہ دور آزادئ ہند اور مسلمان، کیا کھویا ؟ کیا پایا

از جناب محمد عبد الحفیظ خاں، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۵۶، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ : دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا ۱/ ۸-۶۰-۳-۱۰ ہمایوں نگر حیدر آباد۔ اے پی

جناب عبد الحفیظ خاں ان لوگوں میں ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ حالات و مسائل سے فکر مند رہتے ہیں جس کا ثبوت ان کا رسالہ رہگذر ہے، موصوف اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا کے صدر بھی ہیں، ۱۹۸۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے چالیس سال پورے ہونے پر انھوں نے مذکورہ بالا عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا اس میں حیدر آباد کے ممتاز اہل فکر و نظر کے علاوہ مولانا ابو العرفان خاں ندوی مرحوم، مولانا جلال الدین انصر عمری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور سید حامد وغیرہ نے اپنے مقالات و خطبات پیش کیے، خود احتسابی کے اس عمل کی پوری تفصیل اس کتاب میں سمو دی گئی ہے، جس کی ضرورت اور افادہ موجودہ حالات میں دو چند ہے، لائق مرتب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "آزادی کے بعد سے تاریخ کے موضوع پر کسی ادارہ نے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا" اس جراحی میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے، اسی طرح مینا کشی پورم کے واقعات کے ذکر میں اس خواہش کے بعد کہ "ہندو قوم کے علماء القوم اور صاحب اقتدار اور سربراہان مملکت کے سامنے

بلاخوف اور بہ ملا اسلام کی دعوت حق پیش کی جاتی ہے" وہ لکھتے ہیں کہ "اس موقع پر دعوت دین کے علمبرداروں کی گھگھیاں بندھ گئیں" کتابت کی غلطیاں خصوصاً آیات قرآنی میں خاصی ہیں، فہرست مضامین سے بھی کتاب خالی ہے۔

یادایام از جناب مسرور کاشمیری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، بہترین کتابت وطباعت، صفحات ۸۰، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: گلاب پبلشنگ ہاوس، ۹۳، چتراو بازار دلی ۱۱۰۰۹۲۔

سوپور کشمیر کے جناب پریم ناتھ پٹواری کشمیری اور اردو زبانوں کے شاعر ہیں، پہلے وہ عاشق سوپوری تھے اب مسرور کاشمیری ہیں، اردو کی خدمت کا جذبہ شروع سے رہا، اپنے بیٹوں کو بھی انھوں نے اردو کی خدمت پر لگایا اور اس وقت ان کے تین بیٹے اردو افسانہ و ڈرامہ میں معروف ہیں، کشمیری زبان میں ان کے دو مجموعہ اشعار شائع ہو چکے ہیں، اردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے، ان کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف دل کے بہلانے کے لیے لکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے عروض و قافیہ اور بحر و وزن پر انکی توجہ زیادہ نہیں رہی، تاہم بعض نظمیں اور اشعار اچھے ہیں، خصوصاً یادایام کے عنوان سے ان کی نظم خوب ہے، کتاب کی بڑی خوبی عمدہ کتابت و طباعت ہے۔

لاٹری کیا ہے؟ از جناب محمد عبدالمبین نعمانی قادری، قیمت درج نہیں، پتہ دارالعلوم قادریہ چریاکوٹ اعظم گڈھ

لاٹری کی قباحت اور اس کی دینی و دنیوی مضرتوں پر عمدہ رسالہ نیز اس کی شرعی حیثیت پر متعدد مفتیوں کی تحریریں بھی جمع کر دی گئی ہیں۔

(ع ۔ ص)

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

ARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ـــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ اپریل ۱۹۹۳ء مطابق ماہ شوال ۱۴۱۳ھ عدد ۴

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

عہد صحابہ کا نظام تعلیم و تعلم — مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارکپور اعظم گڈھ — ۲۴۵-۲۶۰

ملا محمد صوفی مازندرانی — ڈاکٹر نور السعید اختر مہاراشٹر کالج بمبئی — ۲۶۱-۲۷۷

علمائے خراسان کے سوالات اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے جوابات — ڈاکٹر احمد طاہری عراقی، ترجمہ ڈاکٹر سید حسن عباس — ۲۷۸-۲۸۹

ایک گمنام اردو مثنوی "پیکر حسن" — ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، پھول والان۔ بریلی — ۲۹۰-۳۰۶

معارف کی ڈاک

(۱) مولانا ڈاکٹر غلام محمد برار سوسائٹی۔ کراچی — ۳۰۷

(۲) پروفیسر جگن ناتھ آزاد .... گاندھی نگر۔ جموں — ۳۰۸

(۳) پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اندرا نگر۔ لکھنؤ — ۳۰۹

ادبیات

بابری مسجد — پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ گاندھی نگر۔ جموں — ۳۱۰-۳۱۱

باب التقریظ والانتقاد

رموز سورۂ یوسف — "ض" — ۳۱۲-۳۱۷

مطبوعات جدیدہ — ع۔ ص۔ — ۳۱۸-۳۲۰

روسی فوجوں کے انخلا اور نجیب اللہ حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی افغانستان میں امن وامان مفقود رہا اور مجاہدین کی کشمکش سے وہاں خون خرابہ جاری رہا۔ اس خانہ جنگی اور برادر کشی کے پس پردہ ان دشمنان اسلام کی سازشیں کارفرما ہیں جو کمیونزم کا شیرازہ بکھرنے کے بعد اسلام کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ رہے ہیں اسلئے اس کی بیخ کنی کے لیے انھوں نے دنیائے اسلام میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ مسلم ممالک میں تصادم پیدا کر کے انھیں اپنا دست نگر بنائے ہوئے ہیں۔ اور بعض کو دہشت پسند اور بنیاد پرست قرار دے کر ساری دنیا سے انھیں الگ تھلگ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اس سازش کو کامیاب بنانے میں فراست و دور اندیشی سے مسلمان حکمرانوں کی محرومی کو بھی دخل ہے۔ افغانستان میں مجاہدین کے تصادم، ضد اور ناعاقبت اندیشی سے اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اقوام عالم کے موجودہ ٹھیکیدار اور امن عالم کے نام نہاد علمبردار جن کے دامن خون مسلم سے داغدار ہیں، امن و تصفیہ کے "مبارک کام" کے لیے افغانستان میں اپنی دخل اندازی شروع کر دیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کی سازشیں ناکام ہو گئیں۔

مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے درمیان اسلام آباد میں ہونے والے سمجھوتے کے بعد جنگ بند ہو گئی ہے۔ افغان لیڈروں نے عمرہ کر کے خانہ کعبہ میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی موجودگی میں اسلام آباد معاہدہ کی توثیق کی ہے۔ جس پر ہم کو فرزدق کے وہ اشعار یاد آ گئے جو اس نے جریر کو مخاطب کر کے کہے تھے

الم ترنی عاهدت ربی واننی　　　لبین رتاج قائما ومقام

کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں نے خانۂ کعبہ کی چوکھٹ اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے خداوند سے یہ عہد کیا ہے کہ ؎

علی حلفة لا اشتم الدهر مسلما　　　ولا خارجا من فیّ زور کلام

مدۃ العمر نہ کسی مسلمان کو گالی دوں گا اور نہ میرے منھ سے کوئی جھوٹی بات نکلے گی۔

اس لیے ہماری یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اب افغانستان میں پائدار امن کا راستہ ہموار ہوگا۔ اور افغانی اپنے اختلافات اور معمولی فائدوں کو نظر انداز کریں گے۔ تاکہ ان کی اور اسلام کی مزید رسوائی اور جنگ ہنسائی نہ ہو۔ ہم نے جس طرح مجاہدین کے متحارب گروہوں میں مفاہمت کی خبر سنی ہے اسی طرح اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کے جٹ جانے کی خبر سننے کے لیے بھی بے چین ہیں۔ ان کے جھگڑے سے ناگواری اور مایوسی ان کو ہوئی ہے جو زبانی تو قوموں کی آزادی و خود مختاری کا دم بھرتے ہیں۔ لیکن ان کی چیرہ دستی اور تفریق ملل کی پالیسی سے ساری دنیا تنگ ہے ؂

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

گزشتہ مہینہ بمبئی میں جو زوردار اور تباہ کن دھماکے ہوئے ان میں سیکڑوں جانیں ضائع گئیں اور بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔ کلکتہ اور بعض دوسرے شہروں میں بھی خوفناک دھماکے ہوئے۔ اور ان میں بھی بے گناہ شہریوں کی جان و مال کو نقصان پہونچا۔ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے شرمناک اور بدترین واقعہ ۶؍ دسمبر کو اجودھیا میں پیش آیا جس کے بعد ہی سے ملک پر نحوست کی گھٹا منڈلا رہی ہے۔ پہلے قیامت خیز فسادات ہوئے جن کا خاص نشانہ بمبئی کو بنایا گیا تھا۔ ابھی وحشت و درندگی کا یہ مظاہرہ ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ وہیں بمباری کے یہ لرزہ خیز واقعات رونما ہوئے جو بڑے افسوسناک، سخت قابل مذمت اور ملک کے اتحاد و سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ جس ملک کا عقیدہ سیکولرازم، جمہوریت، صلح، رواداری، محبت، بھائی چارگی اور عدم تشدد کے فلسفہ پر ہو۔ اور جس میں جانوروں کی ہتیا کو بھی پاپ سمجھا جاتا ہو وہاں ایسے پرتشدد واقعات اور انسانوں کا قتل عام ہونا کس قدر حیرت ناک ہے۔

اس کی خوشی ہے کہ بم دھماکوں کے بعد ہی وزیر اعظم اور وزیر داخلہ موقع پر پہونچ گئے اور اعلان کیا کہ ہر قیمت پر مجرموں کا پتہ لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ بمبئی کے تباہ کن دھماکوں کے ذمہ داروں کو پکڑنے کا حکومت مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ ان طاقتوں کو بے نقاب کرے جن کے دماغوں نے

دوسروں کے ہاتھوں سے یہ حرکت کرائی۔ تحقیقات اب چاہے ملک کے اندر کہیں لے جائے یا ملک کے باہر، حکومت دور تک پیچھا کرنے کا ارادہ کر چکی ہے۔ وزیر اعظم کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ حکومت کی مشینری پوری طرح حرکت میں آگئی۔ سی۔ بی۔ آئی نے تفتیش کا کام فوراً شروع کر دیا۔ افسروں کی ایک اعلیٰ سطحی ٹیم بمبئی پہونچ گئی اور فوج بھی تعینات کر دی گئی۔ غرض امکان بھر حکومت نے اس معاملہ میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی تعجب اس پر ہے کہ بم دھماکوں میں اس قدر مستعدی دکھانے اور ۲۵ رفروری کو دہلی میں ہونے والی بی۔ جے۔ پی کی ریلی کو بالکل ناکام بنا دینے والی حکومت بابری مسجد ڈھائے جانے پر چپ سادھے رہی اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں ہونے والے فسادات کے معاملہ میں اس نے بڑی نااہلی اور کمزوری کا ثبوت دیا۔

مسجد کے تحفظ اور اس کی دوبارہ تعمیر کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے جتنی باتیں کہیں وہ سب باد ہوا ہو گئیں، بابری مسجد پر جو وہائٹ پیپر شائع کیا گیا ہے اس کے جس قدر حصے اخبارات میں آئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اپنی نااہلی اور کوتاہی پر پردہ ڈالنا چاہتی ہے اور واقعہ کے پس پشت جس گہری سازش کے پردہ فاش کرنے اور شر پسندوں کو کیفر کردار تک پہونچانے کا اس نے دعویٰ کیا ہے وہ سراسر کھوکھلا ہے۔ کانگریس نے سورج کنڈ میں فرقہ واریت سے جنگ کرنے کا اعلان بڑے زور شور سے کیا ہے۔

لیکن دور دور تک پتہ نہیں چلتا کہ واقعی اس پر عمل بھی ہوگا۔ بابری مسجد ڈھانے والے علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے لیکن حکومت کی نیت صاف نہیں ہے۔ اس کا معیار دوہرا ہے اس نے بم دھماکوں کا پتہ لگانے کے لیے فوراً کمر کس لی مگر اجودھیا کے مجرموں اور بمبئی کے بلوائیوں کے معاملہ میں مہر بلب ہے۔ چار ماہ گزرنے کے بعد خبر آئی ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کی تفتیش کے سلسلہ میں کچھ افراد گرفتار کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں چھاپے مارے گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کا راز بھی معلوم ہو جائے گا۔

اور اب تو بم دھماکوں کی حقیقت کو ظاہر کرنے والے اشارات بھی ملنے لگے ہیں۔

بعض ناشرین دارالمصنفین کی مقبول کتابوں کے ترجمے بلا اجازت شائع کیے جا رہے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ دارالمصنفین کو قانونی چارہ جوئی کے لیے مجبور نہ کریں۔

مقالات

عہد صحابہؓ کا نظام تعلیم و تعلم

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد برکۃ الاسلام، عصابۃ الایمان، عسکر القرآن، جند الرحمٰن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہ و تقویٰ اور علوم دینیہ کے حامل و ناشر تھے، جن کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا بیان ہے :

کان اصحاب محمد صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ
علیہ وسلم ابر ھذہ الامۃ	اس امت میں سب سے زیادہ نیکو کار
قلوباً، واعمقھا علماً، واقلھا	دل، علم میں سب سے زیادہ گہرے،
تکلفاً، واحسنھا خلقاً واصدقھا	تکلف میں سب سے کم، اخلاق میں سب
ایماناً، اولئک قوم اختارھم	سے بہتر، ایمان میں سب سے سچے تھے،
اللہ لصحبۃ نبیہ وتبلیغ	ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت
دینہ۔	اور اپنے دین کی تبلیغ کیلئے منتخب کیا تھا،

درسگاہ نبوت کے ان فضلاء و فارغین میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم عہد رسالت میں فقہ و فتویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے، دوسرے صحابہؓ بھی کتاب و سنت اور فقہ و فتویٰ میں بلند مقام رکھتے تھے اور عہد صحابہ میں انھوں نے دینی علوم کی تعلیم، احادیث کی روایت اور تفقہ فی الدین میں حصہ لیا، جن میں یہ حضرات مشہور

ہیں اور دینی علوم میں مرجع مانے جاتے ہیں، علی بن ابو طالب، عبدالرحمن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، ابو موسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، عبداللہ بن سلام، ابوذر غفاری، زید بن ثابت، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم، ان کے علاوہ ام المومنین ام سلمہ، انس بن مالک، ابو سعید خدری، عبداللہ بن زبیر، سعد بن ابی وقاص، سلمان فارسی، جابر بن عبداللہ وغیرہ رضی اللہ عنہم حدیث و فقہ اور دینی علوم کے حامل و ناشر تھے۔

ویسے حضرات صحابہ میں ہر فرد اپنی ذات سے مینارۂ رشد و ہدایت تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم اور جو حضرات جس علم میں نمایاں تھے آپ نے امت کو ان سے آگاہ کر کے ان سے تحصیل علم کی تاکید فرمائی، آپ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرو، قرآن کی تعلیم ان چار سے حاصل کرو، عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابو حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب جس کو قرآن تازہ بتازہ حاصل کرنا ہو ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) کی قرأت کے مطابق پڑھے، معاذ بن جبل میری امت میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ میری امت میں فرائض کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں، عبداللہ بن عباس قرآن کے بہترین ترجمان ہیں، ابو موسیٰ اشعری کو آل داؤد کی شہنائی دی گئی ہے، علی قضا کے سب سے بڑے عالم ہیں، ابو درداء عبادت میں سب سے آگے ہیں، ابی بن کعب قرأت میں سب سے آگے ہیں، زمین کے اوپر آسمان کے نیچے ابوذر سب سے زیادہ صادق اللہجہ ہیں، عبیدہ بن جراح اس امت کے امین ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ دینی امور و معاملات میں انصار اور مہاجرین کے اہل علم کو جمع

کر کے مشورہ لیا کرتے تھے، ان میں عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عوف معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت دینی علوم اور فقہ و فتویٰ میں مرجع تھے، حضرت عمر اصحاب شوریٰ کے علاوہ انصار میں سے معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت سے دینی و انتظامی امور میں مشورہ لیتے تھے، اسی کے ساتھ عبداللہ بن عباس اور دوسرے نوعمر صحابہ کو اپنی مجلس میں بلاتے تھے اور فتویٰ کی خدمت عثمان بن عفان، ابی بن کعب اور زید بن ثابت انجام دیتے تھے، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بھی یہی حضرات اس منصب پر فائز رہے، معاذ بن جبل سے ان کی وفات کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے علم حاصل کریں تو بتایا کہ ابو درداءؓ سلمان فارسیؓ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن سلام سے، حضرت عمرؓ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا اور کہا کہ جس کو فرائض حاصل کرنا ہو زید بن ثابت کے پاس جائے، جس کو فقہ حاصل کرنا ہو معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جس کو مال حاصل کرنا ہو میرے پاس آئے۔

مسروق بن مخرمہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم ان چھ حضرات پر منتہی ہوتا ہے، عمر، عثمان، علی، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ عمر علم کے دس حصوں میں سے نو حصہ اپنے ساتھ لیتے گئے، اگر عمر کا علم ایک پلہ پر اور دوسرے لوگوں کا علم دوسرے پلہ پر رکھا جائے تو عمر کے علم کا پلہ جھک جائے گا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب محمدؐ کو جب کسی حدیث کے بارے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے حضرت عائشہؓ سے اس کے متعلق سوال کیا تو ان کے پاس علم پایا، نیز ان کا قول ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود کی مجلس میں بیٹھتا تھا، میرے نزدیک

ان کی ایک مجلس میں بیٹھنا ایک سال کے عمل سے زیادہ قابل اطمینان ہے، صحابہؓ کے یہ چند آراء و اقوال علمائے صحابہ کے بارے میں ہیں، اب ان کے تلامذہ تابعین کے چند بیانات اپنے اساتذہ کے بارے میں ملاحظہ ہوں ،

مشہور تابعی مسروق بن اجدعؒ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ میں عمر، علی، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابی بن کعب، ابو موسیٰ اشعری اصحاب فتویٰ تھے، ان ہی کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک صحابی کو اچھی طرح جانچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کا علم چھ حضرات عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابو درداء، زید بن ثابت پر منتہی ہوتا ہے اور ان چھ حضرات کو جانچا تو معلوم ہوا کہ ان سب کا علم دو حضرات علی اور عبداللہ بن مسعود پر منتہی ہوتا ہے۔

امام شعبیؒ کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے چھ اہل علم تھے، عمر، ابن مسعود، زید بن ثابت، علی، ابی بن کعب، ابو موسیٰ اشعری اور اس امت کے قاضی چار تھے۔ عمر، علی، زید، ابو موسیٰ اشعری۔ مجاہد بن جبیر کہتے ہیں علماء تو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، محمد بن سیرین کا قول ہے کہ اہل علم کی رائے میں صحابہ میں مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم عثمان بن عفان اور ان کے بعد عبداللہ بن عمر تھے، میمون بن مہران کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر سے بڑا فقیہ اور ابن عباس سے بڑا عالم نہیں دیکھا ہے۔

ان علمائے صحابہ کے فقہی اقوال و آراء اور فتاوے ضخیم اور متوسط جلدوں میں جمع کیے جا سکتے ہیں چونکہ عہد صحابہ میں باقاعدہ تدوین و تالیف کا رواج نہیں تھا بلکہ بعض صحابہ اور ان کے تلامذہ یادداشت کے طور پر صحیفے اور نسخے لکھ لیتے تھے

اس لیے ان کی روایات اور فتاوے اس وقت مدون نہیں ہو سکے اور بعد میں اس کی باری آئی، چنانچہ خلیفہ مامون کے پڑپوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب نے ابن عباس کے فتاوے بیس جلدوں میں جمع کیے تھے، ان کے شاگرد مجاہد اور مولی عکرمہ نے ان سے سنکر نزول قرآن اور تفسیر قرآن پر کتاب لکھی تھی اسی طرح علی بن ابو طلحہ ہاشمی نے ابن عباس کی تفسیری روایات کو جمع کیا تھا، عبداللہ بن عمرو بن عاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے احادیث کا ایک مجموعہ الصادقہ کے نام سے جمع کیا تھا، جس کی روایت ان سے کی گئی، ابوہریرہ، ابن عباس، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک وغیرہ کے تلامذہ نے انکی روایات کو صحیفوں اور نسخوں کی شکل میں جمع کیا تھا (کتاب علل الحدیث و معرفۃ الرجال، طبقات ابن سعد، جامع بیان العلم، اعلام الموقعین وغیرہ)

علم سے مراد کتاب وسنت اور فقہ ہے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتاب وسنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دی جاتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم تین ہیں انکے علاوہ زائد ہیں، آیۂ محکمہ، سنت قائمہ، فرائض عادلہ، عبداللہ بن عمر کا قول ہے کہ علم تین ہیں، کتاب ناطق، سنت ماضیہ اور لاادری، عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ علم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ہے، اس کے بعد جو شخص اپنی رائے سے کوئی بات بیان کرے تو میں نہیں جانتا کہ اس کو اپنی حسنات میں پائے گا یا سیآت میں پائے گا، عبداللہ بن مسعود نے کہا ہے کہ کثرت حدیث علم نہیں ہے علم تو خشیت خدا ہے[1]

دوسرے علوم اور زبانیں حضرات صحابہ علم یعنی کتاب وسنت اور فقہ کے ترجمان و معلم تھے، اسی کے ساتھ دوسرے علوم والسنہ کے عالم بھی تھے، مثلاً علم الانساب میں ابوبکر صدیق،

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۳ تا ص ۲۶ ملخص۔

ابوالجہم بن حذیفہ، جبیر بن مطعم سب سے بڑے عالم تھے اور جمیع انساب عرب میں رسوخ رکھتے تھے، ان کے علاوہ عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عقیل بن ابوطالب بھی علم الانساب میں نمایاں مقام رکھتے تھے[1] حضرت ابوبکر تعبیر رویا میں سب سے آگے تھے، زید بن ثابت سریانی زبان کے عالم تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سترہ[۱۷] دن میں اس زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، عبداللہ بن عمرو بن عاص بھی سریانی اور عبرانی زبان کے عالم تھے اور تورات پڑھتے تھے، ابوہریرہ نے تورات کو پڑھا نہیں تھا مگر اس کے مضامین سے اچھی طرح واقف تھے، اس کی شہادت کعب احبار نے دی ہے، نیز ابوہریرہ فارسی زبان سے واقف تھے اور بعض روایات کے مطابق حبشی زبان بھی جانتے تھے، ان کے وطن نجران یمن میں اہل فارس آباد تھے جن کو ابناء کہتے ہیں، نیز حبشہ بھی یمن کے سامنے واقع ہے اور وہاں کے لوگ ملک عرب میں کثرت سے رہتے تھے، سلمان کی مادری زبان فارسی تھی، ایک روایت کے مطابق ایرانیوں نے ان سے سورۂ فاتحہ فارسی میں لکھنے کی خواہش کی تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ "بنام یزداں بخشایندہ" لکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، ایرانیوں نے اس ترجمہ کو پڑھنا شروع کیا اور جب ان کی زبان نرم ہو گئی تو عربی میں پڑھنے لگے[2]

مدینہ منورہ کی دینی و علمی مرکزیت وارثین علم نبوت میں بہت سے حضرات عہد نبوی اور عہد خلافت میں جہاد و غزوات میں شہید ہو گئے، کتنے حضرات بلاد اسلامیہ میں امارت، قضا اور تعلیم کے لیے روانہ کیے گئے، کچھ اپنے قبائل اور علاقے میں چلے گئے

---

[1] جمہرۃ انساب العرب ص۵ [2] مناہل العرفان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۵۵۔

اور ایک بڑا طبقہ دینی علوم کی تدریس و تعلیم سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا، اس دور میں جو حضرات مدینہ منورہ میں رہ گئے وہ خلاصۃ الخلاصہ تھے اور شہر نبوت عالم اسلام کا دینی و علمی مرکز تھا، امام مالکؒ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں فلاں غزوات سے اتنے اتنے ہزار صحابہ کو لے کر واپس ہوئے، ان میں سے تقریباً دس ہزار مدینہ میں رہ کر یہیں فوت ہوئے، زید بن ثابت کا قول ہے کہ جب تم اہل مدینہ کو کسی مسئلہ پر متفق دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ سنت ہے، عبداللہ بن مسعود کو حضرت عمرؓ نے تعلیم کے لیے کوفہ بھیجا تھا، جب وہاں کوئی شخص مسئلہ معلوم کرتا تو جواب دیدیتے تھے، اور جب مدینہ آکر دیکھتے کہ یہاں کے علماء کا عمل اس کے خلاف ہے تو کوفہ واپس جا کر گھر جانے سے پہلے اس شخص کو بتا دیتے تھے کہ اس مسئلہ میں اہل مدینہ کا یہ عمل ہے، ایک شخص نے ابوبکر بن عمرو بن حزم سے کہا کہ فلاں مسئلہ میں مجھ کو خلجان ہے انھوں نے کہا کہ بھتیجے! جب تم اہل مدینہ کو کسی بات پر متفق دیکھو تو تمہارے دل میں اس کے بارے میں خلجان نہیں ہونا چاہیے، مجاہد، عمرو بن دینار اور دوسرے علمائے مکہ کہتے تھے کہ ہم علم میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، البتہ عطاء بن ابی رباح کو ہم پر اس لیے فضیلت ہے کہ وہ مدینہ سے علم حاصل کر کے آئے ہیں[1]۔

ابوالعالیہ ریاحی بصری کہتے ہیں کہ ہم لوگ بصرہ میں صحابہ سے حدیث سنتے تھے، اس کے بعد مدینہ جا کر وہاں کے صحابہ سے سنکر مطمئن ہوتے تھے، شعبی نے کوفہ میں ایک حدیث بیان کر کے اپنے شاگردوں سے کہا کہ تم لوگوں کو یہ حدیث مفت مل گئی، اس سے کم حدیث کے لیے آدمی سواری کر کے مدینہ جاتا تھا، ابوقلابہ کہتے

---

[1] ترتیب المدارک ج ۱ ص ۶۲ و ۶۳۔

ہیں کہ میں نے مدینہ میں کئی دن قیام کیا، حالانکہ اس کے علاوہ میری کوئی حاجت نہیں تھی کہ ایک شخص کے پاس ایک حدیث تھی میں اس کو سنوں، یحییٰ بن ابو کثیر نے مدینہ کا سفر کیا تاکہ صحابہ کی اولاد سے علم حاصل کریں[1]

عمر بن عبدالعزیز نے بلاد اسلامیہ میں احادیث وسنن کو مدون ومرتب کرنے کے لیے فرمان جاری کیا تو خاص طور سے قاضی مدینہ ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ وہاں کی احادیث خصوصاً عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی مرویات کو مدون کریں، الغرض مدینہ کے دینی وعلمی مرکز سے پورا عالم اسلام وابستہ تھا اور اسی مینارۂ نور سے ہر طرف روشنی پھیلتی تھی۔

مدینہ کے چار فقہائے صحابہ اور انکی فقہ کے مراکز امام ابن قیم لکھتے ہیں:

والدین والفقہ والعلم	دین فقہ اور علم حضرت عبداللہ بن مسعود
انتشر فی الامۃ عن اصحاب	حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ
عبداللہ بن مسعود واصحاب	بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس
زید بن ثابت، واصحاب	رضی اللہ عنہم کے اصحاب وتلامذہ سے
عبداللہ ابن عمر، واصحاب	پھیلا ہے اور لوگوں کا عام علم ان ہی
عبداللہ بن عباس، فعلم	چاروں حضرات کے شاگردوں سے
الناس عامتہ عن اصحاب	ہے، اہل مدینہ کا علم زید بن ثابت
ھؤلاء الاربعۃ، فاما	اور عبداللہ بن عمر کے شاگردوں سے،
اھل المدینۃ فعلمھم	اہل مکہ کا علم حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1] الکفایہ ص ۴۰۲ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۹۳، المحدث الفاصل ص ۲۲۳۔

عن اصحاب زید بن ثابت	کے تلامذہ سے، اور اہل عراق کا علم
وعبد اللہ بن عمر، واما اھل	حضرت عبد اللہ بن مسعود کے اصحاب
مکۃ فعلمھم عن اصحاب عبد اللہ	سے ہے۔
بن عباس، واما اھل العراق	
فعلمھم عن اصحاب عبد اللہ	
بن مسعود[۱]	

اور امام بخاریؒ کے استاد امام علی مدینیؒ کا بیان ہے:

لم یکن من اصحاب رسول اللہ	حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم من لہ	زید بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن عباس
اصحاب یذھبون مذھبہ	کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ویفتون فتواہ ویسلکون	کے صحابہ میں کوئی عالم ایسا نہیں تھا
طریقتہ الا ثلاثۃ: عبد اللہ	جس کے تلامذہ و اصحاب اس کے
ابن مسعود، وزید بن ثابت	فقہی مذہب پر عمل کرتے ہیں اس کے
وعبد اللہ ابن عباس[۲]	فتویٰ کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور
	اس کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان چار یا تین حضرات کا فقہی مسلک بنیادی طور پر امت میں رائج ہوا اور فقہ و فتویٰ میں ان کے اصول پر عمل کیا گیا، ان کے مقابلہ میں دوسرے صحابہ کے فقہی آراء و اقوال کم رائج ہوئے، ان تصریحات میں صحابہ کے تفقہ فی الدین کا ذکر ہے

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷ [۲] کتاب علل الحدیث و معرفۃ الرجال ص ۴۳

تفسیر و تاویل، تحدیث و روایت اور دوسرے دینی امور میں ان کے رسوخ فی العلم سے بحث نہیں ہے۔

مسجد نبوی کی تعلیمی مرکزیت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں مسجد نبوی مرکزی درسگاہ تھی، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں بھی مسجدوں میں تعلیمی مجالس اور حلقے قائم ہوتے تھے بلکہ اعیان و اشراف اور اہل علم کی عام نشست مسجدوں میں ہوتی تھی، ابو ادریس خولانی کہتے ہیں المساجد مجالس الکرام، حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک شخص نے جہاد میں شرکت کے بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ کیا میں تم کو اس سے افضل عمل نہ بتاؤں؟ مسجد بناؤ اور اس میں فرائض، سنت اور تفقہ فی الدین کی تعلیم دو۔[1] دور صحابہ میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں میں تدریسی مجلسوں کی کثرت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ عبد اللہ بن مسعود کے ایک شاگرد مسجد نبوی میں گئے اور چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا کہ

عہدی بھذا المسجد وانہ	اس مسجد میں میرا وہ دور گذرا ہے
کمثل الروضۃ اختر منھا	جس میں وہ باغیچے کے مانند تھی، تم اسکے
حیث شئت[2]	جس درخت کے سایہ میں چاہو بیٹھ

جاؤ۔

ابو الاحوص کہتے ہیں کہ ہم نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ ان کی مجلسیں صرف مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں،[3] حضرت عمر بن عبد العزیز نے علماء کو حکم دیا تھا کہ علم کی نشر و اشاعت اپنی مسجدوں میں کریں، سنت مٹ رہی ہے۔

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۱۲۰ و ص ۳۲ [2] المحدث الفاصل ص ۱۰۸ [3] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۲۹

عہد فاروقی میں مسجد نبوی میں تعلیمی حلقوں کی کثرت | خلافت راشدہ میں قرآن کی حفاظت و اہمیت کے پیش نظر احادیث کی کثرت روایت سے روکا جاتا تھا، اس کے باوجود مسجد نبوی میں فقہ و فتوی اور روایت حدیث کے متعدد حلقے قائم تھے، جن میں دور دراز کے طلبہ شریک ہوتے تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کی کثرت کا اندازہ حضرت ابی بن کعب متوفی سنہ ۲۲ھ کے ایک صحابی شاگرد کے بیان سے ہوتا ہے، جندب بن عبداللہ بن سفیان بجلیؓ بیان کرتے ہیں:

اتیت المدینۃ، ابتغاء العلم	میں طلب علم میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی
فدخلت مسجد رسول اللہ	میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوگ حلقہ در
صلی اللہ علیہ وسلم فاذا	حلقہ آپس میں حدیث بیان کر رہے
الناس فیہ حلق یتحدثون	ہیں، میں ان حلقوں سے گذرتا ہوا
فجعلت امضی الحلق حتی اتیت	ایک حلقہ میں گیا جس میں ایک صاحب
حلقۃ فیھا رجل شاحب	(ابی بن کعبؓ) متفکر بیٹھے ہیں، ان کے
علیہ ثوبان کانما قدم من	جسم پر دو کپڑے ہیں گویا ابھی سفر سے
سفر۔	واپس آئے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب کے مزاج میں کچھ تندی و تیزی تھی، بعض اوقات طلبہ سے بے اعتنائی برتتے تھے، ایک مرتبہ ان ہی جندب بن عبداللہ بجلیؓ نے ان کی بے رخی پر کہا:

اللھم نشکوھم الیک، انا	اے اللہ! ہم تیری جناب میں ان
ننفق انفاقنا، و ننصب	حضرات کا شکوہ کر رہے ہیں، ہم
ابداننا، و نرحل مطایانا	طلب علم کے لیے اپنے اموال خرچ کرتے

ابتغاء العلم فاذا لقینا ھم تجھموا لنا و قالوا لنا[1]	ہیں، اپنے جسموں کو تھکاتے ہیں، سواریوں پر آتے ہیں اور جب ان حضرات سے ملتے ہیں تو یہ ہمارے سامنے منھ بگاڑتے ہیں اور نا ملائم باتیں کرتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے دوسرے شاگرد عتیؓ بن ضمرہ تمیمی بصریؒ کہتے ہیں:

قلت لابی بن کعب ناتیکم من البعد نرجو عندکم الخیر ان تعلمونا فاذا اتیناکم استخففتم امرنا کانا نھون علیکم[2]	میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ ہم لوگ دور دراز مقامات سے آپ حضرات کے یہاں اس امید پر آتے ہیں کہ آپ لوگ ہم کو حدیث کی تعلیم دیں گے اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو ہم کو حقیر سمجھتے ہیں، گویا آپ کے نزدیک ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

حضرت ابی بن کعب نے اپنے دونوں شاگردوں کا شکوہ سنکر ان کے ساتھ نہایت محبت و شفقت کا معاملہ کیا اور آنے والے جمعہ کے دن حدیث بیان کرنے کا وعدہ فرمایا مگر اس سے پہلے انتقال کر گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی ہی میں مسجد نبوی میں تعلیم و تدریس کے متعدد حلقے قائم تھے اور مدینہ کے باہر کے طلبہ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے

---

[1] ابن سعد ج ۳ ص ۵۰۰ و ص ۵۰۱ [2] ایضاً ص ۵۰۰۔

تعلیمی مجلسوں میں نوجوان طلبہ کی کثرت | صحابہ کی تعلیمی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں نوخیز اور نوجوان طلبہ کی کثرت ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پیشین گوئی فرما کر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور دین کی تعلیم دینے کی تاکید فرمائی تھی ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا:

سیاتیکم شباب من اقطار	عنقریب تمہارے پاس اطراف زمین
الارض یطلبون الحدیث	سے نوجوان علم کی طلب میں آئیں گے
اذا جآؤکم فاستوصوا	جب وہ آئیں تو تم لوگ ان کے ساتھ
بھم خیرا	اچھا سلوک کرنا۔

اور عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں:

اخبرنا ان رسول اللہ صلی اللہ	ہم کو خبر ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قال لایزال اللہ	علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس
یغرس فی ھذا الدین غرسا	دین میں پودے اگاتا رہے گا جو سے
یشد الدین بھم۔	اس دین کو تقویت دے گا۔

حضرت عمرو بن عاص اہل قریش کے ایک حلقہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم لوگوں نے ان لڑکوں کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے؟ ایسا نہ کرو، ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کرو، ان کو حدیث سناؤ اور سمجھاؤ، یہ صغار قوم ہیں، عنقریب کبار قوم ہو جائیں گے، تم لوگ بھی صغار قوم تھے اور آج کبار قوم ہو گئے ہو[1] حضرت حسن بن علیؓ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم حاصل کرو، اگر آج تم صغار قوم ہو تو کل کبار قوم

---

[1] شرف اصحاب الحدیث ص ۲۱ و ص ۶۵۔

ابتغاء العلم فاذا لقينا هم تجهموا لنا وقالوا لنا[1]	ہیں، اپنے جسموں کو تھکاتے ہیں، سواریوں پر آتے ہیں اور جب ان حضرات سے ملتے ہیں تو یہ ہمارے سامنے منہ بگاڑتے ہیں اور نا ملائم باتیں کرتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے دوسرے شاگرد عُتَیّ بن ضمرہ تمیمی بصریؒ کہتے ہیں:

قلت لأبي بن كعب نا تيكم من البعد نرجو عند كم الخير ان تعلمونا فاذا اتيناكم استخففتم امرنا كانا نهون عليكم[2]	میں نے ابی بن کعب سے کہا کہ ہم لوگ دور دراز مقامات سے آپ حضرات کے یہاں اس امید پر آتے ہیں کہ آپ لوگ ہم کو حدیث کی تعلیم دیں گے اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو ہم کو حقیر سمجھتے ہیں، گویا آپ کے نزدیک ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔

حضرت ابی بن کعب نے اپنے دونوں شاگردوں کا شکوہ سنکر ان کے ساتھ نہایت محبت وشفقت کا معاملہ کیا اور آنے والے جمعہ کے دن حدیث بیان کرنے کا وعدہ فرمایا مگر اس سے پہلے انتقال کر گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد فاروقی ہی میں مسجد نبوی میں تعلیم وتدریس کے متعدد حلقے قائم تھے اور مدینہ کے باہر کے طلبہ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے،

---

[1] ابن سعد ج ۳ ص ۵۰۰ و ص ۵۰۱ [2] ایضاً ص ۵۰۰۔

تعلیمی مجلسوں میں نوجوان طلبہ کی کثرت | صحابہ کی تعلیمی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں نوخیز اور نوجوان طلبہ کی کثرت ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پیشین گوئی فرماکر ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور دین کی تعلیم دینے کی تاکید فرمائی تھی ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا تھا:

سیاتیکم شباب من اقطار	عنقریب تمہارے پاس اطراف زمین
الارض یطلبون الحدیث	سے نوجوان علم کی طلب میں آئیں گے
اذا جاؤکم فاستوصوا	جب وہ آئیں تو تم لوگ ان کے ساتھ
بھم خیرا	اچھا سلوک کرنا۔

اور عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں:

اخبرنا ان رسول اللہ صلی اللہ	ہم کو خبر ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قال لایزال اللہ	علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس
یغرس فی ھذا الدین غرسا	دین میں پودے اگاتا رہے گا جن سے
یشد الدین بھم۔	اس دین کو تقویت دے گا۔

حضرت عمرو بن عاصؓ اہل قریش کے ایک حلقہ کے پاس گئے اور کہا کہ تم لوگوں نے ان لڑکوں کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے؟ ایسا نہ کرو، ان کے لیے مجلس میں وسعت پیدا کرو، ان کو حدیث سناؤ اور سمجھاؤ، یہ صغار قوم ہیں، عنقریب کبار قوم ہو جائیں گے، تم لوگ بھی صغار قوم تھے اور آج کبار قوم ہو گئے ہو، حضرت حسن بن علیؓ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم حاصل کرو، اگر آج تم صغار قوم ہو تو کل کبار قوم

لہ شرف اصحاب الحدیث ص ۲۱ و ص ۴۵۔

بن جاؤگے، تم میں سے جو یاد نہ کر سکے وہ لکھ لیا کرے[1]

حضرت ابو سعید خدریؓ جب اپنی مجلس میں نوجوانوں کو آتے ہوئے دیکھتے تو نہایت والہانہ انداز میں ان کا استقبال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو مرحبا ہو، آپ نے ہم سے فرمایا تھا کہ میرے بعد لوگ تمہارے پاس حدیث کی طلب میں آئیں گے، تم ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کرنا، ان کو حدیث کی تعلیم دینا، حسن سلوک سے پیش آنا، مجلس میں جگہ بنانا، اس کے بعد ان سے کہتے تھے کہ:

فانکم خلوفنا واھل الحدیث بعدنا[2]	تم لوگ ہمارے بعد ہمارے جانشین اور حدیث کے عالم ہوگے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جب نوجوانوں کو طلب علم میں دیکھتے تھے تو کہتے تھے،

مرحبا بینابیع الحکمۃ، و مصابیح الظلم خلقان الثیاب جدد القلوب حبس البیوت ریحان کل قبیلۃ[3]	مرحبا حکمت کے سرچشمے، ظلمتوں کے چراغ، پرانے کپڑے، نئے دل والے گھروں کی زینت اور خاندان و قبیلہ کے گل بوٹے۔

درسگاہ صحابہ کے یہ نوجوان طلبہ آگے چل کر علوم نبوت کے وارث و معلم ہوئے اور ان کا شمار طبقۂ تابعین کے علمائے کبار میں ہوا۔

صحابہ کی اپنے شاگردوں سے محبت اور ان کے ساتھ حسن سلوک

وصیت نبوی کے مطابق حضرات صحابہ نے اپنے حلقہ نشینوں اور شاگردوں کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت اور ایثار و خلوص کا معاملہ کیا ان کی دلداری و دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۸۲ [2] شرف اصحاب الحدیث ص ۱۲ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۲ و ص ۵۳

حضرت انسؓ کے شاگرد حمید کا بیان ہے کہ ہمارے ساتھ ثابت بن اسلم بنانی بھی حضرت انسؓ کی مجلس میں جاتے تھے، راستہ میں جو مسجد آتی ثابت اس میں جاکر نماز پڑھتے، جب ہم لوگ حضرت انسؓ کے پاس پہنچ جاتے تو کہتے۔

این ثابت؟ ان ثابتا دویبۃ	ثابت کہاں رہ گیا؟ ثابت ایسا کیڑا
احبھا۔	ہے جس کو میں محبوب رکھتا ہوں۔

خود ثابت کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم کو دیکھ کر کہا کہ:

واللہ لا نتم احب الی من	خدا کی قسم میں تم لوگوں کے برابر
عدتکم من ولدی الا	انسؓ کی (اپنی) اولاد سے زیادہ
من علی مثل ما انتم علیہ[1]	تم لوگوں کو محبوب رکھتا ہوں
	البتہ ان میں سے جو تم لوگوں کے
	مانند ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک سب سے محترم کون آدمی ہے؟ تو بتایا کہ میرا وہ ہم نشین جو حاضرین مجلس کو پھاندتا ہوا میرے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے، اگر میرے بس میں ہو تو اس کے چہرے پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دوں، اس کے بدن پر مکھی بیٹھتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے[2]، ان کا قول ہے کہ میرے ہم نشین کا میرے اوپر تین حق ہے، اسکو آتا ہوا دیکھوں تو انتظار کی نظر سے دیکھوں، جب بیٹھ جائے تو اسکے لیے گنجائش نکالوں اور جب بات کرے تو غور سے سنوں[3]۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۳۲ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۱۲ [3] الکامل مبرد ج ۱ ص ۱۰۲۔

ابو العالیہ ریاحی نے غلامی کی حالت میں قرآن پڑھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا، وہ کہتے ہیں کہ ابن عباس مجھے اپنے تخت پر بٹھاتے تھے حالانکہ قریش کے اعیان و اشراف نیچے بیٹھتے تھے اور کہتے تھے کہ یوں ہی علم عزت و شرافت بڑھاتا ہے اور عالم کو بادشاہوں کی طرح تخت پر بٹھاتا ہے[1]

ابو جمرہ نصر بن عمران ضبعی بصری کہتے ہیں کہ ابن عباس اپنی مجلس میں مجھے تخت پر بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم میرے یہاں رہو، میں تمھارے لیے اپنے مال سے ایک حصہ مقرر کر دیتا ہوں[2]

زر بن جبیش کا بیان ہے کہ میں حضرت صفوان بن عسال کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے پوچھا کس کام سے آئے ہو؟ میں نے کہا کہ طلب علم کے لیے حاضر ہوا ہوں، یہ سنکر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے بشارت دیکر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ طالب علم کے لیے ملائکہ اس خوشی پر اپنے پر بچھاتے ہیں کہ وہ علم طلب کر رہا ہے

مدینہ سے ایک طالب علم حضرت ابو درداءؓ کے پاس دمشق گیا انھوں نے اس سے پوچھا یہاں کس لیے آئے ہو، کوئی حاجت ہے یا تجارت مقصد ہے، یا یہ سفر طلب علم کی غرض سے کیا ہے؟ اس طالب علم نے کہا کہ میں صرف طلب علم کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں، اس پر حضرت ابو درداءؓ نے مسرت و بشارت کے انداز میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندہ طلب علم میں نکلتا ہے، فرشتے اس کے لیے پر بچھاتے ہیں، وہ جنت کا راستہ طے کرتا ہے اور عالم کے لیے آسمان اور زمین والے حتی کہ سمندر کی مچھلیاں استغفار کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت زاہد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے، علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء درہم و دینار وراثت میں نہیں چھوڑتے ہیں بلکہ وہ علم کی وراثت چھوڑتے ہیں، جس شخص نے علم کی وراثت حاصل کی اس نے وافر حصہ حاصل کیا[3]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۰ [2] الفقیہ و المتفقہ ج ۲ ص ۱۱۲ و ص ۱۱۰ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳ و ص ۴۰،

ملاّ محمد صوفی مازندرانی

از ڈاکٹر نورالسعید اختر، بمبئی

(۲)

رباعی:-

(۱) پیوستہ اسیر، گردش دورانم — ہمارہ قرین، فرقت یارانم

بی اصحابم، چون شب مہتابم — بی یارانم چو کشت بی بارانم

(۲) جانِ من خصم گشت و دل بدخواہ — دوست دشمن شد ست ویار اغیار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوفی کو زیر آسمان کہیں بھی سکون میسر نہیں ہوا۔ نقطوی مسلک کی بنا پر غالباً انہیں وطن چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

از خاکِ فارس روی رہِ رفتنم نماند — پایم از زمانہ بدست جفا کشید

صوفی کے اشعار اس امر کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ شراب معرفت اور شراب ناب دونوں کے شیدا تھے۔ ان موضوعات پر صوفی کی مرصع غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ دیوان صوفی کی کئی غزلوں کے پس پردہ ان حقایق کی پردہ کشائی موجود ہے۔ ممکن ہے انہیں "رموز عشق و مستی" کا درس اپنے استاد میر سید جلال رضائی بخاری سے ملا ہو۔ اس حقیقت کی طرف صوفی کا واضح اشارہ ملاحظہ کیجئے:

ندانم خبر رموز عشق و مستی — کہ از استاد خود این یاد دارم

ڈاکٹر محمد صدیق نے صوفی کی شخصیت اور ذاتی زندگی سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:[۹۱]

"In this Poem the Poet also gives an expres-sion of his Personal feelings which are of great value for the study of his Per-sonality. The lines indicate that he led a secluded care free saintly life"

لباس عیش من بے تار و پود است — درخت بخت من بی برگ و بار است
چو من با فقر و فاقه خو گرفتم — مرا با مردم دنیا چه کار است
سبکساری گزیدم در ره عشق — که ره بر گنبد نیلی حصار است
نخواهم بار دیگر بر دل خویش — که بر من زندگانی نیز بار است
سبکسارم از آن خوش می کنم سیر — منم آهوی گیتی مرغزار است
از آنم ملک درویشی خوش آمد — که ملک بی نزاع و پای دار است
نه دردی محنتی از ازدحام است — نه بادی کلفتی از گیر و دار است[۹۲]

"ساقی نامہ" میں صوفی اپنی بے کیف و بے رنگ زندگی کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ؎

(۱) بسی گرد گیتی بگشتم بسی — جگر خون تر از خود ندیدم کسی[۹۳]
(۲) ہمہ نام نیکو بتنگ آمدم — از این زندگانی بتنگ آمدم
(۳) درین بزمگہ با تنی چون نیم — نفس میزنم لیک زنده نیم

(۴) چو من رخت بیرون برم زین جہان خورو شان بدانسا نکہ تیراز کمان

(۵) بنالم چنان زار از ین دار غم کہ بیرون نیاید کسی از عدم

اپنی ناقدری کا شکوہ درج ذیل اشعار میں تعلّی آمیز انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

(۱) بود نسبت من بکوی مغان ہمان نسبت پیل ہندوستان[۹۴]

(۲) مراگرچہ طبعی است گیتی فروز درا یران زمین چون چراغم بروز

(۳) ندارم بہر بوم و بر نیتی نیرزم بیک نان بی منتی

(۴) حقیرم بہر کوی و ہر انجمن چو فضل اندر ایران و دُر در عدن

(۵) ندارد بمن ۔ غبتی ہیچکس درا یران چنانم کہ در دیدہ خس

صوفی کی رندی و مستی کوئی پوشیدہ بات نہیں تھی وہ علانیہ طور پر کہتے ہیں ؎

(۱) رفتم بطرف میکدہ با بسازم آرزوست دیوان حافظ و مے شیرازم آرزوست[۹۵]

(۲) شب شنبہ شراب باید خورد ی چون آفتاب باید خورد

(۳) باجام مے محمد روزی قرین شود کین چرخ را چو شیشۂ رسن درگلو کنند

صوفی کے یہاں صوفیانہ پیرایۂ بیان کس حد تک بے باک اور بے لگام ہے۔ انھوں نے ایک صوفی صافی کی حیثیت سے جا بجا محمد تخلص استعمال کیا ہے جو بسا اوقات ذو معنی ہو جاتا ہے، صوفی اسی انداز بیان کو عشق حقیقی کی معراج تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ "ساقی نامہ" میں کہتے ہیں ؎

(۱) می و عشق را در ہم آمیختند وجود محمد ازان ریختند

(۲) محمد منم این خرد تاج من فتوحات مکی است معراج من[۹۶]

رباعی:(۱) در ظلمت اگر نور و ضیا خواہد بود معنی در لفظ دلکشا خواہد بود
آن آب کہ عمر جاوداں می بخشد قرآن و حدیث مصطفیٰ خواہد بود[۹۶]

صوفی اپنی تر دامنی کے باوجود اپنے زہد و تقویٰ کا اظہار ذیل کے اشعار میں انوکھے پیرایہ میں کرتے ہیں:

(۱) ہاں ای زمین بدیدہ نگاہدار ہمچو اشک کز آبروی بندہ ملائک وضو کنند[۹۷]
(۲) عہدے کہ داشت دختر رز با من آن نماند باید کہ عریان رہی ترک او کنند
(۳) اگر داری پیالی سوی ایمان محمد را پیمبر میتوان کرد

صوفی نے ہندوستان کو مجازی ہی سہی لیکن اپنا وطن تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم انہیں ایران کی بہاریں، شیراز کی مئے گلگوں، احباب و اقارب یاد آجاتے تھے۔ وہ جب بھی دلبرداشتہ ہوتے تو سرزمین ہندوستان انہیں "چاہ یوسف" نظر آتی۔ انہیں جینے اور مرنے تک کا احساس نہ ہوتا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) کو فتادم بعالی کہ درو مردن و زیستن است یکسانم[۹۹]
(۲) درزمین سیاہ ہند امروز ہمچو یوسف بچاہ کنعانم
(۳) محمد را بکام دشمنان کرد فلک در ملک ہندوستان

حتیٰ کہ ہندوستان کے شب و روز صوفی کے لیے قفس سے بدتر ثابت ہوئے اور ایران لوٹ جانے کا خیال ان کے سینے میں انگڑائیاں لیتا رہا چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) بر من شدہ ست کشور ہندوستان قفس یک رہ بملک ایران پروازم آرزو ست[۱۰۰]

رباعی:
در ہند نسیم بوالعجبی در کار است حیوان ددوی عزیز و مردم خوار است
از بسکہ بتلخی گذرد اینجا عمر مردن آسان و زندگی دشوار است

در ہند بسی کہ رای رایان دیدم در صورت بندگان خدایان دیدم
در کسوت مرد دیدہ ام زن بسیار با طبل و علم بسی گدایان دیدم

صوفی مزاجاً نہایت سنجیدہ اور متین تھے۔ انہیں شوخی اور مزاح سے عار تھا۔ تاہم ان کے زیر نظر قول کے برخلاف ان کے کلام میں طنز و مزاح کے نشتر پائے جاتے ہیں۔ صوفی کا قول ملاحظہ کیجئے:

(۱) گریزانم از مشت ہزل پیشہ ملا از صحبت ہزال عار است[۵۱]

رباعی: (۱) ہر چند وجود را بہم بیختہ اند مانند تو پیکری نیا نگیختہ اند
کافور ہمانا بہ یخ آمیختہ اند این قالب بیہودہ از آن ریختہ اند

(۲) ای پور خلیل تا تو گشتی شوہر یک زن نکند آرزوی شوی دگر
دایم بہ پسر دہند مردم دختر این خواجہ ما دادہ بدختر دختر

صوفی کی شاہد بازی کی طرف ان کے دیوان میں واضح اشارہ ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

دلم از صحبت پسر بگرفت شاہد زہرہ وش ہمی خواہم[۵۲]

تقی اوحدی[۵۳] صوفی کی شخصیت اور اعلیٰ ظرفی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہے کہ:

"از فاضلان زمان و دانایان دوران است ..... در سلک رندان خوش طبعان درآمدہ ..... بی تکلف و بی تعین می زیست والحق فطرت بغایت عالی دارد و تتبعات بسیار کردہ نہایت عنقا صفتی و غضنفر ہمتی دارد۔"

بقول صوفی: رباعی: دل آزادگان غمناک باید درون سینہ صد چاک باید
ازین دار فنا ہنگام رفتن حسابش با ہمہ پاک باید
(دیوان صوفی)

ملا قاطعی ہروی نے ملا محمد صوفی کے صوفیانہ مرتبے، زہد، ریاضت اور قناعت کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے[۱۰۴]

"مولد شریف ایشان از مازندران است و درو وادی درویشیا و صوفیگری صوفی حق شناس و پرہیزگار بودہ اند، و در طریق صوفیان مرتکب حیوانی نمیشود و بہ شیر و نان چو نفس را تسکین دادہ قناعت می نمایند و ملا ریاضت کش بودند وسلوک خوب بہ پیش داشتند۔"

وفات | صوفی کی زندگی کے آخری لمحات بدحالی سے ہمکنار رہے، ان کے علمی اور صوفیانہ درجہ کا شہرہ بادشاہ وقت (شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء / ۱۶۲۷ء) تک بہت دیر میں پہنچا تھا، بادشاہ نے انہیں بنفس نفیس مدعو کیا تھا۔ چنانچہ تذکرۂ صبح گلشن کے مولف[۱۰۵] نے صوفی کی شہرت اور انتقال کی خبر ان الفاظ میں دی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"بسکہ شہرہ فضل و کمال وی از زبان بعض ارکین بسامعۂ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ رسید۔ فرمان مطاع در طلب ملا محمد صوفی بنام حاکم کشمیر نافذ گردید و ملا بقصد حضوری حضور شاہی بر جناح استعجال تا شہرند (سرہند) رسیدہ بود کہ بریلیغ قضا تبلیغ از حضرت مالک الملک جل جلالہ بامضاء حکم الیوا در جوار رحمت خود ورود فرمود بہ خط فرمان واجب الاذعان گردن نہاد در سنہ خمس وثلثین والف ہمانجا تن قضا درداد"

۱۰۳۵ھ

تذکرۂ روز روشن کا مولف[۱۰۶] اس واقعہ کو یوں پیش کرتا ہے:

"در عہد اکبر بادشاہ بہ ہند رسید واز امراو شاہی منقطع گردید، شہر گجرات را خوش کردہ: در آنجا اقامت گزید۔ در سنہ سی وچہارم از مائۃ یازدہم کہ

بتقریب بعض مقربان فرمان جہانگیر بادشاہ از لاہور بطلبش در گجرات رسید
وی از آنجا روانۂ لاہور گردیدہ در میانۂ راہ بدار آخرت سرکشید و مصرعۂ
رفتہ ملا محمد صوفی تاریخ وفات اوست۔"

اس ضمن میں تذکرۂ صبح صادق کا مولف[۱۰۸] رقمطراز ہے کہ:

"او سالہا درین دیار (گجرات) ماند۔ و در اربع و ثلاثین والف (۱۰۳۴ھ)
جہانگیر بادشاہ او را بہ حضرت خود خواند۔ مولانا متوجہ لاہور گشت و در راہ
درگذشت۔ بہر سال وفات او گفتم "رفتہ ملا محمد صوفی"۔"

یہ صحیح ہے کہ صوفی کا انتقال لاہور کے سفر میں ہوا۔ مولف صبح گلشن[۱۰۹] نے
تصدیق کی ہے کہ صوفی نے سرہند کے مقام پر دار فانی کو لبیک کہا۔ البتہ صوفی کی وفات
کے سنین میں معمولی سا فرق پایا جاتا ہے۔ تذکرۃ الشعراء کے مولف عبد الغنی فرخ آبادی نے
صوفی کی تاریخ وفات کا ایک اور مادہ تاریخ دے کر اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ عبد الغنی
فرخ آبادی[۱۱۰] کی پیش کردہ تاریخ وفات ملاحظہ کیجیے:

"بحر دانہ یکی نشد بحق محمد صوفی" (۱۰۳۵ھ)

تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صوفی نے حالت نزاع میں شہنشاہ جہانگیر کے
لیے ایک رباعی کہی تھی جس کو پڑھ کر بادشاہ وقت پر رقت طاری ہو گئی تھی ملاحظہ ہو:

رباعی:- اے شاہ نہ تخت و نہ نگین می ماند — از بہر تو یک دو گز زمین می ماند
صندوق خود کاسۂ درویشان را — خالی کن و پر کن ہمین می ماند[۱۱۱]

چند تذکرہ نویسوں نے صوفی کے انتقال کی بابت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان میں
رضا قلی ہدایت[۱۱۲]، تذکرۃ الشعراء کا نامعلوم مصنف[۱۱۳] اور اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری کا

ملا قاطعی ہروی نے ملا محمد صوفی کے صوفیانہ مرتبے، زہد، ریاضت اور قناعت کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے [۱۴]:

"مولد شریف ایشان از مازندران است و در وادی درویشیها و صوفیگری، صوفی حق شناس و پرہیزگار بودہ اند، و در طریق صوفیان مرتکب حیوانی نمیشوند و بہ شیر و نان چو نفس را تسکین دادہ قناعت می نمایند و ملا ریاضت کش بودند و سلوک خوب پیش داشتند"۔

وفات | صوفی کی زندگی کے آخری لمحات بدحالی سے ہمکنار رہے، ان کے علمی اور صوفیانہ درجہ کا شہرہ بادشاہ وقت (شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء / ۱۶۲۷ء) تک بہت دیر میں پہنچا تھا، بادشاہ نے انہیں بنفس نفیس مدعو کیا تھا۔ چنانچہ تذکرۂ صبح گلشن کے مولف [۱۵] نے صوفی کی شہرت اور انتقال کی خبر ان الفاظ میں دی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"بسکہ شہرہ فضل و کمال وی از زبان بعض اراکین بسامعۂ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ رسید۔ زمان مطاع در طلب ملا محمد صوفی بنام حاکم کشمیر نافذ گردید و ملا بقصد حضوری حضور شاہی بہ جناح استعجال تا شہرند (سرہند) رسیدہ بود کہ یرلیغ قضا تبلیغ از حضرت مالک الملک جل جلالہ بامضاء حکم الیوا در جوار رحمت خود ورود فرمود بہ خط فرمان واجب الاذعان گردن نہاد در سنہ خمس و ثلثین و الف ہمانجا تن قضا درداد"

۱۰۳۵ھ

تذکرۂ روز روشن کا مولف [۱۶] اس واقعہ کو یوں پیش کرتا ہے:

"در عہد اکبر پادشاہ بہند رسید واز امرار شاہی منقطع گردید، شہر گجرات را خوش کردہ، در آنجا اقامت گزید۔ در سنہ سی و چہارم از ماتہ یازدہم کہ

بتقریب بعض مقربان فرمان جہانگیر بادشاہ از لاہور بطلبش در گجرات رسید
وی از آنجا روانۂ لاہور گردیدہ در میانۂ راہ بدار آخرت سر کشید و مصرعۂ
رفتۂ ملا محمد صوفی تاریخ وفات اوست"۔

اس ضمن میں تذکرۂ صبح صادق کا مولف[۱۱۰] رقمطراز ہے کہ :

"او سالہا درین دیار (گجرات) ماند۔ و در اربع و ثلاثین والف (۱۰۳۴ھ)
جہانگیر بادشاہ او را بہ حضرت خود خواند۔ مولانا متوجۂ لاہور گشت و در راہ
درگذشت۔ بہر سال وفات او گفتم "رفتۂ ملا محمد صوفی"۔"

یہ صحیح ہے کہ صوفی کا انتقال لاہور کے سفر میں ہوا۔ مولف صبح گلشن[۱۱۰] نے
تصدیق کی ہے کہ صوفی نے سرہند کے مقام پر دار فانی کو لبیک کہا، البتہ صوفی کی وفات
کے سنین میں معمولی سا فرق پایا جاتا ہے۔ تذکرۃ الشعراء کے مولف عبد الغنی فرخ آبادی نے
صوفی کی تاریخ وفات کا ایک اور مادہ تاریخ دے کر اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ عبد الغنی
فرخ آبادی[۱۱۰] کی پیش کردہ تاریخ وفات ملاحظہ کیجیے :

"مجردانہ یکی نشد بحق محمد صوفی" (۱۰۳۵ھ)

تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ صوفی نے حالت نزاع میں شہنشاہ جہانگیر کے
لیے ایک رباعی کہی تھی جس کو پڑھ کر بادشاہ وقت پر رقت طاری ہو گئی تھی ملاحظہ ہو :

رباعی :۔ اے شاہ نہ تخت و نہ نگین می ماند — از مہر تو یک دو گز زمین می ماند
صندوق خود کاسۂ درویشان را — خالی کن و پر کن ہمین می ماند[۱۱۱]

چند تذکرہ نویسوں نے صوفی کے انتقال کی بابت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان میں
رضا قلی ہدایت[۱۱۱]، تذکرۃ الشعراء کا نامعلوم مصنف[۱۱۲] اور اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری کا

مولف ولیم بیل[۱۱۳] شامل ہیں۔

گجرات سے والہانہ محبت | "تزک" میں شہنشاہ جہانگیر نے گجرات کے خطے کی مذمت کی ہے یہاں کے گرد و غبار، آب و ہوا کی کثافت اور کھارے پانی سے جہانگیر کو نفرت تھی لیکن اس کے برعکس صوفی کو اس علاقہ سے بے پناہ محبت تھی۔ صوفی سرزمین گجرات کو فردوس برین کشمیر پر فوقیت دیتے تھے۔ صوفی کے دیوان کا مطالعہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ وہ گجرات (احمد آباد) میں کم اور شہر خوباں سورت میں زیادہ دنوں تک مقیم رہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

(۱) محل من دراین سورت شاداب ملک است مقام من دراین خورم دیار است[۱۱۴]

(۲) مقرمن ازان نشد شہر سورت کہ دانستم این دارالقرار است

خطہ گجرات سے صوفی کے والہانہ عشق کی روداد ہمیں ان کے قصیدے سے بھی ملتی ہے۔ صوفی نے صمیم قلب سے اس سرزمین کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مرا گجرات ازان گشت مسکن کہ از مازندرانم یادگار است

زمین او بہشت اندر بہشت است ہوای او بہار اندر بہار است

بگجرات آرزو با خود مبر دل کہ آنجا دلبرا بیش از شمار است

جمال اینجا ندارد باوفا جنگ صباحت با ملاحت نیز یار است

غبار او عبیر حضر مو ست زمین او ولی مشک تتار است

در او مردم چو در میخانہ مستان زبس کآب و ہوایش سازگار است[۱۱۵]
(دیوان ص۱۱)

شاعرانہ حیثیت | صوفی کی طبیعت کا خمیر، شعر و شاعری، صوفیانہ آہنگ، رندو مستی،

عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تمام ترکیفیات سے رچا ہوا تھا۔ فن شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا اور وہ اس کی تمام نزاکتوں پر حاوی تھے۔ ان کی عشق آشنا طبیعت اور پاکیزہ ذہن سے آبدار اشعار نکلتے تھے۔ وہ شاعری کے آب حیات سے اپنی روح کی کثافت دور کرتے تھے۔ صوفی زبان کی چاشنی اور حلاوت سے زمانے کے قرطاس پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ان خصوصیات کے پیش نظر ان کی شاعرانہ حیثیت مسلم تھی۔ صوفی نہ صرف بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے بلکہ بقول صاحب میخانہ "قطب مرکز سخندانی"[۱۱۵] کے اعزاز کے حامل تھے۔

صوفی کے کلام میں پائی جانے والی طرز ادا کی جدت اور پرکیف دلآویزی نے انہیں مقبول خاص و عام بنا دیا تھا۔ ان کی غزلیں بہاروں کے رنگ اور بادو باراں کی گھن گرج سے معمور ہیں۔ صوفی کے کلام میں دل کو چھو لینے والی کسک اور انداز بیان کی لچک بہت دلکش ہے۔ چنانچہ بقول خود :۔

غزلی گفته می شود در یاب طرب انگیز تر نباد و بہار[۱۱۶]

ان باتوں کی تائید میں چند تذکرہ نویسوں کے خیالات پیش کیے جا رہے ہیں :

(۱) "اکثر سخنان او شور انگیز و اغلب اشعار او دلآویز و طرز حرف زدن او بقدما مانند است"[۱۱۷]

(۲) "شعرش خالی از لطف نیست"[۱۱۸]

(۳) "بعلت ذوق و عرفان شعر عارفانه و صوفیانہ می سرود"[۱۲۰]

(۴) "الحق طرز خاص دارد"[۱۲۱]

(۵) "شعرش در غایت جودت و ہمواری و متانت است"[۱۲۲]

(۶) بقول خود ؎

درین عالم محمد آنچنان است که در مینا نہا پے ہنر گاران[۲۳]

تعلی:۔ صوفی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ فن شعر میں یگانۂ روزگار ہیں۔ فصاحت اور بلاغت میں وہ خود کو "امراء القیس" اور "سحبان" سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ تعلی آمیز لہجے میں کہتے ہیں ؎

در فصاحت چو امراء القیسم در بلاغت چنانکہ سحبانم[۲۴]

البتہ صوفی فارسی کے سربرآوردہ شاعر مسعود سعد سلمان کے معتقد تھے وہ کہتے تھے کہ اگر فلسفہ آواگون کو جائز قرار دیا جائے تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ "مسعود سعد سلمان" کی روح ان کے جسم و جان میں حلول کر گئی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

گر تناسخ رواست من بندہ روح مسعود سعد سلمانم

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

مرا گرچہ طبعی است گیتی فروز در ایران زمین چون چراغم برروز
(ساقی نامہ ص۔)

صوفی اپنی شاعری اور آہنگ شعر سے متعلق جدا جدا رائیں رکھتے تھے۔ کبھی شعر کو اپنی طبیعت کے آتشیں شعلہ سے بہتا ہوا آب حیات کہتے، کبھی رائے کو انجم سوز اور طبیعت کو آسمان سے برستی آگ سے مشابہ کرتے، کبھی شاعری کے آب حیات سے مئے ارغوان کشید کرتے اور اس سے اپنی مکدر طبیعت کی کثافت و خباثت صاف کرتے جب کبھی ان کی پاکیزہ طبیعت رواں ہوتی تو وہ شیریں بیانی اور سخندانی کے رسیلے اور شفاف سوتے بہاتے۔ اس امر کی تصدیق میں صوفی کے چند اشعار پر غور فرمایئے ؎

آفتابیست رایم انجم سوز آسمانیست طبعم آتش بار

بیرون آمد چنان پاکیزہ شعر از طبع پاک او | کہ لولو از دل دریا و لعل از کان برون آید

۱ آب حیات شعر من آرید در میان | تا طبع از جنابت می شست و شو کنند

۲ زبان من شکر ریزی می کرد | ز نظم من در آن خورم عروسی

۳ نقشی است نظم بندہ (محمد) ز خون دل | بر صفحۂ زمانہ بس این یادگار ما

۴ پر ز گوہر شود کنار و برم | بسخن چون زبان بجنبانم

رباعی ای دیدہ ہنر بی جہالت بی نور | بی روی تو باد دیدۂ انجم کور

شعر تو چو آبست و لی آبحیات | طبع تو چو آتش است لیکن آتش طور

صوفی کی تصانیف | اس وقت تک صوفی کے پانچ کارنامے دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ چند تذکروں اور بیاضوں میں صوفی کا متفرق کلام دستیاب ہوتا ہے۔ راقم کے توسط سے صوفی کی دو مثنویوں (۱) حسب نامہ (۲) صوفی نامہ کا پہلی بار مختصر تعارف پیش کیا جائیگا۔

(۱) بتخانہ:- صوفی کے اس تذکرے میں ۲۴۹ شعراء سے متعلق مختصر معلومات اور ساٹھ ہزار اشعار کا انتخاب موجود ہے۔ یہ تذکرہ صوفی کی دیدہ ریزی، علمی ادبی اور تحقیقی صلاحیت اور حسن انتخاب کا ضامن ہے[۱۲۵]۔ صوفی نے اس تذکرے کا نام بتخانہ رکھا ہے کسی تسامح کے باعث ولیم بیل[۱۲۶] نے اس کا نام "میخانہ و بت خانہ" تحریر کیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت نادر اور غیر معروف ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (شعبۂ فارسی) میں صوفی کے اس گرانقدر تذکرے پر تحقیقی کام جاری ہے۔

احمد گلچین معانی[۱۲۷] بتخانے کی تعریف میں رقمطراز ہیں کہ:

"ملا محمد صوفی مازندرانی مدت چہل سال در دواوین و سفاین گردیدہ واز مجموع چہار صد ہزار بیت نزدیک بہ چہل ہزار بیت برگزیدہ و آنرا موسوم بہ بتخانہ

گردانیدہ است "

گجرات کے بخشی حسن بیگ خاکی کی مدد سے ۱۰۱۶ھ مطابق ۱۶۰۸ء میں تذکرہ بتخانہ کی تالیف عمل میں آئی۔ احمد گلچین معانی اس کی تالیف کا زمانہ ۱۰۱۶ھ / ۱۶۰۸ء[۱۲۸] قرار دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آج تک صوفی کا یہ تذکرہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ بتخانہ کی تعریف میں صوفی کے دیوان میں چند داخلی حوالے ملتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

(۱) چو من بتخانہ پیش خود دارم گلستان ارم در پیش دارم

(۲) دو عالم را یکی بتخانہ کردم گر من معجزہ از حد بیش دارم[۱۲۹]

بتخانہ کی تالیف کے پانچ سال بعد یعنی ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء میں عبد اللطیف بن عبد اللہ گجراتی نے اس میں ایک مقدمے اور کچھ معلومات کا اضافہ کیا اور اس کا نام "خلاصۃ الاشعار"[۱۳۰] رکھا۔ بوڈلین کتب خانے کے فہرست نگار[۱۳۱] کا خیال ہے کہ :

" عبد اللطیف گجراتی در حقیقت کتاب صوفی را دزدیدہ است "[۱۳۲]

(۲) ساقی نامہ :- ڈاکٹر امیر حسن عابدی لکھتے ہیں کہ " بتخانہ کے بعد (شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے) ساقی نامہ[۱۳۳] کی باری آتی ہے۔ حالانکہ یہ ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے ساقی نامہ کی تعریف کی ہے۔ عرفات کا مولف لکھتا ہے کہ " ساقی نامہ او در شہرتی عظیم شدہ " اور صاحب میخانہ کہتا ہے " مولانا نے فرمایا۔ ۔ ۔ جس شخص کو میری شاعری کا درجہ معلوم کرنا ہو وہ میرے ساقی نامہ کو دیکھے کہ کیسا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کا کہنا بالکل صحیح ہے[۱۳۴]۔ صوفی کا ساقی نامہ کل ۲۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ احمد گلچین معانی[۱۳۵] اور طاہری شہاب[۱۳۶] نے اسے طبع کر دیا ہے۔

(۳) دیوان ملا محمد صوفی :- ہماری دانست میں دیوان صوفی کے گیارہ قلمی مخطوطے اور

ایک مطبوعہ دیوان ہے۔

(۱) دیوان ملا محمد صوفی : مملوکہ بانکی پور، پٹنہ۔ جلد ۲ نمبر ۱۷۱ صفحہ ۹ (۲) دیوان ملا محمد صوفی : نیشنل میوزیم دہلی[1]۔ نمبر ۷/۱۴۳/۵۹ تعداد اشعار ۷۰۰۰ (۳) دیوان ملا محمد صوفی : فہرست اسپرنگر نمبر ۳۸۲ (۴) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانۂ سلطنتی تہران نمبر شمارہ ۱۰۱۸ (۵) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانۂ آستان قدس، مشہد نمبر ۱۴۱، کتابت ۱۰۲۷ھ تعداد ۱۲۰۰ (۶) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانۂ حاج حسین آقا ملک تہران (۷) دیوان ملا محمد صوفی : مملوکہ طاہری شہاب، ساری، تہران (۸) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانہ ہمبرگ جرمنی نمبر ۱۹۱ (فارسی) جلد نمبر ۴ (۹) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانہ میونخ جرمنی نمبر ۱۸۔ ۷/۶ (۱۰) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانہ گنج بخش راولپنڈی، جلد دوم ۹۵۴ (پاکستان) (۱۱) دیوان ملا محمد صوفی : کتابخانہ مملوکہ مسعود حسن ادیب (مرحوم) لکھنؤ کتابت ۱۰۰۱ھ (۱۲) دیوان ملا محمد صوفی مطبوعہ تصحیح و تحشیہ سید محمد طاہری شہاب ۱۳۴۸ شمسی بسرمایۂ کتابخانہ ابن سینا۔

۴ :۔ مثنویات صوفی بنام (۱) حسب نامہ (۲) صوفی نامہ ؛ سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد مخطوطہ نمبر ۱۷۲۲، جلد نمبر ۵ اندراج صفحات ۸۰، تاریخ کتابت ۱۱۱۵ھ ۱۱۴۴

---

[1] یہ قلمی نسخہ (کشکول) بقول ڈاکٹر امیر حسن عابدی صوفی کا خود نوشتہ کشکول ہے۔ اس میں عربی و فارسی نظم و نثر کا انتخاب موجود ہے۔ اس کشکول کے آخر میں دیوان صوفی شیرازہ بند ہے۔ مخطوطے کے منتخبہ اشعار اور اس کی قدامت ڈاکٹر عابدی کے قیاس کی تائید کرتے ہیں۔ راقم بھی ڈاکٹر عابدی کا ہمنوا ہے۔ اس کی ابتدا میں عربی و فارسی میں ایک مختصر سا مقدمہ ہے۔ اس کا کاغذ قدیم اور زر افشاں ہے۔ اس میں صوفی کے اشعار کی مجموعی تعداد ۷۰۰۰ ہے۔

اس مخطوطے میں صوفی کا ساقی نامہ اور دو مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی حسب نامہ ۱۱۵۳ اشعار پر مشتمل ہے، اختتامیہ شعر کے بعد ایک ۸ اشعار کی غزل ہے۔ حسب نامہ کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

صنع ایزد را کہ صنعت وراست وز کمال حد عقل اولی تراست

ذیل کے اشعار میں شاید بادشاہ وقت (مغل اعظم جلال الدین اکبر) کی طرف اشارہ ہے :۔

قرب شاہ از بہر جانب شد وبال قرب حق آمد ترا عز و جلال
گر جلال حق بتو آمد معین عز وارنیت (کذا) رسد زانسو قرین
قرب شاہت ترا از حیوان کند جانہا بستاند و بیجان کند
چونکہ جانت مایل عزاست وجاہ می گریزائی جان ز قرب بادشاہ

تصوفی فلسفہ کی طرف صوفی کا اشارہ ملاحظہ فرمایئے :

ہر تمنا شاپردہ دار روی تست جملہ عالم نقطۂ ابروی تست

حسب نامے کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے ؎

یاد تو بادا مقیم ہر دلے یا کلید راز ہائے مشکلے
مشکلم را الہی چارہ کن خون خصم از نائژ فوارہ کن
یا الہی جملہ دلہا شاد باد تا قیامت این جہان آباد باد

صوفی نامہ: صوفی کی ایک غزل کے بعد 'صوفی نامہ' کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدائی شعر یہ ہے۔

الٰہی بر دلم ز فیض اثر کن بیانم را قبول بہر نظر کن

اس کے بعد عشق حقیقی کے رموز مندرجہ ذیل حکایتوں کے ذریعہ بیان کیے گئے ہیں۔ انداز بیان تمثیلی ہے

۱۔ حکایت گل وبلبل ۲۔ حکایت بلبل وزاغ ۳۔ ملامت کردن گل باباغبان ۴۔ تقریر کردن بلبل ۵۔ حکایت زاغ (نزد جوئبار) ۶۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس مثنوی میں بھی کم وبیش ایک ہزار ساٹھ سو آٹھ اشعار ہیں۔ اس کا اختتام بھی ایک غزل پر ہوتا ہے جس کا مقطع درج ذیل ہے۔

تناسب کہ افزودی لائے بیا صوفی رہا ئش کن   کہ میر عشق با مستان ز بہر اشتہار آمد

مثنویات صوفی میں دستیاب شدہ غزلیں دیوان صوفی مرتبہ طاہری شہاب تہران میں نہیں ہیں۔ سنہ کتابت (۱۰۵۰ ہجری از فاضل بیگ کاتب)

صوفی نامہ کے اختتامیہ اشعار

بگو ای عشق بیداد بیداد   ہمیشہ حسن ماہرویان فزون باد

کہ ساقی پنبہ از مینا بر آرد   بجام جرعۂ دیگر نشارد

بگو برخیز و ختم ہر دعا را
بہر دم تازہ توحید خدا را

متفرق اشعار صوفی | بقول مولف "میخانہ" صوفی کے تین ہزار اشعار ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں[۱۳]۔ ان میں سے ۱/۴ حصہ ہماری دسترس میں ہے۔ صوفی جیسے جلیل القدر شاعر کے یہ بکھرے ہوئے موتی اور منتشر گوہر پارے اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ اکٹھا ہو جائے گا۔ ذیل میں چند ماخذوں کی فہرست دی جا رہی ہے جو صوفی کے منتشر کلام کی تلاش وجستجو میں مدد معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) تذکرۂ بتخانہ از ملا محمد صوفی مازندرانی (۲) تذکرۂ مقالات الشعرا تالیف میر علی شیر (۳) تذکرۂ بستان عشاق المشہرہ (۴) تذکرۂ جواہر العجائب از فخری (۵) چند شاعر گمنام از گلچین معانی (غیر مطبوعہ) (۶) خرابات از خراب (۷) خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار از ذکری (۸) تذکرۂ مجموعہ العجائب ؟ (دانشگاہ تہران) (۹) ...... (بشمول ان تمام تذکروں کے جن کے حوالے مقالے میں شامل ہیں) (۱۰) فہرست مخطوطات فارسی از اشرف، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد۔ ہند، جلد نمبر ۵ مخطوطہ نمبر ۲۲ ۱۷ ؟ اور جلد نمبر VI از اشرف (دیکھئے صوفی)

منابع و ایرانی ماخذ | ۱۔ جالزادہ، محمد علی: "انتشار کتاب دیوان صوفی مازندرانی" وحید ۷ (۱۳۴۹)

۲۔ طاہری شہاب "محمد صوفی مازندرانی" ارمغان: ۲۷ (۱۳۳۶)

۳۔ گلچین معانی احمد "محمد صوفی مازندرانی" گوہر ۲ (۱۳۵۳)

۴۔ گودازی، فرامرز "مختصری شرح حال محمد صوفی آملی" بہمراہ زندگینامہ طالب آملی، ہنر و مردم، ۱۵، ش ۱۵۸ (آذر ۱۳۵۴)

۵۔ دیگر تلیش شدہ منابع (ایران کے مختلف کتب خانوں کی بیاض وغیرہ)

حوالے

ث۱ رباعیات صوفی، مرتبہ طاہری شہاب: تہران ش۲ و ش۳ دیوان صوفی، ایضاً ش۴ ڈاکٹر محمد صدیق، صدر شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (وظیفہ یاب) ش۵ Some Persi-an Poets of Gujrat in the 19th Century, An article by Dr. Mohammad Siddique. "The growth of Indo-Persian literature in Gujrat, edited by M.M. Siddique, Baroda, 1985, P.26

۹۲ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ص۳۱ ۹۳ ایضاً ص۲ ۹۴ ایضاً ص۵ ۹۵ ایضاً ص۶ ۹۶ و ۹۷ ایضاً ص۸ ۹۸ ایضاً ص۹ ۹۹ و ۱۰۰ ایضاً ص۱۱ ۱۰۱ و ۱۰۲ ایضاً ص۱۳ ۱۰۳ عرفات العاشقین ص۱۰ ۱۰۴ تذکرۂ جہانگیر شاہی از ملا قاطعی ہروی ص۹۳ مطبوعہ ۱۰۵ تذکرۂ صبح گلشن از منشی عبدالعزیز ۱۲۹۵ھ بھوپال ص۲۷۵-۲۴۹ ۱۰۶ صبا، ۱۲۹۵ھ ص۷۱۵ ۱۰۷ بحوالہ میخانہ، مرتبہ گلچین معانی ص۴۹۲ ۱۰۸ منشی عبدالعزیز ص۳۹۰ ۱۰۹ تذکرۃ الشعرا ۱۱۰ مآثرالامرا، شاہنواز خاں ج۔۳ ص۲۴۷-۲۵۱ ۱۱۱ ریاض العارفین تاریخ وفات غلط درج ہے۔ "بخواہش جہانگیر از کشمیر بدہلی رفتہ در سنہ ۱۰۸۰ھ در سرہند وفات یافت ۱۱۲ تاریخ وفات ۱۰۳۰ھ درج ہے۔ بحوالہ مقالہ، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، جامعہ، نومبر ۱۹۶۳ء ۱۱۳ تاریخ وفات ۱۰۳۰ھ درج ہے۔ ص۲۷۳ ۱۱۴ و ۱۱۵ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۱۶ عبدالنبی ص۲۴۳ ۱۱۷ دیوان صوفی ۱۱۸ میخانہ ص۲۴۰ ۱۱۹ مآثر الامرا جلد/۳ ص۲۵۱ ۱۲۰ تذکرہ نویسی فارسی ہند و پاک از نقوی ص۱۳۵ ۱۲۱ تذکرۂ لطائف الخیال ۱۲۲ تذکرۂ ہفت اقلیم از امین احمد رازی ص۱۲۹/۱۳۲ ۱۲۳ دیوان صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۲۴ ایضاً امراء القیس جاہلی عرب کا نامور شاعر اور سحبان مشہور مقرر و خطیب تھا ۱۲۵ تذکرۂ ہفت اقلیم از رازی ص۱۲۵ مطبوعہ ۱۲۶ اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری، از ولیم بیل ص۲۷۳ ۱۲۷ تاریخ تذکرہ ہای فارسی، احمد گلچین معانی ص۵۹ ۱۲۸ ایضاً ۱۲۹ دیوان صوفی: مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۳۰ فہرست مخطوطات بانکی پور، پٹنہ، المقتدر ص۱۲ نمبر ۱۳۰۱ (خلاصۃ احوال الشعرا) ۱۳۱ ایتھے، ہرمن، اور تذکرہ نویسی ہند و پاک، ص۱۳۵/ تاریخ تذکرہ ہائے فارسی ص۵۹۱ ۱۳۲ بوڈلین لائبریری کیٹلاگ، لندن، از ایتھے، ص۳۶۹ ۱۳۳ از صوفی مازندرانی سنہ ۱۳۴ میخانہ: عبدالنبی، مرتبہ گلچین معانی/عرفات اوحدی ص۱۰ ۱۳۵ بحوالہ جامعہ، مقالہ از ڈاکٹر عابدی، نومبر ۱۹۶۳ ص۲۳۵ ۱۳۶ دیوانِ صوفی، مرتبہ طاہری شہاب، تہران ۱۳۷ عبدالنبی۔

علمائے خراسان کے سوالات اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے جوابات☆

از ڈاکٹر احمد طاہری عراقی

ترجمہ: ڈاکٹر سید حسن عباس

"تصوف و عرفان میں شیخ الاسلام شہاب الدین عمر بن محمد سہروردی (۵۳۹-۶۳۲) یقیناً بزرگ ترین عرفا میں سے ایک ہیں انھوں نے اپنے سلف امام ابوالقاسم قشیری (۳۷۶-۴۶۵) کی طرح سنت و شریعت کے حدود میں تصوف کے تحفظ اور بدعت "گذاروں" کی آراء سے اسے پاک کرنے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ ان کی معروف تصنیف عوارف المعارف وہ اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے اسلامی عرفان کے اصول و مبانی اور آداب و اخلاق کو منظم کیا ہے، اس کتاب نے ساتویں صدی ہجری سے آج تک سبھی سلسلہ ہائے طریقت اور حلقہ ہائے عرفان پر گہرا معنوی اثر مرتب کیا ہے۔ شیخ شہاب الدین اپنے عہد کے بڑے محترم شیخ طریقت تھے اگرچہ وہ ابن عربی، ابن فارض، نجم الدین کبریٰ، نجم رازی، بہاء ولد اور سعد الدین حموی وغیرہ جیسے

☆ یہ رسالہ "مقالات و بررسی ہا" نشریۂ گروہ تحقیقاتی دانشکدۂ الٰہیات و معارف اسلامی تہران کے شمارہ ۵۰-۴۹ (۱۴۱۱ھ) ۱۳۶۹ ش میں شایع ہوا تھا۔

بڑے عرفا کے ہم عصر تھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ خصوصی اہمیت کے حامل تھے، لیکن شہاب الدین کی علمی جامعیت اور شافعی فقہ وحدیث میں استادانہ مہارت، زہد وورع وتقویٰ، شریعت وسنت کی حدود کی حمایت اور مسائل طریقت میں ان کے اعتدال نے انہیں ان کے معاصر مشایخ میں ممتاز بنایا اور عوام کے مختلف طبقات میں مقبولیت بخشی۔ ابن فارض ان سے ملاقات کے لیے گئے اور ابن عربی نے انہیں "عبد صالح" کہا ہے۔ سعدی شیرازی ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے زمانے میں تصوف کے جو سلسلے منظم اور مکمل شکل میں سامنے آچکے تھے اور دور ونزدیک کے اکثر علاقوں میں ان کی جتنی خانقاہیں، تکیے اور سرائیں تھیں ان کا تعلق شیخ شہاب الدین سے تھا اور وہ ان کے ارشادات وتحریروں سے استفادہ کرتے تھے۔[1]

شیخ الاسلام سہروردی مرجع خواص تھے اور اہل سلوک، اصول وفروع یا اعمال وآداب کے سلسلے میں ان سے سوالات کرتے تھے، ان سوالات وجوابات میں سے بعض مدون ہوکر رسائل کی شکل میں موجود ہیں۔ دوسرے اسلامی علوم کی طرح عرفان میں بھی سوال وجواب پر مشتمل بہت سے رسائل ملتے ہیں، اس قسم کے اکثر رسائل نکات ودقائق پر مشتمل ہیں، اگرچہ یہ نکات ودقایق بعض کتب وآثار میں

---

[1] شیخ الاسلام شہاب الدین عمر سہروردی کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیں: وفیات الاعیان ۳/۱۱۹ - ۱۲۰؛ طبقات الشافعیہ سبکی ۸/۳۳۸ - ۳۴۱؛ شذرات الذہب ۵/۱۵۳ - ۱۵۵؛ مقدمۂ مرحوم استاد جلال الدین ہمائی بر مصباح الہدایۃ ۱۹ - ۳۱؛ ترجمۂ عوارف المعارف بکوشش قاسم انصاری تہران ۱۳۶۴؛ اور دائرۃ المعارف اسلام طبع اول میں فان ونسبرگ کا مقالہ۔

پائے جاتے ہیں پھر بھی سوال و جواب پر مشتمل رسالوں کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے
ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی خاص زمانے یا حلقے میں کیا مشکلات موجود تھیں اور کس قسم
کے سوالات درپیش تھے اور یہ بات مذہبی اور فکری تبدیلیوں کی تاریخ کی شناخت
میں بڑی معاون ہو سکتی ہے۔

شیخ الاسلام سہروردی کی تصانیف میں ایک رسالہ سوال و جواب پر مشتمل
ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے اور یہ اٹھارہ[۱] سوال وجواب
پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ کتب خانۂ مجلس شورائے اسلامی تہران میں ہے۔ لیکن
ہیلمٹ ریٹر نے جس نے استنبول کے مخطوطات کی بنیاد پر سہروردی کی تصانیف کی فہرست
تیار کی ہے۔ اس رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے[۲]۔ ابن خلکان کے بیان سے ایسا ظاہر ہوتا
ہے کہ اس رسالے سے (یا کم از کم اس کے بعض سوال و جواب سے) ساتویں صدی میں
بعض لوگ واقف تھے۔ (ابن خلکان ۶۰۸ - ۶۸۱) شہاب الدین سہروردی کے
ہم عصروں میں تھا اور اس نے شیخ کے مصاحبین اور مریدوں سے ان کے بارے
میں حکایتیں سنی تھیں۔ البتہ ان کے سفر اربیل کے وقت، کم سنی کی وجہ سے وہ ان سے
ملاقات نہیں کر سکا تھا[۳]۔ ابن خلکان نے مختلف شہروں کے مشایخ طریقت اور
شیخ شہاب الدین کے درمیان خط و کتابت اور ان سے استفتا کی طرف اشارہ کرنے
کے بعد "عمل" اور "عجب" کے بارے میں سوال وجواب کا ذکر کیا ہے اور یہ زیر بحث
"رسالۂ اسئلہ واجوبہ" کا دوسرا سوال ہے گو الفاظ میں فرق پایا جاتا ہے۔ ابن خلکان

---

[۲] H. Ritter — "Philologika IX" Der Islam, 25 (1938) 36 sepp.

[۳] وفیات الاعیان ۳/۱۲۰۔

نے اس سوال و جواب کا ذکر صرف استفتا اور فتوی کی صورت میں کیا ہے کسی مدون رسالے کے جزء کے طور پر نہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ رسالہ واقعی خراسان کے بعض مشائخ کے سوالات کا کوئی مدون مجموعہ ہے جو مختلف وقت میں شہاب الدین سے کیے گئے اور انھوں نے جواب دیا ہے یا یہ کہ تمام کے تمام اٹھارہ سوالات کسی ایک وقت میں خراسان کے کسی صوفی نے شیخ کی خدمت میں بھیجے ہیں۔

کتابخانہ ظاہریہ کے نسخے میں رسالے کا نام درج نہیں ہے۔ فہرست میں اس کا نام "اجوبة عن اسئلة علمائے خراسان" دیا گیا ہے[1]۔ رسالے کی پہلی سطر یوں شروع ہوتی ہے "هذه اسئلة كتبها بعض ائمة خراسان واجاب عنها شيخ الاسلام السهروردی"۔ مجلس شورائے اسلامی کے نسخے میں رسالے کا نام یوں آیا ہے: "وهذه مسائل كتب بها [كذا] اليه بعض ائمة خراسان فاجاب عنها"۔

رسالے میں اٹھارہ[18] سوال و جواب بغیر کسی ترتیب کے ایسے مختلف مسائل کے بارے میں ہیں جو اس زمانے میں صوفیوں کے درمیان پائے جاتے تھے یعنی اعمال و سلوک میں مریدوں کو پیش آنے والے سوالات و مشکلات اور صوفیہ پر دوسروں کی طرف سے کیے جانے والے شبہات و اعتراضات۔ ان سوالات و جوابات کو موضوع کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

الف: صوفیہ کے اعمال و آداب کی شرعی توجیہہ | پانچواں اور چھٹا سوال بظاہر اہل ظاہر کے

---

[1] محمد ریاض المالح: فہرس مخطوطات دار الکتب الظاہریۃ "التصوف" ج ۱ ص ۲۱-۲۲۔ نسخہ میں چھ ورق ہیں؛ تقطیع ۲۳/۵ × ۱۶ سم؛ بخط نسخ خوب و بغیر تاریخ۔

اقوال اور صوفیوں پر ان کے اعتراض میں ہے۔ وہ خلوت اور خرقہ وغیرہ جیسے اعمال و آداب کو "بدعت" سمجھتے تھے اس لیے کہ نہ تو کتاب و سنت میں اور نہ زمانۂ صحابہ ہی میں اس کا کوئی وجود ہے۔ سہروردی کہتے ہیں کہ جن صحابۂ کرام کو آنحضرت (صلعم) کے دیدار کا شرف حاصل تھا اور وہ رسول اللہ (صلعم) کی خدمت میں رہا کرتے تھے، انہیں "خلوت" کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خلوت، آفات نفس کو دور کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور اگر یہ کام کسی اور طریقے سے ہو جائے تو خلوت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کبھی مرید کو خلوت اختیار کیے بغیر یا تنگ و تاریک حجرے میں بیٹھے بغیر ہی صحبت شیخ کی برکت سے وہ مقام مل جاتا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔ پس خلوت صرف بعض مریدوں کے لیے ضروری ہے نہ کہ سب کے لیے، یہ سلوک کا لازمہ بھی نہیں ہے۔

"خرقہ" بھی سلوک کے لوازم میں سے نہیں ہے بلکہ ان "مستحسنات" میں سے ہے جو مشایخ نے وضع کیے ہیں[۵]۔ اسکے باوجود بقول سہروردی، سنت نبوی میں بھی خرقہ پہننے کے لیے روایت مل سکتی ہے، روایت کی گئی ہے کہ رسول کریم (صلعم) نے ام خالد[۶] کو

---

[۵] استحسان سے مراد، استحباب امر اور اس رسم کا اختیار کرنا ہے جسے طالب کی صلاح کے لیے صوفیوں نے اپنے اجتہاد سے وضع کیا ہے بغیر اسکے کہ سنت سے اس کی واضح اور آشکار دلیل ہو، (مصباح الہدایۃ و مفتاح الکفایۃ، ۱۴۷) [۶] ام خالد، امۃ بنت خالد بن سعید بن العاص کی کنیت ہے وہ اپنے والد کی حبشہ ہجرت کے دوران پیدا ہوئیں اور برسوں کے بعد حجاز واپس آئیں اور حضرت زبیر بن العوام سے شادی کی اور عمر بن زبیر و خالد بن زبیر انہیں کے بیٹے ہیں (طبقات ابن سعد ۸/۱۲۹-۱۳۰؛ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۴/۱۷۹۱؛ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۴/۲۳۸؛ اسد الغابۃ ۵/۳۴ و ۳۲۵)

سیاہ لباس پہنایا تھا[۱] بطور تبرک اولیاو مشایخ سے خرقہ (یا کسی اور لباس) کی طلب بھی جائز ہے اور یہ بدعت نہیں ہے اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے پیغمبر کے جسم پر ایک چادر دیکھی جسے ایک عورت نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس صحابی نے رسول (صلعم) سے وہ چادر مانگی اور حضرت نے اسے دیدیا[۲] خرقہ پوشی میں پیر سے مرید کی صحبت اور اس سے علوم واحوال کسب کرنے کا اعتبار ہوتا ہے۔ شیخ سے خرقہ حاصل کرنا اپنی خواہشات سے دستبردار ہونے اور شیخ کے حکم پر عمل کرنے کا "رمز" ہے اس لیے کہ راہ سلوک میں تربیت کرنے والا شیخ جو کچھ کہتا ہے اور سالک کی تربیت میں جو کچھ مناسب سمجھتا ہے سالک کو اسی پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی خواہش کو ختم کر دینا چاہیے' خرقہ اسی غرض وغایت کا "رمز" ہے، جو ان شرائط پر خرقہ حاصل کرے وہ حقیقی ہے' ورنہ ظاہری اور صوری اعتبار سے وہ ایک مرید ہے جو صرف ہیئت وصورت کے لحاظ سے اس گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔

ب: مسائل مشیخت | شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے میں اکثر اسلامی علاقوں میں خانقاہیں' تکیے اور خلوتکدے تعمیر ہو چکے تھے اور ان کے لیے اوقاف کا انتظام تھا اور وہاں بہت سے مشایخ ہدایت وتربیت میں مصروف تھے۔ دوسری جماعتوں کی

---

[۱] اس حدیث کا ذکر شیخ الاسلام سہروردی نے عوارف المعارف میں سند کے طور پر کیا ہے اور اسے خرقہ پوشی کے لیے بنیاد بتایا ہے [عوارف المعارف/۹۶-۹۷؛ ترجمہ فارسی/۴۱-۴۲؛ مصباح الہدایۃ/۱۴۷-۱۴۸] بخاری نے اپنی صحیح میں [کتاب اللباس: ۲۲-۳۲] اس کا ذکر کیا ہے

[۲] دیکھیں: متن رسالہ کا حاشیہ ۱۵۔

طرح ان مشایخ میں بھی کبھی کبھی ایسے افراد نظر آجاتے تھے جو عوام فریب جاہ طلب اور مال و دولت سمیٹنے والے بھی تھے۔ ایسی صورت میں سالک راہ کے لیے دشواری ہوتی تھی کہ کھرے کھوٹے میں کس طرح تمیز کرے اور سچے تربیت کرنے والے عارفوں اور جھوٹے دعویداروں کی شناخت کیونکر ہو، سولھواں اور سترہواں سوال اس مشکل سے متعلق ہے۔

شیخ شہاب الدین کہتے ہیں، حرص، مال اندوزی اور جاہ طلبی غفلت اور خواہشات بڑھانے کا نتیجہ ہوتی ہے اور جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ وہ شیخ نہیں، مشیخت تو اس کے شایان شان ہے جس نے ہوی و ہوس کے دیو کو مار ڈالا ہو اور حرص و آز کا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔

مرید کو بھی صرف ظن و گمان پر عمل نہیں کرنا چاہیے اگر شیخ سے کسی ناروا کام کے سرزد ہونے کا مشاہدہ کرے تو خدا سے دعا کرے کہ اس شیخ کی حقیقت حال اس پر کھول دے۔ سچے شیخ کو عوام کو اپنی طرف بلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اہل حق خود ہی اسے پالیں گے، حق تعالیٰ اس کی محبت دلوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ علم اور مریدوں کے الہام کا امین قرار پاتا ہے۔

سولھویں سوال میں لوگوں نے دریافت کیا ہے کہ مرید، ذکر کی تلقین شیخ سے حاصل کرے یا خود ہی کوئی ذکر و ورد اختیار کرلے؟ سہروردی کہتے ہیں: ذکر تو شیخ سے ہی حاصل کرنا چاہیے، لیکن شیخ کو کامل و عارف اور روشن دل ہونا چاہیے کیونکہ ذکر کی تلقین مرید کے باطن میں شیخ کے دم پھونکنے اور حرف کی روشنی کے دل کی روشنی کے ساتھ ملنے کا نام ہے اور جس قدر ہوائے نفس زائل ہوگی قوت نیت قلب اتنا ہی بڑھتی

جائے گی اور جب خواہشات پوری طرح ختم ہو جائیں گی تو دل نور ہو جائے گا اور جو کلمہ بھی اس دل سے نکلے گا اور مرید تک پہنچے گا، نور کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ج: مسائل مریداں | تیسری قسم کے سوالات ان مشکلات کے بارے میں ہیں جن سے مرید کو سلوک و طریقت کے اعمال اور معاشرتی امور مثلاً خلوت و خدمت، طلب علم، ازدواج، آفات عمل، مالداروں سے سلوک، سلاطین کی خانقاہوں اور تکیوں کے استعمال اور فتوح قبول کرنے کے سلسلے میں سامنا ہوتا ہے۔

۱۔ خلوت یا خدمت :۔ خلوت یا خدمت سالکوں کی استعداد کے مطابق تجویز کی جاتی ہے، جو چاق و چوبند ہو اور اپنا سارا وقت عمل و مراقبہ میں گزار سکتا ہو اسے خلوت اختیار کرنا چاہیے لیکن جو ایسا نہ ہو، اس کے لیے خدمت کرنا ہی بہتر ہے۔ اسے اپنے وقت کا کچھ حصہ اعمال و اوراد و اذکار و مراقبہ اور غور و فکر میں گزارنا چاہیے اور جن اوقات میں اس پر بطالت طاری ہو اس کو چاہیے کہ وہ فقیروں کی خدمت اور مسکینوں کی مدد میں صرف کرے (تیسرا جواب) اور اس مرید کو جو روشن دل شیخ کی نگرانی میں سلوک میں مشغول ہے شیخ کے حکم سے خلوت اور خدمت اختیار کرنا چاہیے۔ شیخ عارف سالک کی توانائی اور استعداد سے آگاہ ہو کر ہی اس کے لیے خلوت یا خدمت تجویز کرتا ہے (چوتھا جواب) لیکن سالک کو خلوت نشین راہبوں کی طرح ہمیشہ خلوت میں نہیں رہنا چاہیے، جماعت کے ساتھ فرائض ادا کرنا چاہیے اور پریشانی خاطر کی وجہ سے جمعہ و جماعت ترک نہیں کرنا چاہیے (پانچواں جواب)

۲۔ عمل :۔ جن اوقات میں سالک عوام کے ساتھ ہوتا ہے اعمال عبادت کی لذت اس کے لیے زیادہ ہو جاتی ہے اور تنہائی میں اس کے عمل میں فتور پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن اسے ریا کے خوف اور خلق پر توجہ سے یہ عمل ترک نہیں کرنا چاہیے۔ سالک کو جاننا چاہیے کہ خلق سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔ وہ خدا کی پناہ حاصل کرے اور اس سے مدد کا طالب ہو اور استغفار کرے، عمل سے اس وقت تک ہاتھ نہ کھینچے جب تک اسکی برکت سے ریا ختم ہو جائے (دسواں جواب)

اسی طرح عُجب ہے جو کبھی عمل اور عبادت کے ساتھ سالک کے نفس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عُجب کا علاج ترک عمل نہیں بلکہ اعمال کے ساتھ ہے۔ اسے جاننا چاہیے کہ یہ عُجب نفس سے' ہے اور اسے اپنے سے دور کرنے کی کوشش کرے (دوسرا جواب)

۳۔ تعلّم و تزہد :۔ اس سوال کے جواب میں کہ آیا سالک کے لیے بہتر ہے کہ سب سے رشتہ توڑ لے اور صرف خدا کی عبادت میں مشغول رہے یا یہ کہ علم حاصل کرے اور احکام و واجبات کی تعلیم حاصل کرے۔ شہاب الدین کہتے ہیں: سالک اگر ضرورت کی حد تک احکام کا علم رکھتا ہو تو اس کے لیے عبادت اور خدا کی پناہ حاصل کرنا اولیٰ تر ہے، لیکن اگر اس کا نفس عمل پر آمادہ نہ ہوا ہو اور فتور و بطالت کی طرف مائل ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ان علوم میں گذارے جو فرض کفایہ ہیں اور اس طرح کی عبادت اور تبتّل عزیمت حال ہے اور علم سے یہ وابستگی رخصت۔ (ساتواں جواب)

۴۔ ازدواج :۔ دریافت کیا گیا ہے کہ سالک مجرد جسے شادی کا خیال آتا ہے، کیا کرے؟ شادی کرے؟ یا عبادت اور مجاہدۂ نفس سے شادی کا خیال ذہن میں نہ آنے دے؟ شیخ شہاب الدین کہتے ہیں: اس زمانے میں بہتر

یہ ہے کہ سالک، خدا کی عبادت، دعا، توفیق الٰہی نیز صالحین کی توجہ اور ارواح اولیا، سے توسل کے ذریعہ ازدواج سے دوری اختیار کرے اور دل سے بیوی، ازدواجی زندگی اور شادی بیاہ کا خیال نکال دے۔[۹] کچھ عرصہ اسی روش پر عمل کرے جب تک کہ خداوند قدوس ایک پارسا بیوی اسے نصیب نہ کر دے (آٹھواں جواب) اور سالک جب شادی کر لے تو اسے اپنے افراد خاندان کے لیے کسب معاش کرنا چاہیے (نواں جواب)

۵۔ ثروت مندوں سے معاشرت :۔ سالک کو اغنیا کی دولت کی وجہ سے نہ انکے سامنے عجز و فروتنی ظاہر کرنا چاہیئے اور نہ ہی اپنی کوئی حاجت ان کے سامنے پیش کرنا چاہیے البتہ شدید ضرورت کے وقت اس کی اجازت تو ہے مگر اس وقت کلیۃً ان پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ان کا مال حرام ہے تو اسکا لینا جائز نہیں۔ حال و مقام کی بلندی سے سالک میں غرور پیدا نہیں ہونا چاہیے جو حرام و حلال کی تفریق میں بے پروا بنا دے۔ سچے سالک، مباح سے بھی پرہیز کرتے ہیں تو مشکوک حال کی بات ہی کیا ہے۔ البتہ شدید ضرورت پر یا ہلاک ہونے کا خوف کے موقع پر [اجازت ہے] لیکن حرام چیز کھانا مطلقاً جائز نہیں ہے (گیارہواں جواب)

---

[۹] صوفی کا مجرد رہنا یا شادی کرنا دونوں ہی خدا کے لیے ہے اور ان میں کوئی ایک عمل بھی نہ طریقت کے لیے مانع ہو اور نہ سلوک میں سستی کا باعث ہو۔ (عوارف ۱۶۳) اور شیخ کی یہ بات مبتدی مریدوں کی تربیت کے پیش نظر تجرد کی فضیلت میں ہے اور اس مفہوم کو جو عوارف (ص ۱۶۳ - ۱۶۷) میں بھی آیا ہے شیخ عزالدین کاشانی نے بھی مصباح الہدایۃ ص ۱۵۵ - ۲۵۶ میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح فتوح کے باب میں، ہر چیز قبول نہیں کرنی چاہیے مگر بوقت ضرورت اور دو مشکوک مال میں سے جو کم مشکوک ہو اسے قبول کرے (تیرہواں جواب) کہتے ہیں ایسے درویش بھی ہیں جو کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہیں کرتے۔ ضرورت کے بغیر جو کچھ انہیں دیا جاتا ہے وہ واپس نہیں کرتے۔ شہاب الدین کہتے ہیں: مجبوری کے علاوہ وہ جائز نہیں ہے اور جو سچا درویش ہے اس کو اس سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ کھانے میں احتیاط نہ کرنا اور لاابالی رہنا ہلاکت کا باعث ہے۔

۶. خانقاہیں اور اوقاف :۔ امرا و سلاطین کی تعمیر کردہ خانقاہوں اور حجروں میں سکونت جائز ہے بشرطیکہ [وہاں قیام کے دوران] اوقاف سے کھانا نہ کھائیں[1] مگر وہ جو تکمیل سلوک کر چکے ہیں ان کے لیے اوقاف کا استعمال، بیمار کے علاج اور سخت ضرورت کے وقت زندگی کی بقا کے مترادف ہے۔ (بارہواں جواب)

جیسا کہ اشارہ کیا گیا شیخ شہاب الدین کے رسالۂ اجوبہ کے دو نسخوں کا ہمیں علم ہے۔ ایک کتابخانۂ ظاہریۂ دمشق (مکتبہ الاسد بشمارۂ: ۴۶۵۳) اور دوسرا کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی شمارہ ۲ تہران (بشمارۂ: ۹۵۴) مجلس کا نسخہ متفرق رسالوں کے اس مجموعے میں شامل ہے جن میں سے بعض کی تاریخ

---

[1] شیخ نے عوارف (ص ۱۱۵) میں بھی مسافر صوفیوں کو اوقاف اور کاروانسرائے وغیرہ کے استعمال سے منع کیا ہے مگر یہ کہ خانقاہ کا شیخ اجازت دے دے" فلا ینبغی ان یاکل من مال السرباط بل یکتسب و یاکل من کسبه ... الا ان یکون تحت سیاسة شیخ عالم بالطریق ینتفع بصحبته و یهتدی بهدیه فیری الشیخ ان یطعمه من مال السرباط..."

کتابت ۶۵۲ھ ہجری ہے یعنی سہروردی کی وفات کے بیس سال بعد۔ نسخۂ ظاہریہ میں تاریخ کتابت نہیں ہے وہ مجلس کے نسخے سے متاخر ہے۔ نسخۂ مجلس نسخۂ ظاہریہ سے قدرے مختصر ہے اس میں اٹھارہ سوالات (علاوہ سوال اول و دوم) کا متن نہیں ہے جوابات کے متن سے بھی بعض جملے حذف ہوئے ہیں یا ان کی تلخیص کی گئی ہے۔ علاوہ بریں اس میں سولہویں اور سترہویں جواب باہم خلط ملط ہو گئے ہیں اور پندرہویں سوال کے جواب کے بعد سولہویں نمبر کے ساتھ مختصر سا جواب یوں آیا ہے "یحتسب و یستغفر من رؤیۃ نفسہ" اس طرح جوابات کی تعداد انیس ۱۹ ہو گئی ہے۔

نسخۂ مجلس میں نقائص کے پیش نظر تصحیح کے وقت نسخۂ ظاہریہ کو مکمل، صحیح اور دقیق ہونے کی بنا پر اصل نسخہ قرار دیا ہے اور اس کا نسخۂ مجلس سے مقابلہ کیا ہے البتہ بعض مواقع پر نسخۂ مجلس کی روایت کو متن قرار دیا گیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر نسخۂ مجلس کے نقائص کا ذکر حواشی میں نہیں کیا ہے۔ حواشی میں "ظا" کی علامت نسخۂ ظاہریہ اور "مج" کی علامت نسخۂ مجلس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

بزم صوفیہ

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

اس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیائے کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات کا مفصل تذکرہ ہے۔ جدید اڈیشن میں دو ضمیموں کا اضافہ ہے۔

قیمت :۔

"منیجر"

ایک گمنام اردو مثنوی پیکرِ حسن

از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

اردو مثنوی نگاری میں نئے رجحانات انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے جس کا سبب تحریکِ تعلیم۔ اخبارات و رسائل کی اشاعت اور تعلیمی و فلاحی انجمنوں کا قیام ہو سکتا ہے۔ قدیم علوم کے ساتھ مغربی ادب اور مغربی سائنسی ترقی اور نظریات سے واقفیت پیدا ہوئی۔ اخبارات اور انجمنوں کے ذریعہ نئے خیالات کی اشاعت ہوئی اور ایسی تحریکات نے بھی جنم لیا جن کے ذریعہ بیداری اور ترقی کا شعور پیدا ہوا۔ خود شعرائے اردو نے قدیم رنگ اور جدید رنگ کی امتیازی حدیں مقرر کیں۔ اردو مثنوی کے نئے رجحانات کے سلسلے میں مذہبی رجحان کا سراغ محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) کی نعتیہ مثنویات "چراغ کعبہ" اور "صبح تجلی" اور بنواری لال شعلہ (م ۱۹۰۳ء) کی کرشن بھگتی پر منحصر مثنوی "بزم بندرابن" سے ملتا ہے۔ اخلاقی اور اصلاحی رجحان کا اظہار الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) کی مثنوی "رحم و انصاف" اور محمد حسین آزاد (م ۱۹۱۰ء) کی مثنویات "شب قدر"، "حب وطن"، "صبح امید" اور "خواب امن" سے ہوا۔ مغربی فلسفے اور طبیعیات کے اثرات بھی مرتسم ہوئے۔ احمد علی شوق (م ۱۹۲۵ء) نے مثنوی عالم خیال تحریر کی اور اسی انداز کی دیگر مثنویات بھی تالیف کیں جو اس کے مجموعۂ مثنویات "گنجینہ" میں شامل ہیں۔ مثنوی نگاروں نے ہندوستان کے موسموں پر

مثنویات تحریر کیں۔ حالی کی مثنوی " برکھارت "۔ آزاد کی " ابر کرم " اور احمد علی شوق " کی " بہار برسات " کا موضوع ہندوستان کے موسم اور ان کی دلفریبی ہے۔ عشقیہ مثنویات اس عہد کی سماجی فضا میں تحریر ہوئیں جس کی وجہ سے لذت پرستی کا میلان زیادہ ہوا اور جمالیات عشق کی جگہ ابتذال نے لے لی۔ ارشد علی خاں قلق (م ۱۸۷۹ء) کی مثنوی " طلسم الفت " اور نواب مرزا شوق (م ۱۸۷۱ء) کی مثنوی " زہر عشق " لذت پرستی کے رجحان کا نمونہ ہیں۔

بریلی کی تاریخ شاعری میں اندازاً دو درجن مثنوی نگار ملتے ہیں اور یہ سلسلہ نواب محمد یار خاں امیر (م ۱۷۷۵ء) کی مثنویات " در شدت برسات " اور " در کثرت مگس " سے شروع ہو کر شیام موہن لال جگر بریلوی (م ۱۹۷۶ء) کی مثنویات پر ختم ہوتا ہے جن میں مثنوی " پیام ساوتری " گراں قدر ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں امیر الدین آزاد (م ۱۸۶۷-۶۸ء) احمد حسن خاں جوش (م [illegible]ء) نیاز احمد خاں ہوش (م ۱۸۹۲ء) جوالا شنکر امیر۔ حسن رضا خاں حسن (م ۱۹۰۸ء) ناصر الدین احمد ناصر (م ۱۹۰۸ء) سید مہربان علی فرحاں (م ۱۸۹۴ء) اور حضور احمد خاں آثم (م ۱۹۴۴ء) بڑے مثنوی نگار تھے۔ حسن کی مثنوی " وسائل بخشش " اور ناصر کی مثنوی " پیکر حشر و نشر " نے مذہبی رجحان کی نشاندہی کی۔ اسی طرح جوالا شنکر امیر نے کتھا ست نرائن کو اپنی مثنوی " دافع العذاب " میں نظم کیا۔ فرحاں نے بچوں کی دلبستگی کے لیے تین مزاحیہ مثنویات مسمی " قصہ قاضی جونپور "۔ " احمق نامہ " اور " آئینہ رونما " (حجام نامہ) تالیف کیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ عشقیہ مثنویات کے سلسلے میں جوش کی مثنوی " فسانۂ جوش "۔ آزاد کی مثنوی " عشق صادق " ہوش کی مثنوی " ترانۂ ہوش "

اور حضور احمد خاں آثم کی مثنوی "ذائقہ عشق" نے شہرت پائی۔ اس طرح مثنوی پیکر حسن کے مولف کے سامنے مقامی ہمعصر شعرا کی مثنویات بھی تھیں اور انکے ساتھ ہی مذہبی مزاحیہ اور عشقیہ میلانات کے نمونے بھی۔

جہانتک اردو مثنوی کے اسلوب بیان کا تعلق ہے اس کی سمت کا تعین چار برس کے اندر لکھی ہوئی تین مثنویات کے ذریعہ ہو گیا تھا۔ نواب محبت خاں محبتؔ (م ۱۸۰۹ء) کی مثنوی مسمی پُنّوں (۱۷۸۲ء) کا تحلیل جذبات عشق پر مبنی نہایت موثر اسلوب میر حسن (م ۱۷۸۶ء) کی مثنوی سحر البیان (۱۷۸۴ء) کا سلیس اور بامحاورہ اسلوب اور میر ضیاء الدین عبرتؔ (م قیاساً ۱۷۸۸ء) کی ناتمام مثنوی "پدماوت" (جس کو میر غلام علی عشرتؔ بریلوی متوفی ۱۸۲۱ء نے ۱۷۹۶ء میں مکمل کیا) کا اسلوب، مثنوی کے ایسے اسالیب تھے جو عہد فردا میں خضر راہ بنے۔ واقعات عشق کی تحلیلِ جذبات اور ثر رفتنی، معاشرتی رسوم وغیرہ کی بامحاورہ پیش کش مثنوی کے پائیدار اسلوب کا ذریعہ بنے۔ میر ضیاء الدین عبرتؔ کے طرز نگارش کو دیا شنکر نسیمؔ (م ۱۸۴۳ء) نے مزید فنی بلاغت اور وسعت کے ساتھ اختیار کیا لیکن اس کو پائیداری نہیں ملی۔ دیگر مثنویات میں اس کے اثرات کو جگہ بہ جگہ زیادہ تر محسوس کیا جا سکتا ہے، ایک چلن اور ایک روش کی کیفیت نہیں ملتی۔

مثنوی پیکر حسن ۱۸۹۹ء میں تالیف ہوئی تھی۔ اس وقت مثنوی زہر عشق عام لوگوں کے اعصاب پر سوار تھی لہٰذا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مثنوی پیکر حسن کے مولف نے ایک عشقیہ قصہ نظم کیا اور نئے رجحانات کو منہ نہیں لگایا۔ اس نے اپنی مثنوی کے طرز نگارش پر نظر رکھی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس کی مثنوی واقعاتی جذبات نگاری

بامحاورہ موثر زبان اور تمثیلی واستعاراتی پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ مثنوی پیکر حسن کے متعلق ضروری معلومات یہ ہیں:

نام مولف کلب حسین مائل۔ تعداد صفحات ایک سو چھپن (۱۵۶)۔ سائز ۲۲ × ۱۸"۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ کتابت اور طباعت اعلیٰ۔ مسطر سترہ (۱۷) سطری۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔ سال طباعت ۱۸۹۹ء۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد دو ہزار (۲۰۵۲) پانچ سو اتنالیس

مثنوی گمنام اور کمیاب۔

مثنوی پیکر حسن کے مولف کے حالات اس طور پر ہیں:

نام کلب حسین۔ تخلص مائل۔ ابن شیخ بسیر محمد۔ متولد موضع شیش گڈھ ضلع بریلی۔ تعلیم واجبی۔ موضع شیش گڈھ سے بریلی آیا جہاں اس کی پھوپی زاد بہن نجبن نے اسکو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اس کو نجبن نے اپنی جائداد کا مختار عام بنایا۔ نجبن روسائے شہر میں بارسوخ تھی جس کی وجہ سے اس کو بھی شناخت کیا گیا اور اس کا شمار بھی بریلی کے امراء میں ہونے لگا۔ اس نے مثنوی پیکر حسن میں نجبن سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ؎

التجا ہے مری تہ دل سے ۔۔۔ دے نجات ان کو فکر باطل سے
پرورش جس نے ہے کیا مجکو ۔۔۔ مال وزر اپنا دے دیا مجکو
ناز سے پا ماسے نیاز کیا ۔۔۔ مجکو مختار ذی مجاز کیا
عمر اور عیش کر عطا ان کو ۔۔۔ شاد و آباد رکھ خدا ان کو (ص ۱۶)

کلب حسین مائل نے روسائے شہر کی وضع کے مطابق شعراء کی سرپرستی کی اور خود بھی شعر کہنا شروع کیا۔ اس نے امیر مینائی (م۔ ۱۹۰۰ء) کے ایک شاگرد احمد علی

خاں عاصی نارنولوی ثم بریلی (م ۱۹۰۱ء) کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ عاقمی قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی (م ۱۹۰۰ء) تلمیذ غالب کے خوان کرم کا زلہ ربا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی پیکر حسن اس کی اصلاح سے بے نیاز رہی۔ کلب حسین مائل نے تحریر کیا ہے ؎

تھا نہ مجکو کبھی یہ سان گمان	مثنوی نظم ہو خدا کی شان
کہا دل نے کہ دوسرے کا بار	کون لیتا ہے اپنے سر بیکار
کیوں کہیں جاکے التجا کیجے	کس سے فریاد نارسا کیجے
رہا اصلاح سے کلام مرا	سب کی خدمت میں ہے سلام مرا
مجکو شکوہ نہ کچھ شکایت ہے	ختم القصہ یہ حکایت ہے (ص ۱۵۶)

اس مثنوی کے علاوہ کلب حسین مائل کا دیگر کلام نہیں ملتا۔ ادبی اور غیر ادبی ماخذ اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ گلدستوں میں اس کی غزلیات شایع نہیں ہوئیں۔ اکثر ہمعصر شعرا اس سے ناواقف تھے۔ خود مجھے اس کو تلاش کرنے میں بہت وقت لگا۔ اس کی ادبی گمنامی کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ خود اس نے بریلی کے شعرا اور مشاعروں سے اجتناب کیا یا پھر اساتذۂ بریلی نے اس کو منہ نہیں لگایا۔ لہذا یہ بات بھی قیاس میں آتی ہے کہ اس نے مثنوی پیکر حسن اساتذۂ بریلی کو نیچا دکھانے کے لیے تالیف کی کہ خود اس کے استاذ سخن ہونے میں شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے مندرجۂ ذیل اشعار میں رجز کا طور ہے ؎

ہوں میں سلطان خسروان سخن	میرے قبضے میں ہے جہان سخن
وہ سخنور ہوں وہ زباندان ہوں	وقت کا اپنے آج سحباں ہوں (ص ۱۴)

پھر بھی اس کو اپنی حیات میں شہرت نہیں ملی۔ اس کی وفات کے بعد بھی اس کی گمنامی

قائم رہی۔ اگر اتفاقیہ طور پر اس کی مثنوی میرے ہاتھ نہیں لگتی تو معلوم نہیں کب تک اس کو گمنام رہنا پڑتا۔

کلب حسین نائلؔ کی شادی حکیم جشید علی خاں اخترؔ دہلوی ثم بریلی (م ۱۹۵۱ء) کی بھانجی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی جشید علی خاں اخترؔ ہیں جن کو سہواً غالبؔ کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اس کا صرف ایک لڑکا مسمّیٰ مقبول حسین تھا جو مالا ریلوے اسٹیشن (ضلع پیلی بھیت) کے ریل حادثے میں ۲۵ نومبر ۱۹۳۵ء کو فوت ہوا۔ خود کلب حسین نائلؔ کی وفات ۱۸ اپریل ۱۹۱۱ء کو ہوئی تھی۔

کلب حسین نائلؔ نے اپنی زندگی میں ایک شاندار مکان متصل کتب خانہ گلی آریہ سماج بریلی میں تعمیر کرایا تھا جس کا تاریخی نام "منظرِ حسین" (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) ہے یہ خاندان عقیدۃً اہلِ سنت والجماعت ہے لیکن محرم الحرام میں عزاداری کے لیے معروف ہوا۔ مذکورہ مکان کے مغربی گوشے میں امام باڑہ ہے جو "نجیبن کا امام باڑہ" کہلاتا ہے اور جو عزاداری کے لیے مشہور رہا۔ لوگ کلب حسین نائلؔ اور مثنوی پیکرِ حسن سے ناواقف ہیں لیکن نجیبن اور نجیبن کے امام باڑے کو جانتے ہیں!

کلب حسین نائلؔ کے سامنے کوئی اپنا یا پرایا قصۂ عشق نہیں تھا اور نہ اس نے خود بھی کوئی فطری قصۂ عشق نظم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جدید میلانات سے گریز کرکے قدیم مثنویات کے قصوں کے طرز پر ایک فوق فطرت کہانی نظم کی جس میں انسانوں کے بجائے جن اور تدابیرِ بشر کے بجائے طلسمات کا دخل تھا۔ سچ پوچھیے تو فوق فطرت امور کتنے ہی خلافِ عقل معلوم ہوں بشر کی ابتدائی جبلت ان سے کلیتہً انکار نہیں کر پاتی اور یہی وجہ ہے کہ رومانٹک شاعری میں نیم تاریخی اور دیومالائی عناصر کا

دخل جاری ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن کا قصہ اس طور پر ہے :

مورخان کہن کہتے ہیں کہ ایک شہر جزیرۂ سوسن میں آباد تھا جہاں خواجہ قاسم نام کا ایک جوان اور دولت مند سوداگر رہتا تھا۔ ایک دن خواجہ قاسم جب تفریح کے لیے نکلا تو اس نے ایک آتش فشاں پھٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک دن اس کے ملازم نے ایک پریشاں حال اجنبی کے متعلق اطلاع دی جس کو اس نے طلب کیا۔ اجنبی کا نام قمر پیکر تھا۔ قمر پیکر نے اپنی کہانی سنائی کہ اس کے مکان کے قریب ایک باغ تھا۔ جہاں وہ سیر کرنے کے لیے ایک دن تنہا گیا۔ اس نے کنج باغ میں ایک پری کی آواز سنی جو اپنا بچہ آہو تلاش کر رہی تھی۔ قمر پیکر پری کو تلاش کرتا ہوا بچۂ آہو کے تعاقب میں گیا اور بالآخر ایک طلسمی شہر میں پہنچ گیا جس کی حاکم وہی پری تھی۔ پری کا نام روشن گہر تھا۔ ایک خواص کے ذریعہ قمر پیکر کی رسائی روشن گہر تک ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے پر مائل ہو کر وصل سے ہمکنار ہوئے۔ کچھ دن عیش و عشرت میں گزارنے کے بعد قمر پیکر کو اپنا وطن یاد آیا۔ اس سے روشن گہر نے واپسی کا وعدہ لے کر اسکو وطن جانے کی اجازت دے دی۔ قمر پیکر نے اپنے وطن واپس ہونے کے بعد حاکم شہر کی لڑکی سے شادی کر لی اور اس کے بہکانے پر ایک عامل کے ذریعہ روشن گہر کے طلسمی محل کو جلا دیا۔ جس وقت روشن گہر اپنے محل میں جل رہی تھی ایک مرد ضعیف محل کی دیوار سے برآمد ہوا اور اس نے عامل کے عمل کو ضائع کر دیا اس کے بعد قمر پیکر اس جگہ بے ہوش ملا جہاں خواجہ قاسم نے آتش فشاں پھٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ قمر پیکر اپنی کہانی سنا کر فوت ہو گیا۔

یہ کہانی قدیم مثنویات کے قصوں کے مطابق ہے۔ فوق فطرت عنصر کے ساتھ

بُعد زمان و مکاں کا تخیل بھی نمایاں ہے۔ مثنوی نگار نے اس کہانی کے ذریعہ بشر کی عہد شکنی، عیش کوشی اور بے وفائی کو واضح کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں اس نے ایک پری کی وفاداری کو پیش کر کے عورت کے کردار کو بھی عظمت بخشی ہے۔ اس نے یہ تاثر دیا ہے کہ عورت کی حالت زار کا سبب مرد کا ظالمانہ رویہ ہے۔

مثنوی پیکر حسن میں چند کردار ہیں۔ خواجہ قاسم ایک مالدار تاجر ہے اور کہانی میں اس کی حیثیت ایک سامع کی ہے۔ قمر پیکر مثنویات کے ہیرو کی طرح جوان اکلوتا مہم جو عاشق مزاج شاہزادہ ہے جس کی بے وفائی اور سخت دلی کی وجہ سے اسکے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ روشن گہر مثنوی کی ہیروئن ہے جس کو اس کی وفا راس نہیں آئی۔ اس کی معصومیت عشق صادق ایثار اور لرزہ خیز انجام اس سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ بزم آرا ایک جوان شوخ وطرار خواص ہے جس کا عضو عضو پھڑکتا ہے اور جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ اردو مثنویات کی تاریخ میں بزم آرا کا کردار امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان کرداروں کے علاوہ دیگر کردار برائے نام ہیں اور وہ کہانی کو پیوستہ رکھنے کے لیے ہیں۔

مثنوی پیکر حسن کے جملہ کردار، خاص طور پر مرکزی کردار، ایک فوق فطرت کہانی میں بشری احساس و جذبے کے حامل ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مثنوی کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ چونکہ مثنوی میں ایک قصہ نظم کیا جاتا ہے لہذا واقعہ نگاری کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حالی نے تو واقعہ نگاری کو قصہ گوئی کے فرائض میں شمار کیا ہے۔ لیکن واقعہ نگاری کے سلسلے میں مثنوی نگار کی افتاد طبع کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے شعری رویے کا انحصار اس کے مدارج احساس پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے

کس واقعہ کو پیش کیا، اس نے واقعہ کی حقیقت کو کس طور پر پیش کیا، اس کا ذاتی رویہ ہے۔ مثلاً مثنوی پیکر حسن میں مثنوی نگار نے باغ کے پُر بہار منظر کو مکمل غنائیت کے ساتھ ضرور پیش کیا لیکن مہین پھوار سے جو سبزہ زار پر جو ہی آیا اور روئے گل سے گرد و غبار دھلا وہ اس کے اپنے رویے پر مبنی ہے۔ اس کے تصور میں باغ کا وہ منظر زیادہ حسین ہے جب کہ مہین پھوار بھی پڑ رہی ہو۔ مثنوی نگار نے اس منظر کو بھی پُر بہار اسلوب میں پیش کیا ؎

اک چمن زار تھا قریب مکاں — نزہت افزا گل ریاض جناں
چل رہی تھی نسیم عنبر بار — پھول دکھلا رہے تھے رنگ بہار
شاخوں پر عندلیب خوش الحاں — لیے منقار میں گل خنداں
پڑھتی تھیں خطبہ وداع خزاں — آمد فصل گل سے تھیں شاداں
زیر گلبن تھے پھول بکھرے ہوئے — نو عروسان باغ نکھرے ہوئے
تھا روش پٹریوں کا دامن صاف — عارض صبح کی طرح شفاف
دفعتاً چھا گئی گھٹا گھنگھور — شور کرنے لگے چکور و مور
لگی چلنے سہانی پروائی — سبزۂ خوش نما میں لہرائی
وجد میں جھومنے لگے اشجار — اور پڑنے لگی مہین پھوار
آ گیا سبزہ زار پر جو بن — مسکرانے لگی فضائے چمن
دھل گیا روئے گل سے گرد و غبار — کھل گیا ہر ورق پہ باغ و بہار
بجلیاں کوندنے لگیں پیہم — بوندیں پڑنے لگیں مگر کم کم
کیا سیر چمن نے سودائی — خود تماشا تھا خود تماشائی (ص ۳۰-۳۱)

اسی طرح سراپا نگاری کے وقت مثنوی نگار کی نظر محبوب کے کس کس عضو پر پڑی اور اس نے حسن کو کس طرح محسوس کیا، کیا جذبات بیدار ہوئے، اس کے ذوق نظر اور افتاد طبع پر منحصر ہے۔ مثنوی نگار نے روشن گہر کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا ؎

تھی وہ تاروں میں ماہ کی صورت پتلیوں میں نگاہ کی صورت

لیکن ایسی جامع تعریف حسن کے ساتھ ہی اس میں لذت پرستی کا ردیہ پیدا ہوا یعنی ؎

دل نے چاہا لپٹ کے پیار کروں عارض ماہ وش کا بوسہ لوں

مثنوی پیکر حسن میں مثنوی نگار نے ایک موقع پر حسیناؤں کے پورے جھرمٹ کی اس طرح منظر کشی کی ہے:

غیرت حور سارے ہم سن ہیں مست ہیں کھیل کود کے دن ہیں
وہ انیلی حسین و نازک تن وہ رسیلی نگاہیں الھڑ پن
وہ پری صورتیں قمر رخسار وہ سجیلی نگاہیں برق نگار
زلفیں بکھری ہوئی دراز دراز ناگنیں ہیں کہ کرتی ہیں پرواز
سرو قد۔ گلعذار۔ غنچہ دہن گدگدا گدگدا سڈول بدن
وہ جوانی۔ ابھار وہ کم کم آنے والے شباب کا عالم
گر فرشتہ بھی اک نظر دیکھے یہ تمنا ہو، عمر بھر دیکھے (ص ۹۰)

یہاں مثنوی نگار کے قلم نے آلت سنگتراش کا کام کیا ہے۔ قاری کی چشم تصور میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کے وہ قطار در قطار اصنام ابھرنے لگتے ہیں جو مندروں میں

حسین پیکروں اور بہاروں کے ساتھ ایستادہ ہیں۔

واقعہ کی حقیقت کا اظہار حقیقی جذبات نگاری سے بھی ہوتا ہے جو ایک مشکل فن ہے کیونکہ اس کا تعلق خارجی منظر سے نہیں ہے۔ شاعر کو خود اپنے مخاطب کی طرح محسوس کرنا اور سوچنا پڑتا ہے مثلاً مثنوی پیکر حسن میں واقعہ صرف اتنا ہے کہ قمر پیکر کو بعد وصل بزم آرا سوئے حمام لے جاتی ہے اور اپنی عادت کے مطابق یہ شرارت آمیز گفتگو کرتی ہے سہ

پالیا شاید آپ نے آ ہو چہرہ بشاش دل پہ ہے قابو
رنگ نکھرا ہوا ہے جوبن کا پانی ڈھلکا ہے چشم پُر فن کا
ہم سے رُخ بھی نہیں ملاتے ہو نیچی نظروں میں مسکراتے ہو
یوں طبیعت بحال تھی نہ کبھی یہ نزاکت کی چال تھی نہ کبھی
خم گردن میں یہ حجاب نہ تھا بانکپن میں کوئی جواب نہ تھا
یہ سخن سن کے جی میں شرما کے ہو کے ہمراہ بزم آرا کے
سوئے حمام میں روانہ ہوا میری جانب رُخ زمانہ ہوا (ص۲۹)

ان اشعار میں بزم آرا کی شوخی، طرحداری اور حسب موقع طنز ملیح واقعاتی شگفتہ اور پر لطف ہے۔

مثنوی پیکر حسن میں واقعاتی جذبات نگاری کی مثالیں اکثر و بیشتر ملتی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پہلی مثال کا تعلق اس موقع سے ہے جب قمر پیکر اپنے وطن کو روانہ ہوتا ہے اور رد روشنی گہر اس کو وداع کرتی ہے۔ ان اشعار سے ایک باوفا عورت کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے سہ

پھر مرا ہاتھ۔ ہاتھ میں لے کر یوں وہ کہنے لگا بہ دیدہ تر

پھر مرے دل میں ہوک اٹھتی ہے آہ سوزاں جگر میں گھٹتی ہے
دیکھو اے بے وفا۔ وفا کرنا نہ جفا۔ بانی جفا کرنا
مجکو جاناں۔ نہ بھول جانا تم ٹھیک وعدے پہ اپنے آنا تم
میری صورت کو دیکھ لو تم پھر میری حالت کو دیکھ لو تم پھر
دیر ہوگی اگر، خدا کی قسم پھر قیامت ہی میں ملیں گے ہم
پیٹھ جیسی دکھا کے جاتے ہو گر خدا چاہتا ہے۔ آتے ہو (ص ۹۶)

لیکن قمر پیکر کی واپسی روشن گھر کو نذر آتش کرنے کے لیے ہوئی۔ قمر پیکر نے عاش کی مدد سے تمام کارخانۂ طلسم کو جلا دیا۔ روشن گھر نے قمر پیکر کے روبرو جلتے وقت جو کہا اس میں دکھ اور پچھتاوا ہے۔ ساتھ ہی اپنی وفا کا بدستور احساس ہے کہ اس کی جان اپنے محبوب کے سامنے سے رخصت ہو رہی ہے حالانکہ وہ انسان کی شکل میں حیوان ہے ؎

رحم کر میری نوجوانی پر رحم کر میری زندگانی پر
میں نے افسوس کیا برائی کی نعمتیں دیں تجھے۔ خدائی کی
سلطنت تجھ کو بائے دی اپنی پیاری عصمت ترے حوالے کی
کیوں مٹاتا ہے بے سبب مجکو نہ جلا بانیٔ غضب مجکو
خاک سے مجھ مریض الفت کی آئے گی بو، تیری محبت کی
نہ جلا مجکو اے بت کم سن میں نے دیکھے نہیں بہار کے دن
روح تیری نہ چین پائے گی بے کسی میری رنگ، لائے گی
کر چلی نذر میں جوانی کو ہے سلام اس جہان فانی کو

آتشِ ہجر میں حسین اکثر | جلتے رہتے ہیں یوں تو آٹھ پہر
دل تو جلتا ہے گھر نہیں جلتے | شمع سوزاں سے پر نہیں جلتے

رو برو تیرے، میری جاں نکلے | منہ سے ممکن نہیں فغاں نکلے

جانے کس قسم کا ہے تو انساں | شکل انسان میں ہے یا حیواں (ص ۱۵۲)

واقعاتی جذبات نگاری کے علاوہ مثنوی پیکرِ حسن میں کوٹھی اور بازار کا بھی بیان ہے۔ مثنوی نگار کے عہدِ شعور میں بریلی کی قدیم اور تاریخی بستی میں زمینداروں کی عالی شان مرصع کوٹھیاں بھی تھیں اور بازار بھی۔ مثنوی نگار کی اپنی کوٹھی بازار میں تھی۔ شاید ان کوٹھیوں اور بازاروں کی تصویریں شعری تجربے سے گذرنے کے بعد جزوِ مثنوی بن گئیں۔ بہر نوع کوٹھی اور بازار کی مرقع نگاری میں اس عصر کے جاگیردارانہ نظام کی معاشرتی جھلک ملتی ہے۔ جاگیردارانہ نظامِ حیات میں ہی معمولی واقعات کو ایک حادثے کی طرح سمجھا اور برتا جاتا تھا۔ مثنوی نگار نے اس موقع پر بھی جو منظر پیش کیا وہ اصل کے مطابق تھا۔ مثلاً جب قمر پیکر بے ہوش ہو جاتا ہے تو اس کو ہوش میں لانے کے لیے جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ نصف صدی قبل تک بڑے گھرانوں میں عام طور پر مروج تھیں :

پھول بیلے کے لاتی ہے کوئی | عطر فتنہ سنگھاتی ہے کوئی
پنکھیا خس کی کوئی جھلتی ہے | کوئی عطر گلاب ملتی ہے
تلوے سہلا رہی ہے کوئی نگار | سورہ جن کی ہے کہیں تکرار
کوئی کیوڑے کے چھینٹے دیتی ہے | اور کوئی بلائیں لیتی ہے
کوئی کہتی ہے کچھ نہ غم کیجیے | آیۃ الکرسی پڑھ کے دم کیجیے

کوئی کہتی ہے سر د پانی منگاؤ یہ غبار سفر تو منہ سے دھلاؤ
گلخنہ دوڑ کر کوئی لائی کی غرض سب نے عقل آرائی (ص ۵۰)

اب یہ تدابیر تو اختیار نہیں کی جاتی ہیں کیونکہ ڈاکٹروں کی کمی نہیں ہے لیکن انسان کا جن و آسیب سے خوف اور انسانی صحت پر ان کا اثر انداز ہونے کا توہم ہنوز برقرار ہے۔ سورۂ جن اور آیۃ الکرسی پڑھ کر بے ہوش انسان پر دم کرنے کی تدبیر بدستور اختیار کی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مثنوی نگار نے مثنوی پیکر حسن میں واقعہ نگاری کے فرض کو موقع و محل اور فطرت انسانی کو ذہن نشین کر کے بہ حسن و خوبی ادا کیا اور اس جہت سے یہ مثنوی مکمل نظر آتی ہے۔

کلب حسین مائلؔ نے بریلی کی تاریخ شاعری کے عہد زریں میں اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ تلامذہ غالبؔ و مومنؔ، داغؔ و امیرؔ اور مظفر علی خاں اسیرؔ و خواجہ حیدر علی آتشؔ بریلی کی فضائے شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ انکے اپنے شاگردوں کی بھی کثرت تھی۔ نہ مشاعروں کی کمی تھی اور نہ گلدستوں کی۔ اس عہد کے ایک شاعر برج موہن لال خمار بریلوی نے بریلی کے عروج شاعری کو پیش نظر رکھکر لکھا تھا ؎

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

ہر چند اساتذہ بریلی نے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی لیکن ان کو شہرت غزل کے اسلوب سے ملی جس کا استاذ کلب حسین مائلؔ نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے بریلی کے اس عہد زریں میں اپنے سخن کا لوہا منوانے کے لیے مثنوی پیکر حسن تحریر کی اور اپنی تمام صلاحیت اس کے طرز نگارش پر صرف کر دی۔ یہ اس کی شعوری کوشش تھی۔ اس نے پیکر حسن

کے طرز نگارش کے لیے جو باتیں ذہن میں رکھیں وہ اس کے ہی الفاظ میں مندرجہ ذیل ہیں:

چلبلی بندشیں ہوں، رنگ نئے　　شستہ ترکیب کے ہوں ڈھنگ نئے

فقرہ فقرہ ہو گوہر و اختر　　حسن الفاظ ہو پری پیکر

ہو نرالی ادا فصاحت کی　　پوری تصویر ہو بلاغت کی

وہ دکھا حسن داستان سخن　　خود سخن بولے۔ ہے یہ جان سخن

میرے آگے زباں کا دعویٰ کیا　　شوکت اردوے معلیٰ کیا

دم تحریر یہ خیال رہے　　حسن معنی کی دیکھ بھال رہے

الغرض ایسی داستاں ہو رقم　　شور محشر بنے صریر قلم

سر کو سودا ہو زلف جاناں کا　　سلسلہ ہو جنوں کے ساماں کا

ہو اچھوتی زباں کہانی کی　　دھوم ہو تیری لن ترانی کی (ص ۱۴)

مثنوی پیکر حسن کے جمیع مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی نگار کا رجحان حسن الفاظ، فقروں کی آب و تاب اور حسن تیزی کی طرف ہے۔ اس نے سلیس الفاظ کا جادو جگایا ہے۔ اس نے کسی موقع پر تخیل طرازی بھی کی تو واقعاتی حقیقت کا بھرم رکھا۔ اس کی مثنوی میں ایک خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ شعر کا مصرعہ ثانی تمثیلی و استعاراتی اسلوب میں ہوتا ہے اور اپنے بے ساختہ پن کی داد چاہتا ہے۔ مثلاً ؎

آ گیا کیا تمھیں خیال اس وقت　　ہو گئے بدر سے ہلال اس وقت

پھر طبیعت کمال گھبرائی　　زلف شب تا کمر لٹک آئی

مست۔ مست شراب ہو جائیں　　شعلہ رو۔ آفتاب ہو جائیں

زرد رنگت ہے سبز بختوں کی　　ڈالیاں جھک گئیں درختوں کی

سوزِ غم چہرہ سے نمایاں ہے قدِ رعنا پہ کیوں چھاغاں ہے
سارے احباب نے کیے جلسے پر نکالے پری نے بوتل سے
اس کو دشتِ عدم دکھاؤں ابھی اس کا گھر دھوپ میں بساؤں ابھی
یہ حناہائے رنگ لائے گی آگ پانی میں یہ لگائے گی
تیرے زبان سے اگر ہٹ جائے ورقِ آسماں ابھی پھٹ جائے
ناز و غمزہ فروخت ہوتا ہے گل خورشید سوخت ہوتا ہے
پہلے تو ہو گئی سکوت میں وہ آئی برجِ حمل سے حوت میں وہ

ان اشعار سے مثنوی نگار کی ذہانت اور ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن کے اس اسلوب نے بھی قاری کی دلچسپی کو قائم رکھا ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن میں جذباتی حقیقت نگاری اور سلاستِ بیان اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ مثنوی کے بعض اشعار کو دورانِ گفتگو اور مکاتبت میں برمحل استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

رنج و راحت ہے ہر بشر کے لیے مجھے رونا ہے عمر بھر کے لیے
اور پھر صبح و شام ہوتی ہے یہاں تُر کی تمام ہوتی ہے
میرا غم اور کا سا غم بھی نہیں کسی صورت سے ہوتا کم بھی نہیں
ہائے مجکو یہ ہے جنوں کیسا کیا میں کہتا تھا کہہ رہا ہوں کیا
بات پر لوگ اپنی مرتے ہیں کہتے ہیں جو زباں سے۔ کرتے ہیں
اب جو پھر کر وطن کو آئیں گے ناؤ ہم خضر کی چڑھائیں گے
کیوں یہ عالم کا ہے چلن بگڑا ہر ادا بگڑی بانکپن بگڑا
جان پر بھی مری اگر بن جائے تو بھی شکوہ ترا زباں پہ نہ آئے

سرنوشتِ قضا مٹائے کون | روزِ بد کی بلا اٹھائے کون
کی خدا نے ہماری سنوائی | ٹل گئی سر پہ یہ بلا آئی
تم تو صاحب عجیب ہو انساں | کبھی ایران ہو کبھی توران
پھر شکایت کسی کی کیا کیجے | اپنی تقدیر کا گلہ کیجے
زندگی کا مزا نہیں مجکو | ہائے لیتی نہیں قضا مجکو

دراصل مثنوی پیکرِ حسن کا معیارِ سخن مثنویات سابقہ کی طرح اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔ مثنوی پیکرِ حسن میں جہاں جدید رجحانات اور جدید لفظیت سے شغف کا ثبوت نہیں ملتا وہاں لذت پرستی اور مبتذل الفاظ و لہجے سے گریز کا رجحان ملتا ہے اس کے طرزِ بیان میں غنائیت اور شگفتگی ہے۔ اس کی سلیس، با محاورہ اور عام فہم زبان میں جذبات کی حرارت، واقعیت اور مثنوی نگار کی ذہانت ملتی ہے۔ اس کے برجستہ اور برمحل اشعار میں نیاپن اور ندرت محسوس ہوتی ہے۔ مثنویات سسی پنوں۔ سحرالبیان۔ خواب و خیال۔ گلزار نسیم۔ طلسم الفت اور زہر عشق کے اسالیب کے ارتقائی سفر میں مثنوی پیکرِ حسن کا اسلوب بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بازیافت سے وہ خلا پُر ہوتا نظر آتا ہے جو نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق اور جوالا پرشاد برق کی مثنوی بہار کی درمیانی مدت میں پیدا ہوا تھا۔

مثنوی پیکرِ حسن کی دوبارہ اشاعت اور اردو مثنویات کی تاریخ میں اس کی شمولیت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس پر توجہ کی جانی چاہیے۔

معارف کی ڈاک

(۱)

۲۹۵۔ بلاک۔ ۷/۸ سی پی برار سوسائٹی۔ کراچی۔

مولانائے محترم زاد فضلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی، ماہ صیام مبارک ہو، ہمارے محکمۂ ڈاک نے اس مرتبہ ایک ایک روپے کے ٹکٹ علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ کی یادگار کے طور پر چھاپے ہیں، آپ کے ملاحظہ کے لیے ملفوف کر رہا ہوں۔

بابری مسجد کے سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے علمی جہاد کا جو حق ادا کیا تھا جنوری ۱۹۹۳ء کے آپ کے تحریر فرمودہ شذرات اسکا اختتامی حصہ ہے' اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور نصرت الٰہی شامل حال ہو جائے۔

اس ناچیز کی تصنیف "رموز سورۂ یوسف" اب تک آپ کی توجہ سے محروم ہے، معارف میں تبصرہ نہ آسکا، الحمدللہ یہاں موسم خوشگوار ہے، روزے سہل گذر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ماہ صیام کی برکات و تجلیات سے بہرہ ور رکھے۔ والسلام

ناچیز غلام محمد

(۲)

اے، ۲۵۔ گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں

۱۷ مارچ ۱۹۹۳ء

محب گرامی قدر، آداب

میں پندرہ بیس دن مسلسل سفر میں رہنے کے بعد پرسوں ہی گھر واپس آیا ہوں۔ ڈاک میں "معارف" کا تازہ شمارہ موجود تھا۔

آپ نے "شذرات" میں اس خاکسار کا ذکر کیا ہے۔ "معارف" نے ہمیشہ میرے چھوٹے چھوٹے علمی اور ادبی کام کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ "معارف" میں اپنا ذکر دیکھتا ہوں تو اپنی بے علمی کے پیش نظر شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم اور سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کے زمانے سے میں "معارف" کا ممنونِ احسان چلا آرہا ہوں۔ یہ خداوند کریم کا کرم ہے۔ وہی سورۂ رحمن والی بات ہے۔

میں نے شاید ایک مدت سے "معارف کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ ان دنوں "بابری مسجد" کے عنوان سے ایک نظم ہوئی ہے۔ نظم تو ، دسمبر ۱۹۹۲ء ہی کو ہوگئی تھی مسلسل سفر پیش آتے رہے۔ یہ نظم کاغذات میں دب گئی۔ اس کی نقل اس خط کے ساتھ منسلک ہے، پسند ہو تو معارف کے لیے حاضر ہے۔

لیجیے مذکورہ سفر کے متعلق اصل بات تو میں نے لکھی ہی نہیں۔ جنوبی ہند کا یہ سفر جناب عزیز قریشی چیرمین سنٹرل اردو یونی ورسٹی کی معیت میں تھا، اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ یونی ورسٹی کا صدر دفتر کہاں قائم کیا جائے۔ ابھی ہندوستان کے بعض اور شہروں کا سفر باقی ہے۔ آئندہ ماہ انشاء اللہ یہ تمام سفر مکمل ہو جائیں گے اس سفر کی رپورٹ کمیٹی کو پیش کر دی جائے گی اور کمیٹی اپنی سفارش حکومت ہند کو بھیج دے گی۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد مجوزہ اردو یونی ورسٹی کے قیام کی خبر آپ اخبارات میں پڑھ لیں گے۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

نیاز مند : جگن ناتھ آزاد

(۳)

سی۔ ۱۳۳۹۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ۔

۱۳/۳/۹۳ء

برادرم اصلاحی صاحب! سلام مسنون۔

معارف کے شمارے نظر سے گذرتے ہیں اور طبیعت خوش ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے پیش روؤں کے علمی اور ادبی وقار کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ حالات حاضرہ کے پس منظر میں "شذرات" کو حق گوئی اور بے باکی کا مظہر بھی بنایا ہے۔ سال رواں کے سبھی اداریے ہمارے عہد کی تاریخی دستاویز مرتب کرتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی بڑی ہی سچی ترجمانی آپ کے قلم سے ہوئی ہے۔ فروری کے شمارہ میں جناب رام لعل نابھوی کا مضمون "عربی فارسی اردو میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں" خاصہ کی چیز ہے اور کتابیات کی جو فہرست انھوں نے مرتب کی ہے وہ انھیں جیسے محقق کے بس کی بات ہے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ لکھنؤ آئیے تو (۳۸۲۴۳۰) پر مجھے ٹیلیفون کیجئے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

نیاز مند

ملک زادہ منظور احمد

ادبیات

بابری مسجد

از پروفیسر جگن ناتھ آزاد

۶ دسمبر کو میں جموں سے دہلی روانہ ہوا، دوسرے دن ۷ دسمبر کو اردو یونیورسٹی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے۔ شام کا سفر تھا۔ طیارے میں ایک ہمسفر نے بتایا کہ بابری مسجد کے ایک گنبد کو گرا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آج دوپہر تک یعنی روانگی کے وقت تک تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا بی بی سی نے اطلاع دی ہے میں درد و غم کے طوفان میں ڈوب گیا اور اسی وقت اس نظم کی ابتدا ہوئی۔ صرف ابتدا کے تین بند ہوئے تھے کہ طیارہ دہلی پہنچ گیا۔ جب میں اپنی قیام گاہ پر یعنی بیٹے کے گھر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ساری مسجد منہدم کی جا چکی ہے۔ نظم کا باقی حصہ اس اطلاع کے بعد مکمل ہوا۔ اس لیے یہ نظم دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ (آزاد)

(۱)

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے
خبر بھی ہے تجھے مسجد کا گنبد توڑنے والے؟

ہمارے دل کو توڑا ہے عمارت کو نہیں توڑا
خیانت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے!

ترے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا
مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں

اِدھر ہندوستاں کا تو نے چہرہ مسخ کر ڈالا
اُدھر بوئے ہیں کانٹے تو نے اسکی راہِ منزل میں

تجھے کچھ بھی خبر اسکی نہیں اے بدنصیب انساں
کہ ہندو قوم کیا ہے اور اسکی آتما کیا ہے
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز جسے تو دھرم کہتا ہے
تجھے کیا علم کیا ہے آتما، پرماتما کیا ہے

(۲)

خبر کل تک بس اتنی تھی کہ گنبد ایک ٹوٹا ہے
کھلی اب بات مسجد کا نہیں چھوڑا نشاں باقی
وہ تہذیبی تسلسل جو تھا جاری چار صدیوں سے
تو سمجھا ہے نہ رہ پائے گی اسکی داستاں باقی؛

میں اک گنبد کو روتا تھا مگر اب یہ کھلا مجھ پر
گرا ڈالا ہے اس ساری عبادت گاہ کو تونے
دیا تھا اک دل آگاہ تجھ کو دینے والے نے
یہ کس رستے پہ ڈالا ہے دل آگاہ کو تونے؛

خدا کا گھر ہے مندر بھی خدا کا گھر ہے مسجد بھی
مجھے تو میرے ہندو دھرم نے بس یہ سکھایا ہے
نہیں ہے دھرم وہ ہرگز فقط اندھی سیاست ہے
تجھے تیرا یہ درس شیطنت جس نے پڑھایا ہے

مروت جس کو کہتے ہیں مودت جس کو کہتے ہیں
یہ مسجد اس مروت اس مودت کی علامت تھی
اسی کے ساتھ تو اک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑپن تھا وہی تیری کرامت تھی

خدا کے گھر کو جب تو منہدم کرنے کو نکلا تھا
خدا جانے ترے دل میں خیال خام کیا ہوگا
مکافات عمل کہتے ہیں جس کو اک حقیقت ہے
شقی انقلب کیا کہیے ترا انجام کیا ہوگا

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہل دل کے سینوں میں
خبر بھی ہے تجھے، مسجد کا ہیکل توڑنے والے
ابھی یہ سرزمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

سورۂ یوسف کے آغاز ہی میں کہا گیا ہے کہ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ (ہم نے اس کو اتارا ہے) فاضل مصنف کی نکتہ شناس نگاہ میں یہ قرآن کی عظمت و حقانیت کا اعلان ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ اس میں ہے وہ حق ہے اور جو کچھ اس کے باہر ہے (اسرائیلیات اور قصے) سب بے سند اور غلط ہے۔ (صـ۱۳)

حضرت یوسفؑ کے بھائی ان کو تاریک کنوئیں میں ڈال کر ان کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر جب حضرت یعقوبؑ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے تو یہ کہنے کے ساتھ کہ "ابا ہم سب تو آپس میں دوڑنے میں لگ گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس ایک بھیڑیا ان کو کھا گیا" یہ بھی کہا کہ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ (اور آپ تو ہمارا کاہے کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں) مصنف کا نکتہ رس ذہن اسے ان کے دل کا چور قرار دیتا ہے اور پھر یہ نکتہ آرائی بھی کرتا ہے کہ "ایک جھوٹ سو جھوٹ پیدا کر کے بھی "یقین" فراہم نہیں کر سکتا اور کیسے فراہم کر سکے کہ جھوٹے کا دل یقین سے محروم ہے"۔

قرآن مجید نے کہا ہے "یوسف اور ان کے بھائی کے واقعات میں پوچھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں" فاضل مصنف نے ان نشانیوں کی تشریح میں خوب ہی نکتے اور فوائد تحریر کیے ہیں (صـ۱۸) اسی طرح "صبر جمیل" اور "تاویل الاحادیث" کے مفہوم کی وضاحت میں بھی نکات بیان کیے ہیں (صـ۲۴ وصـ۲۶)

عربیت اور نحوی نکات سے بھی کتاب خالی نہیں ہے۔ مثلاً وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهٖ (اور جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتے تھے وہ ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کو ان کو پھسلانے لگی)، کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہاں عورت

کا نام نہ لینا تحقیر کے لیے ہے (ص۲۹)

وَكَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں

"یہ نہیں فرمایا کہ حضرت یوسفؑ کو گناہ سے دور رکھیں بلکہ فرما رہے ہیں کہ گناہوں کو ان سے دور رکھیں یعنی یوسفؑ تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے گناہوں سے ہٹے ہوئے تھے ہی البتہ چونکہ برائی اور بے حیائی نے ان کو گھیر لیا تھا اس لیے اس جال کو توڑ دیا" (ص۳۱)

مصنف کا اصل ذوق عرفانی ہے اس لیے سلوک و تصوف کے فوائد و رموز بڑی دلچسپی اور لذت سے بیان کرتے ہیں اور وہ عموماً حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر عرفا کے افادات درج کرتے ہیں، ان نکتوں کے ضمن میں مولانائے روم اور دوسرے صاحبِ دل شعرا کے برمحل عارفانہ اشعار بھی دیے ہیں، مثالوں کے لیے اصل کتاب دیکھنی چاہیے۔

کہیں کہیں اشکالات و ایرادات ذکر کر کے ان کے تشفی بخش جواب دیے ہیں، ایک ہی آیت کی تفسیر میں عموماً مفسرین نے متعدد احتمالات و اقوال بیان کیے ہیں جو کہیں کہیں اس قدر الجھے ہوتے ہیں کہ مرجح قول کا پتہ لگنا دشوار ہوتا ہے فاضل مصنف نے اس طرح کے موقع پر اپنے انداز بیان سے مرجح قول کو نمایاں کر دیا ہے۔ انھوں نے خود بتایا ہے کہ اس کتاب کا مقصد عرفی تفسیر لکھنا نہیں ہے اس لیے اس میں عام تفسیری مباحث سے کم تعرض کیا گیا ہے البتہ پوری سورہ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ مطلب خیز اور ایچ پیچ سے خالی ہے۔

کتاب کی خوبیوں کا صحیح اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ایک مختصر تبصرہ میں

سب کا احاطہ مشکل ہے لیکن مکمل احتیاط و کوشش کے باوجود کور کسر بھی رہ جاتی ہے۔

۱۔ حضرت یوسف کے قصہ کو احسن القصص (سب سے عمدہ قصہ) سمجھا جاتا ہے جو غلط نہیں ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہ اس سورہ میں ہے اور نہ پورے قرآن مجید میں، اس نے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (۴) کہا ہے۔ واضح رہے کہ قَصَص مصدر ہے اور احسن القصص ترکیب میں مفعول مطلق واقع ہے نہ کہ مفعول بہ، رہا قصہ تو اسکی جمع قِصَص ہے

مصنف نے تشریح میں دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے (ص۱۳ و ۱۴) اور ترجمہ یہ کیا ہے کہ "ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں" اسی طرح آخری آیت لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ الخ کا ترجمہ "ان کے قصے میں" کیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ قصص کو قصہ کی جمع سمجھتے ہیں۔

۲۔ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ میں قرآن مجید کے الفاظ کی پوری رعایت کرنی چاہیے۔ لیکن وَنَحْنُ عُصْبَةٌ کا ترجمہ "ہم جماعت کی جماعت ہیں" چاہے غلط نہ ہو لیکن جماعت کی تکرار بلا ضرورت ضرور ہے۔ اسی طرح وَتَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ کا ترجمہ "اور تمہارے سب کام بن جائیں گے" مرادی ہے یہاں صالح کے بالکل لفظی ترجمہ (ٹھیک، بہتر) سے عدول کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

۳۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ کا یہ ترجمہ "اور وہ تم کو پہچانیں گے بھی نہیں" (ص۲۱) غلط ہے، یہ تو وَهُمْ لَا يَعْرِفُوْنَ کا ترجمہ ہے، آگے جہاں حضرت یوسفؑ کے پاس بھائیوں کے پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے یوسفؑ کے بھائیوں کو پہچان لینے اور بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کا ذکر ہے وہاں یہ الفاظ آئے ہیں فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ اس سے معلوم ہوا کہ شعور اور معرفت میں بڑا فرق ہے۔

۴۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ کا یہ ترجمہ "بجز اس کے جس پر میرا رب رحم کرے"۔ درست نہیں ہے بلکہ یہ تو اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ کا ترجمہ ہوا۔ یہاں ما ظرفیہ ہے۔

۵۔ سوٓء و فحشا سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو مراد لینا (ص۲۲) صحیح نہیں ہے۔ سوٓء سے عام برائیاں مراد ہیں اور فحشا سے بے حیائی اور بدکاری مراد ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود فاضل مصنف نے اس کی تشریح میں برائی اور بے حیائی ہی لکھا ہے (ص۲۳)۔

۶۔ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "حضرت یوسفؑ خود کو بچانے کے لیے اور زلیخا ان کو گھسیٹنے کے لیے (دروازے کی طرف دوڑے) اسی میں پیراہن پھٹ گیا، مگر نصرت الٰہی نے مقفل دروازہ معجزانہ طور پر کھول دیا"۔ یہ وہی غیر قرآنی تفصیل ہے جس سے احتیاط کا مصنف نے دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ (دروازے بند کر دیے) کہا ہے، جب تغلیق کے معنیٰ دروازہ مقفل کرنا نہیں ہیں تو مقفل دروازے کے معجزانہ طور پر کھلنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

۷۔ دو ایک جگہ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔

(الف) حَاشَ لِلّٰہِ کا ترجمہ حاشاء للہ (ص۲۳) حاشا بھی غلط ہے اور اللہ کو للہ لکھنے کی غلطی بہت عام ہے۔

(ب) اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ (ملکی خزانوں پر مجھکو مقرر کر دی مامور مقرر ہو گیا ہے)۔

۸۔ ص۹۶، د، ۹ سادہ رہ گئے ہیں، اس کی وجہ سے آخری آیت کے بعض فوائد و نکات تحریر میں آنے سے رہ گئے۔

۹۔ مصنف نے آیتوں پر نمبر نہیں دیے ہیں اس سے استفادہ میں سہولت ہوتی ہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

ابوعلی مسکویہ (انگریزی) از جناب ڈاکٹر بدرالدین بھٹ، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۵، قیمت ۲۰۰ روپیے، پتہ: اسلامک بک فاونڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے مسلم ارباب کمال میں ابن مسکویہ مشہور مورخ، فلسفی اور ادیب تھے جن کو اخلاقیات میں ابن سینا کا ہم پایہ قرار دیا جاتا ہے، ان کی بعض تصنیفات تجارب الامم کتاب آداب العرب والفرس اور تہذیب الاخلاق وغیرہ زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں، زیر نظر کتاب لایق مولف کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اسمیں ابن مسکویہ کے عہد، سوانح حیات، مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات کا جامع تعارف کرایا گیاہے اور ایک مورخ، صاحب طرز ادیب اور سماجی مصلح و مفکر کی حیثیت سے ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیاہے، عام طور پر اسے ابن مسکویہ کہا جاتا ہے۔ لیکن لایق مصنف کے نزدیک بوجوہ مسکویہ درست ہے، ان کی نظر میں وہ پہلا مسلم فلسفی ہے جس نے تاریخ کی تدوین میں واقعات کا فلسفیانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیاہے اور صرف کارآمد واقعات کا انتخاب کیا ہے، تجارب الامم کو تاریخ طبری کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے لیکن مصنف نے متعدد روایتوں کی نشاندہی کرکے دکھایاہے کہ وہ طبری کی تاریخ میں مذکور نہیں ہیں اور مسکویہ نے ان کو ماخذ کی صراحت کیے بغیر ہی نقل کردیا ہے، انبیائے کرامؑ کے علوم و معارف سے کم اعتنائی کو مصنف نے ابن مسکویہ کی کمزوری

بتایا ہے اور اس کی بعض مثالیں بھی دی ہیں، وہ وطن پرستی میں بھی گرفتار تھا اس لیے ایرانی بادشاہوں کے اقوال بہت دلچسپی سے نقل کرتا ہے گو آل بویہ کی تاریخ کا وہ معتبر ماخذ ہے تاہم یہ بھی جانبدارانہ رنگ سے خالی نہیں ہے۔ یہ کتاب محنت و جستجو سے لکھی گئی ہے اس میں مسکویہ کی تصنیفات کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ مولف کے حسنِ ذوق کا ثبوت ہیں۔ اگر ان کے ترجمے بھی کر دیے جاتے تو فائدہ دوچند ہو جاتا۔

ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال (۱۹۰۰-۱۹۵۰) از ڈاکٹر

رضیہ اکبر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۳۷۵، قیمت ۲۲ روپیے، پتہ: حسامی بکڈپو، حیدرآباد، اے پی۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فارسی کی صدر رہ چکی ہیں، ایرانیات اور فارسی ادب پر ان کی بعض تحریریں بھی شایع ہوئی ہیں، زیر نظر کتاب میں انھوں نے اس صدی کے آغاز کے ایران کی سیاسی و معاشرتی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد وہاں کی شاعری، ناول نگاری اور ڈرامانویسی وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے، اپنے براہ راست مطالعہ کی بنیاد پر انھوں نے بعض مستشرقین اور خود ایرانی فضلا کی کئی باتوں سے اختلاف بھی کیا ہے مثلاً ایران کے ترقی پسند ادب کے ہر موڑ پر جدید ایرانی شاعروں اور دانشوروں نے قدیم علمی و ادبی سرمایہ سے اکتساب فیض کرتے ہوئے ماضی کی صحت مند روایتوں کی پاسداری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی جدید فارسی ادب قدیم ایرانی انداز فکر کا عکاس معلوم ہوتا ہے، کتاب میں اس صدی کے نصف اول کے نثر نگاروں اور شاعروں میں محمد علی جمال زادہ سے مرتضیٰ مشفق کاظمی اور نیما یوشیج سے گلچیں گیلانی تک تقریباً تیس ادیبوں اور شاعروں کی خدمات

کا جائزہ لیا گیا ہے، کہیں کہیں نامانوس الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں مثلاً گرو ٹرگیری، عقب ماندگی، پابجائی، اظمالات، ملوک الطوائفی، بہت چند، چند ایک اور اپنوں پرایوں کو کشش کرنے لگی وغیرہ حماس اور معاصر تاریخ شاید سہو کتابت ہے۔

اقوال سلف، حصہ سوم از مولانا محمد قمر الزماں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت اور طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۵۵ روپے، پتہ: مکتبہ عزیزیہ ۱۱/۲۵ بخشی بازار الہ آباد۔

علماء و صلحائے امت کے حالات وواقعات کی لڑی میں انکے اقوال و ملفوظات کے موتیوں اور جواہر پاروں کو پرونے کی روایت قدیم تذکروں سے چلی آتی ہے، انکے مطالعہ سے گویا ان بزرگوں کی مجلس و صحبت میں شرکت کی سعادت اور حضوری کے نور و سرور کی دولت ہاتھ آتی ہے، فاضل مرتب نے متعدد تذکروں میں بکھرے ہوئے ان موتیوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جو اقوال سلف کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہو کر اہل ذوق و اصحاب دل کی نظر میں قابل قدر و مستحسن قرار پائی، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ جس میں خاص طور پر بزرگان ہند میں حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے حضرت شاہ میانجیو نور محمد جھنجھانوی تک تقریباً پچپن بزرگوں کے اقوال کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے، علماء و مشائخ کے علاوہ ان میں جہانگیر و شاہجہاں، عالمگیر و ٹیپو سلطان شہید بھی شامل ہیں، اکثر بزرگوں کے اقوال کے ساتھ ان کے احوال بھی دیے گئے ہیں، بعض مقامات پر ضروری حواشی بھی ہیں، موضوع کی جاذبیت و تاثیر پر مولف کا موثر و دلنشین انداز بیان مستزاد ہے، شروع میں نواب صدیق حسن خاں کی ایک منتخب تحریر کا ترجمہ بھی ہے جو اہل کمال کے علوئے مرتبت و جلالت قدر کے متعلق ہے۔

(ع۔ ص)

مئی ۱۹۹۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا ـــــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ مئی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۳ھ عدد ۵

مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۳۲۲-۳۲۴

مقالات

عہد صحابہ کا نظام تعلیم و تعلم	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارکپور۔ اعظم گڈھ	۳۲۵-۳۳۸
گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف محمد بن جلال شاہی رضوی	جناب عارف نوشاہی صاحب پاکستان	۳۳۹-۳۴۸
شیخ علی اصغر قنوجی کی چند دستیاب شدہ تصنیفات	ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۴۹-۳۵۴
رسالہ "مخزن" (لاہور)	جناب جاوید اختر صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۳۵۵-۳۷۱

معارف کی ڈاک

مکتوب ڈربن	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی صدر شعبۂ اردو و فارسی و عربی جامعہ ڈربن جنوبی افریقہ	۳۷۲-۳۸۰

وفیات

ذکر مالک رام	ضیاء الدین اصلاحی	۳۸۱-۳۹۴
مطبوعات جدیدہ	"ض" و "ع ص"	۳۹۵-۴۰۰

شذرات

بھوپال مدھیہ پردیش کا دارالحکومت اور ایک خوبصورت شہر ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ ریاست تھی، جو اپنی خواتین فرماں رواؤں کی زرپاشی، علم دوستی اور معارف پروری کی بنا پر علمی، تعلیمی، ادبی اور دینی حیثیت سے ملک میں ممتاز تھی۔ والیان ریاست کی فیاضیوں سے صرف اس کے ہی نہیں پورے ہندوستان کے اہم علمی و تعلیمی ادارے متمتع ہو رہے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی جود و سخا نے مصنفِ سیرۃ النبیؐ کو بھی دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل ، کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطانی ہے

نواب شاہ جہاں بیگم کے عہد فرخ فال کے گوناگوں کاموں میں سب سے عظیم الشان تاج المساجد کی تعمیر کا منصوبہ ہے جو ان کی وفات کی بنا پر نامکمل رہ گیا۔

۱۹۴۷ء میں انقلاب آیا۔ اور ہوائے حریت کے جھونکوں نے اس علم و ادب پرور ریاست کی بساط الٹ دی۔ اور اس کے تانے بانے بکھر گئے۔ علمی و تعلیمی اداروں نے دم توڑ دیے۔ اور فلاحی و تعمیری منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مایوسی اور شکستگی کی اس ہولناک تاریکی میں غیب سے مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم نمودار ہوئے۔ انھوں نے اللہ کی مدد، بزرگوں اور اساتذہ کی دعا اور اپنے ایثار پسند، پیکر خلوص اور اولوالعزم رفقائے کار کے تعاون سے مریض و مضمحل قوم میں روح حیات پھونک دی۔ اور جو کام ریاست کے گوناگوں وسائل کے باوجود انجام نہیں پا سکا تھا اسے ایک گدائے بے نوا کے اخلاص، حسن نیت، جوش عمل اور مرد قلندر کے عزم و یقین کامل نے انجام دے دیا ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ، غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں علم دین کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مگر اس نے مخالف ہواؤں میں اسے روشن کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مسجد کی تعمیر بھی مکمل کی اور اسے آباد رکھنے کے لیے دارالعلوم بھی قائم کیا۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

دارالعلوم تاج المساجد کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ عموماً دسمبر میں سالانہ تبلیغی اجتماع کے موقع پر ہوا کرتا تھا اس قدر خوش اسلوبی سے اتنے بڑے اجتماع کا نظم و انصرام مولانائے مرحوم اور ان کے جانشین ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سال دسمبر میں بھوپال مقتل بنا ہوا تھا۔ اس لیے جلسۂ انتظامیہ ۲۷ اپریل کو ہوا جس میں شرکت کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے ساتھ گیا تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ دارالعلوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ بھوپال اور مضافات میں بیس سے زیادہ اسکی شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ دارالعلوم، دارالمطالعہ اور دارالاقامہ کی شاندار عمارتیں بن کر تیار ہوگئی ہیں۔ کتب خانہ (سلیمان ہال) کی پرشکوہ اور مستحکم عمارت جو کئی برس سے تعمیر ہو رہی ہے، اب آخری مرحلہ میں ہے۔ مولانا منظور سرورش امیر دارالعلوم مولانا حبیب ریحان خان ندوی معتمد تعلیم، مولانا محمد لقمان خان ندوی مہتمم اخلاص و جانفشانی سے دارالعلوم کے ہر کام میں منہمک رہتے ہیں، ہم لوگوں کی میزبانی بھی بڑے خلوص اور گرمجوشی سے کی۔ ڈاکٹر حسان خان لیکچرر شعبہ عربی بھوپال یونیورسٹی نے یونیورسٹی کی سیر کرائی۔ مولانا محمد سعید مجددی اور مفتی عبدالرزاق جنرل سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند سے ملاقات اور مولانا محمد عمران خان اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی سعادت میسر آئی اور طلبہ و اساتذہ سے خطاب بھی کیا گیا۔

اعظم گڈھ ایک پسماندہ ضلع ہے۔ اسے آمد و رفت کی موجودہ سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں۔ تاہم یہ علمی تعلیمی اداروں کا مرکز اور بڑا مردم خیز ہے۔ یہاں کے قصبات میں کئی بڑے دینی مدارس عرصہ سے قائم ہیں اور اب تو بعض دیہاتوں میں بھی بڑے بڑے مدرسے قائم ہوگئے ہیں۔ جن میں جامعہ اسلامیہ مظفر پور نمایاں ہے۔ یہ ہمارے لائق دوست مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ تعلیمی اسکول، انٹر کالج اور ڈگری کالج ان کے علاوہ ہیں۔ ان تعلیمی اداروں سے دوسرے اضلاع اور صوبوں کے مسلمان طلبہ بھی فیضیاب ہو رہے ہیں۔ بیناپارہ اسی ضلع کا ایک چھوٹا گاؤں ہے۔ مگر اس کے ذی شعور، حوصلہ مند افراد نے پہلے ہائی اسکول اور انٹر کالج قائم کیا۔ پھر ابن سینا طبیہ کالج کی داغ بیل ڈالی جو نہ صرف اعظم گڈھ بلکہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں قائم ہونے والا پہلا طبی کالج ہے۔ ابھی تک چار سالہ ڈپلوما نصاب مکمل کرکے چار سو طلبہ فارغ ہوئے ہیں

آئندہ تعلیمی سال میں ڈگری کورس میں داخلہ شروع ہونا متوقع ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس طرح کے اداروں کا قیام ایک اہم قومی و ملی ضرورت ہے۔

ابن سینا طبیہ کالج میں ۲۳ر تا ۲۵ر اپریل کو آل انڈیا طبی کانفرنس کا سالانہ صوبائی اجلاس اور علم الادویہ پر ایک قومی سیمینار ہوا۔ جس میں صوبہ اور اسکے باہر کے تقریباً ڈیڑھ سو اطبا شریک تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ اور چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی نے کرسیٔ صدارت کو زینت بخشی اور مشہور سیاسی رہنما چندرجیت یادو نے افتتاح کیا۔ پروفیسر رشید الظفر وائس چانسلر جامعہ ہمدرد، حکیم سیف الدین احمد مشیر اعزازی یونانی مرکزی وزارت صحت و خاندانی بہبود دہلی، حکیم سید خلیفۃ اللہ، جناب آر۔ کے۔ مکھی ڈائرکٹر سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم اور حکیم سید ظل الرحمٰن ندوی صدر شعبۂ علم الادویہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے رونق بڑھائی۔ ان کی اور دوسرے مندوبین کی تشریف آوری سے ویرانہ میں بہار آگئی تھی۔ کانفرنس اور سیمینار کے جلسے یک وقت تین روز تک بڑی خوبی سے ہوئے۔ راقم کو بھی افتتاحی جلسہ میں حاضری اور دارالمصنفین میں طبیبوں کے قافلہ کی پذیرائی کا موقع ملا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس قدر سلیقے سے اتنی بڑی تقریب انجام دینے کیلئے حکیم سید ظل الرحمٰن ندوی، پرنسپل حکیم ارشاد احمد سکریٹری حاجی نیاز احمد اور ابن سینا طبیہ کالج کے تمام ارکان، اساتذہ اور طلبہ قابل مبارکباد ہیں۔

۱۵ر اپریل کو تھوڑے وقفوں سے اردو کے تین اہل قلم کی وفات ہوگئی۔ جناب مالک رام صاحب پر اسی شمارہ میں مفصل مضمون دیا جارہا ہے۔ مفتی شوکت علی فہمی کا اصل وطن میرٹھ تھا۔ وہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد تحریک عدم تعاون سے متاثر ہوئے اور انگریزی تعلیم چھوڑکر دہلی چلے آئے اور دین دنیا کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور متعدد دینی و تاریخی کتابیں لکھیں جو زیادہ معیاری تو نہیں ہیں لیکن ان سے بڑا فیض پہونچا۔ جناب گوپال متل اردو کے مشہور ادیب و شاعر اور صحافی و مترجم تھے ۱۹۴۷ء کے بعد مغربی پنجاب سے ترک وطن کرکے دلی میں آبسے تھے۔ یہیں سے ماہنامہ تحریک جاری کیا جو ۲۷ برس تک پابندی سے نکلتا رہا۔ ان کی تصنیفات میں "لاہور کا جو ذکر کیا" اور "صحرا میں اذان" وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ متل صاحب نے اشتراکیت کی تردید میں درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے اور دوسروں سے کرائے۔ اسکی بدولت اردو کی تاریخ میں ان کا نام ثبت

مقالات

عہد صحابہؓ کا نظامِ تعلیم و تعلم

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

(۲)

اثنائے درس میں خوش وقتی اور تفریحی باتیں | حضرات صحابہ اپنی مجلسوں میں نہایت انبساط و نشاط کے ساتھ تعلیم دیتے تھے، وہ نرے خشک نہیں تھے بلکہ خوش طبع، خوش خلق اور خوش وقت تھے، اپنے تلامذہ کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، موقع بہ موقع تفریحی اور خوش کن باتیں کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ دلوں کو سکون دو اور ان کے لیے حکمت کے لطائف و ظرائف تلاش کرو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ بدن کی طرح دل بھی ملول ہوتے ہیں، ان کے لیے حکمت کے لطائف وظرائف تلاش کرو، حضرت ابو الدرداءؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو باطل اور غلط چیز سے بہلاتا ہوں تاکہ اس کے ذریعہ حق اور صحیح بات کے بارے میں قوت ملے، حضرت علیؓ کا یہ قول بھی ہے کہ جب دل پر جبر کیا جائے گا تو اندھا ہو جائے گا[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر پنجشنبہ کو وعظ بیان کرتے تھے ان کا وعظ بڑا موثر ہوتا تھا، لوگوں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے ان سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ آپ ہم کو روزانہ وعظ سنایا کریں، حضرت ابن مسعودؓ نے کہا کہ مجھکو تم لوگوں کے جمع ہونے کی خبر ملتی ہے مگر میں تمہاری گھبراہٹ اور اکتاہٹ کو پسند نہیں کرتا، رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] الفقیہ والمتفقہ، و جامع بیان العلم وغیرہ۔

علیہ وسلم اسی خیال سے ہم لوگوں کو ناغہ ناغہ سے وعظ سنایا کرتے تھے[1]

ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابتؓ کے تلامذہ نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ عادات و اخلاق بیان کیجئے، حضرت زیدؓ نے بتایا کہ جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ دنیا کی باتیں کرتے اور جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت کی باتیں کرتے اور جب ہم کھانے کی باتیں کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے کی باتیں کرتے، میں یہ تمام باتیں تم لوگوں سے بیان کروں گا، حضرت جابر بن سمرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت، قلیل الضحک تھے (زیادہ خاموش رہتے تھے اور کم ہنستے تھے) بسا اوقات صحابہ آپؐ کے سامنے اشعار پڑھتے تھے اور اپنی باتیں کرکے ہنستے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما دیتے تھے[2] ابو خالد والبیؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے، وہ حضرات آپس میں اشعار سنتے سناتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کا تذکرہ کرتے تھے[3] ابو سلمہ بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نہ منقبض تھے، نہ ان پر مردنی چھائی رہتی تھی، بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں اشعار سنتے سناتے تھے اور دور جاہلیت کے واقعات بیان کرتے تھے اور جب ان میں سے کسی کو اللہ کے حکم کی دعوت دی جاتی تھی تو آنکھوں میں گردش ہونے لگتی تھی جیسے وہ دیوانہ ہے[4] حضرت ابو ہریرہؓ بڑے خوش مزاج

---

[1] بخاری ج ۱ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص۱۱ و ص۱۱۱ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص۱۰۵

[4] الادب المفرد، باب الکبر۔

اور ظریف الطبع انسان تھے ان کی مجلس میں اس قسم کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں، ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن عباسؓ کی مجلس میں گئے تو انھوں نے کہا کہ تم لوگوں کو جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھو، آج میری طبیعت میں نشاط و انشراح ہے، سورۂ بقرہ اور سورۂ یوسف کے بارے میں سوال کرو[1] ابن جبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے مجھ سے کہا کہ تم مجھ سے ایک آیت کی تفسیر کیوں پوچھتے ہو جس میں ایک سو آیت ہے وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا، ہر خیر فتنہ ہے، ہر شر فتنہ ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات کے مطابق حضرات صحابہ اپنی مجلسوں اور حلقوں میں بعض اوقات تفریحی باتیں بیان کرتے تھے اور طالب علموں میں نشاط باقی رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً خوش کن واقعات و اشعار سناتے تھے۔

طلبہ کو تحصیل علم کی تاکید اسی کے ساتھ حضرات صحابہ طلبہ کی ہمت افزائی اور تشجیع بھی کرتے تھے، تحصیل علم کی ترغیب دیتے تھے. امتحان لیتے تھے اور اپنے سامنے ان سے فتویٰ دلاتے تھے، تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا طریقہ سکھاتے تھے، حضرت ابن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ اے لوگو! علم حاصل کرو، تم نہیں جانتے ہو کہ کب تمھاری ضرورت پڑ جائے گی، یا تمہارے پاس جو علم ہوگا اس کی احتیاج ہو گی، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ علم کے سرچشمے، ہدایت کے چراغ، گھروں کی زینت، راتوں کے چراغ، نئے دل، پرانے کپڑے والے بنو، زمین والوں سے پوشیدہ رہ کر آسمان والوں میں پہچانے جاؤ گے، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوذرؓ ..... کہتے ہیں کہ علم کا ایک باب سیکھنا ہمارے نزدیک ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے اور علم کا ایک

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۱۱۵۔

باب جس کو آدمی دوسرے کو سکھائے اس پر عمل کرے یا نہ کرے ہمارے نزدیک سو رکعت نفل نماز سے بہتر ہے[1]

باہمی مذاکرہ کی تاکید | حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ تم لوگ آپس میں مل کر بیٹھو اور حدیث کا مذاکرہ کرو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو حدیث جاتی رہے گی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ حدیث کا مذاکرہ کرو، اس کی حیات مذاکرہ سے ہے، نیز کہتے ہیں کہ تم لوگ ان حدیثوں کا مذاکرہ کرو تاکہ وہ بے قابو نہ ہو جائیں، حدیث قرآن کی طرح نہیں ہے (قرآن محفوظ و مجموع ہو چکا ہے، اگر حدیث کا مذاکرہ نہیں کرو گے تو تمہارے قابو سے باہر ہو جائے گی، تم یہ نہ کہو کہ میں کل تو یہ حدیث بیان کر چکا ہوں، آج نہیں بیان کروں گا بلکہ گذرے ہوئے دن بھی بیان کرو، آج بھی بیان کرو اور کل بھی بیان کرو، جب تم کوئی حدیث ہم سے سنو تو آپس میں اس کا مذاکرہ کیا کرو، ایک ساعت علم کا مذاکرہ ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ آپس میں حدیث کا مذاکرہ کیا کرو، اس لیے کہ مذاکرہ سے بعض حدیث بعض حدیث کو یاد دلا دیتی ہے[2]

ایک رات ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عمرؓ نے ناوقت آنے کا سبب معلوم کیا تو ابوموسیٰ نے کہا کہ ہم فقہ کا مذاکرہ کریں گے، اس کے بعد دونوں حضرات رات گئے تک مذاکرہ کرتے رہے، ابوموسیٰ نے کہا کہ نماز کا وقت ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم لوگ ابتک نماز ہی میں مصروف تھے (یعنی نماز

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۵ و ص ۹۶ و ص ۱۲۶ [2] شرف اصحاب الحدیث ص ۹۴ و ۹۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۹۔

ثواب ہم کو ملتا رہا) پھر مذاکرہ کرتے رہے یہانتک کہ نماز فجر کا وقت آگیا[1]

حفظ حدیث اور کتابت حدیث کی تاکید حضرات صحابہ میں بعض حفظ حدیث کو ترجیح دیتے تھے اور بعض کتابت حدیث پر زور دیتے تھے اور اپنے اپنے طالب علموں کو اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرنے کی تاکید کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ کتابت حدیث کے حق میں نہیں تھے مگر بعد میں اس کی اجازت دیدی، کہتے تھے کہ ہم علم کو نہ لکھتے ہیں، نہ لکھاتے ہیں، مگر ان کے شاگرد ہارون بن عنترہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے ان کو لکھنے کی اجازت دی تھی، ابونضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدری سے کہا کہ ہم آپ سے جو کچھ سنتے ہیں کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ انھوں نے کہا کہ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ مجھ سے سنی ہوئی باتوں کو مصحف بناؤ؟ تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے حدیث بیان فرماتے تھے اور ہم یاد کر لیتے تھے، جس طرح ہم لوگ یاد کرتے تھے تم لوگ بھی یاد کرو،[2]

تدریس و افتاء کی تعلیم و تربیت سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن عباسؓ نے مجھ سے کہا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کس طرح حدیث بیان کرتے ہو، یہ سن کر میں گھبرایا تو کہا کہ کیا تم پر اللہ کا یہ احسان نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیث بیان کرو، اگر صحیح طور سے بیان کرتے ہو تو سبحان اللہ اور اگر غلطی کرتے ہو تو میں تصحیح کر دوں[3]۔ حجاج بن عمرو بن عزیہ کہتے ہیں کہ میں زید بن ثابتؓ کی مجلس میں تھا، ایک شخص نے ان سے فتویٰ پوچھا تو مجھ سے کہا کہ تم فتویٰ دیدو، میں نے کہا کہ ہم آپ کے پاس تحصیل علم کے لیے آتے ہیں پھر بھی زید بن ثابتؓ نے اس کا حکم دیا اور میں نے فتویٰ دیکر کہا کہ میں نے زید بن

---

[1] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ صفحہ ۱۲۵ [2] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴ و ص ۶۳، [3] طبقات ابن سعد۔

ثابتؓ سے ایسا ہی سنا ہے، اس پر انھوں نے کہا کہ زید نے صحیح کہا[1] حضرت ابن عباسؓ اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ لوگوں کو ہر جمعہ (ہفتہ) میں ایک مرتبہ حدیث کی تعلیم دو، اگر اس سے انکار ہے تو دو مرتبہ اور اگر بہت زیادہ چاہتے ہو تو تین مرتبہ تعلیم دو اور لوگوں کو قرآن سے غافل نہ کرو، لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہوں تو تم جاکر ان کی بات مت کاٹو، بلکہ خاموش رہو اور وہ خواہش ظاہر کریں تو حدیث بیان کرو، حضرت ابن مسعودؓ اپنے تلامذہ سے کہتے تھے کہ جب تک لوگ پوری توجہ سے تمہاری طرف دیکھتے رہیں تم حدیث بیان کرو اور جب وہ نظر نیچی کرلیں تو رک جاؤ، نیز کہتے تھے کہ اپنی نیکی کو ایسے شخص کے سامنے نہ پھیلاؤ جو اس کی خواہش نہ کرے (تدریب الراوی ص۳۴۴ و المحدث الفاصل ص۵۹۱)

مختلف علوم میں ممتاز صحابہ یوں تمام ہی صحابہ آسمان نبوت کے ستارے اور علوم نبوت کے حامل تھے، مگر کچھ حضرات ان میں نمایاں تھے اور عام دینی علوم تفسیر و تاویل، حدیث، فقہ و فتویٰ کے ساتھ بعض علوم میں ممتاز تھے، حضرت صہیب بن سنان رومی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و اسفار بیان کرتے تھے اور حدیث نہیں بیان کرتے تھے، کہتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں بیان کروں گا، اگر تم لوگ چاہو تو آپؐ کے غزوات و اسفار کو بیان کردوں[2]۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت صہیبؓ کہا کرتے تھے آؤ میں تم لوگوں سے اپنے غزوات بیان کروں، مگر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہوں گا[3]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص۱۲۱ و ص۱۱۵ [2] کتاب الثقات ابن حبان ج ۴ ص۲۱۱ [3] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۲۹۔

حضرت ابن عباس اپنی مجلس میں ایک دن صرف فقہ، ایک دن صرف تفسیر، ایک دن صرف مغازی، ایک دن صرف اشعار اور ایک دن صرف عرب کی لڑائیوں کو بیان کرتے تھے[1]

حضرت عقیل بن ابو طالب قریش کے انساب وحروب اور ان کے محاسن و مثالب بیان کرتے تھے[2] حضرت سعد بن وقاص وعظ و تذکیر اور تحدیث و تفقہ کے انداز کے بجائے اپنی مجلس میں عام لوگوں کی طرح گفتگو کرتے تھے اور درمیان میں احادیث و جہاد کے واقعات اور اخلاق سے متعلق باتیں بیان کرتے تھے[3] حضرت ابن عباسؓ تفسیر و تاویل میں، حضرت ابی بن کعب قراءت قرآن میں، حضرت معاذ بن جبل حلال، حرام کے علم میں، حضرت زید بن ثابتؓ فرائض میں، حضرت عبداللہؓ بن مسعود تفقہ میں، اور کئی صحابہ مختلف علوم میں ممتاز تھے اور یہ سب حضرات حدیث اور فقہ و فتوی کے ساتھ اپنے مخصوص علم کا درس بھی دیتے تھے۔

مجلسوں اور حلقوں کی ہیئت و کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے بعد ستون ابو لبابہ کے پاس تشریف لاتے تھے اور صحابہ اس طرح حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے کہ سب کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف ہوتا تھا، صحابہ کرام کی مجلس اور حلقہ کا یہی طریقہ تھا اور وہ بھی مسجد نبویؐ کے ستون کے پاس بیٹھتے تھے، حضرت عثمانؓ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر و توسیع کے وقت پتھر کے ستون لگوائے تھے اور مسجد بھی وسیع و عریض اور پختہ تعمیر کرائی تھی، تقریباً ہر ستون کے پاس حلقۂ درس ہوتا تھا، حضرت ابن مسعودؓ کے ایک شاگرد نے اس دور میں مسجد نبویؐ میں مجلسوں

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۶۸ [2] اصابہ ج ۴ ص ۲۵۵ [3] تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۱ ص ۱۲۴ ۔

اور حلقوں کی کثرت کا ذکر بڑے بلیغ و فصیح انداز میں یوں کیا ہے ،

عهدی بهذا المسجد	اس مسجد میں میرا وہ دور گذرا ہے
وانه لمثل الروضة اخضر	جب کہ یہ باغیچہ کے مانند تھی تم اسکے
منها حيث شئت ؕ[1]	جس درخت کے سایہ میں چاہو بیٹھ جاؤ۔

شیوخ و اساتذہ تخت پر بیٹھتے تھے، اصحاب و تلامذہ اسی کے قریب نیچے بیٹھتے تھے، مجلس و حلقہ میں اعیان و اشراف، عوام و خواص، مقامی، بیرونی اور عربی و عجمی سب طلبہ برابر برابر بیٹھتے تھے، اساتذہ بعض طلبہ کو ان کے مقام و مرتبہ یا قرأت کی وجہ سے اپنے تخت پر، یا اپنے قریب بٹھاتے تھے، طلبہ کی کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مجلس میں ابوجمرہ خاص طور سے مجمع میں آواز پہونچانے اور عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے رکھے گئے تھے، اساتذہ کے احترام و ادب کا لحاظ کرتے ہوئے طلبہ سوال کرتے تھے اور کافی و شافی جواب پاتے تھے، بعض اساتذہ نشاط میں ہوتے تو طلبہ سے خود سوال کرنے کی فرمایش کرتے تھے، حضرت علیؓ اور ابن عباس سے ایسے واقعات منقول ہیں، حضرت ابوسعید خدریؓ نے ایک مرتبہ مجلس میں اپنے نوجوان تلامذہ کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد اس قدر زیادہ حدیث بیان کی کہ وہ سب گھبرا گئے،[2] کبھی کبھی اہل مجلس میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مجلس کا رنگ بدل جاتا تھا، شعر و شاعری ہونے لگتی تھی، زمانۂ جاہلیت کی جنگوں کے تذکرے ہونے لگتے تھے، ذاتی باتیں بھی ہوتی

---

[1] المحدث الفاصل ص۱۰۱ [2] الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص۱۱۶۔

تھیں مگر مجلس کا وقار ہر حال میں باقی رہتا تھا، اثنائے درس میں اساتذہ و تلامذہ کثرت سے استغفار اور دعا کرتے رہتے تھے اور مجلس کے خاتمہ پر صحابہ اپنے اور اہل مجلس کے لیے دعا کر کے اٹھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسے موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو پڑھتے تھے۔

اللھم اقسم لنا من خشیتک	اے اللہ! ہم کو اپنی خشیت دے
ما تحول بیننا وبین معصیتک	جو ہمارے اور تیری معصیت کے
ومن طاعتک ما تبلغنا بہ	درمیان حائل ہوجائے اور اپنی
الی حبک، ومن الیقین	اطاعت دے جو ہم کو تیری محبت
ما تھون علینا مصائب	عطا کرے اور یقین دے جس سے
الدنیا بہ، اللھم متعنا	ہم پر دنیا کے مصائب آسان ہوجائیں
باسماعنا وابصارنا	اے اللہ! جب تک تو ہم کو زندہ رکھے
وقوتنا ما احییتنا واجعلہ	ہمارے کان، ہماری آنکھ، ہماری قوت
الوارث منا، واجعل ثارنا	سے ہم کو نفع پہونچا اور ہماری طرف
علی من ظلمنا وانصرنا	سے اس تمتع کو وارث بنا اور ہمارے
علی من عادانا، ولا تجعل	خون بہا کو ہمارے ظالموں پر ڈال
مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل	دے اور ہمارے دشمنوں کے مقابلہ
الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ	میں ہماری مدد فرما! اور ہم کو دینی
علمنا، ولا تسلط علینا من	مصائب میں مبتلا نہ فرما اور دنیا
لا یرحمنا[1]	کو ہمارا سب سے بڑا مقصد اور

[1] عمل الیوم واللیلۃ، لابن السنی ص ۱۲۰۔

ہمارے علم کا منتہی نہ بنا اور ہم پر
ایسے فرد یا قوم کو مسلط نہ کر جو ہم پر
رحم نہ کرے۔

مجلس اور حلقہ کے اوقات اور دن | ان تعلیمی مجالس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا انعقاد روزانہ ہوتا تھا، یا ہفتہ میں چند دن، اسی طرح ان کے اوقات کا علم بھی نہیں ہے، عام طور سے یہ مجلسیں صبح کو فجر کے بعد قائم ہوتی تھیں اور دن میں دوسرے اوقات میں بھی تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حضرت ابن عباس کا معمول تھا کہ ایک دن فقہ، ایک دن تفسیر، ایک دن مغازی، ایک دن اشعار اور ایک دن ایام عرب کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی مجلسوں اور حلقوں کا انعقاد وقفہ وقفہ سے ہوتا تھا، البتہ کچھ حضرات روزانہ درس دیتے تھے اور اہل علم اس میں معمول کے مطابق بیٹھتے تھے، عہد صحابہ کے بہت بعد تک تحدیث و روایت کی مجلسیں اور حلقے قائم ہوتے تھے، جن میں محدثین املاء کراتے تھے ان کے اوقات اور دن کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں، امام سیوطی لکھتے ہیں:

لم اظفر لاحد تبعيين	کسی شیخ کے املا کرانے کے وقت
يوم الاملاء ولا وقته[1]	اور دن کی تعیین مجھے نہیں ملی۔

غالباً دور اسلاف میں یہ مجلسیں آسانی اور حالات کے پیش نظر مختلف اوقات و ایام میں منعقد ہوتی تھیں۔

---

[1] تدریب الراوی ص۳۴۴۔

جمعہ کی تعطیل عہد رسالت میں نماز جمعہ سے پہلے مسجد نبویؐ میں تعلیمی حلقے نہیں ہوتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی تھی، سنن ابو داؤد میں باب التحلق یوم الجمعۃ قبل الصلوٰۃ میں روایت ہے کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الشراء والبیع فی المسجد وان تنشد فیہ ضالۃ وان ینشد فیہ شعر، ونھی عن التحلق قبل الصلوٰۃ یوم الجمعۃ[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں خرید و فروخت، گمشدہ چیز کی تلاش اور شعر پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور جمعہ کی نماز سے پہلے حلقہ قائم کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جمعہ کے دن صبح ہی سے قریات و عوالی مدینہ سے مسلمان مسجد نبویؐ میں آتے تھے اور ذکر و اذکار اور نوافل میں مشغول رہتے تھے یا دینی معلومات حاصل کرتے تھے اس لیے نماز سے پہلے تعلیمی حلقے نہیں ہوتے تھے صحابۂ کرام نے اپنے دور میں اسی پر عمل کیا، البتہ نماز سے پہلے وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ منبر کے پاس کھڑے ہو کر وعظ بیان کرتے تھے بعد میں جب مدارس کا باقاعدہ قیام ہوا تو جمعہ کی تعطیل کا رواج اسی سنت کے مطابق عام ہوا۔

مقامی اور بیرونی طلبہ مدینہ منورہ کی تعلیمی مجالس و حلقات میں مقامی اور بیرونی دونوں قسم کے طلبہ شریک ہوتے تھے، مقامی لوگ مستقل طور سے حاضر باش رہکر فقہ و فتوی

---

[1] سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۱۶۱۔

اور حدیث میں شیخ مجلس کے متبع اور ان کے علم کے ناشر و ترجمان ہوتے تھے اور ان کا شمار خصوصی تلامذہ و اصحاب میں ہوتا تھا مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ کے اصحاب سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قبیصہ بن ذویب، خارجہ بن زید بن ثابت، سلیمان بن یسار، ابان بن عثمان بن عفان، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، قاسم بن محمد بن ابوبکر، سالم بن عبد اللہ بن عمر، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، طلحہ بن عبد اللہ بن عوف، نافع بن جبیر بن مطعم. علمائے تابعین کے ذریعہ حضرت زیدؓ بن ثابت کا فقہی مسلک مدینہ میں عام ہوا اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد عطار بن ابی رباح، مجاہد بن جبیر، طاؤس بن کیسان، جابر بن زید، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، سعید بن جبیر نے مکہ میں حضرت ابن عباسؓ کے مسلک کی اشاعت کی، اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تلامیذ علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، مسروق بن اجدع، عبیدہ سلمانی، حارث بن قیس، عمر بن شرجیل نے کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے مسلک کو رائج کیا، اسی طرح دوسرے صحابہ کے حلقہ نشینوں نے ان کے فقہ و فتویٰ اور احادیث و مرویات کو اپنے اپنے حلقہ میں عام کیا، اور غیر مقامی حضرات چند دن یا چند ہفتہ یا اس سے کم و بیش مدت تک مجلس میں شریک ہو کر اپنے اساتذہ و شیوخ کی احادیث اور اقوال و آرا سنکر واپس چلے جاتے تھے اور اپنے اپنے شہروں میں عام کرتے تھے، اس دور میں جس شہر یا ملک میں کسی صحابی کا پتہ چلتا اہل علم سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی احادیث حاصل کر کے واپس ہو جاتے تھے، حد یہ ہے کہ ایک ایک حدیث کے لیے سفر کیا جاتا تھا، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ایک حدیث کے لیے ملک شام کا سفر کیا تھا، حضرت ابو درداؓ کے پاس دمشق میں ایک آدمی مدینہ سے صرف ایک

حدیث کے لیے حاضر ہوا تھا، امام زہری کہتے ہیں کہ ایک حدیث کے لیے آدمی مدینہ کا سفر کرتا تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں تین دن مدینہ میں مقیم رہا تاکہ ایک شخص سے ایک حدیث سنوں، مختلف مقامات کے تابعین سند عالی اور روایت کی اجازت کے لیے مدینہ آتے تھے، ابو العالیہ ریاحی کہتے ہیں ہم لوگ بصرہ میں صحابہ سے حدیث سنتے تھے اور مدینہ جاکر وہاں کے صحابہ سے اس کو سنتے اور مطمئن ہوتے تھے، ابن جبیر کا بیان ہے میں نے چند حدیثیں کوفہ میں ایک صحیفہ میں جمع کی تھیں، بعض احادیث کے بارے میں ہم لوگوں میں اختلاف ہوگیا تو میں نے عبداللہ بن عمر کے پاس آکر ان کو پڑھا اور ان کے بارے میں سوالات کیے، عکرمہ مولی ابن عباس کا بیان ہے کہ طائف کے کچھ اہل علم حضرت ابن عباس کی لکھی ہوئی حدیثیں لے کر آئے اور ابن عباس نے ان کو ان لوگوں کے سامنے پڑھا، یعنی ان کی تصدیق کی، بشیر بن نہیک کا بیان ہے کہ میں ابو ہریرہؓ سے حدیث سنکر لکھ لیتا تھا جب واپس جانے لگا تو وہ کتاب ان کو پڑھ کر سنائی اور کہا کہ کیا میں نے ان کو آپ سے نہیں سنا ہے ؟ انھوں نے کہا کہ ہاں تم نے مجھ سے سنا ہے، ان چند مثالوں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مدینہ کی تعلیمی مجالس میں بیرونی طلبہ کی حاضری وقتی طور پر ہوتی تھی اور وہ چند دنوں قیام کر کے حدیث کی روایت کرتے، اجازت لیتے، تصدیق کراتے اور سند عالی لے کر واپس چلے جاتے تھے،

طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام عہد رسالت میں مقامی اور بیرونی دونوں قسم کے طلبہ کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام تھا، مقامی طلبہ یعنی فقراء و مساکین اور اصحاب صفہ مسجد نبویؐ میں قیام کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باحیثیت صحابہ ان کو اپنے گھروں میں لے جاکر کھلاتے تھے، مسجد نبویؐ میں صحابہ ان کے لیے کھجور اور پانی رکھتے تھے، بیرونی طلبہ

یعنی افراد اور وفود "دار رملۃ بنت حارث" میں ٹھہرائے جاتے تھے جو دار الضیافہ کے نام سے مشہور تھا اور اس میں چھ سات سو آدمیوں کے قیام کی گنجایش تھی، ان کے طعام کا انتظام حضرت بلالؓ کے ذمہ تھا مگر عہد صحابہ میں مقامی اور غیر مقامی طلبہ کے قیام وطعام کے بارے میں تصریح نہیں ملتی ہے، اس زمانہ میں حالات بدل چکے تھے، تنگی کی جگہ کشادگی اور بدحالی کی جگہ خوشحالی آگئی تھی، مقامی طلبہ کو دوسری جگہ قیام وطعام کی ضرورت نہیں تھی اور بیرونی طلبہ چند دنوں تک ضیافت میں رہتے تھے، یا اپنے متعلقین کے یہاں قیام کر لیتے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وصیت فرمائی کہ میرے بعد حدیث اور علم کی طلب میں اطراف واکناف سے نوخیز ونوجوان آئیں گے تم ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور ہر طرح سے ان کی خبر گیری کرنا، اس وصیت ونصیحت کے مطابق حضرات صحابہ اور اہل مدینہ ان بیرونی طلبہ کا بڑھ کر استقبال کرتے تھے اور ان مہمانانِ رسولؐ کی میزبانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔

اسلامی نظام تعلیم

مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم

اس کتاب میں فن تعلیم وتدریس پر مسلمان علمار کی تصنیفات کا جائزہ لیا گیا اور ان کے خیالات ونظریات کو ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے، نیز بزرگوں کے تعلیمی واقعات ومعاملات سے نہایت مفید اصول بھی اخذ کیے گئے ہیں۔

طبع جدید قیمت ۲۵ روپیے

"منیجر"

گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف
محمد بن جلال شاہی رضوی

از جناب عارف نوشاہی صاحب پاکستان

محمد بن جلال شاہی رضوی ہندوستانی مصنف ہیں، ان کی چند فارسی تصانیف دستیاب ہیں مگر خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے، انکی تصانیف کے مطالعہ سے یہ باتیں سامنے آئی ہیں:

الف ۔ وہ ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں بقید حیات تھے۔

ب ۔ انہیں شاہ عالم گجراتی (م ۸۸۰ھ) سے خاص ارادت تھی۔ نام کے ساتھ نسبت "شاہی" غالباً اسی وجہ سے ہے۔ شاہ عالم کو حضرت شاہیہ بھی کہتے ہیں۔

ج ۔ وہ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ جیساکہ ان کی کتاب دین المریدین میں "رباعی للمصنف" کے تحت یہ رباعی درج ہوئی ہے:

صوفی و خیال کشف و سطح و طامات ۔۔۔ درچلہ نشستن از برای طامات

مارا نبود مراد از خلوت و ذکر ۔۔۔ جز جلوۂ شاہ و بر محمد صلوات

تصانیف | اب تک اس مصنف کی حسب ذیل چار تصانیف سامنے آئی ہیں:

۱۔ چہل حکایت ۲۔ دین المریدین ۳۔ سوال و جواب ۴۔ احصار الاسمار۔

اول الذکر دو تصانیف کا مطالعہ راقم الحروف نے کیا ہے اور انہی کا حاصلِ مطالعہ یہاں پیش کرنا مقصود ہے باقی موخر الذکر دو کتابوں کا محض تعارف کیا جائے گا۔

<u>چہل حکایات</u> | اس کا مخطوطہ ۱۹۸۳ء میں حکیم سید ظہور اشرف دہلوی، کراچی کے ذاتی کتب خانے میں دیکھا تھا[۲] یہ چھوٹی تقطیع (۹ سطور فی صفحہ) کا اڑتالیس (۴۸) اوراق پر مبنی ہے جو روح اللہ بن شیخ منور بن شیخ محمد... زاہدی میرٹھی ثم ہانسوی ساکن صوبہ گجرات نے جمادی الاول ۱۱۳۳ھ میں کسی کاتب سے اپنے لیے کتابت کروایا تھا۔ روح اللہ مہاراجہ (اجیت) سنگھ اور نواب (ناہو) خان کا ملازم رہا ہے۔ نسخے کا پہلا ورق مفقود ہو چکا ہے اور پہلے سترہ اوراق اس قدر کرم خوردہ ہیں کہ بعض جملے اور الفاظ اب پڑھے نہیں جاتے اور ضایع ہو چکے ہیں۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ یہ نادر نسخہ مکمل طور پر ضایع ہو جائے گا۔ راقم الحروف نے فوراً اس کی ایک دستی نقل تیار کر لی اور آج دس سال بعد جب اس کتاب کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یہی نقل پیش نظر ہے۔

<u>محتویات</u> | چہل حکایت سید محمد عرف شاہ منجھن ملقب بہ شاہ عالم گجراتی (م ۸۸۰ھ) کے خوارق وکرامات پر مشتمل ہے۔ شاہ عالم سید برہان الدین عبداللہ ملقب قطب عالم گجراتی (م ۸۵۷ھ) کے فرزند اور شیخ احمد کھٹو کے تربیت یافتہ تھے ان کا مزار محلہ رسول آباد احمد آباد میں ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شاہ عالم کے بارے میں لکھا ہے "خوارق عادات از وی بسیار بہ وجود آمد" زیر نظر کتاب میں ان کے چالیس خوارق از ولادت تا وفات بہ عنوان "حکایت

درج ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت سے مصنف نے اسے چہل حکایت کا نام دیا ہے۔

ماخذ | مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے: "این رسالہ مسمّٰی بہ چہل حکایت در مناقب صاحب الولایۃ العظمی و وارث الکرامۃ الکبری سید محمد بن عبداللہ الملقب بہ شاہ عالم ... چنانکہ از ثقات مسموع شد نوشتہ آمد"۔ ان حکایت کے راویوں میں شاہ عالم کے بلا واسطہ اور بالواسطہ مریدین شامل ہیں اور مصنف نے اکثر حکایات کے راویوں کے نام اور ان کی مروی حکایتوں کی تعداد لکھی ہے ملاحظہ ہو:

راوی	حکایت	راوی	حکایت
قاضی کبیر الدین محمد	۵	ملک محمد بن دولت خواہ	۹
ملک محمد سلاح دار شاہ عالم	۱۱-۱۲-۱۳	ملک اسحاق	۱۴
زمانت الملک بن فضل اللہ بن قاضی بڈھ	۱۵	سید حیدر... عبداللطیف مخاطب داور الملک غازی	۱۷
ملک پیر محمد بن قاضی اسحاق	۱۸	قاضی عماد الدین	۱۹، ۲۰
ملک حاتم بن عالم	۲۱	شیخ محمود واعظ المعروف شیخ چکناں	۲۲
ملک ابو محمد	۲۳	ملک میراں جیو	۲۴
کبیر خاں بن احمد خاں	۲۵	لعل تیرہ واری	۲۶
میر سید کبیر	۲۷	کبیر الملک بن عماد الملک	۲۸
ملک... معین الدین بن مولانا حسین بن ہارون منطق	۲۹	میر سید صدر الدین بھکری	۳۰
شیخ جیو صاحب سجادۂ حضرت قطبیہ	۳۲	شمس الاتقیا شیخ قطب الدین محمود	۳۳، ۳۷
امیر سید خوند میر بن سید خان	۳۴	فتح خان بن نظام خان	۳۵
ملک محمد	۳۶	سید بڈھا دیپال پوری	۳۸
شیخ فضل اللہ کاشانی	۳۹	سلطان الواعظین شیخ غزنی	۴۰

چہل حکایت کی اہمیت | بنیادی طور پر یہ نویں صدی ہجری کے ایک بزرگ کے خوارق وکرامات کا تذکرہ ہے مگر بین السطور اس میں بہت سے تاریخی، معاشرتی اور علمی نکات بھی بیان ہو گئے ہیں، مثلاً پٹن (ہند) میں مولانا علی شیر کے مدرسے کا ذکر (حکایت ۶) ملک ... معین الدین بن مولانا حسین بن ہارون مشہور بہ منطقی مولفِ رسالہ "فصوص" (در علم کلام و منطق) کا اپنا یہ رسالہ لے کر شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہونا (حکایت ۲۹) اور ملک دولت شاہ جلوانی جامع "کنوز محمدی" کا تذکرہ (حکایت ۳۳)

برصغیر پاک و ہند کے صوفیہ کے ملفوظات اور مناقب پر مشتمل فارسی کتب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان میں صوفیہ کی زبان سے نکلے ہوئے مقامی زبانوں کے جملے بھی مل جاتے ہیں جن کا مطالعہ اردو زبان کی تکوین و تشکیل کے لیے بے حد ناگزیر ہے[۱] چہل حکایت میں گجراتی لہجے کے بعض الفاظ اور جملے موجود ہیں مثلاً:

۱۔ فرمودند میاں منجھا برو۔ فرزند میانہ را بہ لغت گجراتی اچھا منجھلا گویند۔ (حکایت ۸)

۲۔ خدای تعالیٰ ترا بہ من بخشید۔ بعد ازین اورا اقند دیا بگو (حکایت ۱۳)

۳۔ شاہ عالم ایشان را در حجرۂ مبارک خود برداشتہ بُردند بزبان گجراتی مناجات فرمودند کہ را جن بگرہ و ٹی بدل بگرہ نا ششا (حکایت ۸)

۴۔ قاضی نجم الدین بنبانی برکی از مقربان سلطان محمود بیگرہ حد شرعی زد و بر مزاج سلطان گران آمد، بہ قاضی گفت: نیچی بیری سب کو ئی جھورے[۲] یعنی درخت کنار کہ پست است دست ہمہ برو می رسد، شما بر زیردستان حکومت می فرمائید چرا بر باپ جیو یعنی شاہ عالم امر معروف و نہی منکر نمی کنید (حکایت ۱۶)

۵۔ بزبان گجراتی مناجات کردند کہ راجن جو تجھ نہیں ہوں رو ٹھا تو بجھ سادے توماٹوں (کذا) یعنی آقا و پادشاھا... تو رنجیدم مگر آنکہ خود خشنود سازی (حکایت ۴)

علاوہ ازیں بعض مفرد الفاظ مثلاً دکھن (حکایت ۱۷) پالکی (حکایت ۲۱) کٹاری (حکایت ۲۵) اور کھر بھل (حکایت ۳۴) بھی استعمال ہوئے ہیں۔

چہل حکایت شاہ عالم کے حالات و مناقب پر ایسا ماخذ ہے جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا۔

زین المریدین | محمد بن جلال شاہی رضوی کی اس تصنیف کا مخطوطہ کتابخانۂ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد میں بہ ذیل شمارہ ۱۶۹۱ محفوظ ہے۔[۴۲] یہ ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور نظر علی نے ۴ رجب ۱۲۶۵ھ کو ملتان میں کتابت کیا۔ راقم السطور نے یہ نسخہ ۱۹۹۲ء میں دیکھا جو صحیح و سالم حالت میں ہے۔

محتویات | یہ کتاب سالکوں اور مریدوں کے لیے ایک اخلاقی اور نظریاتی دستور العمل ہے۔ یعنی راہ سلوک میں قدم رکھنے والے مبتدیوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف نے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس نے یہ کتاب حضرت سید محمد گیسو دراز کی تصنیف "خاتمہ"[۴۳] (جو در حقیقت ابو النجیب عبد القاہر سہروردی کی تصنیف آداب المریدین کا تکملہ ہے) کے طرز و انداز پر لکھی ہے جو شاہ عالم گجراتی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔[۴۴]

اہمیت | جیسا کہ ہم نے لکھا یہ کتاب بنیادی طور پر سالکوں کے لیے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں بعض اہم اور دلچسپ "احکام" بیان ہوئے ہیں۔ علمی نقطۂ نظر سے وہ بے حد اہم ہیں جن میں سفارش کی گئی ہے کہ سالک کون سی کتب پڑھنے سے

احتراز کرے اور کون سی کتابیں پڑھے۔ مصنف نے مرشد کی اجازت کے بغیر وجودی صوفیہ کی تصانیف پڑھنے سے منع کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ترا باید کہ بی اذن پیر گرد مطالعہ کتب صوفیۂ وجودیہ نگردی، بسیاری را دیدہ شد کہ بہ مطالعۂ سخنان این طایفہ خرسند شدند و بہ آن تسکین ایشان شد و بر ہمان قرار ماندند، تصدیق معانی و تحقیق الفاظ آن را عین مقصود و محض توحید تصور کردند و دانستند کہ ھر چہ ہست ہمین است"[۱] ایک اور جگہ پھر تاکید کرتا ہے: "در ابتدا از نظر در کتب صوفیہ وجودیہ بجد محترز باشی، باید کہ مطالعہ منہاج العابدین[۱۱] و انیس التائبین[۱۲] و کشف المحجوب و خاتمۃ الآداب[۱۳] و امثال این از کتب مفیدہ لازم وقت خود سازی و مصباح الہدایۃ[۱۴] و مرصاد العباد[۱۵] و ہر چند کہ از رمز و غمز حقائق خالی نیستند اما در تحسین (کذا: تحصیل) ادب .... دخلی عظیم دارند"[۱۶]

مصنف مریدوں کو عربی زبان سمجھنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتا ہے: "در تعلم چندان کوشی کہ سخن عربی را فہم کنی و از کتب عربیۂ قوم قوت القلوب و احیاء علوم و عوارف المعارف و تعرف مضمون درست بیرون آری و اعراب ادعیہ و اوراد صحیح خوانی و در آشنای تلاوت معانی الفاظ قرآن را حدیث نفس گردانی و ہر روز قدری از سلوک سلف و سیر سلف صالح رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مطالعہ کنی"[۱۷]

ان مریدوں کے لیے جن کا دل مراقبے سے بھاگتا ہے اور پراگندہ رہتا ہے، مصنف نے شیخ سعدی، امیر خسرو اور حافظ کے دواوین کا مطالعہ تجویز کیا ہے، وہ کہتا ہے: "اگر چنین اتفاق افتد کہ دلت از مراقبہ رمیدہ است و ہیچ وجہ توجہی درست دست نمی دہد بہ دیوان شیخ سعدی و امیر خسرو نظری اندازی و بہ صحبت

این سہروردی و چشتی از شعرائے دیگر قناعت کنی و از ہر جا کہ بیان عشق و محبتی یابی و حکایت وفای و استقامتی مثنوی مثل قصۂ لیلیٰ مجنون گوش نہی و دیوان حافظ نیز فصلی از ہمین بایست [۱۸]

اس کتاب میں بھی شاہ عالم گجراتی کے بعض واقعات اور ان کے مریدوں کا تذکرہ ہے مثلاً حضرت گنج گیر گنج بخش (م ۹۴۹ھ = شہ عالم محمد ابقا باد) کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھانا [۱۹] سلطان غزنی شاہی کا سفر سلوک اور شاہ عالم سے تعلق [۲۰]، میاں مخدوم خلیفۂ شاہ عالم کا تذکرہ [۲۱] وغیرہ۔

ہندی فقرے بھی نقل ہوئے ہیں مثلاً

شیخ محمد فرزند قاضی العالم شاہی می فرمودند: جو جو ارے گا تو جمارے گا یعنی از تعالیٰ اگر ترا زندہ خواہد داشت گرسنہ نخواہد گذاشت۔

مصنف نے ہندی شعر اور ضرب المثل بھی نقل کی ہے [۲۲]

رسالۂ سوال و جواب | اس کا مخطوطہ ذخیرۂ آذر دانشگاہ پنجاب، لاہور میں بہ شمارہ ۱۲۵-H موجود ہے۔ یہ رسالہ ایک اور مجموعۂ رسائل میں مجلد ہے راقم الحروف نہیں دیکھ سکا۔ عزیز محترم خضر نوشاہی صاحب نے دیکھا ہے۔ اور اس کا احوال یوں لکھا ہے [۲۳]:

"ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ کو امیر کبیر سید بہوہ کی طرف سے محمد بن جلال شاہی رضوی کی طرف سے قاصد پہنچا جس نے امیر کا ایک خط انہیں دیا۔ اس خط میں سولہ [۱۶] سوالات کے جوابات طلب کیے گئے تھے، بعض سوالات یہ ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ سے شاہ عالم گجراتی تک پشت در پشت بزرگوں کے نام تاریخہائے ولادت و وفات۔

احتراز کرے اور کون سی کتابیں پڑھے۔ مصنف نے مرشد کی اجازت کے بغیر وجودی صوفیہ کی تصانیف پڑھنے سے منع کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "تو باید کہ بی اذن پیر گرد مطالعہ کتب صوفیۂ وجودیہ نگردی، بسیاری را دیدہ شد کہ بہ مطالعۂ سخنان این طایفہ خرسند شدند و بہ آن تسکین ایشان شد و بہ ہمان قرار ماندند، تصدیق معانی و تحقیق الفاظ آن را عین مقصود و محض توحید تصور کردند و دانستند کہ ھرچہ ہست ہمین است۔[۱۱۹]" ایک اور جگہ پھر تاکید کرتا ہے: "در ابتدا از نظر در کتب صوفیہ وجودیہ بجد محترز باشی، باید کہ مطالعہ منہاج العابدین[۱۲۰] وانیس التائبین[۱۲۱] وکشف المحجوب وخاتمۃ الآداب[۱۲۲] وامثال این از کتب مفیدہ لازم وقت خود سازی ومصباح الہدایۃ[۱۲۳] ومرصاد العباد[۱۲۴] و ہر چند کہ از رمز و غمز حقائق خالی نیستند اما در تحسین (کذا: تحصیل) ادب .... دخلی عظیم دارند۔[۱۲۵]"

مصنف مریدوں کو عربی زبان سمجھنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتا ہے: "در تعلم چندان کوشی کہ سخن عربی را فہم کنی واز کتب عربیۂ قوم قوت القلوب واحیاء علوم و عوارف المعارف وتعرف مضمون درست بیرون آری و اعراب ادعیہ و اوراد صحیح خوانی و در اثنای تلاوت معانی الفاظ قرآن را حدیث نفس گردانی و ہر روز قدری از سلوک سلف وسیر سلف صالح رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مطالعہ کنی۔[۱۲۶]"

ان مریدوں کے لیے جن کا دل مراقبے سے بھاگتا ہے اور پراگندہ رہتا ہے، مصنف نے شیخ سعدی، امیر خسرو اور حافظ کے دواوین کا مطالعہ تجویز کیا ہے، وہ کہتا ہے: "اگر چنین اتفاق افتد کہ دلت از مراقبہ رمیدہ است و ہیچ وجہ توجہی درست دست نمی دہد بہ دیوان شیخ سعدی وامیر خسرو نظری اندازی و بہ صحبت

این سہروردی و چشتی از شعرائے دیگر قناعت کنی واز ہر جاکہ بیان عشق و محبتی یابی و حکایت و ناہی و استقامتی شنوی مثل قصۂ لیلیٰ مجنون گوش نہی و دیوان حافظ نیز فصلی از ہمین بایست پڑھاوے[18]

اس کتاب میں بھی شاہ عالم گجراتی کے بعض واقعات اور ان کے مریدوں کا تذکرہ ہے مثلاً حضرت گنج گیر گنج بخش (م ۹۴۸ھ = شہ عالم محمد رابقا باد) کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھانا[19] سلطان غزنی شاہی کا سفر سلوک اور شاہ عالم سے تعلق[20]، میاں مخدوم خلیفۂ شاہ عالم کا تذکرہ[21] وغیرہ۔

ہندی فقرے بھی نقل ہوئے ہیں مثلاً

شیخ محمد فرزند قاضی العالم شاہی می فرمودند: جو جوارے گا تو جمارے گا یعنی از تعالیٰ اگر ترا زندہ خواہد داشت گرسنہ نخواہد گذاشت۔

مصنف نے ہندی شعر اور ضرب المثل بھی نقل کی ہے[22]

رسالۂ سوال و جواب | اس کا مخطوطہ ذخیرۂ آذر دانشگاہ پنجاب، لاہور میں بہ شمارہ ۱۲۵۔ H موجود ہے۔ یہ رسالہ ایک اور مجموعۂ رسائل میں مجلد ہے جسے راقم الحروف نہیں دیکھ سکا۔ عزیز محترم خضر نوشاہی صاحب نے دیکھا ہے۔ اور اس کا احوال یوں لکھا ہے[23]:

"ذلیقعدہ ۱۰۴۲ھ کو امیر کبیر سید بہوہ کی طرف سے محمد بن جلال شاہی رضوی کی طرف سے قاصد پہنچا جس نے امیر کا ایک خط انہیں دیا۔ اس خط میں سولہ[16] سوالات کے جوابات طلب کیے گئے تھے، بعض سوالات یہ ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ سے شاہ عالم گجراتی تک پشت در پشت بزرگوں کے نام تاریخہائے ولادت و وفات۔

۲۔ سید جلال اعظم کس سال اُچ پہنچے ؟

۳۔ سید جلال الدین اعظم نے غوث العالم مخدوم شیخ بہاء الدین کی صحبت میں کتنے سال گذارے ؟

۴۔ حضرت مخدوم جہانیاں کتنی بار مکہ معظمہ تشریف لے گئے ؟

۵۔ اس قطب کا کیا نام ہے جس نے حضرت مخدوم جہانیاں کے حالات پر رسالہ لکھا؟

۱۰۔ (مخدوم جہانیاں جہانگشت کے ملفوظات) جامع العلوم میں لکھا ہے کہ کھانے پینے کی بعض اشیا جو از روے شریعت حرام ہیں بعض اوقات خدا کی طرف سے [مخدوم جہانیاں پر] حلال ہو جاتی تھیں، اس بات کی کیا توجیہہ ہے ؟

۱۶۔ شیخ احمد سرہندی نے بعض باتیں ادب سے دور تحریر کی ہیں ان کی کیا توجیہہ کی جائے گی ؟[۳۲]

محمد بن جلال نے ان سوالات کے جوابات لکھے ہیں۔ سبھی سوال اہم ہیں اور بالخصوص مخدوم جہانیاں جہانگشت اُچی (م ۷۸۵ھ) کے حالات کے سلسلے میں مفید ہیں۔ آخری سوال جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) سے متعلق ہے اس نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ حضرت مجدد کے بعض نظریات اور مقامات سے اختلاف کا جو سلسلہ ان کی زندگی ہی میں چل نکلا تھا یہ بھی تقریباً اسی سلسلے کی کڑی ہے اور ایک معاصرانہ رائے ہے۔ چونکہ اصل رسالہ راقم السطور کے پیش نظر نہیں ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ سائل نے کن باتوں کو "از ادب دور" اور "سخن ہائے فضول" سمجھا ہے اور محمد بن جلال نے اس کا کیا جواب دیا ہے۔ امید ہے ہمارے فاضل دوست جناب محمد اقبال مجددی اس کا تعاقب کریں گے۔

احصاء الاسماء | اس کا مخطوطہ ۲۶ اوراق پر مشتمل عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک (ہند) میں ہے۔ مصنف نے میر حسین میبدی کی کتاب فواتح وغیرہ سے اقتباس کرکے اسمائے حسنیٰ کی تفصیل مع خواص و فضائل و معارف بیان کی ہے۔[۱۵]

حواشی

[۱] دین المریدین، قلمی، گنج بخش، اسلام آباد، شمارہ ۱۹۶۱، ص ۱۰۔ [۲] یہ کتب خانہ ان کے گھر ۸۱ ایف، بلاک ۲، سوسائٹی میں موجود تھا۔ تقریباً ایک سو مخطوطات کی فہرست میں نے تیار کی تھی۔ زیادہ تر طبی کتب تھیں۔ حکیم صاحب یہ تمام مخطوطات اپنے سینے کے ساتھ لگا کر ہندوستان سے ہجرت کے وقت اپنے ساتھ لائے تھے اور جیسے تیسے اب تک سنبھالے ہوئے تھے مگر حکیم صاحب کی پیرانہ سالی اور اخلاف کی عدم دلچسپی کے باعث یہ ذخیرہ تباہی کے دھانے پہ پہنچ چکا تھا۔ ایک الماری صرف متفرق قلمی اوراق سے بھری پڑی تھی جو کتابوں سے الگ ہو چکے تھے۔ ایسے کتنے ہی نوادر ہماری حکومتوں کی غفلت کے باعث ضایع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں [۳] عبدالحق دہلوی، اخبار الاخیار، عکسی اشاعت گمبٹ ضلع خیرپور، ۱۶۱-۱۶۲، نیز دیکھئے محمد غوثی شطاری مانڈوی، گلزار ابرار (اردو ترجمہ اذکار ابرار از فضل احمد جیوری) عکسی اشاعت، لاہور ۱۳۹۵ھ، ص ۱۶۰۔ [۴] ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو، جلد اول میں ایسے کئی نمونے پیش کیے ہیں [۵] جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، طبع لاہور، ۱۹۷۵ء، ج ۱ ص ۹۷، یہی جملہ بحوالہ خاتمۂ مرآۃ احمدی (بعد از ۱۱۷۴ھ) ص ۴۰ درج ہوا ہے [۶] تاریخ ادب اردو ج ۱ ص ۹۸ میں یہ جملہ بحوالہ مرآۃ سکندری (تصنیف ۱۰۲۰ھ) ص ۱۱۱ نقل ہوا ہے [۷] احمد منزوی، فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ گنج بخش، طبع اسلام آباد، ج ۲ ص ۹۲۴ میں پہلی بار یہ نسخہ متعارف ہوا۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ احمد منزوی نے فہرست

مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان ج ۳ ص ۳۶۲۴ اور ج ۱۱ ص ۳۳ ۸۴ پر محمد بن جلال شاہی کو نویں صدی ہجری کی شخصیت بتایا ہے جو سراسر غلط ہے حالانکہ ج ۱۱ ص ۴۹ ۸ پر وہ محمد بن جلال کی تصنیف رسالہ سوال و جواب کا سال تالیف ۴۲ ۱۰ھ لکھتے ہیں ۸؎ خاتمۂ حضرت گیسو دراز باہتمام سید عطا حسین، حیدر آباد دکن سے شایع ہو چکا ہے ۹؎ "این چند کلمہ بر سنن خاتمہ کہ آخر مصنفات قدوۃ السادات خدمت خواجہ صاحب راز خاتم خواجگان چشت امیر سید محمد گیسو دراز است و حضرت خاتم المحبوبین سید محمد بن عبداللہ الملقب بہ شاہ عالم من عند اللہ آن را با خود می داشتند، از خامۂ خام بیرون داد و دین المریدین نام نہاد" مقدمۂ دین المریدین، خطی، گنج بخش ۱۰؎ دین المریدین، ص ۲۱-۲۲ ۱۱؎ امام غزالی کی تصنیف ہے۔ ۱۲؎ شیخ احمد جام ژندہ پیل کی تصنیف ہے۔ تہران سے طبع ہو چکی ہے ۱۳؎ مراد گیسو دراز کا خاتمہ آداب المریدین ہے ۱۴؎ عزیز الدین محمود نطنزی (م ۳۵ ۷ھ) کی تصنیف ہے تہران سے طبع ہو چکی ہے ۱۵؎ نجم الدین دایہ رازی (م ۶۵۴ھ) کی تصنیف ہے۔ تہران سے چھپ چکی ہے ۱۶؎ دین المریدین، ص ۶۰ ۱۷؎ ایضاً ص ۱۷-۱۸ ۱۸؎ ایضاً ص ۴۸-۴۹ ۱۹؎ ایضاً ص ۱۵-۱۶ ۲۰؎ ایضاً ص ۲۳-۲۴ ۲۱؎ ایضاً ص ۳۲ ۲۲؎ ایضاً ص ۴۶، ۵۲ ۲۳؎ خضر عباسی نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانہ دانشگاہ پنجاب لاہور، گنجینۂ آذر، طبع لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۳۵۴ ۲۴؎ مسائل کی اصل عبارت یہ ہے: "احوال میاں شیخ احمد سرہندی کہ در سلسلہ نقشبندیہ بودند بہ سمع عالی رسیدہ خواہد بود۔ بعضی حرف از ادب دور و سخن ہای فضول در قید کتابت در آوردہ اند ... بہ چہ وجہ نوشتہ باشد"؟ ۲۵؎ محمد عمران خان، خزینۃ المخطوطات، طبع ٹونک، ۱۹۸۴ء، ج ۳ ص ۶۸۔

شیخ علی اصغر قنوجیؒ کی چند دستیاب شدہ تصنیفات

از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی

ماہ اگست کے معارف میں جناب محمد عارف اعظمی عمری کا ایک گراں قدر مقالہ بعنوان "بارہویں صدی ہجری کے دو اودھی مفسرین" مولانا شیخ غلام نقشبند لکھنویؒ اور شیخ علی اصغر قنوجیؒ نظر سے گذرا۔ وہ اس کاوش پر تحسین و تشکر کے سزاوار ہیں۔ شیخ علی اصغر قنوجی کے حال میں انھوں نے درست لکھا کہ ان کا کوئی شعری مجموعہ دستیاب نہیں ہے۔ پروفیسر محمد سالم قدوائی صدر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی صرف تفسیر سے متعلق ان کی تصنیف ثواقب التنزیل فی اثارۃ التاویل کا پتہ چل سکا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی اور مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبان نے بھی ان کی بقیہ تصانیف کے صرف اسماء پر اکتفا کی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد مرحوم نے بھی اپنی تحقیقی کاوش "THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE" میں ان کی کسی تصنیف کی موجودگی کا کسی لائبریری میں تذکرہ نہیں کیا۔ حسن اتفاق سے راقم الحروف کو قنوجی کی چھ تصانیف کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے۔ انکے یہ چھ مصنفات کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔ قارئین معارف کے ملاحظہ کے لیے یہ چند سطور قلم بندکی جارہی ہیں۔

شیخ علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۰ھ/۲۷-۱۷۲۶ء) کی تصنیف جوامع الکلم شرح فصوص الحکم کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

۱۔ تبصرۃ المدارج:۔ اس مخطوطہ میں کل ۸۴ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں سترہ سطریں ہیں۔ خط نستعلیق و شکست ہے کاتب کا نام درج نہیں ہے مگر پہلے ہی صفحہ پر عبدالباسط بن رستم علی بن شیخ علی اصغر صدیقی قنوجی کی مہر ہے جس کے نیچے ان ہی کی تحریر ہے

المالک ھو اللہ سبحانہ لکنہ بفضلہ اعطی التصرف لعبدہ کالضعیف عبدالباسط بن رستم علی بن علی اصغر القنوجی۔

ابتدا اس طرح کی ہے۔

سبحان من ستر الحقیقۃ الکاملۃ باظہار الخصوصیۃ الشاملۃ ....

حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ پیر محمد لکھنویؒ کی مدح و منقبت کی ہے۔

اس کے بعد رسالہ کی غرض و غایت، وجہ تسمیہ، اس کے محتویات و مشمولات کے بیان کے بعد سالک کے لیے لازمی امور کا تذکرہ ہے۔ ابداوال اخذ فیض، تشکر، مقام توبہ، صبر، زہد، سلوک کے فوائد، تواضع، توکل، رضا، محبت حیا، شوق، انس، خوف، رجاء، فقر، وصل اور دوسرے مقامات و کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد سالک کو راہ سلوک اور کرامات کے مقام پر پہنچنے پر جو شیطانی وسوسے اور خیالات آتے ہیں ان کا بیان ہے آخری عبارت یہ ہے:

ھذا ما تیسر لنا بمقتضی الحال ولم یمل علی نفسی فیہ الی فتق المقال

لئلا یقتضی الی الملال .... أسئله ان ینفعنا وایاك به فانه
الیه المرجع والمآب۔

۲۔ اللطائف العلیه فی المعارف الالٰهیه :۔ یہ مخطوطہ دو سو بائیس[۲۲۲] صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ صفحہ اول پر عبدالباسط قنوجی کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ان کی ملک رہا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ نسخہ بخط مؤلف ہے۔ صفحہ اول پر ۱۱۳۰ھ مرقوم ہے۔ یہ تصنیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) کی مشہور زمانہ، معرکۃ الآراء تصنیف "فصوص الحکم" کے طرز پر ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور ایک مقدمہ و خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ابتدا اس طرح ہے :

الحمد لله الذی خلقکم وما تعملون عالم الغیب والشهادة فتعالیٰ عمایشرکون به ......

مقدمہ میں سالکین کے لیے مقامات سلوک اور احوال کے سلسلہ میں جن رموز و نکات اور تنبیہات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بیان ہے۔ پہلے باب میں وجود باری اور اس سے متعلق مباحث کا بیان ہے دوسرا باب ایجاد عالم کے سلسلہ میں اور تیسرا و چوتھا تنزلات و تنزیہات کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب کو بھی تقسیم کیا ہے مثلاً تیسرے باب کا پہلا حصہ تنزلات کے وجودی مراتب کے بارے میں اور دوسرا وجود امکانی کے مراتب کے سلسلہ میں ہیں۔ خاتمہ کتاب میں ان تمام "لطائف" کا بیان ہے جنکا تعلق "نشأۃ اخرویۃ" سے ہے۔

کتاب کی آخری عبارت یہ ہے :

شیخ علی اصغر قنوجی (م ۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء) کی تصنیف جوامع الکلم شرح فصوص الحکم کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

۱۔ تبصرۃ المدارج :۔ اس مخطوطہ میں کل ۸۴ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں سترہ سطریں ہیں۔ خط نستعلیق و شکست ہے کاتب کا نام درج نہیں ہے مگر پہلے ہی صفحہ پر عبدالباسط بن رستم علی بن شیخ علی اصغر صدیقی قنوجی کی مہر ہے جس کے نیچے ان ہی کی تحریر ہے

المالك هو الله سبحانه لكنه بفضله اعطى التصرف لعبد كالضعيف عبد الباسط بن رستم علی بن علی اصغر القنوجی۔

ابتدا اس طرح کی ہے۔

سبحان من ستر الحقيقة الكاملة باظهار الخصوصية الشاملة ....

حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ پیر محمد لکھنویؒ کی مدح و منقبت کی ہے۔

اس کے بعد رسالہ کی غرض و غایت، وجہ تسمیہ، اس کے محتویات و مشمولات کے بیان کے بعد سالک کے لیے لازمی امور کا تذکرہ ہے۔ ابتدا اخذ فیض، تشکر، مقام توبہ، صبر، زہد، بھوک کے فوائد، تواضع، توکل، رضا، محبت، حیا، شوق، انس، خوف، رجاء، فقر، وصل اور دوسرے مقامات و کیفیات کا ذکر کرنے کے بعد سالک کو راہ سلوک اور کرامات کے مقام پر پہنچنے پر جو شیطانی وسوسے اور خیالات آتے ہیں ان کا بیان ہے آخری عبارت یہ ہے :

هذا ما تيسر لنا بمقتضى الحال ولم يمل على نفسي فيه الى فتق المقال

لئلا یقتضی الی الملال .... أسئلہ ان ینفعنا وایاک بہ فانہ الیہ المرجع والمآب۔

۲۔ اللطائف العلیہ فی المعارف الالٰہیہ :۔ یہ مخطوطہ دو سو بائیس[۲۲۲] صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ صفحہ اول پر عبدالباسط قنوجی کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ان کی ملک رہا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ یہ نسخہ بخط مولف ہے۔ صفحہ اول پر سنہ ۱۱۳۰ھ مرقوم ہے۔ یہ تصنیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (م ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) کی مشہور زمانہ، معرکۃ الآرا تصنیف "فصوص الحکم" کے طرز پر ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور ایک مقدمہ و خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ابتدا اس طرح ہے :

الحمد للہ الذی خلقکم وما تعملون عالم الغیب والشہادۃ فتعالیٰ عما یشرکون بہ ......

مقدمہ میں سالکین کے لیے مقامات سلوک اور احوال کے سلسلہ میں جن رموز و نکات اور تنبیہات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بیان ہے۔ پہلے باب میں وجود باری اور اس سے متعلق مباحث کا بیان ہے دوسرا باب ایجاد عالم کے سلسلہ میں اور تیسرا و چوتھا تنزلات و تنزیہات کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب کو بھی تقسیم کیا ہے مثلاً تیسرے باب کا پہلا حصہ تنزلات کے وجودی مراتب کے بارے میں اور دوسرا وجود امکانی کے مراتب کے سلسلہ میں ہیں۔ خاتمہ کتاب میں ان تمام "لطائف" کا بیان ہے جنکا تعلق "نشأۃ اخرویہ" سے ہے۔

کتاب کی آخری عبارت یہ ہے :

احیانا اللہ علی ملتہم واماتنا علی سیرتہم واحشرنا فی زمرتہم واجعلنا منہم ومعہم وممن احبہم واتبعہم۔

۳۔ القصیدۃ النعتیہ :۔ یہ عربی نعتیہ قصیدہ نواشی اشعار پر مشتمل ہے۔ جابجا فارسی میں حواشی بھی ہیں۔ صفحہ اول پر بالترتیب تین مہریں عبدالباسط بن رستم علی قنوجی، رستم علی بن علی اصغر قنوجی ۱۱۳۱ھ، علی اصغر بن عبدالصمد قنوجی ۱۱۰۱ھ ہیں۔ چوتھی مہر "یا باسط" ہے اس کے نیچے "مالک ایں کتاب عبدالباسط" لکھا ہے نیز عبدالباسط قنوجی کی تحریر ہے "نسخۂ قصائد تصنیف ملا علی اصغر قنوجی" اس تحریر کے زیریں حسب سابق یہ عبارت مرقوم ہے "المالک ھو اللہ سبحانہ لکنہ بفضلہ ...."

قصیدہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

یامظہر الاسم الاتم یامصدرا لوصف الاسم	ترجی برؤیتک الھدی تمحی بہ رحمتک الظلم
بیدیک اسقاط التعب ولدیک من ملح الادب	لبیک من اھل العرب سعدیک من اھل العجم
انت النبی المصطفیٰ انت الامین المقتدیٰ	بدر الدجیٰ صدر العلیٰ لیث الوغیٰ غیث الکرم

آخری اشعار یہ ہیں :

انوار اعلام الھدایۃ تھتدی بجنابہم	کل عرانین العرب کل صنادید العجم
کانوا بحار الفضائل والمعارف جمۃ	استخرجت منھا اللاٰلی الحقایق والحکم

۴۔ القصیدۃ المیمنیۃ فی النفحۃ المحمدیہ :۔ اکسٹھ صفحات پر مشتمل اس قصیدہ میں ایک سو تراسی اشعار ہیں۔ حواشی پران اشعار کے مشکل اشعار کی تشریح وتوضیح ہے۔ اس قصیدہ کا خط بھی مذکورہ بالا قصیدہ جیسا ہے۔ اشعار

تصوف کے رنگ میں ہے۔ ان پر لکھے ہوئے حواشی عربی میں ہیں:

تف خلیلی بالمطایا نا و تلقاء الحمیٰ — ان تری لیھا القباب الحمر عس ج لعلعا

ان وجدت الوقت بین من حقایق قلبیہ — بالتادب فی مقام العطف من حسن الادا

فی الحقیقۃ لیس لی من عاذل فی حبھا — انھا معشوقۃ کالشمس فی بسط الضیا

نعتیہ اشعار کے بعد عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر القرون ہونے اور صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب کا بیان ہے:

اسعد الازمان فی الدنیا قرون الانبیا — سیما القرن الذی فیہ محمد مصطفیٰؐ

حبذا عھد الصحابۃ انھم خیر الوریٰ — حبذا من کان فی عھد النبی المصطفیٰؐ

آخری شعر یہ ہے:

قال اصحابی لکم مثل النجوم بایھم — اقتدیتم اھتدیتم کلھم عین الھدیٰ

۵۔ ایک تیسرا قصیدہ اسی ضمن میں ایک سو اٹھاون اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ مذکورہ بالا دونوں قصائد کے ساتھ مجلد ہے۔ تینوں قصائد کا خط یکساں اور نستعلیق ہے۔ قیاس یہی ہے کہ یہ نسخہ بھی بخط شاعر (مصنف) ہے۔

اشعار میں اخلاص و نیازمندی، تصوف کے حقائق و معارف، رموز و نکات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں نعتیہ اشعار، عشق و محبت رسولؐ جو تصوف اور ارباب تصوف کے لیے لابدی ہیں۔ ان سب کا بیان ہے۔ حاشیہ پر جابجا مشکل الفاظ اور اصطلاحات کی تشریح و توضیح بھی کی ہے۔

ابتدائی اشعار یہ ہیں:

احمد اللہ الموفق للمحبۃ والرضا — احمد اللہ المقدر وجھہ ما فی القضا

الحکیم المظہر الاسما بوجہ اقتضیٰ　　القدیر الواھب الاشیاء ما فی عینھا

لا یودی حمدہ التشبیہ والتنزیہ لا　　حمدہ ما قال خیر الخلق لا احصی ثنا

بعض اشعار پر حواشی بھی لکھے ہیں :

قصیدہ کا یہ آخری شعر سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے :

سلموا یا قوم صلوا علی خیر الوریٰ　　رحمۃ للعلمین ماجاء الا مصطفیٰ

۶۔ النفائس العلیۃ فی کشف استار المھیمنیہ :۔ یہ "القصیدۃ المھیمنیہ فی النفحۃ المحمدیۃ" کی شرح ہے جو ایک سو چونتیس (۱۳۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اپنے بعض اشعار کی شرح بہت تفصیل و بسط سے کی ہے اور بعض اشعار میں اختصار کو پیش نظر رکھا ہے۔ صرف مطلع کی شرح تین صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ بخط نستعلیق و شکست ہے۔

صفحہ اول پر حسب سابق ۳ مہریں ہیں۔ عبدالباسط قنوجی کی مہر کے نیچے ان کی تحریر ہے۔ شرح کی ابتدا اس طرح ہے :

منہ مابدأ ما نظم فی عقد القدیر القضاء ما من دابۃ الا ھو اخذ بناصیتھا طوبیٰ لمھدی منھم السالکین من خزائنہ الجود والھدیٰ سیما نبینا و رسولنا محمد المصطفیٰ المخصوص بقرب قاب قوسین او ادنیٰ ... و بعد فیقول العبد المفتقر الی اللہ الغنی علی اصغر بن عبدالصمد القنوجی البکری الکسائی الخ

بعض اشعار کی تشریح میں اختصار کو بھی مدنظر رکھا ہے مثلاً صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب میں آخری دو اشعار کی تشریح اس طرح کی ہے۔

قال اصحابی لکم مثل النجوم بایھم　　اقتدیتم اھتدیتم کلھم عین الھدیٰ

انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم ویتحد والھدیٰ مصدر کالتقی اطلق علیھم مبالغۃ الخ۔

رسالہ "مخزن" (لاہور)

از جناب جاوید اختر صاحب

گو اردو میں صحافت کا آغاز انیسویں صدی کے ربع اول میں ہوا لیکن نصف اول تک اخباروں کی تعداد بہت کم تھی، اس زمانہ کے اخبار سیاسی کم اور مذہبی و سماجی زیادہ تھے جو مختلف انداز میں معاشرتی اصلاح کر رہے تھے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد صحافت نے کروٹ بدلی۔ ایک طرف غدر کی خونچکاں داستان کا بےباکی کیساتھ برملا اظہار کیا اور دوسری طرف تحریک آزادی کی چنگاری کو بے خوف و خطر ہوا دی۔ اس سلسلے میں کئی اخبار اور پریس کے مالک گرفتار ہوئے اور انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ بعض کی پھانسی بھی ہوئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کی اردو صحافت

۱۸۵۷ء کا انقلاب اہل ہند کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے ایک دھماکہ ثابت ہوا۔ جس نے جمود و تعطل کو ختم کر کے ان کے ذہنوں کو بیدار کر دیا۔ اس زمانے میں مسلمان ہر اعتبار سے پست، کمزور اور انگریزوں کے معتوب ہو گئے تھے۔ ان کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ لیکن اسی پُر آشوب دور میں سر سید نمودار ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مختلف طریقہ کار اپنائے۔ تعلیمی کمیٹیوں کا انعقاد، مدارس کھولنے کا اہتمام، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی بنیاد اور "تہذیب الاخلاق" کا اجرا وغیرہ۔ "تہذیب الاخلاق"

کا مقصد قوم کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی اصلاح تھا۔ اس کی بدولت اردو میں علمی و ادبی صحافت کی بنیاد پڑی اور اس کے نثری سرمایہ میں وسعت و تنوع پیدا ہوا۔

مزاحیہ صحافت نے "اودھ پنچ" (ہفتہ وار۔ اجراء ۱۶ جولائی ۱۸۷۷ء بمقام لکھنؤ) کی شکل میں آنکھ کھولی۔ اس کے بعد صحافت کی دنیا میں "پنچوں" کا سیلاب امڈ پڑا جس کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد "فتنہ" (ہفتہ وار۔ اجراء ۸ جولائی ۱۸۸۳ء) اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ افقِ صحافت پر طلوع ہوا اور اس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ "فتنہ" کی تقلید میں ایک بار پھر مزاحیہ اخباروں کا دھارا تیز ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے مزاحیہ صحافت کا بڑا رواج ہو گیا۔ نادم سیتاپوری لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان بھر میں مزاحیہ اخبارات کی تعداد پچاس سے اوپر پہنچ چکی تھی۔"[۱]

اردو کی علمی و ادبی صحافت میں "تہذیب الاخلاق" کے بعد "دلگداز" (۱۸۸۷ء لکھنؤ) "معارف" (۱۸۹۸ء۔ علی گڑھ ثم پانی پت) اور "ادیب" (۱۸۹۹ء۔ فیروز آباد) نے آگے چل کر وسعت و اضافہ کیا۔ ان رسائل نے خالص علم و ادب کی ترویج و اشاعت کی۔ فلسفہ، تاریخ، اخلاق، طب، ادب وغیرہ موضوعات کو اختیار کر کے اردو نثر میں تنوع پیدا کیا۔ لیکن "دلگداز" کے علاوہ سب کی چمک دمک دو چار سال سے زیادہ نہیں رہی۔

مزاحیہ اور علمی و ادبی صحافت کے علاوہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں گلدستوں کے اجراء سے شعری ادب میں اضافہ ہوا۔ بڑی تعداد میں گلدستے نکلے۔

دلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ کا کیا ذکر انکے ملحقات سے بھی گلدستے آسمان صحافت پر تاروں کی مانند چمک رہے تھے" تاریخ صحافت اردو" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں گلدستوں اور طرحی رسالوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد ہو گئی تھی۔

۱۸۶۵ء میں پہلی بار اردو اور ہندی کا تفرقہ شروع ہوا جو بڑھتا ہی گیا اور اس کے نتیجہ میں:۔

• ۱۸۹۹ء میں ہندی زبان کے حامی ہندوؤں نے بے شمار دستخطوں کے ساتھ ایک محضر نامے کے ذریعہ اینٹونی میکڈانل سے مطالبہ کیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی کو رائج کیا جائے۔ اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں یو پی کی عدالتوں میں ہندی رسم الخط جاری کر دیا۔[۲]

رسالہ مخزن کے اجرا کا سبب | محسن الملک نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں اس کے خلاف احتجاج کیا اور کامیاب جلسے کیے۔ اگست ۱۹۰۰ء میں جب لکھنؤ میں جلسہ منعقد ہوا تو پنجاب کی نمائندگی غلام بھیک نیرنگ، شیخ محمد اقبال اور شیخ عبدالقادر نے کی۔ ان لوگوں نے اردو کی تائید و حمایت میں تقریریں کیں۔ جلسہ کے بعد شیخ عبدالقادر نے لکھنؤ کی سیر کی۔ ان کے اعزاز میں بعض مخصوص نشستیں بھی ہوئیں جن میں بہت سے شعراء نے اظہار تعلی کرتے ہوئے ایسے اشعار کہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کے اصل مالک اہل دہلی اور اہل لکھنؤ ہی ہیں۔ دوسرے علاقوں کے افراد کی اردو دانی ان ہی سے مستعار ہے۔ شیخ عبدالقادر نے اسے محسوس کر کے لکھنؤ میں ہی یہ فیصلہ کیا کہ ایسا رسالہ جاری کریں جو مذہبی، سیاسی اور ادبی بحثوں اور مناقشوں سے علیحدہ ہو کر

صرف صحت مند اور تعمیری ادب کی ترویج و ترقی کو اپنا اولین فرض سمجھے چنانچہ لاہور واپس آنے کے بعد اس ارادہ کو عملی جامہ پہنایا اور اپریل ۱۹۰۱ء میں "مخزن" نام کا رسالہ اپنی تمام ظاہری و معنوی خوبیوں کے ساتھ آسمانِ صحافت پر طلوع ہوا۔ رسالہ کے نام کی بابت شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"اس رسالہ کا نام انگریزی لفظ "میگزین" کا صحیح ترجمہ ہے اور گو "میگزین" بھی اردو میں سمجھا جاتا ہے مگر جب "میگزین" اصل میں عربی لفظ "مخزن" سے مشتق ہے تو کیوں ہم "مخزن" کو ان معنوں میں استعمال نہ کریں"[۱]

مخزن کے اصول و مقاصد "مخزن" نے بیسویں صدی کے آغاز میں شایع ہونے والے رسائل میں بہت جلد اپنا ممتاز مقام بنا لیا۔ اسکی معتدل ادبی حیثیت نے اہلِ ادب کو اپنا گرویدہ بنالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاص و عام میں مشہور و مقبول ہوگیا۔ دوسرے رسائل کی طرح "مخزن" نے بھی اپنے اصول و ضوابط مرتب کیے اور مقاصد پیش کیے۔ پہلے ہی شمارہ میں "بناوٹ اور سادگی" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون میں بناوٹ اور تکلف کی سحر کاری میں ملوث سماج پر طنز کرتے ہوئے اس کے نقصانات کی وضاحت کی ہے اور خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ ساتھ ہی سر سید اور ان کے رفیقوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے منثور و منظوم ادب پاروں کی خوبی و تعریف اور اردو ادب کی جملہ اصناف نثر و نظم میں موجود تصنع اور آورد کی تاریخ و روایت کا احاطہ کرتے ہوئے اس کی ناگفتہ بہ حالت پر افسوس کیا ہے۔ بعد میں لکھتے ہیں:

"ہم آج سادگی کی اصل و نفریبیوں کے قدر دانوں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اگر سادگی اور بناوٹ کی جنگ دیکھنا ہے تو ہمارے پاس آئیں اور "مخزن" کے صفوں میں

دیکھیں۔ بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور ہو سکتا ہے اس کو اپنے دلداروں کی تعداد کا گھمنڈ ہے اور بجا ہے مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اور درست ہے اور سب سے بڑی تسلی اسے یہ ہے کہ زمانہ کی رفتار اس کے موافق ہے۔ یہ نیا مذاق بہت کچھ "تہذیب الاخلاق" کے نامور ایڈیٹر اور ان کے ہمراہیوں اور "حسن" کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ .... ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ موجودہ علمی رسالوں کی تعداد میں ایک رسالہ زیادہ کرتے ہوئے اپنا رنگ جہاں تک ممکن ہو سب سے جدا رکھیں۔[۲۲]

"مخزن" اول تا آخر مذکورہ مقصد کو پورا کرتا رہا، معنوی اعتبار سے رسالہ کی نثر و نظم کے مندرجات میں جو اصلیت اور سادگی ملتی ہے وہ عصری رسائل میں نظر نہیں آتی ہے، باوجود علمی موضوعات مثلاً فلسفہ، اخلاق، سائنس، معاشرت وغیرہ کے اس کی نثر ثقیل الفاظ اور پیچیدہ اسلوب سے معرّا ہوتی تھی۔ عام فہم انداز میں علمی مباحث پیش کرنا "مخزن" کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے شعر و ادب سے لے کر مختلف علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

"اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شایع ہو کر داخل کورس ہوئے۔"[۲۳]

"مخزن" نے جب بزم صحافت میں قدم رکھا تو معاصر اخبارات و رسائل نے اسکا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ "ٹریبیون" (لاہور)، "پیسہ" (لاہور)، "وطن" (لاہور)، "سول اینڈ ملٹری نیوز" (لدھیانہ)، "چودھویں صدی" (راولپنڈی)، "اتفاق" (ساڈھورہ)، "اپنچ" (بانکی پور)، "پنجاب گزٹ" (سیالکوٹ)، "شمیم ہند" (جالندھر) "سیالکوٹ پیپر"

(سیالکوٹ) وغیرہ اخبارات نے "مخزن" کی تعریف و توصیف کی۔ ان کے علاوہ معاصر رسائل "دلگداز" (لکھنؤ)، "معارف" (پانی پت)، "زبان" (دہلی)، "جلوۂ محبوب" (حیدرآباد دکن)، "بھارت پرتاپ" (جھجھر) اور انگریزی رسالہ "کائستھ سماچار" (الٰہ آباد) وغیرہ نے بھی "مخزن" کا استقبال کیا اور ان کے مریدوں نے اپنے اپنے رسالوں میں اس کی خوبیاں بیان کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "مخزن" نے اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے عصری رسائل میں ایک منفرد و ممتاز مقام پیدا کر لیا تھا۔ بہزاد نے لکھا ہے:

"ادیب" (فیروز آباد) کے بعد سب سے اچھا رسالہ لاہور سے شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں "مخزن" نکلا۔ جس نے اپنے مضامین و حسن ترتیب کی وجہ سے بہت جلد ہر دلعزیزی و شہرت حاصل کر لی اور جس قدر اشاعت اس رسالہ کی ہوئی۔ ہمارا خیال ہے کہ سوائے "دلگداز" (لکھنو) کے اور کسی رسالہ کو آج تک نصیب نہ ہو سکی ہے۔"

"مدیر 'مخزن' نے رسالہ کے دوسرے شمارہ میں اس کی خصوصیات لکھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مخزن" صرف ایک ادبی رسالہ ہی نہیں تھا بلکہ اس کے بانی اور رفقائے کار اسے تحریک کی شکل دینے میں سعی و محنت کر رہے تھے۔ "مخزن" کی خصوصیات اس کے مدیر کی زبانی ملاحظہ ہوں:

"اول: انگریزی مضمون نگاری کی دلچسپیاں اپنی زبان میں پیدا کرنا مگر ایسی نزاکت سے کہ پرانے مذاق کو ناگوار نہ ہو اور حتی الوسع اردو انشا پردازی کے اصولوں میں کسی سے انحراف نہ ہو۔

دوم :۔ اس کے مضامین بالعموم ایسے ہوں گے جو کسی ایک مذہب و ملت کے مذاق تک محدود نہ ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا جائے گا۔

سوم :۔ فن تقریر و فصاحت جو اس زمانہ میں مغرب میں بہ حیثیت فن سیکھا اور سکھایا جاتا ہے، ہندوستان میں رواج دینا تاکہ ہندوستان کے ایسے مقرر جن کو قدرت نے قوت بیانیہ اور جوش و اثر عطا کیا ہے۔ فصاحت کی نئی معلومات سے فائدہ اٹھائیں۔

چہارم :۔ انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے، اخلاقی نظمیں اور پرانے رنگ کی نظم کے انتخاب اس میں جمع کیے جائیں گے۔"

ان خصوصیات کو "مخزن" نے ابتدا ہی سے نبھانا شروع کیا اور جب تک شیخ عبدالقادر رسالہ کی پوری نگہداشت کرتے رہے۔ رسالہ کی ترقی و معیار روزافزوں رہا۔ ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر مضامین شایع ہوتے رہے اور وہ اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرتا رہا لیکن تیسری خصوصیت فن تقریر و فصاحت کے مغربی طرز و معیار سے اہل ہند کو متعارف کرانے کے اصول پر وہ ابتدائی تین شماروں کے بعد کاربند نہیں رہا۔

مخزن کے قلمی معاونین "مخزن" کو اپنے دور کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کا تعاون میسر آیا اور اردو ادب کی قدآور شخصیتیں اس سے وابستہ رہیں۔ اقبال، سجاد حیدر یلدرم، ظفر علی خاں، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، داغ دہلوی، جلال، تسلیم، مائل، شرر لکھنوی، چکبست لکھنوی، عشرت لکھنوی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد،

سلطان حیدر جوش، سید احمد دہلوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید دہلوی، ناصر نذیر فراق دہلوی، خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، مولوی ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم پانی پتی، تلوک چند محروم، سرور جہان آبادی، طالب بنارسی، نادر کاکوروی، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، شاہ دین ہمایوں، حکیم احمد شجاع، نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، حبیب الرحمن خاں شروانی، اسمٰعیل میرٹھی، آزاد عظیم آبادی، برج موہن دتاتریہ کیفی، یاس یگانہ چنگیزی، قاضی عبد الغفار، مرزا اعجاز حسین، حفیظ جونپوری، احسن مارہروی، آغا شاعر قزلباش، تاجور نجیب آبادی، حفیظ جالندھری، جلیل قدوائی، فانی بدایونی، حافظ محمود خاں شیرانی، سید امتیاز علی تاج، آغا حشر کشمیری، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، عبد الحمید عدم، یوسف ظفر، قیوم نظر، میراں جی، حامد علی خاں میاں بشیر احمد اور شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی وغیرہ نے "مخزن" کو واقعتاً ایک گنج گرانمایہ بنا دیا تھا۔

مخزن کے مختلف دور | مخزن کی اشاعت درمیان میں منقطع بھی ہوتی رہی ہے، جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلا دور :۔ اپریل ۱۹۰۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء دوسرا دور :۔ مارچ ۱۹۲۶ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء تیسرا دور :۔ جنوری ۱۹۴۹ء تا مئی ۱۹۵۱ء۔

پہلا دور | اس کے پہلے دور میں شیخ عبد القادر رسالہ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک کا وقفہ چھوڑ کر ۱۹۱۱ء تک انھوں نے اپنا سارا وقت، محنت اور صلاحیت "مخزن" کے لیے وقف کر دی تھی، لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد اپنی نجی مصروفیات کے باعث وہ "مخزن" کی جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے جس کی وجہ سے پہلے جیسا رسالہ کا معیار برقرار نہ رہ سکا۔ معیار کے لحاظ سے پہلے دور کے مخزن کو تین حصوں میں تقسیم کیا

جا سکتا ہے۔

۱۔ اپریل ۱۹۰۱ء تا دسمبر ۱۹۱۶ء ۲۔ جنوری ۱۹۱۷ء تا اکتوبر ۱۹۲۰ء ۳۔ مئی ۱۹۲۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء۔

ابتدا میں "مخزن" کے ساتھ شیخ عبدالقادر کی مستقل وابستگی نے رسالہ کو ادبی صحافت کے عروج پر پہنچا دیا تھا جس کا اعتراف تمام اہل نظر نے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر پہلے شمارہ سے لے کر اپنے سفر انگلستان (۱۹۰۴ء) تک رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں لگے رہے۔ مختلف النوع موضوعات پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ نظم سے زیادہ نثر کی طرف توجہ دیتے تھے۔ رسالہ کا تین چوتھائی حصہ نثر سے مملو ہوتا تھا اور بقیہ منظومات و غزلیات پر مبنی ہوتا تھا۔ حصۂ نظم میں مدیر قدیم و جدید شعرا کی نگارشات بڑے اہتمام سے شایع کرتے۔ اس حصہ میں جہاں ایک طرف اقبال، ظفر علی خاں، غلام بھیک نیرنگ، آزاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، صادق علی خاں،، خوشی محمد ناظر، تلوک چند محروم، مرزا اعجاز حسین اور شاہ دین ہمایوں جیسے نظم گو حضرات انگریزی خیالات سے ماخوذ نظمیں اور جدید طبع زاد نظمیں لکھ کر اردو کے شعری ادب میں وسعت و اضافہ کر رہے تھے وہیں دوسری طرف قدیم طرز سخن کے دلدادہ، داغ۔ جلال، تسلیم اور سائل وغیرہ اردو غزل کے پُر پیچ گیسو سنوارنے اور نکھارنے میں منہمک تھے۔

شیخ عبدالقادر ۱۹۰۴ء میں انگلستان جانے لگے تو رسالہ کو شیخ محمد اکرام کے سپرد کر دیا۔ اس سے ادبی حلقہ میں رسالہ سے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور اس کے معیار کے بارے میں اندیشے ظاہر کیے جانے لگے۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے لگن

دلچسپی اور محنت کے ساتھ "مخزن" کے گذشتہ معیار کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے بہتر بھی بناتے رہے۔ نثری مضامین کا تنوع بھی قائم رکھا اور ترتیب شاعری بھی باقی رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کے عہد ہی میں "مخزن" کی شہرت، مقبولیت اور قدر افزائی نے رسالہ کو ادب کی ایک اعلیٰ منزل پر پہنچا دیا تھا، اسے اپنے دور کے لائق و فائق اہل قلم اور بلند پایہ مصنفین کا قلمی تعاون حاصل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے شیخ عبدالقادر کے انگلستان جانے کے بعد بھی "مخزن" پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

شیخ محمد اکرام نومبر ۱۹۱۰ء میں "مخزن" سے علیحدہ ہو گئے اور رسالہ کا سارا کام شیخ عبدالقادر نے پھر اپنے ذمہ لے لیا لیکن اپنی مستقل ذاتی مشغولیات کی وجہ سے رسالہ کی ملکیت اور ذمہ داری غلام رسول کو سونپ دی اور صرف مدیر کی حیثیت سے "مخزن" میں کام کرتے رہے مگر پہلے جیسا انہماک نہیں رہا جس کے باعث رسالہ کے معیار پر اثر پڑا۔ بہزاد لکھتے ہیں:

"شیخ عبدالقادر کی برائے نام ایڈیٹری میں اب بھی بلا پابندی اوقات شایع ہوتا ہے مگر جیسے مبتذل اور ناکارہ مضامین اس میں شایع ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔"[۵۴]

۱۹۱۵-۱۶ء میں شیخ عبدالقادر کی حیثیت آنریری ایڈیٹر کی رہی اور اسسٹنٹ ایڈیٹر میر نثار علی شہرت ہوئے (ان کا نام رسالہ کے سرورق پر نہیں چھپتا تھا بلکہ رسالہ کے اندر ان کی تحریروں کے نیچے "اسسٹنٹ ایڈیٹر 'مخزن' درج ہوتا تھا)، انھوں نے رسالہ میں ظاہری تبدیلیاں کیں۔ سائز اور فہرست مضامین کی تبدیلی واضح اور نمایاں تھی۔ معنوی اعتبار سے مضامین میں پہلی جیسی وسعت و تنوع نہیں رہا۔

ہلکے پھلکے نثری مضامین شایع ہوتے تھے اور حصۂ نظم بھی زیادہ بہتر نہیں تھا۔ اِدھر شیخ عبدالقادر کی روز افزوں مصروفیات اور "مخزن" سے ان کی بے توجہی نے رسالہ کے ظاہری و معنوی معیار کو نہ صرف ابتر کیا بلکہ تیسرے درجہ کا رسالہ شمار ہونے لگا گویا "مخزن" اب رو بہ انحطاط ہونا شروع ہوگیا۔ خود اداریہ میں رسالہ کی اس کسمپرسی کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے:

> "یادش بخیر! "مخزن" کا ایک شباب کا زمانہ تھا کہ دنیائے ادب میں اس کی دھوم تھی۔ اردو کے بہی خواہ اس کی دلربائیوں پر فریفتہ نظر آتے تھے۔ ہندوستان کے فاتدالاقران ادیب و شعرا اپنے جواہر نگاریوں سے زینت بخشتے تھے۔ اس کے قدرداں اس کے خیر مقدم کے لیے پلکوں کا فرش کرتے تھے۔ اس کی اشاعت اتنی تھی کہ آج اردو کے کسی معتدر روزانہ اخبار کی بھی نہیں ہے لیکن آج "مخزن" کی کس مپرسی دیکھنے کے قابل ہے"[۵]

جنوری ۱۹۱۶ء سے "مخزن" کے جوائنٹ ایڈیٹر تاجور نجیب آبادی ہوئے اور رسالہ کی تمام تر ذمہ داری انہیں کے ہاتھ میں ہوگئی صرف آنریری ایڈیٹر کی حیثیت سے شیخ عبدالقادر کا نام شایع ہوتا تھا۔ اس عہد میں فہرست مضامین کی واضح تبدیلی یہ ہوئی کہ نثر اور نظم دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ حصے ایک ساتھ شایع ہونے لگے۔ "مخزن" کے سولہ سال کے عرصہ میں یہ ایک نئی تبدیلی تھی جو رسالہ کے ظاہری حسن میں اضافہ اور اسے پہلے جیسا مقبول بنانے میں مفید ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ "مخزن نے اپنی سولہ سال کی مدت میں ظاہری حسن میں جو کشش و جاذبیت پیدا کی تھی، ناظرینِ "مخزن" کی ایک بڑی تعداد نے اسے پسند کیا تھا اور

مزاج اس کا عادی ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں تاجور کی مذکورہ تجویز و عمل سود مند ثابت نہ ہوا۔ اس کے علاوہ تاجور نے معنوی تبدیلی بھی کی جس کی وجہ سے نثری حصہ بالخصوص متاثر ہوا۔ حالانکہ یہی وہ حصہ تھا جو "مخزن" کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نوع کی تبدیلی کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ "مخزن" کے پہلے دور کے نثر نگاروں کی نگارشات انہیں میسر نہ ہوئیں دوسرے شیخ عبدالقادر کی "مخزن" سے مستقل اور مکمل علیحدگی تھی۔ تاجور کے دور میں لاہور کی انجمنوں کی رپورٹیں، مشاعروں کی روداد اور ان کے انتخابات نے "مخزن" کو بہت نقصان پہونچایا جس کی وجہ سے رسالہ کا سارا مقصد فوت ہو گیا اور قارئینِ "مخزن" کی نظر میں "مخزن" کمتر درجہ کا رسالہ ہو گیا۔ اظہر نعمانی رودولوی نے لکھا ہے:

> " مخزن" جس وقت تک شیخ عبدالقادر کی نگرانی میں نکلا ہندوستان کے اعلیٰ پرچوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن جس وقت سے شیخ صاحب اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باعث اس سے سبکدوش ہو گئے اس کا وہ اگلا سا رنگ نہیں رہ گیا۔[۹]

مئی ۱۹۲۱ء سے بیدل شاہجہانپوری "مخزن" کو مرتب کرنے لگے، اب شیخ عبدالقادر کا نام سرپرست کی حیثیت سے شایع ہوتا تھا لیکن انہیں براہ راست رسالہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً مضامین لکھ دیا کرتے تھے۔ بیدل نے تاجور کے طریق سے انحراف کرکے "مخزن" کے دور اول کی ظاہری ترتیب کو اپنا لیکن علمی، ادبی اور دوسرے موضوعات سے متعلق نثری مضامین کی تعداد بہت کم ہو گئی اور افسانوی ادب کی تعداد بڑھ گئی۔ بعض طویل افسانے، ڈرامے اور ناول بالاقساط شایع ہونے لگے۔ سعی بلیغ کے باوجود بیدل "مخزن" کو اس کا کھویا ہو

مقام نہ دلاسکے تاہم تاجور کے عہد سے اسے بہتر ضرور بنادیا تھا مگر جنوری ۱۹۲۲ء
کا شمارہ نکال کر اسے بند کر دیا۔ مخزن کے اس دور کی بابت بھی اہل نظر کی رائے
اچھی نہیں ہے۔

دوسرا دور | "مخزن" کا دوسرا دور مارچ ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۳۰ء تک
محیط ہے۔ اس دور کے روح رواں ابوالاثر حفیظ جالندھری تھے۔ "مخزن" کُلّی
طور پر ان کے ہاتھ میں تھا، شیخ عبدالقادر سے اس کا کوئی بھی تعلق نہ تھا۔ اسے
'مخزن' کا "دور جدید" کہا جاتا ہے۔ رسالہ کا یہ دور اپنے پہلے اور دوسرے دور
سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہری تبدیلی مثلاً سائز، کاغذ، طباعت
اور رسالہ کے مندرجات وغیرہ کے لحاظ سے منفرد و یکتا نظر آتا ہے۔ آرٹ سے
مزین اشاعتِ تصاویر کا اہتمام ملتا ہے۔ معنوی اعتبار سے رسالہ کے نثری مضامین
زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ ادب اور تنقید سے متعلق مضامین کا فقدان ہے، افسانوی
ادب پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ نظموں سے زیادہ غزلیں شایع کی جاتی تھیں
اس دور کے مشمولات ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "مخزن" نے اپنے سابقہ مقاصد کو
نظر انداز کر دیا ہے۔

تیسرا دور | "مخزن" کے تیسرے دور کا آغاز جنوری ۱۹۴۹ء میں ہوا اور مئی
۱۹۵۱ء کا آخری شمارہ نکلنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس بار شیخ
عبدالقادر کی سرپرستی میں حامد علی خاں نے جنوری ۱۹۴۹ء میں "مخزن" کا
پہلا شمارہ نکالا۔ رسالہ کی ظاہری ترتیب اپنے دوسرے دور سے مماثل و مشابہ
نظر آتی ہے، لیکن رسالہ کے مندرجات کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے، ادب و تنقید

اور افسانوں کے علاوہ بعض مشاہیر پر مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا جو دیر تک قائم رہا۔ لیکن ان سب کے باوجود رسالہ کے زیادہ صفحات "مخزن المعارف" "تبرکات مخزن"، "قارئین"، "یاران نکتہ داں" وغیرہ عنوانات کے لیے وقف ہوتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مخزن" کا مقصد وحید شاید ان کالموں میں سمٹ کر آگیا ہے اور بقیہ نگارشات کا درجہ ثانوی ہے۔

مخزن کے کالم | "مخزن" کے ہر دور کے مستقل کالم بھی دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں ہیں۔ "کچکول" کے عنوان سے قدیم و جدید شعرائے اردو کے چیدہ اشعار شایع کرنے کا سلسلہ جاری کیا گیا جو اپریل ۱۹۰۱ء سے مارچ ۱۹۰۴ء تک قائم رہا، اسی درمیان پہلی بار نومبر ۱۹۰۲ء سے حصہ نظم میں "تازہ غزلیں" عنوان کا اضافہ ہوا جس کے تحت معاصر شعراء کا کلام چھپنے لگا۔ مارچ ۱۹۱۷ء سے "ریویوز" کے کالم میں رسائل و کتب پر مختصر تبصرہ کی ابتدا ہوئی، تاجور نے مئی ۱۹۱۷ء سے لاہور کی تین ادبی محفلوں "انجمن ارباب علم"، "بزم اردو" اور "بزم احباب" کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں کی روداد اور انتخاب مشاعرہ کا سلسلہ جاری کیا۔ بشیر احمد کی خواہش اور اصرار پر جون ۱۹۱۷ء سے "کچکول" کالم کی تجدید ہوئی۔ جنوری ۱۹۱۸ء سے رسالہ کے پہلے صفحہ پر "تبصرہ" کے عنوان سے ہر شمارہ کے منتخب مضامینِ نثر و نظم پر مدیر نے مختصر تعارفی نوٹ لکھنا شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک رسالہ کے آخر میں "محکمۂ احتساب" کالم کے تحت اردو کے عصری اخبارات و رسائل، کتب اور اہل قلم کی نگارشات کا تجزیہ کیا جانے لگا۔

اس طرح مارچ ۱۹۱۷ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک رسالہ کے کالموں میں

جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہو سکی، کوشش یہ کی گئی کہ ان کالموں کو کوئی نئی شکل دی جائے اور اس کے لیے نئے نئے کالم شروع بھی کیے گئے اور پھر جلد ہی بند بھی ہو گئے۔ پیش کش کے انداز بھی بدلتے رہے۔ جس سے رسالہ کی ظاہری و معنوی صورت میں بھی برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ سب کچھ رسالہ کے معیار کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تھا۔ لیکن شیخ عبدالقادر کی علیحدگی کے بعد "مخزن" کا معیار کم سے کم تر ہو گیا۔ مذکورہ بالا دور کے متعلق حفیظ جالندھری لکھتے ہیں:

> "وہی 'مخزن' تھا اور اسے بلند معیار پر لانے کے لیے اس کے مالک بے دریغ روپیہ صرف کر رہے تھے، لیکن ایڈیٹر کی ناتجربہ کاری اور چھوٹے پن نے اسے مشاعروں کی رپورٹوں اور انتخابات کا ایک ذلیل وادنیٰ مجموعہ بنا کر ذوق سلیم کی نگاہوں سے ایسا گرا دیا کہ بعد میں اسے سنبھالنے کی بہتیری کوشش کی گئی اور مولانا بیدل (مرحوم) نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی"[۱]

"مخزن" کے دوسرے دور میں ملا رموزی کے مستقل کالم "شذرات واشارات" بعد میں "نکات" توجہ طلب ہیں۔ اس کالم کے تحت ملا رموزی مسلمانوں کے عصری مسائل بالخصوص زبان اردو کے ساتھ حکومت اور متعصب ہندوؤں کے سوتیلے برتاؤ کا ذکر بڑے طنزیہ انداز میں کرتے تھے ترمیم واضافہ کے بعد یہی نکاتِ رموزی کے نام سے دو حصوں میں کتابی شکل میں شایع ہوئے۔

حامد علی خاں نے اپنے دور میں "مخزن المخازن" کے ضمن میں "تبرکات مخزن" کے کالم کا آغاز کیا جو زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ "یاران نکتہ داں"

"مطبوعات" اور "ایڈیٹر کے نام" وغیرہ کالموں کا بھی سلسلہ جاری کیا۔

مذکورہ تمام تبدیلیوں کے باوجود "مخزن" میں سادگی اول تا آخر نظر آتی ہے، البتہ حفیظ جالندھری نے اپنے دور میں شوخ تصاویر کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ لیکن ظاہری ترتیب میں انھوں نے بھی سادگی کو باقی رکھا۔ رسالہ کا سرورق بالکل سادہ ہوتا تھا "مخزن" کے دور اول کے سرورق پر ہندوستان کا نقشہ ہوتا تھا اور پھر ان شہروں کی نشاندہی کی جاتی تھی جن کی اردو مادری زبان تھی یا جہاں وہ مروج تھی یا سمجھی جاتی تھی، ان تینوں کے لیے تین طرح کے نشان دیے جاتے تھے اور فہرست مضامین کے نیچے سطر کھینچ کر اس کی تفصیل لکھتے تھے۔ نمونہ پیش ہے۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے دہلی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس

□ ان شہروں میں اردو مروج ہے لاہور، پشاور، حیدرآباد دکن

⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے مدراس، بنگلور، بمبئی، کلکتہ، کشمیر

اس کے علاوہ سرورق پر درج ذیل عبارت ہوتی تھی۔ جس سے اس وقت اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔"

مخزن کے صفحات | "مخزن" ابتدا میں ۴۸ صفحات پر نکلنا شروع ہوا، لیکن جیسے جیسے اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور قارئین مخزن کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ صفحات کی تعداد بڑھانے کے تقاضے بھی شروع ہوئے تو مدیر مخزن نے صفحات کی تعداد بڑھانا شروع کر دیا اور مختلف اوقات میں ۵۶، ۶۰، ۶۴ اور ۷۲ تک اضافہ ہوا۔

اور ایک دور وہ بھی آیا کہ "مخزن" ۸۰ صفحات پر نکلنے لگا لیکن دوسرے اور تیسرے دور میں صفحات کی تعداد کم ہوگئی۔ البتہ جب کبھی خاص نمبر یا سالگرہ نمبر نکلا تو تعداد صفحات بڑھا کر تقریباً ۱۲۵ تک کر دی گئی۔

"مخزن" کے ہر دور میں سائز بھی بدلتا رہا۔ اپنے پہلے دور (اپریل ۱۹۰۱ء تا جنوری ۱۹۲۲ء) میں $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۶}$ سائز پر نکلا اور دوسرے اور تیسرے دور میں $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ سائز پر نکلتا رہا۔

شیخ عبدالقادر نے اپنے دور میں اس چیز کا خاص اہتمام کیا کہ "مخزن" کو ہر طبقہ کے لوگ پڑھیں اور اس سے مستفیض ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب رسالہ کی قیمت کم ہو۔ چنانچہ انھوں نے رسالہ کو دو طرح کے اعلیٰ و ادنیٰ کاغذ پر نکالنا شروع کیا اور دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں متعین کیں تاکہ خاص و عام آدمی خرید سکے۔

اعلیٰ قسم کے کاغذ پر سالانہ چندہ بلا محصول	سے ر	(تین روپیے)
دوئم درجہ " " " "	عہ ر	(دو روپیے)
محصول ڈاک خرچ	۶ ر	(چھ آنے)
نمونے کے پرچہ کی قیمت	۴ ر	(چار آنے)

اس طرح "مخزن" نے بیسویں صدی کے ربع اول تک بالخصوص اور پانچویں دہائی میں بالعموم اردو زبان و ادب کی نمایاں اور ناقابل فراموش خدمت انجام دیکر اردو رسائل کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز درجہ حاصل کیا۔

حواشی

[۱] انتخاب نقد: نادم سیتاپوری [۲] رسالہ "المعارف" (لاہور) فروری ۱۹۴۲ء [۳] رسالہ "مخزن" لاہور مئی ۱۹۰۱ء [۴] ایضاً اپریل ۱۹۰۱ء [۵] تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ مترجم مرزا محمد عسکری نیشنل بک ہاؤس۔ اردو بازار۔ لاہور ۱۹۳۴ء [۶] رسالہ نقاد (آگرہ) مارچ ۱۹۱۴ء [۷] ایضاً [۸] رسالہ "مخزن" (لاہور) دسمبر ۱۹۱۶ء [۹] رسالہ "الناظر" (لکھنؤ) جون ۱۹۱۹ء [۱۰] رسالہ "مخزن" (لاہور) مارچ ۱۹۲۳ء۔

معارف کی ڈاک

مکتوب ڈربن

جامعہ ڈربن۔ جنوبی افریقہ

۲۷ رمضان المبارک/۲۱ مارچ ۱۹۹۳ء

برادر عزیز گرامی قدر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب سلام و رحمت فراوان، سلامت باکرامت باد۔ رمضان و عید مبارک۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۲ء کو دار المصنفین اعظم گڈھ میں زوال روس اور سنٹرل ایشیا (ترکستان) سے متعلق سمینار میں حاضری دیکر واپس آیا تو دم مارنے کی مہلت نہ مل سکی، جامعہ کی تدریسی مصروفیات کے بعد علمی اعتکاف میں چلا گیا۔ زوال روس جدید عالمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں تقریبا سات سمینار میں اس موضوع پر تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگوں کی دلچسپی اور غیر معمولی انہماک سے خیال پیدا ہوا کہ روس میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو ایک مقالہ کی صورت میں مرتب کر دیا جائے۔ کیونکہ ترکستان کے بخارا و تاشقند و سمرقند کے علاوہ یورپین (European) روس میں مسلم ریاستوں اور ممالک سے متعلق معلومات کی بڑی کمی ہے۔ دوسرے یہ تاریخی حقائق دیگر مسلم اقلیتوں کے لیے درس عبرت ہیں جن سے مستقبل سازی کی راہیں ہموار ہو سکیں گی۔ مقالہ نے کتاب کی صورت اختیار کر لی اور باوجود اختصار و اجمال کے تفصیلات بڑھتی چلی گئیں۔ روس (مغربی روس اور مشرقی روس) میں، داغستان کے امام شامل اور دیگر صوفیائے کرام کی تحریک جہاد نے

کس طرح مسلمانوں کے وجود کو بچا لیا، یہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہے، سرفروشان راہ حریت کی صدسالہ جدوجہد اور جہاد کی جانبازیاں آج بھی مسلم اقلیتوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

روس نام کی کوئی مملکت صفحۂ ہستی پر موجود نہ تھی۔ سارا علاقہ جسے آج روس کہا جاتا ہے سلاطین تاتار اور منگول کے مقبوضات میں تھا۔ رُس (Rus) نام کا ایک قبیلہ جو باہر سے آکر وہاں آباد ہوا، وہ بھی سلاطین تاتار کا باجگذار تھا اور موسکو نامی گاؤں میں آباد ہوا جو خود سلاطین تاتار کے زیر حکمرانی تھا۔ تاریخی نادانی کہیے یا فراست کی کمی کہ سلاطین تاتار قبائلی تفرقہ کا شکار ہوتے گئے اور عیش و عشرت میں کھوتے چلے گئے اور انھوں نے (Rus) رُسی قبائل کے سرداروں کو تحصیل مالگذاری (Tax-collector-revenues) کا افسر مقرر کر دیا۔ یہ افسران نواب کے لقب سے نوازے گئے۔ اس عہدہ کے ذریعہ انھوں نے بتدریج معاشی و سیاسی اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور طاقتور ہوتے چلے گئے۔ مسلم حکمران غفلت میں پڑے رہے۔ وہ وقت آگیا جب ان رُسی قبائل کے سرداروں نے سلاطین تاتار کو چیلنج کرنا شروع کیا اور (Tax) دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ Snavo نامی سرداروں نے بالآخر ۱۵۵۲ میں قازان پر جو تاتارستان کا مرکزی علاقہ تھا اور موسکو سے قریب ترین تھا، قبضہ کر لیا۔

سقوط قازان ۱۵۵۲ء سے روس کی اصل تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سلاطین تاتار کی ریاستیں اور مقبوضات ختم ہوتی چلی گئیں۔ ایک تاتاری مورخ نے حیرت کے ساتھ لکھا کہ (ہم اپنے سابق غلاموں کے غلام کی طرح ہو گئے؟ حیرت ناک بات ہے) کوئی ۳۰۰ برس ایوان خاندان پھر رامانوف کے خاندان کی حکومت رہی انھوں نے اپنا خطاب زار (بادشاہ) روس رکھ لیا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۹۱ تک

مارکسی سوشلسٹ نے سارے روس اور مسلم ممالک پر قبضہ کرلیا اور لادینی کا دور شروع کیا۔ دین کے خلاف جنگ ان کا اصل منشور تھا۔ اللہ نے ۷۰ سالوں میں ان کی تاریخ کے ابواب بند کر دیئے۔ زار روس نے شہدائے تاتار کے بریدہ سروں کے ہم شکل گنبد نما چرچ موسکو میں تعمیر کیے جس کی تصویریں اکثر رسائل و مجلات میں آتی رہتی ہیں۔ یہ چرچ مسلمانوں کی شکست کے جشن کی یادگار ہے۔ اس میں شہدا کی داڑھی اور عمامہ کی نقل اتاری گئی ہے۔ یہ روسی صلیب کا سیاہ ترین دور تھا۔ سقوط قازان میں غدار مسلمانوں کا ہاتھ تھا جو دشمنوں سے جا ملے تھے، آج بھی یہ عمل عالم اسلام میں جاری ہے۔ اور زوال امت مسلمہ کے اہم اسباب میں ایک سبب ہے۔

مارچ ۹۲ء میں مسلم روس (Muslim Russia) کے زیر عنوان تالیف کا سلسلہ جاری تھا کہ بوسنیا (Bosnia) کا المیہ پیش آگیا اور سال بھر سے شہادت زار بوسنیا کربلا یا شہدا کبر بنا ہوا ہے۔ سارا مسیحی یورپ اسلام اور مسلمانوں کو یورپ کی سرزمین سے نکالنے پر کمربستہ ہے۔ روس کھل کر سربیا کی مدد کر رہا ہے اور عالم اسلام سو رہا ہے۔ لب کشائی کی بھی ہمت باقی نہ رہی۔ سابق یوگوسلاویہ کی چھ ریاستوں یعنی بوسنیا (۲) سربیا (۳) کروٹیا (۴) سلووینیا (۵) مسی ڈونیا اور (۶) مونٹی نگرو سے اسلام کے خاتمہ کی سعی اسی طرح جاری ہے جس طرح بلقان کی چھ ریاستوں یعنی (۱) یوگوسلاویہ (۲) رومانیہ (۳) ھنگری (۴) یونان (۵) بلغاریہ اور (۶) البانیہ سے اسلام کا انخلاء اور خاتمہ کیا گیا اور ۱۲-۱۹۱۳ء میں بلقان کی جنگ میں ترکی مریض ناتوان کے تمام مقبوضات پر مسیحی یورپ نے قبضہ کرنے کے بعد یورپ کی سرزمین کو مسلمانوں سے پاک کرنا شروع کیا۔ مساجد و مدارس کا انہدام

اوقاف اسلامیہ و اراضی مسلمین پر قبضہ کرکے مسلمانوں کو دربدر کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ میں ترکی جو کبھی عالمی سپر پاور Super Power تھا مریض ناتوان کی طرح خود اپنی موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ خلافت کے خاتمہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کا انہدام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ سارا عالم مسیح آج جدید آلات اور ہتھیاروں سے ظالم سربیا کی مدد کر رہا ہے تاکہ وہ جلد از جلد مسلمانوں کا خاتمہ کر سکے۔ اقوام متحدہ نامی ادارہ انھیں صلیبی قوتوں کا مرکزی آفس ہے۔ veto کے مالک صلیبی اس دفتر کے مالک ہیں۔ جس کی مثال اس شعر کے مترادف ہے؂

اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر تم ہی قاتل تم ہی شاہد تم ہی منصف ٹھہرے

شہادت زار بوسنیا کے زیر عنوان ایک رسالہ مرتب ہوگیا ہے اس میں اس کی چارسو سالہ اسلامی تاریخ آگئی ہے اور عصر حاضر کے واقعات وکوائف کا بھی احاطہ ہوگیا ہے۔ یہ انگریزی زبان میں ہے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت یہ باتیں اچانک نوک قلم پر اس لیے آگئیں کہ ان کا گہرا تعلق ہندوستان کی مسلم اقلیت سے بھی ہے۔ اجودھیا کا واقعہ اسی تعلق کی ایک کڑی ہے۔ ہند میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک سمجھی بوجھی پالیسی کے تحت ہو رہا ہے۔ رموز سلطنت خسروان دانند کے اصول یا فار مولا پر خسروان کے ملاء اعلیٰ میں ایک نصاب تیار ہوا ہے کہ سرزمین ہند کو مسلمانوں سے پاک کیا جائے۔ اندلس۔ روس۔ بلقان اور یوگوسلاویہ طرز کی اسکیم جاری کی جائے۔ اس نصاب کے مولف بھی اہل صلیب ہیں جو مسلمانوں کے ابدی اور ازلی دشمن ہیں۔ یہ عمل اسی نصاب کے تحت جاری ہے۔ ملاء اعلیٰ سے ملاء ادنیٰ تک اس نصاب کی تدریس میں منہمک ہے۔ لیکن

ایں محال است و خیال است و جنون۔

آج سے کوئی ۱۷یا ۱۸ سال قبل ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کے زیر عنوان ایک کتاب ۱۹۷۵ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ اس کے مولف بھی ایک صلیبی مسٹر ہرمین (S. Harman) ہیں، کتاب کا مرکزی مضمون اور عمودی خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی طرح کل کا جزء بنا دیا جائے تاکہ اتنی بڑی مسلم اقلیت کا اکثریت میں انضمام و انہضام مکمل ہو جائے۔ کتاب ضخیم ہے ادغام کی اسکیم کتاب کے چودہویں باب میں کھول کر بیان کی گئی ہے۔ انضمام کا نسخہ یورپ کے صلیبی نسخہ سے بہت قریب ہے۔ مولف کے مشورہ پر ایک کل ہند جماعت یا تحریک جو اندنوں اڈوانی کی زیر قیادت فعال ہے اور جو مکمل طور پر انضمام و انہضام کی بات ہی نہیں کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ان کی روایات کی تحقیر میں پیش پیش ہے۔ کتاب کے صفحات ۲۲۲ سے ۲۳۲ قابل غور و فکر ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آج انہیں مشوروں پر عمل ہو رہا ہے۔ مذہب کا مسئلہ ہو یا زبان کا مسئلہ!

کتاب کے مولف تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندو اکثریت میں مدغم ہو جانا اس لیے آسان ہے کہ یہ اصلاً سب ہندو تھے۔ زبردستی مسلمان بنائے گئے۔ آسانی کے ساتھ اپنے اصل مذہب اور عقائد کی طرف مراجعت کر لیں گے (۲۲۲) مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ فوراً اپنے کو ہندو اکثریت میں مدغم کر کے ہندو سرچشمہ اور دھارے کا حصہ بن جائیں (۲۲۲) مسلمانوں کو چاہیے کہ رضاکارانہ طور پر اپنے نام کے آخری حصہ کو ہندو نام کے ساتھ ضم کر دیں (۲۲۳) سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ قومی سطح پر ایک ایسی کل ہند تنظیم یا جماعت کی تشکیل کی جائے جس کا مقصد اول ہی "تحریک ادغام

وانضمام کی تکمیل ہو، اس تنظیم کی شاخیں ملک گیر طور پر صوبائی مراکز، اضلاع اور شہروں
دیہاتوں بلکہ سڑکوں اور چوراہوں پر بھی قائم کر دی جائیں تاکہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت
میں ضم اور مدغم ہو جانے کی تلقین کی جاتی رہے (۲۲۳-۲۲۴) اس انضمام کے لیے
مسلمانوں کو اردو رسم الخط کو فوری طور پر ترک کرنا ہوگا (۲۲۴) توحید امت اور تکمیل
ادغام کے لیے مسلمانوں کو اپنا خاص طرز لباس بھی ترک کرنا ہوگا۔ مردوں کے لیے
دھوتی کا استعمال ضروری ہوگا اور خاص قسم کی اسلامی ٹوپی کو جو مسلم تشخص اور
انفرادیت کی علامت ہے، ترک کرنا ہوگا۔ تاکہ مسلم شناخت باقی نہ رہے۔ مساجد
کی تقریبات میں ہندوؤں کی شرکت اور مندروں کی رسومات میں مسلمانوں کی شرکت
کو جائز قرار دیا جائے، اس کی کھلی اجازت ہو (۲۲۴) مسجد کی ہر تقریب کو ہندوؤں
کی شرکت کے بغیر اور مندر کی پوجا پاٹ کو مسلمانوں کی شرکت کے بغیر نامکمل تصور
کیا جائے (۲۳۲) انضمام یا ادغام اور انہضام کی اس پالیسی کو قومی سطح پر نافذ کیا جائے۔
جزو کو کل کا حصہ بنانے کا یہی واحد اور کامیاب طریقہ ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی
کا واحد حل بھی یہی ہے (۲۳۲) اس انضمام کے بعد مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت
کسی حد تک قائم ہو سکتی ہے (۲۳۲)

اس تحریر کا تقابلی مطالعہ اگر روس، بلقان اور یوگوسلاویہ اور اب بوسنیا کے
نصاب سے کیا جائے تو تمام خطوط (Patterns) مشابہ نظر آئیں گے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اقلیتوں کو اس کا حق ہے کہ دنیا میں شائع ہونے
والی ان تمام تالیفات اور نصاب کا مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے دفاعی مورچے بھی
اسی طرح مستحکم کرتے رہیں۔ جس طرح روس کے مسلمانوں نے کیا۔ اس بات کی بھی اشد

ضرورت ہے کہ معارف میں ایک مقالہ وقتاً فوقتاً دنیا کی مسلم اقلیتوں پر شایع ہوتا رہے چونکہ اس کے قاری زیادہ تر ہندوستان کی مسلم اقلیتیں ہیں اس لیے رسالہ کو ان کے تحفظ کی تدبیروں سے واقف رکھنا چاہیے۔ روایتی مقالات (علمی ادبی و دینی) علی حالہ قائم رہیں۔ آخر میں ایک مقالہ مسلم اقلیتوں کے ایسے سے متعلق ضرور ہو۔ اس لیے بھی کہ ع ہم ہی جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل۔ جب معارف کے پڑھنے والے رہیںگے تو معارف عرفانِ نفس اور تعیینِ ذات کا درس بھی دے سکے گا۔

آپ کے شذرات دینی اور قلبی ہوتے ہیں۔ ادبی چاشنی وحلاوت کے علاوہ امت کی بقاء اور اکثریت کے مظالم کی نقاب کشائی میں ہوش و جوش دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اللّٰہم زد فزد۔ بعض تبصرہ چونکہ ناگزیر ہے اس لیے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔ روایات کا تحفظ و احترام نئی نسل کے لیے لازم ہے۔ لیکن شیخ سعدی اور ان کے سفر ہند سے متعلق کذب بیانی کی داستان پڑھ کر مجھے نہ صرف دکھ ہوا بلکہ حضرت سعدیؒ کے ساتھ صدیوں کی عقیدت میں کمی آگئی۔ جب مجھ جیسے عقیدتمند کا یہ حال ہو سکتا ہے تو جدید نسل کی نظر میں روایات کے احترام کی بات ہی تحصیل حاصل ہے۔ مسئلہ مقالہ کی صحت وعدم صحت کا نہیں ہے بلکہ اس وقت جبکہ امت خود زیست و بقار کے نازک مراحل سے گذر رہی ہے۔ ایسے مقالات تشکیک و ریب میں اضافہ کرتے ہیں[1]۔ ان نازک مواقع پر ایسے مقالات کی اشاعت پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ عربی اور فارسی سے متعلق بعض مقالات بھی محل نظر ہیں کیونکہ اب جدید تحقیق اس قدر آگے جا چکی ہے کہ قدیم اسناد پر قناعت و تکیہ محل نظر ہے۔ میں نے بعض تبصرے لکھے تھے لیکن پھر مصروفیات

---

[1] اصل چیز تحقیق حق ہے، شیخ سعدی کی اصل عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔

کی وجہ سے ان کو آپ کی خدمت میں ارسال نہ کر سکا۔ نہ ہی ان کی تکمیل ہو سکی[1]۔ بیرون ملک سے آنے والے تمام پرچوں میں مجھے معارف کا انتظار شدت کے ساتھ رہتا ہے مصروفیات کے باوجود دلچسپی اور شغف کے ساتھ مضامین کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس عرصہ میں کچھ پرچے مجھے نہیں مل سکے ہیں شاید ڈاک کی نذر ہوئے۔ آئندہ کسی خط میں ان شماروں کا ذکر کروں گا جو مجھے نہیں مل سکے۔ چونکہ میں ہر شمارہ کی حفاظت کرتا ہوں لہذا کسی بھی شمارہ کی گم شدگی سے رکارڈ نامکمل رہ جاتا ہے۔ گذشتہ ملاقات کے دوران آپ کی محبت و شفقت اور تواضع و انکساری کا صمیم قلب سے مشکور ہوں۔ دیگر احباب کی خدمت میں بھی شکرانہ ادا کریں۔ میں خاص طور پر ان حاضرین اور سامعین کا مشکور ہوں جنھوں نے ہمارے محاضرہ کو پسند فرمایا۔ تقبل اللہ۔

وقعت الواقعہ | اجودھیا کی تاریخی مسجد کا انہدام کسی خاص جماعت یا قیادت کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے اس میں ایک مرکزی ذہن (Brain) از سر تا قدم فعال ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے۔ مرکزی و صوبائی حکومتیں، فوج و پولیس تماشا دیکھیں اور انہدام مسجد کا عمل جاری رہے؟ اس حادثہ سے مسلمانان عالم کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ مولانا آزاد کے اس مقالہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو حضرت مولانا آزادؒ نے مشہد اکبر کانپور کے زیر عنوان ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو صفحات ۱۲۰ – ۱۲۳ پر لکھا تھا۔ تقریباً سو برسوں کے بعد بھی یہ مرثیہ زبان حال سے مسلمانوں کے جذبات و صدمات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

واقعہ اجودھیا اب واقعہ عالم ہو گیا | مولانا آزاد کے گزشتہ ارشادات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا

---

[1] مکتوب نگار کی اس رائے پر دوسرے اہل نظر کا کیا خیال ہے؟

ہے کہ اجودھیا کا واقعہ اب اجودھیا کا واقعہ نہیں رہا بلکہ سارے عالم کا واقعہ بن گیا ہر مذہب و ملت کے افراد بلکہ لامذہبیوں تک نے انہدام مسجد کی حشر سامانیوں کو اقلیتوں کے عبادت خانہ پر شب خون سے تعبیر کیا۔ اس مذہبی پیکار اور اقلیتوں کے بارے میں پالیسی کے تضادات و تناقضات کو تخریبی میلانات قرار دیا۔ تاریخی حقایق کو اساطیر اور ضمنیات میں تبدیل کرنا اور اقلیتوں کے تحفظ سے کوتاہی کو المناک انحراف سے تشبیہ دی۔ جو خود آگہی نہیں۔ خود پرستی و خود کاری ہے۔

بعد میں خیال آیا کہ اجودھیا کی مسجد کی شہادت کے پیچھے یہودی دماغ بھی کارفرما ہے تاکہ انکو اپنے دعویٰ میں تقویت حاصل ہو یعنی حضرت سلیمانؑ کے ہیکل پر مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ یا گنبد تعمیر کی۔ یہ ایک عالمی تحریک چل رہی ہے، میرے پاس ایک مقالہ ہے جو کسی انگریز کا لکھا ہوا ہے، اس کا عنوان یہی ہے کہ مکہ میں خانۂ کعبہ ہندوؤں کا ٹمپل تھا اور ہندو حکمرانوں کی سلطنت عربیہ تک پھیلی ہوئی تھی، خیال تھا کہ اس کی تلخیص کر کے آپ کو ارسال کر دوں لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے نہ کر سکا، یہ سب ایک عالمی منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے جس کے پیچھے یہودی اور صلیبی ذہن و دماغ فعال ہے، سقوط ڈھاکہ کے وقت ہندی فوج کا کمانڈر انچیف ایک یہودی تھا جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات میں کیا ہے، ضرورت ہے کہ ہند کی مسلم اقلیتوں کو ان حقایق سے باخبر رکھا جائے، میر، مومن، انیس ہو دبیر کے مرثیے تو چلتے رہیں گے، حالات حاضرہ سے متعلق ایک مضمون معارف میں ہونا ضروری ہے یہ پرچہ عام طور پر ذہین لوگ پڑھتے ہیں لیکن وہ بھی حالات حاضرہ اور لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی کی چالوں سے واقف نہیں ہیں اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ الخ کی قرآنی ہدایت بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہے۔

والسلام دعاگو و دعا جو

سید حبیب الحق ندوی

وفیات

ذکرِ مالک رام

از ضیاء الدین اصلاحی

اردو کے مشہور عالم و فاضل، نامور محقق و مصنف اور غالب و ابو الکلام کے عاشق و شیدائی جناب مالک رام کی وفات پر پوری اردو دنیا سوگوار اور اشکبار ہے، ان سے راقم کے جو گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے اس کی بنا پر اس کے لیے بھی ان کی جدائی بہت شاق ہے۔

وہ پھالیہ ضلع گجرات میں جو اب مغربی پنجاب (پاکستان) کا حصہ ہے ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو بوہجہ کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے والد لالہ نہال چند فوج کے محکمۂ سپلائی میں ملازم تھے، لیکن مالک رام ابھی بارہ دن ہی کے تھے کہ والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے، والدہ نے پرورش و پرداخت کی، چار برس کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا جو ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں منقطع ہوا، اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

مضمون نگاری اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ بچپن سے تھا، ابتدا میں شعر و شاعری سے بھی کچھ دلچسپی رہی، ان کا پہلا باقاعدہ مضمون نیرنگ خیال لاہور میں چھپا، یہ ٹیگور کی گیتانجلی کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ تھا، اس کے بعد ۱۹۲۶ء کے نگار میں ذوق اور غالبؒ کے عنوان سے ان کا مضمون شایع ہوا جس میں آگے چل کر ماہر غالبیات

ہونے والے نے غالب پر ذوق کو ترجیح دی تھی، لاہور میں قیام کی بنا پر نیرنگ خیال کے مدیر حکیم محمد یوسف حسین سے مالک رام کے تعلقات ہو گئے تھے، ۱۹۳۰ء میں ان کی خواہش پر ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے، پھر لاہور ہی سے شایع ہونے والے "آریہ گزٹ" سے متعلق ہوئے، اس سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۶ء میں روزنامہ "بھارت ماتا" سے منسلک ہوئے، یہ بند ہو گیا تو دلی کا رخ کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکمۂ اطلاعات عامہ سے وابستہ ہوئے پھر جالندھر کی ایک فرم میں بھی ملازمت کی۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں سے مالک رام کی اچھی یاد اللہ تھی۔ ان کی کوشش سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں ان کا تقرر ہو گیا، تین مہینے کی ٹریننگ کے بعد یکم اگست ۳۹ء کو انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہو کر اسکندریہ چلے گئے اور آزادی کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو اس میں لے لیے گئے اور مصر، عراق، ترکی اور بلجیم وغیرہ میں رہے، سرکاری طور پر ان کو شام، فلسطین، سوڈان، افغانستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بعد میں روس اور ایران کا بھی سفر کیا، سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ساہتیہ اکاڈمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی خدمت پر مامور ہوئے اور اردو سیکشن کے انچارج ہوئے، اکاڈمی سے ضابطہ کا تعلق ختم ہو جانے پر دلی سے ایک ماہی رسالہ "تحریر" کے نام سے نکالا جو بڑا معیاری اور بلند پایہ تھا، لیکن جب اس نے بھی دم توڑ دیا تو جالندھر موٹر ایجنسی لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر ہو گئے۔

اردو کے فروغ و ترقی کے لیے جو سرکاری و غیر سرکاری کمیٹیاں بنیں، ان میں ان کی

شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی، انجمن ترقی اردو ہند اور غالب اکیڈمی کے وہ برابر ممبر رہے اور انجمن کے کئی برس تک صدر بھی رہے، گجرال کمیٹی اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے بھی وہ رکن تھے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ممبر کے علاوہ پرو چانسلر بھی تھے، اردو کی مدۃ العمر خدمت کرنے کی وجہ سے اس کے تعلق سے ان کو بڑے سے بڑا اعزاز ملا اور ان کی کتابوں پر مختلف اداروں نے انعام دینے میں فخر محسوس کیا۔ دراصل ان کی ذات اعزاز و انعام سے بالاتر تھی۔

مالک رام صاحب مطالعہ کے بڑے حریص اور شوقین تھے، کتب بینی کی عادت بچپن ہی سے تھی، جس میں سرکاری ملازمت کی مشغولیت بھی مانع نہیں ہوئی، مطالعہ میں کثرت اور انہماک کی وجہ سے بصارت کمزور ہوگئی تھی اس لیے میگنیفائنگ گلاس استعمال کرتے تھے، میری آمد و رفت ان کے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب وہ بوڑھے ہوگئے تھے مگر جب بھی انکے کمرے میں داخل ہوا تو پڑھتے لکھتے ہی پایا، کرسیوں اور میزوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

پنجابی مادری زبان تھی اور اردو سے ان کو عشق تھا، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا، غالباً ہندی اور بنگالی سے بھی واقفیت تھی اس لیے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بھی اچھا تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے تھے اسے مستحضر رکھتے تھے، طبیعت میں سلامت روی، اعتدال اور بے تعصبی تھی اور اصل مقصود علم کی طلب و جستجو تھا اس لیے کسی زبان و مذہب سے متعلق کتاب بھی ہوتی وہ اس کا مطالعہ کرکے اپنی علمی تشنگی بجھاتے، کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں انہیں قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق ہوا تو عربی سیکھی اور ایک صاحب سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا، معلم کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تو شوقین متعلم نے

خود ترجمہ قرآن کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عرب ملکوں میں رہنے کی وجہ سے عربی میں ان کی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ عربی بولنے پر بھی قادر ہو گئے تھے، قرآن مجید میں غور و فکر کا سلسلہ آخر عمر تک قائم رہا۔

"تاریخ و ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ غالب و ابوالکلام پر وہ اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انھیں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور عجائب گھروں کی سیر کرتے۔

مالک رام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور تصنیف و تالیف سے ان کا اشتغال ہمیشہ قائم رہا اس لیے ان کی قلمی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے لیکن تحقیق کا میدان ان کی اصل جولان گاہ رہا ہے اور اس میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اگست ۱۹۷۶ء میں ماہنامہ آجکل دہلی کا "اردو تحقیق" نمبر شائع ہوا، جس میں اردو تحقیق کے چار ستونوں کے ساتھ ان کی بھی تصویر چھپی تھی اور اسی نمبر میں جناب علی جواد زیدی نے ان چاروں ستونوں کو یہ خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

"جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آتے ہیں' قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی' سید مسعود حسین رضوی ادیب۔"

اور اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں، وہ جس

موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں، تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کر دیتے ہیں' ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔"

اردو تحقیق کے تین ستون تو کب کے گر چکے تھے اور اب یہ چوتھا ستون بھی زمیں بوس ہو گیا ع افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند۔

مالک رام صاحب کے علمی، تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بڑی وسعت، تنوع اور رنگارنگی ہے، ان کی ہر تصنیف علمی، ادبی اور تحقیقی حیثیت سے معیاری اور بلند پایہ ہے۔ غالب ان کی تلاش و تحقیق کا خاص موضوع تھا اور اسی کو ان کے سب کاموں میں اولیت و فضیلت حاصل ہے، غالب پر ۵۰ سے زیادہ مضامین انھوں نے لکھے ہونگے، جن کے دو مجموعے عیار غالب اور فسانۂ غالب چھپ گئے ہیں، ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ غالب کی کتاب "سبد چین" ایڈٹ کرکے شایع کی، جس میں مرزا کا وہ کلام دیا ہے جو ان کی زندگی میں چھپنے والے کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، اسی کتاب کے مقدمہ کے لیے انھوں نے غالب کے حالات لکھنا شروع کیا جو اس قدر پھیل گیا کہ ۱۹۳۸ء میں "ذکر غالب" کے نام سے اسے علحدہ کتابی صورت میں شایع کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے ۵ اڈیشن نکلے ہر اڈیشن نئی تحقیقات پر مشتمل ہوتا تھا، غالب پر جو دو چار اچھی اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں انھی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ حسن تالیف و ترتیب میں یہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے، اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوا، متعلقاتِ غالب میں ان کی تصنیف "تلامذۂ غالب" ایک

معیاری اور مستند کتاب ہے، اس کے پہلے اڈیشن میں ۱۴۶ اور دوسرے میں لگ بھگ پونے دو سو تلامذۂ غالب کے حالات وانتخاب کلام درج ہے، متون کے سلسلہ میں دیوان غالب، خطوط غالب، دستنبو اور گل رعنا کو شایع کیا، موخرالذکر میں غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انھوں نے خود کلکتہ کے مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر کیا تھا، اس کو ڈھونڈ نکالنا اور عالمانہ مقدمہ وحواشی کے ساتھ شایع کرنا مالک رام صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے، لیکن اول الذکر دونوں کتابوں کے سلسلے میں اہلِ نظر کو ان سے بعض بجا شکایتیں رہیں۔ تاہم غالب پر ان کے سارے کام مجموعی حیثیت سے بہت اہم اور بڑی قدر وقیمت کے حامل ہیں جس کا اندازہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اس تجزیہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:۔

"غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا، پچھلی نصف صدی سے جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لیے وقف رہا ہے اور جن کے لیے غالب اور اردو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں، مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف ومولف ومرتب ہیں، ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے، انکی خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہو جاتا کہ انھوں نے "ذکرِ غالب" یا "تلامذۂ غالب" یا "فسانۂ غالب" لکھیں یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب کیا یا غالب کے معاصرین، ممدوحین ورفقا پر مضامین قلم بند کیے بلکہ یہ کہ غالبیات کی موجودہ مستحکم باشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر اسے الگ کر دیا جائے تو ہمیں اس میں بہت کمی محسوس ہوگی، مالک رام کا کام اس پایے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا

جاسکتا ہے، اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی اعلا علمی روایت کو نظر میں رکھے
بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔"

انھوں نے کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام بھی کر لیا تھا مگر اسکی اشاعت نہ ہو سکی۔

غالب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تحقیق و تدوین نے بھی مالک رام صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیا ہے، ساہتیہ اکاڈمی نے ترجمان القرآن کی جو چار جلدیں شایع کی ہیں، ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں دوسروں کے ساتھ ان کی شرکت بھی رہی ہے لیکن غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کے متون کی تصحیح و تحقیق کا کام انھوں نے تن تنہا انجام دیا ہے، علامہ سیوطی نے جمع الجوامع کے نام سے احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا شیخ علی متقی کی کنز العمال اسی کی ترتیب و تنقیح ہے، لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ "سیوطی نے اپنی کتاب لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا اور شیخ علی متقی نے کنز العمال لکھ کر خود سیوطی پر احسان کیا" یہی بات اگر اس موقع پر بھی کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ مولانا مرحوم کے ایک بڑے قدرداں جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری رقمطراز ہیں:۔

"غبار خاطر مولانا کی بہترین علمی و فنی تحریروں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے افادہ و فیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا، اس دائرے کی تکمیل جناب مالک رام صاحب کے حواشی سے ہوتی ہے، نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں، سیکڑوں اشخاص و کتب تھیں جن کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا، فاضل مرتب کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود و کمال سے آشنا کیا ہے اور منقولات کی صحت کو

عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے"

تحقیق و تحشیہ کے کام میں بعض نقائص اور غبار خاطر سے اجمل خاں صاحب کے ضروری مقدمہ کو حذف کر دینے کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ کام مالک رام صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے متعلقات پر مالک رام نے متعدد وقیع مقالے بھی لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شایع کیا ہے، یہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔

متون کی تہذیب، تدوین اور تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے اور بھی گوناگوں کام انجام دیے ہیں جن میں کربل کتھا بڑا اہم ہے، اس کو پروفیسر مختارالدین احمد کے اشتراک سے مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

مالک رام صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا ایک میدان مذہب اسلام بھی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تدوین و تحقیق کا کام اس اعلیٰ اور بلند معیار پر وہ اسی لیے انجام دے سکے ہیں کہ انہیں اسلامیات پر عبور تھا، وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ براہِ راست کیا تھا اس لیے اسلام کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی مطالعہ و تحقیق اور معروضی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے، انہیں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی، خصوصاً عورتوں کے بارے میں وہ اسلامی تعلیم و ہدایت سے زیادہ متاثر تھے، ان کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے،

"اسلامیات بھی ان کی محققانہ کتاب ہے جو اسلام کے بارے میں چھ اہم مفید مضامین کا مجموعہ ہے، بعض خامیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مصنف کی غیر جانبداری، بے تعصبی اور مذہب اسلام سے ہمدردی کا ثبوت ہیں، ان میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان پر مسلمان فضلا کی نظر بھی شاید ہی گئی ہو سے"

سرِ خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

انھی خوبیوں کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:۔

"صراحت کے ساتھ اگر اپنا نام ہر بار نہ لکھتے رہیں تو کوئی شخص بھی ان مالک رام اور عبدالمالک کی تحریروں میں فرق و امتیاز کر ہی نہیں سکتا۔"

خاکہ نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، وہ لوگوں کا سراپا بیان کرنے اور اشخاص کی تصویر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" خاکہ نگاری اور مرقع آرائی کا اچھا نمونہ ہے۔ تذکرہ نگاری سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی، ذکر غالب اور تلامذہ غالب اسی ضمن میں آتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ تذکرۂ معاصرین ہے جس کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں اور ایک جلد کے بقدر مواد چھپنے سے رہ گیا ہے، "تذکرۂ ماہ و سال" کی اہمیت بھی مسلم ہے، ان کتابوں میں بعض غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں لیکن علی جواد زیدی کے بقول:

"ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہونا معمولی بات نہیں، اس جاں سوز کام کے لیے مالک رام ستائیش کے مستحق ہیں۔۔۔ تذکرۂ معاصرین کا سلسلہ دورِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بے حد مواد مہیا کرتا ہے، اس سلسلے میں تذکرہ نویسی ایک نئے اور ترقی یافتہ روپ میں ظاہر ہوتی ہے، جس لگن

اور خلوص سے مالک رام نے اپنے زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور بعض صحافیوں
کے حالات یکجا کر دیے ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس
طرح کے معلومات کی فراہمی سے سابقہ پڑا ہے۔"

اردو میں یادگار صحیفوں کی اشاعت کی روایت مالک رام صاحب ہی نے
قائم کی ہے، اس کی بدولت نذر عرشی، نذر ذاکر، نذر عابد، نذر زیدی اور
نذر حمید حبیبی باوقار کتابیں شایع ہوئیں، یہ صحیفے اس عہد کے بڑے ممتاز اصحاب علم
کی نگارشات سے مزین ہیں، اتنے سارے مضامین کو مالک رام صاحب ہی حاصل
بھی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جن موقر اصحاب کمال
کو یہ مضامین نذر کیے گئے ہیں ان کے حالات و کمالات کا پورا مرقع بھی پیش کیا ہے،
اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے "نذر" کے مجموعے شایع کیے ہیں، اور غالب
اور حالی پر بھی انگریزی میں کتابچے لکھے ہیں۔

جس طرح مالک رام صاحب نے دوسروں کی خدمات علم و ادب کے
اعتراف میں یہ یادگار صحیفے شایع کیے، اسی طرح خود ان کے کمالات کے اعتراف
کے لیے ارمغان مالک کی دو جلدیں شایع ہوئیں، جن کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
نے منتخب اہل علم کے ایک بورڈ کے تعاون سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شایع
کیا تھا، انگریزی میں یادگار صحیفے کو علی جواد زیدی صاحب نے ایڈٹ کیا تھا،
وہی "مالک رام ایک مطالعہ" کے بھی مرتب ہیں جو ۱۹۸۶ء میں شایع ہوئی ہے، اس
میں ان کے مبسوط مقدمہ کے علاوہ غالبیات، اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق
مرقع نگاری، نثر نگاری اور تدوین ابوالکلام کے زیر عنوان دو درجن سے زیادہ

مضامین شامل ہیں۔

مالک رام صاحب کسی ادارہ اور اکیڈمی سے وابستہ نہیں تھے حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے علم و ادب کش ماحول میں رہ کر انھوں نے تن تنہا یہ سارے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیے؟

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مالک رام صاحب اردو کے بہت اچھے نثر نگار تھے، اب ایسی سلیس، صحیح اور خوبصورت نثر لکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ انہیں قدرت نے تصنیف و تالیف کا خاص سلیقہ اور بڑا عمدہ ذوق عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریریں خوبی و دلکشی اور رعنائی و بانکپن سے معمور ہوتی ہیں، سادگی اور اصلیت کے باوجود انکی نثر میں شگفتگی، سلاست، روانی، برجستگی اور پُرکاری ہوتی ہے جو حشو و زوائد، طوالت، تکرار، ایچ پیچ اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہوتی ہے، الفاظ اور جملے نپے تلے اور موقع و محل کے اعتبار سے ہوتے ہیں، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے تھے، مختصر ہونے کے باوجود ان کی تحریریں جامع، پُرمغز، بلیغ اور جاندار ہوتی ہیں، ان کے موضوعات خشک علمی و تحقیقی ہوتے تھے اس کے باوجود وہ تحریر کی دلآویزی اور اثر انگیزی کو قائم رکھتے اور شگفتگی، بے ساختگی اور برجستگی میں کمی نہ آنے دیتے، ان کی عالمانہ، باوقار اور سنجیدہ تحریریں لطافت و حلاوت سے معمور ہوتی تھیں، کبھی کبھی طنز و مزاح کی لطیف آمیزش سے بھی ان کی نثر میں بڑی کیفیت و جاذبیت پیدا ہو گئی ہے، مواد و معلومات کو سمیٹ کر اچھے ڈھنگ اور خاص سلیقے سے پیش کرنے میں مالک رام صاحب کو بڑی مہارت ہے، ان کی

ساری کتابیں مواد و معلومات سے پُر اور مناسب و موزوں ترتیب و تبویب کا اچھا نمونہ ہیں۔

اپنے دور کے اکثر اکابر اور نامور فضلا و مشاہیر سے ان کے اچھے روابط تھے، دارالمصنفین سے ان کے روابط بہت قدیم تھے، جس زمانے میں انھوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں دارالمصنفین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے آوازۂ شہرت سے پورا ملک گونج رہا تھا، اس لیے مالک رام صاحب کی نگاہ بھی ان کی جانب اٹھی، غالب کے خطوط میں جب "سید چینی" کا ذکر پڑھا تو ان کو اس کی تلاش ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کے متعلق دریافت کیا' انھوں نے بتایا کہ کتب خانۂ حبیب گنج میں اس کا نسخہ موجود ہے، اس کے لیے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے رجوع کیا جائے، معارف میں مالک رام صاحب کے مضامین بھی چھپتے تھے اس کے سلیمان نمبر میں بھی ان کا مضمون شامل ہے' اور ان کی جب بھی کوئی کتاب شایع ہوتی تو اسے دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے، یہ معمول آخر تک قائم رہا، اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" کو پریس کے حوالے کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیجکر مشورہ و اصلاح کے طالب ہوئے، ان کے خلاف جب مولانا امداد صابری نے مقدمہ دائر کیا تو مالک رام صاحب نے نواب سائل دہلوی مرحوم کے ذریعہ سے صلح و صفائی کی پیش کش کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان سے ہمیشہ ان کے خوشگوار تعلقات اور برابر خط و کتابت رہی، انھوں نے ندر کے نام سے جو صحیفے شایع کیے اور خود ان کو جو صحیفہ نذر کیا گیا ان سب کی مجلسِ ارکان

میں شاہ صاحب کا نام اور حصہ مقالات میں صباح الدین صاحب کے مضامین شامل ہیں، مجھے یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ کب میرے کان میں مالک رام صاحب کا نام پڑا لیکن فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی بہت دھوم سے منائی گئی جس میں ارباب دول کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مشاہیر علماء و فضلاء بھی شریک ہوئے، اسی موقع پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی پاکیزہ صورت اور پرکشش شخصیت نے اپنی جانب متوجہ کر لیا، مجھ پر ان کی قابلیت اور وسعت علم و نظر کا سکہ اس سے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا، مئی ۱۹۶۱ء کے معارف میں مقریزی اور ان کی خطط پر میرا ایک مضمون شایع ہوا، اس میں میں نے مقریزی کی کسی تصنیف کو غیر مطبوعہ بتایا تھا، یہ مضمون مالک رام صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس وقت کے اڈیٹر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو لکھا کہ مقریزی کی یہ کتاب طبع ہو چکی ہے، شاہ صاحب نے جب ان کے گرامی نامہ کا مجھ سے تذکرہ کیا تو مجھے پسینہ آگیا مگر شاہ صاحب نے میری دلجوئی کے لیے فرمایا کہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آدمی نے تمہارا مضمون پڑھا۔

ساہتیہ اکاڈمی سے مالک رام صاحب نے جب غبار خاطر کا محقق و محشی ایڈیشن شایع کیا تو راقم نے معارف میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ "حواشی میں فاضل مرتب سے بعض اغلاط سرزد ہو گئے ہیں"، اسے پڑھ کر انھوں نے پھر شاہ صاحب کو تحریر فرمایا کہ "اغلاط سے مبرا ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اگر ان کی نشاندہی کر دی جائے تو آیندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی، شاہ صا

نے ان کا گرامی نامہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا " مالک رام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے اغلاط کی دو چار مثالیں ضرور دینی چاہیے تھی، میں نے عرض کیا کئی غلطیاں ہیں، معارف کے مختصر تبصرے میں ان کی صراحت کی گنجایش کہاں ہوتی ہے، شاہ صاحب نے فرمایا اب تم خود ان کو خط لکھو جس میں غلطیوں کی نشاندہی کر دو، محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ اغلاط کی نشاندہی کرتا ہوں، انہیں بھی اپنے خط میں شامل کر لینا، اس طرح ان کے تعاون سے تقریباً ۵ غلطیاں قلم بند کر کے ان کی خدمت میں بھیجی گئیں جن کو ملاحظہ فرمانے کے بعد انھوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اکثر سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جن سے اتفاق ہے آیندہ اڈیشن میں ان کے مطابق تصحیح کر دی جائے گی۔

اس خط سے میرے دل میں ان کی بڑائی جاگزیں ہو گئی اور اس کے بعد ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ کبھی کبھی سنین وغیرہ کی تحقیق اور بعض دوسرے امور دریافت کرنے کے لیے وہ مجھ ہیچ مداں کی جانب رجوع بھی فرمانے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نگر نئی دہلی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ میں بھی شرکت کے لیے گیا تھا، کانگریس کے اجلاس پانچ چھ روز تک ہوتے رہے، مالک رام صاحب تقریباً روزانہ شرکت کے لیے اپنے دولت کدہ سے جو ڈیفنس کالونی میں تھا تشریف لایا کرتے تھے ان دنوں ان سے متعدد علمی امور و مسائل پر گفتگو رہتی، ان صحبتوں سے انکے عجز و انکسار، شرافت، شائستگی، بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، خورد نوازی، عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔　　　(باقی)

مطبوعات جدیدہ

آثر مولانا ابوالکلام آزاد

از پروفیسر خلیق احمد نظامی، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۱۷، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتہ: ادارۂ ادبیات دلی قاسم جان اسٹریٹ ۲۰۰۹، دہلی نمبر ۶۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نامور مورخ اور مشہور مصنف ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد پر ان کی باوزن کتابوں سے علمی و تاریخی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے، ہندوستان کی ولی اللّٰہی تحریک اور اس کے اثر سے وجود میں آنے والی دوسری تحریکوں کے علاوہ انھوں نے جنگ آزادی کی تاریخ کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی کے رہنمائے اعظم مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی و شخصیت بھی ان کے مطالعہ کا موضوع رہی ہے، اس کتاب کے پانچ حصوں میں مولانا کی علمی، ادبی، تاریخی بصیرت، سیاسی شعور اور اولوالعزمانہ جدوجہد وغیرہ مختلف مآثر و مفاخر کا مرقع پیش کرکے اپنا جوہر اور کمال ہنر دکھایا ہے، پہلے مولانا کے بحر علم کی بے پایانی کا ذکر اور ان کی ذات میں آباد علم وعرفان کی دنیا کی سیر کرائی ہے اور ان کے علمی تبحر کے اسباب وعوامل کا تجزیہ کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ میں انہماک، غیر معمولی حافظہ، لسانی صلاحیتیں، مختلف زبانوں پر عبور، متعدد فنون میں جامعیت، ذوق علم و ادب، بلند ادبی معیار، شاعرانہ مذاق، موسیقی سے واقفیت، تاریخ سے دلچسپی اور اس سلسلہ کے خاص امتیازات، قدیم کلام و فلسفہ، بلاغت و تفسیر، موجودہ فلسفیانہ و سائنسی افکار و رجحانات سے باخبری،

عصری تقاضوں اور سماجی ضرورتوں پر گہری نظر، عالمی اور اسلامی دنیا کی سیاسی و مذہبی تحریکوں کا وسیع مطالعہ، جمالیاتی ذوق، محققانہ نظر، مجتہدانہ بصیرت، ہر مسئلہ کے تاریخی، نفسیاتی، عملی اور اعتقادی پہلوؤں کی وضاحت، اسلوب بیان اردو کی ترقی کی جدوجہد وغیرہ مآثر کا ذکر مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے حوالہ سے کیا ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے تاریخی شعور و بصیرت کے عالمانہ تجزیہ میں احساسِ زماں کی نزاکت، زندگی میں اوقات کی پابندی کے اہتمام، تاریخی دیدہ وری، تاریخی نقطۂ نظر، تاریخ ہند سے متعلق ان کے خیالات کی وسعت و گہرائی پر روشنی ڈالی ہے، تاریخی تحقیق میں آرکائیوز پر انکے زور دینے اور آثار قدیمہ کو قدیم تاریخ کا ماخذ قرار دینے اور غیر معمولی حافظہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، تیسرے باب میں دکھایا ہے کہ سرسید سے اختلاف کے باوجود مولانا پر ان کا جو اثر پڑا اس نے بھی ان کی عظمت و توقیر بڑھائی تھی، چوتھے حصہ میں مولانا کے قائدِ حریت ہونے کے ثبوت میں ان کے فطری انقلابی جذبات، حصول آزادی کے لیے بے نظیر قربانی، عدم تشدد کی گاندھیائی پالیسی سے مولانا کے اتفاق و اختلاف کے حدود اور قومی وحدت اور ملک کی سالمیت کو ہر حال میں مقدم سمجھنے کو پیش کیا ہے، سیاسی جھمیلوں میں پڑنے کے اسباب و محرکات بھی زیر بحث آئے ہیں اور جد و جہدِ آزادی میں مولانا کے کارنامے مختلف عنوانات کے تحت قلم بند کیے گئے ہیں، آخری باب میں انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کے متعلق فضول ولایعنی بحثوں کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں ظاہر کیے گئے تمام خیالات مولانا ہی کے ہیں، فاضل مصنف نے عقل نقل، ... واقعات و حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر انہیں صحیح اور مولانا کے سیاسی تدبر پر مبنی قرار دیا ہے، کتاب سے علم و تاریخ پر مصنف کی گہری نظر اور بحث و تجزیہ کی مورخانہ

بصیرت اور دیدہ وری کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب مولانا کے آثر اور افکار کا مرقع ہی نہیں ہے بلکہ نصف صدی کے تاریخی و سیاسی واقعات اور قومی جدوجہد کی روداد بھی ہے، آخر میں مولانا سے مصنف کے قرب و تعلق کا تذکرہ اور ان کی ایک تاریخی تقریر کا متن درج ہے اور شروع میں حضرت مولانا علی میاں کا جاندار پیش لفظ بھی اس کی زینت ہے۔ "ض"

آپ بیتی عباس محمود العقاد مترجم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، لمبی تقطیع عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۳۰۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی ۲۲۱۰۱۰۔

عباس محمود العقاد مصر کے صاحب طرز ادیب، انشا پرداز، نقاد، محقق، شاعر اور صحافی تھے، تاریخ اور سیرت نگاری میں ان کی تصنیفات مشہور و مقبول ہوئیں، ان میں بھی ان کا سلسلۂ عبقریات زیادہ ممتاز ہے، جس میں رسول اکرمؐ اور بعض کبار صحابۂ کرامؓ کے سوانح شامل ہیں، ان کے علاوہ بعض اسلامی موضوعات پر ان کی قابل قدر تحریریں ان کے غور و فکر اور دلکش و شگفتہ اسلوب کی وجہ سے غیر عربی زبانوں میں منتقل ہوئیں، زیر نظر کتاب ان کی مشہور آپ بیتی "انا" کا ترجمہ ہے، کاروانِ زندگی کے نقوش اور اس کے نشیب و فراز کی یہ داستان نہایت دلچسپ ہے، بچپن، زمانۂ طالب علمی، خاندان، احباب، اساتذہ، ہم عصر ماحول اور مطالعہ و مکروہات اور کچھ کھونے اور پانے کے واقعات اپنے دامن میں بصیرت و عبرت کی داستان سمیٹے ہوئے ہیں، ان کی یہ آپ بیتی ضمناً ان کے عہد کی تاریخ بھی ہے، ترجمہ عموماً سلیس و رواں ہے، مترجم عربی اور اردو کے مشاق اہل قلم ہیں، اس کے باوجود تعجب ہے کہ کہیں کہیں

بالکل ٹھیٹ لفظی ترجمہ کیا ہے اور بعض جگہ عبارت میں اغلاق وابہام ہے، مثلاً "میں نے خود سے محبت نہیں کی مگر ایک مناسب سبب کی وجہ سے جس کے باعث زندگی کا مستحق بنا ہوں اگر یہ سبب موجود نہ ہو تو زندگی کی لحظہ بھر کے لیے میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہوگی" "خیال کا دوسرا شے خیالات تک ایک الہام اور دل کی ایک پکار ہے دوسرے دلوں کے لیے" "نظام کی مخالفت اور واجبات کی ادائیگی میں گریز میں انتہا پسند تھا" "محبت طبیعت جنسیہ نہیں کیونکہ غریزۂ جنسیہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے" "کبھی محبت تمام چیزوں سے خالی ہو کر صرف ایک صفت سے متصف باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے اہتمام" "پھر یاد میں مبالغہ سے قبل میں نے اپنی طرف رجوع کیا" "ہاں اگر دوام مطالبہ ضروری ہو جائے تو پھر سردی کا دوام ہو" "جوانی اور بڑھاپے میں بہت سے فروق ہیں بلکہ یہ صحیح ہے کہ دنیا کی حالتوں میں کن ہی دو حالتوں میں اتنا فرق نہ ہوگا" "اپنی طبعی عادتوں کی تفسیر سے میں ان اوہام کی بھی اصلاح کر سکوں گا جو انظوار کے مفہوم کو سمجھنے میں پیدا ہوتے ہیں" "اشیاء کے اندر لوازم و ملابسات سے فرق ہو جاتا ہے" "عالم کتب میں خنصر و بنصر کے مابین انتقال کس قدر دور ہے" "عورت کی جانب نظر ہی زندگی کے بارے میں نظر کا معیار ہے جو اس پر غصہ کا سبب ہے اس کی تعظیم کے باعث" "اپنے الہام کو سمجھ نہیں سکتا کیونکہ اسے وہ عالم نسب (؟) سے حاصل کرتا تھا" "ایک جسم جو فرط محرومی سے متمرد ہو گیا ہے اور ایک روح جو شہوات سے فرط استمتاع کی وجہ سے متمرد ہو گئی ہے" "ہم اب بھی مجلس سماع میں جنسی و جسمانی ہی کر جاتے ہیں"۔ بعض جگہ خالص عربی الفاظ ہی منتقل کر دیے گئے ہیں، مثلاً استطرادی اسلوب، ایام واسابیع، متباعد قطبین، مسور اور فول،

کمیا فیلیہ، ذرائع، شعر و ظرائف، احساس پرستوں کے محالف، موسیقی عالیہ، بعض الفاظ کا مفہوم بھی صاف نہیں ہے جیسے "نظام و شیطنت یا نظام و خلاف ورزی" یہاں نظام سے شاید نظم و ضبط اور ڈسپلن مراد ہے، "مجھے سرعت سے محبت تھی" سے مقصود شاید یہ ہے کہ میں عجلت پسند تھا۔ کتابت کی غلطیاں بھی جا بجا ہیں جیسے سدا کو صدا، تعیتیم کو تقیم، ملتن کو طمن لکھ دیا گیا ہے۔

قومی کتابیات (شعبۂ اردو) ۸۱-۱۹۸۰ء مدیر: اقبال احمد، لبی تقطیع

عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۹۸، قیمت درج نہیں، پتہ: بھاشا وبھاگ، اتر پردیش سرکار، لکھنؤ۔

ہندوستانی قومی کتابیات کے موضوع پر اتر پردیش کی حکومت قریباً آٹھ دس برس سے ہندی اور اردو میں ہر سال ایک فہرست کتابیات شایع کرتی ہے، اس میں ملک میں ہر سال شایع شدہ کتابوں اور رسالوں کا تعارف کرایا جاتا ہے، زیر نظر مجموعہ ۸۱-۱۹۸۰ء کی کل ۳۸۵ مطبوعات پر مشتمل ہے جو ڈیلیوری آف بکس اینڈ نیوز پیپرس ایکٹ کے تحت نیشنل لائبریری کلکتہ کو موصول ہوئی تھیں، ان مطبوعات کو سلیقہ سے تین حصوں یعنی مضامین، اشاریۂ مصنفین و کتب اور اشاریۂ مضامین کے تحت تقسیم کرکے الگ الگ موضوعات مثلاً مذاہب، فلسفہ، منطق، عمرانیات وسیاسیات وغیرہ خانوں میں رکھا گیا ہے، آسانی کے لیے مذاہب میں بھی اسلام، برہمنیت، بدھمت اور سکھ مذہب کے تحت کتابوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے، پھر مصنفین و مضامین کے اشاریہ کے ذریعہ ان کی تلاش اور بھی آسان کر دی گئی ہے، اس فہرست کتابیات سے ہندوستان میں اردو دنیا کے مذاق و مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادبیات میں

۳۶۰، مذہبیات میں ۴۸، تاریخ میں ۶۳، عمرانیات میں ۳۸ کتابیں ہیں اور فلسفہ وسائنس اور فنون لطیفہ میں کل ۱۳۱ کتابوں کا اندراج ہوا۔ عربی ٹائپ میں طباعت بہتر ہے، البتہ اندراجات میں چند غلطیاں ہیں مثلاً عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی مرحوم کو ابوعبدالرحمٰن لکھدیا گیا اور شمس تبریز کے بجائے طبریز چھپ گیا۔

ماسونیت، ایک تاریخی دستاویز از جناب محمد صفوت سقا امینی سعدی ابوحبیب، ترجمہ از مولوی عبدالوہاب حجازی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۱، قیمت ۱۶ روپیے، پتہ: مکتبہ سلفیہ، مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰۔

رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے شایع ہونے والی اس کتاب میں ماسونیت کی تاریخ، اس کے اصول وضوابط، یہودیت سے اس کے ربط وتعلق اور اسلام ومسلمانوں کے متعلق اس کی فتنہ انگیزی کی حیرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے، اس تحریک نے خلافت عثمانیہ کے سقوط میں مصطفیٰ کمال، خالدہ ادیب، جاوید جمال سفاح انور طلعت وغیرہ کو اپنے دام تزویر کا شکار کیا، موجودہ زمانہ میں بعض عرب سربراہوں کا تعلق بھی اس جماعت سے ثابت ہوا، یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اکثر اسلام دشمن تحریکوں کا مزاج اور طریقۂ کار خفیہ وباطنی قسم کا رہا ہے، ماسونیت پر علامہ رشید رضا مصری کے ایک فتویٰ کے علاوہ فقہ اکیڈمی مکۃ المکرمہ کی ایک قرارداد بھی کتاب میں شامل ہے، ترجمہ سلیس ہے تاہم کہیں کہیں بعض عربی الفاظ وتعبیرات کو اور زیادہ آسان کیے جانے کی ضرورت تھی۔

ع۔ ص

جون ۱۹۹۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ رو۔

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ در

نام سے بنوائیں :

L MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے

اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، ا

رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوال

- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵% ہوگا ——— رقم پیشگی آنا چاہیے۔

جلد ۱۵۱ ماہ جون ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ عدد ۶

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

سبک ہندی اور صائب — جناب علی جواد زیدی، اندھیری ایسٹ بمبئی — ۴۰۵-۴۲۲
حفظان صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات — ڈاکٹر حافظ محمود اختر، پنجاب یونیورسٹی لاہور — ۴۲۳-۴۳۸
مشرقی یورپ کی ایک مظلوم ریاست بوسنیا وہرزگووینا — محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین — ۴۳۹-۴۵۳
فیضی کی بھگوت گیتا — جناب رام لعل نابھوی، نابھا پنجاب — ۴۵۴-۴۵۸
استدراک — ڈاکٹر ف۔ عبدالرحیم۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ — ۴۵۹-۴۶۰
اخبار علمیہ — ع۔ ص۔ — ۴۶۱-۴۶۴

تلخیص و تبصرہ

جزیرۂ کریمیا میں اسلام اور مسلمان — ک۔ ص — ۴۶۵-۴۷۰

وفیات

ذکر مالک رام — ضیاء الدین اصلاحی — ۴۷۱-۴۷۷
مطبوعات جدیدہ — ع۔ ع — ۴۷۸-۴۸۰

شذرات

ہندوستان قدیم زمانے سے علم و فن کا گہوارہ رہا ہے۔ علم و ہنر کی قدردانی اس ملک کا طرۂ امتیاز تھا مسلمانوں کے خمیر میں بھی علم و حکمت سے دلچسپی اور شیفتگی داخل ہے۔ انھوں نے اپنے ملک کی شاندار اور پُر عظمت علمی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ اور ہندوؤں کے علوم و معارف کی تحصیل میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے علمی کارنامے کسی اسلامی ملک سے کم نہیں ہیں۔ یہ ان کے لیے بھی اور ہندوستان کے لیے بھی فخر کی بات ہے۔ مگر اب خود مسلمانوں کے علوم اور ان سے نسبت رکھنے والی علمی روایات معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے قدیم علمی ذخیروں کی طبع و اشاعت کا کوئی سروسامان نہیں رہ گیا ہے۔ علمی خزانوں کا تلف ہونا علم و فن کی بدنصیبی بھی ہے اور ملک کا زیاں بھی۔ علوم و فنون کی طرف سے بے اعتنائی کسی حال میں بھی کسی حکومت کے لیے زیبا نہیں ہے۔ لیکن اس میں حکومت کی ناقدری کے علاوہ خود مسلمانوں کی بے حسی کا بھی بڑا دخل ہے۔

ہندوستان میں اسلامی علوم اور عربی کی امہاتِ کتب کی اشاعت کا ایک بڑا مرکز دائرۃ المعارف حیدرآباد تھا۔ ریاست کے خاتمہ کے بعد وہ دم توڑنے لگا تو ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی مسیحائی نے اس میں کچھ جان ڈالی۔ مگر ان کے بعد حکومت کی ناقدری نے اس کا وجود و عدم وجود برابر کر دیا ہے۔ ڈابھیل کی مجلس علمی نے زیادہ عمر نہیں پائی، تاہم اس کا کام قدر و قیمت کا حامل ہے۔ مولوی غلام رسول سورتی کا ادارہ بھی نسیاً منسیاً ہو چکا ہے۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی نے فارسی کی نایاب تاریخی کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ عرصہ سے بند ہے۔ چند برس پہلے بمبئی کے الدار السلفیہ نے تفسیر و حدیث وغیرہ کی بعض اہم کتابیں شائع کیں تو امید بندھی تھی مگر یہ سلسلہ بھی منقطع معلوم ہوتا ہے۔

ہم کو تسلیم ہے کہ عربی اور فارسی اس ملک کی زبانیں نہیں ہیں۔ لیکن علم و ادب کے معاملہ میں تعصب و تنگ نظری کو راہ دینا بدبختی ہے۔ تاہم اردو تو اسی ملک کی زبان اور اس کا عظیم ثقافتی ورثہ ہے۔ آخر

اس کے ساتھ کیوں سوتیلے پن کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ اور اسے کیوں سبزۂ بیگانہ سمجھا جا رہا ہے۔ کیا اپنے ہی ملک کے قیمتی سرمایہ کو ضائع کرنا وطن دوستی اور قومی خدمت ہے؟ اردو حکومت کو ایک آنکھ نہیں بھاتی حیرت اس پر ہے کہ اردو دشمنی میں فرقہ پرست اور سیکولر جماعتیں بالکل متحد ہیں۔ اس کی قانونی اور دستوری حیثیت تو کب کی ختم کردی گئی ہے۔ اور اس کی تعلیم کی راہ میں پہاڑ جیسی دشواریاں حائل کردی گئی ہیں، رہیں بعض صوبوں کی اردو اکاڈمیاں تو انھیں بھی غیر مؤثر، غیر مفید اور بے فیض بنا دیا گیا ہے۔ یہ حکومت سے زیادہ دست خویشتن کے جور کا شکار اور اردو والوں کی کشمکش و اختلاف کی آماجگاہ ہیں۔

اردو کے اہم اشاعتی ادارے اور معیاری کتب شائع کرنے والے مطابع دم توڑتے جارہے ہیں اور جو ہیں وہ جس معیار کی کتابیں شائع کر رہے ہیں ان سے اردو کے علمی ذخیرہ میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ہندی اکیڈمی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اب اسے اردو کتابوں کی طبع و اشاعت سے کیا سروکار؟ مکتبہ جامعہ نے معیاری ادب کی ترویج کا پروگرام بنایا۔ مغربی بنگال اور اترپردیش کی اردو اکاڈمیوں نے معیاری کتب کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ مگر یہ سارے سلسلے جاری نہیں رہ سکے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور دارالمصنفین اپنی بساط بھر اردو کی خدمت کرکے قوم کی ذہنی و دماغی تربیت کر رہے ہیں۔ لیکن دورِ زماں انھیں بھی میٹ رہا ہے۔

حال میں پبلک اورینٹل لائبریری پٹنہ نے اردو کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں جو پیش رفت کی ہے وہ قابل رشک ہے۔ اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار ایک فعال اور متحرک شخص ہیں۔ چند برس پہلے وہ مفید موضوعات پر بڑے معیاری سمینار کراتے رہے ہیں۔ اب انھوں نے سمینار کے مجموعۂ مقالات، مفید علمی کتب اور ایسے لٹریچر کی اشاعت کو اپنے دائرۂ عمل میں شامل کیا ہے جس سے حالات میں قوم کی تعمیر و تشکیل میں معاون ہو۔ انھوں نے اپنی اسّی مطبوعات دارالمصنفین کو نذر کی ہیں جن میں طلسم ہوش ربا کی آٹھ جلدیں اور ایک علاحدہ جلد میں اس کا مقدمہ بھی ہے۔ ہندوستانی، ادیب، العصر، زبان،

معیار اور پیام (مولانا آزاد) کی اشاعت سے ان رسالوں کو نئی زندگی مل گئی ہے۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا ترجمۂ قرآن "من موہن کی باتیں" (چند سورتیں)، پنڈت موتی لال نہرو کا خطبۂ صدارت اور اورنگزیب ایک نیا زاویۂ نظر' اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں ہے۔ ان کے علاوہ ایسے ناسازگار حالات میں دوسری سنجیدہ اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی کتابوں کی اشاعت نہایت قابل ستائش ہے۔ قوم کو اس کی قدر افزائی کرنی چاہیے۔

سیاسی اور قومی جھگڑوں اور جذباتی مسائل میں الجھ کر مسلمان برابر نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اس لیے مسلم رہنما نئی نئی جماعتیں تشکیل دے کر مسلمانوں کے انتشار کو بڑھانے کے بجائے سنجیدہ علمی، تعلیمی اور سماجی کاموں کی جانب توجہ کریں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نئی دہلی حکیم عبدالحمید صاحب کی سرپرستی اور جناب سید حامد کی رہنمائی میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے برابر جدوجہد کر رہی ہے۔ اسی مقصد سے سوسائٹی نے ۱۹۸۶ء میں طلبہ کو قرض تعلیمی وظیفے دینے کی اسکیم شروع کی تھی جس سے اب تک ۱۹۹ مسلم طلبہ وطالبات فیضیاب ہوئے ہیں۔ اور اب ۱۹۹۳ء تعلیمی سال کے دوران قرض وظیفے جاری کرنے کے لیے درخواستیں وصول کرنا شروع کر دیا ہے۔ خواہشمند طلبہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تعلیم آباد، سنگم وہار نئی دہلی سے مقررہ درخواست فارم اور شرائط کا سرکلر طلب کرکے ۱۱ ستمبر ۹۳ء تک واپس بھیج دیں۔

۱۵ر جون کو سابق وزیر اعظم اور جنتا دل کے رہنما مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ اپنی پارٹی کے پروگرام میں شرکت کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائے تو دارالمصنفین میں بھی قدم رنجہ فرمایا۔ ان کے ساتھ سابق وزیر داخلہ مفتی محمد سعید، سابق مرکزی وزیر محنت رام ولاس پاسوان اور اترپردیش جنتادل کے صدر چودھری کیول سنگھ اور چندرجیت یادو بھی تھے۔ ان لوگوں نے کتب خانہ کے نوادر اور مخطوطات دیکھ کر خوشی ظاہر کی۔ اس موقع پر شہر کے معزز اور دانشور مسلمان بھی جمع ہو گئے تھے جن کے سامنے مسٹر وی۔ پی سنگھ نے اقلیتوں کے مسائل کے بارے میں اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔

مقالات

سبک ہندی اور صائب

از جناب علی جواد زیدی صاحب ،بمبئی

اب سے کئی سال پہلے جب میں دیوان غنی کشمیری کی تحشی وتدوین میں مشغول تھا تو مجھے سبک ہندی کے ناقدین کے افکار وخیالات کو تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اس موضوع پر شرح وبسط سے غور وخوض کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ غنی کو بھی سبکِ ہندی کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس تفصیلی مطالعہ وجستجو کے باوجود یہ سوال بدستور محتاجِ جواب رہا کہ آخر یہ 'سبک ہندی' ہے کیا؟ ادبیات کے میدان میں بعض مفروضات کی ایسی تشہیر وتبلیغ ہوتی ہے کہ ذہنوں پر مرتسم نقش کا مٹانا آسان نظر نہیں آتا۔ اس کوہِ بے ستوں سے دودھ کی نہر نکالنے کے لیے کسی کوہکن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی یہ یقین نہیں رہتا کہ بیچارے کوہکن کو وصالِ شیریں حاصل بھی ہوگا یا کوئی پیرزن اس فکر میں ہے کہ کسی طرح کوہکن اپنا تیشہ خود اپنے ماتھے پر مار لے۔

متعدد کتابیں اور مقالے پڑھنے اور باریک بینی سے ان کے محتویات کی چھان بین کے بعد بھی یہ الجھن باقی رہ گئی کہ سبک ہندی کی ابتدا امیر خسرو دہلوی کے زمانے (۶۰۵ھ/ ۱۲۰۹-۱۲۰۸ء تا ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) سے ہوتی ہے یا ایران میں صفویہ کے دور کے آغاز (۹۰۶ھ/ ۱-۱۵۰۰ء) سے۔ آغاز کے ان مبیّنہ دو نقطوں کے درمیان ڈھائی سو سال کا فاصلہ حائل ہے جسے کسی طرح پُر نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے

بعد ایک صدی اور گزرتی ہے تب کہیں جا کے غنیؔ اور صائبؔ کی نوبت آتی ہے۔ جو حضرات خسرو کو "سبک ہندی" کا بنیادگزار قرار دیتے ہیں وہ زمانے کی لگام بالکل ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور جو ہرکی بیشی کا قصور صفویوں کے سر تھوپنا چاہتے ہیں وہ اسی زمانے کو نقطۂ آغاز مان کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے اور اپنے خیال میں قلعہ فتح کر لیتے ہیں۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایسے بھی صاحبانِ قلم ہیں جو خسروؔ اور صائبؔ دونوں ہی کو اس سبک و اسلوب کا موجد مانتے ہیں اور اس کی بھی پروا نہیں کرتے کہ ان دونوں کے درمیان تو چار صدیوں کی خلیج حائل ہے جسے کسی طرح پار نہیں کیا جا سکتا!

جناب علی دشتی اپنی تصنیف "نگاہے بہ صائبؔ" میں لکھتے ہیں:۔

"سبک ہندی اصطلاحیست	"سبک ہندی" ایسی اصطلاح ہے جو
برای یک نوعِ شعرِ فارسی کہ در	دسویں گیارہویں صدی ہجری میں
قرنِ ۱۰ و ۱۱ ہجری متداول ورائج	شعرِ فارسی کی خاص قسم کے لیے "شیوۂ
شد، مقابل شیوۂ خراسانی و	خراسانی" اور "سبک عراقی و شیرازی"
سبکِ عراقی و شیرازی۔ بعضی	کے مقابل رائج ہوئی۔ بعض حضرات
..... با این اصطلاح موافق	..... اس اصطلاح سے متفق نہیں
نیستند و برآنند کہ آں را سبکِ	ہیں اور یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کا
دوران صفوی نام نہند.....	نام "سبکِ صفوی" رکھا جائے۔
تغییر اصطلاحی کہ زبان زدِ عموم	جو اصطلاح، عام اہلِ ادب کی زبان
اہلِ ادب شدہ است چندان	پر چڑھ گئی ہے، اس کے بدلنے کی ضرورت
ضرورتی ندارد..... شاید ہم این	نہیں ہے..... شاید یہ اصطلاح اس

اصطلاح ازین ناشی شدہ است	بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان کے
کہ غالب شعرای فارسی گوئی ہندوستان	اکثر فارسی گو شعرا یا ایرانی شاعروں نے
یا شاعران ایرانی بہ ہندوستان رفتہ	ہندوستان پہنچ کر اس طرز میں شعر کہے
بدین شیوۂ سخن گفتہ کہ نمونۂ کامل این	ہوں گے جس کے مکمل نمونے صائب اور
سبک صائب و بیدل اند"	بیدل کے یہاں ملتے ہیں"۔

آگے چل کر علی دشتی لکھتے ہیں کہ خاقانی (۵۲۰-۵۹۵ھ/۱۱۲۶-۹۹-۱۱۹۸ء) "شعرائے سبک ہندی کے بہت سے موارد کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس حساب سے ان کو اس سبک کا مُبدع کہا جا سکتا ہے"۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "متقدمین میں حافظ (۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء تا ۷۹۱ھ/۸۹-۱۳۸۸ء) کو ... سبک ہندی کے پیروؤں میں شامل سمجھنا چاہیے"۔ اور پھر اسی ضمن میں لکھتے ہیں کہ "شعرائے سبک ہندی کے طبعی آثار کے سلسلے میں خسرو کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ نکلے گا کہ اس اسلوب کے آثار چھٹی صدی ہجری سے شروع ہو کر گیارہویں صدی ہجری تک باقی و قائم رہے"۔ تعبیروں کی اس کثرت میں نقطۂ آغاز ہی گم ہو گیا۔ امیر خسرو کی غزل سرائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "اس میں سب سے زیادہ سعدی[1] کی شاعری کا اثر پایا جاتا ہے۔ محمد علی اسلامی ندوشن کا خیال ہے کہ "نظامی گنجوی[2] کے آثار سے مشتاقانہ آشنائی کی بدولت خسرو کو اس شیوۂ خاص (ہندی) کے اخذ کرنے میں مدد ملی۔ نظامی گنجوی کا دورِ حیات سو سال پہلے تھا۔ اس نے اسی زمانے سے اپنی شاعری کی لمحی حاکی کی شاعری کی طرف موڑ دی تھی اور وہ خیال کی باریکی اور پیچاپیچی پر خاص توجہ رکھتا تھا"۔ چونکہ سبک ہندی کا سرچشمہ نظامی، حافظ بلکہ سعدی

---

[1] ۶۰۲ھ/ ۸-۱۲۰۷ء و لغایۃ ۶۹۳ھ/ ۹۴-۱۲۹۳ء [2] ۵۳۳ھ/ ۳۹-۱۱۳۸ء تا ۵۹۹ھ/ ۳-۱۲۰۲ء

و تکا کی سے جا ملتا ہے، اس لیے اس طرز شاعری کی ابتدا کو نیچے گھسیٹ کر کسی طرح صائب کے زمانے تک نہیں لایا جا سکتا۔ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ آثار شعری کا یہ سلسلہ ایک تدریجی اور طبعی ارتقا کی غمازی کرتا ہے جس کی طرف نظامی اور خاقانی کی توجہ شروع میں مبذول ہوئی اور صائب اور کلیم کے زمانے میں اوج و عروج کو پہنچی۔

یہ خلط مبحث نقطۂ تاریخ ہی سے مربوط نہیں ہے۔ اس سبک سے جن خصوصیات کو نسبت دی جاتی ہے اس میں بھی اسی طرح کے اشتباہات کی نشاندہی ملتی ہے۔ جن لوگوں نے "سبکِ ہندی" کی اصطلاح ایجاد کی وہ مدتوں اس سبک کی خصوصیتوں کی تعیین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ بعض اس سلسلے کو اس حد تک کھینچ لے گئے کہ چند نقائص ڈھونڈ ڈھونڈ کے پیدا کیے اور ان سب کو اس سبک کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس آخری گروہ کے بعض ادیبوں اور ناقدوں کو سبکِ ہندی کے نغمہ گروں کے یہاں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے وہ شدت و تفریطِ آمادۂ زوال ہے اور ادبی حلقے متوازن اور مبنی بر انصاف رایوں کو سننے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور فضا سازگار تر ہو گئی ہے۔

ہندی نژاد قارئین کے دلوں میں ایک جذبۂ وطن دوستی اس وقت بیدار ہوتا ہے جب وہ فارسی کی کسی تحریر میں لفظ "ہندی" سے متعارف ہوتے ہیں۔ زبان و ادبِ فارسی سے جو تھوڑی بہت آشنائی بھی رکھتے ہیں انہیں اس سے دکھ ہوتا ہے کہ والہ داغستانی، صاحبِ "ریاض الشعرا" کے قبیل کے اہلِ زبان، بیرونی فارسی نویسوں کی نگارشات کو کم ارزش سمجھتے ہیں اور اس کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار بھی کرتے ہیں۔ بیرونِ وطن پرور فارسی دانوں کو اس روشِ اہلِ زبان سے اور بھی رنج پہنچتا ہے۔ جب میں

اب سے تقریباً بتیس برس پہلے ایران گیا اور وہاں چار برس قیام کے دوران وہاں کے نمایندہ ادیبوں اور شاعروں سے ملا تو زمانۂ سابق کی یہ روش بہت تیزی سے انحطاط پذیر تھی اور خسرو، غنی اور اقبال کے بارے میں ان کے تنقیدی رویے میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ادبیاتِ سنسکرت و ہندی کے تراجم بھی وہاں شایع ہو رہے تھے، علی دشتی بھی انہیں آخر الذکر لوگوں میں تھے جو شدت پسندی کی روش ترک کرنے پر مائل تھے۔

اگرچہ علی دشتی نے علانیہ "سبک ہندی" کے نقائص گنائے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی کتاب مذکورۂ بالا ہی میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ:

"گسترشِ ادب و فرہنگ فارسی	"برصغیر ہندوستان میں ادب
در شبہ قارۂ ہندوستان خود	و زبان فارسی کی توسیع و فروغ خود
امری غرور انگیز است۔ مسافرت	ایک قابل فخر بات ہے۔ صائب، کلیم اور
بسیاری از شاعران چون صائب	عرفی کے پایے کے شاعر ہندوستان
و کلیم و عرفی بہ ہندوستان برای	گئے ہی اس لیے تھے کہ وہاں فارسی شعر
این بودہ کہ شعر و ادب فارسی بازارِ	و ادب کی گرم بازاری تھی اور اس کو
رائجی داشت۔ و عنوان فضل و کمال	وہاں عنوان فضل و کمال سمجھا جاتا
بشمار میرفت۔۔۔۔ نکتہ ہائی دقیق	تھا۔۔۔ "سبک ہندی" برتنے والے
و لطیف و پر مغز در سرایندگانِ	شعرا کے یہاں وہ دقیق و لطیف و پُر
سبک ہندی دیدہ می شود کہ نمی	مغز نکات دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے
توان آنہا را نادیدہ گرفت۔"	صرفِ نظر ناممکن ہے۔"

اب اگر ہم اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ اس "سبک" میں اظہار کمال کرنے والوں کی

و تکا کی سے جا ملتا ہے، اس لیے اس طرز شاعری کی ابتدا کو نیچے گھسیٹ کر کسی طرح صائب کے زمانے تک نہیں لایا جا سکتا۔ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ آثار شعری کا یہ سلسلہ ایک تدریجی اور طبعی ارتقا کی غمازی کرتا ہے جس کی طرف نظامی اور خاقانی کی توجہ شروع میں مبذول ہوئی اور صائب اور کلیم کے زمانے میں اوج و عروج کو پہنچی۔

یہ غلط مبحث فقط تاریخ ہی سے مربوط نہیں ہے۔ اس سبک سے جن خصوصیات کو نسبت دی جاتی ہے اس میں بھی اسی طرح کے اشتباہات کی نشاندہی ملتی ہے۔ جن لوگوں نے "سبک ہندی" کی اصطلاح ایجاد کی وہ مدتوں اس سبک کی خصوصیتوں کی تعیین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ بعض اس سلسلے کو اس حد تک کھینچ لے گئے کہ چند نقائص ڈھونڈ ڈھونڈ کے پیدا کیے اور ان سب کو اس سبک کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس آخری گروہ کے بعض ادیبوں اور ناقدوں کو سبک ہندی کے نغمہ گروں کے یہاں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے وہ شدت و تفریط آمادۂ زوال ہے اور ادبی حلقے متوازن اور مبنی بر انصاف دائیوں کو سننے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور فضا سازگار تر ہو گئی ہے۔

ہندی نژاد قارئین کے دلوں میں ایک جذبۂ وطن دوستی اس وقت بیدار ہوتا ہے جب وہ فارسی کی کسی تحریر میں لفظ "ہندی" سے متعارف ہوتے ہیں۔ زبان و ادب فارسی سے جو تھوڑی بہت آشنائی بھی رکھتے ہیں انہیں اس سے دکھ ہوتا ہے کہ والہ داغستانی، صاحبِ "ریاض الشعرا" کے قبیل کے اہلِ زبان، بیرونی فارسی نویسوں کی نگارشات کو کم ارزش سمجھتے ہیں اور اس کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار بھی کرتے ہیں۔ بیرونی وطن پرور فارسی دانوں کو اس روش اہلِ زبان سے اور بھی رنج پہنچتا ہے۔ جب میں

اب سے تقریباً بتیس برس پہلے ایران گیا اور وہاں چار برس قیام کے دوران وہاں کے نمایندہ ادیبوں اور شاعروں سے ملا تو زمانۂ سابق کی یہ روش بہت تیزی سے انحطاط پذیر تھی اور خسرو، غنی اور اقبال کے بارے میں ان کے تنقیدی رویے میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ادبیات سنسکرت و ہندی کے تراجم بھی وہاں شایع ہو رہے تھے، علی دشتی بھی انہیں آخرالذکر لوگوں میں تھے جو شدت پسندی کی روش ترک کرنے پر مائل تھے۔

اگرچہ علی دشتی نے علانیہ "سبک ہندی" کے نقائص گنائے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی کتاب مذکورۂ بالا ہی میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ :

"گسترش ادب و فرہنگ فارسی	"برصغیر ہندوستان میں ادب
در شبہ قارۂ ہندوستان خود	وزبان فارسی کی توسیع و فروغ خود
امری غرور انگیز است۔ مسافرت	ایک قابل فخر بات ہے۔ صائب، کلیم اور
بسیاری از شاعران چون صائب	عرفی کے پایے کے شاعر ہندوستان
و کلیم و عرفی بہ ہندوستان برای	گئے ہی اس لیے تھے کہ وہاں فارسی شعر
این بودہ کہ شعر و ادب فارسی بازار	و ادب کی گرم بازاری تھی اور اس کو
رائجی داشت۔ و عنوان فضل و کمال	وہاں عنوان فضل و کمال سمجھا جاتا
بشمار میرفت ..... نکتہ ہائی دقیق	تھا..... "سبک ہندی" برتنے والے
و لطیف و پر مغز در سراپند گان	شعرا کے یہاں وہ دقیق و لطیف و پُر
سبک ہندی دیدہ می شود کہ نمی	مغز نکات دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے
توان آنہا را نادیدہ گرفت۔"	صرف نظر ناممکن ہے۔"

اب اگر ہم اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ اس "سبک" میں اظہار کمال کرنے والوں کی

صف میں کلیم و صائب و عرفی بھی رہے ہیں بلکہ یہ اور ان کے پیشرو مثلاً نظیری و فغانی و حقانی وغیرہ ایرانی شعرا بھی اس طرز شاعری کے مبدع رہے ہیں تو دشتی کی کتاب یا اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں اس سبک کو "سبک ہندی" قرار دے کر جو نکتہ چینیاں کی گئی ہیں وہ سراسر علاقائی جنبہ داری پر مبنی ہیں۔ حق یہ ہے کہ ان کو کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ایسی طرز ہے جو ایران و افغانستان سے لے کر برصغیر ہندوستان تک جاری و ساری رہی ہے اور اس کو 'سبک ہندی' کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

جس اسلوب کو 'ہندوستانی' کا نام دے کر مطعون کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسے تازہ گوئی' خیال آفرینی وغیرہ کا نام بھی دیا جاتا ہے، علامہ شبلی نعمانی نے 'سبک ہندی' کی جگہ طرز "تازہ گوئی" کا ذکر کیا ہے گویا یہ طرز سادہ گوئی سے انحراف کی شکل ہے۔ علامہ شبلی تازہ گوئی کا موجد بابا فغانی کو مانتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "اوحدی نے "عرفات" میں تصریح کی ہے کہ تمام متاخرین فغانی کے مقلد ہیں۔ اندرونی شہادت یہ ہے کہ عرفی، شفائی، نظیری وغیرہ عموماً فغانی کی طرحوں پر غزل لکھتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تتبع کرنا چاہتے ہیں"[1]

دوسرے لفظوں میں ان کا بھی فیصلہ یہی ہے کہ نام جو کچھ بھی ہو' یہ طرز و اسلوب ہندوستانی نہیں بلکہ درآمدی مال ہے۔ مشہور مورخ ادبیات فارسی ڈاکٹر محمد ذبیح اللہ صفا کی تحقیق ہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں جو شاعری کی گئی اس کی خصوصیت تازہ مضامین و افکار سے شغف ہے۔ اس دور میں ادب عربی سے اقتباسات کا خاص

---

[1] شعر العجم ۵ ، ۲۰۔

رجحان تھا، شعرا "تازگیِ مواضیع و مطالب و مضامین" کی خاطر نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈنے لگے تھے۔ چنانچہ منوچہری (ف ۴۳۲ھ/۴۱ - ۱۰۴۰ء) نے "متنوع اور مرکب تشبیہات" میں نام پیدا کیا[1]۔ اس عہد کے آخر تک شاعروں کی توجہ استخراجِ معانیِ دقیق اور ترکیباتِ تازہ و مضامینِ متکبر اور تشبیہات نادر کی جانب مبذول ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ سامانی کے اوائل کے مقابلے میں اس دور کے شعرا کے یہاں تغیرات رونما ہوئے اور عنصری (ف ۴۳۱ھ/۴۰ - ۱۰۳۹ء) کی طرح کے شاعروں کا ایک گروہ شعری ایجادات کیلئے افکارِ علمی سے بھی استفادہ کرنے لگا[2]۔ شعر ہی کی طرح نثرِ عربی میں بھی چوتھی صدی ہجری اور پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں "فن و صنعت" کا رجحان بڑھا اور الفاظ پر توجہ زیادہ دی جانے لگی۔ ادبِ عربی میں استعمالِ صنائع کے رجحان سے فارسی والوں کی ہمتیں اور بڑھیں اور ایک نئے اسلوب کے آثار نمایاں ہوئے[3]۔ چوتھی صدی سے شروع ہونے والا یہ رجحان چھٹی صدی ہجری تک اور بھی شدت اختیار کرتا رہا۔ ایران جدید کے مشہور سبک شناس، ملک الشعرا بہار کی معتبر شہادت ہے:-

در نثرِ قرنِ ششم، مانندِ شعر،	"چھٹی صدی کی نثر میں بھی، شعر ہی
باستعمالِ صنائع و تکلفاتِ صوری	کی طرح، صنائع اور صوری تکلفات
و سجع ہائے مکرر و آوردن جملہ ہائے	اور مکرر سجع اور ایسے جملوں کا استعمال
مترادف المعنیٰ و مختلف اللفظ	ہونے لگا جو معنیٰ میں تو مترادف ہوں
متوسل گردیدند ... [4]	لیکن الفاظ مختلف ہوں ..."

اس سلسلے میں ابو المعالی (مترجم کلیلہ و دمنہ فارسی) کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] تاریخ ادبیات در ایران ۱: ۴۲۱ - ۳۶۳ [2] ایضاً ۱: ۳۶۵ [3] ایضاً ۱: ۶۳۰ [4] سبک شناسی ۲: ۲۴۸۔

بہار نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ طرز چوتھی صدی ہجری کے ادبیات عرب کی تقلید میں اختیار کی تھی[1]۔ اسی طرح غزلیات جامی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمیں احوال یعنی علاقہ شاعر بیافتن	"یہی اصول یعنی شاعر کا مضمون یابی اور
مضمون و تدارک قافیہ و توجہ بصنعت	تدارک قافیہ سے علاقہ اور صنعت اور
و ہنر نمائی موجب پیدا شدن سبک	ہنر نمائی پر توجہ سبک پیچیدۂ ہندی کے
پیچیدۂ ہندی گردید و ایں شیوہ	پیدا ہونے کا سبب ہوا اور یہ اسلوب
از ہرات توسط جامی و فغانی بہ دہلی	جامی و فغانی کے توسط سے ہرات سے چل کر
و دکن و اصفہان سرایت نمود[2]"	دلی، دکن، اور اصفہان تک سرایت کر گیا۔"

پھر تیموریوں کے زمانے کی شاعری پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:۔

"شعر فارسی، یکبارہ گوئی با خواجہ	"ایسا لگتا ہے کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمہ
حافظ علیہ الرحمہ بہبشت رفت	کے ساتھ شعر فارسی بہشت گیا تو پھر واپس
و باز نگشت و در فردوس بریں	نہیں آیا بلکہ فردوس بریں ہی میں وری
با دری گویان بہشتی جای خویش	(فارسی) زبان کے بہشتی شاعروں میں آخر
کرد، سبک پیچیدہ و متنوع بی	بے جگہ بنالی اور ایک طرز پیچیدہ و متنوع
روح کہ از عالم الفاظ تجاوز	و بے روح نے جو عالم الفاظ سے باہر قدم
نمی نمود شعر را از قصیدہ و غزل	نہیں رکھتی تھی شعر کو قصیدہ و غزل کی بجائے
بحالت ابتذال افگند و پایۂ سبک	حالت ابتذال میں لا ڈالا۔ اس زمانے میں
ہندی از ہمیں دورہ در ہرات	سبک ہندی کی بنیاد ہرات (خراسان

---

[1] سبک شناسی ۲، ۲۰۱۔ [2] ایضاً ۳، ۲۲۶۔

و خراسان و ترکستان نہادہ شد — و ترکستان میں ڈالا گئی۔ بعد میں اس نے
و بعد با صفہان و ہند سفر کرد[1] — اصفہان و ہند کا سفر کیا۔

یہ بات ایرانی شہادتوں اور ماہرین ادبیات فارسی کے بیانات سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رجحانات ہندوستان کے باہر سے بہت بعد میں عرب و ایران و افغانستان و ترکستان کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے تھے اور انھوں نے ایک پورا ارتقائی سفر طے کیا تھا۔ ان تازہ رجحانات کی اچھائیوں اور برائیوں کو ہندوستان سے وابستہ کرنا اہم تاریخی غلطی ہے۔

بے شک فارسی ہندوستانیوں، افغانوں اور پاکستانیوں کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی پیدائش و پرورش ایران میں ہوئی ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اہل ہند نے صدیوں اہل زبان کے پہلو بہ پہلو اس زبان کی خدمت کی ہے اور اس کی تربیت و تنظیم و فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس حسین و شیریں زبان نے ہندوستان میں ایسی رونق پائی تھی اور اس کا اثر و نفوذ ایسا جاذب توجہ تھا کہ اہل زبان اپنے وطن مالوف سے ہندوستان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اس ملک کے فارسی دانوں کو ان کے علم و شاعری سے فائدہ پہنچا اور ان کے شاگردوں یا فارسی زبان کے دوسرے حلقہ بگوشوں نے اس زبان میں ایسی مہارت بہم پہنچائی کہ ان کے کلام میں لغوی اور [illegible] کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ اہل ہند اہل ایران کی سند پہ شاعری میں اصرار کرتے تھے اس لیے ہندی فارسی گویوں کا محاورہ ایرانی محاورے کے عین مطابق ہوتا تھا، عرفی [illegible] و کلیم و قدسی وغیرہ کی موجودگی سے، جنھوں نے فارسی شاعری کی بساط نئے اہتمام سے

---

[1] سبک شناسی: ۳: ۱۸۴۔

بچھائی تھی۔ یہاں مجلس شعر و سخن اور بھی گرم ہوئی۔ ان ارباب فن کو ذی علم اور باہنر شاگرد بھی نصیب ہوئے۔ ان کے علاوہ علما، فضلا و مشائخ بھی گروہ در گروہ آتے رہے اور مدارس اور خانقاہوں میں زیادہ تر فارسی ہی کو ذریعۂ تدریس و ارشاد بناتے رہے، اس لیے دلی، لاہور، ملتان، کشمیر، دکن، مرشد آباد، بنارس، لکھنؤ اور الٰہ آباد وغیرہ میں اس زبان کی مزید توسیع اور بار آوری کا سامان مہیا ہوتا رہا۔

صائب کے سلسلے میں خاص طور سے سبک ہندی کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ صائب کی ساری زندگی ایران میں گزری پھر اس کا سبک 'ہندی' کیسے بن گیا؟ وہ ہندوستان آیا ضرور تھا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ صائب کا ہندوستان میں قیام بہت تھوڑی سی مدت تک تھا۔ یہ مدت پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہاں بھی صائب کی صحبت زیادہ تر ایرانیوں اور زبان دانانِ فارسی سے تھی۔ اس نے کسی لمحے بھی اسالیب و محاورۂ ایرانی سے منہ نہیں موڑا۔ جو کچھ صائب نے لکھا یا اس کے پیرووں اور شاگردوں نے کہا وہ فارسی کا سرمایۂ اصیل ہے۔ اس زمانے میں ہندکی ادبی محفل میں خوش سلیقہ اور باذوق ایرانیوں اور دیگر زبان دانوں کا تسلط تھا۔ اس وقت کے جو ادبی آثار موجود ہیں ان کا شمار بے واسطہ یا بالواسطہ عطیات خراسان و فارس میں ہوگا، چاہے ان کے محتویات کو ہم سبک ہندی یا تازہ گوئی کا نام دیدیں یا اس کے لیے کوئی اور اصطلاح تلاش کریں۔

اس ضمن میں ایک جاذب توجہ بحث یہ نکل پڑی ہے کہ سبک ہندی کا بزرگ نمایندہ کون ہے، صائب یا بیدل۔ ان میں سے ایک ایرانی النسل ہے اور ایک خارجی لیکن ان کے اکتسابات کے پیشِ نظر دونوں ہی کے لیے ادعائے بزرگی کیا جا سکتا ہے۔

خود اس بات سے یہ ظاہر تھا کہ یہ اسلوب ایران سے افغانستان و ہندوستان تک رائج
تھا۔ ان دونوں نامی شعرا کے درمیان تمثیل اور خیال آفرینی کے علاوہ اور کوئی مشترک
قدر نہیں ہے۔ ان دونوں میں ایک دوسرے پر فوقیت کا سوال اس کے پہلے کسی
اور نے اٹھایا نہیں تھا۔ علی دشتی نے یہ بحث چھیڑی لیکن وہ اسے کوئی قطعی شکل نہیں
دے پائے اور انھوں نے مقابلہ و موازنہ کو کسی منطقی نتیجے تک لے جانے کی زحمت
گوارا نہیں کی۔ چونکہ ان کی اس کتاب کا مقصد صرف صائب پر ایک نگاہ ڈالنا تھا
اس لیے انھوں نے اپنی گفتگو بیشتر صائب تک محدود رکھی اور ان دونوں میں بزرگ تر
یا اہم تر نمایندہ کون ہے اس کی تعیین کو غیر ضروری جانا، لیکن بحث چھیڑنے کی کوشش
ضرور کی۔ مقصود شاید یہ رہا ہو کہ اگر ایک کو نہیں تو دوسرے کو سبک ہندی کا
نمایندہ مان لیا جائے۔

سبک ہندی کی جن خصوصیات کی نشاندہی علی دشتی نے کی ہے وہ ہیں —
باریک خیالی، مبالغہ و اغراق، مضمون تراشی اور ایک بے نام خصوصیت جو رعایت
لفظی و معنوی سے مشابہت رکھتی ہے۔ نقائص میں صرف مسامحات لفظی اور 'زنجورہ'
گنائے ہیں۔ سب سے پہلے مسامحات لفظی کو لے لیجیے۔ مسامحۂ لفظی کسی بھی سبک کی
خصوصیت نہیں ہے۔ چند مسامحات ہر زبان اور ہر زمانے کے بزرگ اور پُرگو شعرا
کے یہاں مل جاتے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضرورت شعری یا شاعر کی فنی پابندیوں
کی طرف سے بے توجہی ایک انحراف کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ یا پھر محاورۂ عام کا
استعمال مسامحات کا باعث ہوا ہوگا۔ ان شخص لغزشوں کو۔ اگر انہیں واقعتاً لغزش
مان بھی لیا جائے، کسی اسلوب یا سبک کا جزو نہیں مانا جا سکتا۔ اگر اس سبک کے

پیروؤں نے ان مسامحات کو قابلِ تاسی خصوصیات یا حسن کی حیثیت سے قبول کر لیا ہو تو دوسری بات ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ اگر کچھ مسامحات کہیں مل بھی جائیں تو اس کا تعلق شاعر یا کسی خاص اثر سے ہوگا اور سبک کو اس کے لیے زندانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ علی دشتی نے مسامحات کی جو مثالیں دی ہیں وہ بھی اشکال سے خالی نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں سعید سیرجانی، ایرانی، شاعر و ناقد نے جو اعتراض کیا ہے وہ خاصا اہم ہے۔ مسامحات کے ضمن میں جن کلمات کو خردہ گیری کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ متقدمین کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں ؟ اگر قدما کے یہاں ان کلمات کا نشان مل جاتا ہے تو صائب و بیدل سے ٹٹ پونجیوں جیسا حساب کرنا کیا ضروری ہے، مثلاً اسی کلمۂ "چقدر" کو لیجیے کہ مصنف دشتی نے اسے بازاری قرار دیا ہے اور زیرلب یہ اقرار بھی کیا ہے کہ قدما کے آثار میں بھی تلاش سے مل سکتا ہے۔ اس لیے "چقدر" جیسے بے مقدار کلمے کے حق میں یہ سب زورِ قلم صرف کرنا یہاں تک کہ اس بیچارے کلمے کو تمسخر واستہزا کا نشانہ بنایا جائے کسی قدر غیر معتدل رویہ قرار دیا جائے گا۔ آخر صائب کے کلام کی قدر و قیمت ایک "چقدر" پر تو منحصر نہیں ہے۔ اگر اسی طرح کے دو تین مسامحات پر کہ ان کا مسامحہ ہونا بھی محل نظر ہے، ادیب و ناقد یہ اندازہ لگانا شروع کر دیں کہ مضمون آفرینی میں بہت زیادہ دقت پسندی سے کام لینے کی وجہ سے شعرا صحت لفظی سے بے پروا اور بے نیاز ہو گئے تھے، تو حق بجانب نہ ہوں گے۔ لغت و محاورہ ساکن و جامد حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک زندہ اور اجتماعی حقیقت ہیں کہ ان میں بھی جامعہ کی طرح تغییر و حرکت کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ تجویز بھی محل نظر

ہے کہ بازاری کلمات کو بارگاہ شعر میں اذن پذیرائی نہ ملنا چاہیے۔

دشتی نے الگ سے ایک فصل "زنجورہ" کے عنوان سے قائم کی ہے اور اس بنیاد پر اس سبکِ شعر کو ایرادات کی آماجگاہ بنایا ہے کہ شاعر دنیا کی بے ثباتی اور رنج وغم کی فراوانی پر ماتم کناں ہیں اور فریاد وزاری کرتے رہتے ہیں۔ اس انفعالی کیفیت پر گفتگو بے محل تو نہیں ہے لیکن یہ امر بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اشعار "زنجورہ" کا تناسب کیا ہے ؟ صائبؔ کے کلیات میں اشعار 'زنجورہ' کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے کہ ناقابل برداشت ہو جائے یا یہی غالب رنگ ہو، اگر ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ شاعر زمانے کے احساسات اور ادبی حسّیات کا عکاس ہے تو صائبؔ کے گرد و پیش کی دنیا کا مطالعہ بھی ضروری قرار پائے گا اور دوسرے معاصر شاعروں کے اسالیب وسبک کا تجزیہ اور تحلیل بھی لازم ہو گا کہ وہاں بھی" زنجورہ" کی مثالیں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر 'زنجورہ' ہر جگہ ہے اور ہر رنگ میں ہے تو اسے کسی ایک سبک کی نہیں بلکہ عام خصوصیت مانا جائے گا۔ لیکن 'زنجورہ' اتنا جاری و ساری نہیں رہا ہے۔

رعایت لفظی سے متشابہ خصوصیتیں بھی قدیم تر ہیں۔ 'مراعات النظیر' کی طرح کی صنعتیں تو نثر میں بھی سرایت کر گئی تھیں اور تاریخ تک کی کتابیں اس سے محفوظ نہیں تھیں۔ قرینہ یہی ہے کہ یہ ہم عصر پُر تکلف زندگی کی عکاس تھیں یا کم از کم انہیں معاشرے کے تکلفات و تعارفات اور ہم عصر جامعے کے بالائی طبقات کی زندگی کا پرتو ماننا پڑے گا۔ کیا اس سے سماج کی بے بضاعتی اور کھوکھلے پن کے اشارے نہیں ملتے ؟ کوئی ایسا شاعر اور سبک نہیں جس نے عمومی میلانات سے روگردانی کی ہو۔ زیادہ تر اجتماعی اطوار کسی خاص جگہ محصور و محدود ہو کر نہیں رہتے بلکہ منطقہ بمنطقہ

منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ میلانات و رجحاناتِ ادبی کی حکایت اس سے کچھ مختلف نہیں ہے، ان میلانات کو کسی ایک طبقے، منطقے یا زمانے میں محصور کرنا ممکن نہیں ہے۔ چاہے وہ ادبیات سنسکرت ہوں یا صدرِ اسلامی کے بعد کے عربی ادبیات کہیں بھی صنّاعی اور تکلفاتِ فنی شجرِ ممنوعہ نہیں تھے۔

دشتی جہاں بھی صائب کا ذکر چھیڑتے ہیں وہاں حافظ و سعدی و مولوی کا ذکر بھی بیچ بیچ میں کرتے جاتے ہیں۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نہ صرف صائب بلکہ ان مشاہیر کے بعد فارسی زبان کے جس شاعر نے شعرگوئی شعار کی وہ ان شخصیاتِ نابغہ کے زیرِ تاثیر ضرور آیا، ان کی پیروی کو سرمایۂ افتخار سمجھا اور اس سدا بہار گلشن سے گل چینی کرتا رہا۔ لیکن کہاں سعدی و مولوی و حافظ اور کہاں صائب؟ انکے درمیان زبردست تفاوت ہے۔ ان کا علاقہ مختلف ادوار سے رہا ہے اور ان متقدمین اور صائب کے اختلافاتِ فکر و اسالیب اسی اختلاف زمانی کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان مشاہیر ثلاثہ کا میلان بیشتر معنوی اور روحانی عناصر کی طرف تھا اور شعرِ صائب فقط اخلاقیات کے محور پر گردش کرتا رہتا ہے۔ اخلاقیات کو بھی دنیائے معنوی سے ربط ہے لیکن صائب کے یہاں اخلاقیات کی بنیادیں صرف اس کے مادی تصورات کی گہرائیوں تک جاتی ہیں۔ اس کے یہاں جو ماورائی تصورات ملتے بھی ہیں وہ عنصرِ غالب کی حیثیت نہیں رکھتے۔

عشق کے داخلی کیفیات و حالات کا بیان جو قدیم غزلوں کا اسلوب و طرّۂ امتیاز بتایا جاتا ہے۔ اس میں امتداد زمانہ کے ساتھ رسمی اور تشریفاتی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گداز و گرمی و شور جو عشق حقیقی میں کھل اٹھتا تھا وہ رو بہ زوال تھا سماج ایک فکری بحران سے دوچار تھا اور اقدار مذہبی و روحانی سے توسّل مائل بہ انحطاط

لیکن ابھی تک درسِ اخلاق ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا، جنھیں اخلاقیات سے علاقہ باقی تھا انہیں بھی آموختے کی ضرورت تھی۔ ظاہری طمطراق و زرق برق کے باوجود سماج کی اکثریت سکونِ دلی، آرامشِ درونی اور خوش حالی سے محروم تھی۔ زندگی کے اس گھیرے میں وہی شعر پھل پھول سکتا تھا جس کی آبیاری ہم عصر شعرا جدید اسلوب سے کریں۔ یہاں ایران و ہند کی قید نہیں تھی۔ شاعری کی محفل میں ایسے سامعین کا وجود ہی نہیں تھا جو اخلاقیات کے روکھے سوکھے وعظ پر کان لگائے رہیں۔ اس لیے شاعرانِ عصر نے تمثیل و خیال آفرینی کا راستہ اپنایا اور بے لذت اور بے آب مطالب کو ایسا گوارا بنا دیا کہ ان کے بہت سے اشعار ضرب المثل بن گئے۔ اب غزل میں جس عشق کا جلوہ نظر آتا تھا اس میں عشقِ حقیقی کا دلی پیوند نہیں تھا بلکہ کبھی کبھی تو ہوس کی طرف جھکاؤ نظر آنے لگتا تھا۔ اسی لیے اخلاق دوست شاعروں نے شعرِ عشق سے ارادتاً پرہیز کیا۔ صائبؔ کی نگاہ میں عشق کی حیثیت ثانوی تھی اور غنیؔ اور صائبؔ کی طرح کے بیشتر شعرائے تمثیل نگار اسی راستے پر گامزن رہے۔ یہاں صرف اشارے پر اکتفا کرتا ہوں، کیونکہ تفصیل باعثِ طوالت ہوگی۔

اگر غور کیا جائے تو جس اسلوب کو "سبک ہندی" کا نام دیا جاتا ہے اس کے افق پر کئی ضمنی اسلوب مثلاً تمثیل نگاری، خیال آفرینی وغیرہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ان سب کو الگ الگ رشتوں میں پرونا بھی غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ شعرِ تمثیل (مثال کے طور پر) کم و بیش سبھی تکنیک پرستوں کے یہاں نظر نہیں آتا۔

مشاعروں میں غزل طرح کرنے کا رواج عام تھا۔ کوئی مصراع قدیم یا معاصر شاعر کا منتخب کرکے طرح کر دیا جاتا تھا اور اسی وزن و قافیہ و ردیف میں کئی شعرا

طبع آزمائی کرکے سامعین کے سامنے پیش کرتے تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ایسے مشاعروں کو "مطارحہ" کا نام دیا ہے۔ ان مشاعروں کو ہندوستان میں قبول عام حاصل تھا، لیکن ایسا رواج ایران میں نہیں تھا۔ وہاں ہم طرح معاصر غزلیں نسبتاً کم دیکھنے میں آتی ہیں، لیکن یہاں بھی شعرا بطور خود ہم طرح غزلیں کہتے تھے۔ جن غزلوں کو شہرت مل جاتی یا جو زمینیں انہیں پسند آجاتی تھیں ان کا جواب لکھنے کی طرف صائبؔ کا میلان زیادہ تھا۔ نظیرہ گوئی صائبؔ کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ غزلیاتِ معاصر کا بھی جواب لکھا کرتے تھے۔ یہ شرف انھوں نے غنیؔ کشمیری کی غزلوں کو بھی بخشا ہے۔ لیکن اس میلان طبع سے اسلوب کے بارے میں کوئی محاکمہ غلط ہوگا۔

اکثر مسئلوں پر علی دشتی نے اپنے استدلال کی بنیاد تذکروں کے انتخابِ اشعار پر رکھی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ استدلال کا یہ طریقہ نااستوار ہے، کیونکہ تذکرہ نگاروں کے انتخاب یا تو ان کی ذاتی پسند و ناپسندیدگی پر مبنی ہیں یا پیشرو تذکرہ نویسوں کے اقتباسات پر۔ اگر تذکرہ نگار تمثیل یا باریک خیال کو پسند کرتا ہے تو اسی قسم کے اشعار ضمناً اور درج کرتا ہے۔ اگر استدلال کی خشت اول ہی ہو تو نظریہ سازی کی جو عمارت تیار کی جائے گی وہ ہمیشہ متزلزل رہے گی۔

اسی طرح شعرائے قدیم سے اتباع کا اظہار بھی ایک پرانی رسم پروری سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ جو شعرا ایک جگہ تتبع کا اقرار کرتے ہیں وہی دوسری جگہ انہیں شعرا کے مقابلے میں تفاخر و تعلی کے لہجے میں بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ صورت عام طور سے غزلوں کے مقطعوں میں نظر آتی ہے۔ اس قسم کے اشعار کا وجود طریق فکر اور طرزِ بیان کسی معاملے میں تتبع کی دلیل قطعی نہیں ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ شاعر

صرف پسند و میلان کا سرسری اظہار کر رہا ہے یا پیشرو شاعروں کی بزرگی کا اعتراف۔ تتبع و تقلید کی بات ہی اور ہے۔

علی دشتی کا یہ محاکمہ ٹھیک ہے کہ سعدی و مولوی جیسا شور عشق تمثیل نگاروں اور صائب کے کلام میں نہیں پایا جاتا لیکن تمثیل نگاری اور 'سبک ہندی' مترادف نہیں ہیں۔ چونکہ تمثیل نگاروں میں شورش عشق عام طور سے پائی نہیں جاتی اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اس کیفیت کو ارادی تسلیم کیا جائے۔ قاری یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ ان شاعروں کے یہاں یہ شور کیوں نہیں ملتا۔ عشق ایک جاذبۂ فطری ہے۔ ایسا شاید ہی کوئی انسان اور وہ بھی شاعر۔ ہوگا جس نے کسی لمحے میں بھی نیشِ عشق کی کھٹک محسوس نہ کی ہو۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہوا کہ صائب و غنی و کلیم کی شاعری اس گرمی و شور سے کم کم بہرہ ور ہوئی۔ یہ کافی نہیں ہے کہ ہم اس کو ایک سبک کا رنگ تقلیدی قرار دے کے خاموش ہو جائیں۔ گرمی عشق کے مدھم ہونے یا گویا نہ ہونے کے بھی اسباب ہوں گے۔ یہ سبب وہی ہے جسے علی دشتی نے "تصوف کی پسپائی اور عقب گیری" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ سوز و حرارت جو عشق کو حقیقت کا پرتو عطا کرتے ہیں۔ مجاز کا مقسوم نہیں عشق مجاز بھی شعر میں دو طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ جو طول کھینچ کر جنون کی سرحد تک جا پہنچتا ہے۔ صاحب "غیاث اللغات" عشق کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "عشق قسیمست از مالیخولیا"۔ عشق کا دوسرا رخ وہ ہے جس کا رشتہ علاقۂ و رغبت شدید سے جا ملتا ہے۔ یہ عشق شدت کے باوجود متوازن اور متعادل ہوتا ہے۔ قربانی سے دریغ نہیں کرتا اور عقل کی مصلحت اندیشی کو ٹھکرا دیتا ہے، اس کے باوجود یہ محویت اور وا رفتگی

کا حال بھی ہوتا ہے۔ ہوس کو چھوڑیے کہ وہ تو ہمیشہ دشمن عشق مانی گئی ہے۔ اس کے
ماورا ایک دنیائے وسیع ہے جو محبت سے لے کر میلان و رغبت سب کا احاطہ
کرتی ہے اور عام طور سے شعراسی دوسری نوع کی محبت سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس محبت
کو بوئے عطر اور پھیلی ہوئی چاندنی بھی کیف و سرور بخشتی ہے۔

صائب کے کلام میں سب تمثیل اور دور از کار خیال آفرینی ہی نہیں ہے بلکہ
وہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں کیفیت خاص پائی جاتی ہے۔ یہاں اس
طرح کے چند اشعار بھی ہدیۂ ناظرین کر کے اس مختصر تبصرے کو تمام کرتا ہوں:

کدام آبلہ پا عزم این بیابان کرد — کہ خارہا ہمہ گردن کشیدہ اند امروز
گہ سبو زنم بر سر، گہ بپای خم افتم — ساقیا مرنج از من عالم جوانیہاست
چشم مخمورش کہ ما را بادہ در پیمانہ ریخت — میتواند از نگاہے رنگ صد میخانہ ریخت
دلم بابا بہ دگر بہ سر ناز آمدۂ — از دل ما چہ بجا ماندہ کہ باز آمدۂ
آنقدر باش کہ من از سر جاں برخیزم — کہ بہ غم خانہ ام ای بندہ تو از آمدۂ
چشم عاشق ز تماشائی تو چوں سیر شود — ہر نگہ سلسلہ جنبان نگاہ دگر است
کہ گزشت است ازیں بادیہ دیگر امروز — نبض ارہ می تپد و سینۂ صحرا گرم است
میان نور و ظلمت عالمی دارم، نمی دانم — کہ شامم صبح یا صبح امیدم شام میگردد

حفظانِ صحت کے اسلامی اُصول اور جدید تحقیقات

از ڈاکٹر حافظ محمود اختر۔ لاہور

اسلام نے انسان کی روحانی اور مادی زندگی کی اصلاح و ارتقاء کے لیے اس کی صحت کو اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان عطیہ بتایا ہے۔ اگر صحت درست ہے تو انسان دینی اور دنیوی فرائض کو اچھی طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے جہاں انسان کی روحانی زندگی کی اصلاح کے لیے ہدایات دی ہیں وہاں اس کی جسمانی صحت کیلئے بھی دائمی اور عالمگیر راہنمائی کی ہے۔ اس کے بتائے ہوئے نظام میں انفرادی و اجتماعی سطح پر حفظانِ صحت کے اصول مدنظر رکھے گئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں جہاں انسان ذاتی طور پر صاف ستھرا رہتا ہے وہاں ماحول کو بھی آلودگیوں سے پاک رکھا جا سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس نے حفظانِ صحت کے کن بنیادی اصولوں کی طرف راہنمائی کی ہے۔

طہارت و پاکیزگی قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ (بقرہ، ۲۲۲)	بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور طہارت اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

قبا کی بستی والوں کا یہ وصف پسند کیا گیا کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کو پسند کرتے ہیں (آیۃ)

آغازِ وحی میں بھی یہ حکم دیا گیا کہ:

وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ وَالرُّجْزَ	اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھو اور ہر
فَاھْجُرْ (مدثر: ۴)	قسم کی غلاظت اور گندگی کو چھوڑ دو۔

اس آیت مبارکہ میں "رُجز" میں الف لام لگا کر تمام قسم کی غلاظتوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ وہ روحانی ہوں یا جسمانی، انفرادی ہوں یا اجتماعی، جسم سے متعلق ہوں یا لباس سے، خوراک سے متعلق ہوں یا ماحول سے، تھوڑی ہوں یا زیادہ'

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ[1]	طہارت ایمان کا حصہ ہے۔
الطُّھُوْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ[2]	طہارت نصف ایمان ہے۔
ان اللّٰہ طیب و یحب الطیب	اللہ تعالیٰ خود پاک ہیں اور وہ پاک
نظیف یحب النظافۃ[3]	چیزوں ہی کو پسند فرماتے ہیں۔

حضورؐ نے ایک موقع پر ایک شخص کو دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ گندے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ اپنے بالوں کو درست کر لیتا۔ ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا اسکے پاس پانی نہ تھا کہ یہ اپنے کپڑوں کو دھو لیتا[4] حضورؐ نے اسے براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے تنبیہ کے لیے صیغہ غائب استعمال فرمایا۔ آپؐ تنبیہ اور سرزنش کے موقع پر یہی اسلوب اختیار فرماتے تھے۔

نظافت و پاکیزگی حاصل کرنے اور ہر وقت پاکیزہ رہنے کے لیے اسلام نے ایسا ضابطۂ حیات وضع کر دیا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان ہر لمحہ پاک و صاف رہتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر صفائی انسان کی زندگی کا لازمی جز بن جاتی

ہے۔ پانچ وقت نماز کے لیے وضو کرنا، غسل، کپڑوں اور جسم کا پاک رکھنا، نماز کی جگہ کا پاک و صاف ہونا۔ یہ سارے امور ایک مسلمان کو ہمہ وقت پاک و صاف رہنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ وضو اور غسل کے پس منظر میں یہ فلسفہ بھی شامل ہے کہ یہ دراصل انسان کو بار بار احساسِ پاکیزگی دلانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خاص فضل سے یہ حقیقت سمجھا دی ہے کہ فلاح وسعادت کی جس شاہراہ کی طرف دعوت دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی اگر چہ اس کے بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں لیکن کثرت کے باوجود وہ سب ان عنوانات کے تحت آتے ہیں:

۱۔ طہارت۔ ۲۔ اخبات۔ ۳۔ سماحت۔ ۴۔ عدالت[۵]"

شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"نفسِ انسانی کی طہارت کی حالت دراصل اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی حالت سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ طہارت سے انسان فرشتوں والے ملکوتی کمالات حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے اور اس میں ملاء اعلیٰ سے استفادے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے[۶]"

صحت و صفائی کی کئی صورتیں ہیں اگر ان تمام صورتوں پر واقعتاً عمل کیا جائے تو انسانی صحت کا تحفظ یقینی ہے۔ مثلاً انسان ذاتی زندگی میں صفائی کا خیال رکھے۔ اپنے جسم کو میل کچیل سے پاک کرے۔ کپڑے صاف ستھرے پہنے۔ اگر تمام لوگ ایسا کرنے لگیں تو معاشرے میں صحت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے جسم کو پاک صاف رکھنے کے ساتھ ساتھ جب ہم اپنے اردگرد کو بھی گندگی سے صاف

رکھیں گے تو اصل مطلوبہ نتائج حاصل ہوں گے۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے سلسلے میں حضورؐ کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱۔ آپؐ نے راستہ میں قضائے حاجت سے منع فرمایا۔[۴۸]

۲۔ سایہ دار جگہ جہاں لوگ عموماً آرام کرتے ہیں وہاں بھی گندگی پھیلانے اور قضائے حاجت کی ممانعت فرمائی۔[۴۹]

۳۔ فراغت کے لیے آپؐ نے آبادی سے دور جانے کا حکم دیا ہے اور خود حضورؐ کا معمول بھی اس کے مطابق تھا۔[۵۰]

اس کا مقصد جہاں پردے اور حیاء کا اہتمام کرنا ہے وہاں صفائی بھی ملحوظِ خاطر ہے۔ اس زمانہ میں جنگلوں اور درختوں کو آلودگی میں کمی کے سلسلے میں بہت معاون سمجھا جاتا ہے۔ ہوا جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ درختوں ہی کی بدولت میسر آتی ہے۔[۵۱] درختوں کے اس فائدہ کے علاوہ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے اور طوفان اور سیلاب کے زور کو کم کرنے میں بھی درخت بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے آجکل کی حکومتیں شجر کاری کی مہم چلاتی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی درخت اگانے کی ترغیب سے خالی نہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان درخت اگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس کی کاشت سے پرندے انسان اور جانور خوراک حاصل کرتے ہیں اس کا یہ عمل اس کی طرف سے صدقہ بن جاتا ہے۔[۵۲] علامہ بدرالدین عینی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ درخت لگانے والے اور کھیتی کرنے والے کو اس عمل پر اجر و ثواب ملتا ہے خواہ اس نے ثواب کی نیت نہ کی ہو۔ اگر اس نے یہ درخت اگایا پھر فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے

حق میں صدقہ ہوگا[12]

عبادت گاہیں ہمارے ماحول کا ایک حصہ ہیں۔ انہیں صاف ستھرا رکھنے کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱)

اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو۔

خوشبو بھی ماحول کو صاف ستھرا رکھتی ہے جو حضورؐ کی پسندیدہ اشیاء میں سے ایک ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ خوشبو لگانے سے انسان کے باطن میں انشراح اور سرور پیدا ہوتا ہے، وہ طہارت کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس کے لیے اسکے نفس میں قوی بیداری پیدا ہوتی ہے[13]

حفظان صحت کے سلسلے میں کھانے پینے کے اصول بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پانی کے بارے میں کتب حدیث و فقہ میں مفصل احکام موجود ہیں۔ جس پانی میں ناپاکی شامل ہو جائے اسکے استعمال کے بارے میں فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر اس پانی کی رنگت، بو یا ذائقہ بدل جائے تو اس پانی سے طہارت حاصل نہیں کی جا سکتی[14]۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا "کسی کھلے گھڑے میں جس کا پانی نہانے دھونے یا پینے کے کام آتا ہو کوئی گندگی نہ ملائی جائے"[15] حضورؐ نے ایسے کنووں سے پانی پینے اور استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے جو کسی کھنڈر میں طویل عرصے سے ویران پڑے ہوں[16]۔ کیونکہ اس قسم کے کنوؤں سے گیس نکلتی رہتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی شخص اس طرح کے کنویں میں کسی مقصد سے اترتا ہے تو وہ عموماً بے ہوش ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو اس کی موت بھی ہو جاتی ہے۔

کھانے کے معاملے میں اصولی ہدایات دیتے ہوئے قرآن حکیم نے حلال اور طیب اشیاء ہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

۱۔ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (البقرہ: ۱۶۸)	اے انسانو! کھاؤ اس چیز میں سے جو زمین میں ہے پاکیزہ اور حلال۔
۲۔ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (البقرہ: ۱۷۲)	اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔
۳۔ يَآ أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (المومنون: ۵۱)	اے رسولو! پاک اشیاء میں سے کھاؤ اور اچھے اعمال کرو۔
۴۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف: ۳۲)	پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو۔
۵۔ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ (المائدہ: ۴)	آپ سے سوال کرتے ہیں کہ انکے لیے کیا حلال ہے؟ فرما دیجئے انکے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ہیں۔

حلال و حرام کی تقسیم بھی در حقیقت اسی اصول پر مبنی ہے کہ چنانچہ طبی یا اخلاقی طور پر جس چیز کا مضر اثر انسان پر ہوتا ہو اس کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے،

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ (البقرہ: ۱۷۳)	بے شک تمھارے لیے مردار، بہنے والا خون اور خنزیر کا گوشت حرام قرار

دیا گیا ہے۔

محققین کا بیان ہے کہ مردار، جمے ہوئے خون اور خنزیر کے گوشت میں بے شمار مضرتیں ہیں اور جو شخص انہیں استعمال کرتا ہے وہ ان سے متاثر ہوتا ہے، شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

"اہلِ عقل متفق ہیں اور انھوں نے تجربہ اور فراست سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ مردار میں عموماً زہریلے اثرات ہوتے ہیں، شرعی طور پر ذبح نہ کیے جانے والے جانوروں کے جسم کا خون اندر ہی جم جاتا ہے، اس کی وجہ سے ان میں جو زہریلے اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کے اندر ہی رہ جاتے ہیں اور یوں گوشت کھانے والے کو منفی طور پر متاثر کرتے ہیں۔"[۳۸]

جانوروں کی حلت و حرمت کا ذکر کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"ان تمام جانوروں کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں حفظ صحتِ نسانی اور مصلحتِ حقہ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔"[۳۹]

گندگی خور جانور بھی شریعتِ اسلامیہ میں ممنوع ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

نھیٰ رسول اللہ صلعم عن	حضورؐ نے نجاست خور جانور کے کھانے
اکل الجلالۃ والبانھا۔[۴۰]	سے منع فرمایا۔

جلالہ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا منظور نعمانی لکھتے ہیں "کبھی بعض جانوروں گائے بکری وغیرہ کا مزاج ایسا بگڑتا ہے کہ وہ نجاست اور غلاظت بھی کھانے لگتی ہیں۔ ایسی صورت میں اس نجاست کے اثرات ان کے گوشت اور دودھ میں

بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے جانور کو جلالہ کہتے ہیں۔ گویا طبی مضرتیں گوشت اور دودھ
میں پیدا ہو جاتی ہیں[۱۲]

اسلام میں خنزیر کا گوشت بھی حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ موجودہ تحقیقات نے یہ
ثابت کر دیا ہے کہ یہ اپنے اندر بہت سے امراض لیے ہوئے ہوتا ہے مشہور مرض
Tapeworm صرف ان افراد کو لاحق ہوتا ہے جو خنزیر خور ہوتے ہیں۔ جس مرض
کو یہ مرض لاحق ہو خنزیر اس کا فُضلہ کھالیتا ہے اس کی وجہ سے اس کے معدے
میں اس مرض کے نامکمل کیڑے لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ
کیڑے خون کے ذریعے سور کے جسم کے مختلف حصوں میں جا کر گھر بنا لیتے ہیں۔
سور کا گوشت کھانے والے ان کیڑوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ یہ کیڑا انسان کی
آنتوں میں پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور کئی فٹ لمبا ہو جاتا ہے۔

ایک اور مرض Trichiniasis بھی خنزیر خور لوگوں کو لاحق ہوتا ہے۔
اس مرض کے جراثیم خوردبین سے بھی نہیں دیکھے جا سکتے۔ ڈاکٹر گوشت کا معائنہ
کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس میں اس مرض کے جراثیم موجود ہیں۔
پیچش کی ایک قسم Belantidnicoli بھی خنزیر کے گوشت سے پیدا
ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چینڈلر Chandlers نے ثابت کیا ہے کہ یہ بیماری صرف
انہی ممالک میں ہے جہاں اس جانور کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک
اور قسم کے جراثیم کا ذکر کیا ہے جو سور سے پھیلتے ہیں یہ Faciolopsis buski
کہلاتے ہیں۔ Hook worm نام کا مرض بھی سور کے گوشت سے پیدا ہوتا ہے۔
ایک اور مرض بیماری (Roun worm) بھی اسی سے پھیلتی ہے۔ Clonorchiases

اور Gigantohyschus اور Endemic Haemoptysis اسی سبب سے پھیلتے ہیں۔ ثانی الذکر بیماری میں معدے کے اندر کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ آخر الذکر مرض میں پھیپھڑوں سے خون بہنے لگتا ہے۔ جن علاقوں میں خنزیر نہیں کھائے جاتے وہاں یہ امراض نہیں ہوتے [۲۲]

یہی حال شراب کا بھی ہے۔ مفتی عبدہٗ کے حوالہ سے مولانا مفتی محمد شفیع نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں شراب کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا مقولہ نقل کیا ہے کہ اگر آدھے شراب خانے بند کر دیے جائیں تو میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ آدھے شفاخانے اور آدھے جیل خانے بلاضرورت ہونے کی وجہ سے بند ہو جائیں گے [۲۳]

قرآن مجید نے پاکیزہ اشیاء کے استعمال کے بارے میں بھی یہ اصولی ضابطہ بیان کیا ہے کہ ان کے استعمال میں اسراف سے کام نہ لیا جائے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف: ۳۱)

(کھاؤ پیو اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ایران کے ایک رئیس نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے ذاتی طبیب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کے علاج معالجے کی خدمت [illegible] دے لیکن ایک عرصے تک اس کے پاس کوئی مریض ہی نہیں آیا چنانچہ اس نے [illegible] سے شکایت کی کہ میرے پاس کوئی مریض سرے سے آتا ہی نہیں۔ رئیس نے کہا کہ تم حضورؐ کے پاس جا کر مریض طلب کرو۔ آپؐ نے اسے یہ جواب دیا:

"یہ لوگ اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک کہ انہیں بھوک نہ ہو، جب تک

پیاس نہ ہو اس وقت تک پانی نہیں پیتے۔ یہ کھانا اس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب کہ انہیں ابھی کھانے کی خواہش باقی ہوتی ہے۔"[۱۲]

ڈاکٹر حسین نصر لکھتے ہیں:

"طب اور اس کے دیگر شعبوں، صفائی اور غذا وغیرہ کے بارے میں اقوالِ نبویؐ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے ان تعلیمات کو دل و جان سے قبول بھی کیا اور انہیں عملی طور پر اختیار بھی کیا۔"[۱۳]

وہ مزید لکھتے ہیں:

"جہاں تک حفظانِ صحت کا تعلق ہے یہ بات بڑی اہم ہے کہ اسلامی طب میں غذا کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ موجودہ طب میں بھی غذا کو دوا سے زیادہ اہم قرار دیا گیا ہے۔"[۱۴]

قرآن مجید و احادیث نبویؐ میں مختلف پھلوں اور غذائی اشیاء کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ تمہارے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ان فوائد کا اجمالی ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے۔ لیکن حدیث نبویؐ میں کسی قدر تفصیل پائی جاتی ہے۔ پھل وغیرہ بھی انسانی صحت کی ضمانت ہیں۔

حضور اکرمؐ تمام عمر سادہ غذا استعمال کرتے رہے اور اسی کی تعلیم انھوں نے اپنے متبعین کو بھی دی ہے۔[۱۵] مقدام بن معدیکرب کہتے ہیں میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سُنا:

"آدمی نے کوئی برتن پیٹ سے بڑھ کر نہیں بھرا۔ اس کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں اور اگر پیٹ بھرنا ضروری ہی ہو جائے تو چاہیے کہ

پیٹ کے تین حصے کر لیے جائیں ایک حصہ میں کھانا، دوسرے میں پانی اور تیسرا حصہ سانس کی آمد و رفت کے لیے[۲۱]

ایک شخص نے حضورؐ کے سامنے لمبی ڈکار ماری تو آپؐ نے فرمایا اس ڈکار کو چھوٹی کر اس لیے کہ قیامت کے روز بڑی بھوک رکھنے والا وہ شخص ہوگا جو دنیا میں پیٹ بھر کر کھاتا ہے[۲۲] آپؐ کا مقصد اسے کم خوری کی تلقین کرنا تھا۔

معدہ کے اندر عمل تخمیر کے بعد غذا ہضم ہوتی ہے۔ اگر معدہ مکمل طور پر بھرا ہو تو ایک طرف اسے اپنا کام کرنے میں دقت ہوتی ہے دوسری جانب اخراج ریح اور کھٹی ڈکاروں سے قریب بیٹھے ہوئے لوگ اذیت کا شکار ہوتے ہیں۔ بسیار خور لوگ ہی بالعموم گردے۔ تپے۔ ذیابیطس اور جگر کے ورم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر بچپن میں ہی بسیار خوری کی عادت پڑ جائے تو بچے موٹے ہو جاتے ہیں۔ قبل از وقت بلوغت کو پہنچ جاتے ہیں اور جنسی اعتبار سے بھی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ جنسی مسائل پیدا کرنے کے ساتھ ہی کم عمری کا باعث بھی بنتی ہے۔ اگر خوراک مناسب مقدار تک ہی استعمال کی جائے تو وہ آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے لیکن جس طرح ایک مشین کو اس کی استعدادِ کار سے زیادہ استعمال کیا جائے تو وہ جلد ہی خراب ہو جاتی ہے اسی طرح پیٹ کے وہ اعضاء جو انہضام کا کام کرتے ہیں اگر ان پر زیادہ بوجھ پڑ جائے تو اعضائے انسانی جلد ناکارہ ہو کر مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، زیادہ کھانے سے طاقت کی بجائے کمزوری بڑھتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو اس کے اعضاء بھوکے ہوتے ہیں یعنی

اس کے اندر جنسی حس زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت اس پر حیوانیت طاری ہوتی ہے اگر پیٹ خالی ہو تو اس کے اعضا سیر ہوتے ہیں۔[۴۰]

اسی لیے حضورؐ نے کم خوری کی تلقین فرمائی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لیے کافی ہے اور تین آدمیوں کا چار آدمیوں کے لیے۔[۴۱] مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے دو کا چار کے لیے اور چار کا آٹھ آدمیوں کے لیے کافی ہے۔[۴۲] حضورؐ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔[۴۳]

جن کاموں سے مفید نتائج مرتب ہوتے ہوں، آپؐ انہیں اسلامی سوسائٹی میں رائج کرنے کی ترغیب موثر پیرائے میں دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ میں نے تورات میں پڑھا کہ کھانے کے وقت ہاتھ منہ دھونا باعث برکت ہے۔ اس کا ذکر میں نے حضورؐ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا:

برکۃ الطعام الوضوءُ قبلہ الوضوءُ　　کھانے سے قبل اور بعد وضو کرنا

وبعدہ[۴۴]　　باعثِ برکت ہے

حضرت شاہ ولی اللہ برکت کی وضاحت یوں فرماتے ہیں کہ "غذا کا جو اصل مقصد ہے وہ اچھی طرح سے حاصل ہو، کھانا رغبت اور لذت کے ساتھ کھایا جائے تھوڑی سی مقدار بھی کافی ہو جائے، اس سے صالح خون پیدا ہو اور صالح خون ہی جزو بدن بنے۔[۴۵] مولانا منظور نعمانی لکھتے ہیں:

"یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ صفائی اور اصول صحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہاتھ اور منہ جو کھانے کے آلات ہیں، کھانا کھانے سے پہلے بھی انہیں دھو کر اچھی طرح

سے صاف کیا جائے اور کھانے کے بعد بھی[۳۶]

مطلب یہ ہے کہ کھانے کے ساتھ ہاتھوں کو لگے ہوئے جراثیم اندر جائیں گے تو بیماری پھیلے گی اور کھانے کے ساتھ لگی ہوئی چکناہٹ وغیرہ بھی مضر ہوسکتی ہے اسی لیے کہا گیا کہ بعد میں بھی ہاتھ دھوئے جائیں۔

کھانے پینے میں اصل وسیلہ منھ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صفائی کی بڑی تاکید فرمائی ہے، ارشاد ہے:

لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُہُمْ بِالسِّوَاکِ عِنْدَ کُلِّ صَلٰوۃٍ[۳۷]	اگر یہ بات میری امت پر بوجھ نہ ہوتی تو میں تمام نمازوں کے لیے مسواک لازم کر دیتا۔

حضورؐ نے فرمایا مجھے مسواک کی اس قدر تاکید کی گئی کہ میں سمجھنے لگا کہ یہ عمل فرض قرار دے دیا جائے گا[۳۸] آپؐ نے جن پانچ چیزوں کو اصول فطرت میں بتایا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے، ایک اور موقع پر فرمایا چار چیزیں تمام انبیاء کی سنت رہی ہیں۔ حیاء، خوشبو لگانا۔ مسواک کرنا۔ نکاح کرنا۔ آپؐ نے مسواک کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلسِّوَاکُ مُطَہِّرَۃٌ لِلْفَمِ مَرْضَاۃٌ لِلرَّبِّ[۳۹]	مسواک منھ کو صاف کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہے۔

حضورؐ جب نیند سے بیدار ہوتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے[۴۰] کیونکہ اس سے منھ میں جمع شدہ مضر مادے خارج ہو جاتے ہیں۔

بصارت کے تحفظ کے لیے آپؐ نے سرمہ لگانے کی ترغیب دلائی[۴۱] ارشاد

ہوا کہ "اثمد" کا سرمہ لگایا کرو[۴۲] وضو کے وقت تازہ پانی آنکھوں میں جاتا ہے تو آنکھوں میں پڑا ہوا سارا گرد و غبار نکل جاتا ہے۔ گلے تک مسواک کرنے سے آنکھوں سے جو پانی نکلتا ہے وہ بھی آنکھ کی صفائی کا سبب بنتا ہے۔ اسلامی غسل بھی حفظانِ صحت کی ضمانت ہے۔ غسل سے قبل وضو کا حکم ہے۔ بدن کے زیریں حصے کو ٹھنڈا کرنے سے مفید نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے جسم اور دماغ کے درجۂ حرارت میں زیادہ فرق نہیں رہتا۔ بلا ترتیب اگر جسم پر یکدم پانی ڈالا جائے تو جسم کا درجۂ حرارت دفعتاً گر جاتا ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے سے پانی جسم پر یکدم نہیں گرتا۔ اس طرح جسم کا درجۂ حرارت بھی دفعتاً نہیں گرتا۔

غسل خانوں اور بیت الخلاء کو یکجا کرنا بھی اسلام میں پسند نہیں کیا گیا ہے۔[۴۳]

جنسی فعل کے بعد جسم میں جو نقاہت پیدا ہوتی ہے، اطبا کا خیال ہے کہ غسل سے یہ کمزوری دور ہو جاتی ہے[۴۴] اسلام میں غسل سے قبل وضو کے حکم میں یہ حکمت بھی مخفی ہے کہ گرم علاقوں میں وضو کر لینے کے بعد جسم تر و تازگی محسوس کرنے لگتا ہے اور تھوڑا سا پانی ہی جسم پر ڈال لینے کے بعد انسان غسل کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ پانی کی اچھی خاصی مقدار استعمال کر کے ہی فرحت و راحت حاصل کر سکتا تھا۔ حضورؐ نے غسل کے بعد سر میں تیل لگانا پسند فرمایا ہے۔ آپؐ کا معمول مبارک بھی ایسا ہی تھا۔ بالوں کو خشک رکھنے سے سر میں خشکی پیدا ہونے کے علاوہ سر کے بال بھی جھڑنے لگتے ہیں۔ حضورؐ کی سنت کے مطابق ایک معمولی کام سے خشکی بھی دور ہو جاتی ہے اور بال بھی محفوظ رہتے ہیں۔[۴۵]

حواشی

۱؎ مسلم، امام، الجامع الصحیح، دارالفکر، بیروت، الجزءالاول، صفحہ ۱۴۰ ۲؎ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، امام، جامع ترمذی، جلد دوم، صفحہ ۱۰۹ ۳؎ ایضاً، جلد چہارم، صفحہ ۱۹۴ ۴؎ ابو داؤد، امام، سنن ابی داؤد، جلد چہارم، صفحہ ۷۴، (باب فی غسل الثوب وفی الخلقان) خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، المکتب الاسلامی، دمشق، ۱۹۶۱، جلد دوم، صفحہ ۴۲ ۵؎ و ۶؎ ولی اللہ شاہ، حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم) قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳، صفحہ ۲۱، ۷؎ و ۸؎ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۹۹ ۹؎ ایضاً مزید نسائی، امام، سنن النسائی، مطبوعہ المصریہ، قاہرہ، جلد اول، صفحہ، (باب العباد عند ارادۃ الحاجۃ) ۱۰؎ درخت اور پودے رات کو آکسیجن جذب کرتے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ جبکہ انسانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ آکسیجن سانس سے اندر لے جاتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اس کو آکسیجن کا چکر کہا جاتا ہے۔ اسی سے انسان زندہ ہیں ۱۱؎ مسلم، امام، الجامع الصحیح، دارالفکر، بیروت، جلد پنجم، صفحہ ۲۷ (باب فضل الغرس والزرع) ۱۲؎ حفظ الرحمن مولانا، "اسلام کا اقتصادی نظام" لاہور، ۱۹۸۱، صفحہ ۱۶۶ ۱۳؎ ولی اللہ، شاہ، حجۃ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۱۰۳ ۱۴؎ حوالہ کے لیے دیکھئے مرغینانی، الہدایہ، مولوی مسافر خانہ، کراچی، جلد اول، صفحہ ۱۹-۱۷، الجزیری عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، مصر، طبعہ اولیٰ، جلد اول، صفحہ ۲۹ ۱۵؎ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، جلد اول، مسلم، امام، الجامع الصحیح حدیث ۲۳۲، ۲۳۳ (مع شرح النووی)، دارالفکر، بیروت، الجزءالثانی عشر، صفحہ ۱۱۱ ۱۶؎ مسلم امام، الجامع الصحیح (باب النہی عن الدخول علی اہل الجزام من یدخل بالکیا) ۱۷؎ ولی اللہ شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم صفحہ ۲۳، ۱۸؎ و ۱۹؎ ایضاً صفحہ ۲۳، ۲۰؎ ایضاً صفحہ ۲۶، ۲۱؎ نعمانی، محمد منظور، معارف الحدیث، جلد ۲۲؎ واسطی، جمیل، اسلامی روایات کا تحفظ، مجلس فلاح و تعلیم، لاہور، ۱۹۷۱، صفحہ ۹۲-۸۱ ۲۳؎ شفیع

محمد، مفتی، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۸۸، جلد اول، صفحہ ۵۲۹۔
اس سلسلہ میں مفتی صاحب نے بہت سی جدید تحقیقات پیش کی ہیں (دیکھئے صفحات ۵۳۱۔

Sharif, M.M., A History of Muslim Philo- ۲۴
-losophy, Wiesbaden, 1966, vol II, P.1333 ۲۵ و ۲۶
Nasr, Hussain, Science And Civilization In
Islam, Times Mirror, New York, 1970, P.192 ۲۷

دیکھئے خطیب تبریزی۔ مشکوٰۃ المصابیح، دمشق ۱۹۶۱، جلد دوم، صفحہ ۴۳-۲۴۲،
احادیث نمبر ۴۲۰۰-۴۱۹۹ نیز حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم صفحہ ۱۴۱، ۲۸ مشکوٰۃ، جلد دوم،
صفحہ ۶۵۵ (کتاب الرقاق)۔ حدیث ۵۱۹۲ ۲۹ ایضاً (حدیث ۵۱۹۳ ۳۰ حجۃ اللہ
البالغہ، جلد دوم، صفحہ ۱۲۹ (ابواب الصوم) ۳۱ و ۳۲، ۳۳ مشکوٰۃ، جلد دوم، صفحہ ۴۴۳-
(کتاب الاطعمہ، حدیث نمبر ۴۱۴۰ و ۴۱۶۸ و ۴۱۶۳ ۳۴ ایضاً صفحہ ۴۴۸ (حدیث
نمبر ۴۲۰۸ ۳۵ حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، صفحہ ۳۴، ۳۶ نعمانی، محمد منظور،
معارف الحدیث، جلد ششم، صفحہ ۲۵۴ ۳۷ بخاری، محمد بن اسماعیل، امام، الجامع
الصحیح، جلد اول، صفحہ ۱۵۱ (باب السواک) ۳۸ بخاری الجامع الصحیح، جلد اول، صفحہ
۱۵۳ (باب السواک) ۳۹ نسائی، امام، سنن النسائی (علامہ جلال الدین کی شرح
والا نسخہ) مطبعہ المصریہ قاہرہ ۴۰ اول ص ۴۱ بخاری جلد اول صفحہ ۱۵۲ ۴۲ ترمذی، محمد بن
عیسیٰ، امام شمائل ترمذی، صفحہ ۴۶-۴۵ (باب ما جاء فی کحل رسول اللہ صلعم ۴۳
ایضاً (اثمد ایک خاص سرخی مائل سرمہ کو کہتے ہیں یہ بلاد مشرق میں ہوتا ہے) ۴۴ ترمذی، محمد بن عیسیٰ،
سنن الترمذی الجامع الصحیح، دار الفکر، بیروت، جلد اول، صفحہ ۱۱-۱۰ (باب ما جاء فی کراہیۃ البول فی المغتسل)
بحوالہ فارانی، فضل کریم، اسلامی اصول صحت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۲، صفحہ ۹ ۴۶ ایضاً
صفحہ ۹ ۴۷ ایضاً صفحہ ۱۰۰-۹۲ (تلخیص)

مشرقی یورپ کی ایک مظلوم مسلم ریاست

بوسنیا و ہرزیگووینا

از

محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

"اس مضمون میں "دولت عثمانیہ" مرتبہ ڈاکٹر محمد عزیر سابق رفیق دارالمصنفین اور "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"، پنجاب سے خاص طور پر مدد لی گئی ہے۔" ع۔ ع

مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ پر ابھی ماضی قریب میں کمیونزم کا تسلط تھا مگر اب اسکا طلسم ٹوٹنے کے بعد اس کی تمام ریاستیں بکھر کر خود مختار ہوگئی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی ایک مسلم ریاست بوسنیا اور ہرزیگووینا جارحانہ ظلم و ستم کا شکار بنی ہوئی ہے۔

محل وقوع اور پیداوار | بوسنیا اور ہرزیگووینا یوگوسلاویہ کے مغرب میں واقع ہے، سلطنت عثمانیہ کے دور میں یہ دو صوبے تھے، یہاں بوسنیا نام کا ایک دریا بہتا ہے اسی کے نام پر یہ صوبہ موسوم ہے، ندخیزی کی وجہ سے یہاں پیداوار بکثرت ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں ہرزیگووینا میں ہموار زمین کم ہے لیکن چشمے اور دریا زیادہ ہیں، انواع و اقسام کے پھلوں کے باغ ہیں اور موسم سرما میں کافی برف باری ہوتی ہے، تاہم یہ پورا صوبہ معدنی ذخائر، سمندر سے حاصل ہونے والی قیمتی اشیاء اور جنگلوں کی وجہ سے مالامال ہے۔

رقبہ اور نظم و نسق | بوسنیا اور ہرزیگووینا کا موجودہ رقبہ اکاون ہزار ایک سو تیس کیلومیٹر

ہے، یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کی طرح بوسنیا و ہرزیگووینا کی اپنی ایک مجلس قانون ساز ہے، جس کی مجلس عاملہ اور اعلیٰ سرکاری دفتر (سکریٹریٹ) سراجیو میں ہیں جو اس جمہوریہ کا صدر مقام ہے، اس جمہوریہ کو بارہ اضلاع اور چونتیس پرگنوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس وقت اس جمہوریہ کے صدر علی عزت بیگووِیچ ہیں۔

آبادی | ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق جمہوریۂ بوسنیا و ہرزیگووینا کی آبادی ۳۳ لاکھ کے قریب تھی، جس میں مسلمان ایک تہائی سے زیادہ ہیں، اس وقت وہاں کے مسلم رہنماؤں کے بیان کے مطابق ان کا تناسب نصف ہو گیا ہے۔

باشندے | جمہوریۂ بوسنیا و ہرزیگووینا کے باشندے نسلی اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہیں۔

۱۔ سرب:۔ ان کی اکثریت مشرقی کلیسا سے تعلق رکھنے والے آرتھوڈاکس عیسائیوں کی ہے اور بقیہ مسلمان ہیں۔

۲۔ کروش:۔ ان میں زیادہ تر رومن کیتھولک عیسائی ہیں اور بقیہ مسلمان ہیں۔

۳۔ بوسنی:۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت بوسنوی النسل ہے، مگر وہ قومی اور نسلی تصور سے بالاتر ہیں۔ ماضی قریب تک وہاں کے مسلم رہنما اپنے آپ کو ترک سلاطین کی رعایا سمجھتے تھے اور یہی ان کا امتیاز تھا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے تمام باشندے سرب کروش زبان بولتے ہیں اور یہی مسلمانوں کی بھی زبان ہے اور وہاں کی پوری آبادی سلاوی النسل ہے، جس کو عرب مورخین صقالبہ کہتے ہیں۔

مشرقی یورپ میں صقالبہ کی سکونت | صقالبہ کے اصل وطن کے بارہ میں عرب مورخین

مختلف الرائے ہیں، تاہم ان کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ اصلاً ایشائی قبائل تھے جو دوسرے قبیلوں کی غارتگری سے عاجز آکر مغرب کی جانب ہجرت کر گئے اور وادی بلقان میں دریائے ڈینیوب کے کنارے جاکر آباد ہو گئے، ان قبائل نے مدتوں اپنی انفرادیت اور مذہبی تشخص کو باقی رکھا، ان میں اہم قبیلے کروش، سرب اور بوسنی تھے، کروش ابتدا سے لاطینی عیسائیت کے پیرو تھے اور سرب یونانی کلیسا کے متبع تھے، ان دونوں کے درمیان سخت معرکہ آرائی رہتی تھی، چنانچہ بوسنی قبائل نے ان معرکوں سے تنگ آکر ایک نیا مذہب اختیار کرلیا تھا جو بوگومل مذہب کے نام سے مشہور ہوا۔

بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اسلامی فتوحات کا آغاز سلطنت عثمانیہ کے فرماں روا مراد اول نے سنہ ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں درۂ دانیال کو عبور کرکے مشرقی یورپ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، اسی وقت سے بوسنیا اور ہرزیگووینا کا خطہ بھی اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور ہوا، اس دور میں مشرقی یورپ میں بیزنطی حکومت قائم تھی، مگر اس کی حالت نہایت ابتر تھی، پھر یونانی اور لاطینی کلیساؤں کی شدید مخاصمت کی بنا پر وہاں کے باشندوں میں اتحاد عمل بھی مفقود تھا، تاہم مراد کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے پوپ اربن پنجم نے ہنگری، سرویا، بوسنیا اور ولاچیا کے حکمرانوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی فوجیں روانہ کریں۔ چنانچہ سنہ ۷۶۴ھ/۱۳۶۳ء میں ان ملکوں کی ایک مشترکہ فوج جو بیس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی، تھریس پہونچی، مراد کے فوجی جنرل لالہ شاہین نے ایک مختصر فوج کے ذریعہ انکو بری طرح شکست دی، یہ پہلا معرکہ تھا جو عثمانیوں اور سلاوی النسل قوموں کے درمیان پیش آیا۔

سنہ ۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء میں لالہ شاہین اور عثمانی افواج کے دوسرے مشہور جنرل افرینوس نے مقدونیا پر حملہ کیا اور اس کے اہم مقامات پر قبضہ کرتے ہوئے بوسنیا کی سرحد

میں داخل ہو گئے۔

جنگ کسووا | سنہ ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں سلاوی اقوام کی عیسائی حکومتیں ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے مشرقی یورپ سے ترکوں کے استیصال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس اتحاد کا داعی سرویا تھا، بوسنیا سمیت تمام سلاوی النسل عیسائی حکومتوں نے اس میں شرکت کی، چنانچہ انھوں نے بوسنیا میں مقیم ایک عثمانی فوج پر حملہ کر کے تقریباً پندرہ ہزار ترک فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ۱۵ جون ۱۳۸۹ء (۷۹۱ھ) کو کسووا کے میدان میں اتحادیوں اور مراد کی فوج کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ اسی معرکہ میں ایک زخمی سرویائی فوجی کے ہاتھوں مراد کو ایسا کاری زخم لگا جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکا، تاہم اس کے بعد بوسنیا نے سلطنت عثمانیہ کو خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔

صلیبی اتحاد | سنہ ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں شاہ لارسلاس ہنگری اور پولینڈ دونوں ملکوں کا بادشاہ ہوا، اس کی تحریک پر ہنگری، پولینڈ، ولاچیا، سرویا اور بوسنیا کا نیا اتحاد سلطنت عثمانیہ کے خلاف پھر قائم ہوا۔ اس دفعہ مغربی یورپ سے فرانس اور جرمنی نے بھی اپنی اپنی فوجیں معاونت کے لیے روانہ کیں۔ بعض ملکوں نے اپنے بحری بیڑے بھیجے اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لیے کثیر رقم فراہم کی گئی۔ ہونیاڈے جو اس دور میں مسیحی دنیا کا سب سے بڑا جنرل سمجھا جاتا تھا اتحادی افواج کا قائد مقرر ہوا۔

صلح نامہ زیجیڈین | مراد ثانی کے دور میں اتحادیوں نے ابتدا میں عثمانیوں کو شکست دی لیکن بعد میں جب انھوں نے جم کر مقابلہ کیا تو بالآخر ۲۶ ربیع الاول ۸۴۸ھ (۱۲ جولائی ۱۴۴۴ء) کو زیجیڈین کے مقام پر لارسلاس اور مراد ثانی کے درمیان

ایک معاہدہ ہوا جس میں دس سال تک کے لیے فریقین نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا، اس معاہدہ پر قائم رہنے کے لیے لارسلاس نے انجیل اور مراد نے قرآن مجید ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔

جنگ وارنا صلح نامۂ زیجیڈین کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہنگری کی مجلس قومی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے دفعتہً عثمانیوں پر حملہ کر دیا۔ ترک اس فریب سے بالکل بے خبر تھے، چنانچہ اس غیر متوقع حملہ کی وجہ سے متعدد قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے، بہت سے ترکی دستے جو قلعوں کی حفاظت پر مامور تھے قتل کر دیے گئے یا ان کو چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیا گیا، چنانچہ ۲۸ر رجب ۸۴۸ھ (۱۰ر نومبر ۱۴۴۴ء) کو وارنا کے مقام پر عثمانی افواج کا اتحادیوں سے مقابلہ ہوا جس میں اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی اور بوسنیا نے سلطنت عثمانیہ کی سیادت تسلیم کر لی۔

کسووا کی دوسری جنگ ہونیاڈے جو اتحادی افواج کا سرلشکر تھا، جنگ وارنا میں شکست خوردگی کے باوجود عثمانیوں سے لڑنے کے لیے بے چین تھا، اس نے شاہ بوسنیا کو پھر معاہدہ سے منحرف ہونے پر مجبور کیا اور اتحادیوں کا ایک لشکر لے کر کسووا کے میدان میں خیمہ زن ہوا، جہاں پہلی مرتبہ اتحادیوں کو مراد اول کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی، ۱۸ر شعبان ۸۵۲ھ (۱۷ر اکتوبر ۱۴۴۸ء) کو مراد ثانی اور ہونیاڈے کی متحدہ افواج کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں اتحادیوں کو دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ شاہ بوسنیا نے پھر اپنا سر اطاعت سلطنت عثمانیہ کے سامنے خم کر دیا۔ اور مراد نے بھی حسب دستور صرف سالانہ خراج کی ادائیگی اس پر لازمی قرار دی۔

سلطنت عثمانیہ میں بوسنیا و ہرزیگووینا کی شمولیت سلطان محمد فاتح کے عہد حکومت میں

شاہ بوسنیا نے پھر خراج دینا بند کر دیا، جس کی تنبیہ کے لیے سلطان کے فوجی جنرل محمود پاشا نے ایک فوج لے کر بوسنیا کا رخ کیا، پہلے گزر چکا ہے کہ بوسنیا میں قدیم زمانہ سے لاطینی اور یونانی عیسائیوں میں باہم معرکہ آرائی رہتی تھی، جس سے عاجز ہو کر وہاں کے باشندوں نے بوگومل مذہب اختیار کر لیا تھا، مگر اب اس جدید فرقہ کے لوگوں پر دوہرے مظالم ہوتے تھے، یہ کبھی یونانی کلیسا کے تشدد کا شکار ہوتے اور کبھی لاطینی کلیسا کے مظالم برداشت کرتے، محمود پاشا کی فوج جب بوسنیا پہونچی تو وہاں کے لوگوں نے مذہب اسلام کو اپنے لیے باعث رحمت سمجھ کر بوسنیا کے ستر قلعوں کے دروازے عثمانی فوجوں کے لیے کھول دیے اور بہت سے امراء مشرف بہ اسلام ہو گئے، اس صورت حال میں شاہ بوسنیا میں مقابلہ کی ہمت نہ رہی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے، غرض ۸۶۶ھ / ۱۴۶۲ء میں بوسنیا سلطنت عثمانیہ کا ایک باقاعدہ صوبہ بن گیا، اس کے بیس برس بعد ۸۸۷ھ میں ہرزیگووینا بھی سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا اور تقریباً پانچ صدیوں تک یہ خطہ دولت عثمانیہ کی حکمرانی میں رہا۔

سلطنت عثمانیہ کے عہد حکمرانی میں بوسنیا و ہرزیگووینا کی ترقی | ترکی کی فتح سے بوسنیا و ہرزیگووینا کا نقشہ ہی بدل گیا، اس وقت سلطنت عثمانیہ اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ ترکوں نے یہاں اپنا معاشرتی نظام رائج کرنے کے لیے بڑی دور رس تبدیلیاں کیں جس کی وجہ سے عظیم مذہبی اور نسلی تغیرات بھی رونما ہوئے، جس کے اثرات پوری آبادی پر پڑے اور ہر طبقہ کے لوگوں میں وسیع پیمانہ پہ مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت ہوئی۔

سلطنت عثمانیہ کے زیر اہتمام وہاں عسکری اور جاگیرداری کے آئین بھی نافذ کیے گئے، جس کے نتیجہ میں معیشت و معاشرت میں انقلاب آگیا۔ صناع اور اہل حرفہ مثلاً چرم ساز، نمدگر، آلات حرب بنانے والے اور شہری ضروریات مہیا کرنے والوں نے بڑی ترقی کی، اہم شہروں میں اور ان کے مضافات میں پہلے سے الگ الگ حکمرانوں کے دور کی دوکانیں، کارخانے اور حمام وغیرہ واقع تھے اب ان کے پہلو بہ پہلو مسجدیں، تکیے اور دینی مدارس تعمیر ہونے لگے، اس طرح دوسرے ترکی صوبوں کی طرح وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہوگیا، ہر مسجد سے ملحق ابتدائی تعلیم کے مکاتب کا رواج ہوگیا، جن میں قرآن مجید کے علاوہ ابتدائی دینی تعلیم ہوتی تھی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں مدرسہ کہلاتی تھیں جو ترکی نمونے کے مطابق تعمیر کی گئی تھیں، سراجیو کا سب سے قدیم مدرسہ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں غازی خسرو کے زمانہ میں قائم ہوا تھا، جس کا تحریری ثبوت ابھی تک موجود ہے۔

طوپال عثمان پاشا کی صوبیداری کے زمانہ میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں سرکاری تعلیمی مدارس کا رواج ہوا، اس نے "رشدیہ" اور "مکتب حقوق" کے نام سے مدرسے قائم کیے، اس کے بعد وہاں دارالمطالعہ اور دفتر طباعت کا آغاز ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ترکی حکومت کے اختتام کے قریب بوسنیا و ہرزیگووینا میں نو سو سترہ مکتب، پینتالیس مدرسے اور اٹھائیس رشدیے تھے، ان کے علاوہ سراجیو میں ادنیٰ درجہ کا ایک مدرسہ حربیہ، استادان مکتب کے لیے ایک تربیتی درسگاہ اور ایک تجارتی مدرسہ قائم تھا۔

ترکی عہد حکومت میں بوسنیا و ہرزیگووینا کے تقریباً چالیس مصنفوں کے ناموں

کا ذکر ملتا ہے، ان کی کتابیں زیادہ تر عربی میں تھیں اور اکثر کتابوں کا موضوع دینیات، فقہ، نظم مملکت اور تاریخ تھا، ان میں بہت سے لوگ استنبول اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں مقیم تھے، ترکی مورخوں کی ایک خاصی تعداد بوسنوی مسلم خاندانوں کی اولاد سے ہوئی ہے، علاوہ ازیں ان میں بعض ممتاز شعرا بھی گزرے ہیں جو ترکی اور سرب کروٹ دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے، بعض شعرا فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

غرض ترکی عہد حکومت میں بوسنیا و ہرزیگووینا کے اہم شہر اسلامی ثقافت و تمدن کے آئینہ دار بن گئے تھے اور اس سے لازماً دیہی علاقے بھی متاثر ہوئے، کسان اور دوسرے لوگ مسلمان ہو کر دیہاتوں سے شہر کی طرف منتقل ہو گئے۔

اہم شہر بوسنیا کا مشہور شہر سرائے (سراجیو) ہے جو اس وقت عوامی جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا کا پایۂ تخت ہے، اس شہر کی ترقی مسلمانوں کے عہد اقتدار میں ہوئی، قربانی نے لکھا ہے کہ اس کے باشندوں کی تعداد ستر ہزار ہے اور تقریباً نصف آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس شہر میں تقریباً سو مسجدیں ہیں اور اکثر مسجدوں کے مینارے سفید پتھر سے بنائے گئے ہیں، مشہور سیاح اولیا چلپی نے گیارہویں صدی کے وسط میں اس شہر کا یہ حال لکھا تھا:

> "اس میں ایک سو ستر مسجدیں ہیں، جن میں ستر مسجدوں میں نماز جمعہ ہوتی تھی، شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد جامع خسرو بک ہے، جس کو خسرو بک نے اپنے ذاتی سرمایہ سے تعمیر کرایا تھا"

خسرو بک عثمانی فرماں روا بایزید خاں کا نواسہ تھا اور کافی عرصہ تک بوسنیا کا حکمراں رہا، اس کے والد فرہاد بک بوسنیا کے رہنے والے تھے، اولیا چلپی نے سرائ

کا بہت سی مسجدوں کی تفصیل اور مدرسوں کے احوال لکھے ہیں، جن میں بعض کے آثار

اب بھی موجود ہیں۔

ہرزیگووینا کا مشہور شہر موستار ہے، ترکوں کے عہد میں یہی وہاں کی راجدھانی تھی، یہ شہر ایک بڑے دریا کے کنارے آباد ہے اور اس کے اکثر باشندے مسلمان ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے عہد میں وہاں تقریباً تیس مسجدیں تھیں اور مسلمانوں کے اپنے مدرسے بھی تھے۔

صلیبی اتحاد اور سلطنت عثمانیہ سے آویزش ۱۶۸۴ء میں عیسائی حکومتوں کا ایک مذہبی اتحاد قائم ہوا جس میں پولینڈ، وینس، مالٹا اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی شریک ہو گیا۔ ان سب نے مل کر ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کر دیا، اس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کو یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے یورپی مقبوضات سے محروم ہونا پڑا۔ چنانچہ شہزادہ لوئی نے بوسنیا پر حملہ کر کے اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، اگست ۱۶۹۰ء میں مصطفیٰ کوپرلی نے آسٹروی فوج کو شکست دے کر اسکو آزاد کرایا۔

صلح نامہ کارلووٹز ۱۶۹۷ء میں شہزادہ یوجین دریائے ڈینوب کی راہ سے بوسنیا میں داخل ہوا اور سراجیو تک اس کا قبضہ ہو گیا، اس نے سراجیو کو جلا کر خاکستر کر دیا، عثمانیوں کو اس کے مقابلہ میں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی، مگر کچھ ہی دنوں بعد ترکی فوج کے سپہ سالار طبان پاشا نے اس کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا یہانتک کہ اس نے بوسنیا کو خالی کر دیا۔

اسی دوران برطانیہ کے سفیر لارڈ پیجٹ نے برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت سے صلح کی یہ تحریک کی کہ ہر فریق کا قبضہ اس کی فتوحات پر قائم رہے۔ بالآخر یہ طے

پایا کہ صلح کا مسئلہ ایک کانگریس کے سپرد کر دیا جائے جس میں دولت عثمانیہ، آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ کے نمایندے شریک ہوں، اس کانفرنس کے لیے کارلووٹنز کا مقام تجویز ہوا، بہتر روز کے بحث و مباحثہ کے بعد ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا جو صلح نامۂ کارلووٹنز کے نام سے مشہور ہے، اس صلح نامہ کی اہمیت کا اندازہ مشہور جرمن مورخ وان ہیمر کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

"یہ صلح نامہ نہ صرف اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اس نے اہم ملکی تبدیلیوں کو برقرار رکھا اور نہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بعد سلطنت عثمانیہ کی فاتحانہ طاقت کا رعب دلوں سے زائل ہو گیا، بلکہ اس وجہ سے بھی یادگار رہے گا کہ اس موقع پر باب عالی اور روس نے پہلی بار ایک عام یورپین کانگریس میں شرکت کی اور اس کانگریس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے نمایندوں کو بھی جبکہ ان دونوں میں سے کوئی حکومت بھی جنگ میں شریک نہ تھی داخل کر لیا گیا تھا، اس طرح سلطان اور زار روس دونوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ مفاد عامہ کے لیے یورپ کی حکومتیں دوسری سلطنتوں کے باہمی تنازعات میں دخل دے سکتی ہیں۔"

بوسنیا و ہرزیگووینا میں روس کی ریشہ دوانیاں | صلح نامہ کارلووٹنز دراصل دولت عثمانیہ کے زوال کا آغاز ہے۔ اس وقت روس کا پیٹر اعظم دن بدن اپنی سلطنت کو مضبوط کرتا جا رہا تھا اور اس کی نگاہیں قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں۔ ۲۵ فروری ۱۷۱۱ء کو اس نے ماسکو کے سب سے بڑے کلیسا میں ترکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور اسے ایک مذہبی جنگ قرار دیا جس کا مقصد یورپ سے ترکوں کو نکال دینا تھا، روسی علم کے ایک

جانب صلیب کی تصویر بنی ہوئی تھی اور دوسری جانب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے،
"خدا اور مسیحیت کے لیے"

پیٹر نے بعض امراء کی وساطت سے بلقان کی سلاوی قوموں میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات بھڑکانے شروع کیے، اس کے خفیہ جاسوس بلقان کی تمام ریاستوں میں پھیل گئے اور عیسائی رعایا کو برانگیختہ کرنے لگے۔

جنوری ۱۷۳۶ء میں آسٹریا اور روس نے ایک خفیہ معاہدہ کیا جس کی سب سے اہم دفعہ یہ تھی کہ دونوں ملک متحد ہو کر دفعۃً ترکی پر حملہ کر دیں، اس وقت سلطنت عثمانیہ اپنے ضعف و اختلال کی بنا پر جنگ کے قابل ہی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اس نے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا، چنانچہ ۱۷۳۷ء میں نیمی روف کے مقام پر روس، آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کے وکلاء کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی، روس اور آسٹریا کا مقصد دراصل ترکوں کو صلح کے فریب میں مبتلا رکھ کر آئندہ مہم کے لیے خفیہ طور پر تیار ہونا تھا، چنانچہ ان دونوں کی جانب سے شرائط صلح ایسے پیش کیے گئے جن کو تسلیم کرنا سلطنت عثمانیہ کے لیے قطعاً محال تھا، اس کانفرنس میں آسٹریا نے اپنے لیے بوسنیا اور سرویا کے سارے علاقوں کو صلح کی قیمت قرار دی، صلح کی گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ دفعتاً ان دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا، جولائی ۱۷۳۷ء میں آسٹریا کی ایک فوج سرویا کی جانب اور ایک فوج بوسنیا کی طرف روانہ ہوئی، بوسنیا کے باشندوں نے بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور آخر کار بوسنیا سے انہیں نکال باہر کیا۔

سلطنت عثمانیہ کا اختلال اور اس کی تقسیم کا منصوبہ

اٹھارہویں صدی کے اخیر تک سلطنت

کا داخلی نظام کافی مختل ہو چکا تھا، گو سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اسکی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا، مگر سلیم کی اصلاحات کی سخت مخالفت ہوئی، یہاں تک کہ فوج نے علانیہ بغاوت کر دی اور سلیم کو اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لیے مجبوراً اصلاحات کو منسوخ کرنا پڑا، تاہم ان اصلاحات نے سلطنت عثمانیہ کے مختل نظام میں ایک نئی روح پھونک دی اور بعد کے فرماں رواؤں نے سلیم کے ہی نقش قدم کی پیروی کرنے کی کوشش کی، مگر مجموعی اعتبار سے سلطنت عثمانیہ اپنے زوال و پستی کی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔

۱۷۸۲ء میں روس کی ملکہ کیتھرائن اور شاہ آسٹریا جوزف ثانی کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ دوبارہ یہ معاہدہ ہوا کہ روس اور آسٹریا متحد ہوکر ترکوں کو ان کے تمام یوروپین مقبوضات سے بے دخل کر دیں۔ کیتھرائن نے جوزف سے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔ اس مجوزہ تقسیم میں آسٹریا کے حصہ میں سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور ڈالماچیا کے صوبے رکھے گئے تھے۔

کیتھرائن کو اپنی اس اسکیم کی کامیابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے پہلے ہی سے اس نئی سلطنت کے لیے ایک سکہ ڈھلوا لیا تھا۔ جس کے ایک طرف شہزادہ قسطنطین کے چہرہ کی شبیہ تھی اور دوسری طرف ایک تمثیلی نشان تھا جو ہلال پر صلیب کی آئندہ فتح و نصرت کو ظاہر کر رہا تھا۔ مگر سلطنت عثمانیہ کے تمام تر ضعف و اختلال کے باوجود یہ اسکیم کاغذ ہی تک محدود رہی، روس کی جانب سے ایک سخت حملہ کے نتیجہ میں سلطنت کا ایک معمولی حصہ کریمیا اس کے ہاتھ آسکا۔

جمعیۃ سلاویہ | سلطنت عثمانیہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے روس نے جو ذرایع اختیار

کیے تھے ان میں جمعیۃ سلاویہ کی تشکیل ایک نہایت موثر ذریعہ تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلاوی قوموں کو روس کے زیر سیادت منظم کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے، اسی مقصد کو سامنے رکھ کر روس کے چند دانشوروں نے ۱۸۵۸ء میں یہ جمعیۃ قائم کی، جنگ کریمیا کے بعد سے اتحاد سلاوی کے مبلغین جن میں زیادہ تر روسی تھے اپنی ہم مذہب اور ہم نسل قوموں میں مسلسل پروپیگنڈہ میں مشغول تھے، بوسنیا و ہرزیگووینا کی تمام بلقانی ریاستوں میں ان کی خفیہ سوسائٹیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان کی پشت پر اعلیٰ سیاسی قوتیں کام کر رہی تھیں۔

آسٹریا جو عرصہ دراز سے بوسنیا و ہرزیگووینا پر نگاہیں لگائے ہوئے تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا، وہ بوسنیا و ہرزیگووینا میں بغاوت برپا کرا کے خود ان پر قابض ہونا چاہتا تھا، چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے خفیہ طور پر وہاں اسلحہ اور گولا بارود بھیجنا شروع کیا، رفتہ رفتہ یہ خطہ شورش پسندوں کا مرکز بن گیا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا میں بغاوت کی ابتدا اس تمام کارروائی کے نتیجہ میں جولائی ۱۸۷۵ء میں ہرزیگووینا کے پایہ تخت موستار کے کسانوں نے دفعتاً ٹیکس ادا کرنے اور زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ مقامی حکام بجائے اس کے کہ شورش کو فوراً ختم کرتے قصر شاہی سے احکام کا انتظار کرنے لگے، اس سے باغیوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور چونکہ انہیں خارجی مدد کا یقین دلایا گیا تھا اس لیے ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا، بالآخر مختار پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج باب عالی کی طرف سے بھیجی گئی جس نے بآسانی بغاوت کو فرو کر دیا، روس اور آسٹریا چونکہ بغاوت کے ذریعہ اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے

باغیوں کو در پردہ پھر ابھارا اور اپنے سفیروں کے توسط سے باب عالی میں بوسنیا وہرزیگووینا کے باغیوں کی طرف سے چند مطالبات بھی پیش کیے، بدقسمتی سے صدر اعظم اسعد پاشا نے اپنی نرم خوئی کی بنا پر باغیوں اور باب عالی کے درمیان مصالحت کی خدمت قبول کر لی، اس سے باغیوں کی مزید حوصلہ افزائی ہوئی، انھوں نے محسوس کیا کہ حکومت اس شورش کو فرو کرنے سے قاصر ہے اور ان کی حیثیت حریف مقابل کی ہے، غرض پہلے جو چیز تھوڑے سے کسانوں کی جانب سے شروع ہوئی تھی اب باقاعدہ بغاوت کے درجہ تک پہونچ گئی، اس کی ابتدا ہرزیگووینا میں ہوئی، مگر کچھ مدت بعد بوسنیا میں بھی یہ شورش پھیل گئی۔

دول عظمیٰ کی مداخلت | یورپ کی مسیحی حکومتوں کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا، جسکا بہانہ بنا کر انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی، چنانچہ روس اور آسٹریا جن کی سازش سے یہ بغاوت ہوئی تھی جرمنی کو ساتھ لے کر اس بارہ میں باہم مشورہ کرنے لگے، جس کے نتیجہ میں سلطنت عثمانیہ کے داخلی معاملات میں مداخلت کی تجویز منظور ہو گئی۔

اندراسی نوٹ | اس مشورہ میں جو امور طے کیے گئے ان کو آسٹریا کے چانسلر کاؤنٹ اندراسی نے "اندراسی نوٹ" کے نام سے جاری کیا، اس میں پہلے تو یہ بتایا گیا کہ دول عظمیٰ بوسنیا وہرزیگووینا میں بغاوت فرو کرنے اور یورپ میں امن قائم رکھنے کے لیے بے چین ہے اور باب عالی ان صوبوں کی اصلاحات میں قاصر رہے، چنانچہ اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سلطان پر دباؤ ڈال کر مندرجہ ذیل مطالبات پورے کرائے جائیں،

۱۔ بوسنیا وہرزیگووینا کے باشندوں کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے۔

۲۔ بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔

۳۔ ٹیکس کی وصولی میں قدیم طریقہ بند کر کے اسے براہ راست عمال حکومت کے ذریعہ وصول کیا جائے۔

۴۔ بوسنیا و ہرزیگووینا کے باشندوں سے لیا جانے والا ٹیکس وہیں کی مقامی ضروریات میں صرف ہو۔

۵۔ زمین کے مالک کسانوں کی تعداد بڑھائی اور دیہی آبادی کی حالت بہتر کی جائے۔

۶۔ اصلاحات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس کے ارکان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو۔

اس نوٹ کے آخر میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر مذکورہ بالا مطالبات جلد از جلد موثر طریقہ پر پورے نہیں کیے گئے تو دول عظمیٰ بغاوت کو روکنے کی کوشش سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔

۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو تمام دول عظمیٰ کی طرف سے اندراسی نوٹ باب عالی میں پیش کیا گیا۔ ۱۱ فروری کو سلطان نے اس کی تمام دفعات منظور کر لیں سوائے ایک دفعہ کے جس میں ٹیکس کو صرف مقامی ضروریات میں صرف کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی باغیوں نے ہتھیار نہیں رکھے اور اس بات کا مطالبہ کرتے رہے کہ پہلے اصلاحات جاری کی جائیں۔ باب عالی کا جواب یہ تھا کہ بغاوت جب تک قائم ہے اصلاحات کا نفاذ ممکن نہیں ہے چنانچہ باغیوں کی ضد بھی قائم رہی اور شورش برابر بڑھتی چلی گئی۔ (باقی)

فیضی کی بھگوت گیتا

از

جناب رام لعل نابھوی

فارسی زبان میں گیتا کے دو منظوم ترجمے ملتے ہیں۔ ایک علامہ ابوالفیض فیضی کا ہے۔ دوسرا کنور بدری کرشن فروغ کا ہے۔ پہلا شہنشاہ اکبر کے زمانے کا ہے دوسرا ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا۔ فیضی کا ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے۔

ابوالفیض فیضی کی فارسی گیتا کے دو منظوم تراجم اردو میں ہیں۔ ایک لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کا ہے۔ دوسرا آلم مظفر نگری کا۔ دونوں چھپ چکے ہیں۔ فیضی کی گیتا کا جو ترجمہ صدر صاحب اور آلم صاحب نے کیا ہے وہ مثنوی میں ہے اور اسی بحر میں ہے جس میں فیضی کا ترجمہ ہے۔

حضرت صدر اور حضرت فروغ نے فیضی کے ترجمے کو بعض مقامات پر معناً ناقص بتایا ہے اور پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی نے فیضی کے نثری ترجمے پر جو تقریظ لکھی ہے اس میں فیضی کے ترجمے کی کچھ خامیاں دکھائی ہیں۔ منور لکھنوی نے صدر کی گیتا پر "چند الفاظ" میں لکھا ہے:-

"لیکن کئی مقامات پر ترجمے سے مجھے ابھی تک اختلاف ہے اور وہ مقامات ایسے ہیں جہاں علامہ فیضی نے گیتا کی صحیح ترجمانی نہیں کی ہے۔ میرے اس دعوے کا ثبوت

خود حضرت صدر کی تقریظ اور منشی بدری کرشن فروغ کے تمہیدی اشعار سے بھی ملتا ہے
گیتا کے تراجم کا ذکر کرتے ہوئے صدر صاحب نے فرمایا ہے۔

زفیضی است پیشِ نظر پنجمیں　　بسے اختلاف است در پنجمیں
مگر نظم نادر بود سر بسر　　که پوشاندش من لباس دگر
نگویم که فیضی تعصب نمود　　مگر اینکه دستِ تصرف کشود
نمود آنچه در شعر فیضی بیاں　　به اردو نگهداشتم همچناں
بل از مصرعے مصرع آوردہ ام　　همانا که خون جگر خوردہ ام
کنوں چشم دارم ز اہلِ سخن　　که حرفے نگیرند بر حرف من
براہِ غلط رفته باشم اگر　　بپوشند عیبم ز روئے ہنر

اسی کے ساتھ مرحوم نے اپنے اس ترجمے کی تاریخ بھی نکالی ہے۔ فرمایا ہے :۔

چو خورشید با معرفت شد مضاف　　عیاں اسم و تاریخ گردید صاف
۱۹۱۰
دگر ارمغانِ حقیقت بود　　که ایں نسخۂ جاں حقیقت بود

کنور بدری کرشن فروغ نے اپنی گیتا کے صفحہ ۱۰ پر فیضی کے ترجمے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

زفیضی چه گفتار آوردۂ　　تو خود خونِ دل را بخود خوردۂ
بگیتائے فیضی کشادی زباں　　هم از شاعری هم ز مضمونِ آں
ز علم عروض آں چه واقف نبود　　با شعار اکثر غلط با نمود
ولے کس ندارد سرے سوئے او　　به استادیش می کند گفتگو
مضامینِ گیتا غلط گفته است　　هم اشعار او بے نمط گفته است

لیکن حضرت فرداغ کے ترجمے کے آخر میں منشی سعید الدین تسکین دہلوی نے تو ایک عجیب ہی بات لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"اس کتاب کے ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں اور شاید سب سے پہلا ترجمہ فارسی زبان میں ایک منظوم ترجمہ ہے جو علامہ فیضی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، ہم نے فارسی کتابوں کی بہت سی ورق گردانی کی، کہیں اس کا ثبوت نہیں ملا، فیضی کی تصانیف کا متعدد جگہ ذکر ہے مگر گیتا کے ترجمہ کا کہیں نام و نشان نہیں...... موجودہ گیتا جو ان کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اس کے مضامین کی بے ترتیبی، عروض کی غلطیاں اور ترجمے کے سقم خود اسی بات کے شاہد ہیں کہ علامہ ممدوح کی طرف اس کو منسوب کرنا چاند پر خاک ڈالنا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اور غیر معروف شخص کی تصنیف ہے جو بوجہ اشتراک اسمی اس کی جانب منسوب ہو گئی ہے۔ اس کا بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ فیضی نے ابنائے زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کر مرزا غالب کی طرح اپنا تخلص فیضی ترک کر دیا تھا اور بجائے اس کے فیاضی اختیار کر لیا تھا۔"

حضرت تسکین دہلوی کی یہ تحریر نہایت اہم ہے اور اس کی بنا پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ حقیقت کا پتہ لگایا جائے، مولانا تسکین دہلوی کا یہ فتویٰ کہ فارسی کا منظوم ترجمہ علامہ فیضی کا نہیں ہے، اسی تخلص کے کسی اور شاعر کا ترجمہ ہے ان لوگوں کے لیے ایک چیلنج ہے جو اس ترجمے کو فیضی سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر میں مولانا تسکین کے فتویٰ سے نہ متفق ہوں نہ مطمئن۔"

مولانا تسکین دہلوی کی رائے پر کس نے کیا لکھا اور یہ کہ کیا کسی نے لکھا بھی، معلوم نہیں لیکن میں دو ایسے قلمی نسخوں کا ذکر کروں گا جن سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہ

ثابت ہو جاتا ہے کہ جو گیتا فارسی میں فیضی کے نام سے منسوب ہے، وہ ابوالفیض فیضی برادر علامہ ابوالفضل کی ہی لکھی ہوئی ہے۔

۱۔ فہرست مشترکہ نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان، تالیف احمد منزوی جلد چہارم۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۲۱۳۹

۳۸۷۸۔ بھگوت گیتا: بھاگوت گیتا۔

ہمانکہ از ابوالفیض فیضی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵م) دانستہ شدہ است۔

نخستین بار اکبر بادشاہ (۹۶۳۔ ۱۰۱۴ھ) بہ سال ۹۸۳ھ/۱۵۷۵م یک برہمن تازہ مسلمان بنام "بھاون ساکن" را دستور داد کہ این متن را ترجمہ کند، نخست او را بہ ملا عبدالقادر بدایونی سپرد، کہ "بھاون" مطالب رامیفہماند، و بدایونی بہ فارسی می نوشت، لیکن چون عبارت ہای آن مغلق بود، بدایونی، وزش خواست و کنار رفت، و اکبر بجای او ابوالفیض فیضی (ن، ک، رتن و پدم، در ہمین بخش) را گماشت و اس از فیضی این کار بہ ابراہیم سرہندی واگذاشتہ شدہ است، ولی این ترجمہ ہفت بار بنام فیضی چاپ شدہ است (شعرای کشمیر ۳ : ۱۱۹۸)

آغاز: مقولۂ دہر تراشتر ای سنجہ در زمین کو دکھر مزرعۂ نیکو کاران است،

(ن۔ک شمارہ ۱: ۸۲۷ "بھگوت گیتا" در چاپ آنرا، بدون نام مترجم)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے رامائن کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے بعد اسے ایک گناہ بتایا تھا۔ گیتا کے ترجمے سے ان کی کنارہ کشی اسی لیے تھی۔ یہ قلمی نسخہ ۴۰۷ سال پرانا ہے (۱۴۱۱ ہجری نفی ۱۰۰۴ ہجری = ۴۰۷ سال)

۲۔ بھگوت گیتا انوداد از Winand M. Callewaert Shila

ترجمہ Nand Hemraj ستیہ بھارتی پبلیکیشن رانچی ۱۹۸۳ء کے صفحہ ۳۳۵ کے فٹ نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالفیض فیضی نے ہریدہر کی گیتا سودھنی کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا۔ جس کا مخطوطہ موجود ہے۔

شہنشاہ اکبر نے رامائن۔ مہابھارت۔ یوگ واشِشٹ جیسی ضخیم کتابوں کے تراجم فارسی میں کرائے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گیتا جیسی مختصر کتاب کا ترجمہ جس کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں ہوئے۔ فیضی سے نہ کراتے۔

ایک اور گیتا کا پتہ چلتا ہے جسے فیضی فیاضی نے نثر فارسی میں ترجمہ کیا۔ دیکھئے فہرست مشترکہ نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان تالیف احمد منزوی۔ جلد چہارم صفحہ ۲۱۳۹۔

۱۱۵۸۹۔ کراچی، موزہ ملی ۷۷ - ۱۹۶۱ . N.M ؛ نستعلیق، پنڈت راجہ رام کول عرف طوطہ خلف بیکیٹھ باس پنڈت، ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲م با متن ہندی و ترجمہ راجہ جے سنگھ سوامی دیاشنش، ۱۸۳ ص۔

اس قلمی نسخے کی ایک کاپی جو ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور جسے پنڈت راجارام کول معروف طوطہ نے سمبت ۱۹۲۸ در ۱۸۷۲ ہجری تیار کیا۔ سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں موجود ہے۔

اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیضی فیاضی نے بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی نظم و نثر دونوں میں کیا۔

مقالات شبلی جلد دوم

اس جلد میں دوسرے ادبی مضامین کے علاوہ ہندی صنائع و بدائع اور بھاشا زبان وغیرہ پر بھی مضامین ہیں۔

استدراک

ڈاکٹر ف ۔ عبدالرحیم، مدینہ منورہ

معارف کے مارچ کے شمارے میں جناب گوردیال سنگھ صاحب مجذوب کا مضمون " بائبل میں قدیم ہندوستانی ثقافت کے اثرات " نظر سے گذرا، فاضل مضمون نگار نے علمی تحقیق کے اصول وضوابط کو یکسر پس پشت ڈال کر محض اٹکل پچو کی بنا پر بائبل کے بہت سارے الفاظ کو سنسکرت نژاد قرار دیا ہے[1] علمی تحقیق ٹھوس علمی حقایق پر مبنی ہوتی ہے، تخمین وظن پر نہیں، موصوف کی " تحقیقات " ایسی ہی ہیں جیسے کہ انگریزی کے decoration کو اردو کے " دیکھ رے شان " یا malign کو عربی کے " بلا عین " سے ماخوذ بتانا !

مضمون نگار نے اپنے نظریے کے اثبات کی خاطر بعض زبانوں کے درمیان صوتی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اس ضمن میں انھوں نے جو باتیں بتائی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، ذیل میں انکی نشاندہی کر رہا ہوں،

ص ۲۰۸ میں لکھتے ہیں: " (عربی میں) گ کو ج میں تبدیل کر دیتے ہیں بلکہ آج کل تو ج کو غ میں بدلنا بھی شروع ہوگیا ہے، پہلے گیتا لفظ کو جیتا لکھتے تھے، اب غیتا بھی بولنے اور لکھنے لگے ہیں۔"

گ کو غ میں تبدیل کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، قدیم زمانے سے گ کو ج یا

---

[1] دعویٰ بلا دلیل (معارف)

غ میں تبدیل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ یونانی کے γεωγραφια (1) (geographia) میں دو گ ہیں، اس کی تعریب جغرافیہ کی شکل میں ہوئی، اس میں پہلے گ کو ج میں اور دوسرے کو غ میں تبدیل کیا گیا۔

اسی طرح Πυθαγορας (2) (Pythagoras) کی تعریب فیثاغورس ہے۔ اس میں بھی گ کو غ سے بدلا گیا ہے۔

اسی طرح Γραικος (3) (greek) سے اغریق بنا۔

ص ۲۰۹ میں لکھتے ہیں، "اسی طرح کئی جگہ تھ کو عربی میں ث سے بدل دیا گیا ہے، جیسے ایلزبیتھ کو ایلزبث۔"

ایلزبیتھ کو بدل کر ایلزبث نہیں بنایا گیا ہے، انگریزی کے Elizabeth کو عربی میں ایلزبث لکھتے ہیں اس لیے کہ انگریزی کے th کا وہی نطق ہے جو عربی کے ث کا، انگریزی کے th کو تھ ہندوستانی بولتے ہیں۔ اہل زبان انگریز اس کو ث پڑھتے ہیں، اس بنا پر اس لفظ میں کوئی صوتی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

ص ۲۱۰ میں لکھتے ہیں، "... جیسے عربی والوں نے گیتار guitar کو قیثارۃ کر کے ت کو ث میں بدلا ہے۔"

عربی کا قیثارۃ انگریزی کے guitar سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ عربی اور انگریزی دونوں نے اسے یونانی کے κιθαρα (کِثارا) سے لیا ہے، یہ لفظ عربی میں قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے عربی کے لفظ قیثارۃ میں ث اصل ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ انگریزی کے guitar میں تبدیلی ہوئی۔

اخبار علمیہ

بوسنیا کی تباہی پر کرب و اضطراب کا اظہار مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے ملیشیا کی ایک مصورہ شریفہ الجعفری نے چاول اور کاٹن پیپر پر چینی طرز مصوری کے نمونے پر ۱۲ تصویریں بنا کر "بوسنیا" کے عنوان سے کوالالمپور کی ایک نمائش میں پیش کیں، یہ گراں قدر و قیمت پر فروخت ہوئیں اور ان کی کل آمدنی بوسنیا کے مظلوم اور بے سہارا لوگوں کو دے دی گئی، مصورہ شریفہ ملیشیا کی پہلی آرٹسٹ ہیں جنھوں نے برش اور رنگوں سے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے چینی مصوری کو ذریعہ بنایا، ان کی ایک پینٹنگ میں سورہ مومن کے حرف آغاز حٰمٓ کو نہایت معنی خیز انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے بتایا کہ یہ سورہ دین و کفر، حق و باطل اور وحی کے قبول و انکار کے رموز و حقائق کو آشکارا کرتی ہے، انسان حق و صداقت اور ایمان و عقیدہ کے بغیر محض طاغوت کا آلہ کار رہتا ہے۔ حٰمٓ کا یہ دو حرفی لفظ بوسینا بلکہ ہر جگہ حق و باطل کے فرق و امتیاز کا واضح اشارہ ہے، فن مصوری کے ماہرین نے ان تصویروں کی فنی قدر و قیمت کا اعتراف کیا اور کہا کہ ایک مہینہ کی مدت میں اس مصورہ نے وہ نقوش کاغذ پر اتار دیے جو سالہا سال کی محنت کے بعد بھی مشکل سے وجود میں آتے ہیں، دراصل ان کے خون جگر نے اسے نقش دوام بنا دیا۔ ایک نقاد نے کہا کہ "شریفہ کے

عمل میں عقیدہ نے رنگ بھرا" شعلوں کی لپک کی طرح تڑپتے ہوئے تیز، تیکھے، نوکیلے، چمکدار عربی حروف جن کو مشاقی ومہارت سے چینی برش کے ذریعہ داغ گیا گیا ہے، دیکھنے والوں پر عجیب اثر طاری کر دیتے ہیں۔

بوسنیا کے واقعات نے خلافت عثمانیہ کے عروج وزوال کی یادوں کو بھی زندہ کر دیا ہے، اندلس کی طرح گاہے گاہے اسکے قصہ پارینہ کی بازخوانی، عظمت وحسرت کا حظ وکرب بخشتی ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی استنبول سے شایع ہونے والی کتاب The ottoman Turks: Nomad kingd-om to world empire ہے، اس کے مصنف تاریخ ترکی خصوصاً تاریخ خلافت عثمانیہ کے نامور محقق کارل مارکس کورٹ پیٹر ہیں، کتاب دراصل پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف علمی مجلوں میں شایع ہوئے تھے، ان میں خلافت عثمانیہ کی ہیئت وخصوصیت، سماجی اور انتظامی ساخت، معاشی نظام تہذیب وثقافت، عسکری اصلاحات، بیرونی اور اندرونی ریاستوں سے سیاسی تعلقات وغیرہ موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور ارض حجاز سے سلاطین عثمانی کے تعلقات پر اولیائے چلپی کے سیاحت نامہ کے پس منظر میں دلچسپ اور عمدہ بحث کی گئی ہے، دو مضامین میں خلافت کے دور آخر میں امریکا اور شرق اوسط کے باہمی ربط وقرب پر بحث کرتے ہوئے شمالی افریقہ کی امارتوں اور امریکی بحریہ کے تعلقات اور رابرٹ کالج اور بیروت میں امریکن یونیورسٹی کے قیام کا بھی ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

حقایق کی معرفت اور مسائل کے سنجیدہ مطالعہ کے بجائے انسانی معاشرہ

میں غیر سنجیدہ، بے مقصد اور لایعنی حدیث دیگراں (GOSSIP) سے کیوں زیادہ دلچسپی لی جاتی ہے؟ برطانیہ کی یونیورسٹی کالج کے بائیلوجیکل اینتھروپولوجی کے ماہر پروفیسر رابن ڈبنار نے اس سوال کے جواب میں جو کاوش وتحقیق کی ہے وہ برطانیہ کے سائنسی مجلہ 'نیو سائنٹسٹ' میں حال ہی میں شایع ہوئی ہے سب سے پہلے انھوں نے یونیورسٹی کے اسٹاف روم میں لوگوں کی گفتگو کو اپنا مرکز توجہ بنایا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی بات چیت کا ستر فیصد غیر اہم معاشرتی تعلقات اور شخصی تجربات سے متعلق تھا، اس میں بھی نصف حصہ دوسروں کی ذات سے تعلق رکھتا تھا، مردوں میں یہ گفتگو زیادہ تر ان کے اپنے معاملات سے سروکار رکھتی تھی تو عورتوں کی باتوں کا بیشتر حصہ دوسروں کے لیے وقف رہا، سائنسدانوں کے لیے یہ جائزہ حیرت انگیز ثابت ہوا، چنانچہ اس تجزیہ سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی اصل وجہ انسانی دماغ کا نشوو ارتقا ہے، دوسرے انسان نما جانوروں یا دودھ پلانے والی اعلیٰ حیوانی مخلوقات کے جسم کے لحاظ سے داغ کی جو بناوٹ ہوتی ہے انسان کا دماغ اس کے برخلاف اپنے جسم کی ساخت کے مقابلہ میں چھ گنا زیادہ بڑا ہوتا ہے اور یہی غیر معمولی حجم زبان کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے اور یہ زبان ان افراد کے عمل کو جاننے اور بیان کرنے میں زیادہ کھلتی ہے جو کسی ممتاز اور خاص دائرہ اور حدود میں رہتے ہیں، پروفیسر ڈبنار نے انسانی دماغ کے زیادہ بڑے ہونے کی دو خاص وجہیں بھی بیان کیں کہ روزی کی روزانہ فراہمی کے سلسلہ میں پیش آمدہ مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک بڑے دماغ کی ضرورت ناگزیر ہے، دوسرے افراد کے ربط وتعلق کی نزاکت

وسعت اور سماجی بندھنوں کی الجھنیں بھی ایک بڑے دماغ کی محتاج ہیں، یہ
بھی معلوم ہوا کہ حیوانات اعلیٰ اپنا بیس فیصد وقت اپنے جھنڈ اور ریوڑ میں
ایک دوسرے سے تعلق پر صرف کرتے ہیں جبکہ اس کے لیے انسان ۳۵ سے
۴۵ فیصد وقت صرف کرتا ہے اور چونکہ سماجی تعلقات کا قیام واستحکام زیادہ
وقت طلب ہے اس لیے پروفیسر کے خیال میں یہ مشکل زبان کی شکل میں آسان ہوتی
ہے اور آپس کی گفتگو سے انسان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے متعلق تبادلہ معلومات
وخیالات کر سکے جو ان کی مجلس سے بہت دور ہیں، اسی زبان کی مدد سے یہ فرصت بھی ملتی ہے
کہ وہ ایسے لوگوں سے ذہنی ربط قائم کرلے جنکو اس نے شاید کبھی براہ راست دیکھا بھی نہیں،
لوگوں کے درمیان فرق مراتب قائم کرنے اور اپنی محبوب شخصیتوں سے غائبانہ ربط کو وسعت دینے
میں بھی زبان ہی کام آتی ہے، جبکہ دوسرے دودھ پلانے والے جانوروں کی سماجی تگ ودو کا مرکز صرف
انکی اپنی ذات ہوتی ہے، ظاہر ہے انسانی زبان کا یہ احسان نسبتاً اسکے بڑے دماغ کا مرہون منت ہے۔

مذہبی احکام وعقائد کی بجاآوری کا ذکر (م ز ی د ہ G) نہیں ہے لیکن بعض خبریں واقعی دلچسپ
ہوتی ہیں، تروپتی کے لارڈ وینکٹیشور کے مندر کے بارے میں گذشتہ دنوں یہ معلوم ہوا کہ اس
کی سالانہ آمدنی میں بے حساب اضافہ ہوتا جارہا ہے، یہاں تقریباً ساٹھ ستر ہزار عقیدتمند
روزانہ حاضری دیتے ہیں، گذشتہ موسم گرما میں صرف ایک دن میں پچاس ہزار زائرین نے
اپنے سر کے بالوں کا نذرانہ بھگوان کے سامنے پیش کیا ۱۹۹۰ء میں دو لاکھ دس ہزار کلو بال
فروخت کیے گئے جن سے ۸۰ ملین روپیوں کی آمدنی ہوئی، بعض بعض عقیدتمند بالوں کے علاوہ
بڑے نذرانے بالکل پوشیدہ طریقہ سے پیش کرتے ہیں، چنانچہ ایک دن دس لاکھ کے موتی کسی نے
خاموشی سے چڑھادیئے ہنڈی میں کسی صاحب نے ایک مشت ۲۰ لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کیا ۱۹۱۲ء میں
اس مندر کی آمدنی ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور اب یہ ایک سو پچاس کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔

ع۔ص

تلخیص وتبصرہ

جزیرۂ کریمیا میں اسلام اور مسلمان

"یہ مفید مضمون ماہنامہ الازہر (قاہرہ) میں شائع ہوا تھا، مولوی کلیم صفات اصلاحی ناظر کتب خانہ دارالمصنفین نے قارئین معارف کے لیے اس کی تلخیص کی ہے" (ض)

کریمیا بحر اسود اور بحر (ازوف Azov) کے درمیان ایک جزیرہ نما ہے، اس کے مشرق میں خلیج کرتش ہے جو بحر ازوف کو بحر اسود سے ملاتی ہے اس صدی کے اوائل سے کریمیا سوویت یونین کے زیر اقتدار ہے اس کا رقبہ ۲۷۰۰۰ کیلو میٹر ہے، کریمیا کا جنوبی علاقہ کوہستانی ہے، البتہ اس کے شمال میں وسیع میدان ہے جو ایک تنگ درے سے گذرتا ہوا براعظم یورپ سے جا ملتا ہے!

کریمیا ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے یہاں پھولوں کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے، معدنیات میں لوہے کی کانوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

کریمیا کی موجودہ راجدھانی اکتشبک ہے جبکہ اس کا قدیم دارالحکومت بغچہ سرائے تھا، کریمیا کے مشہور شہروں میں یالتا (Yalta) ہے جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد یالتا کانفرنس (Yalta Conference) ہوئی تھی، جس میں امریکی صدر روزولٹ Roosevelt اور روس کے مرد آہن استالن (Stalin) شریک ہوئے تھے، اسی کانفرنس میں پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام کو تقسیم کر دینے کی تجویز منظور ہوئی تھی تاکہ ان پر ان دونوں بڑی طاقتوں کا مکمل

عمل دخل رہے ۔

۱۳۳۹ء میں کریمیا کے تاتاریوں نے اسلام قبول کر کے اس کے جنوبی و مشرقی حصوں پر قبضہ کر لیا تھا، ۱۳۸۰ء میں تاتاریوں نے بحر ماہ Azo کے پہاڑی علاقوں پر اپنا قبضہ جما لیا، ان کی حکومت عثمانیوں سے پہلے قائم ہوئی تھی، وہاں عثمانیوں کے پہونچنے کے وقت تاتاریوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اور روس کی حکومت طاقتور ہو کر ابھر رہی تھی جو تاتاریوں کے لیے خطرہ بن گئی تھی، مشرقی تاتار میں روس کے وحشیانہ مظالم کی وجہ سے دونوں کے درمیان آویزش کا سلسلہ شروع ہوا جس میں اول وہلہ میں تاتاریوں نے روسیوں کو شکست دی یہانتک کہ ماسکو (Moscow) پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا، لیکن زمانہ نے پھر کروٹ لی اور روسیوں کو فتح نصیب ہوئی تو وہ کریمیا کے شمالی حصے پر غالب آگئے اور تاتاریوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

سلطان احمد خاں ثالث کے عہد حکومت میں عثمانیوں نے دو لاکھ فوجوں کے ساتھ قیصر روس کا محاصرہ کیا لیکن عثمانی افواج کے کمانڈر بلطجی محمد پاشا نے جلد ہی یہ حصار اٹھا لیا، کیونکہ قیصر روس نے ۱۷۱۱ء میں معاہدہ فلکون پر دستخط کر دیے تھے، جس کی وجہ سے زار کو شہر آزاق عثمانیوں کے حوالہ کر دینا پڑا، سلطنت عثمانیہ کے پورے عہد میں روس سے کریمیا کے لیے اس کی کشمکش کا سلسلہ قائم رہا، لیکن کمزور ہونے کے بعد وہ کریمیا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، بالآخر اس پر روس کا قبضہ ہو گیا جس نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد وہاں کے تاتاری مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے!

۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا، انقلابی لیڈروں کے سامنے متعدد موانع اور مشکلات تھے اول تو خود روسیوں کی ایک بڑی تعداد انقلاب کی مخالف تھی دوسرے یہ کہ انقلاب کے علمبردار مغربی یورپ کے مزدور طبقوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں ناکام رہے تھے، تیسرے موثر اور زور آور فوجی طاقت بھی مزاحمت کر رہی تھی اور وہ انقلاب کو ناکام بنا دینا چاہتی تھی اس لیے انقلابیوں کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ روس کے مشرقی علاقوں سے مدد حاصل کریں۔

اسٹالن اور لینن کے دستخط سے ایک اپیل شایع کی گئی جس میں روس کے تمام طبقوں کے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا تھا جس کا متن یہ تھا:

" ظلم وستم پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے ایسے سنگین حالات میں اے روس اور مشرق کے مسلمانو! ہم تم سے مخاطب ہوتے ہیں اے وہ لوگو جو محنت و مشقت برداشت کرتے ہو اس کے باوجود اپنے حقوق سے محروم رہتے ہو اے وہ لوگو! جن کی عبادت گاہوں اور مقبروں کی بے حرمتی کی جارہی ہے اور جن کے عقائد و معاملات میں مداخلت ہو رہی ہے اور جن کے شعائر و ارکان کو ظالم و جابر روسی شہنشاہوں نے پامال کر ڈالا ہے، اس انقلاب کے بعد تم کو اپنے عقائد، معاملات، قومی و ثقافتی امور میں کامل آزادی حاصل ہوگی اور تم پر کسی طرح کا ظلم و جبر روا نہ رکھا جائے گا، اٹھو اور اپنی منشار کے مطابق اپنی قومی و ملی زندگی کا از سر نو آغاز کرو اور اس انقلاب کو غنیمت جانو اور اسکا خیر مقدم کرو، ہم اور تم ایک ہی راستے کے مسافر ہیں، ہمارا مقصد دنیا کو ایک

نئے انقلاب سے روشناس کرانا ہے اس کے لیے ہم تم سے مدد کے طلبگار ہیں۔"

اس اپیل میں روس کے نئے حکمرانوں نے صراحتہً اسلام اور مسلمانوں کیخلاف صدیوں سے جاری صلیبی بغض وعناد کا اعتراف کر کے آیندہ اس کی تلافی کر دینے کا وعدہ کیا تھا جس سے مسلمان دھوکہ کھا گئے چنانچہ اس کے بعد رونما ہونیوالے واقعات اس کے بالکل برعکس تھے۔

۱۹۱۸ء میں لینن نے مسلمانوں کے ان شہروں پر حملہ بول دیا جو زار کے زیر اقتدار تھے اور ۱۹۲۰ء میں بالشویکی طاقتوں نے کریمیا کا رخ کیا اور ایسا سخت محاصرہ کیا کہ لوگ بھوک پیاس سے بے چین ہو گئے اور جب روسی بالشویکی افواج کریمیا میں داخل ہوئیں تو وہاں تقریباً ۵ لاکھ مسلمانوں کی آبادی تھی جن پر اس خونین انقلاب اور جابرانہ نظام میں جو شدید مظالم ہوئے ان کے سامنے شہنشاہی دور کے مظالم بھی بالکل ہیچ تھے۔ تقریباً بیس برسوں یعنی ۱۹۴۰ء تک مسلمانوں کی تعداد گھٹ کر صرف پانچ لاکھ رہ گئی، ۱۵۵۸ مسجدوں میں سے چند کو چھوڑ کر تمام مسمار کر دی گئیں اور انہیں جگہوں پر اصطبل اور میوزیم بنا دیے گئے، مسمار کی جانے والی مسجدوں میں متعدد تاریخی مسجدوں مسجد احماقیو، جامع طوزیا زا کو بھی کلب اور میوزم میں تبدیل کر دیا گیا۔

لینن کی انواج کے محاصرہ کے بعد جب کریمیا میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو وہاں کے لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے، لینن نے وعدہ کیا کہ کریمیا میں جمہوری حکومت قائم کی جائے گی، اس جمہوریت کا صدر ایک کمیونسٹ بالاکون کو بنایا گیا اور اسکا نام سوشلسٹ جمہوریہ کریمیا قرار دیا گیا۔

بالاکون کے عہد میں کریمیا کے تاتاری مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کی جگہ روس، یوکرین اور بلغاریہ کے لوگوں کو بسا دیا گیا، البتہ جن مسلمانوں نے کیمونزم کو بے چون وچرا تسلیم کر کے اپنے آپ کو اس کے نظام حکومت کے ماتحت کر لیا انہیں اعلیٰ مناصب پر فائز کیا گیا۔ چنانچہ بالاکون کے بعد کریمیا کا صدر ولی ابراہیم منتخب ہوا مگر لینن نے ۱۹۲۸ء میں اس کو تمام وزراء سمیت قتل کرا دیا، یہی حشر ۱۹۳۰ء میں صدر محمد قوبائی اور انکے وزیروں کا ہوا اور ۱۹۳۶ء میں الیاس طرخان کے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا گیا، ان مظالم سے تنگ آکر کریمیا کے مسلمانوں نے روس کے خلاف بغاوت کر دی، چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں کریمیا سے تعلق رکھنے والے ۱۸ ہزار فوجی جرمنی کا مقابلہ کرنے سے اس لیے رک گئے تھے کہ اس کے زیر سایہ آئندہ انہیں امن وسکون نصیب ہوگا مگر الکفر ملۃ واحدہ۔

جب جرمنی کو پتہ چلا کہ یہ ۱۸ ہزار فوجی مسلمان ہیں تو انھوں نے ان کے ساتھ ظلم وستم کا معاملہ شروع کر دیا، ان کے ہتھیار چھین لیے، رزق کے اسباب ووسائل بند کر دیے، ناقابل برداشت اذیتیں دیں، بھوک پیاس کی تکلیف سے کچھ لوگ ہلاک ہوگئے اور جو بچ رہے ان کو ایسے تاریک اور ہولناک قیدخانہ میں محبوس کر دیا جہاں دن میں بھی روشنی نہیں پہونچتی تھی اور غذائی قلت کا بہانہ کر کے خورد ونوش سے محروم رکھا جاتا تھا، بھوک کی شدت نے انہیں مردار اور دیواروں پہ لگے تارکول کھانے پر مجبور کر دیا۔

جب جرمنی کی فوج کے افسروں کو پتہ چلا کہ وہ اپنے مردوں سے اپنے شکم کی آگ

بجھا رہے ہیں تو انھوں نے قید خانہ سے باہر کرکے ان مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا کسی طرح سے تین آدمی بچ گئے، انھی کی زبانی دنیا کو اس بھیانک عذاب اور بے پناہ ظلم و ستم کی اطلاع ملی، دوسری طرف روسی حکومت نے کریمیا پر یہ الزام لگایا کہ یہ جرمنی کے ایجنٹ اور غدار ہیں، اسلیے روسی افواج کریمیا کی راجدھانی باغچہ سرائے میں پہلے داخل ہوگئیں، اسلامی یادگاروں اور تاریخی مسجدوں کو تباہ و برباد کرنے میں لگ گئیں، قرآن مجید کے نسخے جمع کرکے کھلے میدان میں انھیں نذر آتش کر دیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے بعد باقی ماندہ کو جلاوطن کر دیا اور خود کریمیا پر قابض ہوگئے، البتہ کریمیا کے کچھ تاتاری سائبیریا کے جنگلوں اور مختلف پوشیدہ جگہوں میں روپوش ہوگئے اور وہیں سے وطن میں اپنی واپسی کا مطالبہ کیا۔

۱۹۷۰ء میں جب روسی حکومت کو خبر ہوئی کہ کچھ انتہا پسند تاتاری سرکاری اجازت کے بغیر اپنے ملک واپس ہو رہے ہیں اور مکانات بھی بنا رہے ہیں تو اس نے قومی گارڈ کے دستوں کو بھیج کر انکے مکانات گرا دیے اور زندہ لوگوں کو گرفتار کرکے جیلوں میں بند کر دیا اور انکے وطن واپس ہونیکے مطالبے کو مسترد کر دیا۔

۱۹۹۱ء میں پھر انقلاب آیا اور اللہ کے حکم سے سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ کمیونزم کی دھجیاں اڑ گئیں مگر اب بھی روس کریمیا پر قابض ہے اور اسے تاتاری مسلمانوں کی واپسی گوارا نہیں ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے ہر قسم کی جد و جہد کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، خدا کی راہ میں صبر و استقامت کے بعد ہی کریمیا، بوسنیا، ہرزگووینا کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا سلسلہ بند ہوگا اور اللہ کی نصرت کے مستحق ہونگے، اسلام کا دم بھرنے والوں کو اسوقت واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا کا صحیح نمونہ پیش کرنا چاہیے۔

ک۔ ص۔

وفیات

ذکرِ مالک رام

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

۱۹۶۵ء میں جناب علی جواد زیدی نے ان کی متنوع علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار صحیفہ شایع کیا، اس کے لیے غالباً انہی کے ایما سے عورت اور اسلامی تعلیم پر مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی حالانکہ ان کو علم تھا کہ اس کے بعض مندرجات سے مجھے اتفاق نہیں ہے، میں اس فرمایش کو مسترد نہیں کر سکا اور اپنے حقیر معروضات بے تکلف پیش کر دیے، مجھے یہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کہ مضمون کے معترضانہ حصے انھوں نے اور زیدی صاحب نے جوں کا توں شایع کر دیا، بعد میں ان سے اس پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ ہر تبصرہ نگار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے بے کم و کاست ظاہر کرے۔ اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں تصرف کا کسی کو حق نہیں۔

مالک رام سے میرے تعلقات بڑھے تو انھوں نے اصرار کیا کہ دلی آؤں تو ان سے مل لیا کروں یا انہیں اپنی قیامگاہ کا پتہ بتادوں تو وہ خود مل لیا کریں گے، دلی میں میرا قیام عموماً اپنے ایک عزیز کے یہاں ہوتا تھا وہاں انہیں کیا زحمت دیتا، میں نے خود ان سے ملاقات کو اپنا معمول بنا لیا، اگر کبھی جلدی میں اس کا موقع نہیں ملتا اور انہیں میرے دلی جانے کا پتہ چل جاتا تو اشارتاً اس کا ذکر کر دیتے،

ایک دفعہ میں اپنے بزرگ کرمفرما مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم سے ملنے انکی جماعت کے دفتر گیا تو وہیں سے مالک رام صاحب کو فون کیا کہ آپ جس وقت گھر پر موجود رہیں اس وقت میں ملاقات کے لیے حاضر ہو جاؤں، انھوں نے دریافت کیا تم کہاں سے فون کر رہے ہو، جب میں نے بتایا تو انھوں نے یہ مصرع پڑھا ع

تری آواز مکے اور مدینے

پھر مولانا کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرنے کو کہا۔ ایک دفعہ نواب مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم ہمدرد نگر میں جناب اوصاف علی صاحب کے یہاں سے انہیں فون کر رہے تھے، میں نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ میرا سلام پیش کردیں تو مالک رام صاحب نے فرمایا کہ صرف سلام سے کام نہیں چلے گا، ممکن ہو تو ملاقات بھی کریں۔

اس سال انجمن ترقی اردو ہند نے جنوری میں ان کا یوم ولادت منانے کا پروگرام بنایا تھا، ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے اس میں شریک ہونے اور ان پر کوئی مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، میرے لیے یہ بڑے فخر و سعادت کی بات تھی، لیکن ڈاکٹر صاحب کا پہلے خط آیا کہ اب یہ پروگرام فروری میں ہوگا پھر ملک کے حالات کی وجہ سے اس وقت بھی اسے ملتوی کرنا پڑا، "محقق و ماہر غالبیات مالک رام" کے عنوان سے میں مقالہ تیار کر چکا تھا، خیال تھا کہ اسے مالک رام صاحب کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج دوں، مگر چند مہینے حیص بیص میں گزر گئے اور مالک رام صاحب اپنے مالک و داتا کے پاس پہنچ گئے، دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے۔

ایک مرتبہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دہلی کے کسی سمینار

میں شریک ہو کر دارالمصنفین واپس آئے تو شاہ معین الدین صاحب سے اسکی روداد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مالک رام صاحب نے مجھے دیکھکر فرمایا کہ میں نے اپنے مضمون میں آپ کے جدامجد کی خبر لی ہے، اس پر صباح الدین صاحب مرحوم کو بڑی ناگواری تھی اور اس کی وجہ سے مجھ پر بھی بہت دنوں تک یہ اثر رہا کہ مولانا شبلیؒ کے بعض معاندین کی طرح انہیں بھی ان سے عناد ہے، لیکن جب ان سے تعلقات ہوئے تو محسوس ہوا کہ بعض امور میں اختلاف کے باوجود وہ مولانا کے پورے عظمت شناس ہیں، دراصل مالک رام صحیح معنوں میں عالم تھے اس لیے وہ دوسروں سے علمی اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ان کے قدرداں اور عظمت شناس نہیں تھے، درست نہیں ہے۔

تنقید اور نکتہ چینی کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اچھے اچھے لوگ ایسے موقع پر چراغ پا ہو جاتے ہیں لیکن مالک رام صاحب کو میں نے اس معاملہ میں بڑا عالی ظرف پایا، ان سے اگر اختلاف کیا جاتا تھا تو اپنی عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کی بنا پر وہ کبھی اس کا برا نہیں مانتے تھے، بڑے مصنفین کی طرح ان کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس پر اعتراضات نہ کیے گئے ہوں، قاضی عبدالودود وغیرہ سے لے کر ہر درجہ کے لوگوں نے ان سے جا و بیجا اختلاف کیا ہے مگر وہ اس پر چیں بر جبیں نہیں ہوئے، اعتراض درست ہوتا تو معترض کے شکر گذار ہوتے اور فوراً اسے قبول کر لیتے لیکن غلط اعتراض کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے، اپنی کتاب "تلامذۂ غالب" پر ہونے والی تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"ان ۲۵ برسوں میں تلامذۂ غالب سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کتاب سے

متعلق بھی اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی' ان میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کا تھا۔ میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان اصحاب کا احسان مند ہوں، اگرچہ افسوس ہے کہ ان کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔"

علامہ شبلیؒ کی طرح بعض لوگوں نے ان کی بھی خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف لغزشوں اور فروگزاشتوں ہی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، یہاںتک کہ انکے خلاف ایک کتاب بھی شایع کی گئی مگر مالک رام صاحب کو نہ اس سے کوئی پریشانی ہوئی اور نہ انھوں نے ایسے لوگوں کی شکایت سے اپنی زبان آلودہ کی، علی جواد زیدی صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"علامہ شبلیؒ کی طرح مالک رام کے لیے بھی یہ شرف مخصوص ہوا کہ انکے مثبت اکتسابات کے مقابلے میں ان کی لغزشوں اور فروگذاشتوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور ایک خاصی کتاب وجود میں آگئی، مجھے یقین ہے کہ انہیں اس احساس سے تسکین ہوئی ہوگی کہ ایسے شرف اچھے ادیبوں اور محققوں کی قسمت ہی میں لکھ دیے گئے ہیں' آزاد اور شبلیؒ کے پرستاروں سے زیادہ اسے کون محسوس کر سکتا ہے کہ اعتراضات کی مسلسل بوچھار کا مخاطب بننے کے لیے بھی بلند پائیگی کی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

مالک رام صاحب حسن صورت و حسن سیرت کے جامع تھے، وہ وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب بھی تھے اور خلیق، ملنسار، متواضع، وسیع المشرب اور انسان دوست بھی، ان کا دل شرافت، مروت، ہمدردی اور خلوص و محبت کا گہوارہ تھا، انکی زندگی تکلف سے بری اور نمود و نمایش سے خالی تھی، حرص و طمع کے بجائے قناعت پسند تھے،

بڑے سرکاری افسر اور اردو کے صف اول کے اہل قلم میں بھی ممتاز ہونے کے باوجود ان میں نہ غرور تھا نہ تمکنت' جھوٹ اور مکاری سے نفرت، وعدے کے سچے اور پکے تھے، بڑے اصول پسند تھے، بے اصولی کو پسند نہیں کرتے تھے، خود بھی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے، ہمیشہ مستعد اور چاق وچوبند رہتے، ہر وقت اپنے کام میں منہمک اور دھن میں مست رہتے، نہ کبھی فضول باتوں اور لایعنی کاموں میں اپنا وقت ضایع کرتے اور نہ دوسروں کی شکوہ شکایت اور غیبت کرتے، اسی اصول پسندی اور وقت کی قدر کرنے کے نتیجہ میں انھوں نے کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے گوناگوں علمی وتحقیقی کام انجام دیے۔

مالک رام صاحب نے بڑی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی، کسی سے بغض وکینہ نہیں رکھتے، اپنے مخالفین کے معاملہ میں بھی عفو ودرگزر سے کام لیتے، کبھی غضب واشتعال میں آکر صبر وضبط، نرمی اور اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے، صلح کل ان کا مزاج تھا، دوسروں کے درمیان بھی صلح وآشتی کرا دیتے، اپنے سے چھوٹے لوگوں پر بھی شفقت فرماتے اور برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے، ان میں ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تھی، اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کرتے، جو لوگ ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کرتے ان کے احسانمند ہوتے۔

ان سے کوئی غلط کام کرانا آسان نہ تھا وہ نہ کسی کی حق تلفی کرتے اور نہ بیجا رورعایت کرتے، صاف گوئی اور دوٹوک بات کہنے کے عادی تھے، دیانت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ان سے کلکتے کی کسی بڑی کمپنی کے مالک کے امپورٹ لائیسنس کے لیے جناب دوارکا داس شعلہ نے سفارش کی، مالک رام صاحب کی نظر میں کمپنی

کے مالک واقعی اس کے مستحق تھے اس لئے انھوں نے ان کا کام کر دیا، کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعہ دوارکا داس کے پاس کچھ بڑے کوزے رس گلوں کے بھجوائے اور کہا کہ کچھ مالک رام صاحب کو بھی پہنچا دیے جائیں، دوارکا داس ایک کوزہ لے کر مالک رام کے پاس گئے، ان کو جب صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے رس گلے لینے سے انکار کر دیا اور کہا ان صاحب سے میرا کوئی واسطہ نہیں، میں نے ان کا کام اس لیے کیا تھا کہ وہ مستحق تھے اگر وہ واقعی مستحق نہ ہوتے تو میں صاف کہہ دیتا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں، اگر اس قسم کے مستحق لوگ اور بھی تمہارے پاس آئیں تو بلا تکلف انہیں میرے پاس بھیج دو، ان کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہو گی ضرور کروں گا۔

دوسروں کا کام کر دینے میں انہیں بڑی لذت ملتی تھی ایک مرتبہ میں دلی گیا اور ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو برسبیل تذکرہ کہا کہ اس دفعہ میں نے صرف اپنے لڑکے محمد طارق کے داخلہ کے لیے سفر کیا، مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام میں کسی قسم کا دخل دیں گے اور میرا تعاون کریں گے مگر انھوں نے اپنے امکان بھر ہر طرح مدد کی اور بڑی دلچسپی لی۔

بڑے منکسر المزاج اور وضعدار شخص تھے حق دوستی نبھانے کے لیے خود طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے دلی کی ایک اردو کانفرنس میں دوارکا داس کو لے کر گئے۔ مالک رام کے پاس دعوت نامہ موجود تھا، وہ چاہتے تو اسٹیج پر فروکش ہوتے مگر دوارکا داس کے پاس دعوت نامہ نہیں تھا، اگر یہ کسی کو اشارہ کر دیتے تو انہیں بھی دعوت نامہ مل جاتا مگر مالک رام صاحب نے یہ احسان لینا گوارہ نہیں کیا۔

اور دوارکا داس کی مروت میں جاڑے کے دنوں میں کھلی جگہ گھاس پر بیٹھ کر ٹھنڈک کھاتے رہے۔

مالک رام صاحب کی انسان دوستی کی راہ میں ہندو مسلمان کی تفریق حائل نہیں ہوتی تھی، جناب محمد باقر سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ان کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے، دونوں ایک دوسرے کے گھر برابر آیا جایا کرتے تھے، مالک رام صاحب کے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لینے کے بعد باقر صاحب لاہور جاتے تو وہ انہیں زبردستی اپنے ہوسٹل میں لے آتے، حالانکہ ان دنوں کالج کے ہوسٹل میں کسی مسلمان کو ٹھہرانا سنگین جرم تھا مگر مالک رام صاحب خطرہ مول لیکر انہیں اپنے ساتھ ٹھہراتے، اتفاق سے ایک دفعہ وہ ہوسٹل میں بیمار ہوگئے تو مالک رام صاحب نے ہندو ڈاکٹر سے ان کا غلط نام بتاکر دوائی لی، اگر کہیں یہ راز فاش ہوجاتا تو مالک رام صاحب کو ہوسٹل خالی کرنا پڑتا۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے مالک رام کو بڑا وسیع النظر بنا دیا تھا اور وہ ہر مذہب و ملت اور ہر طبقہ و مشرب کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے، اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے اسلام اور اسلامی علوم و مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اعتدال و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور اسلام کی جن خوبیوں اور صداقتوں کو محسوس کیا ہے، انہیں بے خوف و خطر بیان کیا ہے، ان کی طبیعت اور مزاج پر اسلام کا بڑا اثر تھا اور وہ اس کی اکثر تعلیمات کے مداح تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادوں کے نام آفتاب و سلمان اور ایک صاحبزادی کا نام بشریٰ رکھا تھا، حقیقت کا علم تو خدا کو ہے لیکن ایک دفعہ وہ مجھ سے کہنے لگے بعض لوگ مجھے قادیانی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں' خیر مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ میری بخشش کرے گا۔ وہ ہماری قدیم شرافت، وضعداری اور رلی ملی گنگا جمنی تہذیب کا ایک دلکش نمونہ تھے' اب ان خوبیوں کے لوگ عنقا ہوگئے ہیں۔

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

مطبوعات جدیدہ

الاعلام باصول الاعلام الواردة فی قصص الانبیاء علیہم السلام (عربی) از ڈاکٹر ف عبدالرحیم، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت درج نہیں۔ پتہ: دارالقلم، دمشق۔

ڈاکٹر ف عبدالرحیم صاحب علم اشتقاق (فیلالوجی) کے متبحر عالم ہیں، وہ دنیا کی کئی اہم زبانوں سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے الفاظ کے تغیرات اور تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر ہے، قرآن اور صحف سماوی میں جن انبیا اور ان کے عہد کے اشخاص کے ناموں کا تذکرہ ہے، ان کی تحقیق و جستجو علمائے سلف کا دلچسپ موضوع رہا ہے، جس پر قدما کی کئی اہم کتابیں موجود ہیں، ڈاکٹر صاحب نے انھی کتابوں کی مدد اور اپنے مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں یہ مفید اور علمی کتاب ترتیب دی ہے، جس میں انھوں نے انبیائے سابقین ان کے اعزہ و متوسلین نیز ان کے زمانہ کے امرار و سلاطین اور موافقین و مخالفین کے ناموں کو یکجا کر کے ان کے اصل ماخذ کی نشاندہی کی ہے، اس کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے، مصنف نے علمائے سلف کی تحقیقات نقل کر کے حسب موقع اپنی رائے بھی پیش کی ہے، ماخذ کی نشاندہی زبان کے اصل حروف لکھ کر کی گئی ہے، جو مولف کی وسعت نظر کی دلیل ہے، بعض جگہ علمائے سلف کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے، مثلاً بختنصر کو عام علما کے برعکس وہ عبرانی الاصل لفظ قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام قدیم مفسرین نے آزر اور تارح دونوں

لکھا ہے اور ان کے درمیان تطبیق کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں ناموں کی اصل یونانی بتائی ہے، کتاب میں علمائے سلف کی فروگزاشتوں کا بھی ذکر ہے، مثلاً حضرت سلیمانؑ کے نام کا ماخذ جوالیقی نے عبرانی بتایا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے عبرانی کے علاوہ یونانی اور سریانی میں بھی اس کے مترادفات تلاش کرکے اس کو سریانی سے زیادہ قریب بتایا ہے، (ص ۱۰۶) اسی طرح لفظ فرعون کے بارے میں ازہری کا خیال ہے کہ یہ قبطی زبان میں مگرمچھ کو کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھ کو اس کی اور کوئی مثال نہیں ملی۔ (ص ۱۴۰) ایک جگہ بغیر کسی تبصرے کے طبری کے حوالہ سے دبورا نام کی ایک عورت کو بنی اسرائیل کی ایک پیغمبر بتایا گیا ہے، جو محل نظر ہے، اس کے متعلق ابن اثیر کا یہ بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ دبورا انبیاء کے خاندان کی ایک عورت تھی جس کو ڈاکٹر صاحب نے غالباً اسی وجہ سے نقل بھی کیا ہے (ص ۹۵) حضرت ذوالکفل کا تذکرہ کتاب میں نہیں آسکا ہے، جن کا انطباق بعض ہندوستانی علماء نے گوتم بدھ پر کیا ہے۔

نصوص من الحدیث النبوی الشریف از ڈاکٹر ف عبدالرحیم

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، غیر مجلد، قیمت ۳۰ روپیے، صفحات ۱۲۴، پتہ: اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ ۷۸، پیرمبور ہائی روڈ، مدراس۔

زیر نظر کتاب سولہ احادیث نبویہ کا مجموعہ ہے جو عربی زبان کے ابتدائی طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اس کا انداز بیان سہل اور مبتدی کے لیے عام فہم ہے، اس مجموعہ کی ترتیب کا بنیادی مقصد ان طلبہ کو حدیث نبویؐ سے متعارف کرانا ہے

جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے، مگر اس کے ساتھ عربی مدارس کے ابتدائی طلبہ
کے لیے بھی یہ بہت مفید ہے، کیونکہ اس میں قصے کہانیوں کی کتابوں کے بجائے
احادیث رسولؐ کے قصص و واقعات درج کرکے عربی زبان سکھانے کی کوشش
کی گئی ہے اور مشقی سوالات بھی دیے گئے ہیں، کتاب کے آخر میں احادیث نبویؐ
کے ساتھ ہی ان نحوی اور لغوی مسائل کی بھی جامع فہرست دی گئی ہے جو اس میں
زیر بحث آئے ہیں، اس مفید کتاب کی ترتیب پر مصنف ستایش کے مستحق ہیں
اور یہ عربی مدارس کے ابتدائی درجات کے نصاب میں شامل کیے جانے کے
لائق ہے۔

المسعف فی لغۃ واعراب سورۃ یوسف از ڈاکٹر ف

عبدالرحیم، کاغذ، کتابت، طباعت، عمدہ، قیمت ۴۵ روپیے، صفحات ۲۱۲،
پتہ: ایضاً۔

احادیث نبویؐ کے مذکورہ بالا مجموعہ کی اشاعت کے بعد فاضل مصنف
نے طلبہ کے اصرار پر اسی نہج و اسلوب پر زیر نظر کتاب لکھی جو قرآن مجید کی سورۂ
یوسف کی تفسیر ہے، اس میں بھی نحو و لغت کے مسائل سے زیادہ بحث ہے اور طلبہ
ہی اس کے مخاطب ہیں، البتہ اس سورہ کو چھ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ کے
آخر میں سوالات کی صورت میں مشقیں بھی لکھ دی ہیں، جس سے کتاب کا فائدہ دوچند
ہوگیا ہے، سہولت کے لیے فہرست میں حروف تہجی کے اعتبار سے نحو اور لغت
کے مسائل درج کیے ہیں اور ان کے لیے آیتوں کے حوالے بھی دیدیے ہیں۔

ع۔ ع۔

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۵۱ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۳ء تا ماہ جون ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	جناب ڈاکٹر احمد طاہری عراقی	۲۷۸
۲	جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مبارکپور۔ اعظم گڈھ	۲۴۵۔۳۲۵
۳	ڈاکٹر بیگم افتخار صاحبہ صدیقی ذاکر حسین کالج، دہلی۔	۷۷
۴	جناب جاوید اختر صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	۳۵۵
۵	پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں۔	۲۲۵۔۳۰۸، ۳۱۰
۶	پروفیسر سید حبیب الحق ندوی صدر شعبۂ اردو و فارسی و عربی جامعہ ڈربن۔ جنوبی افریقہ۔	
۷	جناب رام لعل نابھوی صاحب نابھا۔ پنجاب	۱۲۸۔۲۱۱، ۳۵۴
۸	پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی حبیب منزل، علی گڑھ	۲۳۰
۹	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب ذاکر نگر، نئی دہلی	۴۰۔۱۵۴، ۲۲۷
۱۰	ضیاء الدین اصلاحی	۲۔۸۲۔۹۸، ۱۵۰۔۱۶۲، ۲۴۲۔۳۱۲، ۳۲۲۔۳۸۱، ۴۰۲۔۴۰۱
۱۱	جناب عارف نوشاہی صاحب پاکستان	۳۳۹
۱۲	جناب عبدالرؤف خاں صاحب اودوتی کلاں، راجستھان	۷۰۔۳۲۵

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۳	جناب عروج زیدی بدایونی مرحوم رامپور	۱۵۶
۱۴	جناب علی جواد زیدی صاحب اندھیری، بمبئی	۴۰۵
۱۵	مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب بہار سوسائٹی، کراچی	۳۰۷
۱۶	ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی لکچرار عربی تکمیل الطب کالج لکھنؤ	۱۰۴۔۲۷
۱۷	ڈاکٹر ف عبدالرحیم صاحب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ	۴۵۹
۱۸	مولوی کلیم صفات ناظر کتب خانہ دارالمصنفین	۴۶۵
۱۹	جناب گوردیال سنگھ مجذوب دہلی	۲۰۷
۲۰	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب صاحب بریلی	۲۹۰
۲۱	جناب مولوی محمد اکرام ندوی صاحب آکسفورڈ	۱۶۵۔۸۵
۲۲	جناب محمد ایوب واقف صاحب اندھیری، بمبئی۔	۱۵۱
۲۳	جناب محمد بدیع الزماں صاحب پھلواری شریف، پٹنہ	۱۱۸

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۲۴	جناب محمد خالد پٹیل صاحب بھیونڈی، مہاراشٹر	۱۵۲
۲۵	پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں صاحب، کلکتہ	۱۹۹
۲۶	مولوی محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین	۸۰، ۴۳۹
۲۷	جناب محمد عبدالرحمن سعید صدیقی صاحب شکاگو۔ امریکہ	۷۰۔۶۶
۲۸	مولوی حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دارالمصنفین	۵۰۔۶۸، ۲۷۵۔۲۷۶، ۱۵۔۳۱۸، ۴۶۱
۲۹	ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔	۴۲۳
۳۰	جناب حکیم مختار اصلاحی صاحب محمد علی روڈ، بمبئی۔	۱۴۸
۳۱	جناب ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۳۴۹
۳۲	پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب اندرا نگر لکھنؤ	۳۰۹
۳۳	پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی	۳۴۔۱۵۰
۳۴	پروفیسر نذیر احمد صاحب سر سید نگر، علی گڑھ	۵
۳۵	جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۱۱۔۱۴۶
۳۶	ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب مہاراشٹر کالج، بمبئی۔	۲۶۱

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۱

ماہ جنوری ۱۹۹۳ء تا ماہ جون ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	شذرات	۲ - ۸۲، ۱۶۲ - ۲۴۲، ۳۲۲ - ۴۰۲	۸	رسالہ مخزن (لاہور)	۳۵۵
	مقالات		۹	سبک ہندی اور صائب	۴۰۵
۱	استدراک	۴۵۹	۱۰	شیخ علی اصغر قنوجی کی چند دستیاب شدہ تصنیفات	۳۴۹
۲	اقبال کا مرد قلندر	۱۱۸	۱۱	عربی، فارسی، اردو میں سکھ گوردوارہ پوتھیاں	۱۲۸-۲۱۱
۳	امام ابو عیسیٰ ترمذی	۱۹۱	۱۲	علمائے خراسان کے سوالات اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے جوابات	۲۴۸
۴	ایک گمنام اردو مثنوی پیکر حسن	۲۹۰	۱۳	عہد صحابہؓ کا نظام تعلیم و تعلم	۲۴۵-۳۲۵
۵	بائبل میں قدیم ہندوستانی ثقافت کے اثرات	۲۷۰	۱۴	غبار خاطر ایک تاثراتی جائزہ	۸۴
۶	حفظان صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات	۴۲۳	۱۵	فیضی کی بھگوت گیتا	۴۵۴
۷	خطاطی کی اہمیت اور ہندوستان کے دس اہم مخطوطات	۱۹۶	۱۶	کلمات نقشبندیہ	۲۷-۱۰۴

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۱۷	گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف	۲۳۹
۱۸	مشرقی یورپ کی ایک مظلوم ریاست بوسنیا و ہرزیگوینا	۴۳۹
۱۹	ملا صوفی مازندرانی	۲۶۱
۲۰	مولانا فراہیؒ اور حدیث نبویؐ	۸۵-۱۶۵
۲۱	میر محمد مومن عرشی اکبرآبادی	۵
	تلخیص و تبصرہ	
	جزیرۂ کریمیا میں اسلام اور مسلمان	۴۶۵
	معارف کی ڈاک	
۱	مکتوب بمبئی	۱۴۸-۱۴۹، ۱۵۱
۲	مکتوب بھیونڈی	۲۳۳
۳	مکتوب جموں	۳۰۸
۴	مکتوب دہلی	۱۵۰-۱۵۴، ۲۲۷
۵	مکتوب ڈربن	۳۷۲
۶	مکتوب راجستھان	۶۷
۷	مکتوب شکاگو	۶۶-۱۴۷
۸	مکتوب علی گڑھ	۲۳۰

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۹	مکتوب کراچی	۳۰۷
۱۰	مکتوب لاہور	۱۴۶
۱۱	مکتوب لکھنؤ	۳۰۹
	اخبار علمیہ	۲۲۵-۴۶۱
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	علامہ حمید الدین فراہیؒ-حیات و افکار (مقالات فراہی سیمینار)	۶۸
۲	رموز سورۂ یوسف	۳۱۲
	وفیات	
۱	ذکر بالک رام	۱۲۱-۱۴۱
۲	مولوی نور عظیم ندوی مرحوم	۱۵۵
	ادبیات	
۱	بابری مسجد	۳۱۰
۲	تاریخ ہند کا ایک واقعہ	۲۳۵
۳	سانحہ (بابری مسجد)	۷۷
۴	غزل	۱۵۶
	مطبوعات جدیدہ	۷۸-۱۵۷، ۲۳۹-۳۱۰، ۳۹۵-۴۰۸

جنوری ۱۹۹۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کر

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذ
نام سے بنوائیں:

RUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو ا
اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے
رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور د
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵ [illegible] ہوگا [illegible]

جلد ۱۵۲ ماہ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ عدد ۱

مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۲-۴

مقالات

مسلک سلیمانی	جناب مولانا غلام محمد صاحب بلڈ سوسائٹی کراچی پاکستان	۵-۲۵
حفظان صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات	ڈاکٹر حافظ محمود اختر پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۲۶-۳۴
مشرقی یورپ کی ایک مظلوم ریاست بوسنیا و ہرزیگووینا	مولوی محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین	۳۵-۴۸
"خون جگر" اور اقبال	جناب محمد بدیع الزماں صاحب پھلواری شریف پٹنہ	۴۹-۵۷
اخبار علمیہ	ع۔ ص	۵۸-۶۱

تلخیص و تبصرہ

آذربائیجان	ک۔ ص	۶۲-۷۱

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور	جناب شیخ نذیر حسین صاحب پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۷۲-۷۳

ادبیات

نماز عصر (کربلا کے معرکۂ حق و باطل میں)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد گاندھی نگر جموں توی	۷۴-۷۵
مطبوعات جدیدہ	ع۔ ص	۷۶-۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو مختلف و متضاد چیزوں کا مجموعہ بنایا ہے، آسمان کے ساتھ زمین بنائی، سورج کیساتھ چاند بنایا، دن اور رات دونوں پیدا کیے اور نور کیطرح ظلمت اور دھوپ کیطرح چھاؤں کو پیدا کیا، یہ سب بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان کی شکل و ہیئت، ماہیت و خصوصیت میں بڑا فرق ہے، انکے ظہور کے طریقے اور کائنات پر مترتب ہونے والے اثرات بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن اسکے باوجود ان میں کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ بڑی موافقت اور سازگاری ہے انکی ہم آہنگی اور ربط و اتصال ہی کی وجہ سے وہ مفید اور صالح نتائج برآمد ہوتے ہیں جن پر کائنات کے بقا کا انحصار ہے، اگر ان اجزائے مختلفہ کے توازن کو مدبر کائنات قائم نہ رکھتا اور انکو اس قدر موزوں اور مناسب طریقے سے نہ بناتا تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔

یہ متضاد عناصر ایک مقررہ نظام کے تحت اپنے اپنے دائروں میں شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سورج چاند کے دائرے میں اور چاند سورج کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا، دن اپنے مقررہ وقت پر آتا ہے اور رات بھی خاص وقت پر نمودار ہوتی ہے، ان میں سے کسی کی بھی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے حدود سے تجاوز کرے، خالق کائنات نے ہر ایک کے دائرے متعین کر کے اسکو اسکا پابند بنا دیا ہے، اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے مقررہ اصول و ضوابط سے انحراف کرے اور طغیان و سرکشی پر آمادہ ہو تو دنیا کی تباہی لازمی ہے، ان مختلف اجزا کا باہم تعاون سے کائنات کے مقاصد و مصالح کی تکمیل میں لگے رہنا، انسان کو بھی خدا کے بتائے ہوئے حدود کی پابندی کی دعوت دیتا ہے، اگر اس نے طغیان و سرکشی کا رویہ اختیار کیا تو زمین شر و فساد سے معمور ہو جائے گی حالانکہ دنیا کا بنانے والا شر و فساد کو پسند نہیں کرتا۔

ان متضاد اشیا کی خلقت اور انسانوں کے لیے انکی تسخیر و نفع بخشی خالق کائنات کی قدرت، حکمت رحمت اور ربوبیت کا پتہ دیتی ہے ان کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بے لگام ہو کر آزاد نہ چھوڑے

بلکہ انکے افعال واعمال اور حرکات وسکنات پر نظر رکھے اور اسی کے مطابق انہیں سزا و جزا دے ورنہ اسکی رحمت و ربوبیت اور قدرت وحکمت بے معنی ہوجائے گی اور یہ کارخانۂ عالم عبث اور بیکار قرار پائے گا، خدا نے مخلوقات کو جوڑے جوڑے (نر و مادہ) پیدا کیا ہے' ان میں سے ہرایک کا علاحدہ وجود اپنے اندر جو خلاء رکھتا ہے وہ نہ اسکے جوڑے کے بغیر پُر ہوسکتا ہے اور نہ اپنی غایت کو پہنچ سکتا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی کامل الوجود ہستی ایسی ہے جو ہر نقص سے پاک ہے اور جس کی قدرت وحکمت ان متضاد عناصر میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرکے انہیں با مقصد بناتی ہے' وہی دنیا کے خلا کو پُر کرنے کیلئے آخرت کو بھی ظہور میں لائے گی ورنہ دنیا کھیل تماشہ بن کر رہ جائے گی۔

عالم کائنات کی طرح نفس انسانی کا عالم بھی خیر و شر کے متضاد عوامل و محرکات کا مرکب ہے' خالقِ کائنات نے انسانی فطرت میں خیر و شر، نیکی و بدی اور بھلائی اور برائی کی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں لیکن نیکی و بدی کا شعور اور خیر و شر میں امتیاز کا ذوق بھی بخشا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو آلائش اور گندگی سے پاک رکھے' خیر پر شر کو حاوی نہ ہونے دے' نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے بچے' اپنے کو آزاد اور بے لگام سمجھ کر طغیان و فساد میں مبتلا نہ ہو کیونکہ خالق کائنات فساد برپا کرنیوالوں کو بس ایک حد تک اپنی مصلحت کے مطابق چھوٹ دیتا ہے' جب یہ اس حد سے آگے بڑھتے ہیں تو وہ اپنی زمین کو فساد برپا کرنے والوں سے پاک کردیتا ہے کیونکہ انکا وجود دنیا کے لیے خطرناک بن جاتا ہے۔

دنیا میں انسان کو یُسر و عُسر اور فراخی و تنگی دونوں حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے، اسکا مقصد اسکی ابتلا و آزمایش ہے مگر جب اللہ لوگوں پر اپنا فضل و کرم فرماتا ہے اور انہیں رزق کی فراوانی اور آسایش و کشادگی عطا کرتا ہے تو وہ اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں اور طغیان و سرکشی پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے استحقاق کی بنا پر اللہ نے ان کا اعزاز و اکرام کیا ہے اور جو لوگ تنگی اور عسرت سے دوچار رہتے ہیں وہ مایوس اور دل شکستہ ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے ان کی تذلیل کی ہے لیکن خدا کے شاکر و صابر بندے نہ نعمت پاکر مغرور ہوتے ہیں اور نہ فقر کی

آزمائش میں دلگیر ہوتے ہیں، کیونکہ کائنات کا مالک جس طرح نعمتیں دے سکتا ہے اسی طرح ان کو چھین بھی سکتا ہے، کسی فرد کی مشکلات و آزمائشیں دائمی نہیں ہوتیں، رات کے بعد دن اور تاریکی کے بعد روشنی آتی ہے، اس لیے رنج و زحمت بھی اسی وقت تک کے لیے ہیں جب تک یہ خدا کی مصلحت اور آدمی کی تربیت کے لیے ضروری ہوتے ہیں، صبر و شکر ہی سے انسان کو وہ نفس مطمئنہ حاصل ہوتا ہے جو اسے راضی برضا رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کے قدیم اور مخلص خدمت گذار مولوی عبدالباری صاحب ۳۰ جون کو وفات پا گئے، ان کی عمر ۹۰ سال سے تجاوز تھی، دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں تصحیح اور کتب خانہ کی نگرانی کے کام پر مامور کیا تھا جسکو وہ برس پہلے تک وہ انجام دیتے رہے، دارالمصنفین کے عروج کا دور دیکھنے والے اب تنہا وہی رہ گئے تھے، ان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی تھی اور وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے ہم سبق تھے، دارالمصنفین سے وابستگی کی وجہ سے انہیں مضمون نگاری کا چسکہ لگ گیا تھا، ابوعلی اثری اور ابوعلی اعظمی کے نام سے مدۃ العمر اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے، علامہ شبلیؒ کے بڑے مداح اور سید صاحب کے نہایت عقیدتمند تھے، ان کا ذکر برابر لطف و لذت سے کرتے تھے ان پر اور مولانا ابوالکلام آزاد پر بے شمار مضامین لکھے، دونوں بزرگوں پر انکے مضامین کے ایک ایک مجموعے ضیاء اللہ کھوکھر صاحب (گوجرانوالہ۔ پاکستان) نے شایع کیا تھا، اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کا منت کش ہونا گوارا نہیں کیا اور قناعت پسندی کی بنا پر ایک قلیل مشاہرہ پر پوری زندگی گذار دی، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت نعیم میں جگہ دے آمین۔

مقالات

مسلکِ سلیمانی

از جناب مولانا غلام محمد صاحب کراچی

ایک ایسے دور میں جو اہل کمال علماء و فضلاء کا دور تھا، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ایک انفرادیت حاصل تھی۔ انکی ذات میں شاہ ولی اللہ کا عمق اور عبقریت، علامہ ابن تیمیہؒ کی وسعت اور محتاط فکری حریت اور امام غزالیؒ کی حکمت و للّٰہیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، اس لیے ان کو سمجھنے اور ان کے مسلک کا واضح تصور حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کوشش میں ضروری ہے کہ نہ تو اپنے ذوق اور رنگ کو آنے دیا جائے اور نہ تنقید یا توثیقِ غیر کے خیال کو کوئی اہمیت دی جائے بلکہ ان کو ویسا ہی دیکھا جائے جس انداز سے وہ بزم آرا رہے۔

حضرت علامہ کی شخصیت چونکہ پہلو دار ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ مگر الگ الگ دیکھیں گے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اجتماعیت میں انکا مسلک کیا تھا؟

تفسیری مسلک حضرت علامہ کے نزدیک قرآن پاک کا سب سے یقینی اور صحیح مطلب و مفہوم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے متعین ہوتا ہے، اسی لیے قرآن فہمی کے لیے بنیادی توجہ حدیث و سنت پر رہنی ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"قرآن خدا کا کلام ہے جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ملک عرب میں فصیح و بلیغ عربی زبان میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا۔ اس میں نظریے بھی تھے اور عملی تعلیم بھی۔ اس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا اور ان کی عملی تعلیمات کو عملاً کر کے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا اور بتایا اور اس لیے کہ وہ اس کلام کا پہلا مخاطب تھا اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہی اسلام کے مطلب کو سب سے معتبر سمجھ سکتا تھا اور اسی لیے اس کلام کا جو مطلب سمجھا اور اپنی تعلیم اور عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے، اس لیے قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے حامل قرآن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی تفسیر سے بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"[1]

اس کے بعد دوسری چیز زبان عربی، اس کے قواعد اور محاورۂ عرب سے پوری پوری آگاہی ہے، جس کے بغیر قرآن پاک کی صحیح تفسیر ممکن نہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :۔

"کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی ہے۔ یہ کسی طرح درست نہ ہوگا کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی فقرہ کی تشریح میں اس زبان کی لغت اور قواعد میں ایسا تصرف کریں جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو اور ہمارے اس تصرف کا منشا صرف اتنا ہو کہ ہم اپنے استعداد عقلی کی تسکین کر سکیں۔"[2]

---

[1] معارف، جلد ۴۱ شمارہ ۲۔ اعظم گڈھ، فروری ۱۹۳۸ء مقالہ "مقدمہ تفسیر جواہر" ص ۸۵۔۸۶
[2] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۸ء ص ۸۷۔

اس کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ بہت غور سے سننے کی ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"حالانکہ استبعاد عقلی کوئی یکساں چیز نہیں اور نہ وہ خلاف عقل کے معنوں میں ہے عقل کی وسعت اور استبعادات عقلی کی فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے اس لیے قرآن پاک کی تفسیر کا یہ معیار نہیں بنایا جا سکتا"[1]

اب رہی یہ بات کہ ہر زمانہ میں عقلی مسلمات بدلتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے فکری فضا بھی بدلتی رہتی ہے اور ہر دور کے لوگ اپنے زمانہ کے موثرات کے تحت ہی کسی بھی کلام کو سمجھنا چاہتے ہیں اس لیے قرآن فہمی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ٹھہر سکتی تو اس کا جواب حضرت علامہ یہ دیتے ہیں:۔

"فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی علم اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے زمانہ میں غلط ہو جائیں تو ایسا ہونا بہت حد تک قرین قیاس ہے، مگر خدائے پاک کے کلام میں، جس کا علم ازل سے ابد تک کو محیط ہے، اس قسم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے اگر مخلص اہل علم اور نیک نیت علماء اس کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے موثرات کے مطابق اس طرح کریں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ، مخاطب اول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور زبان کی لغت و قواعد کے خلاف نہ ہوں تو ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔ اسی بنا پر جب مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا، اس نظر سے بھی قرآن پاک کی تفسیریں لکھی گئیں۔ معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر اور قاضی عبدالجبار کی تنزیہ القرآن اور اہل سنت میں امام ابو منصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک کی

---

[1] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۸ء ص ۸۰۔

مشکلات القرآن، امام محمد غزالی کی جواہر القرآن اور سب سے آخر میں امام فخر رازی کی تفسیر کبیر اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان ہیں۔[1]

"اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان" کا جملہ خوب ذہن نشین رہے کیونکہ اسی بنیاد پر علامہ مرحوم آخر حیات تک یہی فرماتے تھے کہ قرآن کی "بہترین" تفسیر کسی بھی تفسیر کو قرار نہیں دیا جا سکتا، یہی جواب انھوں نے عین مرض وفات میں اس وقت کے سفیر شام متعینہ پاکستان کو بھی دیا تھا، جب سفیر صاحب نے ان سے پوچھا تھا کہ قرآن پاک کی سب سے اچھی تفسیر کون سی ہے؟

حضرت علامہ کے تفسیری مسلک کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ وہ الفاظ قرآنی کے مراد ظاہری سے عدول کو روا نہیں رکھتے تھے۔ میرے استاد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو قرآنی آیات سے اعتبارات، صوفیانہ نکات اور آیات کے نتائج قیاسی نکالنے کا خاص ذوق تھا اور اس کے اثر سے اس عاجز کی طبیعت بھی اس نہج کے نکتوں اور چٹکلوں کو پڑھ کر جھوم جاتی ہے، مگر جب جب ایسی کوئی بات میں نے حضرت علامہ سے نقل کی تو سختی سے متنبہ فرمایا کہ الفاظ قرآنی کے "ظاہر مراد" سے عدول نہ ہونا چاہیے، نیز خود قرآنی مراد کو معلوم کرنے کے لیے ایک ہی لفظ کے جتنے استعمالات قرآن پاک میں آئے ہیں ان سب کا احاطہ کر کے اس کی مراد کو متعین کرنا چاہیے، مثلاً قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہتا ہے تو اب دیکھنا چاہیے کہ لفظ "خاتم" قرآن پاک میں کس کس معنیٰ میں بولا گیا ہے تاکہ ختم نبوت کا قرآنی مفہوم متعین ہو سکے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو

---

[1] معارف اعظم گڈھ فروری ۱۹۳۵ء ص ۸۷ - ۸۸ -

یہ لفظ یا تو اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ باہر کی چیز اندر نہ جا سکے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[1] (یعنی رسول کی بات دل میں نہیں جا سکتی)، یا پھر اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ اندر کی چیز باہر نہ نکل سکے، جیسے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ[2] (یعنی حشر کے دن کافروں کے دل کی کوئی بات منھ سے باہر نہ نکل سکے گی)، یا پھر یہ لفظ ان دونوں معنوں کی یکجائی کے ساتھ بولا گیا ہے جیسے وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ[3] (جنتیوں کو جو شراب ملے گی اس پر مشک کا ختام ہوگا جو اس بات کی ضمانت ہوگی کہ اس بوتل کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ اب اس میں سے نہ تو اندر کی چیز باہر آسکتی ہے نہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے) بس ان تین استعمالات کے سوا لفظ "خاتم" کا کوئی اور استعمال قرآن پاک میں نہیں ملتا، اس لیے "خاتم النبیین" کا قرآنی مفہوم صاف یہ نکل آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی میں نبیوں کے خاتم بنائے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے جو زمرۂ نبوت میں داخل ہو چکے ان میں سے کوئی بھی اب زمرۂ نبوت سے خارج تصور نہیں کیا جا سکتا اور آپ کے بعد باہر سے کوئی اس زمرۂ مقدسہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ یہ ہے فہم قرآن اور فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ کا تازہ اعجاز، اور یہ تو ایک مثال ہے، "سیرت النبیؐ" کی ضخیم مجلدات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو علامہ فہامہ کا یہ مسلک و ذوق تفسیری جگہ جگہ نمایاں نظر آئے گا۔ ع

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب ایک آخری بات تفسیری مسلک کے سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۷۔ [2] سورۂ یٰسین، آیت ۶۵ [3] سورۂ مطففین، آیت ۲۶۔

"متشابہات قرآنی" کے بارے میں حضرت علامہ کا مسلک قدمائے اہل سنت والجماعۃ والا مسلک تھا کہ خدا کی ذات وصفات اور دیگر عقائد کے متعلق قرآن پاک نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ تواتر جو کچھ ثابت ہے اس پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی عقل وقیاس اور استنباط سے اس کی تشریح کرنا صحیح نہیں ہے، گویا حضرت علامہ کے نزدیک وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ[1] (اس کا منشاء ومفہوم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا) ایک حقیقتِ اعتقادیہ ہے، جس سے یہ مسلک بنا کہ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا[2] یعنی جو پختہ علم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بس ہم اس پر ایمان لائے کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں بالفاظ دیگر متشابہات کے معاملے میں حضرت علامہ تشبیہ کے قائل تھے مگر تنزیہ کے ساتھ۔ وہ یَد۔ قَدَم۔ اِسْتَوٰی وغیرہ کی تاویل نہیں فرماتے تھے مگر ان میں کی ہر حقیقت کو لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ[3] کے وصف سے متصف جان کر ہر تشبیہ کو تصور انسانی سے پاک اور رسائی فہم سے وری الوری سمجھتے تھے۔

حدیثی مسلک | قرآن پاک کے بعد دین کی دوسری اہم اصل حدیث نبوی ہے۔ قرآن وحدیث کے باہمی ربط اور نزاکتِ ارتباط کو حضرت علامہ نے ایک وجد آفریں جملہ میں یوں ادا فرمایا ہے:۔

"علم قرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی، یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۷۔ [2] ایضاً [3] سورۂ شوریٰ آیت ۔۔

ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے"[1]

حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء بحمداللہ ہر دور میں بہت رہے ہیں اور رہیں گے مگر جو خود محدثانہ مزاج اور رنگ نسبت کا مرقع ہوں ایسے محدث خال خال ہی ملیں گے۔ حضرت علامہ اسی منتخب فہرست کے فرد فرید تھے، ان کی تاریخ دانی کا شہرہ خود ہی ان کے مفسرانہ اور محدثانہ کمالات کا حجاب بنا ہوا تھا، اس پر ادارتی تعصب نے ان کے معاصرین کے ہاتھوں اس کو ایک دیوار بنا کر کھڑا کر دیا ورنہ سیرۃ النبیؐ خصوصاً اس کی جلد سوم، سیرت عائشہؓ، خطبات مدراس کا ایک غیر جانب دار پڑھنے والا اور فن حدیث کا واقف کار علامہ کے جلیل القدر محدث اور ماہر فن رجال ہونے کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ حضرت علامہ محدث تھے اور ان کا حدیثی مسلک احتیاط اور حزم محدثانہ پر مبنی تھا۔ وہ اس وقت بھی اس معاملہ میں سخت تھے جب باضابطہ حلقۂ طریقت میں داخل نہیں ہوئے تھے اور اس وقت بھی ویسے ہی مستحکم رہے جب وہ شیخ طریقت مانے گئے۔ اکثر صوفیائے کرام اپنے ذوق یا وجدان کے سہارے بعض مقولوں کو حدیث کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، ادھر حضرات علماء اپنے موضوعہ اصولوں پر "فضائل" میں توسیع اختیار کر کے ضعیف ترین احادیث کو اپنی تصانیف میں فراخی کے ساتھ شامل رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے مگر حضرت علامہ کا مسلک کسی پہلو سے بھی ان گنجایشوں کا متحمل نہیں تھا۔ وہ فرماتے تھے (اور اس وقت ان پر خوف چھا جاتا تھا) کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر کہ من کذب علی متعمداً

---

[1] "تعارف" تدوین حدیث مصنفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مکتبہ اسحاقیہ کراچی ۱۹۶۵ء ص "د"

فلیتبوّأ مقعدہ من النار (بخاری) (یعنی جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کر لے) میرا دل لرز جاتا ہے کہ مبادا کوئی قول ایسا حضورؐ کی طرف منسوب ہو جائے جو آپؐ نے نہ فرمایا ہو اور اس کی وجہ سے اس وعید کا مورد بننا پڑے۔ راقم الحروف نے حضرت علامہ کا منشاء یہ سمجھا کہ حزم و احتیاط کے سبب کوئی ارشاد نبویؐ نقل سے رہ جائے تو اس پر تو کسی عتاب و عقاب کا اندیشہ نہیں مگر غلط انتساب سے تو جہنم مول لینا ہو گا، العیاذ باللہ اسی لیے دیکھا اور بار ہا دیکھا کہ قبول حدیث میں علامہ نے کبھی عرفی دباؤ بھی قبول نہیں فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ کیا اقطاب و ابدال کا موجود ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ نہیں البتہ بہ کثرت بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں اور وہ کافی ہیں اس پر انھوں نے تعجب سے مکرر عرض کیا کہ احادیث میں بھی اس کا ذکر نہیں؟ حضرت علامہ نے اپنی طبعی نرم مزاجی سے دوبارہ فرمایا "جی نہیں، کوئی صحیح اور قوی حدیث ایسی نہیں ملتی"۔ اس پر ان مولوی صاحب نے دباؤ ڈالنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ (جو حضرت علامہ کے پیر طریقت تھے) نے تو تعلیم الدین میں تائیدی حدیثیں تحریر فرمائی ہیں، حضرت علامہ کو ان کا یہ غیر عالمانہ طرز ناگوار ہوا اور قدرے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا:۔

> "حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے، میں نے تو نہیں لکھا، آپ مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں"

پھر جب یہ صاحب چلے گئے تو احقر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں کیا کروں، میرا

تو دل لرز جاتا ہے کہ کوئی قول حضورؐ کی جانب ایسا منسوب ہو جو آپؐ کا ارشاد نہ ہو۔

اقطاب و ابدال والی بات تو خیر ایسی اہمیت کی نہیں مگر "ظہور مہدی" کے بارے میں تو ہمارے عام محدثین حتیٰ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تک کئی حدیثیں اپنے رسالہ آثار قیامت وغیرہ میں تحریر فرمائی ہیں مگر حضرت علامہ نے اپنے مسلکِ احتیاط کی بنا پر یہاں بھی بہ تمام ادب ان اکابر سے الگ ہو رہنا ہی گوارا فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے "ظہور مہدی" سے متعلقہ حدیثی روایات کے بارے میں دریافت کیا تو علامہ نے صاف فرما دیا کہ ان روایات میں ایک روایت بھی مجھے ایسی نہیں ملی جس میں کوئی نہ کوئی راوی شیعی نہ آ گیا ہو، اس لیے یہ روایات ساقط الاعتبار ہیں۔

جہاں تک درس و تعلیم حدیث کا تعلق ہے، میں نے یہ بات بہ صراحت حضرت علامہ سے پوچھی تھی کہ کتب احادیث تو سب وہی ہیں پھر فلاں اور فلاں مدرسہ کی تعلیم حدیث میں فرق کیا ہے؟ فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں تو حدیث کو حدیث کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے اور فلاں مدرسہ میں حدیث کو حنفی کر کے پڑھایا جاتا ہے، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہ یہ چاہتے تھے کہ حدیث پڑھاتے وقت کسی بھی فقہی مذہب کے تحفظ ذہنی کے بغیر اقوال نبویؐ کے منشاء کو پانے کی کوشش کرنی چاہیے، درس حدیث میں اس بات کی طرف التفات نہ رہنا چاہیے کہ کس حدیث سے کس فقہی مذہب کی تائید ہو رہی ہے اور کونسی روایت کس کے خلاف جا رہی ہے۔ یہ کام تو فقہ کے درس میں کرنے کا ہے۔

رہی بات ادب و تعظیم حدیث کی، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے

لگیئے۔ ایک مرتبہ حضرت علامہ کی مجلس میں ایک صاحب نے بالکل موضوع حدیث نقل کردی۔ میں بے صبری سے کہہ پڑا کہ "یہ حدیث غلط ہے" حالانکہ وہ حضرت علامہ سے مخاطب تھے اور پھر حضرت علامہ ہی نے انہیں سلیقے سے غلطی پر متنبہ فرمایا۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو علامہ نے اس ادب ناشناس کو مخاطب کرکے نہایت نرمی سے فرمایا کہ "روایت غلط سہی انتسابی نسبت کا احترام تو ضروری ہے، ایسے موقع پر توقف کرکے یوں کہنا چاہیے کہ یہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے یا حضورؐ کا ارشاد ایسا نہیں ہے۔" اللہ اکبر، کیا پاسِ ادب ہے !!

فقہی مسلک | حضرت علامہ کے فقہی مسلک کے بارے میں اہل علم مختلف نظر آتے ہیں، بعضے ان کو غیر مقلد سمجھتے ہیں اور بعضے مقلد۔ جو غیر مقلد سمجھتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ علامہ کی تحریروں میں جامد تقلیدی رنگ نظر نہیں آتا اور جو ان کو مقلد خیال کرتے ہیں وہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے علامہ کو ہمیشہ حنفی طرز پر نماز پڑھتے دیکھا یا تقلید کے خلاف ان کے قلم یا زبان سے کوئی بات نہیں سنی، مجھ بے استحقاق کو بحمداللہ حضرت علامہ کے قرب و صحبت کی سعادت حاصل رہی ہے اور ان کی تصانیف کو بغور دیکھا ہے اس لیے صحیح صورت حال سے یقینی آگاہی ہے اور وہ یہ ہے کہ علامہ مقلد ہی تھے مگر ان کا تقلیدی رنگ وہ تھا جو دورِ تابعین کے بعد سے اسلام کی چوتھی صدی کے ختم تک رہا کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ عوام تک کسی خاص شخص کی فقہ کے پابند نہ تھے اور خواص کا طرزِ تقلید یہ تھا کہ :

"ان کو کسی مسئلہ میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی تھی اور ان کے پاس بہت سی احادیث مستفیضہ یا صحیحہ تھیں جن پر بعض فقہا عمل کرچکے تھے۔۔۔۔۔۔اگر تعارض

نقل اور وجہ ترجیح ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے کسی مسئلہ میں ان کا دل مطمئن نہ ہوتا تھا تو گذشتہ فقہا میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں فقہا کے دو قول ان کو ملتے تو ان میں سے جو زیادہ قابل اعتماد ہوتا اسکو وہ اختیار کرتے تھے خواہ وہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہل کوفہ کا۔"[1]

چنانچہ حضرت علامہ نے تراجم علمائے اہل حدیث مولفہ ابویحیی امام خاں نوشہری پر جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے، اس میں اپنی بابت رقم طراز ہیں:۔

"میں سنت کا پیرو اور توحید خالص کا معتقد ہوں، سنت کو دلیل راہ مانتا ہوں اور علما کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا جانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں کسی ایک میں منحصر نہیں سمجھتا۔ اس پر آپ مجھے جو چاہیں سمجھ لیں۔"[2]

یہ تحریر ۱۳ ر صفر ۱۳۵۷ھ کی ہے اور علامہ کا سن وفات ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھا، گویا وفات سے تقریباً پندرہ برس قبل کا یہ اظہار ہے، مگر اس سے واضح تر تحریر جو مسلک فقہی کی صراحت ہی کے لیے علامہ نے لکھی تھی وہ ۱۲ ر شعبان ۱۳۴۶ھ کے اس مکتوب میں ملتی ہے جو انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر فرمایا تھا، وہ یہ ہے:۔

"فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں مگر اہل حدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں۔ ائمہ رحمہم اللہ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتہً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا۔"[3]

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول۔ مترجم عبدالحق حقانی، کراچی سال اشاعت ندارد ص ۳۵۴

[2] ابویحیی امام خاں نوشہری۔ تراجم علمائے اہل حدیث [3] تذکرہ سلیمان مصنفہ راقم الحروف کراچی ۱۴۰۱ھ طبع ثانی ص ۹۹

اس توضیح کے بعد علامہ کے فقہی مسلک میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ رہی یہ بات کہ یہ مسلک اہل نظر کی نگاہ میں علامہ جیسے صاحب خبر و نظر کے لیے کیسا ہے تو اس کے لیے حضرت مولانا تھانویؒ کی تصدیق ملاحظہ ہو۔ حضرت ممدوح کی جوابی تحریر ہے:۔

"جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا' دو وجہ سے، ایک صدق و خلوص پر دال ہونے سے، دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے چنانچہ اس احقر پر...... دوسرا رنگ ہے کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں"[1]

غرض گو اکثر امور میں حضرت علامہ حنفی مذہب ہی کے پیرو تھے، رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ تراویح میں بیس رکعت کا التزام تھا مگر ساتھ ہی قرأت فاتحہ خلف الامام اور ناگزیر صورت میں جمع بین الصلاتین پر بھی ان کا عمل تھا۔ اسی طرح فتوی لکھنے میں شدو مد سے ایک مسلک کے پابند نہ تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے بھی اپنے مضمون "استاذ مرحوم نقوش و تاثرات" میں حضرت علامہ کا یہ مختصر مگر بے غبار جملہ نقل فرمایا ہے کہ :۔

"میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے"[2]

اس سلسلہ کا ایک چشم دید واقعہ سنیے اور اس سے حکمت سلیمانی کا اندازہ

---

[1] تذکرۂ سلیمان' مصنفہ راقم الحروف، کراچی ۱۹۸۲ء طبع ثانی ص ۱۰۲ [2] مولانا مسعود عالم ندوی "استاذ مرحوم نقوش و تاثرات" مقالہ مشمولہ "معارف" سلیمان نمبر، اعظم گڈھ مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۴۷۔

لگا یئے۔ ایک انگریز میاں بیوی مشرف بہ اسلام ہوئے، چند ہی روز بعد آپس کی ناچاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاق مغلظ واقع ہوگئی۔ یہ ماجرا ان کے ایک مسلمان دوست عزیز نے سنا تو انھوں نے شوہر سے کہا کہ تمہارا تو نکاح ہی فسخ ہوگیا، اب تو نومسلم میاں بیوی بھی پریشان اور ان کے دوست بھی حیران۔ احتیاطاً ان دوست نے بعض معتبر مفتیوں سے رجوع کیا مگر جواب ہر جگہ سے طلاق قطعی ہی کا ملا، پھر وہ حضرت علامہ کی خدمت میں آئے، سارا ماجرا سنایا۔ علامہ نے فرمایا کہ بھئی مفتی صاحب (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ) سے پوچھیے، انھوں نے عرض کیا کہ وہاں سے تو یہی جواب ملا۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا تو آپ کا جی کیا چاہتا ہے کہ جواب برعکس ملے؟ اس پر وہ چپ ہو رہے، تب علامہ نے ان سے فرمایا کہ آپ ایک استفتا لکھ کر کل مفتی صاحب کے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں لائیے، مجھے جو کچھ لکھنا ہے میں وہیں لکھ دوں گا، چنانچہ دوسرے روز جلسہ جب ختم ہوا اور مخصوص علماء جن میں حضرت مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور خود حضرت میزبان ممتاز ترین تھے۔ چائے نوشی کے لیے ایک کمرے میں بیٹھ گئے تو علامہ نے ان صاحب سے استفتاء کر ایک ایک کو دکھلایا، متفقہ جواب یہ تھا کہ "طلاق واقع ہوگئی" پھر حضرت علامہ نے اپنے قلم سے اس پر فتوی یہ تحریر فرمایا کہ "اہل سنت والجماعت میں مسلک اہل حدیث کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوئی رجوع کرا دیا جائے" (لفظی تغیر ممکن ہے، غالب یادداشت یہی ہے) پھر علمائے کرام کو یہ جواب دکھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ نومسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی لہذا قانون میں کوئی گنجایش بھی نکلتی ہو تو اس کا فائدہ

انہیں ملنا چاہیے۔ اس پر مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برملا فرمایا کہ یہ جواب حضرت ہی لکھ سکتے تھے ہم چونکہ فقہ حنفی کے مفتی ہیں اس لیے نہیں لکھ سکتے تھے، پھر مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع نے بھی اس قول کی تائید فرمائی۔

ایک اختلافی مسئلہ "طلاق مکرہ" کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک کوئی شخص اپنی بیوی کو خوف و ڈر کی وجہ سے با دل ناخواستہ جبراً طلاق دیدے تو وہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، حضرت علامہ "طلاق مکرہ" کے واقع نہ ہونے ہی کے قائل تھے، اپنی تصنیف حیات امام مالک میں امام دار الہجرۃ کے مسلک کو جہاں بیان فرمایا ہے وہاں اپنے متعلق یہ طویل حاشیہ لکھا ہے:۔

"اس مسئلہ کے متعلق مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک مناظرہ یاد آگیا ہمارے استاذ فقہ مولانا مفتی عبد اللطیف صاحب مدرس اول دار العلوم و تلمیذ رشید مولانا لطف اللہ صاحب اطال اللہ بقاہما ہیں۔ جناب مفتی صاحب کو فقہ حنفی کی صحت کلی میں نہایت شدت کے ساتھ غلو ہے اور جس سے میں بدطفولیت سے محروم ہوں۔ طلاق مکرہ کے مسئلہ میں ہماری جماعت میں اختلاف ہوا۔ میرے سوا تمام طلبہ وقوع کے قائل تھے، میں حضرت عائشہؓ کی حدیث لا طلاق ولا عتاق فی الاغلاق (حالت جبر و اکراہ میں طلاق وعتاق نہیں)، پیش کرتا تھا اور ان کی طرف سے ثلث جدھن و ھزلھن سواء (تین چیزوں میں اظہار واقعیت اور مذاق دونوں برابر ہیں) طلاق کی حدیث پیش کی جاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ طلاق مکرہ نہ جد (واقعیت) ہے نہ ہزل (مذاق)، "ہزل" تو متفقاً نہیں ہے، جد اس لیے نہیں کہ "جد" نام ہے خواہش

حقیقی و واقعی کے اظہار کا جو بحالت اکراہ غیر ممکن ہے! بالآخر یہ معاملہ جناب مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا، مفتی صاحب نے استدلال عقلی کے طور پر فرمایا کہ زبان سے لفظ طلاق ادا کرنا انسان کا ایک فعل ہے اور افعال کا اثر محتاج نیت وارادہ، واظہار واقعیت وغیر واقعیت نہیں ہے مثلاً کسی کو تم طمانچہ مارو جو تمہارے ہاتھ کا ایک فعل ہے تو اس کا اثر یعنی چوٹ اور صدمہ محسوس ہو واقع ہوگا، خواہ مارنے کے لیے تمہارا ارادہ و خواہش واقعی ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح لفظ طلاق کے نطق کا جو اثر ہے وہ ہر حال میں واقع ہوگا۔ اس استدلال کو سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا، لیکن پھر علی الفور خدا نے مجھے ایک جواب القا کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ افعال کے آثار دو قسم کے ہیں، اعتباری و واقعی، وہ جو ہماری تسلیم و اعتبار پر موقوف نہ ہو بلکہ وہ حقیقتاً بلا اعتبار معتبر ہو مثلاً ضرب کے لیے احساس صدمہ، دوسرا صرف اعتباری، اگر اعتبار کیجئے تو اثر ہے اور نہ اعتبار کیجئے تو اثر نہیں ہے مثلاً ایک مجنون کے لفظ طلاق کے ساتھ حرکت زبان۔ اگر شرع اعتبار کرے تو طلاق ہے نہ اعتبار کرے تو طلاق نہیں ہے، اس لیے بجائے استدلال عقلی کے صرف یہ ثابت کرنا چاہیے کہ مکرہ کے اس فعل کے اس اثر کو شریعت اعتبار کرتی ہے یا نہیں اور اس کا فیصلہ حدیث عائشہؓ نے کر دیا کہ نہیں کرتی ہے[1]

ایک اور بات۔ اکثر فقہاء نے مدات زکوٰۃ والی آیت إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ[2] الخ میں فِي سَبِيلِ اللَّهِ سے مراد صرف جہاد بالسیف لیا ہے اور لِلْفُقَرَاءِ کے لام کو لام تملیک قرار دیا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک یہ تحدیدات درست نہیں

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی: حیات امام مالک، کراچی ۱۹۶۰ء۔ حاشیہ ص ۵۸-۵۹ [2] سورۂ توبہ، آیت ۶۰۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں ہر دینی کام شامل ہو سکتا ہے اور لِلْفُقَرَآءِ کے لام کو لام انتفاع لینا چاہیے۔ سیرۃ النبی جلد پنجم میں اس مقام پر یہ بصیرت افروز حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے :-

"اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گزر چکی، لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ[الف] اس سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملک بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقرآء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا[ب]"

حضرت علامہ کی یہ توضیح فرنگی دور غلامی میں چاہے ہمارے علماء کے لیے ناقابل اعتنا رہی ہو مگر آج پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں ترویج زکوٰۃ کے مرحلہ پر اس کی اہمیت اور افادیت پر اگر توجہ نہ دی گئی تو محض ایک روایتی تعبیر پر اصرار کی وجہ سے صرف زکوٰۃ کا دائرہ اپنے ہاتھوں محدود ہو کر رہ جائے گا اور دوسری طرف اہل مدارس کی چلائی ہوئی "حیلۂ تملیک" کی قباحت کو قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

صوفیانہ مسلک | حضرت علامہ کا گھرانہ خانوادۂ نقشبندیہ سے منسلک تھا اور خود علامہ کی ابتدائی روحانی تربیت ان کے برادر بزرگ سید ابو حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر ہوئی تھی جو قطب وقت شاہ ابو احمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور ذوق اتباع

[الف] سورۂ بقرہ آیت ۲۷۳ [ب] علامہ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی (مقدمہ) اعظم گڈھ ۱۹۴۳ء اشاعت دوم ص ۳۳۰۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۹۔

سنت میں مثال سے تھے، لازماً اتباع سنت کا یہی نکھرا ہوا ذوق علامہ کے قلب و دماغ نے بھی قبول کیا۔ دوسری طرف علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی اپنے اس جہاں عمر شاگرد عزیز کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا کہ بقول حضرت سلیمانؒ :-

"اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت سرور کائنات، فخر موجودات رحمت عالم، سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکار اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے سب سے اول پہنچایا"[1]

راست اتباع نبویؐ کا یہ ذوق متوجہ بتصوف ہو کر اور زیادہ تیز ہو گیا تھا، اس کا اظہار اپنے دوسرے عریضہ میں مرشد تھانویؒ سے ان الفاظ میں کیا ہے :-

"امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ سے عقیدت تامہ رکھتا ہوں، خرافات وطامات صوفیہ کے دل سے منکر ہوں۔ صالح نہیں لیکن صلاح حال کا دل سے خواستگار ہوں"[2]

حضرت اقدس تھانویؒ نے درمیانی جملہ کی بابت اپنے رنگ کا اظہار یوں فرمایا ہے:

"صوفیہ کے احوال و اقوال کو محتمل تاویل سمجھتا ہوں الا من تحقق بطلانہم بالقطع"[3]

بہر حال اس نقشبندی جوہر کا چشتی اشرفی بھٹی کی آگ میں پھنک کر جو کشتہ تیار ہوا تو اس میں ایک انفرادیت اور صوفیانہ مسلک کا وہ نکھار پیدا ہوا کہ وہ ٹھیک سلف اولین والی جلا سے مجلیٰ ہو گئے۔ حضرت علامہ کے مسلک احسانی کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔

(۱) وحدۃ الوجود ہو کہ وحدۃ الشہود ان میں سے کوئی چیز مدار طریق نہیں، بعض

---

[1] علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ حیات شبلی (مقدمہ) اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۱۱ [2] تذکرۂ سلیمان ص ۱۰۱ [3] ایضاً ص ۱۰۲۔

حال کا درجہ رکھتے ہیں (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی متبدل شکلیں (جیسے تنزلات ستہ) لہذا ان کی طرف توجہ نہ ہونی چاہیے۔

(ب) صرف توحید تنزیہی مطلوب ہے۔ تشبیہ کا انکار نہ ہو مگر تشبیہ میں بھی تنزیہ کا اقرار رہے (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)

(ج) توحید افعالی پر تمام تر توجہ مرکوز رہنی چاہیے، قرآن پاک نے سارا زور توحید افعالی پر دیا ہے، توحید ذاتی تک رسائی کا یہی محفوظ زینہ ہے۔

(د) کثرت وظایف واوراد کے بجائے ہر عمل میں اتباع سنت اور ہر عمل سے متعلقہ ادعیہ ماثورہ کی پابندی پر توجہ مرکوز رہے، اسی سے وصول الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔

(ہ) مصطلحات صوفیانہ کو ترک کرکے قرآنی وحدیثی اصطلاحات پر اکتفا ہے۔ (جیسے خشوع، خضوع، تقویٰ، خشیت، ذکر، احسان وغیرہ)

(و) صوفیانہ مسائل کی بحث وتمحیص اور قیل وقال سے احتراز کا اہتمام اور اپنے اقوال، اعمال، احوال اور اذواق کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ہم رنگ بنانے کی کوشش بلیغ رہنی چاہیے۔

(ز) اسرار وحقایق الٰہیہ سے متعلق جو سوالات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے نہیں اٹھائے وہ ہم کو بھی از راہ تصوف نہ اٹھانے چاہییں نہ ایسی باتوں میں الجھنا چاہیے۔

(ح) ساری توجہ لطیفۂ قلب پر مرکوز رہے کہ یہی قرآن وحدیث میں مذکور ہے اور ذکر مفرد مع الحضور کی کثرت سے رسوخ اور دوام حضور حاصل کیا جائے تاکہ

تنائے تام حاصل ہو کر مقام عبدیت میں تمکین میسر آ جائے جو مقصود ہے اور اِیَّاكَ نَعْبُدُ
وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جس پر دلیل محکم ہے!

(ط) محاسبۂ نفس کی ہر وقتی مشق اور اہتمام تا دم آخر قائم رہے۔

اب آخری بات جو تصحیح فہم کے نقطۂ نظر سے اولین اہمیت کی چیز ہے کہ حاصل تصوف کیا ہے؟ اس کو خود حضرت علامہ کی زبان عارفانہ میں سنیے۔ اپنے شاگرد عزیز مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک والا نامہ میں تحریر فرما رہے ہیں:

"ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے اور جب خدا اور بندے کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "نسبت" کہتے ہیں اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ[1] اور رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ[2] کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً[3]، انہی کے لیے نوید بشارت ہے[4]۔"

اجتماعیاتی مسلک | سب جانتے ہیں کہ حضرت علامہ خالص علمی و تحقیقاتی کاموں کے لیے جوانی ہی سے خود کو وقف فرما چکے تھے، ان کی اسی فنائیت علمی کا ثمرہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں دار المصنفین کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا، اس کے باوجود ہر دیکھنے والا یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے اولین اجلاس منعقدہ بمبئی میں اور پھر اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی میں شریک ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں مجلس علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۵۴ [2] سورۂ انعام، آیت ۱۱۹۔ سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲۔ سورۂ بینہ، آیت ۸ [3] سورۃ الفجر، آیات ۲۷، ۲۸ [4] سید مسعود عالم ندوی "مکاتیب سلیمانی"۔

میں علمائے ہند کی تنہا نمایندگی یورپ میں فرما رہے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں صوبۂ بہار کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں کرسیٔ صدارت کو زینت بخشے ہوئے ہیں ۱۹۲۴ء میں حجاز اور مصر پہنچکر ابن سعود اور شریف حسین میں کامیاب مصالحت کرا رہے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جمیعۃ العلمائے ہند کے تاریخی سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کی زمام صدارت ہاتھ میں لیے علمائے کرام کو سمت عمل کی صحیح نشاندہی فرما رہے ہیں، ادھر السلال کی ضیا پاشیوں میں نور کی کتنی تابناکیاں ہیں جو اسی آفتاب علم کی رہین منت ہیں۔ پھر تحریک پاکستان کے ہونہار دور میں وہی صاحب نظر ہے جو بظاہر الگ تھلگ مگر خاموشی سے "اسلام کا سیاسی نظام" اپنی نگرانی میں مرتب کروا کے لیگیوں کے حوالے کر رہا ہے۔ پھر جب پاکستان بن چکا تو اس کی دعوت پر ۱۹۵۰ء میں یہاں آکر علامہ ہی کی فعالیت ہے جو مراحل دستور سازی اور تشکیل قانون اسلامی میں کارفرما نظر آتی ہے۔ دوسری سمت دیکھئے تو وہ بالواسطہ دھیمے دھیمے جماعت اسلامی کی بائی کمان کو جادۂ حق پر لانے کی حکیمانہ کوشش فرما رہے ہیں، کبھی دیکھئے تو وہی ہیں جو شان فقر لیے تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں نم دیدہ دست بدعا دکھائی دے رہے ہیں اور زعمائے تبلیغ کو وسعت فکر و عمل کی وصیت فرما رہے ہیں۔ غرض خلوت پسندی اور اجتماعی جدوجہد میں عجیب دل کش و دل فریب ربط پیدا کیے ہوئے ہے۔ یہی حضرت علامہ کے اجتماعی مسلک کا امتیاز ہے جو دراصل قرآن پاک کی دو آیات پر اپنی اساس قایم کیے ہوئے تھا، ایک تو وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ [1] (یعنی ہر تقویٰ اور نیکی کے معاملہ میں تعاون) اور دوسرے

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۲۔

لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۔ (یعنی اپنی خدمات میں مخلوق کی طرف سے جزا یا قدردانی کے صلہ سے بے نیازی) اسی لیے حضرت علامہ کے مسلک اجتماعی میں بڑی ہمہ گیری تھی ۔ ان کا اجتماعیاتی مسلک آویزش و محاذ آرائی کی تلخیوں سے پاک، منصب وجاہ کی حرص اور نمود و شہرت کی نفسانی خواہشات سے منزہ تھا ۔ یہاں کسی خاص جماعت میں نہ انضمام تھا نہ کسی سے انقطاع بلکہ انضمام و انقطاع کے درمیان "بے غرض تعاون" تھا، جو صرف امت محمدیہ سے محبت اور اس کی دل سوزی کے محرکات اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کی طلب کے اضطراب قلبی کا نتیجہ تھا ۔

اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں اور نوازشیں ہوں ایسے پاکیزہ مسلک حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی روح پر فتوح پر!

---

[۱] سورۂ دہر، آیت ۹۔

حفظانِ صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات

از ڈاکٹر حافظ محمود اختر، لاہور

(۲)

روزہ ایک عظیم الشان عبادت ہے جس کے طبی فوائد مسلم ہیں، یہ معدے کے امراض اور بدن کے گندے مواد کے خاتمہ کے لیے ایک مستقل نسخہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے"۔[۶۶] زکوٰۃ مال کو پاک و صاف کرتی ہے اور روزہ انسانی جسم کو مادی اور روحانی بیماریوں سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے۔

اطبا نے بھی بعض امراض میں انسان کو کچھ دیر کے لیے پیٹ خالی رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ایک روسی ماہر ابدان پروفیسر وی این نکیٹن نے لمبی عمر کا راز بھی اسی میں مضمر بتایا ہے۔ لندن میں ۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر میرے تحقیق شدہ یہ تین اصول زیرعمل آجائیں تو بدن کے زہریلے مادے خارج ہو کر بڑھاپا کو روک سکتے ہیں۔

۱۔ خوب محنت ۲۔ کافی ورزش ۳۔ غذا کچھ بھی ہو لیکن ہر ماہ ایک مرتبہ لازماً فاقہ۔[۶۷]

کتب حدیث میں "صیام التطوع" "یعنی نفلی روزے" کے باب کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر دکھائی دے گی کہ حضور اکرمؐ نے ہر ماہ میں تین روزوں کی

بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے[۹] دوسری جانب روزے فرض بھی قرار دیے گئے ہیں لیکن کسی طرح کے روزے میں کوئی افراط و تفریط نہیں ہے مسلسل روزے سے انسانی جسم نقاہت کا شکار ہو جاتا ہے، رہے روزے کے اوقات تو ان کی مدت کے تعین میں کمال حکمت کا اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:-

"روزے کے دنوں کی تعداد میں ایک حکمت کارفرما ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہے"
اگر تفریط ہوتی یعنی بہت کم دنوں کے روزے فرض کیے جاتے تو روزہ کا اصل مقصد ہی حاصل نہ ہوتا اور اگر افراط کی راہ اختیار کی جاتی اور روزے زیادہ لمبے عرصے کیلئے لازم کیے جاتے تو اس سے انسانی قویٰ و اعضاء میں خرابی پیدا ہو جاتی، کام کرنے کی استعداد پر منفی اثرات پڑتے اور انسان اتنا کمزور ہو جاتا کہ جیتے جی قبر میں پاؤں لٹکا لیتا ہے[۱۰]

اسی طرح کھانے پینے سے رکے رہنے کا وقفہ بھی اس قدر طویل نہیں ہے کہ انسانی جسم میں کمزوری ہو جائے اور انسان دینی و دنیوی فرائض کی ادائی سے قاصر ہو جائے[۱۱]
حضورؐ کی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایسے طبی اصول کی رعایت کی گئی ہے جن سے انسانی جسم کمزوری کا شکار نہ ہو۔ مثلاً حضورؐ نے روزہ کی حالت میں سینگیاں لگانے اور لگوانے سے متعدد حدیثوں میں اسی لیے منع کیا ہے کہ سینگی لگوانے والے پر کمزوری طاری ہو سکتی ہے اور سینگی کھینچنے والا روزہ سے اس لیے ہاتھ دھو بیٹھا کہ وہ سینگی چوستے وقت اس بات کے قریب ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے منہ میں چلی جائے، آپؐ نے رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں مسلسل روزے رکھنے کی ممانعت یا حوصلہ شکنی فرمائی ہے[۱۲] غرض روزہ جیسی اہم عبادت کا طریقہ ایسا بیان

کیا گیا ہے جس سے مثبت اثرات مرتب ہوں اور منفی اثرات سے بچا جاسکے۔ انسان صحت مند ہو تو وہ دنیوی فرائض بھی سرانجام دینے کے قابل ہوگا اور عبادت میں انہماک بھی اسی وقت رہیگا جب وہ جسمانی اعتبار سے توانا ہوگا۔[۵۲]

اسلام کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے اندر راہبانہ تصور زندگی پایا جاتا ہے۔ ہندومت اور بدھ مت میں بھوکے پیاسے رہ کر جسم کو کمزور اور لاغر بنالینا تزکیۂ نفس کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس قسم کی انتہا پسندانہ ریاضتیں اور مشقتیں انسانی جسم کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں جو ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے، اسلام کا کمال یہ ہے کہ وہ تزکیۂ نفس بھی کرتا ہے اور انسانی صحت کی بہتری اور حفاظت کا سامان بھی کرتا ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء کو ڈھانپ کر رکھنے کی ہدایت اسی لیے دی گئی ہے کہ کھلی چیزوں میں مکھی، مچھر، چیونٹی یا گرد و غبار وغیرہ پڑجاتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی زہریلا مادہ لگا ہو تو وہ انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ابو حمید انصاری مقام نقیع سے حضور اکرمؐ کے لیے دودھ کا برتن لائے آپؐ نے فرمایا تم اسے ڈھانپ کر کیوں نہیں لائے۔[۵۳] ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا بسم اللہ پڑھ کر اپنی مشک بند کردو اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے برتن ڈھانپ دو۔[۵۴]

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تم سونے لگو تو اپنے چراغ بجھا دیا کرو۔ کیونکہ چوہے رات کو دیے کی بتی کھینچ لیجاتے ہیں اور گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔[۵۵] حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ حضورؐ نے پانی پیتے وقت اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ ایک شخص نے عرض کیا اگر اس میں تنکے پڑجائیں؟ آپؐ نے فرمایا

تھوڑا سا پانی پھینک دو۔[۵]

حضورؐ نے مشک میں منہ لگا کر پانی پینے سے بھی منع فرمایا اس کے مصالح حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ بیان کیے ہیں۔

۱۔ اس طرح سے کئی بار پانی پینے والے کی سانس اندر جا کر مشروب کو مسموم و مکروہ بنا دیتی ہے۔

۲۔ پانی کا ایک حصہ اس کے جوف میں داخل ہو کر ضرر رساں بن جاتا ہے۔

۳۔ کبھی اس میں کوئی مکھی مچھر یا کوئی اور جانور گر پڑتا ہے جس کا پتہ پیتے وقت نہیں چل سکتا اور اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔

۴۔ کبھی پانی میں تنکے وغیرہ گر پڑتے ہیں جو پیتے وقت نظر نہیں آتے اور پیٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ عین ممکن ہے کہ مشک کا منہ اچانک زیادہ کھل جانے سے پانی سانس والی نالی کے اندر چلا جائے اور مشاہدہ یہ ہے کہ اس صورت میں آدمی کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔[۶] شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"پانی غٹ غٹ کر کے یکبارگی حلق میں داخل کرنے سے درد جگر پیدا ہوتا ہے جو معدہ کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور چونکہ اس طرح پانی پینے سے مشکیزہ نظر سے اوجھل رہتا ہے اس لیے کوئی بھی موذی اور مکروہ چیز اس کے شکم میں جا سکتی ہے چنانچہ ایک شخص نے اس طرح پانی پیا، مشکیزے میں سانپ تھا جو پانی کے ساتھ ہی اس کے اندر چلا گیا۔[۷]"

پانی وغیرہ میں پھونک مارنے سے منع فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ پھونک کے

ساتھ منہ یا اس کی ناک سے پانی میں ایسی چیز گر جائے جس سے طبیعت ابا کرتی ہو اور وہ موجب ضرر ہو[59] بخاری اور مسلم شریف میں روایت ہے۔

عن انس قال کان رسول اللہ[60]	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم یتنفس	حضور اکرمؐ پیتے وقت تین دفعہ
فی الشراب ثلثاً۔	سانس لیا کرتے تھے۔

مسلم شریف کی روایت میں اس کے بعد یہ اضافہ ہے۔

یقول انہ اروی وابرأ	اس طرح سانس لینے سے زیادہ
وامرأ[61]	سیرابی حاصل ہوتی ہے، یہ زیادہ
	صحت بخش ہے اور معدہ کے لیے زیادہ
	خوش گوار ہے۔

پانی پینے کے دوران تین بار سانس لینا حضور اکرم صلعم کا معمول مبارک تھا۔ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کے لیے حجۃ اللہ البالغہ ملاحظہ ہو (جلد دوم ص۱۹۲)

درحقیقت حضور اکرمؐ کی ہر سنت کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت مضمر ہوتی ہے خواہ وہ عام لوگوں کو نہ معلوم ہو محسوس ہو، اس طرح سنت پر عمل پیرا ہونا باعثِ خیر و برکت بھی ہے اور ضرر سے تحفظ کا ذریعہ بھی ہے۔

جان کی حفاظت کے لیے و فعِ مضرت کے متعلق بھی ہدایات دی گئی ہیں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علیہ وسلم من بات وفی	فرمایا جو کوئی رات کو اپنا ہاتھ دھوئے

ید ہٗ غمر لم یغسلہ فاصابہٗ شیئٌ فلا یلومن الا نفسہ[۶۲]	بغیر اس طرح سو جائے کہ ہاتھ پر چکنائی کا اثر اور اس کی بو باقی رہ گئی ہو اور اس کی وجہ سے اسے کوئی گزند پہنچ جائے (جیسے کوئی کیڑا کاٹ لے) تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (کیونکہ یہ اسی کی غفلت سے ہوا ہے)

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اپنا یہ معمول بیان کرتی ہیں کہ جب ثرید پکا کر ان کے پاس لائی جاتی تو وہ اس وقت تک ڈھکی رکھی جاتی تھی جب تک کہ اسکی گرمی ختم نہ ہو جاتی۔ اس کے بعد ہی وہ اسے تناول فرماتیں اور کہتیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے سُنا ہے کہ ٹھنڈا کرکے کھانا زیادہ برکت کا باعث ہے[۶۳]۔ یہی طبی اصول بھی ہے کہ کھانا زیادہ گرم نہ کھایا جائے، صاحب کنز العمال نے اس سلسلہ کی متعدد احادیث جمع کر دی ہیں۔

صحت اور جان کی حفاظت کے سلسلہ میں یہ امور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:-

۱- اِذا کان احدکم فی الفیئ فقلص عنہ الظل فصار بعضہٗ فی الشمس وبعضہٗ فی الظل فلیقم[۶۴]	جب کوئی سایہ کی جگہ پر بیٹھا ہو پھر اس پر سے سایہ ہٹ جائے اور اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں رہ جائے اور کچھ حصہ سائے

میں تو اسے چاہیے کہ وہ اس جگہ
سے اٹھ جائے۔

ماہرین کے خیال میں یہ اصول طب کے اعتبار سے بھی مفید ہے۔

۲۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا جو دیواروں اور منڈیروں سے گھری ہوئی نہ ہو[۶۵]۔ حضرت علی بن شیبانؓ سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو شخص کسی گھر کی چھت پر سوئے جس پر پردہ اور رکاوٹ نہ ہو تو اس پر سے اللہ کی ذمہ داری ختم ہو گئی[۶۶]۔ اس میں پڑوسیوں کی بے پردگی کے علاوہ جان کی ضیاع کا اندیشہ بھی ہے۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک میں نے ارادہ کیا تھا کہ ایام رضاعت میں عورتوں کی مقاربت سے امت کو منع کر دوں[۶۷]۔ ایک دوسری حدیث میں اسی بات کو اس پیرایہ میں کہا گیا ہے کہ پوشیدہ طور پر اولاد کے قتل کا باعث نہ ہو[۶۸]۔ اس کی شرح میں شاہ ولی اللہ صاحب رقمطراز ہیں:

> "اس کی وجہ یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت سے جماع اس کے دودھ کو ضرر رساں بنا دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔ شیر خوارگی کے دوران میں صحت پر پڑنے والے مضر اثرات بچے کے جوان ہو جانے تک موجود رہتے ہیں[۶۹]۔ ...."

اول الذکر حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ لیکن میں نے دیکھا کہ اہل روم و فارس میں یہ فعل مروج ہے پھر بھی ان کے بچوں کو ضرر نہیں پہنچتا اس لیے میں نے اس پر پابندی لگانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔

گستاولی بان لکھتے ہیں:

"عربوں نے حفظِ صحت کے علم کو نہیں چھوڑا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس علم کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو ان امراض سے محفوظ کر سکتا ہے جو علاج سے اچھے نہیں ہوتے۔ ابتدائے زمانہ عربوں کی عادات حفظ صحت بہت عمدہ تھیں۔ احکامِ قرآن میں غسل، وضو اور ترک شراب پر اصرار اور گرم ملکوں میں نباتی غذاؤں کو حیوانی غذاؤں (گوشت) پر ترجیح دینا نہایت عاقلانہ اور مفید اصول ہیں اور صحت کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات ارشاد فرمائی ہیں ان پر کسی طرح بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے حفظان صحت کے اصول و قواعد ملفوظات کی شکل میں ہیں جس کی بنا پر وہ آسانی کے ساتھ یاد ہو جاتے ہیں"[۱]

۴۔ حضور اکرم صلعم نے فرمایا دو نعمتیں ہیں جن کے بارے میں لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں ایک صحت دوسری فراغت یعنی لوگ ان کی قدر نہیں کرتے[۲]

آپؐ نے فرمایا پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے قبل صحت کو، افلاس سے قبل خوشحالی کو، مشاغل سے پہلے فراغت کو اور موت سے پہلے زندگی کو[۳]

حضورؐ نے فرمایا جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو، اس کا بدن درست ہو، ایک دن کے کھانے کا سامان اس کے پاس موجود ہو تو اس شخص کے لیے گویا دنیا کی نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں[۴]

ناخن ترشوانا۔ ختنہ۔ بیویوں سے جنسی تعلق میں اعتدال، جوتا جھاڑ کر پہننا۔

زیادہ گرم اور زیادہ ٹھنڈی اشیاء کھانے سے احتراز، کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرنا۔ کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرنا، ریح کے اخراج کو نہ روکنا اور اس نماز کو مکروہ قرار دینا جس میں اخراج ریح کو جبراً روکا جا رہا ہو، ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں ہاتھ نہ ڈالنا، دھوپ میں گرم کیا ہوا پانی استعمال نہ کرنا۔ نہار منہ پانی استعمال نہ کرنا۔ کسی برتن کے ٹوٹے ہوئے حصہ سے پانی نہ پینا، گرم اور سرد چیز کا یکے بعد دیگرے استعمال نہ کرنا، روزہ کھولتے وقت نمک استعمال کرنا وغیرہ اس طرح کے تمام احکام میں انسانی صحت کا راز مضمر ہے۔

حواشی

۴۶ بحوالہ فارانی، فضل کریم، اسلامی اصول صحت، صفحہ ۴۰۱ ۴۷ دیکھئے مثلاً مشکوٰۃ، جلد دوم صفحہ ۴۲۵-۴۲۶ (صیام التطوع) ۴۸ و ۴۹ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۲۹۳، ۵۰ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، دمشق، جلد دوم، صفحہ ۴۲۵-۴۲۶ (باب صیام التطوع) ۵۱ دیکھئے ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۲۹۴-۲۹۲ (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم) ۵۲ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ، دمشق، جلد دوم، صفحہ ۴۶۹ (باب تغطیۃ الاوانی وغیرھا، حدیث ۴۲۹۹ ۵۳ بخاری، امام، الجامع الصحیح، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱ (باب بدء الخلق) ۵۴ ایضاً، جلد ششم، صفحہ ۱۱۱ (باب کراھۃ التنفس فی نفس الاناء ....) ۵۵ ایضاً ۵۶ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم، صفحہ ۴۹-۳۸، ۵۷ ایضاً جلد دوم، صفحہ ۴۹، ۵۸ ایضاً ۵۹ و ۶۰ بحوالہ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، دمشق، جلد دوم، ۴۴۳ ۶۱ و ۶۲ مشکوٰۃ کتاب الاطعمہ فصل ثالث ۶۳ و ۶۴ و ۶۵ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، جلد دوم صفحہ ۱۹۰ ۶۶ و ۶۷ و ۶۸ ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم صفحہ ۵۹۰ (اردو ترجمہ از مولانا عبدالرحیم ۶۹ گستاولی بان، تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی، ظفر ٹریڈرز سرگودہا صفحہ ۴۵۲ ۷۰ و ۷۱ و ۷۲ و ۷۳ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ، دمشق، ۱۹۶۱، جلد دوم، صفحہ (کتاب الرقاق)

مشرقی یورپ کی ایک مظلوم مسلم ریاست

بوسنیا و ہرزیگووینا

از محمد عارف اعظمی عمری رفیق دار المصنفین

(۲)

برلن میمورنڈم روس اور آسٹریا ایک طرف تو خفیہ انقلابی کمیٹیوں کے ذریعہ سے بلقان کے ہر صوبہ میں بغاوت پھیلا رہے تھے اور دوسری طرف دول عظمیٰ کی طرف سے دباؤ ڈال کر باب عالی سے باغیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے، اندراسی نوٹ کے بعد ۱۱ رمئی ۱۸۷۶ء کو روس کے پرنس گورچاکوف، آسٹریا سے کاؤنٹ اندراسی اور پرشا کا پرنس بسمارک نے برلن میں دوبارہ میٹنگ کی اور باب عالی میں بھیجنے کے لیے ایک دوسرا میمورنڈم مرتب کیا جو برلن میمورنڈم کے نام سے مشہور ہے، اس میمورنڈم میں مندرجہ ذیل مطالبات کیے گئے تھے۔

۱۔ بوسنیا و ہرزیگووینا میں بغاوت کے نتیجے میں منہدم کیے گئے تمام مکانات کی دوبارہ تعمیر باب عالی کرائے۔ کاشتکاروں کے لیے زراعت کے وسائل و اسباب مہیا کیے جائیں اور تین سال کا ٹیکس بھی معاف کر دیا جائے۔

۲۔ بوسنیا و ہرزیگووینا کے لیے مسلمان اور عیسائی ارکان پر مشتمل ایک مخلوط کمیشن بیٹھایا جائے جس کا صدر ایک مقامی عیسائی ہو۔

۳۔ بوسنیا و ہرزیگووینا سے ترکی فوجیں ہٹالی جائیں بجز دس متعین قلعوں کے۔

۴۔ جب تک وہاں اصلاحات مکمل طور پر نافذ نہ ہو جائیں اور امن و امان ازسرنو قائم نہ ہو جائے عیسائیوں کو ہتھیار کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

۵۔ دول عظمیٰ کے سفیروں اور نمایندوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی نگرانی میں یہ مطالبات پورے کرائیں۔

آخر میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر فوجی کارروائی موقوف کر کے دو ماہ کی مدت میں یہ مطالبات پورے نہ کیے گئے تو سلطنت عثمانیہ کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائیگا۔

برلن میمورنڈم سے فرانس اور اٹلی نے بھی اتفاق کیا، صرف حکومت برطانیہ کو اس بنا پر اختلاف تھا کہ روس، آسٹریا اور پرشا نے اس سے مشورہ کیے بغیر اس کو مرتب کر لیا تھا۔

ترکی کا دستور اساسی اور قسطنطنیہ کانفرنس | ۱۲ شعبان ۱۲۹۳ھ (یکم ستمبر ۱۸۷۶ء) کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی سلطنت عثمانیہ کے فرماں روا مقرر ہوئے۔ انکی تخت نشینی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ترکی کے بنیادی آئین کا اعلان کریں گے چنانچہ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو ترکی کے دستور اساسی کا اعلان کر دیا گیا، اس دستور کے رو سے ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی، دارالاعیان اور دارالمبعوثین دارالاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے اصول پر اور دارالمبعوثین کے ممبروں کا کثرت رائے سے ہونا طے پایا، پارلیمنٹ کے ماتحت ایک وزارتی کابینہ بھی قائم

کی گئی، سلطان کی تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت برابر کے حقوق دیے گئے اور حکومت کے عہدے بھی سب کے لیے یکساں طور پر کھولے گئے، دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے، اس کے علاوہ اس میں جلسوں اور پریس کی آزادی، عدل و انصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا وعدہ بھی کیا گیا تھا۔

دستور کے اس اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا، مگر یورپین حکومتوں کو یہ چیز پسند نہ آئی، کیونکہ اس سے سلطنت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں انکی مداخلت کا سدباب ہو رہا تھا۔

۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو عین قانون اساسی کے اعلان کے روز ہی قسطنطنیہ میں دول عظمی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کی ابتدائی کارروائی ابھی مشکل سے ختم ہوئی تھی کہ باسفورس کے دوسرے کنارے سے دستور اساسی کے اعلان کی خوشی میں توپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کانفرنس میں سلطنت عثمانیہ کی نمائندگی صفوت پاشا کر رہے تھے جو اس وقت سلطنت کے وزیر خارجہ تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر ارکان مجلس کو مخاطب کر کے کہا کہ "توپوں کی جو آواز آپ لوگ سن رہے ہیں وہ سلطان المعظم کی طرف سے قانون اساسی کے اعلان کی دلیل ہے اور یہ قانون بلا استثنا، سلطنت کے تمام لوگوں کے حقوق و حریت کا کفیل ہے، کانفرنس کا جو مقصد تھا وہ حاصل ہو گیا، اب اس کا انعقاد اور اسکی کارروائیاں فضول ہیں۔"

صفوت پاشا کی اس تقریر سے مجلس پر سناٹا چھا گیا، کیونکہ اب سلطنت عثمانیہ

کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا، مگر تھوڑی دیر بعد روسی سفیر جنرل اگنا تیف نے جو جمعیہ سلاوی کا رئیس اعظم اور سلطنت عثمانیہ کا بدترین دشمن تھا مہر سکوت توڑا اور یہ تجویز رکھی کہ کانفرنس کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے چنانچہ کانفرنس کی کارروائی اگنا تیف ہی کی اس تجویز سے شروع ہوئی کہ صوبۂ بلغاریا کو خود مختاری دی جائے، وہاں ایک عیسائی حکمراں مقرر کیا جائے اور ایک قومی فوج قائم کی جائے اور ترکی فوجیں صرف چند متعین قلعوں میں باقی رکھی جائیں اور بوسنیا و ہرزیگووینا کے لیے بھی اسی قسم کے مطالبات پیش کیے گئے۔

دستور اساسی کے اعلان کے بعد بھی اس طرح کی تجویز سلطنت عثمانیہ کے داخلی معاملات میں صریح مداخلت تھی، چنانچہ ترک نمائندوں نے اس کی مذمت کی، بالآخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد دول عظمی کے نمائندوں کی جانب سے کم سے کم جو مطالبہ پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ مقامی حکام کی مدد کے لیے ایک سفارتی کمیشن مقرر کیا جائے اور بلغاریا، بوسنیا و ہرزیگووینا کے صوبوں کے حکمراں دول عظمی کی منظوری سے مقرر کیے جائیں اس میں اس کی بھی صراحت تھی کہ اس مطالبہ میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، ترک نمائندوں کے نزدیک یہ تجویز بھی قابل قبول نہ تھی، مگر دول عظمی کے نمائندوں نے اس تجویز کو ایک الٹی میٹم کی شکل میں باب عالی کو بھیجا اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا قابل اطمینان جواب نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے۔

اسکے بعد مدحت پاشا نے سلطان کے حکم سے ایک مجلس عالیہ منعقد کی، جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندے شریک کیے گئے اور ان کے سامنے کانفرنس کی یہ تجویز

لی گئی، مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں صاف لفظوں میں کہدیا کہ اگر یہ تجویز مسترد کردی گئی تو جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، مجلس کے نمائندوں نے پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور متفقہ طور پر دول عظمیٰ کے مطالبات منظور کرنے سے انکار کردیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ دول عظمیٰ کے نمائندوں کی یہ مداخلت سلطنت کی غیرمسلم رعایا کی ہمدردی کے نام پر تھی جبکہ صورت حال اس سے بالکل الگ تھی، چنانچہ اس نازک موڑ پر مجلس عالیہ کے تمام نمائندے مسلمان عیسائی اور یہودی سب ہی متفق و متحد تھے اور سلطنت عثمانیہ کی ماتحتی میں جنگ لڑنے کے لیے آمادہ تھے، مجلس عالیہ کے اس فیصلہ کی اطلاع باب عالی سے دول عظمیٰ کے نمائندوں کو دیدی گئی اور ۲۰ جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے۔

روس سے جنگ ادھر دول عظمیٰ کے نمائندے قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے اور ادھر روس نے جنگ کی تیاری شروع کردی، وہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، ۲۴ اپریل ۱۸۷۷ء کو اس نے سلطنت کے خلاف باضابطہ جنگ کا اعلان کرکے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں میں داخل ہونے کا حکم دیدیا، اس موقع پر زار روس نے شاہ آسٹریا سے ملاقات کرکے یہ معاہدہ کیا کہ اس جنگ میں آسٹریا اگر غیرجانبدار رہا تو فتح کی صورت میں بوسنیا و ہرزیگووینا اس کے حوالہ کردیے جائیں گے، تقریباً ایک سال تک سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ کا سلسلہ قائم رہا۔

معاہدہ سان اسٹیفانو ۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ سان اسٹیفانو کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں

منجملہ اور شرائط کے روس اور آسٹریا کی نگرانی میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں ان اصلاحات کو فوراً نافذ کیے جانے کا وعدہ کیا گیا جو قسطنطنیہ کانفرنس میں پیش کی گئی تھیں۔

معاہدۂ برلن | معاہدۂ سان اسٹیفانو کی بہت سی دفعات سے یورپین ملکوں کو اختلاف تھا، خود آسٹریا بھی اس کا شدید مخالف تھا، کیونکہ جنگ سے پہلے روس سے اس کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے وہ بوسنیا و ہرزیگووینا پر اپنا فوجی قبضہ رکھنے کا دعویدار تھا، غرض ہر طرف سے معاہدۂ سان اسٹیفانو کی مخالفت کی بنا پر ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو دول عظمیٰ کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان کانگریس برلن میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں معاہدۂ سان اسٹیفانو کی بہت سی دفعات تبدیل کر دی گئیں اور ایک ماہ کی بحث و مباحثہ کے بعد ۱۲ جولائی ۱۸۷۸ء کو ایک جدید معاہدہ مرتب ہوا جو معاہدۂ برلن کے نام سے مشہور و معروف ہے، اس نے تقریباً یورپ میں سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد اس کے بہت سے صوبے خود مختار ہو گئے اور اس کے رو سے بوسنیا و ہرزیگووینا غیر متعینہ مدت کے لیے آسٹریا کے حوالہ کر دیے گئے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا پر آسٹریا کا قبضہ | بوسنیا و ہرزیگووینا معاہدۂ برلن کی رو سے گو آسٹریا کو دیدیے گئے تھے، مگر بالفعل یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں شامل تھا، دسمبر ۱۹۰۸ء میں سلطنت عثمانیہ کے انقلابیوں کی ایک کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا جائے اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم کر دی جائے، بالآخر ۱۹۰۸ء میں انقلابیوں کی انجمن "اتحاد و ترقی" کے شدید اصرار اور ملک میں بغاوت کے اندیشہ کی بنا پر ترکی میں دستوری

حکومت کا اعلان ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

جمہوریت کے اعلان کے بعد ترکی کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر بوسنیا و ہرزیگووینا تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے انہیں اب بھی استبداد کی زنجیروں سے رہائی نصیب نہیں ہوئی، ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا و ہرزیگووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں، آسٹریا کو اس سے سخت تشویش ہوئی، وہ بوسنیا و ہرزیگووینا کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ تھا چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اس نے دفعتہً بوسنیا و ہرزیگووینا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ترکی نے اس پر سخت احتجاج کیا مگر یورپ کے مرد بیمار میں اب اتنی فوجی قوت نہ تھی کہ آسٹریا سے بزور بازو اس خطہ کو لے سکے، چنانچہ ترکی نے آسٹریا سے مصالحت کر لی، آسٹریا نے ۲۲ لاکھ پونڈ نقد اور نووی بازار کا علاقہ ترکی کو بوسنیا و ہرزیگووینا کے بدلہ میں واگذار کیا۔

آسٹریا کے عہد حکمرانی میں بوسنیا و ہرزیگووینا کا حال معاہدۂ برلن کی رو سے بوسنیا و ہرزیگووینا کو جب آسٹریا کی نگرانی میں دیا گیا تو اس کی فوجیں وہاں پہنچ گئیں لیکن وہاں کے مسلمانوں نے ان کا جم کر مقابلہ کیا، خاص طور پر سراجیو کے مسلمانوں نے بڑی سخت مزاحمت کی مگر آسٹریائی فوجوں کی جانب سے سخت کارروائی کے نتیجہ میں ان کو پسپا ہونا پڑا، آسٹریا کی نگرانی کے زمانے میں بھی بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمان اپنے آپ کو عثمانی سلاطین کی رعایا سمجھتے رہے، گو آسٹریا کے حکمرانوں نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ بوسنیا و ہرزیگووینا میں متحدہ قومیت کا تصور قائم ہو جائے مگر اس میں

وہ ناکام رہے کیونکہ سرب اور کروش اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر ایک دوسرے سے بہت دور تھے اور مسلمانوں کا طبقہ ترکی کو اپنا اصل وطن سمجھتا تھا، چنانچہ بوسنیا وہرزیگووینا کے بہت سے مسلم خاندان ہجرت کرکے ترکی چلے گئے اور وہیں آباد ہوگئے۔
۱۸۸۲ء میں آسٹریائی حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو اپنی تحویل میں لینے کی غرض سے مجلس علماء تشکیل کی اور رئیس العلماء کا عہدہ اختراع کیا، ۱۸۸۳ء میں متعدد مسلمان نمائندوں اور حکومت کے دو نگراں نمائندوں پر مشتمل اوقاف کی ایک مرکزی کمیٹی سراجیو میں بنائی، دوسری طرف کیتھولک پادری مسلمانوں کو بجبر عیسائی بنانے کی مہم میں لگ گئے۔ بوسنیا وہرزیگووینا کے مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات میں مسیحی حکومت کی یہ مداخلت منظور نہیں تھی، کیونکہ اوقاف کی مرکزی کمیٹی جو سراجیو میں بنائی گئی تھی وہ اس وقت تک کسی فیصلہ کو نافذ نہیں کرسکتی تھی جب تک کہ سرکاری نمائندے اس سے متفق نہ ہوں اور اوقاف کے سارے اختیارات اسی مرکزی کمیٹی کی تحویل میں دے دیے گئے تھے، چنانچہ ۱۸۹۶ء میں بوسنیا وہرزیگووینا کے مسلمانوں نے شاہِ آسٹریا کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں اوقاف کے معاملات میں آزادی کا مطالبہ کیا گیا، ۱۸۹۹ء میں انھوں نے مفتی موستر جانیچ کی قیادت میں مذہبی اور تعلیمی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کی، جس کی پاداش میں مفتی موستر جانیچ کو ملک بدر کردیا گیا۔
۱۹۰۶ء کے بعد مسلمانوں کی تحریک زیادہ سرگرم ہوگئی، انھوں نے ایک متحدہ اسلامی مرکز بھی قائم کرلیا، غرض مسلسل جدوجہد اور کشمکش کے بعد ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے اوقاف، معارف اور ان سے متعلق مالی امور کے لیے ایک مجلس کا

قیام عمل میں آیا اور رئیس العلماء کی قیادت میں سراجیو میں ایک مدرسۂ قضاۃ بھی قائم ہوا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا پر سربیا کے تسلط کی کوشش

بوسنیا و ہرزیگووینا کی ہمسایہ ریاست سربیا ہے، جو سلطنت عثمانیہ کی حکمرانی میں تھی، مگر سلطنت کے عہد آخر میں خود مختار ہوگئی تھی، سربیا کے قدیم حکمراں متعدد بار بوسنیا و ہرزیگووینا اور بلقان کے دوسرے علاقوں کو فتح کرکے ایک وسیع سرب ریاست بنانے میں کامیاب ہوچکے تھے، مگر سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی کے بعد ان کا یہ خواب پراگندہ ہوچکا تھا۔

سربیا کی آزادی کے بعد اس کا ایک فرماں روا میخائل سرب نوجوانوں کی تحریک "اوملادنا" سے متاثر تھا، اس تحریک کا مقصد جنوبی صقالبہ کو سربیا کے زیر تسلط متحد کرنا تھا، اس تحریک کے پس پشت بھی روس ہی کا ہاتھ تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ اس کا مقصد آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال پر قبضہ کرنا تھا، چنانچہ سربیا میں مقیم روسی سفیر ہارٹ وگ نے اس تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔

معاہدۂ برلن کے مطابق بوسنیا و ہرزیگووینا جب آسٹریا کی نگرانی میں دیدیے گئے تو سربیا آسٹریا سے نالاں ہوگیا اور اس نے روس سے اپنے تعلقات مضبوط کرلیے، اسی اثناء میں سلطنت عثمانیہ اور بلقانی ریاستوں کے درمیان جنگ بلقان ہوئی، جو تاریخ کی بھیانک جنگوں میں شمار کی جاتی ہے، جنگ بلقان کا اصل محرک سربیا تھا اور سربیا میں یہ روح ہارٹ وگ نے پھونکی تھی، اس جنگ کے نتیجہ میں ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء کو بخارسٹ کی صلح کے رو سے سربیا کا رقبہ تقریباً دوگنا ہوگیا، اس سے اپنے حدود مملکت کو وسیع کرنے کی تحریک کو مزید تقویت حاصل

ہوئی، اس نے متعدد انقلابی جماعتیں آسٹریا و ہنگری وغیرہ کے زیر تسلط سلاوی علاقوں پر قبضہ کے لیے تیار کیں جن میں اسکی جمعیت "دست سیاہ" Crna Ruka کو کافی شہرت ملی۔

سرب کروشن سلووان اسٹیٹ کا قیام | ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو سراجیو میں آسٹریا کے ولیعہد فرڈینڈ اور اس کی بیوی کے قتل کے واقعہ سے جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے دوران سربیا نے آسٹریا کے زیر تسلط علاقوں کو حاصل کر لیا، ۴ نومبر ۱۹۱۸ء کو اس نے بلغراد کو فتح کر کے جنوبی صقالبہ پر اپنا قبضہ جما لیا،

جنگ عظیم کے بعد سربیا کا مستقل وجود ختم ہو گیا، اس کے بجائے سرب کروشن سلووان اسٹیٹ کے نام سے ایک نئی ریاست تشکیل دیدی گئی، جس کی سربراہی سربیا ہی کو حاصل تھی، چنانچہ سربیا کا صدر مقام بلغراد اس نئی مملکت کا دارالحکومت اور سربیا کا فرمانروا پیٹر قرہ جارجیورج اس کا پہلا بادشاہ بنا۔ بوسنیا و ہرزیگووینا مقدونیا اور مانٹینگرو وغیرہ کے تمام علاقے اس مملکت میں شامل کر لیے گئے، ۲۸ جون ۱۹۲۱ء کو اس مملکت کا آئین منظور ہوا، پھر ۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو سربیا کے حکمراں الکسنڈر نے اپنی آمریت کا اعلان کر کے آئین، پارلیمنٹ اور تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا۔ دوبارہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک نئے آئین کا اعلان ہوا اور مملکت کا نام تبدیل کر کے یوگوسلاویہ رکھا گیا۔

کروشیا کا قیام | اس مملکت میں صرف سرب ہی ایک مضبوط مرکز کے علمبردار تھے، ان کے علاوہ بقیہ تمام قومیں نہایت کمزور اور بے بس تھیں اور سب کی سب صوبائی خود مختاری کی طالب تھیں، ان میں کروشں کو چونکہ کیتھولک عقیدہ کی

بنا پر مغربی ملکوں کی تائید حاصل تھی، اس لیے ۱۹۳۹ء میں یوگوسلاویہ کی حکومت نے خودمختارانہ اور داخلی معاملات میں آزاد کروشیا کا مطالبہ منظور کر لیا، جس کے بعد کروشیا کے نمائندے مرکزی پارلیمنٹ میں شرکت پر آمادہ ہوگئے، اس تقسیم کے نتیجہ میں بوسنیا وہرزیگووینا کا بڑا حصہ کروشیا کے حصہ میں آیا جس کی بنا پر وہاں کے مسلمان کروشی اکثریت کے زیر نگیں ہوگئے اور ان کا رشتہ یوگوسلاویہ کے دوسرے مسلمانوں سے کٹ گیا۔

یوگوسلاویہ پر جرمنی کا حملہ ۶ راپریل ۱۹۴۱ء کو ہٹلر کی نازی فوجوں نے یوگوسلاویہ پر قبضہ جما لیا اور اس کی تمام پرانی تقسیم مٹا دی، یوگوسلاویہ کے بہت سے فوجی افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور جرمنی افواج کے خلاف گوریلا جنگ لڑنے لگے۔

بوسنیا وہرزیگووینا کے مسلمانوں کا قتل عام ان فوجی افسروں میں ایک سرب فوجی افسر میخلووچ تھا، اس کے ہمنواؤں نے جرمنی کے خلاف جنگ کے دوران بوسنا وہرزیگووینا اور مانٹینگرو کے دو لاکھ سے زیادہ بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام کیا تاکہ ان کی تعداد کلیسائے یونان کے پیروسربوں کے مقابلہ میں کم ہو جائے اور جنگ کے بعد ان علاقوں کو بسہولت سربیا میں شامل کیا جاسکے۔

متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا قیام جرمنی کے خلاف گوریلا جنگ کرنے والوں میں ایک نمایاں شخص جوزف بروزٹیٹو تھا جس کی قیادت میں "سپاہ آزادی ملت" کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی، اس تنظیم کو یوگوسلاویہ کے عام باشندوں کی تائید حاصل تھی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں ٹیٹو نے سربیا کے بعض علاقے فتح کر لیے اور بالآخر اکتوبر ۱۹۴۴ء میں

بلغراد بھی اس کے قبضہ میں آگیا، غرض مارچ ۱۹۴۵ء میں یوگوسلاویہ کی مرکزی متحدہ حکومت قائم ہوئی، ہر صوبہ کی الگ الگ مقامی حکومتیں بنائی گئیں۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو باضابطہ متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا قیام عمل میں آیا، اس میں چھ حکومتیں شامل تھیں۔ سربیا۔ کروشیا۔ سلوانیا۔ بوسنیا و ہرزیگووینا۔ مقدونیا۔ مونٹینگرو۔

موجودہ صورت حال

سنہ ۱۹۹۱ء میں کمیونزم کے سب سے بڑے مرکز جمہوریہ روس کے بکھر جانے کے بعد ہی یہ آثار نمایاں ہونے لگے تھے کہ متحدہ جمہوریہ یوگوسلاویہ کا بھی یہی حشر ہونیوالا ہے، چنانچہ اسی کے چند مہینوں بعد یہ جمہوریہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی اور اس کی تمام ریاستیں آزاد ہو گئیں اور دنیا کے بیشتر ملکوں نے ان کو تسلیم بھی کر لیا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کے علاوہ یوگوسلاویہ کی بقیہ پانچ ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب بہت معمولی ہے اس لیے مسلم دشمن اقوام کو ان کے بارہ میں کوئی فکر نہیں ہوئی۔ مگر بوسنیا و ہرزیگووینا میں مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد ہے اور مذہب اسلام سے وہاں کے باشندوں کا گہرا اور والہانہ تعلق ہے، اس لیے مسلم دشمن اقوام کو اس بات کا خطرہ ہوا کہ یہ مشرقی یورپ کی ایک مسلم ریاست نہ بن جائے، اس جمہوریہ کے پہلے انتخابات سے بھی اس کا اندازہ ہو گیا جس میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوئی اور ایک معزز مسلم رہنما عالیجاہ عزت بیگووچ اس کے صدر مقرر ہوئے اس کے سدباب کے لیے پہلے بوسنیا و ہرزیگووینا کے سربوں کو بغاوت پر آمادہ کیا گیا جو روس اور اس کے ہمنواؤں کا قدیم وطیرہ ہے، پھر ان سربوں کی حمایت کے نام پر سربیا نے بوسنیا و ہرزیگووینا پر حملہ اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا میں آباد کیتھولک عیسائی کروٹس جو ابتداء میں مسلمانوں کے ساتھ تھے انھوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا، ان کو کروشیا کی تائید حاصل ہے، اور ان دونوں نے موجودہ متمدن دنیا اور علم و حکمت کے اس دور میں بوسنیا و ہرزیگووینا کے نہتے، بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر وہ مظالم ڈھائے جنکی مثال جنگل کے راج اور وحشت کے دور میں بھی نہیں ملے گی۔ اس وقت تک انکے ظلم وستم کے نتیجہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مسلمان مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور ۲۵ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو خانماں برباد ہونا پڑا ہے، ہزاروں عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی ہے، غرض ایسے وحشیانہ سلوک کیے گئے ہیں جن کو سن کر آدمی پانی پانی ہو جائے، بوسنیا و ہرزیگووینا کے قدیم مسلم تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی آثار و نشانات کو بھی خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں شہر کے شہر اور قصبات کے قصبات کھنڈر میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

اتنے نازک اور پُر آشوب حالات میں بھی بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی ہے جو ان کی مذہب اسلام سے سچی محبت کی دلیل ہے۔ بوسنیا و ہرزیگووینا کے تکلیف دہ واقعات کی خبریں روزانہ آتی ہیں، مگر مغربی اقوام کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، یورپ کے بعض ملکوں میں وہاں کے لیے ہمدردی کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آرہا ہے، بالخصوص برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کا بیان اور ویٹکن کے پوپ کی دعائیں یہ سب دراصل ایک سیاسی کھیل ہیں، ان کا مقصد بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کی حمایت نہیں بلکہ بوسنیا میں آباد کروٹس کا تحفظ یقینی بنانا ہے اور آئندہ بوسنیا و ہرزیگووینا کی مجوزہ تقسیم میں

کروشیا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا ہے۔

سربیا کی حمایت میں سب سے پیش پیش روس ہے، روس کی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر سربیا کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے خلاف اقوام متحدہ کی کسی تجویز کو جس میں سربیا پر فوجی اقدام کیا جائے، ویٹو کرنے کا حکم اپنے نمائندہ کو دیا ہے، حد یہ ہے کہ عالمی امن کے علم بردار نوبل پرائز یافتہ سابق روسی صدر گورباچیوف نے بھی سربیا کے ان جارحانہ حملوں کی حمایت کی ہے، گویا پورا یورپ اس وقت مسلمانوں کے خلاف ایک منصوبہ بند صلیبی جنگ میں مصروف ہے

بوسنیا و ہرزیگووینا میں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے وہاں کے باشندے یونانی کلیسا کے متبع سرب اور کیتھولک چرچ کے پیرو کروش کے ظلم و ستم کے شکار تھے اس وقت ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے ان دونوں سے علٰحدہ بوگو ل مذہب اختیار کر لیا تھا، آج پھر وہ ان کے مظالم کے شکار بنے ہوئے ہیں اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے پرستار ہیں، وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، بوسنیا ہرزیگووینا کے مسلمانوں کی نگاہیں آج پھر کسی لالہ شاہین اور محمود پاشا کی منتظر ہیں مگر افسوس کہ یورپ کا مرد بیمار کب کا دم توڑ چکا، عرب ملکوں میں کوئی سیاسی اتحاد نہیں ہے اور پورا عالم اسلام سیاسی سطح پر بے وزن اور بے وقعت اور ان مظلوموں کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

والی اللّٰہ المشتکیٰ

"خونِ جگر" اور اقبال

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب

"خونِ جگر" کی ترکیب پچھلے پچاس برسوں سے اردو ادب میں اقبالیات کے توسط سے آئی ہے اور اقبال نے اسے اپنے کلام میں اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ اس نے ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اقبال کے کلام میں "خونِ جگر" کی اصطلاح کئی معنوں میں آتی ہے۔ کہیں اس سے وہ خلوص اور جذبۂ عشق مراد لیتے ہیں تو کہیں اس سے خداداد صلاحیتیں کہیں اس سے اپنے نصب العین سے والہانہ عشق مراد ہے تو کہیں مقصدِ حیات، کہیں اس سے عشقِ رسولؐ میں گرویدگی مراد ہے تو کہیں حسنِ عمل اور جہدِ پیہم۔ اقبال کے "خونِ جگر" کو اردو کے نقادانِ ادب نے صاحبِ فن کے اپنے فن سے انتہائی خلوص اور اس کے اپنے فن کے نصب العین سے والہانہ عشق کے معنوں ہی میں اصطلاحاً استعمال کیا ہے کیونکہ فن میں صداقتِ جذبات بہت اہم چیز مانی گئی ہے۔ ایسا اس لیے بھی کہ "خونِ جگر" کی اصطلاح سے اقبال کے زیادہ تر اشعار فنونِ لطیفہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اصطلاح اقبال کے کلام میں "بالِ جبریل" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے تیسرے بند کے درج ذیل شعر سے مشہور ہوئی ہے

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت　　معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس شعر کے بعد ہی یہ شعر ہے ؎

قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل　　خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اسی موضوع پر اس نظم کا یہ آخری شعر ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

اقبال صرف فن ہی کی نہیں بلکہ "معجزۂ فن" کی بھی باتیں کرتے ہیں جو معجزہ صرف صاحب فن کے "خونِ جگر" کی آمیزش سے نمود میں آتا ہے۔ "معجزہ" متکلمین کی ایک اصطلاح ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی فن میں بہت سے اصحاب فن ہوتے ہیں مگر سب کا فن "معجزہ" نہیں ہوتا۔ فن تب ہی "معجزہ" کی شکل اختیار کرتا ہے جب صاحب فن اپنی ساری فطری صلاحیتوں اور ذہنی طاقتوں، یعنی اپنی ساری فطری اور ذہنی متاع کو اپنے نصب العین کے حصول میں لٹا دے۔ عظیم فنکاری میں "خونِ جگر" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں ہو۔ اس کلیہ کا اطلاق خود پر کرتے ہوئے "بالِ جبریل" کی نظم "ذوق و شوق" کے تیسرے بند میں کہتے ہیں ؎

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش　　ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

ہم جسے "شخصیت" کہتے ہیں، خواہ وہ شخصیت صاحب فن کی ہو یا زندگی کے کسی شعبہ سے وابستہ کسی انسان کی، وہ صرف "خونِ جگر" کی آمیزش سے پروان چڑھتی ہے۔ یہی "خونِ جگر" اس کی شخصیت پر اثر انداز ہو کر اسے بقائے دوام بخشتا ہے۔ اس لیے جب ہم کسی صاحب فن کے فن یا زندگی کے کسی شعبے میں لگے کسی

عظیم انسان کے مطالعہ سے گذرتے ہیں تو قدم قدم پر اس کی شخصیت کی چھاپ ہمارے ذہن پر اثرانداز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اقبال شخصیت کو مسلسل جد و جہد سے تعبیر کرتے ہوئے پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں کہتے ہیں :۔

"شخصیت یا مسلسل جد و جہد کی حالت انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ جو شے شخصیت کو مسلسل جد و جہد کی طرف مائل کرتی ہے وہ ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ لہٰذا وہ اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو کمزور کرے وہ بری۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے"

مگر جہاں تک فنکاری کا سوال ہے۔ ایک عظیم شخصیت کا ابھر کر سامنے آنا، اقبال کے نزدیک صرف صاحب فن کی "الہامی صلاحیت" پر منحصر ہے۔ مرقع چغتائی کے دیباچہ میں اقبال اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :۔

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس کے شعراء اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو۔ یہ ایک عطیہ ہے۔ اس عطیہ سے فیضیاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمہ یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے، قوم کے لیے چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے"

اقبال کی ان تشریحات و توضیحات سے عظیم فنکاری میں "خونِ جگر" کی ماہیت

ہمارے سامنے ایک الہامی عطیہ بن کر آتی ہے چونکہ صاحب فن کو اپنی عمل و ایجادی قوت اپنے فن میں منتقل کرتا ہے اس لیے فنکاری دراصل صاحب فن کے روحانی توازن کا اظہار بن جاتا ہے جس کی بنیاد صرف حقیقت کی جستجو اور اس کے اپنے نصب العین سے خلوص پر منحصر ہے۔ اس خلوص کی وجہ سے صرف صاحب فن کی شخصیت ہی ابھر کر سامنے نہیں آتی بلکہ اس کی وجہ سے ہمارے جذبات، ماحول اور خارجی حقیقتوں کے درمیان ایک ربط اور ہم آہنگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

صاحب فن کو "خونِ جگر" کی یہ آمیزش تو اس کے شعور کی غذا بہم پہنچاتی ہے اور اسی لیے ہر بڑا ذی فن باشعور ہوتا ہے۔ اس کے خلوص اور اپنے فن کے نصب العین سے عشق کی وجہ سے اس کی شخصیت کی خودی کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں دنیا کو اپنے شکنجہ میں کس لینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جگر کے لہو کی آمیزش سے گرد و باد کے ماحول سے بالاتر ہو کر دنیا پر ایک مجموعی نظر ڈالتے ہوئے بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ حالانکہ ہر صاحب فن اپنا ضمیر، اپنا ذہن اور اپنا ذوق لے کر پیدا ہوتا ہے مگر اپنے فن پر اپنی شخصیت کی چھاپ ہر صاحب فن نہیں چھوڑتا۔ "جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

صاحب فن کی نظر زندگی کی قدروں کا داخلی طور پر تجزیہ کر کے اس پر فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرتی ہے جو مسِ خام کو کندن بنا دیتی ہے اور صاحب فن کو جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے خلوص ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دلوں کے تاروں کو چھیڑتا ہے زندگی کے حسن میں بیداری پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے "خونِ جگر" سے نئی محفل سجاتا ہے جس میں دوسروں کو زندگی کی حقیقتیں

بے نقاب نظر آتی ہیں۔ اپنے فن میں "خون جگر" کی آمیزش سے وہ دل کے زخموں میں پھول کھلاتا، سینے کے داغوں میں چراغاں کرتا، الفت کے چمن کو "جنت ویراں نہیں بلکہ "جنت عرفاں" بناتا ہے۔ وہ صرف "فیضانِ محبت" ہی کو عام نہیں کرتا بلکہ "عرفانِ محبت" کو بھی عام کرتا ہے۔ اس کی زندگی فکر و نظر کی زندگی ہوتی ہے اور اسے حقیقت اور صداقت کی تلاش ہوتی ہے۔ حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی اس کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ وہ پرانے بتوں کو توڑ کر ساتھ ہی نئے بت تراشتا بھی جاتا ہے۔ اس لیے ایک عظیم صاحب فن اپنے خونِ جگر کے سہارے وسیع تر پیمانے پر قدروں کے ایک بڑے نظام کو دریافت کرکے اپنے خوابوں میں زندگی کی زیادہ سے زیادہ حقیقتوں کے درک کو سمو لیتا ہے۔

اقبال جب کہتے ہیں کہ: "نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر" تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ فن صرف حسن آفرینی کا نام نہیں بلکہ صاحب فن کو حسن کے آئینہ میں کچھ حقیقتیں بھی دکھلانی چاہییے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے دل میں خلوص ہو۔ اگر دل میں جوش نہیں، خلوص نہیں یا وہ صداقت نہیں جو بیک وقت ذوقِ لطیف کو آسودگی بخشے اور زندگی کو تابندگی عطا کرے تو ایسے نقش میں کوئی کشش نہیں ہوگی۔ اقبال کے تصورات میں یہ خلوص، یہ واقعیت اور حقیقت کے انکشاف کی یہ تلاش صرف صاحب فن کے رگ ساز میں صاحب ساز کے لہو رواں ہونے ہی پر منحصر ہے۔ بالفاظ دیگر یہ خلوص اور یہ سوز محض دکھاوے کی چیز نہ ہو بلکہ صاحب فن کی سیرت میں رچا ہوا ہو۔ فن میں "معجزۂ فن" کی نمود اسی وقت جلوہ نما ہوتی ہے جب فن والے کے دل میں وہ عشق پیدا ہو جائے

جس کا مقصد بنی نوع انسانی کی شیرازہ بندی پیدا کرتا ہے۔

اقبال کے تصور کائنات کی مشہور اصطلاح "عشق" ہے جس میں اقبال نے وجدان کے فطری عناصر کے ساتھ زندگی کے عملی عناصر کو بھی شامل کر دیا ہے اور یہی عشق، صرف فن ہی میں نہیں، بلکہ ہر انسان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ یہ ہر ذرے کا تعلق اصل حقیقت سے قائم رکھتا ہے تاکہ اس کی مادی و معنوی تربیت ہو سکے۔ اقبال جب عظیم فن میں "خونِ جگر" کی بات کرتے ہیں تو وہ آرٹ کی بنیادی قدروں میں سے ایک قدر اس "عشق" کو بھی شامل کرتے ہیں۔ مسجد قرطبہ ہو یا بدھ کے مجسمے یا خمریاتِ خیام ان سب کی بنیادی قدریں تصورِ حسن اور سوزِ عشق سے وابستہ ہیں جن کے جلوؤں کا انعکاس و انضباط فنونِ لطیفہ کی بنیادی قدر ہے۔ صنّاعی اسی کا نام ہے۔ جب صناعت کامیاب ہوتی ہے تو تجربہ و اظہارِ تجربہ دونوں کامیاب ہوتے ہیں۔ صناعت صرف "جلوۂ طور" نہیں، "یدِ بیضا" بھی ہے۔ آرٹ کے پیدا ہونے کے لیے ایمان شرط ہے، خواہ ایمان ذرہ پر ہو یا ستاروں پر، پھول پر ہو یا حسین آنکھوں پر، شرابِ طہور پر ہو یا آبِ انگور پر، خودی پر ہو یا خدا پر۔

فن میں "خونِ جگر" کی آمیزش اگر صاحبِ فن کی پوری شخصیت کو ابھار کر رنگِ ثبات و دوام عطا کرتی ہے تو یہی دوامیت اس کی انفرادیت کی پہچان بھی بن جاتی ہے اس لیے کہ اعلیٰ اور غیر معمولی آرٹ زندگی کی انفرادی اور خالص شخصی امتیازات کا مرقع ہوتا ہے۔ مگر غیر معمولی فن، غیر معمولی تب بنتا ہے جب صاحبِ فن رنگینیوں کے باوجود عام اور مشترک سطح سے بلند ارفعیت تک پہنچ جائے۔ اس طرح انفرادیت کے غیر معمولی رنگوں کے امتزاج کے بغیر کوئی فن اپنے لیے ابدیت کا حقِ امتیاز پیدا نہیں

کر سکتا لیکن اس کے لیے "خون جگر" کی آمیزش سے بڑے غور و فکر اور گہرے درد و محبت کی ضرورت ہے جو انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کے تناقض و تضاد اور بے آہنگی کو دور کرے۔ یہی وجہ ہے کہ فن میں انفرادیت کی پہچان صاحبِ فن کے اپنے فن میں خونِ جگر کی آمیزش سے پرکھی جاتی ہے۔ ان ہی اصولوں پر فنونِ لطیفہ میں، جہاں تک اردو شاعری میں انفرادیت کی پہچان کی بات ہے تو اس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے فن میں صاحب فن کے "خونِ جگر" ہی کی آمیزش کے پس منظر میں یہ اظہار خیال کیا ہے کہ :-

"اردو میں انفرادیت کی مثال بڑی طویل منزلوں کے بعد ملتی ہے اور وہ منزلیں تو خاصے فاصلے پر ہیں جن میں ارفعیت کا مقام محمود نظر آتا ہے ۔ ۔ ۔ اگر دیکھا جائے .... تو اردو شاعری میں ... غیر معمولی انفرادیت کے نشانات بہت مسافتیں طے کرنے کے بعد بھی کم دستیاب ہوتے ہیں۔ مثلاً میر کے بعد غالب اور غالب کے بعد اقبال اور بس ۔ حالانکہ اس تمام زمانے میں شاعروں کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہے۔"

اردو شاعری میں یہ انفرادیت صرف تین ہی میں اس لیے ملتی ہے کہ میر کے یہاں بھی "خونِ جگر" درد و غم کا نام پاتا ہے، غالب کے یہاں اس کے لیے "دلِ گداختہ" اور اس طرح کی اصطلاحیں ملتی ہیں اور اقبال نے ان سب کو سمیٹ کر "خونِ جگر" کا نام دیا جو ایک صاحب فن کی پوری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے ۔

اقبال صرف صاحب فن ہی میں "خونِ جگر" کی آمیزش کی تلقین نہیں کرتے بلکہ وہ عبادت میں بھی اس کی آمیزش فلاح کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں یعنی عشقِ

رسولؐ میں وہی گرویدگی، وہی جذبۂ عشق اور وفاداری کا وہی پاس اور وہی خلوص جو دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ چنانچہ دعا کے معاملے میں بھی وہ دعا کرنے والوں کو اپنی دعا میں اپنے جگر کا لہو یعنی عشقِ رسولؐ کا رنگ منعکس ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں جسے قرآن مجید میں خشوع و خضوع کا نام دیا گیا ہے۔ نماز، بروئے شریعت، سب سے بڑی عبادت ہے اور عبادت کا مغز دعا ہے۔ چنانچہ مسجد قرطبہ میں بھی اگر اقبال دعاگو ہیں تو اپنی دعا میں "خونِ جگر" کی آمیزش ہی کی باتیں کرتے ہیں، کہتے ہیں ؎

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
(بالِ جبریل ۔ "دعا")

آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی تعلق وجدان سے ہے اور دونوں کی ظاہری اور باطنی جہتیں ہیں۔ آرٹ میں ہئیت کا وہی مقام ہے جو مذہب میں شریعت کی جگہ ہے۔ اول الذکر میں فنی تجربے کی ذہنی کیفیت ہے تو ثانی الذکر میں طریقت یا باطنی تجربے کی۔

اقبال "خونِ جگر" سے انسان کی خداداد صلاحیتیں بھی مراد لیتے ہیں۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ کے درج ذیل شعر میں کہتے ہیں ؎

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

یہاں وہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ خدا نے انسان کو جو فطری صلاحیتیں عطا کی ہیں اسے مقصدِ حیات کو حاصل کرنے کے لیے صرف کرنا چاہیے نہ کہ دنیا کی فانی و لایعنی دلچسپیوں میں۔

اقبال "خونِ جگر" سے مسلسل جد و جہد بھی مراد لیتے ہیں۔ جیسے "ضربِ کلیم" کی نظم

"ناظرین سے" کے اس آخری شعر میں ؎

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات　　فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل! نہ "جل ترنگ"

اقبال کے یہاں اس "خونِ جگر" کی اہمیت تسخیرِ کائنات اور کوشش پیہم کے معنوں میں بھی آتی ہے۔ "بالِ جبریل" کی نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے چوتھے بند میں اس پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اپنے دورۂ ہسپانیہ (موجودہ اسپین) میں ہسپانیہ کے شہر قرطبہ (کورڈووا) میں واقع مسجد قرطبہ کے نقش و نگار میں اقبال کو "قافلۂ سخت جاں" کا خونِ جگر نظر آیا۔ اسی ہسپانیہ میں جہاں مسلمانوں نے سات سو سال سے زائد حکومت کی مگر آج وہاں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا تو وہ اس المیہ پر اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس بندھاتے ہیں ؎

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی　　باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں (بالِ جبریل، ہسپانیہ)

اخبار علمیہ

بوسنیا ہرزی گووینا کے مسلمانوں کے قتل عام اور ان کے شہروں اور بستیوں کی بربادی کے لرزہ خیز واقعات سے اب کون ناواقف ہے، بیسویں صدی کی "مہذب دنیا" میں انسانوں کی اس شیطنت و بربریت پہ جنگل کے وحوش و بہائم بھی شرما اٹھے ہیں، ترکی کے ادارہ IRCICA کے ترجمان رسالہ سے جو ہمیں تاخیر سے موصول ہوا، اندازہ ہوتا ہے کہ سرب عیسائیوں اور مسیحی صلیبوں کا مقصد صرف خون مسلم کی ارزانی کا تماشہ دیکھنا ہی نہیں ہے بلکہ نہایت منظم طریقہ سے یورپ میں واقع مسلم آبادی کے مذہب، تہذیب، تاریخ اور معیشت کو تاخت و تاراج کر دینا ہے، اسی لیے ان کے حملوں کا خاص نشانہ مسجدیں، کتب خانے اور علمی و ثقافتی مراکز ہیں، جن مساجد کو شہید کیا گیا ہے ان میں بعض نہایت تاریخی اہمیت کی تھیں مثلاً فوکا کی سلطان بایزید کی مسجد جو سنہ ۱۵۰۰ء میں تعمیر ہوئی تھی، سنہ ۱۵۵۰ء کی الاکا مسجد جسے قدیم عثمانی طرز تعمیر کا شاہکار خیال کیا جاتا تھا، بوسنیا کی سب سے قدیم مسجد اسنی کولیٹا میں سنہ ۱۴۴۸ء میں تعمیر ہوئی تھی، سنہ ۱۹۴۱ء میں اسے نقصان پہنچایا گیا تھا مگر اب اسے مکمل منہدم کر دیا گیا، موستار شہر میں سولہویں اور سترہویں صدی میں تعمیر شدہ کئی خوبصورت مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا، عثمان پاشا بیگووک کی مسجد سنہ ۱۷۲۶ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اپنے در و دیوار پر منقش خطاطی کے حسین نمونوں

کے پہلے مشہور تھی اسے اور سرا جیوو کی شیخ مغربی مسجد کو جو اسلامی فن تعمیر کا نادر نمونہ تھی پوری طرح زمیں دوز کر دیا گیا، مساجد کے ساتھ عام طور پہ مکاتب اور خانقاہیں بھی ملحق تھیں انہیں بھی نیست و نابود کر دیا گیا ان میں بلاگاج کی وہ خانقاہ بھی ہے جسے ترکی کے آرائشی طرز تعمیر کا بے مثال نمونہ ہونے کی بنا پر یورپ کے اور ملکوں میں بھی شہرت حاصل تھی، ایک مشہور صوفی درس گاہ حنیکا کا وجود بھی باقی نہ رہا، کتب خانوں میں غازی حسریوبے کا کتب خانہ جو سرا جیوو کی زار مسجد سے ملحق اور ۱۵۶۵ء میں تعمیر ہوا تھا اور پورے بلقانی خطہ کا سب سے شاندار خزینہ کتب تھا اور اس کا ذکر ان کالموں میں پہلے آچکا ہے اسے بھی خاکستر میں بدل دیا گیا ، سرا جیوو کی اسلامک فیکلٹی آف تھیالوجی' اسلامک لا اسکول جسے ٹاؤن میوزیم بھی کہا جاتا تھا اور حاجی سنان کا تکیہ یہ سب اب قصۂ پارینہ بن گئے۔ لیکن اس المناک داستان کا سب سے روح فرسا باب سرا جیوو کے علوم مشرقیہ کے ادارہ کی تباہی ہے جسے علم جدید کے مدعیوں نے صرف ایک دن میں جلا کر راکھ کر دیا، عربی، فارسی، ترکی اور بوسنیائی زبان کے اس اہم مرکز کو ۱۹۵۰ء میں جدید طرز پہ قائم کیا گیا تھا، اس کی ثروت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں صرف سائنس، فلسفہ اور ادبیات کے موضوع پہ گیارہویں صدی ہجری تک کے ۵۲۶۳ مخطوطات کا خزانہ تھا، ان کے علاوہ سولہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تقریباً سات ہزار دستاویز اور وثیقے تھے جن میں سلطانی احکام و فرامین درباری اسناد' انتظامی روداد اور مالیاتی کاغذات شامل تھے، ان کے علاوہ بوسنیا کے صوبوں اور جاگیروں کے متعلق دو لاکھ دستاویزیں بھی تھیں، ان سب کے علاوہ

اس انسٹی ٹیوٹ کا مکمل منتخب ذخیرہ کتب بھی جل کر راکھ ہو گیا، کیا اس وسیع پیمانے پر معصوم انسانوں کی خوں ریزی و سفاکی کے ساتھ علم و حکمت کے موتی و جواہر کو مٹی میں ملانے والوں کے ان "کارناموں" کو بنی نوع انسان کی تاریخ کبھی فراموش کر سکے گی۔

بوسنیا کی خونچکاں حکایت کا یہ ورق لکھا جا چکا تھا کہ مذکورہ خبر نامہ کا تازہ شمارہ خاص نمبر کی شکل میں موصول ہوا، اس میں بوسنیا کی مذہبی، قومی اور تہذیبی تاریخ کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، گویا یہ بوسنیا نمبر ہے، اس میں بھی ۱۸۴ مسجدوں، مدرسوں اور قدیم تاریخی مراکز کی بربادی کا نام بنام ذکر ہے، خبر نامہ کے مطابق تباہی صرف اسی تعداد تک محدود نہیں بلکہ ظالموں نے ہر بستی اور ہر گاؤں میں اپنی بربریت کا نشانہ سب سے پہلے مساجد و مدارس ہی کو بنایا ہے، یہ خصوصی شمارہ تین زبانوں یعنی عربی فرانسیسی اور انگریزی میں ہے اور اس کے مہمان مدیر ایک بوسنوی النسل ماہر فن تعمیر ڈاکٹر عامر پاسٹیش ہیں۔

ساری دنیا اور خود یورپ میں اب بوسنیا کی تاریخ سے واقفیت کا شوق روز افزوں ہے، چنانچہ جرمن زبان میں ایک تازہ کتاب "نامعلوم بوسنیا، یورپ اور عالم اسلام کے درمیان ایک پل" کے نام سے شایع ہوئی ہے، یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں اس کی ابتدائی تاریخ، قرون وسطیٰ میں جنوبی یورپ کی عام حالت، وہاں اسلام کی آمد، عثمانی خلافت سے قبل و بعد کی تمدنی و تہذیبی اور تعمیری حیثیت، دینی، علمی اور ادبی حالت وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے اور آخری باب میں معاصر یورپ سے اس کے ربط و رشتہ پر بھی پر از معلومات گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مصنف بھی بوسنیا کے ایک اہل قلم اسمٰعیل بالک ہیں۔

نالۂ دل کے ساتھ بوئے گل کا رشتہ محض شاعرانہ خیال نہیں ہے، اس کی ایک مثال استنبول ترکی سے شایع ہونے والی نئی کتاب "اوراق گلہائے" ہے، ترکی زبان کی اس کتاب کے مصنف بشیر ایاز اوغلو ہیں، اس میں ترکی ادب و معاشرت پر پھولوں کے اثرات کا دلچسپ جائزہ لیا گیا ہے، ترکی میں بھی گلاب کی حیثیت گل سرسبد کی ہے، لیکن وہاں کے ادب، شاعری اور عوامی داستانوں کو گلاب کے علاوہ دوسرے اور پھولوں نے بھی رنگینی و رعنائی عطا کی ہے، آرائشی اشیا، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں اور باغوں اور رگلزاروں میں کن پھولوں کا حسن زیادہ دلکش و دلفریب ثابت ہوا ہے؟ اور مختلف زمانوں میں کن پھولوں کی زیادہ قدر افزائی ہوئی اور کون سے پھول نگاہوں سے اتر سے؟ ان دلچسپ سوالوں کے ساتھ یہ سوال بھی زیر بحث آیا ہے کہ عہد اسلامی سے پہلے اور پھر اسلام کے ابر کرم کے برسنے کے بعد کن پھولوں نے عوام کو اپنی خوبی و زیبائی سے سرشار کیا؟ معصنف کا منہج تحقیقی ہے لیکن کتاب اپنے دلکش ادبی اسلوب سے نمایاں ہے۔

ترکی اور ہندوستان کے ترکی صغیر حیدرآباد دکن میں یکسانیت کی متعدد مثالیں ہیں، قسطنطنیہ اور حیدرآباد کی افسانوی شہرت پر عام اتفاق ہے، سنہ ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد کو بسے ہوئے چار سو برس پورے ہوئے تو اس شہر اور اس کی تہذیب کے شیدائیوں نے مختلف شکلوں میں جشن تاسیس منایا، اسی موقع پر ایک آسٹریلیائی اہل قلم ایان آسٹن نے "داستانوں کا شہر، حکایت حیدرآباد" کے نام سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جو بقول مصنف تاریخ (ہسٹری) سے زیادہ کہانی (اسٹوری) ہے، تاریخی حیثیت سے کمتر ہونے کے باوجود حیدرآباد کی تہذیب اسکے فرمانرواؤں کی رواداری و فیاضی اور عام لوگوں کی امن پسندی اور معاشرہ کی زندہ دلی کی یہ داستان واقعی دلکش اور پراثر ہے۔

ع۔ص۔

تلخیص و تبصرہ

آذربائیجان

سوویت یونین کی ریاست آذربائیجان کی راجدھانی باکو ہے، یہ بحر قزوین (Caspian Sea) کے قریب ہے اس کے مغرب میں جورجیا اور شمال مغرب میں داغستان ہے یہ سب ریاستیں سوویت یونین کا جز تھیں جو اب آزاد ہو چکی ہیں، آذربائیجان کی سرحدیں ایران سے بھی ملتی ہیں، اس کا مجموعی رقبہ چھیاسی ہزار چھ سو تیس کیلو میٹر ہے جس میں اس کی ماتحت جمہوریہ ناخشفان (Nahcivan) اور قرہ باغ (kar-abagh) کا علاقہ بھی شامل ہے۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق آذربائیجان کی آبادی تقریباً اسّی لاکھ ہے جس میں ۴۷ فیصدی کرد ہیں جو آذربائیجان کے پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ کچھ تاتاری النسل کے لوگ بھی ہیں جو نہر کورا (koura) کے کنارے شہر باکو میں آباد ہیں، علاوہ ازیں یہاں قریب کے ملکوں سے آکر بھی لوگ آباد ہو گئے ہیں جنکی زبان بھی ترکی ہے۔ روسی زبان کو آذربائیجان میں ثانوی حیثیت حاصل ہے اور اس کے دور دراز علاقوں ہی میں بولی جاتی ہے۔ آرمینیائی اور جورجیائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں ۱۹۲۰ء میں آذربائیجان جمہوریہ بنا اور ۱۹۳۶ء میں اس پر سوویت یونین کا مکمل تسلط ہو گیا، آذربائیجان کے باشندوں میں ۸۰ فیصدی مسلمان ہیں جن میں شیعہ بھی قابل ذکر تعداد میں ہیں ان کے علاوہ روسی ارمنی اور جورجیائی النسل

عیسائیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور کچھ یہودی بھی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی امور کی دیکھ بھال کے لیے باکو میں ایک کمیٹی قائم ہے، اس طرح کی کمیٹیاں مسلم اکثریت کے دوسرے علاقوں ازبکستان، داغستان، باشکیریا و یوتیا کسک اور داغستان میں بھی ہیں جہاں کے مفتی ان کمیٹیوں کے سربراہ ہوتے ہیں۔

آذربائیجان میں گیہوں اور روئی بکثرت پیدا ہوتی ہے، ان کے علاوہ چاول بھی ہوتا ہے، ماہی گیری بھی ایک اہم ذریعۂ آمدنی ہے، بحر قزوین (Caspian Sea) کے ساحلی علاقوں میں چائے کی عمدہ کاشت بھی ہوتی ہے، انگور اور مختلف قسم کے پھلوں اور سبزیوں کے لیے بھی یہ خطہ مشہور ہے، ان کا کاروبار بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ پٹرولیم اور قدرتی گیس بھی کافی مقدار میں نکلتے ہیں، لوہے اور تانبے کی معدنیات بھی دستیاب ہیں۔ جن سے مختلف قسم کی مشینیں اور کل پرزے تیار کیے جاتے ہیں۔ آذربائیجان کی اقتصادی حالت اطمینان بخش ہے۔ ۲،۴۲۶،۰۰۰ افراد برسر روزگار ہیں، زراعت، صنعت و حرفت سے وابستہ ہونے کے علاوہ ۴۵ فیصدی افراد ملازمت پیشہ ہیں، لوگوں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۱۹۶۸ روبل ہے، جدید سائنسی ایجادات ٹی۔ وی سٹ، ریفریجیٹر وغیرہ کے یہاں رواج واستعمال سے ملک کے لوگوں کی خوشحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں کے علمی اور تعلیمی اداروں میں آذربائیجان اکیڈمی آف سائنسز اور رسول زادہ اسٹیٹ یونیورسٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکیڈمی میں مختلف علوم و فنون سے متعلق تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں اور رسول زادہ یونیورسٹی میں جدید سائنسز کے تمام شعبے ہیں، دوسری یونیورسٹیوں میں کیرووف یونیورسٹی آف

میڈیسن، نصر الدین طوسی یونیورسٹی، عزیزبیوف آئل اینڈ کیمیکل انڈسٹریل یونیورسٹی، چنگیز یلدرم ٹکنیکل یونیورسٹی، مرزا ستار الی (SAT ALI) آخوندوف انسٹی ٹیوٹ آف رشین لینگویج، آذربائیجان اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف فنانس، فارن لینگویجز، سول انجینئرنگ پیٹرولیم، فائن آرٹس یونیورسٹیاں وغیرہ بھی لائق ذکر ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانے ہی میں آذربائیجان اسلام کے زیرنگیں ہوگیا تھا، انھوں نے اس کا علم حذیفہ بن یمان کے سپرد کردیا تھا۔ انھی کی کوششوں سے یہاں اسلام کی نشر و اشاعت کا آغاز ہوا اور بتدریج آذربائیجان کا پورا علاقہ حلقہ بگوش اسلام ہوگیا، یہاں جب عربوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو مصر اور شام کے قبائل بھی آباد ہونے لگے تھے اور مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ بحر خزر کی سرحد کے قریب شہر دربند اور شروان کے شہروں تک پہنچ گیا اور وہ داغستان کے بعض علاقے فتح کرتے ہوئے خزر کی راجدھانی بلنجر تک پہنچ گئے، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت حبیبؓ ابن مسلمہؓ نے شہر تفلیس فتح کیا جو اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا۔

مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں کے گورنروں کی دعوت اسلام کے نتیجہ میں شہر تبرطائی اور کو باکو اسلام کی ضیاء پاشیوں سے منور ہوئے، ہشام بن عبدالملک کے عہد میں اس کے بھائی مسلمہ نے دربند میں مسلم حکمرانی کو مزید قوت و استحکام عطا کیا اور ۱۱۰ھ میں داغستان بھی زیر نگیں کرلیا، اسی زمانے میں مسلمہ نے اہل خیزران سے مصالحت کے بعد ان کا قلعہ ڈھا دیا اور اس کو اپنی جاگیر بنالیا۔ اس کو آج کل خور خیزران کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کے بعد کوہستانی علاقوں کے بادشاہ بھی باجگذار ہوگئے اور شہر باب بھی فتح ہوگیا، اس شہر میں تقریباً ایک:

خزری پناہ گزیں تھے مسلمہ نے ان کا محاصرہ کر کے شہر باب الابواب میں چوبیس ہزار شامیوں کو وظیفہ دے کر آباد کیا اس کے بعد مروان بن محمد وہاں کے سرحدی خطہ کا والی مقرر ہوا اس نے بھی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ والی خیزان نے اسلام قبول کر لیا تو مروان نے اسے اس کے منصب پر بحال رکھا اور غزوات کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا اور بحر خزر پر دفاعی چوکیاں بنا دی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ مملکت اسلامیہ کا تحفظ کیا جا سکے اور وہاں سے اسلام کی نشر و اشاعت کا فریضہ بھی انجام دیا جا سکے۔

غرض بنی امیہ کے آخری عہد میں قفقازیا میں مسلم حکمرانی کا دور دورہ ہو گیا تھا اس کے نتیجے میں یہاں عربی زبان و ثقافت کے فروغ کے علاوہ بڑی تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔

بنو عباس کے عہد حکومت میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں یزید بن اسید السلمی آذربائیجان کے سرحدی علاقوں کے گورنر مقرر ہوئے، جنھوں نے آذربائیجان کے شمالی علاقوں کو اسلام کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا اور جب بغا الکبیر عباسی افواج کا کمانڈر ہوا تو اس نے بھی مروجہ طریقہ پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام انجام دیا۔

پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں آذربائیجان کے کچھ ممتاز خاندان نمایاں ہوئے ۵۳۱ھ میں اتابک ایلدگوز یہاں کا حاکم ہوا ۶۲۲ھ میں جلال الدین خوارزم شاہ نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور ۶۵۶ھ میں اس پر مغلوں کا قبضہ ہوا، انھوں نے اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا ۹۱۵ھ میں یہاں صوفیوں کا زور رہا بالآخر عثمانیوں

نے اپنی حکومت قائم کی، انیسویں صدی کے آغاز تک آذربائیجان میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی لیکن اس کے بعد ان کا زوال شروع ہوگیا اس کی وجہ سے روسیوں کا اس پر حملہ شروع ہوا، اس زمانہ میں آذربائیجان چھوٹی خود مختار ریاستوں میں منقسم ہوچکا تھا جو باہم برسرپیکار رہتیں گو وہاں کے مقامی سربراہوں نے زار کی فوجوں کا مقابلہ ضرور کیا لیکن وہ بالکل بے دم ہوچکے تھے اس لیے ان کی کوششیں کارگر نہیں ہوسکیں، غرض ۱۲۱۶ھ میں روس نے جنوبی قوقاز اور جورجیا کو ساتھ ملاکر آذربائیجان کی ایک ریاست گنجہ پر دھاوا بول دیا اس ریاست کے سردار جواد خاں نے دلیری کے ساتھ مدافعت کی لیکن اپنے دو ہزار بہادروں کے ساتھ مارے گئے اور میدان روسیوں کے ہاتھ رہا انھوں نے ریاست کا نام بدل کر زار اول الیگزنڈر کی بیوی کے نام پر یزاوتیل رکھ دیا، اس کے بعد آذربائیجان کے دوسرے علاقوں پر بھی یکے بعد دیگرے ان کا قبضہ ہوتا چلا گیا جس کی تفصیل یوں ہے۔

ریاست تنکی ۱۲۳۰ھ میں، ریاست شماخی ۱۲۳۶ھ میں اور ریاست قارابغ ۱۲۳۸ھ میں ان کے مقبوضات میں شامل ہوئی، ان معرکوں میں آذربائیجان نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا اور انھوں نے روسی جنرل سیستانوف کو قتل کرڈالا اس کے بعد روسی افواج کا ظلم و تشدد ان پر اور بھی سوا ہوگیا اور انھوں نے ان کی املاک و جائداد پر بھی زبردستی قبضہ کرلیا، سوویت علوم اکیڈمی کے معہد تاریخ و فلسفہ کے استاد ایک روسی مورخ نے اپنے آباء واجداد کے ان مظالم کا اعتراف کیا ہے۔

آذربائیجان اور تمام مسلم صوبوں میں زار حکومت کے خلاف متعدد بغاوتیں ہوئیں، ۱۹۰۵ء میں آذربائیجان میں جو بغاوت ہوئی اس نے روس کی مسلم حکومتوں کے ساتھ ہی خود روس کو بھی اپنی زد میں لے لیا تھا، اس زمانہ میں کئی سرگرم جماعتیں وجود میں آئیں جن میں اہم جماعت کا نام جماعۃ المسلمین لعموم روسیا تھا جس کا مقصد روسی مسلمانوں کے دینی وسیاسی حقوق کی بازیافت تھا اس کا آذری سیاسی رہنما علی مردان طوبچی پاشا تھا، ۱۹۰۶ء میں زار روس نیقولا ثانی نے جب روسی پارلیمنٹ کو تحلیل کرکے آذربائیجان کے نئے انتخابی قوانین مرتب کیے تو پارلیمنٹ میں روس کے مسلمانوں کی نمائندگی گھٹ کر دس سے چھ ہوگئی، ۱۹۱۰ء میں روسی وزیراعظم سولیبین نے سرکلر جاری کیا جس میں زار کی سلطنت کی جس سیاسی پالیسی کی وضاحت کی گئی تھی وہی پالیسی بعد میں بالشویکی حکومت کی بھی رہی بلکہ یہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تمام مسیحی حکومتوں کی بھی پالیسی ہے، سولیبین کے سرکلر کا متن یہ تھا۔

"اسلام اور مسیحیت کا اختلاف محض مذہبی نہیں ہے بلکہ یہ ایک سیاسی، تہذیبی، لڑائی اور اقتدار کی جنگ ہے، ادھر چند برسوں میں اسلامی دعوت کو جو کامیابی ہوئی ہے اس سے ہم کو چوکنا رہنا چاہیے، یہ کامیابی وطن عزیز روس کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے باوجودیکہ روس کے مسلمان مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے طور طریقے اور زبان کے لہجے وغیرہ کسی قدر مختلف ہیں تاہم یہ سب ترکی سے تعلق رکھتے ہیں اور سب ترکی زبان بولتے ہیں۔"

۱۹۰۵ء کے انقلاب کے بعد روس کے زیر تسلط علاقوں میں گرچہ عام سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ہوگئی تھی مگر روسی حکمران مسلم زعماء کو خلافت عثمانیہ

کا جاسوس اور مائلہ کار خیال کرتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں روسی وزیر داخلہ نے یہ حکم دیا کہ مسلم علاقوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے اور اگر مسلمان کوئی سیاسی تنظیم قائم کریں تو اسے خلاف قانون قرار دے کر اس کے سربراہوں کو گرفتار کر لیا جائے روس میں مسلم ریاستوں کی نئی جمہوری ریاستوں کے بارے میں یہی دوہری پالیسی آج تک جاری ہے۔

فروری ۱۹۱۷ء میں روس میں جو ناکام بغاوت ہوئی اس کے نتیجہ میں اسی سال اکتوبر میں اشترا کی انقلاب رونما ہوا اور بالشویک حکومت قائم ہوئی اس سے پہلے یہاں کے مسلمانوں کی ایک دس روزہ کانفرنس یکم تا ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی۔ جس میں محمد رسول زادہ نے یہ تجویز پیش کی کہ روسی فیڈرل میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو خود مختاری و آزادی دی جائے، اس تجویز پہ کانفرنس کے اکثر شرکاء متفق تھے۔

بالشویکی حکومت کے قیام کے بعد لینن نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے ڈینکن کے خلاف اس کا ساتھ دیا تو ان کی ریاستوں کی آزادی برقرار رکھی جائیگی اور انہیں بھی مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی، چنانچہ ایک ماہ بعد، دسمبر ۱۹۱۷ء کو برسر اقتدار بالشویک پارٹی نے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے دوسروں کے علاوہ خود لینن و اسٹالن کے دستخط سے یہ اعلان کیا کہ:۔

" اب لوٹ گھسوٹ اور سرمایہ دارانہ جبر و تشدد کے خاتمہ کا وقت قریب آگیا ہے، سامراجیوں کی حکومت لب گور پہونچ چکی ہے، ہم روس اور مشرق کے مسلمانوں کے بہی خواہ ہیں، یہ محنت و مشقت سے کھیتی اور مزدوری کرتے

ہیں لیکن ان کے حقوق سلب کر لیے گئے ہیں، ان کی عبادت گاہوں اور مقبروں کی بے حرمتی کی جاتی ہے، ان کے اعتقادات اور مذہبی امور میں مداخلت کی جاتی ہے، ظالم زار حکمراں ان کی عزت و آبرو پامال کرتے اور ان کی جان و مال سے کھیلتے رہے ہیں لیکن اب ان کو اپنے عقائد اور مذہبی امور اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں مکمل آزادی حاصل ہو گی اور ان پر کوئی تشدد نہیں کیا جائے گا، نئی حکومت روسیوں ہی کی طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی محافظ ہو گی اور اسکی ساری مشینریاں اور عوامی نمائندے ہر طرح ان کی مدد کے لیے تیار رہیں گے، اس لیے وہ اس حکومت کے وفادار اور مددگار بن جائیں، یورپ کے ظلم و ستم برداشت کرنے والو بیدار ہو جاؤ اور اپنی گردنوں سے غلامی کا قلادہ نکال دو اور متحد ہو کر ان جابروں کا مقابلہ کرو۔"

غرض روس کے حکمرانوں نے خود اپنی زبان سے روس میں مسلمانوں کے ستائے جانے کا اعتراف کر کے انہیں یہ خوش خبری دی تھی کہ اب ان کے مصائب کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا، لیکن ان کے سارے وعدے اور یقین دہانیاں باد ہوا ہو گئیں، بیچارے مسلمانوں نے تو نئے روسی نظام کے ساتھ پورا تعاون کیا مگر بالشویک حکمرانوں نے اپنا تسلط جمانے کے بعد ان کو آزادی اور خودمختاری دینا پسند نہیں کیا۔

سب سے پہلے مئی ۱۹۱۸ء میں قوقاز نے خودمختاری کا اعلان کیا اس کے معاً بعد جورجیا نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن لینن نے دونوں جگہ بغاوت کرا دی اور سیستان شادمیان کو بھی آلۂ کار بنا کر آزادی کو کچلنے کی مہم شروع کر دی،

اس تصادم میں صرف شہر باکو میں مارچ ۱۹۱۸ء میں اٹھارہ ہزار مسلمان شہید ہوئے، ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ترکی افواج کے ذریعہ اس فتنے کا استیصال ہوا مگر جنگ میں ترکی افواج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ادھر ایران کی سرحد سے برطانوی فوجوں نے ترکی افواج پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۸ء میں ترکی فوج وہاں سے ہٹ آئی۔ ۱۰ اگست ۱۹۱۹ء کو برطانوی افواج کو بھی آذربائیجان کے مقامی باشندوں کی پامردی اور استقلال کے سامنے پیچھے ہٹنا پڑا، ان کے ہٹنے کے بعد محض دو سال یہ جمہوریہ آزاد رہ سکی کیونکہ ، اپریل ۱۹۲۰ء کو لینن کی فوجوں نے آذربائیجان پر حملہ کر کے اسے اپنے زیر نگیں کر لیا۔ یہ سب کچھ اس وعدے اور یقین دہانی کے بعد کیا گیا جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، چند برس پہلے افغانستان کے ساتھ بھی روس نے یہی طرز عمل اختیار کیا تھا، غرض ۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء کو سوویت یونین کی اشتراکی جمہوریہ آذربائیجان کی تشکیل ہوئی جو مارچ ۱۹۲۲ء میں آرمینیا، جورجیا میں اس لیے ضم ہوگئی کہ ان کے مجموعہ سے جمہوریہ قفقاس کی تشکیل عمل میں آئے، مگر اس جمہوریہ کو توڑ کر سوویت یونین میں شامل کر لیا گیا۔ روس کے ان جارحانہ اقدامات کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد سے آذربائیجان میں بغاوت رونما ہوئی مگر روس کی مسلح فوجوں نے اسے فرو کر دیا۔

ان مظالم کو عرب اور مسلمان ممالک بالکل خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہے، حالانکہ ان کی شدت و سنگینی کا اعتراف روس اور امریکہ والوں کو بھی رہا، مگر عربوں کی حکومتیں اپنی کمزوری اور انتشار کی وجہ سے روس کے مقابلہ کی

جرأت وہمت نہیں ہوئی ۔

اگست ۱۹۹۱ء میں گورباچوف کے دور میں جوزبردست تاریخی انقلاب رونما ہوا اس نے روس سے اشتراکیت کو نیست ونابود کر دیا۔ اس عظیم انقلاب کے بعد غیر مسلم ریاستیں لیتھوانیا، اسٹونیا اور لاٹیویا نے جب اپنی آزادی کا اعلان کیا تو امریکہ کی سربراہی میں دنیا کے تمام ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا اور اقوام متحدہ نے اس کا خیر مقدم کیا مگر جب ان کی تبعیت میں اسلامی جمہوری ریاستوں آذربائیجان، ازبکستان اور قرغیزیا نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو دنیا کی تمام بڑی حکومتیں چپ سادھے رہیں، یہاں تک کہ خود مسلمان حکومتوں کو بھی انہیں تسلیم کرنے میں معلوم نہیں کیوں پس وپیش ہوا، ممکن ہے آیندہ اس راز سے پردہ اٹھے ۔ (ماخوذ از الازہر)

سلسلۂ تاریخ اسلام

اس میں عہد رسالت وخلافت راشدہ یعنی آغاز اسلام سے بنوامیہ اور بنوعباس اور اندلس، صقلیہ اور ترکی کی خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے ۔

حصہ اول زیر طبع، دوم (بنوامیہ) ۴۰ روپیے، سوم چہارم (بنوعباس) ۵۰، ۵۰ روپیے، تاریخ اندلس زیر طبع، دولت عثمانیہ اول ودوم ۵۵، ۵۰ روپیے، تاریخ صقلیہ اول ودوم ۶۰، ۵۰ روپیے ۔

"منیجر"

معارف کی ڈاک

دفتر اردو دائرہ معارف اسلامیہ،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مورخہ ۸ر جون ۱۹۹۳ء فاضل مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف (اپریل) کا شمارہ کل ملا۔ شذرات حسب معمول برمحل اور حسب حال ہیں، پچھلے ہفتے ہمیں ترکیہ کے محکمہ اوقاف کی طرف سے ترکی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (اسلام انسکلو پیڈیسی) کی ساتویں جلد موصول ہوئی۔ یہ جلد حرف "ج" سے شروع ہونے والے اسماء و اعلام اور مشہور کتابوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ حسب سابق اس جلد کی زبان ترکی (رومن رسم الخط) ہے، صرف عنوانات عربی رسم الخط میں ہیں جن سے مشمولات و مندرجات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے، ان میں سے چیدہ چیدہ مقالات کا تعارف حسب ذیل ہے:۔

جلد کی ابتدا میں امام جعفر صادق اور فرقۂ جعفریہ پر مقالات ہیں۔ لفظ جامع کے تحت عالم اسلام کی مشہور مساجد کے مختصر حالات کے علاوہ ان کی خوبصورت تصاویر بھی شامل ہیں۔ مشہور کتب میں جامع احکام القرآن (قرطبی) اور جامع البیان (طبری) جامع الکبیر اور جامع الصغیر (امام محمد بن حسن شیبانی)، جامع الصحیح البخاری، صحیح مسلم اور سنن ترمذی، جامع الاصول لاحادیث الرسول (ابن الاثیر) الجمع بین الصحیحین، الجواب الصحیح (ابن تیمیہ)، ان کے قلمی نسخوں کی تصویریں بہت دیدہ زیب ہیں اور

جاوید نامہ (اقبال) پر اچھے خاصے مقالات ہیں۔

لفظ جماعت کے تحت جماعت اسلامی، جماعت تبلیغ اور جمعیۃ العلماء المسلمین (الجزائر) پر مفید مضامین ہیں۔ اول الذکر دو جماعتوں پر مضامین ایک ہندوستانی مسلمان مقیم انگلستان کے قلم سے ہیں۔ دینی مضامین میں الجلیل، الجبارہ، سورۃ جاثیہ، جزیہ اور جہاد قابل ذکر ہیں۔

مشاہیر ادباء و علماء میں جاحظ، جامی، امام جصاص رازی، جوالیقی، امام جوہری، سید جمال الدین افغانی، جمال الدین قاسمی دمشقی، عبدالقادر الجزائری، ڈاکٹر جواد علیؒ اور حکمرانوں میں شہنشاہ جہانگیر، جہاں آرا بیگم، جہاں وارشاہ پر مقالات ہیں۔ قدرتی طور پر ترک مشاہیر پر مضامین زیادہ ہیں۔
سیکولرازم اور لادینیت کے اس دور میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی اشاعت ہر لحاظ سے مستحق تبریک و تحسین ہے۔ کاش کہ ان مقالات کو عربی رسم الخط میں بھی لکھا جا سکتا۔ ہاں میرا ایک مضمون "سیرت نگاران نبوی صلعم (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں) آپ کے ہاں منتظر اشاعت ہے حسب گنجائش جب چاہیں اس کو شایع کر سکتے ہیں اگر یہ مضمون ایک ہی قسط میں شایع ہو سکے تو بڑا کرم ہوگا۔

فقط والسلام۔ نیاز مند

(شیخ) نذیر حسین، لاہور

ادبیات

نمازِ عصر

(جو کربلا کے معرکۂ حق و باطل میں ادا ہوئی)

جناب جگن ناتھ آزاد صاحب

میری نوا میں سوزِ کہن رو نما ہے آج ۔۔۔ در پیش نغمگی کو عجب معرکہ ہے آج
دنیائے دل میں ایک قیامت بپا ہے آج ۔۔۔ نوکِ قلم پہ تذکرۂ کربلا ہے آج
چھیڑا ہے آج دل نے شہادت کا تذکرہ
بے مثل و بے عدیل عبادت کا تذکرہ

گردوں سے بھی بلند تمہارے کربلا کی خاک ۔۔۔ میری نظر میں تو حرم کی طرح ہے پاک
کیسے کہوں کہ ذکر نہایت ہے دردناک ۔۔۔ دامن میں تیرے پھول کا سینہ ہے چاک چاک
اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ رسولؐ

لُو چل رہی ہے نام کو سایہ کہیں نہیں ۔۔۔ حدت وہ ہے کہ وقت کی سانسیں ہیں آتشیں
آنکھیں اٹھا کے دیکھ ذرا اے دلِ حزیں ۔۔۔ گردوں تنور ہے کرۂ نار ہے زمیں
اک شعلہ زار ہے کہ ہے میدانِ کربلا
اک آگ ہے کہ ریگِ بیابانِ کربلا

طوفاں بپا ہے، گرم ہے میدانِ کارزار ۔۔۔ ہے قاتلوں سے محوِ دعا ایک شہسوار
اہلبیت اِدھر اُدھر انسان کا وقار ۔۔۔ تنہا حسینؑ اور یزیدی کئی ہزار
اے گردشِ زمانہ ٹھہر جا ذرا یہیں
ایسی مثال پھر نہ ملے گی تجھے کہیں

وہ سامنے غنیم کی فوجیں ہیں دجلہ بار ہیں اس طرف اکیلے حسین اسپ پر سوار
دامن پہ ہے غبار، گریباں ہے تار تار کانٹوں میں جیسے پھول ہو پیلا بے وقار

آزاد! نوک خار کی زد پر ہے پھول دیکھ
ہاں دیکھ انقلاب جہاں کا اصول دیکھ

اوپر تلے تپے ہوئے ذروں کا انتشار ہتھیار جس قدر ہیں بدن پر ہیں شعلہ زار
اور اسکے ساتھ ساتھ ہیں چاروں طرف سے وار سر تیغ سے شکستہ جگر تیر سے فگار

دو دن ہوئے ہیں پینے کو پانی ملا نہیں
لیکن نماز ظہر یہاں بھی قضا نہیں

اب ہیں نماز عصر کی ساعات بھی قریب ہیں کوئی دم میں شام کے لمحات بھی قریب
اے دوپہر کی دھوپ! ہے اب رات بھی قریب جس بات کا ہے ذکر وہ ہے بات بھی قریب

گھوڑے سے گر چکے ہیں شہ مشرقین اب
سجدے میں سر جھکائے ہوئے ہیں حسین اب

دیکھ اے نگاہ، دیکھ یہ منظر جگر خراش تاب نظر کہاں کہ کلیجہ ہے پاش پاش
فریاد سے فضاؤں میں پیدا ہے ارتعاش کیا اے فلک تجھے تھی اسی وقت کی تلاش

دست قضا کو صبر ذرا بھی نہ ہو سکے
اور عصر کا فریضہ ادا بھی نہ ہو سکے

وہ ہاتھ اٹھا لعین کا شمشیر تول کر بھرپور وار، جسم ادھر اور سر اُدھر
اے کم نگاہ! راز حقیقت سے بے خبر سجدہ یہی ہے سجدہ جو باطن پہ ہو نظر

روح حیات و روح شہادت یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت یہی تو ہے

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، متوسط

تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد صفحات ۸۰، قیمت ۴۵ روپیے،
پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زیر نظر کتاب رسالہ جامعہ میں چھپنے والے چار مقالات کا مجموعہ ہے، پہلے مقالہ میں عرب و ایران کے مشترکہ اسلامی تمدن کے زیر سایہ علمی و تعلیمی فروغ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مکاتب کے علاوہ مساجد، کتب خانوں، قصہ گویوں اور اتالیقوں کے ذریعہ علمی و تعلیمی ترقی اور دیوان خانوں کی ادبی محفلوں کی اہمیت بتائی گئی ہے اور قاہرہ و بغداد، بخارا و سمرقند اور طوس و غزنہ کے چند اہم علمی مرکزوں اور کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور محمود غزنوی کے عہد تک ایران اور وسط ایشیا کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کو کیسی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ عہد وسطیٰ کے کتب خانوں کے نظم و انصرام اور لائبریرین کے فرائض کی تفصیل بھی دی ہے، دو مضامین مدارس کے قیام اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے عنوان سے ہیں ان میں اس خیال کو غلط بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کا اولین مدرسہ یہی ہے بلکہ یہ حکومت کی سرپرستی اور کفالت میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ چنانچہ مصنف نے کئی اہم مدارس کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ سب اس سے پہلے ہی قائم ہو چکے

تھے، اس خیال کی بھی تغلیط کی گئی ہے کہ یہ مدارس محض شیعی اور معتزلی اثرات کو روکنے اور اہل سنت والجماعت کے مخالفین کو پسپا کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے بلکہ ان کے قیام کی وجہ دینی و دنیوی تعلیم کی روز افزوں ضرورت تھی۔ اسی بحث میں نظریۂ تعلیم سے متعلق حنفی و شافعی مسلک کا موازنہ بھی کیا ہے اور مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے غیر مذہبی یا سیکولر مضامین مثلاً ادب، ریاضی، فلسفہ، کیمیا، طب اور طبیعیات کی تفصیل بھی آگئی ہے۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان کی سرکاری اور عوامی بالادستی کے باوجود مدارس کے دروازے دوسری زبانوں کے لیے بند نہیں تھے۔ چنانچہ ابوبکر وجیہ الدین الضریر نحوی بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں نحو کے استاد تھے لیکن وہ ترکی، فارسی، یونانی، آرمینی اور یعقوبی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں کے طلبہ کی مشکلات کو خود ان کی زبانوں میں حل کرتے تھے۔ آخری مقالہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے متعلق ہے، اس میں فاضل مولف نے تحقیق و کاوش سے اس دور کے تعلیمی نظام و نصاب کا خاکہ پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کے تمام معقولی و منقولی نظام تعلیم پر جمود و تقلید چھائی تھی اور قدما کے لکچر اور بحث و مباحثہ کے طریقہ کے بجائے حاشیوں اور شرحوں میں پوری قوت ضائع ہو رہی تھی۔ یہ مقالہ مصنف کے غور و خوض کا نتیجہ اور برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ اور نہایت جامع ہے۔

رباعیات سرمد اردو ترجمہ از پال کمند عرش ملسیانی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نفیس طباعت و کتابت، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کا تعلیمی نظام۔ جناب پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، متوسط

تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۸۸، قیمت ۵/۴ روپیے،
پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زیر نظر کتاب رسالہ جامعہ میں چھپنے والے چار مقالات کا مجموعہ ہے، پہلے مقالہ میں عرب وایران کے مشترکہ اسلامی تمدن کے زیر سایہ علمی وتعلیمی فروغ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مکاتب کے علاوہ مساجد، کتب خانوں، قصہ گویوں اور اتالیقوں کے ذریعہ علمی وتعلیمی ترقی اور دیوان خانوں کی ادبی محفلوں کی اہمیت بتائی گئی ہے اور قاہرہ، بغداد، بخارا، سمرقند اور طوس وغزنہ کے چند اہم علمی مرکزوں اور کتب خانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور محمود غزنوی کے عہد تک ایران اور وسط ایشیا کی علمی وادبی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کو کیسی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ عہد وسطیٰ کے کتب خانوں کے نظم وانصرام اور لائبریرین کے فرائض کی تفصیل بھی دی ہے، دو مضامین مدارس کے قیام اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے عنوان سے ہیں ان میں اس خیال کو غلط بتایا ہے کہ دنیائے اسلام کا اولین مدرسہ یہی ہے بلکہ یہ حکومت کی سرپرستی اور کفالت میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ ہے۔ چنانچہ مصنف نے کئی اہم مدارس کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ یہ سب اس سے پہلے ہی قائم ہو چکے

تھے، اس خیال کی بھی تغلیط کی گئی ہے کہ یہ مدارس محض شیعی اور معتزلی اثرات کو روکنے اور اہل سنت والجماعت کے مخالفین کو پسپا کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے بلکہ ان کے قیام کی وجہ دینی و دنیوی تعلیم کی روز افزوں ضرورت تھی۔ اسی بحث میں نظریۂ تعلیم سے متعلق حنفی و شافعی مسلک کا موازنہ بھی کیا ہے اور مدارس اسلامیہ میں پڑھائے جانے والے غیر مذہبی یا سیکولر مضامین مثلاً ادب، ریاضی، فلسفہ، کیمیا، طب اور طبیعیات کی تفصیل بھی آ گئی ہے، یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان کی سرکاری اور عوامی بالادستی کے باوجود مدارس کے دروازے دوسری زبانوں کے لیے بند نہیں تھے۔ چنانچہ ابوبکر وجیہ الدین الضریر نحوی بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں نحو کے استاد تھے لیکن وہ ترکی، فارسی، یونانی، آرمینی اور ایعقوبی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں کے طلبہ کی مشکلات کو خود ان کی زبانوں میں حل کرتے تھے، آخری مقالہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کے متعلق ہے، اس میں فاضل مولف نے تحقیق و کاوش سے اس دور کے تعلیمی نظام و نصاب کا خاکہ پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کے تمام معقولی و منقولی نظام تعلیم پر جمود و تقلید چھائی تھی اور قدماء کے لکچر اور بحث و مباحثہ کے طریقے کے بجائے حاشیوں اور شرحوں میں پوری قوت ضائع ہو رہی تھی۔ یہ مقالہ مصنف کے غور و خوض کا نتیجہ اور برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ اور نہایت جامع ہے۔

رباعیات سرمد اردو ترجمہ از بال مکند عرش ملسیانی، بڑی تقطیع، بہترین کاغذ اور نفیس طباعت و کتابت، مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش، صفحات ۳۰۵، قیمت درج نہیں، پتہ: انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

آزاد بھون، اندرپرستھ اسٹیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مشہور صوفی شاعر سرمد کی ذات خواہ جس قدر بھی مختلف فیہ رہی ہو لیکن اس کا کلام بہت مقبول ہے اور اب بھی اس کی رباعیوں کی اثر آفرینی میں کمی نہیں آئی ہے جو دنیا کی بے حقیقتی اور ترک ہوا و ہوس کے مضامین اور مسائل تصوف کے بیان سے مالا مال ہیں ان کی مقبولیت کی وجہ سے ان کے دو منظوم اردو ترجمے بھی ہو چکے ہیں، پہلا ترجمہ منشی سید نواب علی صولت لکھنوی نے تقریباً پون صدی قبل رباعیات سرمد کے نام سے شایع کیا تھا اور دوسرا جناب عرش ملسیانی نے نغمہ سرمد کے نام سے شایع کیا، یہ بھی کئی برس پہلے شایع ہوا تھا اب پھر اس کا جدید اڈیشن شائع ہوا ہے جو نہایت خوبصورت ہے اور اس کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں سرمد پر مولانا ابوالکلام آزاد کے معروف و مشہور مضمون کو شامل کیا گیا ہے اور موجودہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا فاضلانہ پیش لفظ بھی اس کی زینت بنا ہے، لیکن پہلے اڈیشن میں سرمد کے سوانح پر فاضل مترجم کا جو مفید اور معلوماتی مضمون شامل تھا معلوم نہیں کیوں اسے حذف کر دیا گیا ہے، ترجمہ کی خوبی کے لیے جناب عرش ملسیانی کا نام ہی پوری ضمانت ہے جس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو ؎

عمری کہ شدہ است صرف در لہو و لعب ... بے پرسش اگر عفو کند نیست عجب

کی زشتی افعال در آرد بہ نظر ... آنرا کہ کرم بود فزوں تر ز غضب

ترجمہ یوں کیا ہے:

جس عمر کا مقصود رہا لہو و لعب ... بے پرسش اسے عفو کرے کیا ہے عجب

ہیں جس کی عنایات بہت کم ہے غضب　　اعمال زبوں کی اس کو پروا کیا ہے

یہاں صولت لکھنوی کا ترجمہ بھی دلچسپی کے لائق ہے۔

ممکن ہے کہ دم بھر میں ہو بخشش میری　　گو لہو و لعب میں عمر ساری گزری
کب میرے گنا ہوں پہ نظر ہے اسکی　　ہے جس کا کرم قہر و غضب سے افزوں

علوم اسلامیہ اور ہندوستانی علماء از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گردپوش صفحات ۱۵۲، قیمت ۶۰ روپیے، پتہ، پبلی کیشنز ڈیویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

زیر نظر کتاب فاضل مولف کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں اخوان الصفا کے علاوہ تمام مضامین ہندوستان کے چند اہل علم و کمال خصوصاً مفسرین کے سوانح اور ان کی تفسیروں سے متعلق ہیں مثلاً خواجہ گیسو دراز، شیخ مبارک، فیضی، حسن محمد بن میاںجیو، سرسید اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ، ایک جدا مضمون' قرآن کے اردو تراجم اور تفاسیر' کے عنوان سے بھی ہے، جس پر پہلے ان کی مستقل کتاب بھی شایع ہوچکی ہے، عربی مدارس کے نظام تعلیم پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم گاہوں اور مدارس دینیہ میں ربط و تعلق کے استحکام کو قائم کرنے اور بدظنی کی خلیج کو دور کرنے کے لیے بعض مشورے بھی دیے ہیں جو توجہ کے لائق ہیں، کاکوری کے بزرگوں کے تذکرہ گلشن کرم کے تعارف کے علاوہ امیر خسرو، چارلس ایمبروز اسٹوری اور مولانا اسلم جیراجپوری پر بھی مفید مضامین ہیں۔

دکن کا عہد اسلامی مرتبین جناب عمر خالدی اور جناب معین الدین عقیل، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۱۰۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: حیدرآباد ہسٹاریکل سوسائٹی، ۵۰۰ ڈف (DUFF) اسٹریٹ، واٹر ٹاؤن، ایم اے ۰۲۱۷۲-۳۰۱۶، یو ایس اے۔

دکن ہند قریباً پانچ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت اور تہذیب و تمدن سے فیضیاب ہوتا رہا، اس طویل عہد کی تاریخ پر اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے، ان کے شمار و قطار کے دشوار گذار کام کا بیڑا جناب عمر خالدی نے اٹھایا اور ۱۹۸۸ء و ۱۹۹۱ء میں انھوں نے انگریزی کتابوں اور مقالات کی دو جامع فہرستیں امریکہ سے شایع کیں، انکی پذیرائی سے اردو و فارسی کے دکنی ذخیرہ کی کتابیات تیار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا، زیر نظر کتاب اسی کاوش کا ثمرہ ہے، اور بقول مولفین "یہ ایک ابتدائی اور بہ یک کوشش مرتب ہونے والی فہرست ہے اسلئے یہ محض مطبوعہ اور فوری طور پر دستیاب ہونے والی کتابوں اور مقالوں تک محدود ہے" تاہم اس منتخب کتابیات نے خاصی معلومات کا استقصاء کر لیا ہے، تاریخ دکن، مذہب، معاشرت، سوانحی ماخذ، دکنی ادب، اسناد و ماخذ اور متفرقات کے زیر عنوان مختلف ابواب ہیں اور ان میں بھی ذیلی عنوانات کے تحت بڑے سلیقہ سے الفبائی ترتیب میں اشخاص و مضامین کو جمع کیا گیا ہے، دکنیات کے شیدائیوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے، کمپیوٹر کی طباعت خوبصورت ہے اور اغلاط سے یکسر پاک ہے اور اس نے کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

ع۔ ص۔

اگست ۱۹۹۳ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

ARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ اگست ۱۹۹۳ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ عدد ۲

مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۸۲-۸۴

مقالات

سیرت نگاران نبویؐ (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں)	جناب شیخ نذیر حسین صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور۔	۸۵-۱۰۴
حضرت شیخ احمد کھتوی سرکیجی	جناب مولانا محمد یوسف متالا لندن۔	۱۰۵-۱۲۴
علم تفسیر کی اہمیت اور تفسیر اعجاز البیان کا ایک نادر مخطوطہ	جناب حکیم سید محمد احمد ٹونکی ٹونک، راجستھان۔	۱۲۵-۱۳۲
اقبال کے فلسفیانہ افکار کا ارتقاء	ڈاکٹر آفاق فاخری لکچرر اشرفیہ کالج، مابل، اعظم گڈھ	۱۳۳-۱۴۳

وفیات

پروفیسر نور الحسن کی رحلت	ضیاء الدین اصلاحی	۱۴۴-۱۵۱
ڈاکٹر محمد معظم مرحوم جیراجپوری	ضیاء الدین اصلاحی	۱۵۱-۱۵۲

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر	ع۔ ح۔	۱۵۳-۱۵۶
مطبوعات جدیدہ	ع۔ ص۔	۱۵۷-۱۶۰

شذرات

دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور بعض موقر ارکان کے ضعف و معذوری کے باعث اس سال اسکی دونوں مجالس عاملہ و منتظمہ کے اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہوئے، مجلس عاملہ کا جلسہ ۷ اگست کو حضرت مولانا کی صدارت میں ہوا جس میں اسکے ارکان مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جناب سید شہاب الدین دسنوی معتمد دارالمصنفین اور راقم شریک ہوئے، جلسہ میں دارالمصنفین کے مختلف شعبوں کے مسائل و ضروریات پر غور و خوض ہوا اور اسکے معیار و وقار کو بلند کرنے پر زور دیا گیا، بعض نئی عمارتوں کی تعمیر کا مسئلہ بھی پیش ہوا، اگر حالات مساعد رہے تو اسے جلد ہی شروع کر دیا جائیگا، سر دست دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی منظوری سے اسکی مسجد کی توسیع کا کام متوکلاً علی اللہ شروع کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل فرمائے۔

مجلس انتظامیہ کے صدر محترم پرنس مفخم جاہ بہادر بالقابہ کے تشریف نہ لانے کی بنا پر اسکا جلسہ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں ۸ اگست کو ہوا جس میں مذکورہ بالا ارکان کے علاوہ مجلس انتظامی کے ارکان میں مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال) اور مرزا امتیاز احمد بیگ ایڈوکیٹ (اعظم گڑھ) نے شرکت فرمائی، خصوصی مدعو کی حیثیت سے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور جناب عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین بھی شریک مجلس رہے، اس جلسہ میں دارالمصنفین کے علمی و انتظامی شعبوں کی رپورٹ ان کے ذمہ داروں نے پیش کی اور سالانہ بجٹ اور مجلس عاملہ کی تجویزیں پیش کی گئیں، جو بحث و تمحیص کے بعد منظور کر لی گئیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں انگریزی اور اردو کتابوں کا اضافہ تو بتدریج ہو رہا ہے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے گذشتہ کئی برسوں سے عربی کتابوں کا اضافہ خاطر خواہ نہیں ہو سکا جس پر صدر محترم نے بجا طور پر تشویش ظاہر کی اور اسکے حصول کے لیے بعض قیمتی اور مفید مشورے دیے۔

معارف پریس میں طباعت کا کام ابھی تک لیتھو پر ہو رہا ہے لیکن اب اچھے کاتب اور پلیٹ بنانے والے نہیں ملتے، اس لیے طباعت کی رفتار اور معیار میں روز بروز فرق آتا جارہا ہے علاوہ ازیں دارالمصنفین کی بعض مطبوعات عرصہ سے ختم ہوگئی ہیں جن کی مانگ برابر جاری ہے، اسکی اور خراب طباعت کی وجہ سے دارالمصنفین کی تجارت بھی متاثر ہوگئی ہے جس پر اس کا اصل انحصار ہے، مزید ستم یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ کتابوں کو بعض خود غرض ناشرین شایع کرکے اسے نقصان پہنچارہے ہیں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے کمپیوٹر سے کمپوزنگ کرکے طباعت کرانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن دارالمصنفین کے لیے فوری طور پر اس کے سلسلے میں ہونے والے مصارف کا متحمل ہونا بہت دشوار ہے، اس لیے طے پایا کہ فی الحال باہر سے کمپوزنگ کراکے طباعت کا کام موجودہ پریس ہی سے لیا جائے تاکہ دارالمصنفین کی نئی اور پرانی مطبوعات جلد طبع ہوسکیں۔ گذشتہ سال دارالمصنفین نے مشاہیر کے خطوط، سفرنامہ افغانستان اور الاسلام والمستشرقون (عربی) شایع کی تھیں اور اب الفاروق کا عکسی اڈیشن بھی عنقریب تیار ہوجائے گا، یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی اور اسے غیر قانونی طور پر لوگ چھاپ رہے تھے۔

دارالمصنفین کے بعض ارکان کے وفات پاجانے کی وجہ سے ان کی خالی جگہوں کے لیے مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کا انتخاب عمل میں آیا ہے، اول الذکر کا وطن اعظم گڈھ ہے، یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے محبوب شاگرد اور خاص مسترشد ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ہندوستان کے دوسرے مدارس میں حدیث کا درس دینے کے بعد اب العین یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر ہیں، اپنے خاص موضوع پر انھوں نے محققانہ کتابیں تالیف کی ہیں، ابتدا ہی سے دارالمصنفین سے ان کو بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور اس کو فائدے بھی پہنچاتے رہے

ہیں۔ مولانا معصومی اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب کے مشہور فاضل ہیں، پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاذ پھر اس کے پرنسپل رہے، برہان اور معارف ان کے بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین سے متمتع ہوتے رہے ہیں، دارالمصنفین اور علامہ شبلیؒ سے ان کو بڑا لگاؤ ہے، گذشتہ سال شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں علامہ شبلیؒ پر اپنا فاضلانہ خطبہ دینے کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائے تو دارالمصنفین میں قیام فرما کر اسے رونق بخشی۔

دارالمصنفین کے جلسوں سے فراغت کے بعد راقم الحروف کو ۹؍اگست کو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مجلس عاملہ اور ۱۰؍اگست کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں شرکت کی سعادت بھی میسر آئی، مجلس کے جلسہ میں اس کے سکریٹری مولانا سید محمد رابع ندوی نے ضابطہ کی کارروائی کے بعد اس کی کتابوں کی اشاعت و فروخت کے مسائل کی جانب توجہ دلائی جس پر ارکان نے ہمدردی اور دلسوزی سے غور کیا، دارالعلوم کے جلسۂ انتظامیہ میں بھی ضابطہ کی ضروری کارروائی ہوئی اور اس کے گرامی مرتبت ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی رپورٹ پیش کی جو اس اعتبار سے بڑی فکر انگیز تھی کہ اس میں ہندوستان اور دنیا کے مسلمانوں کو درپیش خطرات اور عالم اسلام کی بیخ کنی کے امریکی و اسرائیلی منصوبوں اور سازشوں کی جانب توجہ دلائی گئی تھی، دراصل اس وقت مسلمانوں کو جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اسی کے مقابلہ کے لیے ندوۃ العلماء کی تحریک وجود میں آئی تھی جس کی قیادت و رہنمائی خوش قسمتی سے مولانا جیسا بیدار مغز شخص کر رہا ہے، جنھوں نے گوناگوں حیثیتوں سے ندوہ کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے، وہی اس نازک موڑ پر ہندوستان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی بھی کر سکتے ہیں۔

مقالات

سیرت نگاران نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
(بنو اُمیہ اور بنو عباس کے عہد میں)

از

جناب شیخ نذیر حسین صاحب، لاہور

معاصر ترک فاضل استاد فواد محمد سیزگین نے اپنی جلیل القدر تصنیف "تاریخ التراث العربی" کی جلد دوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں (بعہد بنو امیہ اور بنو عباس) پر ایک علٰحدہ باب باندھا ہے، جس میں بعض نئی معلومات آگئی ہیں جن سے سیرت النبیؐ پر اردو کی عام کتابیں خالی ہیں، چنانچہ اس باب کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ مطبوعہ کتابوں کے قلمی نسخوں کی تفصیل اور متعلقہ کتاب خانوں کا بیان میں نے حذف کر دیا ہے۔ (نذیر حسین)

اموی عہد اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا رواج ہوا تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات کی جمع و ترتیب اور تدوین و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ متاخرین صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام نے حیات مبارکہ پر بہت سی جامع اور مفصل کتابیں کتاب المغازی کے نام سے لکھیں۔ یہ کتابیں کتب السیرت بھی کہلاتی تھیں۔ امام الزہری (المتوفی ۱۲۴ھ) سب سے پہلے نامور محدث ہیں جنہوں نے لفظ سیرت کو اس کے اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا۔ قرن اول میں بہت سے مولفین نے سیرتِ مطہرہ پر قلم اٹھایا۔ کتب المغازی میں مندرجہ اقتباسات کے

حوالے سے ہم مندرجۂ ذیل مولفین/مرتبین کا ذکر کریں گے۔

۱۔ سعید بن سعد بن عُبادۃ الخزرجی

بشتر مورخین سعید بن سعد کو ان کے باپ کی طرح صحابی سمجھتے ہیں۔ ان کے والد زمانۂ جاہلیت میں تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے الکامل کہلاتے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق حضرت سعیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ حیات میں پیدا ہوئے، لیکن شرف ملاقات سے مشرف نہ ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعید نے اوائل عمر ہی سے آپ کی زندگی کے واقعات لکھنے شروع کر دیے تھے اور اپنے باپ کے طرز تحریر سے کچھ اختلاف بھی کیا تھا۔ ان کی کتاب اوائل عہد عباسی تک انکے پوتے سعید بن عمرو کے پاس محفوظ تھی (ابن حجر: التہذیب، ۴/ ۶۹) اس کتاب کے بعض حصے مسند احمد بن حنبل (۵/ ۲۲۲) اور مسند ابی عوانہ میں پائے جاتے ہیں (الاصابہ ۲/ ۱۲۲۳)۔ ابو عوانہ سعد بن سعید بن ابو عُبادہ کا اکثر حوالہ دیتے ہیں۔ تاریخ الطبری میں بھی بعض عبارتیں منقول ہیں (۱/ ۱۱۱ - ۱۱۲) ہمیں حضرت سعیدؓ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت سعید کے بیٹے شرحبیل نے سنو برس کی عمر میں ۱۲۳ھ/ ۷۴۰ء میں وفات پائی۔ وہ المغازی کے مولف تھے، انکے حالات کے مآخذ یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/ ۸۰ - ۸۱، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن جبیر (المحبر، ص ۲۲۴، ۲۳۴، ۲۴۳؛ (۳) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۱۳۲) (۴) ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل ۲/ ۱/ ۴/ ۲۴ - ۲۵)

۲۔ سہل بن ابی حثمہ

سہل بن ابی حثمہ، مدنی اور انصاری تھے۔ ان کا لقب ابویحییٰ یا ابومحمد تھا۔ وہ ۳ھ/ ۶۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوائل شباب ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات اور ان کی مغازی کی تدوین و تالیف میں مصروف ہوگئے تھے۔ ان کی مغازی کی بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پوتے یا پڑپوتے، محمد ابن یحییٰ بن سہل کے پاس ان کی مغازی کا نسخہ تھا۔ ان میں سے بعض ٹکڑے الواقدی کی المغازی میں ملتے ہیں (دیکھیے المغازی، ص ۹۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۰۷) الواقدی کے علاوہ یہ اقتباسات البلاذری (انساب الاشراف، ۱/ ۵۰۹) تاریخ الطبری ۱/ ۱۲۶۴، ۱۶۰۹، ۱۷۵۷، ۱۷۸۲-۱۷۹۳ اور طبقات ابن سعد ۱/ ۳۳۲، ۴۸۹، ۴۹۰، ۵۰۲ اور ۳/ ۲۱۲، مطبوعہ بیروت میں ملتے ہیں۔ سہل بن ابی حثمہ نے حضرت امیر معاویہؓ کے عہد امارت میں ۴۱ھ/ ۶۲۱ء میں وفات پائی، ان سے ان کے بیٹے محمد، بھانجے محمد بن سلیمان، بشیر بن یسار الانصاری، نافع بن جبیر بن مطعم و عروہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ الزہری کو ان سے براہ راست روایت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ حالات کے مصادر اور آثار علیہ ملاحظہ ہوں:

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۱۰۰۲؛ (۲) ابن حجر (الاصابہ، ۲/ ۲۷۶؛ (۳) ابن حجر (التہذیب، ۴/ ۲۴۸-۲۴۹) ان کی احادیث مسند احمد، ۳/ ۴۴۸ و ۴/ ۲-۳ میں ملتی ہیں۔

۳۔ سعید بن المسیب

ابومحمد سعید بن المسیب بن حزن المخزومی ۱۳ھ/ ۶۳۴ء میں پیدا ہوئے، وہ ماہر انساب، مورخ، محدث اور فقیہ تھے اور حضرت عمر فاروقؓ کی فقہ پر اعتماد کرتے

ہوئے فتاویٰ دیا کرتے تھے، اس لیے ان کو حضرت عمرؓ کا راوی کہا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں الزہری، قتادہ، حضرت عمرؓ کے پوتے محمد بن عبداللہ اور سالم وغیرہ شامل ہیں، حضرت سعید نے ۹۴ھ/۷۱۳ء میں وفات پائی، حالات کے ماخذ درج ذیل ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات ۱۱۹/۵ - ۱۴۳، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۵۹ - ۶۱) (۳) ابن حجر (التہذیب، ۸۴/۴ - ۸۸) (۴) الزرکلی (الاعلام، ۱۵۵/۳)

آثار علمیہ: الطبری نے حضرت سعید کی مغازی اور الفتوح اور سیرت نبویؐ سے بہت استفادہ کیا ہے۔

۴۔ عبیداللہ بن کعب

ابو فضالہ عبیداللہ بن کعب بن مالک الانصاری متقدمین تابعین میں سے ہیں۔ ہمیں ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ انھوں نے ۹۷ھ/۷۱۵ء میں انتقال کیا۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جبکہ خود ان سے امام زہری اور ان کے بھائی معبد وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ اکابر علمائے انصار سے ہیں اور بعض نامور مؤلفین مغازی ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ تاریخ الطبری میں ان کے جو اقتباسات ملتے ہیں (۱/۱۳۶۴، ۱۴۶۳، ۱۴۷۹، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰) ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبیداللہ بن کعب کی کتاب المغازی زیادہ ضخیم نہ تھی۔ الطبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے عبیداللہ بن کعب کی کتاب المغازی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ حالات کے مصادر یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۲۰۱/۵، مطبوعہ لائیڈن (۲) ابن ابی حاتم: الجرح

والتعدیل، ۴/۲/۱ ۳۳۱-۳۳۲؛ (۳) ابن حجر: التہذیب، ۴۴/۷-۴۵؛ (۴) ابن حجر: تقریب التہذیب، ۱/ ۵۳۸)

۵۔ الشعبی

ابو عمرو عامر بن شرحبیل الشعبی ۱۹ھ/ ۶۴۰ء میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ عبدالملک بن مروان کے ہم نشینوں سے تھے، محدث، فقیہ، مغازی کے عالم اور شعر و سخن کے واقف کار اور راوی تھے۔ عبدالملک بن مروان نے انہیں سفیر بنا کر قیصر روم کے پاس بھیجا تھا اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے انہیں قاضی بھی مقرر کیا تھا۔ انھوں نے ۱۰۳ھ/ ۷۲۱ء میں وفات پائی۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۶/ ۱۷۱-۱۷۸، مطبوعہ بیروت (۲) ابن قتیبہ: المعارف، ص ۲۲۹) (۳) خطیب بغدادی: تاریخ بغداد، ۱۲/ ۲۲۷-۲۳۳) (۴) ابن خلکان: وفیات الاعیان ۱/ ۳۰۶-۳۰۷) (۵) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ص ۷۹-۸۸) (۶) ابن حجر: التہذیب، ۵/ ۶۵-۶۶؛ (۷) الزرکلی: الاعلام، ۴/ ۱۸-۱۹) (۸) الکحالہ: معجم المولفین، ۵/ ۴۵)

مندرجۂ ذیل کتب حوالہ میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب المغازی (دیکھئے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ۱۲/ ۲۳۰۔

(۲) الفرائض والجراحات (حوالہ سابق، ص ۲۳۲)

(۳) الکفایۃ فی العبادۃ والطاعۃ (کحالہ کی مذکورہ بالا کتاب)

(۴) الشعبی نے فتوح الاسلامیہ پر بھی کتاب لکھی تھی، اس کتاب کو امام قتیبہ بن مسلم نے اپنی یادداشت سے املا کرایا تھا۔ اس کی بعض عبارتیں تاریخ الطبری میں مذکور ہیں۔

۵۔ کتاب الشوریٰ و مقتل عثمانؓ۔

۶۔ اُبَان بن عثمانؓ بن عفّان

جنگ جمل میں یہ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ تھے (۳۶ھ/۶۵۶ء) جبکہ ان کی عمر ۱۶ برس تھی۔ انھوں نے سیاسی معاملات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ۷۵ھ میں یہ مدینہ منورہ کے والی مقرر ہوئے (ابن سعد: الطبقات، ۵/۱۱۳) لیکن عبدالملک نے انہیں ۸۳ھ میں معزول کر دیا (الطبری، ۲/۱۱۴۱) ان کی وفات کی مختلف تاریخیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۹۶ھ/۱۰۶ھ کے کسی درمیانی سال میں فوت ہوئے حضرت ابان بن عثمان کا شمار فقہائے مدینہ میں ہے (دیکھئے ابن حجر: التھذیب، ۱/۹۷) مغازی کی تمام قدیم کتابوں میں ان کی کتاب بھی قابل ذکر ہے (دیکھئے مقالہ یوسف ہارویتز در اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن ۱۹۲۷ - ۱۹۲۸ء) مغازی کے کسی مورخ ماسوائے الیعقوبی (۱/۳) نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہاں کتب حدیث میں انکی بہت سی روایات شامل ہیں۔

۷۔ عروہ بن الزبیر

عروہ بن الزبیر بن العوام الاسدی ۲۳ھ/۶۴۳ء اور ۲۹ھ/۶۴۹ء کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے نواسے اور حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کے بھائی تھے۔ شاید عمر میں تیس[۳۰] سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے جنگ جمل میں شرکت نہیں کی اور سات سال (۵۸ھ تا ۶۵ھ) مصر میں گزارے۔ جب امویوں نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کیا تو وہ اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ تھے لیکن انکی شکست کے بعد عبدالملک بن مروان کے پاس چلے گئے۔ ہشام بن عروہ بیان کرتے تھے کہ

ان کے باپ نے اپنی بہت سی فقہ کی کتابیں یوم الحرۃ (۶۳ھ) میں جلا دی تھیں، جنکا ان کو عمر بھر افسوس رہا (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۱۳۳/۵) حضرت عروہ کا شمار مدینہ کے سات ممتاز فقہاء میں ہے، انھوں نے ۹۴ھ میں وفات پائی، وہ محدث بھی تھے اور اپنے تلامذہ سے احادیث اور صدر اسلام کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ ابن اسحاق، الواقدی اور الطبری ان کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں وہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدیم ترین مصنف بھی ہیں اور سیرت النبیؐ کے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب اپنی جمع کردہ احادیث سے دیا کرتے تھے۔ امام سخاوی نے الاعلان میں لکھا ہے (ص ۸۸) کہ امام زہری اور ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل مغازی کے واقعات عروہ بن الزبیر کی زبانی بیان کیا کرتے تھے (دیکھئے ابن حجر: التہذیب، ۹/۳۰۷-۳۰۸) اور الاصابہ، ۲۵۵/۱) حالات کے مصادر درج ذیل ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۱۳۲/۵) (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۱۱۴ (۳) امام بخاری (تاریخ الکبیر، ۳۱/۱/۴-۳۲ (۴) ابونعیم حلیۃ الاولیاء ۲/۱۷۶-۱۸۲) (۵) ابن خلکان (وفیات الاعیان، ۳۹۸/۱-۴۰۰، مطبوعہ بولاق) (۶) ابن حجر: (التہذیب، ۱۸۰/۷-۱۸۵) (۷) مقدمہ زخاؤ، در طبقات ابن سعد) (۸) الزرکلی: الاعلام، ۱۷/۵) (۹) ولہاوزن اور یوسف ہارویز کے مقالات' در اسلامک کلچر حیدرآباد دکن۔

آثار علمیہ:۔ یوسف ہارویز اور عبدالعزیز الدوری نے مندرجہ بالا مقالات میں عروہ بن الزبیر کی مغازی کی بعض عبارتیں جمع کردی ہیں۔ امام مسلم نے عروہ بن الزبیر کی احادیث کے رجال پر ایک رسالہ لکھا تھا، جس کے بچپن اوراق خطیب بغدادی

کے لکھے ہوئے کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں۔ ان کے مکاتیب بنام عبدالملک بن مروان کے لیے دیکھئے تاریخ الطبری ۱/۱۱۸۱/۱-۱۲۸۴-۱۲۸۸) ان مکاتیب کو سپرنگر نے جرمن زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔

۸۔ شرحبیل بن سعید

سیرت و مغازی کے قدیم مصنفین سے ہیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے متعارف تھے (ابن حجر، التہذیب، ۴/۳۲۲) کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سو برس کی عمر پا کر ۱۲۳ھ میں وفات پائی۔ موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ/۷۵۸ء) کا بیان ہے کہ حضرت شرحبیل نے غزوۂ بدر میں شریک ہونے والی مہاجرین کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی۔ سفیان بن عیینہ نے ان کو مغازی کے جلیل القدر عالموں میں شمار کیا ہے (ابن حجر، التہذیب، ۴/۳۲۱) اگرچہ ابن اسحاق اور واقدی نے ان سے کوئی روایت نہیں کی لیکن ابن سعد نے طبقات، ۱/۱/۱۶۰، مطبوعہ لائیڈن میں ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بارے میں ان سے ایک روایت درج کی ہے (دیکھئے یوسف ہارویز کا مقالہ در اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۷ء) حالات کے مصادر کے لیے دیکھیں:

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۳۳۸-۳۳۹) (۲) یاقوت (معجم البلدان، ۱/۲۶۹ (۳) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ عندالعرب، ص ۲۲)

۹۔ القاسم بن محمد

ابو محمد، القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ۳۷ھ/۶۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وہ عروہ کی طرح اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ الشعبی اور الزہری انکے راویوں سے ہیں۔ آخر عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی۔ انھوں نے ۱۰۷ھ/۷۲۵ء

میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/۱۸۷-۱۹۴، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/۲/۱۱۸) (۳) ابونعیم (حلیۃ الاولیاء، ۲/۱۸۲) (۴) العسکری (نکت الہمیان، ص ۲۲۰) (۵) (۶) ابن حجر (التہذیب، ۸/۳۲۳-۳۳۵) (۷) ابن حجر (تقریب التہذیب، ۲/۲۲۱) (۸) الزرکلی (الاعلام، ۶/۱۵)

تصانیف: (۱) الطبری نے قاسم بن محمد کی کتاب سے بہت سی عبارتیں اپنی تاریخ میں دی ہیں، دیکھیے تاریخ الطبری ۱/۱۵۱، ۱۵۳، ۱۷۴، ۵۰۰-۳۵-۵۲۸-

اس کے علاوہ فہرست تاریخ الطبری میں پچیس[۲۵] بار قاسم بن محمد کی کتاب المغازی کا حوالہ آیا ہے، ان میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد خلافت کے واقعات کے علاوہ جنگ جمل کا بھی ذکر ہے۔ یہ واقعات سہل بن یوسف السلمی کے واسطے سے قاسم بن محمد کی مغازی سے ماخوذ ہیں۔ بعض عبارتیں الواقدی اور البلاذری نے بھی نقل کی ہیں۔

۱۰۔ عاصم

عاصم بن عمر بن قتادۃ المدنی ابوعمر تابعی ہیں۔ انھوں نے بعض صحابہ مثلاً جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے جبکہ ان سے ان کے بیٹے الفضل، زید بن اسلم، ابوالاسود (عروہ کے پروردہ) اور محمد بن قاسم وغیرہ نے روایتیں کی ہیں۔ مغازی کے مشہور عالم تھے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ جامع دمشق میں لوگوں کو مغازی اور مناقبِ صحابہ کا درس دیا کریں۔ حضرت عاصم نے ۱۲۰ھ/۷۳۰ء میں وفات پائی۔ حالات کے آخذ کے لیے دیکھیے:

(۱) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۶) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/ ۳۴۶) (۳) القیسرانی (الرجال، ص ۳۸۳؛ (۴) ابن حجر (التہذیب، ۵/ ۵۳-۵۴) (۵) وہی مصنف (الاصابہ، ۳/ ۴۴۷) (۶) مقالہ یوسف ہاروینز، در مجلہ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، شمارہ ۲، ۱۹۲۸ء)

آثار علمیہ:- ابن اسحاق اور واقدی نے محمد بن صالح محمد بن دینار کے واسطے سے عاصم کی اکثر روایتیں نقل کی ہیں جبکہ ابن سعد نے یہ روایتیں واقدی سے لی ہیں۔ (الطبری کے اقتباسات کے لیے دیکھئے فہارس تاریخ الطبری، ص ۳۰۳)

۱۱- امام الزہری

ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہری۔ ۵۰ھ/ ۶۷۰ء یا ۵۱ یا ۵۶ -۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی سنہ میلاد کی تاریخیں مختلف ہیں۔ امام زہری محدث، مورخ اور شعر و سخن کے شناسا تھے۔ محدث کے طور پر ان کے دو علمی کارنامے ہیں۔

وہ سب سے پہلے محدث ہیں جنھوں نے احادیث میں اسناد کا التزام کیا۔ (دیکھئے مقدمہ ابن ابی حاتم، ص ۲۰) اس کے علاوہ انھوں نے احادیث کو مدون کیا (ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، ۱/ ۷۳)، اس لیے تاریخ الحدیث میں ان کا اہم مقام ہے۔ ان کے زمانے سے پہلے حدیث کا ذخیرہ یا تو اسناد سے خالی تھا یا زبانی روایات پر مشتمل تھا اور سارے عالم اسلام میں منتشر تھا۔ امام زہری کے زمانے میں صحابۂ کرام جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تھا اور اوائل تابعین کی روایت کردہ بہت سی احادیث زبانی یا منتشر تحریروں میں موجود تھیں انھوں نے رواۃ کے ناموں

سیت مدون کیا (دیکھیے راقم السطور کی کتاب ماخذ بخاری، ص ۲۰) اس کے علاوہ ایک اور اہم کارنامہ امام زہری نے سرانجام دیا۔ ان کے پاس بہت سے راویان یا مولفین حدیث اپنے کراسے یا نوشتے لے کر حاضر ہوتے کہ امام صاحب ان میں رواۃ کے نام لکھ دیں، لیکن مشاغل کے ہجوم میں ہر شخص کے مطالبے کو پورا کرنا مشکل تھا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھوں نے اپنے تمام تلامذہ کو مشورہ دے دیا کہ وہ حدیث کو کسی شیخ سے سماع اور قرأت کے بغیر بے تکلف روایت کرتے جائیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس طریقے کو الاجازہ والکتابۃ کہا جاتا ہے (خطیب بغدادی، الکفایۃ فی علم الروایۃ، ص ۳۱۸) گولڈ تسیہر کا یہ کہنا کہ امام زہری نے بنو امیہ کی سلطنت کے استحکام کے لیے یہ طریقہ نکالا، محض کم نظری اور غلط فہمی کی دلیل ہے [حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ ہشام نے امام زہری سے فرمایش کی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کے لیے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کر دیں]

مندرجۂ بالا واقعے کے ساتھ امام زہری کے اس قول کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا کہ ہم علم کو کتابت کی قید میں لانا ناپسند کرتے تھے، یہاں تک کہ امرا نے ہمیں کتابت پر مجبور کیا۔ میری رائے میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے، "احادیث کو کسی شیخ سے سماع یا قرأت کے بغیر لکھ لیا جائے تو یہ طریقہ ہمیں منظور نہ تھا، لیکن افادۂ عام کی غرض سے ہمیں امرا نے سماع یا قرأت کے بغیر کتابت پر مجبور کر دیا" (دیکھیے السیوطی: تقریب الراوی، ص ۱۴۶)

امام زہری کا دوسرا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے احادیث کو مدون کیا۔ گو امام زہری کے زمانے سے بہت پہلے حدیث کی تدوین کا آغاز ہو گیا تھا لیکن یہ تحریری

سرمایہ کراسوں کی شکل میں پایا جاتا تھا، انھوں نے ان تمام تحریروں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ امام زہری سے پیش رو ابوبکر بن حزم نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی فرمایش پر احادیث لکھ کر بھیجیں۔ امام زہری کے تلمیذ معمر کا بیان ہے کہ امویوں کے شاہی کتاب خانے میں امام زہری کی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں۔ الطبری نے لکھا ہے کہ الزہری مورخ، علم المغازی اور "اخبار قریش والانصار" کے اولین مصنف تھے۔ اس کے علاوہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام کے سوانح نگار بھی تھے (دیکھئے ذیل المذیل ص ۹۰؛ عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ص ۸۱) علاوہ ازیں وہ لفظ سیرت کے اصطلاحی مفہوم سے بھی شناسا تھے۔ حالات کے مآخذ درج ذیل ہیں:

(۱) البخاری (تاریخ الکبیر ۱/۱/ ۲۲۱)؛ وہی مصنف: تاریخ الصغیر، ص ۹۳، ۱۰۴، ۱۴۸ مطبوعہ الہ آباد؛ (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۹) (۳) المرزبانی (معجم الشعرا، ص ۴۱۳) (۴) ابونعیم (حلیۃ الاولیا، ۳/ ۳۶۰-۳۶۱) (۵) ابن اثیر (الکامل، ۷/ ۲۸۹) (۶) ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ، ۹/ ۳۴۰-۳۴۸) (۷) الذہبی (تاریخ الاسلام ۵/ ۳۴۰-۳۴۸) (۸) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ۲۰-۳۲) (۹) الزرکلی (الاعلام ۷/ ۳۱۷) (۱۰) زخاؤ کا تحقیقی مقدمہ بر طبقات ابن سعد، ج ۳/۱، ج ۱۳، ج ۱۹۔ مذکورہ کتب کے علاوہ زخاؤ، گولٹ تسیہر، یوسف ہارویز اور عبدالعزیز الدوری نے اسی موضوع پر مقالات لکھے ہیں۔

آثار علمیہ: ۱۔ المغازی: حاجی خلیفہ نے (کشف الظنون، ص ۱۷۴۷، مطبوعہ استانبول) میں لکھا ہے اور السخاوی کا یہ بھی قول ہے کہ امام زہری عروہ بن الزبیر کی مغازی کے راوی ہیں (اعلان بالتوبیخ، ص ۸۸) معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے

اس کتاب سے استفادہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے کیا ہے (دیکھئے صحیح البخاری، ۵/۸۶؛ علم التاریخ از عبدالعزیز الدوری، ص ۹۷) السخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کتاب المغازی کے راوی الحجاج بن ابی منیع (المتوفی ۲۱۶ھ/۸۳۱ء) ہیں، ملاحظہ ہو (ابن سعد۔ طبقات ۱۷۵/۷، مطبوعہ بیروت؛ امام بخاری (تاریخ الکبیر ۱/۲/۳۸۰) اس مغازی کے بعض اقتباسات تک ہماری رسائی عبدالعزیز الدوری کی سعی و کاوش کی مرہون منت ہے۔ اس کا مخطوطہ کتابخانہ الظاہریہ دمشق میں ہے۔

۲۔ نسب قریش: معلوم ہوتا ہے کہ مصعب الزبیری نے اپنی کتاب "نسب قریش" کا مدار امام زہری کی کتاب نسب قریش پر رکھا ہے (دیکھئے الزبیری کی نسب قریش، ص ۳، امام زہری کی کتاب سے اقتباسات (ابن حزم، الجمہرہ، ص ۱۵ اور ابن حجر، الاصابہ ۱۰/۱۰۲) میں بھی پائے جاتے ہیں۔

۳۔ اسنان الخلفاء: خلفائے اسلام کے سنہ وار حالات۔ تاریخ الطبری میں اس کے دو ٹکڑے ہیں (۲/۴۲۸)۔

۴۔ الناسخ والمنسوخ فی القرآن: اس کی تہذیب و ترتیب الحسین بن محمد اللّمی (المتوفی ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) نے کی تھی، مخطوطہ کتابخانہ بایزید (استانبول) میں ہے۔

۵۔ احادیث: ابو محمد الحسن بن علی بن محمد بن الحسن الجوہری (المتوفی ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء) کا روایت کردہ قلمی نسخہ جرمنی میں ہے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں۔

۶۔ تنزیل القرآن، صلاح الدین المنجد کی تحقیق اور تعلیق سے بیروت سے ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا تھا۔

۷۔ مشاہد النبی۔ اس کے راوی یونس بن یزید الابلی (المتوفی ۱۵۹ھ/۷۷۰ء) ہیں۔ (امام بخاری؛ تاریخ الکبیر، ۴/۲/۴۰۶) الطبری نے اپنی تاریخ میں اس کے چند اقتباسات بھی دیے ہیں۔

۸۔ امام زہری کے چار اشعار خلیفہ عبدالملک بن مروان کی تعریف میں ملتے ہیں۔ (المرزبانی؛ معجم الشعراء، ص ۴۱۳)

۱۲۔ السبیعی

ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی الہمدانی ۳۲ھ/۶۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں فوت ہوئے، عمر بھر کوفہ میں رہے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۸ صحابیوں سے حدیث کا سماع کیا تھا۔ مغازی کے بڑے عالم تھے (دیکھئے فتوح مصر از واقدی) حالات کے مآخذ کے لیے دیکھیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۶/۳۱۳، ص ۱۷۸، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن قتیبہ: (المعارف، ص ۲۲۹) (۳) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/۲۴۳، ۲، (۴) الذہبی (تذکرۃ الحفاظ، ص ۱۱۴-۱۱۶) (۵) ابن حجر (التہذیب، ۸/۶۳-۶۷) (۶) وہی مصنف: تقریب التہذیب، ۲/۷۳؛ (۷) الزرکلی، الاعلام، ۵/۲۵۱)

آثار علمیہ: تاریخ الطبری میں مندرجہ بعض قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ الطبری نے السبیعی کی کتب مغازی اور فتوحات سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور واقدی نے بھی ان کی بہت سی عبارتیں دی ہیں (دیکھئے ابن قتیبہ: المعارف، ص ۹۱، ۱۰۶)

۱۳۔ یعقوب بن عتبہ

یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ الثقفی المدنی امام زہری کے معاصر تھے۔ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقف کار تھے۔ انھوں نے ۱۲۸ھ/۷۴۵ء میں وفات پائی۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں:

(۱) ابن حجر (التھذیب' ۱۱/ ۳۹۲) (۲) الذہبی: تراجم رجال جن سے محمد بن اسحاق نے روایت کی، ص ۸۷-۸۸، تحقیق فیشر)

علمی آثار: تاریخ الطبری میں یعقوب بن عتبہ کی السیرۃ کے بہت سے اقتباسات ہیں (فہارس تاریخ الطبری، ص ۶۴۷)۔ معلوم ہوتا ہے کہ الطبری نے یہ اقتباسات یعقوب کے حوالے سے ابن اسحٰق سے نقل کیے ہیں۔ ان کے حوالے سے دو مزید ٹکڑے کتاب الواقدی سے ماخوذ ہیں (الطبری ۱/ ۲۵۲۹-۲۸۹۴)

۱۴۔ عبد اللہ بن ابی بکر

عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم المدنی ۵۶ھ یا ۶۰ھ/ ۶۷۹ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، جو مورخ، فقیہ اور محدث تھے۔ ان سے حضرت امام مالک، ابن جریج اور ہشام بن عروہ وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ عبد اللہ بھی اپنے باپ کی طرح مورخ اور محدث تھے، لیکن انکی زندگی میں زیادہ شہرت نہ حاصل کر سکے۔ ابن اسحاق، الواقدی، ابن سعد اور الطبری وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبد اللہ کتاب المغازی کے مولف تھے معلوم ہوتا ہے کہ انکے بھانجے عبد الملک بن محمد القاضی (المتوفی ۱۷۶ھ/ ۶۹۲ء) ان کے راوی تھے۔ شاید عبد الملک نے بھی کتاب المغازی تالیف کی تھی (ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۲۶)، عبد اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض مکاتیب کی بھی روایت کرتے تھے جو آپؐ نے اپنے معاصرین کو بھجوائے تھے۔ ان میں ایک مکتوب گرامی

فرماں رواہان حمیر کے نام بھی تھا (الطبری، ۱/ ۱۷۱۷-۱۷۲۰)۔ عبداللہ نے ۱۳۴ھ/ ۷۵۲ء یا ۱۳۵ھ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں۔

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۷/ ۶۸، مطبوعہ بیروت) (۲) البخاری (تاریخ الکبیر ۳/ ۵۴۱) (۳) ابن حجر (التہذیب، ۵/ ۱۶۴-۱۶۵)

۱۵- یزید بن رومانؒ

یزید بن رومان الاسدی المدنی، ابو روح، آل الزبیر بن العوام کے موالی سے تھے۔ ان کا شمار متاخر تابعین میں سے ہے، اگرچہ انھوں نے صحابۂ کرام سے روایت نہیں کی۔ وہ محدث اور مغازی کے مولف تھے۔ ان کی روایات کا مدار عروہ اور الزہری کے اقوال ہیں لیکن خود ان سے محمد بن اسحاق اور حضرت مالک بن انس اور ہشام بن عروہ وغیرہم روایت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن رومان کی کتاب المغازی محمد بن صالح بن دینار (المتوفی ۱۶۸ھ/ ۷۸۴ء) کی روایت سے الواقدی کی دسترس میں تھی (ابن حجر (التہذیب، ۹/ ۲۲۵-۲۲۶) طبقات ابن سعد میں بھی اسکے اقتباسات ملتے ہیں۔ انھوں نے ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء میں وفات پائی۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں۔

(۱) القیسرانی (الرجال، ص ۵۷۳) (۲) ابن الجزری (غایۃ النہایۃ ۲/ ۳۸۱) (۳) الذہبی (تاریخ الاسلام، ۵/ ۱۸) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۱۱/ ۳۲۵) (۵) الزرکلی (الاعلام، ۹/ ۲۳۴)

علمی آثار: الطبری نے ابن سعد، الواقدی اور ابن اسحاق کے حوالے سے یزید بن رومان کی المغازی کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں (فہارس تاریخ الطبری، ص ۶۴۱)

۱۶- ابوالاسود

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل بن الاسود الاسدی نے عروہ بن الزبیر کے دامن شفقت میں تربیت پائی تھی۔ وہ تابعی ہیں اور عروہ بن الزبیر ان کے سب سے بڑے شیخ (استاد حدیث) ہیں۔ خود ان سے الزہری، عبیداللہ بن ابی جعفر (مورخ مصر) عبداللہ بن لہیعہ، شعبہ اور اللیث وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، اہل علم کے نزدیک ابوالاسود کی روایات قابل وثوق ہیں۔ ابن حجر نے الاصابہ میں انکی کتاب المغازی کے جو مقطوعات دیے ہیں، ان سے ابوالاسود کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ ان کا منبع و ماخذ عروہ بن الزبیر کے اقوال ہیں۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں۔

(۱) ابن ابی حاتم، مقدمہ، ص ۱۲۰، (۲) ابن حجر (التہذیب، ۹/۳۰۷-۳۰۸)

تالیفات: ابوالاسود کی کتاب المغازی سے منتخبات البلاذری کی کتاب انساب الاشراف، ۱/۱۱۲-۱۵۱، الطبری، ابن حجر کی الاصابہ (بے شمار مقامات) اور ابن سعد (الطبقات، ۱/۲۱۳، ۲۱۵، ۳/۱۳۶، ۱۶۴، مطبوعہ بیروت) میں ہیں۔

۱۷۔ داؤد بن الحصین

ابوسلیمان داؤد بن الحصین الاموی، عکرمہ اور نافع وغیرہم کے شاگرد اور امام مالکؒ اور ابن اسحاق کے شیخ تھے۔ اپنے استاد عکرمہ کی طرح خوارج کی طرف مائل تھے۔ بعض محدثین نے ان کی روایات کی تضعیف کی ہے اور بعض نے ان کی توثیق کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے حالات جمع کرنے کا ہی اہتمام کیا تھا۔ انھوں نے ۱۳۵ھ/۷۵۲ء میں رحلت کی، حالات کے ماخذ کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۴) (۲) ابن ابی حاتم (علل الحدیث، ۱/۳۸۰)
(۳) القیسرانی (الرجال، ۱/۱۲۹) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۳/۱۸۱-۱۸۲)

آثار علمیہ: عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری (المتوفی ۲۰۰ھ/۸۱۵ء) نے ابو سلیمان کی کتاب جہاں کی خود نوشتہ تھی سے استفادہ کیا تھا (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۴۹/۳، مطبوعہ بیروت) مزید براں الواقدی، ابن سعد اور البلاذری وغیرہم نے داؤد بن الحصین کی مغازی سے بہت سے مندرجات نقل کیے ہیں۔

۱۸۔ ابو المعتمر

ابو المعتمر سلیمان بن طرخان التیمی، ۴۶ھ/۶۶۶ء میں پیدا ہوئے، حضرت انس بن مالک کے علاوہ بہت سے قدیم تابعین، مثل الحسن البصری وغیرہم سے حدیث کی روایت کی۔ ان کی دقیقہ رسی کی وجہ سے اہل علم ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، انھوں نے ۱۴۳ھ/۷۶۰ء میں بصرہ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں: (۱) ابن سعد (الطبقات، ۷/ ۲۵۲ - ۲۵۳، مطبوعہ بیروت)، البخاری (تاریخ الکبیر ۲/۱/ ۲۲-۲۳) (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۴۰) (۳) ابن ابی حاتم: (الجرح والتعدیل، ۲/۱/ ۱۲۴ - ۱۲۵) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۴/ ۲۰۱ - ۲۰۲) (۵) السخاوی (الاعلان بالتوبیخ، ص ۸۸)

تصانیف: کتاب المغازی۔ خطیب بغدادی نے دمشق میں ان کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی (مشیخۃ للخطیب بغدادی، در کتاب خانہ الظاہریہ، دمشق) تاریخ الطبری میں اس کے دو بڑے اقتباسات ہیں، ۱/ ۲۹۶۳، ۲۹۴۵ وغیرہ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں خصوصاً جلد پنجم میں اس کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

۱۹۔ موسیٰ ابن عقبہ

ابو محمد موسیٰ بن عقبہ کی تاریخ پیدائش کا ہمیں علم نہیں۔ طبقات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ نوجوان ہی تھے جبکہ انھوں نے ۶۸ھ/۶۸۷ء میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا اور وہ حج کرنے مکہ معظمہ جا رہے تھے (ابن حجر (التھذیب، ۱۰/ ۳۶۲، تاریخ الطبری، ۲/ ۲۸۲) ہمارے اندازے کے مطابق ان کی زیادہ سے زیادہ تاریخ پیدائش ۵۵ھ متعین ہو سکتی ہے۔ موسیٰ بن عقبہ امام زہری کے شاگرد رشید تھے۔ مسجد نبویؐ میں ان کا حلقۂ درس تھا جہاں وہ روایات کا اجازہ عطا فرمایا کرتے تھے۔ مورخ کی حیثیت سے ان کی تمام تر توجہ کا مرکز مغازی رسولؐ اور خلفائے راشدین تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مہاجرین حبشہ اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والوں کے اسمائے گرامی بھی ضبط کئے تھے۔ انہوں نے چند سوانح پر امویوں کا بھی ذکر کیا ہے (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۵/ ۲۸۳) موسیٰ بن عقبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنہ وار تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں، ان کے بہت سے پیش رو جن میں عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (المتوفی ۱۲۰ھ/ ۷۳۷ء) بھی شامل ہیں سنین کا التزام کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ میں اشعار سے شاذ و نادر استشہاد کرتے ہیں۔ انھوں نے ۱۴۱ھ میں انتقال کیا۔ حالات کے ماخذ درج ذیل ہیں:

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۴/ ۲/ ۱۵۵) (۲) الذہبی (طبقات الحفاظ، ص ۱۴۸) (۳) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ص ۲۷) (۴) الزرکلی (الاعلام، ۸/ ۲۷۶)، (۵) الکحالہ (معجم المولفین، ۱۳/ ۴۳)

تالیفات: امام مالک نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی پر سخت جرح کی ہے۔ (ابن حجر: التھذیب، ۱۰/ ۳۶۰) ان کی مغازی کی بنیاد امام زہری کی کتاب المغازی

کی روایات پر ہے، جن کو وہ مختلف الفاظ سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تحریری ذخیرہ سے بھی استفادہ کیا تھا جو کریب مولیٰ ابن عباس نے موسیٰ بن عقبہ کی امانت میں دے دیا تھا اور یہ کتابی ذخیرہ کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھا (طبقات ابن سعد، ۵/۲۱۶)
موسیٰ بن عقبہ کی اصل کتاب تو ضایع ہو چکی ہے، اس کا ایک ٹکڑا برلن میں تھا، جس کا جرمن ترجمہ زخاؤ نے شایع کیا ہے۔ یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) نے اس کا اختصار کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر کے نام سے کیا تھا (جو چھپ گیا ہے) حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی سے بے شمار اقتباسات الاصابہ میں دیے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک ٹکڑا جناب مصطفی الاعظمی نے بیروت سے شایع کیا ہے۔ (باقی)

حضرت شیخ احمد کھتوی سرکھیجی

از مولانا محمد یوسف متالا، لندن

شیخ احمد کھتوی شیخ اسحاق مغربی کے خلیفہ تھے جو حضرت شیخ ابو مدین مغربی کے فیض یافتہ تھے، صاحب تحفۃ المجالس کا بیان ہے کہ حضرت شیخ اسحاق مغربی اپنے پیر شیخ ابو مدین مغربی کی وفات کے بعد ان کے اشارے سے ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ سلطان فیروز شاہ کے زمانہ میں اجمیر آئے اور حضرت خواجہ اجمیری کے مزار پُرانوار پر ایک عرصہ تک قیام فرمایا۔ ایک رات حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے خواب میں ارشاد فرمایا کہ ناگور کے علاقہ میں قصبہ کھتو یا کھاتو میں جا کر کام کریں۔

خطہ پاک اوچ نامی کتاب میں ہے کہ وہ شیخ معین الدین اجمیری کے معاصر ہیں۔ ان کو حضرت اجمیریؒ نے کھتو یا کھاتو بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منامی ارشاد نہیں بلکہ بیداری کا واقعہ ہے، بہرحال وہ کھتو یا کھاتو میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور خلقِ خدا کو روحانیت سے مالا مال کرتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ سلطان فیروز شاہ بھی نیازمندانہ خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو دیکھ کر مخلوق کا رجوع ان کی جانب اور زیادہ بڑھ گیا سنہ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء/سنہ۸۴۳ھ/۱۴۴۰ء میں وفات پائی۔

شیخ اسحاق پیر روشن دل — آنکہ در خلق ذات او طاق است
رکن رقم سال رحلتش سرود — آنکہ مشہور جملہ آفاق است

مہدی متقی امین اللہ نیز سردار عالم اسحاق است

شیخ کھتو کا نام احمد بن عبداللہ اور لقب گنج بخش تھا، جمال الدین، شہاب الدین اور گنج گیسر بھی لقب تھا۔ جہانگیر اپنی توزک میں گجرات کے سفر کے سلسلے میں کھتو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چونکہ شیخ احمد کھٹو کا مزار سرراہ ہے واقع تھا اس لیے وہاں فاتحہ پڑھنے گیا کھٹو سرکار ناگپور میں واقع ایک قصبہ کا نام ہے شیخ کی ولادت یہیں ہوئی تھی۔"

لیکن در اصل شیخ کے مولد کے بارے میں جہانگیر کو سہو ہوا ہے۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی جیسا کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے۔ وہ ۷۳۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہاں کے بزرگوں میں تھے۔ بابا اسحاق مغربی کے مرید و خلیفہ تھے، ان کا نام نصیر الدین تھا۔ بحر التواریخ میں بھی ۷۳۷ھ میں دہلی میں متولد ہونے کی صراحت موجود ہے۔ مگر حکمت الہیٰ نے انہیں کھتو پہنچا دیا اور کھتوی سرزمین کی نسبتوں سے مشہور ہوئے۔

جودھپور کے ضلع ناگور میں کھاٹو نام کے دو موضع ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر ہیں۔ دونوں میں امتیاز کرنے کی خاطر مشرقی قصبے کو چھوٹی کھاٹو اور مغربی کو بڑی کھاٹو کہتے ہیں، کھاٹو جدید تلفظ ہے۔ قدیم صورت کھٹو ہے۔ تمام پرانی کتابوں، فرامین اور کتبوں میں یہ نام بہ صورت "کھٹو" ملتا ہے۔ بڑی کھاٹو کسی زمانے میں نہایت اہم جگہ رہی ہے، جہاں بہت سی مساجد، مزارات اور دوسرے پرانے آثار موجود ہیں۔ ان میں سب سے قدیم سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ) کے دور کی ایک مسجد ہے۔ اسی عہد کا ایک کتبہ بھی موجود ہے۔ سنگ مرمر کے اس

کتبے پر جو عربی میں کندہ ہے، رمضان ۶۲۹ھ تاریخ دی گئی ہے۔ کتبے کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا میں التمش کے عہد میں کسی تالاب پر نصب کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں پانی کی قلت کے سبب سے برسات کا پانی بڑے بڑے تالابوں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ جو سال بھر استعمال ہوتا ہے۔ آج کل یہ کتبہ حضرت اسحاق مغربی (متوفی ۷۶۳ھ) کی درگاہ میں موجود ہے۔ جو شیخ احمد کھٹو کے پیر و مرشد تھے اور جن کا مزار سرکھیج (گجرات) میں واقع ہے۔

افسوس ہے کہ شیخ کے حالات بہت کم ملتے ہیں، سب سے قدیم کتاب مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول ہے جو نویں صدی ہجری کے وسط کی تالیف ہے۔ یہ انکے کسی معتقد محمد قاسم نامی کی تصنیف ہے۔ اس کا قلمی نسخہ احمد آباد میں حسینی پیر کے کتب خانے میں موجود ہے[1]۔ اس کی اور بعض دوسری کتابوں کی مدد سے جو کچھ حالات دستیاب ہوئے ہیں انہیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

بابا اسحاق کی خدمت میں شیخ احمد کی رسائی

بچپن میں بابا اسحاق سے شیخ احمد کے متوسل ہونے کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد دہلی کے باشندے تھے اور ان کا بچپن دہیں گزرا۔ ایک بار دہلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ سخت طوفان اور آندھی آئی جو ان کو وہاں سے کسی اور طرف لے گئی۔ چنانچہ مسافروں کی طرح بے یار و مددگار ہو گئے اور کسمپرسی کی حالت میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گذارا کرتے تھے۔ ایک دن بابا اسحاق مغربی سے ملاقات ہوئی جو اس وقت کے بڑے کامل درویش تھے وہ انہیں اپنی قیام گاہ کھٹو میں لے آئے جو اجمیر کے قریب ایک گاؤں ہے۔ اس طرح بابا اسحاق مغربی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔

---

[1] مقدمہ مقالات شیرانی ج ۱ ص ۱۸ و ۱۹۔

دوسری روایت صاحب معارج الولایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شیخ احمد کھتو کے پیر و مرشد بابا اسحاق میرٹھ کی طرف آئے دریائے جون (جمنا) کے کنارے ایک توت کے درخت کے نیچے چند روز یاد خداوندی میں گزارے اور وہاں سے کھتو نامی موضع میں آکر مقیم ہو گئے انہی دنوں دہلی میں زبردست طوفان آیا۔ تمام ماحول میں اندھیرا چھا گیا۔ دہلی کا ایک بچہ جسے اس کی دایہ گھر سے باہر لائی تھی تاریکی میں گم ہو گیا اور ایک ایسے مقام پر جا پہنچا جہاں ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح قافلے والوں نے ایک خوبصورت بچے کو دیکھا تو اسے اپنے ساتھ لے لیا اور دوآبہ (پنجاب) کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ بچہ ایک شخص نجیب نسّاج کے ہاتھ آ گیا جو پنجاب کے ایک قصبے دہندا سے روئی کی تجارت کو دہلی کو گیا ہوا تھا، چنانچہ وہ بچے کو اپنے گھر لے آیا۔ اتفاقاً مولانا شہاب الدین ہمدانی کے پوتے مولانا صدر الدین اسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے۔ وہ جناب بابا اسحاق سے ملنے کے لیے کھتو گئے تو انہوں نے فرمایا کہ اگر ایک بچہ اس شکل وصورت کا ملے تو میرے لیے لانا۔ اس قصبہ میں جب انھوں نے اس بچے کو غور سے دیکھا تو وہ واقعی اسی شکل وصورت کا تھا جس کی خواہش حضرت شیخ اسحاق نے کی تھی چنانچہ نجیب نسّاج سے وہ بچہ لے کر حضرت کی خدمت میں آئے، انھوں نے اپنی فرزندی میں رکھ کر بچے کی پرورش کی اور اس کا نام شیخ احمد رکھا جو بعد میں شیخ احمد کھتو کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس بچہ کی عمر اس وقت ۴ برس کی تھی جب وہ بارہ ۱۲ سال کے ہوئے تو حضرت اسحاق اپنے ہمراہ انہیں دہلی میں بزرگان چشت کے مزارات کی زیارت کے لیے تشریف لے آئے، یہاں شیخ احمد کے بھائی نے انہیں پہچان لیا اور کہا یہ تو میرا بھائی

ملک نصیر الدین ہے وہ اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کے والدین بھی زندہ تھے انھوں نے اصرار کیا مگر بچے نے شیخ اسحاق سے جدا ہونا قبول نہ کیا۔ ان دنوں مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہٗ اوچ سے آکر دہلی میں قیام پذیر تھے، سلطان فیروز شاہ اور دوسرے امرائے سلطنت ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ اسحاق نے اپنے بیٹے شیخ احمد سے کہا اگر چاہو تو تمہیں مخدوم جلال الدین جہانیاں سے بیعت کرا دوں انھوں نے کہا کہ میں آپ کا مرید ہوں۔ آپ ہی میرے مخدوم ہیں مجھے نئی جگہ بیعت کی کیا ضرورت ہے۔ بچے کی بات سن کر شیخ اسحاق بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے شہنشاہ تمہارے دروازے پر حاضری دیا کریں گے۔ شیخ اسحاق کی محبت کا یہ عالم تھا کہ شیخ احمد کھتو کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھولتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ایسے حسن و جمال سے نوازا تھا کہ جو بھی ان کو دیکھتا بے اختیار ہو جاتا تھا، ان کی آواز میں بڑی جاذبیت تھی۔ شیخ احمد کی عمر بیس سال ہوئی تو شیخ اسحاق نے لباس خلعت سے نوازا اور خرقۂ خلافت کے ساتھ ساتھ اپنے پیران کرام کے تبرکات اور روحانی امانتوں سے بھی نوازا اور خود فوت ہو گئے[1]

بابا اسحاق مغربی کا سلسلہ شیخ ابو مدین مغربی سے ملتا ہے اور یہ اس قدر عالی سلسلہ ہے کہ صرف پانچ بزرگوں کے واسطے سے سید الکونین فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں

---

[1] خزینۃ الاصفیا ص ۲۹۵، گلزار ابرار ص ۱۴۳، اخبار الاخیار، تذکرۂ اولیائے پاک و ہند ص ۱۹۵ تذکرۂ صوفیائے میوات، نزہۃ الخواطر ص ۴ ، ۱۹ ۔

تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے سلسلہ کے تمام بزرگ ڈیڑھ سو برس سے زائد عمر ہوتے تھے۔

سفر حج | شیخ احمد کے پیر و مرشد حضرت بابا اسحاق مغربی ۱۱۶ سال کی عمر حسب روایت ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء میں فوت ہوئے، ان کا مزار کھٹو میں مرجع عوام ہے[1]۔ پیر و مرشد کی رحلت کے بعد وہ ۷۸۳ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے، پٹن کے راستے سے کھمبایت تشریف لے گئے اور وہیں سے جہاز پر سوار ہوئے، اس وقت راستی خاں وہاں کے صوبہ دار تھے۔ پٹن میں راستی خاں کے والد فرحت سے بھی ملاقات کی تھی[2]۔ حج کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے، جب قافلہ مدینہ کی سرحد میں داخل ہوا اور گنبد خضرا کا نظارہ ہوا تو ان پر والہانہ کیفیت طاری ہوئی، اونٹ سے اتر گئے اور پیادہ درود شریف کا ورد کرتے اور نعتیہ اشعار پڑھتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔

حجاز سے واپسی | حجاز سے واپسی پر ٹھٹھہ ہوتے ہوئے اُچھ پہنچے اور وہاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملاقات کی اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے، اُچھ سے کھٹو پہنچے، پھر دہلی تشریف لے گئے اور مسجد خانجہاں میں قیام فرمایا۔

مسجد خانجہاں میں | مسجد خانجہاں میں زیادہ وقت مراقبہ، ذکر و فکر اور تحصیل میں گزرتا، عبادت و ریاضت میں ایسے مشغول ہوئے کہ دن بھر روزہ سے رہتے شام کو کھلی کے ایک ٹکڑے سے روزہ افطار فرماتے اور جب چلہ کشی شروع

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات، [2] خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۳۳

فرمائی تو شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ چالیس روز میں صرف ایک کھجور کھایا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت دہلی تشریف لائے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ مسجد خانجہاں میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ملاقات کے لیے پہنچے اور بڑی دعائیں دیں۔

تیمور کا حملہ | ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ دہلی پہنچ کر اس نے تخت و تاج پر قبضہ کیا، اس وقت دہلی کا بادشاہ محمود تغلق تھا، تغلق دہلی چھوڑ کر گجرات چلا آیا، شیخ احمد کھٹو اس وقت دہلی میں مقیم تھے۔ تیمور کی فوج نے لوٹ مار کرکے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا جن میں یہ بھی تھے، اس کو جب انکی بزرگی اور کرامت کا حال معلوم ہوا تو اس نے رہائی کا حکم دے دیا اور سواری بھیج کر انہیں اپنے پاس بلا لیا، انھوں نے تیمور سے قیدیوں کی رہائی اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری بند کرنے پر زور دیا۔ تیمور نے یہ بات مان لی اور ان کا معتقد ہو گیا[۱]

سفر سمرقند | تیمور کی درخواست پر اس کے ساتھ شیخ احمد سمرقند پہنچے۔ سمرقند میں کچھ دن قیام کے بعد ہندوستان لوٹے، ہندوستان آتے ہوئے بلخ، ہرات اور قندھار بھی تشریف لے گئے، قندھار کے گورنر نے ان کا خیر مقدم کیا اور قیام کی درخواست کی جس کو منظور نہیں فرمایا اور ملتان تشریف لائے، پھر پٹن پہنچے اور سرکھیج میں سکونت اختیار فرمائی اور تا دم حیات یہیں مقیم رہے۔

اخبار الاخیار میں گجرات تشریف آوری کا حال اس طرح لکھا گیا ہے کہ

---

[۱] تاریخ صوفیائے گجرات۔

تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے سلسلہ کے تمام بزرگ ڈیڑھ سو برس سے زائد عمر کے ہوتے تھے۔

سفر حج | شیخ احمد کے پیر و مرشد حضرت بابا اسحاق مغربی ۱۱۶ سال کی عمر میں حسب روایت ۸۲۶ھ / ۱۴۲۳ء میں فوت ہوئے، ان کا مزار کھٹو میں مرجع خواص و عوام ہے[1]۔ پیر و مرشد کی رحلت کے بعد وہ ۸۳۰ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے، پٹن کے راستے سے کھمبایت تشریف لے گئے اور وہیں سے جہاز پر سوار ہوئے، اس وقت راستی خاں وہاں کے صوبہ دار تھے۔ پٹن میں راستی خاں کے والد فتح الملک سے بھی ملاقات کی تھی[2]۔ حج کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے، جب قافلہ مدینہ منورہ کی سرحد میں داخل ہوا اور گنبد خضرا کا نظارہ ہوا تو ان پر والہانہ کیفیت طاری ہوئی، اونٹ سے اتر گئے اور پیادہ درود شریف کا ورد کرتے اور نعتیہ اشعار پڑھتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔

حجاز سے واپسی | حجاز سے واپسی پر ٹھٹھہ ہوتے ہوئے اُچھ پہنچے اور وہاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملاقات کی اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے، اُچھ سے کھٹو پہنچے، پھر دہلی تشریف لے گئے اور مسجد خانجہاں میں قیام فرمایا۔

مسجد خانجہاں میں | مسجد خانجہاں میں زیادہ وقت مراقبہ، ذکر و فکر اور تحصیل میں گزرا، عبادت و ریاضت میں ایسے مشغول ہوئے کہ دن بھر روزہ سے رہتے اور شام کو کھلی کے ایک ٹکڑے سے روزہ افطار فرماتے اور جب چلہ کشی شروع

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات، [2] خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۳۳

فرمائی تو شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ چالیس روز میں صرف ایک کھجور کھایا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت دہلی تشریف لائے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ مسجد خانجہاں میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ملاقات کے لیے پہنچے اور بڑی دعائیں دیں۔

تیمور کا حملہ | ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ دہلی پہنچ کر اس نے تخت و تاج پر قبضہ کیا، اس وقت دہلی کا بادشاہ محمود تغلق تھا، تغلق دہلی چھوڑ کر گجرات چلا آیا، شیخ احمد کھٹو اس وقت دہلی میں مقیم تھے۔ تیمور کی فوج نے لوٹ مار کر کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا جن میں یہ بھی تھے، اس کو جب انکی بزرگی اور کرامت کا حال معلوم ہوا تو اس نے رہائی کا حکم دے دیا اور سواری بھیج کر انہیں اپنے پاس بلا لیا، انھوں نے تیمور سے قیدیوں کی رہائی اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری بند کرنے پر زور دیا۔ تیمور نے یہ بات مان لی اور ان کا معتقد ہو گیا۔[1]

سفر سمرقند | تیمور کی درخواست پر اس کے ساتھ شیخ احمد سمرقند پہنچے۔ سمرقند میں کچھ دن قیام کے بعد ہندوستان لوٹے، ہندوستان آتے ہوئے بلخ، ہرات اور قندھار بھی تشریف لے گئے، قندھار کے گورنر نے ان کا خیر مقدم کیا اور قیام کی درخواست کی جس کو منظور نہیں فرمایا اور ملتان تشریف لائے، پھر پٹن پہنچے اور سرکھیج میں سکونت اختیار فرمائی اور تا دم حیات یہیں مقیم رہے۔

اخبار الاخیار میں گجرات تشریف آوری کا حال اس طرح لکھا گیا ہے کہ

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات۔

ظفر خاں جو فیروز شاہ کی حکومت کی طرف سے نہروالہ کا حاکم تھا اور سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا، اس نے دہلی کی اقامت کے دوران تعلقات کی بنا پر مجبور کیا کہ وہ گجرات تشریف لائیں اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائیں چنانچہ سرکھیج میں رہنے لگے[1] شیخ ابوالقاسم نے کتاب الکبیر میں لکھا ہے کہ ۸۰۲ھ میں مظفر خاں کے دور حکومت میں گجرات آئے اور بدا بوہرو نامی شخص کے یہاں قیام فرمایا اور بعد میں سرکھیج میں مستقل سکونت اختیار کی۔

سلطان مظفر خاں کی وفات کے بعد ان کے پوتے سلطان احمد تخت نشین ہوئے، وہ بھی شیخ احمد کے مرید ہو گئے تھے۔ ایک دن سلطان احمد نے التماس کی کہ حضور مجھے حضرت خضر سے ملایئے، فرمایا، میں حضرت خضر سے پوچھتا ہوں اگر وہ مان گئے تو بہتر۔ انھوں نے پوچھا تو حضرت خضر نے کہا، انہیں چالیس دن تک عبادت خداوندی میں رہنا چاہیئے چنانچہ سلطان ایک ماہ تک چلہ میں رہے، پھر حکم ہوا کہ دو چلے مزید کاٹیں، تین چلے مکمل کر لیے گئے تو سلطان احمد حضرت شیخ احمد کے حجرے میں بیٹھے تھے کہ نماز صبح کے بعد حضرت خضر تشریف لائے دوران گفتگو سلطان احمد نے درخواست کی، حضور مجھے عجائبات دنیا سے کوئی حیران کن چیز دکھائیں، فرمایا، دریائے سابرمتی کے کنارے پر جہاں آج کل صحرا ہے ایک شہر آباد تھا، اس شہر کا نام تھا باوراں باد۔ وہاں کے لوگ بڑے خوش حال اور امیر تھے، ایک دن مجھے بھوک لگی، میں اس شہر میں گیا ایک حلوہ فروش کی دکان پر پہنچا اور تمیس تنکہ دے کر حلوہ خریدنا چاہا، دکاندار نے

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۴۴۔

مجھے دیکھتے ہی کہا تم مجھے درویش دکھائی دیتے ہو۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا ہاں
علاوہ جس قدر چاہو کھالو، کچھ عرصہ بعد میں پھر وہاں سے گزرا تو وہاں شہر، شہر والوں،
بازاروں اور محلات کا نام ونشان نہیں تھا، ان کھنڈرات پر ایک ڈیڑھ سو سالہ
بوڑھا بیٹھا نظر آیا۔ میں نے اس سے شہر کے حالات دریافت کیے تو کہنے لگا، شہر
کا حال تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ہاں میں نے اپنے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ یہاں
ایک شہر تھا جس کا نام باداں باد تھا۔ سلطان نے حضرت خضر سے اجازت لی
کہ اگر آپ چاہیں تو میں اسی مقام پر ایک شہر آباد کرنے کا حکم دوں۔ حضرت خضر
نے کہا۔ ہاں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن ایک شرط یہ ہے کہ سارے ملک سے
ایسے چار اشخاص لائے جائیں جن کا نام احمد ہو اور انہوں نے اپنی (شعوری) عمر
میں نماز عصر کی سنتیں بھی قضا نہ کی ہوں اور وہ اس شہر کا سنگ بنیاد رکھیں
اور اس کا نام احمد آباد رکھا جائے۔ چنانچہ چار ایسے آدمی تلاش کرنے کا حکم
دیا گیا۔ سارے ملک گجرات میں صرف دو اشخاص احمد نامی ملے۔ ایک قاضی احمد
اور دوسرے ملک احمد تھے لیکن ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ملا۔ حضرت
شیخ احمد نے فرمایا، تیسرا شخص احمد میں ہوں، سلطان احمد یہ سُن کر کہنے لگا، چوتھا
احمد میں ہوں۔ آج تک میری عصر کی سنتیں قضا نہیں ہوئیں۔ چنانچہ چاروں مل کر
دریائے سابرمتی کے کنارے پہنچے حضرت خضر نے جس جگہ کی نشاندہی کی تھی،
وہاں ۷ ر ذیقعدہ ۸۱۳ھ کو احمد آباد کی بنیاد رکھی۔ اطراف میں تین سو ساٹھ [۳۶۰]
پورے بنائے گئے۔ ہر ایک پورہ ایک مکمل شہر تھا، چنانچہ عثمان پورہ میں صرف
کاریگروں کی دکانیں دس بارہ ہزار تھیں۔

مرآۃ سکندری میں لکھا ہے کہ گجرات کے سلطان احمد نے احمد آباد کی بنیاد ڈالی، اس کی تعمیر کا آغاز ذیقعدہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء اور اختتام ۸۱۶ھ/۱۴۱۴ء میں ہوا۔ احمد نام کے چار آدمیوں نے اس کی بنیاد رکھی، یعنی قطب المشائخ شیخ احمد کھتو۔ سلطان احمد رسّی کا ایک سرا سلطان نے پکڑا اور دوسرا شیخ احمد نے، شیخ احمد اور ملا احمد۔ اسی سلطان نے ۱۴۱۴ء/۸۱۶ھ میں مانک چوک کے قریب ایک عظیم الشان مسجد بنوائی، جس میں "ملوک خانہ" کے علاوہ تین سو باون ستون تھے، دروازۂ ملوک خانہ میں بارہ تخت، ملوک خانہ میں آٹھ اور جنوبی و شمالی بازوؤں میں دو سو بارہ ستون تھے اور اسی طرح دیگر بہت سے ستونوں کے علاوہ ۹۸ گنبد تھے۔ محمود ثانی کے زمانے میں دستور تھا کہ ربیع الاول کی یکم سے بارہویں تک علماء، صلحاء اور مشائخ وغیرہ ان کے دربار میں حاضر ہوتے، بخاری شریف کا درس ہوتا۔ بارہویں کو سلطان خود آنے والوں کی خدمت کرتے، ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالتے اور وزیر طشت پکڑے رہتے، اس روز بہت زیادہ نقدی اور پارچہ انعام میں دیا جاتا[1]۔ اس طرح سنہ ۸۱۳ھ میں شہر احمد آباد کا سنگ بنیاد انکے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔

شیخ احمد کھتو جب سنگ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں ایک بزرگ کو دیکھا، ان بزرگ نے ان کو آواز دی، یہ ان کے پاس گئے، تھوڑی دیر تک دونوں بزرگ بیٹھے رہے، اس کے بعد وہ ان سے اجازت لے کر رخصت ہوئے اور پھر احمد آباد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، کچھ عرصہ بعد حضرت شیخ احمد کھتو سے کسی خادم

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۲۵، ۲۴، ۲۰، ۲۸، بحوالہ تاریخ ادبیات ج ۴ ص ۹۴۵۔

نے دریافت کیا کہ وہ بزرگ کون تھے، فرمایا کہ وہ حضرت خضر تھے، انہوں نے فرمایا تھا کہ جاؤ بنیاد رکھو بہت اچھا شہر ہوگا[1]

شہر کی تاسیس کے بعد ۸۱۷ھ میں احمد آباد کی جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جس کی تاریخ ان کلمات سے نکلتی ہے "خیر و بخیر"

سلاطین سے تعلقات | شیخ احمد کھتو نے دہلی اور گجرات کے کئی سلاطین کا زمانہ دیکھا، فیروز تغلق، غیاث الدین تغلق، ابوبکر تغلق، ناصر الدین تغلق، محمود تغلق۔ یہ سارے شاہان دہلی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے، گجرات کے بادشاہوں میں بھی سلطان مظفر شاہ، احمد شاہ اور سلطان محمد معتقد تھے، بلکہ احمد شاہ نے تو انکے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی[2]

شیخ احمد کھتو کی سوانح | محمود بن سعید ایرجی نے تحفۃ المجالس کے نام سے شیخ کے ملفوظات جمع کیے تھے، اس میں سوانح و کوائف بھی دیے ہیں اور عبادت و ریاضت، کشف و کرامات اور تبحر علمی کے بہت سے واقعات بھی مرقوم ہیں۔ چند واقعات درج ذیل ہیں:

شیخ خود فرماتے ہیں کہ یہ فقیر جب زیارت خانۂ کعبہ کے ارادہ سے جہاز پر سوار ہوا تو ایک دن وضو کرنے میں اتفاق سے پاؤں پھسل گیا اور میں سمندر میں جا گرا۔ گرتے ہی یا حافظُ یا حفیظُ یا رقیبُ یا وکیلُ یا اللہ کا ورد کرتا رہا۔ میں پانی کی سطح پر تھا اور یہ وظیفہ زبان پر تھا، اتنے میں مجھے اپنے پاؤں کے نیچے پتھر سا معلوم ہوا، میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ پانی کمر تک تھا، میں نے ان اسمائے مبارکہ کا ورد برابر جاری رکھا، اس کے بعد ملاحوں نے مچھلی کی طرح اوپر اٹھا لیا، اس کے ساتھ ہی

[1] تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ تاریخ سلاطین گجرات [2] تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ ہسٹری آف گجرات۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ پہونچ کر حج کیا اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوا، مدینہ منورہ میں ہمارے ساتھ امام خانجہاں اور شیخ تاج الدین سرکھجی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے، ہم مسجد نبوی میں ستھے، ساتھیوں نے کہا کھانے کا انتظام کرنا چاہیے، میں نے کہا کہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوں۔ وہ لوگ باہر گئے اور کھانے سے فارغ ہو کر واپس آئے، ہم نے ایک ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، نماز پڑھ کر وہ حضرات سو گئے اور میں تسبیح میں مشغول ہو گیا، ناگہاں آواز آئی، رسول اللہ کا مہمان کون ہے؟ میں نے خیال کیا کسی اور کو آواز دی جا رہی ہے پھر دوسری اور تیسری بار جب یہ آواز آئی تو میں سمجھا کہ یہ آواز مجھے دی جا رہی ہے، میں اٹھا اور اس کے سامنے گیا۔ دیکھا کہ وہ شخص ایک طبق ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ میں نے دامن پھیلا دیا، اس نے کھجوریں میرے دامن میں ڈال دیں اور طبق لے لیا، وہ کھجوریں میں نے کھائیں، وہ اتنی لذیذ اور میٹھی تھیں کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا، کھجوریں کھا کر سو گیا۔ رات کو ایک خواب دیکھا اور یہی خواب میرے ساتھیوں نے دیکھا کہ:

"ایک نہایت پُر فضا مقام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام تشریف فرما ہیں اور ایک عورت زیور سے آراستہ وہاں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت کو قبول کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ بابا اسحاق نے قبول نہیں کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا، میں نے دیکھا تو حضرت علی اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بابا احمد رسول اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرو اور اس عورت

کو قبول کرلو۔ چنانچہ میں نے اس عورت کو قبول کرلیا ؛
شیخ احمد کھتو فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ عورت دنیا کی صورت مثالی تھی۔ آج جو ہمارے یہاں دنیا کی بہتات ہے وہ حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے۔

مدینہ منورہ سے واپسی کے وقت ہم تینوں ساتھی آخری سلام کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوئے۔ روضۂ مبارک کے خدام دس گز کے فاصلے پر ہاتھوں میں کالے دستانے چڑھائے کھڑے تھے۔ مجھ سے کہا یہ عمامہ لو، میں نے جواب دیا ہمارے مرشد نے عمامہ نہیں باندھا، وہ ٹوپی پہنتے تھے، اس پر خدام نے کہا، رات خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کو دس گز کپڑا عمامہ باندھنے کے لیے دیا جائے اور ارشاد فرمایا ہے کہ احمد کو ہمارا حکم ہے کہ یہ عمامہ اپنے سر پر باندھے اور مخلوق خدا کو اسلام کی دعوت دے، چنانچہ وہ کپڑا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ تھا میں نے ہاتھ میں لیا اسکو چوما اور سر پر باندھ لیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، آپؐ نے ارشاد فرمایا دہلی کی مسجد خانجہاں میں رہ کر چلے سے زیادہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ کیا جائے۔ اسی اثنا میں سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کو بھی یہ ندائے غیبی سنائی دی کہ ایک جوان صالح دہلی کی مسجد خانجہاں میں مشغول عبادت ہے اور بہت ہی ریاضت کر رہا ہے، چنانچہ جب ہم حج سے واپس آئے تو مسجد خانجہاں میں سید جلال الدین میری ملاقات کو تشریف لائے وہ مسجد کے قریب پہونچے تو ان کے ایک معتقد نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مخدوم جہانیاں

آپ سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں، میں فوراً اٹھا اور مسجد کے دروازے پر پہونچا، وہ پالکی پر سوار تھے پالکی سے اترے اور نہایت شفقت و پیار سے مجھے گلے لگایا، دیر تک سینے سے لگائے رکھا، پھر پالکی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک جگہ سفر کا تذکرہ ہے، فرماتے ہیں۔ اس فقیر نے بلا کسی رفیق اور سامان کے تنہا سفر کیا ہے اور پورے گیارہ سال تک برہنہ پا۔ جس شہر اور قصبہ میں جاتا وہاں کی مسجد میں رات بسر کرتا۔ یہ سفر اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر اور ریاضت و مجاہدہ کے سلسلے میں ہوتے تھے، ایک دن فرمایا فقیروں کی مجلس میں آنا آسان ہے، مگر وہاں سے اپنے کو صحیح و سالم واپس لے جانا مشکل ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں ایک دفعہ سمرقند کی مسجد میں جا پہونچا۔ وہاں ایک فقیہ طلبہ کو پڑھا رہا تھا، میں فقیروں کی سی ٹوپی اور درویشوں کے لباس میں تھا، طلبہ سے دور ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک طالب علم حسامی پڑھ رہا تھا۔ اس نے غلط اعراب پڑھے۔ میں نے آواز سے کہا کہ "اعراب غلط میخوانی" میری آواز سنتے ہی فقیہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ سے ملا، وہاں سے اٹھ کر اپنی مسند درس کے قریب لے گیا۔ علم اصول کے بارے میں مجھ سے کچھ سوالات پوچھے، میں نے صحیح جواب دیا۔ میری علمی جانچ کر کے مجھ سے بولا، اس علم کے باوجود یہ معمولی کپڑے اور فقیروں سی ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے، میں نے جواب دیا اگر عمدہ کپڑے پہنوں تو نفس بد خوئی کی طرف مائل ہو جائے گا، اس لیے اس فقیر نے اپنے آپ کو اس لباس میں چھپا رکھا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک دفعہ بہت بڑا تاجر تقریباً تیس سیر مصری اور مشک کا ایک نافہ ہمارے پاس اس زمانے میں لایا جب کہ ہم مسجد خانجہاں میں تھے میں نے

ان سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں اور ہمیں کب سے جانتے ہیں اس نے جواب دیا کہ میں شیخ نور کا مرید ہوں جو پنڈوہ میں رہتے ہیں اور میں اس وقت وہیں سے آرہا ہوں، اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دہلی آچکا ہوں، گذشتہ دنوں دہلی سے سامان تجارت کی خرید و فروخت کے بعد شیخ نور کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ دہلی میں کن کن مشائخ سے ملاقات کی؟ میں نے جن جن بزرگوں سے ملاقات کی تھی سب کے نام بتا دیے، شیخ نے دریافت کیا کہ شیخ احمد کھتو سے بھی ملے، چونکہ آپ سے نہیں ملا تھا اس لیے خاموش ہو گیا، شیخ نے فرمایا کہ جب شیخ کھتو سے نہیں ملے تو تمہارا دہلی جانا بالکل بے کار ہے، اسکے بعد پریشانی کی حالت میں وہاں سے روانہ ہوا اور شیخ کے حکم کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا اس شخص کے پیر و مرشد سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی انہوں نے اپنے کشف سے جو خدا کی ایک خاص نعمت ہے مجھے خود ہی پہچان لیا۔

شیخ احمد کھتو کے مرید محمود بن سعید ایرجی اپنی کتاب تحفۃ المجالس میں لکھتے ہیں کہ سلطان فیروز کو بھی شیخ کھتو سے بہت عقیدت و محبت تھی، امیر تیمور کے دہلی آنے سے پندرہ دن قبل شیخ نے اپنے کچھ مریدوں اور خود سلطان فیروز کو اس کے دہلی پر قابض ہونے کی خبر دے دی تھی، چنانچہ سلطان فیروز شیخ کی پیشین گوئی کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر جونپور چلا گیا، شیخ کو بھی فیروز نے ساتھ چلنے کو کہا مگر انھوں نے فرمایا کہ ہمیں تو دہلی والوں کے ساتھ ہی رہنا ہے، بالآخر شیخ اور آپ کے کچھ متعلقین مغلیہ فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، آپ کی بزرگی اور عظمت کی جب امیر تیمور کو اطلاع ہوئی تو اس نے ان تمام لوگوں کو جو شیخ کے ہمراہ گرفتار ہوئے تھے بڑی عزت د

ادب سے رہا کر دیا۔

شیخ فرماتے تھے کہ ہمارے ساتھ چالیس فقیر جیل میں قید تھے، غیب سے روزانہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاس چالیس گرم گرم روٹیاں بھیج دیا کرتا تھا۔

فرمایا کہ میں ننگے پاؤں اور بلا کسی ساز و سامان کے سفر کیا کرتا تھا اور کسی شہر یا بستی میں پہونچکر رات مسجد میں گذارتا تھا، خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ناپاکی سے بھی محفوظ رکھا۔ میں ہمیشہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا رہا، سفر میں بھی روزہ رکھتا اور غیر معمولی ریاضت کرتا، اگرچہ سفر میں مشقتیں اور تکلیفیں بے شمار ہوتی ہیں لیکن میرا دل ہمیشہ مسرور رہتا تھا۔ میں برہنہ پا اور پیادہ اس لیے سفر کرتا تھا کہ حدیث شریف ہے دامشوا حفاۃ عس اۃ ستر ون اللہ جھرۃ ای عیانا۔

شیخ عبد الحق نے لکھا ہے کہ شیخ احمد کھٹو کے یہاں فقرا، امراء و سلاطین ہر ایک کے لیے دستر خوان وسیع تھا۔

صاحب تحفۃ المجالس لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ احمد نے مولانا محمد قاسمؒ سے کہا کہ تم فلاں گاؤں چلے جاؤ، قصہ یہ تھا کہ مولانا نماز تراویح میں تمام قرآن سن چکے اور صرف سبع اسمہ ربک کے بعد والا حصہ باقی رہا تھا، ان کے دل میں خیال آیا کہ آج رات قرآن سن کر صبح سویرے فلاں کام کے لیے فلاں جگہ روانہ ہو جاؤنگا شیخ احمد نے فرمایا کہ مولانا آپ ابھی فلاں گاؤں چلے جائیں مگر مولانا اس خیال سے خاموش رہے کہ اگر نفی میں جواب دیتا ہوں تو شیخ ناراض ہو جائیں گے اور اگر چلا جاتا ہوں تو قرآن کریم پورا نہ سن سکوں گا، چنانچہ شیخ نے پھر حکم دیا کہ آپ

فلاں گاؤں ابھی چلے جائیں۔ شیخ کے اس حکم پر مولانا سلام کرکے اس گاؤں کی جانب روانہ ہوگئے، جہاں انکو جانا تھا۔ اس گاؤں کا نام قصبہ دھولکہ تھا چنانچہ مولانا قصبہ دھولکہ پہونچے تو اس وقت عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا اس لیے وضو کرکے فوراً مسجد میں چلے گئے، امام کے ساتھ عشاء کے فرض پڑھے پھر نماز تراویح شروع ہوئی تو امام نے سورہ سبح اسم ربک ہی سے پڑھنا شروع کیا اور مولانا کا قرآن ختم ہوگیا۔

پھر مولانا کام سے فارغ ہوکر اس گاؤں سے واپس آئے اور شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت معاف فرمائیں میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں ذرا تامل اس لیے کیا تھا کہ مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں تمام قرآن سننے کی سعادت سے محروم نہ رہوں، شیخ احمد نے فرمایا کہ مولانا! تمہارے کسی دنیاوی کام کی وجہ سے شیخ دینی کام میں نقصان واقع نہیں ہونے دے گا۔

وفات | حضرت شیخ احمد کھٹو ایک طویل مدت رشد و ہدایت فرماتے رہے۔ جب زندگی کے ایک سو گیارہ سال ہوئے تو خدا کی طرف سے بلاوا آگیا۔ چنانچہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۴ شوال ۸۴۹ھ کو واصل بحق ہوئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں، حضرت شیخ احمد کی عمر ایک سو سال سے تجاوز کر گئی تھی، شیخ صلاح الدین کو جو راجپوت کا لڑکا تھا اور بچپن سے انکی زیر تربیت رہا تھا، اپنا جانشین بنایا اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ آپ ایک سو گیارہ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔[1]

شرح جلال اور معارج الولایت میں لکھا ہے کہ شیخ کی ولادت ۷۳۸ھ میں

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، صفحہ ۳۰

ہوئی تھی اور ایک سو گیارہ سال کی عمر میں بروز جمعرات دس ماہ شوال ۸۴۹ھ میں فوت ہوئے، یہ زمانہ سلطان محمد بن سلطان احمد بادشاہ گجرات کا تھا، صاحب معارج الولایت نے سن ولادت مخدوم الاولیا (۷۳۸ھ) اور سن وفات قطب الاولیا (۸۴۹ھ) اور سن عمر قطب (۱۱۱) سے نکالا ہے، احمد آباد سے قریبی فاصلہ پر آپ کا مزار پُر انوار موضع سرکھیج میں واقع ہے۔

شیخ احمد بود مرغوب خدا　　رہنمائے حق فقیر بے نظیر
امجد آفاق (۷۳۸ھ) احمد مجتبیٰ (۷۳۸ھ)　　سرور دیں مصرع تولیدش بگیر

شیخ نے عمر بھر نکاح نہیں کیا اور اپنی عمر ترک و تجرید میں گزار دی[1]۔

جہانگیر بادشاہ کی مزار پر حاضری | جہانگیر اپنی تزک میں لکھتے ہیں:

"۶ ماہ بہمن ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) کو مبارک شنبہ جمعرات کے دن باغ فتح کی سیر کے لیے گیا جو موضع سیر خیز میں واقع ہے، راستے میں ایک ہزار پانسو روپے نچھاور کیے، چونکہ شیخ احمد کھٹو کا مزار سر راہ واقع تھا اس لیے وہاں حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی، کھٹو ایک قصبے کا نام ہے جو سرکار ناگور میں واقع ہے یہی قصبہ شیخ احمد کھٹو کی پیدائش گاہ ہے، شیخ سلطان احمد کے زمانے میں تھے، جس نے شہر احمد آباد کی بنیاد رکھی تھی، سلطان احمد شیخ سے نہایت عقیدت و اخلاص رکھتا تھا، اس علاقے کے لوگ بھی ان سے نہایت عقیدت رکھتے ہیں اور انہیں اکابر اولیاء میں شمار کرتے ہیں، ہر جمعہ کی شب میں ان کے مزار پر شریف و وضیع ہر قسم کے لوگ کثرت سے زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، سلطان محمد کے

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۳۳۔

بیٹے سلطان احمد نے شیخ کے مقبرے و مسجد اور خانقاہ کی عالی شان عمارتوں کی بنیاد رکھی تھی اور مقبرے کے متصل جنوبی حصے میں ایک بڑا تالاب بنوایا تھا، تالاب کے گرد و پیش کو پتھر اور چونے سے پختہ کیا تھا، یہ عمارتیں محمود کے بیٹے قطب الدین کے زمانے میں مکمل ہوئیں، تالاب کے کنارے شیخ کے مزار کی پائنتی میں گجرات کے سابقہ بادشاہوں کے مقبرے بنے ہوئے ہیں، گنبد کے اندر سلطان محمود بیگڑہ اور اس کا بیٹا سلطان مظفر اور اس کا پوتا محمود شہید، جو سلاطین گجرات کا آخری فرمانروا تھا، ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سلاطین گجرات کے مقبرے کے قریب ان کے امراء کے گنبد ہیں، بلا شبہہ شیخ احمد کھٹو کے مقبرے کی عمارت نہایت عالی شان اور اس کا محل و قوع نہایت نفیس ہے، تقریباً پانچ لاکھ روپے اس عمارت پر صرف ہوئے ہونگے، واللہ اعلم بالصواب[1]

مرأۃ احمدی میں ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ اور سلطان مظفر حلیم ان کے پائینتی مدفون ہیں، اسی طرح تمام خدام اور خلفا بھی وہیں دفن ہیں[2]۔

شیخ کا مدرسہ | حضرت شیخ احمد کھٹوی متوفی ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء نے سرخیز (سرکھیج) میں خانقاہ مسجد اور تالاب بنوائے تھے، وفات پا جانے پر محمد شاہ دوم نے ان کا مقبرہ اور مدرسہ وغیرہ بنوایا، اس کے ساتھ طلبہ کے رہنے کے لیے ایک دار الاقامہ بھی تھا جو عرصہ تک قائم رہا، ۱۸۲۱ء تک اس کے حجروں کے آثار موجود تھے، محمود اور انکے لڑکے مظفر کے عہد میں حسن العرب اس مدرسہ کے افسر اعلیٰ تھے[3]

کتب خانہ | سرکھیج میں شیخ احمد کھٹو مستقلاً قیام پذیر تھے، جہاں اپنی زندگی میں

---

[1] تزک جہانگیری ص ۴۴۔۴۳۔ [2] خاتمہ مرأۃ احمدی ص ۳۳۔ [3] گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۱۹۵۔

انہوں نے مسجد، تالاب اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ محمد شاہ نے آپ کے بعد اسی جگہ مقبرہ اور ایک مدرسہ بنوایا، جس میں کتب خانہ بھی رہا ہوگا، لیکن شیخ احمد کھٹو کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، چنانچہ ایک موقع پر حدیث کی کتاب مصابیح اپنے کتب خانہ سے نکال کر حاضرین مجلس کو ایک حدیث سنائی تھی[۱]، مرقاۃ الوصول میں ہے کہ قاضی عبدالرزاق مبارک المداحی جو آپ کے مخلص ملازموں میں سے تھے، وہ اس کتب خانہ کے ناظم اور کاتب تھے، لوگ ان کو قاضی بڈھ مبارک بھی کہتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتنی زیادہ کتابیں تھیں کہ اسکے انتظام کے لیے ایک مستقل ناظم اور کاتب رکھنا پڑا، حضرت شیخ کتابوں کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے[۲]

---

[۱] تحفۃ المجالس قلمی مجلس ۸ ۳ [۲] مرقاۃ الوصول ص ۵ بحوالہ گجرات کی تمدنی تاریخ صفحہ ۲۲

علم تفسیر کی اہمیت اور تفسیر ایجاز البیان کا ایک نادر مخطوطہ

از
حکیم سید محمد احمد ٹونکی

قرآن کریم کو جو عظمت و رفعت ساری کتابوں پر حاصل ہے وہ کبھی کسی زمانہ میں کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی اور کبھی حاصل ہو بھی نہیں سکتی، اس لیے کہ کتابیں خاص موضوع خاص زمانے یا خاص ضرورت تک محدود ہوا کرتی ہیں اور کتاب اللہ زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ یہ خالق و مالک کا وہ کلام ہے جو پوری زندگی کے واسطے قانون ابدی و سرمدی کے طور پر نازل فرمایا گیا ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنی صداقت و کمال پر " فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ " (ایسی ایک ہی سورہ لادو) فرما کر چیلنج کیا ہے جس کے جواب میں منکرین تک کی زبان سے " مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ (یہ آدمی کا قول نہیں) کہتے ہوئے حقیقت کا اعتراف ہوا ہے " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (اس کتاب میں کوئی شک نہیں) ہر طرح صحیح و مسلم ہے اور جو بلندی قرآن حمید کو تمام کتابوں پر حاصل ہے، وہی رفعت و سربلندی علم تفسیر کو دوسرے علوم و فنون پر حاصل ہے تفسیر کتاب الٰہی سے تعلق رکھنے والا وہ علم ہے جس کی برابری کسی علم کو حاصل نہیں اور ہر علم کی فضیلت و بزرگی اس کے موضوع اور غایت کے اعتبار سے ہوتی ہے علم تفسیر کا موضوع چونکہ قرآن کریم کے معانی و مطالب کی وضاحت ہے اس لیے اسے اشرف علوم

اور افضل و اعظم کہنا بجا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں قرآن فہمی کا ذوق و شوق پایا جاتا رہا ہے اور جس طرح صحابۂ کرام میں مفسرین پائے جاتے تھے اسی طرح تابعین و تبع تابعین اور ان کے بعد کے دور میں بھی علمائے تفسیر موجود رہے اور ہر طرح کی تفاسیر لکھی جاتی رہیں اور ممالک عربیہ ہی میں نہیں بلکہ ممالک عجم میں بھی بہت کثرت سے تفسیر کے خادم ہوئے ہیں۔

لفظ تفسیر "فسر" سے مشتق ہے اور اس کے معنی کھولنے، اظہار کرنے اور بے حجاب کرنے کے ہیں اسی لیے قرآن کے معنی ظاہر کرنے کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید ایک بحر زخار ناپیدا کنار ہے ناممکن ہے کہ کوئی اس کے علوم اس کے اسرار اس کے حکم، اس کے مطالب اور اس کے معانی کا کما حقہ استقصاء اور استحصاء کر سکے اس لیے فرمایا گیا ہے وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) اور وجب العنایة بالقصد الممکن لان کانت علوم القرآن لا تحصی ومعانیه لا تقصی (بقدر امکان اعتنا ضروری ہے، کیونکہ قرآنی علوم حد شمار سے باہر ہیں اور اس کے معانی کا استقصاء نہیں کیا جا سکتا) ہر شخص اپنے علم اور اپنی سمجھ اور اپنے غور و فکر کے اعتبار سے جتنا ہو سکتا ہے استفادہ کرتا ہے۔ فقیہ اس سے احکام فقہی اور حلال و حرام کے مسائل معلوم کرتا ہے، متکلم اس سے وحدانیت کے دلائل تک پہنچتا ہے، فلسفی اس سے ذات، واجب، ممکن، حادث اور قدیم کے براہین پاتا ہے اور عارف و سالک حقیقت و معرفت کے اسرار و رموز سے بہرہ ور ہوتا ہے، واعظ و متذکر اسکے اخبار و قصص سناتا ہے اور نصیحت و عبرت حاصل کرتا ہے، نحوی اس سے قواعد اعراب کا اظہار کرتا ہے، علم بدیع و معانی سے تعلق رکھنے والا اسلوب بیان و ترتیب الفاظ

دجل پر مرشتا ہے۔ ایک حق گو شاعر کا یہ قول کتنا صحیح اور برمحل اعتراف ہے

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

(ترجمہ) سب علوم قرآن میں موجود ہیں، لیکن لوگوں کی سمجھ اسے جاننے سے قاصر ہے

"سیوطیؒ" نے اتقان میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب الٰہی ایک دودھ کے برتن کے مانند ہے، تم اس کو جتنا متھوگے اسی قدر اس سے مکھن نکلتا رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جتنا بھی اس میں غور و فکر کیا جائے گا اس سے استفادہ کیا جاتا رہے گا۔

دنیا میں صرف یہی کتاب ہے جس سے سب سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ ہر ہر موضوع کے اعتبار سے بے شمار تفاسیر لکھی گئیں اور مفسرین نے قرآن کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دور میں قیل و قال اور موشگافیاں نہیں تھیں لیکن جب اسلام "جزیرۂ عرب" سے نکل کر "عجم" میں پھیلا اور علوم و فنون کی تدوین ہوئی فلسفہ اور منطق اور دوسرے نئے علوم پیدا ہوئے اور علمی و فنی موشگافیاں ہونے لگیں اور قرآن کو صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا تو بھی ہر مسئلہ کا کافی و شافی جواب اس سے ملا اور آئندہ بھی قیامت تک جتنے بھی جدید علوم پیدا ہونگے ان کا جواب بھی قرآن مجید سے ملتا رہے گا۔ چودہ سو سال کے عرصہ میں قرآن مجید پر جتنا کام ہوا ہے اور جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں اور جتنے لوگوں نے اس کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہے اس سے بادی النظر میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے

حریفاں بادہا خوردند و رفتند تہی خمخانہا کردند و رفتند

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بقول علامہ سیوطی کلما مخصتہ اخرجت زبدتہ، دفتر کے دفتر لکھے گئے، لکھے جاتے رہیں گے لیکن کلام الٰہی کے محاسن نہ پورے

ہوسے ہیں اور نہ آئندہ پورے ہوسکیں گے، شراب حقیقت کا یہ خم خانہ کبھی خالی ہونے والا نہیں ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ

بعض فضلا کے نزدیک وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر موضوع اور ہر مطلب پر سیر حاصل گفتگو کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے امام رازی نے "تفسیر کبیر" جیسی مبسوط تفسیر مرتب کی اور بعض اکابر کی نظر میں اختصار کی اہمیت تھی، اس کے لیے تفسیر جلالین۔ تفسیر مدارک اور تفسیر ایجاز البیان جیسی تفسیریں لکھی گئیں، اس مقالہ میں اسی موخر الذکر تفسیر پر بحث و گفتگو مقصود ہے۔ یہ بیجا طوالت اور اختصار مخل سے خالی اور چھٹی صدی ہجری کی تفسیر ہے اور مختصر ہونے کے باوجود بڑے قیمتی مواد پر مشتمل ہے، اس کے مرتب "نجم الدین ابو القاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی" ہیں وہ اپنے دور کے بڑے فاضل، محدث، فقیہ، ادیب اور شاعر تھے۔ "بیان الحق" کے نام سے معروف تھے۔ یہ نادر تصنیف خجند میں ۵۵۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور چند صدیوں تک علماء کے درمیان متداول رہی اکثر تذکروں میں اس تصنیف اور اس کے مصنف کے تذکرے اختصار کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً معجم الادباء للیاقوت، بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، کشف الظنون لحاجی خلیفہ، الاعلام لزرکلی۔ معجم المولفین لعمر کحالہ وغیرہ۔ معجم المولفین اور اعلام میں مصنف کا ذکر مکمل حوالوں کے ساتھ موجود ہے لیکن صاحب اعلام نے اس کے کسی نسخہ کے محفوظ موجود ہونے کی صراحت نہیں کی ہے، ہماری معلومات کی حد تک اس نادر تصنیف کے نسخے اب دنیا میں ناپید ہیں، مشہور مستشرق "براکلمان" (جرمنی) نے اس تفسیر کا کوئی نسخہ "اسپین" میں

ہونا ظاہر کیا ہے، لیکن دوسرے حوالوں سے اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ راجستھان میں ریاست ٹونک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کا نادر ترین نسخہ یہاں کے مشہور کتبخانہ میں موجود ہے، یہ کتب خانہ ریاست ٹونک کے تیسرے رئیس نواب[1] محمد علی خاں صاحب بہادر مرحوم مغفور کا قائم کیا ہوا جو بعد میں کتب خانہ عبدالرحیم[2] خاں اور کتب خانہ سعیدیہ[3] کے نام سے متعارف رہا، اب راجستھان سرکار نے مستقل حیثیت دیکر "عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک" کے نام سے ڈائرکٹریٹ[4] قائم کردی ہے اور اسے پورے راجستھان کے تمام عربی فارسی قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ کا مرکز بنا دیا ہے، "ٹونک" کا یہ مخطوطہ قدیم ہے اور مکمل نسخہ ہے۔ اس مخطوطہ کی کتابت ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں ہوئی اور کاتب عبداللہ بن محمد بن محمد ترمذی ہیں، ساڑھے سات سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ نسخہ نہایت صاف اور مایقرء ہے البتہ مرورِ زمانہ سے کئی جگہ سے کچھ حروف اور جملے اور بعض جگہ سے کچھ سطریں مٹ گئی ہیں۔ ادارہ کی جانب سے بغرض حفاظت اس کا لیمنیشن ہوگیا ہے، اس کا یہ تو فائدہ ہوا کہ

---

[1] نواب محمد علی خاں، ریاست ٹونک کے تیسرے رئیس ہیں، انگریزوں نے ناراضگی کیوجہ سے انہیں گدی سے نیچے اتار دیا تھا اور "شہر بنارس" (یو پی) میں نظر بند کردیا تھا اور انکی جگہ انکے بیٹے "ابراہیم علی خاں" کو نواب بنا دیا تھا، نواب محمد علی خاں بڑے بہادر، علم دوست اور خود بھی عالم تھے، انہیں کتابوں سے بہت شغف تھا[2] صاحبزادہ عبدالرحیم خاں، نواب محمد علی خاں کے بیٹے کا نام ہے، کتب خانہ ان ہی کے زیر نگرانی رہا اسلئے کتبخانہ عبدالرحیم خاں کے نام سے مشہور ہوا

[3] نواب ابراہیم علی خاں کے بعد نواب سعادت علی خاں نواب بنائے گئے سعید الدولہ خطاب تھا، اسی مناسبت سے کتبخانہ کا نام "کتبخانہ سعیدیہ" ہوا [4] یہ ڈائرکٹریٹ آج کل ضعف اور تنزل میں ہے اس کے ڈائرکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں کو سرکار نے بعض الزامات لگا کر معطل کردیا ہے۔

نسخہ بہت محفوظ ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے بعض سطور اور بعض صفحات ہلکے ہو گئے ہیں، یہ مخطوطہ قدیم و بیتر غیر مجدول کاغذ پر قدیم خط میں لکھا گیا ہے، صفحات کل ۳۱۸ ہیں اور سطور ۱۵ ہیں۔

مقدمہ میں مفسر علام نے اس تفسیر کی اہمیت اور خصوصیت بتاتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ یہ مختصر ہونے کے باوجود دس ہزار فائدوں پر مشتمل ہے (اگرچہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے:

"نجم الدین ابو القاسم محمود بن ابو الحسن نیشاپوری قزوینی بیان الحق کی تفسیر ایجاز البیان فی معانی القرآن دس ہزار سے زیادہ فوائد پر مشتمل ہے جیسا کہ مصنف نے خود دیباچہ میں صراحت کی ہے، اس کی تحریر و تسوید سے ۵۵۳ھ میں فارغ ہوئے تھے۔"

نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب اکسیر فی اصول التفسیر میں کشف الظنون کے بیان کا اعادہ کیا ہے۔

مفسر مذکور نے اس تفسیر کے مقدمہ میں اپنی چند تصانیف کا ذکر کیا ہے جو سب کی سب فن تفسیر سے متعلق ہیں، لیکن ان کتابوں کا ذکر یا حوالہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کسی کتاب کا کوئی نسخہ کہیں محفوظ ہے۔ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) غرر الاقاویل فی معانی التنزیل (۲) کتاب باهر البرهان فی مشکلات القرآن (۳) کتاب الاسئلة الرائعة والاجوبة الصادعة (۴) زبدة التفاسیر ولمعة الاقاویل (۵) موارد الشواهد وقلائد القصائد (۶) حل الغرائب غالباً شرح ایجاز البیان

موخر الذکر کتاب کا ذکر مصنف نے اپنے مقدمہ تفسیر میں نہیں کیا ہے، لیکن الاعلام وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حل الغرائب علم حدیث کی کتاب ہے جسے مصنف نے "ایجاز البیان" سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف کیا ہے اور غالباً اسی کتاب کو "کشف الظنون" میں "حل الغرائب" لکھا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ تفسیر نہایت مختصر اور رادق ہے" چنانچہ اس مخطوطہ پر کسی نے اپنا نوٹ اس طرح دیا ہے۔ "تفسیر ایجاز البیان آنش باسمے بسیار مطابق است" مصنف علامہ نیشاپوری است از علمائے متقدمین است عجب تفسیر غایۃ الایجاز دقیق بلکہ ادق الا فرمودہ" مختصر ہونے کے باوجود بمصداق قل و دل نہایت جامع اور نافع ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

آغاز (ابتدا):- قال الشیخ الامام المفسر ابو القاسم محمود ابن ابی الحسن النیشاپوری تغمدہ اللہ برحمتہ وانزلہ بحبوحۃ جنتہ وغفر لہ و لوالدیہ بعد حمد اللہ کما حقہ والصلوۃ علی نبیہ محمد خیر خلقہ فان افضل العلوم علم کتاب اللہ تعالیٰ الناس ل من عندہ الخ

اختتام :- الناس معطوف علی الوسواس لا غیر ای من شر الجن والانس واللہ اعلم با لحقیقۃ ترتیبہ ۔ فرغ من تمنیق ھذا الکتاب العبد النحیف الضعیف المفتقر الی رحمۃ اللہ ربہ اللطیف عبد اللہ بن محمد بن محمد الترمذی ضحوۃ الخمیس العشرین من جمادی الاخری سنہ ثمان وخمسین وست مائۃ ۔ حامدا ومصلیا۔

یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس مخطوطہ پر کام

کرنے اور تعلیقات کے ساتھ اسے مرتب کرنے کا موقع ملا ہے اگرچہ ابھی تک تھوڑا کام ہوا ہے اور حتی الامکان کوشش کی جارہی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جاسکے، چونکہ اس تفسیر کو مجھے بالاستیعاب غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لیے اس کی خصوصیات نمبروار تحریر کرتا ہوں:

(۱) قرآن مجید کی یہ تفسیر علمی و فنی لحاظ سے بڑی نمایاں اور قابل قدر ہے اب تک کی معلومات کے اعتبار سے یہ واحد قدیم نسخہ ہے۔

(۲) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نہایت مختصر اور ادق ہے۔

(۳) مختصر ہونے کے باوجود بمصداق ما قل و دل نہایت جامع اور نافع ہے۔

(۴) تفسیر بیان کرتے وقت مفسر نے جس طرح اسباب نزول و شان نزول کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح علم کلام و عقائد کے نکات بھی اس میں ملتے ہیں اور صرفی، نحوی اور لغت کے اشارات بھی موجود ہیں۔ اسرار و معارف کا بھی ذکر ہے اور احادیث کے حوالے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔

(۵) گو مفسر نے اس تفسیر میں علوم نقلیہ اور احادیث ماثورہ کی روشنی میں بحث و گفتگو کی ہے لیکن انکا طریق بیان اسطرح کا ہے کہ علوم عقلیہ سے بھی مطابقت پیدا ہوگئی ہے یعنی روایت کیساتھ درایت بھی موجود ہے۔

(۶) مختلف تشریحات و بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفسر کا مسلک حنفی ہے لیکن بعض مقامات پر تشریح حنفی مسلک کے مطابق نہیں ہے۔

(۷) اس تفسیر میں قرآن مجید کی ہر ہر آیت اور جملہ کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ ضروری مشکل اور قابل توضیح الفاظ یا جملوں اور آیتوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب پر جو کام ہوا ہے وہ قسط وار جرنل ادارہ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں شایع ہو رہا ہے اہل علم سے تعاون کی درخواست ہے، اگر کسی صاحب کو اس تفسیر یا اسکے مرتب کے بارے میں واقفیت اور مزید معلومات ہوں تو وہ ادارہ کو [illegible]

"اقبال کے فلسفیانہ افکار کا ارتقاء"

از ڈاکٹر آفاق فاخری

اقبال کے فلسفیانہ افکار میں مشرق و مغرب دونوں کے تصورات و نظریات کا امتزاج ہے، ان کے ذہن و فکر کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے سرچشموں سے پوری طرح سیراب ہوئے ہیں لیکن وہ ایک مفکرانہ اور فلسفیانہ ذہن و دماغ کے حامل تھے، تحقیق و تجسس، تلاش و جستجو اور غور و فکر ان کی نمایاں خصوصیت تھی، اس کے ثبوت کے لیے ان کے کلام اور خطوط کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

اقبال اوائل عمر سے لے کر اپنی زندگی کے آخر تک تلاش و جستجو کے مسلسل عمل کے اسیر تھے، اسی لیے ان کے فکری ارتقاء میں متعدد جگہ تغیر و تبدل نظر آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک فکر انسانی جامد و ساکت شے نہیں ہے بلکہ ہر ہر لحظہ اس میں تبدیلیاں ممکن ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کا غالب رجحان فلسفے کی جانب تھا۔ فلسفیانہ نظریات اور تاریخ پر انہیں بڑا عبور تھا۔ فلسفہ اقبال کے متحرک شے ہونے ہی کی بنا پر انکے کلام میں جمود و تعطل کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے فلسفہ کو انسانی تعقل میں حرارت بخشنے والا قرار دیا ہے۔ اپنی ڈائری میں تحریر کرتے ہیں۔

"فلسفہ انسان کی بر فیلی ساخت میں کانپتا ہوا جوہر ہے، شاعر نمودار ہوتا ہے، دماغ کو معروضیت کی حرارت بخش دیتا ہے۔"[1]

اقبال ایسے فلسفہ کے قائل تھے جو خونِ جگر سے لکھا گیا ہو۔ قوت، ایثار و قربانی اور جدوجہد سے خالی فلسفہ کو انھوں نے زندگی سے محروم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ قسم کے فلسفہ کو انسانی معاشرے کے مسائل اور زندگی کے شب و روز سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ؎

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے　　یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

اقبال کا فلسفہ ہمہ وقت آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ اس ارتقاء پذیری سے ان کے شعور کی پختگی اور بالیدگی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان کے فلسفہ میں نظم و ارتباط کے باوجود ناقدینِ اقبال ان کے تشخص کے متعلق مختلف الرائے ہیں۔ کسی نے انہیں محض شاعر یا محض فلسفی اور کسی نے فلسفی شاعر (PHILOSOPHER POET) یا شاعر فلسفی (POET PHILOSOPHER) کہا ہے، خود اقبال کا بیان یہ ہے کہ ؎

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھکو حدیثِ رندانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں　　پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اقبال کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے، لیکن ان کے شاعرانہ اور خطیبانہ لہجہ و آہنگ میں بھی فلسفہ کا انعکاس کافی نمایاں ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ فلسفہ کے خشک موضوع اور منطقی استدلال کو شعر و سخن کے نازک قالب میں ڈھال دیا ہے جو ان کی عہد ساز اور دوربیں شخصیت کا کمال ہے، فنِ لطیف اور فلسفیانہ افکار کے انضمام میں ہی اقبال کی انفرادیت مضمر ہے۔ ان کے فلسفیانہ تفکرات میں لطیف خیالات اور بلندیٔ فکر کی آمیزش سے ایک غنائیت و موسیقیت نے

جنم لیا ہے جو صرف انہی کا حصہ ہے۔ اقبال کی شاعری میں بیک وقت فکر و فلسفہ اور
مذہب تینوں چیزیں موجود ہیں، اسی لیے بعض ناقدینِ اقبال نے ان کے فلسفہ کو خالص
اسلامی فلسفہ کہا ہے اور ان کے احساسات اور تخیلات کی اساس بھی اسلام کو ہی
قرار دیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے فلسفے اور فکر
کا اعلیٰ مقصد اسلامی افکار کی ترویج اور اسلامی فلسفہ کو غیر اسلامی عناصر سے پاک
کرنا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کو خوشخبری اور امید کا فلسفہ اور جد و جہد اور تحصیل مقاصد
کا فلسفہ کہا گیا ہے[۱۲]۔ اقبال نے خود اپنے انگریزی خطبات میں فلسفہ کی تعریف و تشریح کی ہے۔
ان کے پہلے خطبہ "علم اور روحانی حال و وجدان" سے فلسفہ کے متعلق ان کے خیالات
و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ فلسفہ کی آزادی کے اس حد تک قائل تھے کہ

"فلسفہ آزادانہ عقلی تجسس و تحقیق کا نام ہے وہ سند اور اور تقلید کو شبہ کی نظر
سے دیکھتا ہے، فکر انسانی اور عقائد دین میں بہت سی باتوں کو بے تنقید و تحقیق مسلمات
میں داخل کر لیا جاتا ہے، فلسفہ ان مسلمات و معروضات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش
کرتا ہے...... فلسفے کو بے شک یہ حق حاصل ہے کہ وہ دین پر ایک تنقیدی نظر
ڈالے اور آزادانہ طور پر اس کو پرکھے"[۱۳]

اقبال نے مشرق و مغرب کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے۔ مشرق کے علمی و ادبی
خزانوں سے استفادہ کیا ہے اور مغرب کے حکیمانہ افکار نو کے ذخائر سے بھی
خوشہ چینی کی ہے اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک فکری و فنی شاہراہ متعین
کی اور متعدد ادبی شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اپنی شاعری میں حکمت اور فلسفہ
کے خشک دقیق اور پیچیدہ مسائل کو شعر کا جامہ عطا کیا ہے۔ انھوں نے یونان و یورپ

مفکروں افلاطون، ارسطو، نیٹشے، کانٹ، ہیگل، برگساں، فشٹے، مارکس اور لینن وغیرہ سے لے کر مشرقی حکما، ابن تیمیہ، رومی، غزالی، ابن سینا، فارابی اور ابن عربی وغیرہ تک کے فکری اثاثوں کا نہ صرف بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے بلکہ ان پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ ان میں سے بعض مفکرین نے مشرق و مغرب کو فکری اعتبار سے یکساں طور پر متاثر کیا۔ اسی باعث مشرق و مغرب میں غیر مذہبی فکری رجحانات کی دو الگ الگ سمتیں متعین ہو گئیں۔ اقبال نے اسی فکری اور مذہبی روایات کی میراث سے کسب فیض کر کے اپنے فلسفیانہ ماحول کی تہذیب و ترتیب کی ہے۔ اس لحاظ سے انکو مشرقی اور مغربی ادب کے بلند ترین افکار کا سچا وارث کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خود کو قدیم روایات کا اسیر نہیں بنایا اور یورپ کے ارتقاء اور عہد جدید کی مثبت قدروں کی جانب سے اپنی آنکھیں بند نہ کیں بلکہ ان کو بھی اپنے فکری سرمایہ کا عنصر تصور کیا، اس طرح انکی دوربین نگاہیں ماضی و حال سے گزر کر مستقبل پر بھی کمند پھینکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اقبال نے اپنے عہد کی تحریکوں اور نظریات کے بھی اثرات قبول کیے لیکن اندھی تقلید سے اپنے کو بچائے رکھا، جہاں وہ داغ، حالی، اکبر الہ آبادی سے متاثر ہوئے ہیں وہیں غالب و بیدل کے اثرات کو بھی قبول کیا۔ ابن عربی، عرفی، حافظ، سنائی سے اگر متاثر ہوئے تو رومی کو اپنا پیر و مرشد کہہ کر پکارا۔ رومی اور ابن سینا کے فکری فاصلہ کو سمجھا اور دوسری جانب ہیگل، گوئٹے اور نٹشے کی کاوشوں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ غرض ان سب کے مجموعی اثرات اور مشرقی و مغربی مفکروں کی فلسفیانہ میراث نے اقبال کی شخصیت و افکار کی

تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، اپنی ڈائری میں وہ تحریر کرتے ہیں۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈسورتھ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اول الذکر دونوں نے اشیاء کے اندرون تک پہونچنے میں میری رہبری کی۔ تیسرے اور چوتھے نے مجھے یہ سکھایا کہ شاعری کے غیر ملکی تصورات کو جذب کرنے کے بعد بھی جذبہ و اظہار میں کیسے مشرقیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور موخرالذکر نے میری طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔"[۱]

فلسفیانہ شاعری محسوسات و مشاہدات کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ اقبال کی فلسفیانہ شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے محسوساتی حقائق و افکار جذبات و وجدان سے لبریز ہیں، ان کی نگاہیں کائنات اور اس کے اثرات پر ایک فلسفیانہ اور مفکرانہ اور عالمانہ زاویہ سے پڑتی ہیں، ان کی شاعری کو شعریت اور فلسفہ کا سنگم کہا جا سکتا ہے، اقبال کے موضوعات میں فکر و فلسفہ، طبیعیات، مابعدالطبیعیات، مذہب و تمدن، تاریخ و عمرانیات اور فنون لطیفہ بھی شامل ہیں، ان کا سلسلۂ فکر ایک نئے دستور حیات کا ضامن ہے، جس میں اجتہاد فکر و نظر نمایاں طور پر کارفرما ہیں، اقبال کی فکر مشرقی و مغربی افکار و تفلسف سے ہم آہنگ ہو کر اسلامی فلسفہ یا اسلامی دستور حیات کو پیش کرتی ہے، ان کی شاعری کے فکری عناصر کی نشاندہی پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے انداز میں خوب کی ہے۔

"اگر ہم کلام اقبال کے فکری عناصر کی اجمال کے ساتھ نشاندہی کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں عشق، اثبات خودی، عمل، حرکت اور سخت کوشی کا

تصور، فقر و استغنا جو انسان کی روحانی اساس، مشینی نظام کے خلاف احتجاج اور فرد و جماعت کے مفادات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی کی تلاش شامل ہے۔"[۶۵]

اقبال کے تصورات و تخیلات کا مرکز اور عزیز ترین موضوع "خودی" ہے، یہی اقبال کے فکر و فلسفہ کا نقطۂ ارتکاز اور محور ہے، بنیادی طور پر اس میں اسلامی معاملات زیر بحث آئے ہیں"۔ فلسفۂ خودی میں مرد مومن یا "انسان کامل" کی تصویریں نہایت واضح نظر آتی ہیں۔ ان سے انسان دوستی اور انسان سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ حیات متحرک اور زندہ اقدار کا حامل ہے، اس میں سکوت وجمود نہیں ہے، اقبال کا فلسفہ، پیغام حیات کی نوید سناتا ہے، انہوں نے خودی کو دعوت دے کر بنی نوع انسان کو اپنے اندر پوشیدہ روحانی قوت کو عشق الٰہی کے ذریعہ نمو دار کرنے پر زور دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ خودی انسان کا ازلی اور ابدی عنصر ہے، اقبال کا نظریۂ خودی، اسلامی نظریات سے ماخوذ ہے جس کا سرچشمہ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال اور فلسفۂ خودی کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے۔

"ان کے فلسفیانہ تفکر کا آغاز بھی خودی ہے، وسط بھی خودی اور انجام بھی خودی"[۶۶]

اقبال کے نزدیک خودی کے بغیر انسان اپنے اصل مرکز اور نصب العین سے دور ہو جاتا ہے۔ خودی اسے مادی اور روحانی ترقی کی اعلیٰ وارفع بلندیاں عطا کر کے کامیاب و کامران بناتی ہے، اسی باعث اقبال کا اصل فلسفہ، اسلامی فلسفہ

اخلاقی میں مضمر نظر آتا ہے، چنانچہ "بال جبریل" کی مشہور مثنوی "ساقی نامہ" میں اقبال نے خودی کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اس کی ماہیت اور عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے		خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات		خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند		سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے		نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
تری آگ اس خاکداں سے نہیں		جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

فلسفۂ خودی پر ہی اقبال کے فلسفۂ حیات کی اساس ہے جو ان کے مربوط اور منضبط نظام فکر میں غالب ہے۔ تربیت خودی کے لیے انھوں نے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الہی کے تین مراحل تجویز کیے ہیں۔ خودی کی نشوونما انسان کو ہر لحظہ انقلاب نو سے آشنا کرتی ہے۔ اسی سبب سے اسے انسانی زندگی کی آبرو کہا گیا ہے۔ وہ اس کائنات میں انسان کے اندر اپنی شناخت کا جذبہ پیدا کرتی ہے ذات کا یقین و شعور ہی فلسفۂ خودی کا مقصود ہے اور شعور ذات اور شعور کائنات کے انضمام کو فلسفۂ خودی کا نام دیا گیا ہے۔ اسی شعور ذات اور شعور کائنات کو انفس و آفاق بھی کہا گیا ہے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی قرآنی تعلیمات اور مذہبی تصورات پر مبنی ہے، انکی

شاعری اور حضور اکرم سے حسن قلبی اور والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے اس سے انکے
روحانی اور وجدانی تفکرات کا اندازہ ہوتا ہے

اقبال نے خودی کی توسیع و بقا اور اس کے ارتقاء و استحکام کے لیے عشق،
سعی پیہم، فقر و استغنا کو ضروری قرار دیا ہے اس کی تکمیل اور اس کے اندر حرارت اور
بیداری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب عشق اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو،
خودی اور عشق دونوں لازم و ملزوم ہیں، خودی کے استحکام میں عشق ہی سب سے
بڑا معاون ہے اور عقل اس کے راستے میں مزاحم ہے، بعض مغربی مفکرین کے نزدیک
اقبال عقل کو محدود اور عشق کو لامحدود قرار دیتے ہیں۔ عقل و عشق کی اسی کشمکش میں
وہ ایک بار گرفتار ہوکر اس کا فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس کو ترجیح دی جائے
وہ کبھی رازی کے فلسفۂ عقل و خرد اور کبھی رومی کے سوز و ساز کی طرف متوجہ ہوئے
اور اسی کشمکش میں وہ ہیگل کی جانب مائل ہوئے مگر وہاں ان کی فکر میں اور بھی
الجھاؤ پیدا ہوگیا لیکن چونکہ اقبال ایک فلسفیانہ ذہن و دماغ بھی رکھتے تھے اسلیے
وہ جلد ہی مطمئن ہوگئے، ڈاکٹر عبدالحکیم نے "فکر اقبال" میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"اقبال خود فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی، اس کی طبیعت میں بو علی اور رازی
کا انداز بھی ہے اور رومی کا سوز و ساز بھی، اسی آمیزش نے اس کے کلام کو
الہامی بنا دیا ہے"[۹]

اقبال نے عقل اور عشق کے ان معاملات میں امام غزالی سے بھی رہنمائی حاصل
کی ہے اور ان کی اس ذہنی و فکری کشمکش کا خاتمہ کچھ اس انداز سے ہوا۔

ع جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

عقل و خرد کے متعلق انھوں نے اپنی شاعری میں متعدد جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے ان کے عقلی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً ؎

خودی نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال نے ہمیشہ عشق کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی سادگی اور جرأت مندی کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں سچائی ہے اور عقل فریب و مصلحت کا نام ہے جو انسان کے ذوق عمل کو کمزور کر دیتی ہے۔

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی　　　خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

اقبال نے خودی کے استحکام و بقا کے لیے جہد مسلسل کو لازمی قرار دیا ہے۔ بعض ناقدین اقبال نیٹشے "فوق البشر" کو اقبال کے "مرد کامل" کا مماثل ٹھہراتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ خلاف واقعہ ہے۔ اقبال کی فکری اساس احکامِ خداوندی پر ہے اور نیٹشے کے یہاں خدا کا تصور ہی نہیں؛ وہ وجود خدا کا منکر ہے۔ اپنے فوق البشر کی زندگی کے لیے نیٹشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں حرکت اور تجدید کا ظہور نہایت نمایاں ہے، ان کی فکر میں برگساں اور نیٹشے کے تصورات کا عکس ملتا ہے مگر اقبال نے زمانے کی دو قسمیں بتائی ہیں؛ اول زمان مسلسل یعنی وہ زمانہ جس کے شب و روز کو تقسیم کیا گیا ہو اور جو گردش رتیق کا مرہون منت ہو، دوسرا وہ زمانہ ہے جس میں شب و روز کی تقسیم ممکن نہیں، جس کا خارجی وجود نہیں، جس میں غروب و طلوع کا کوئی مسئلہ نہیں، جو ماضی اور مستقبل کی قید سے آزاد اور صرف زمان حال کا نام ہے، ایسے زمانے کو زمانِ خالص یا زمانِ حقیقی

کہا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی حال ہی حیات دوام ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا؟ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

انسان کی زمان و مکان سے آزادی کو اقبال نے عین منشائے الٰہی اور مقصد حیات قرار دیا ہے، تسخیر فطرت ہی آدمی کا اصل مقصد ہے، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر انسان کائنات کو مسخر کر سکتا ہے لیکن عقل و خرد ان ساری صلاحیتوں کو سلب کر دیتی ہے ؎

خرد ہوتی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لآ اِلٰہ اِلَّا اللہُ

وقت ایک مجرد تصور ہے۔ اقبال نے اس کو ایک حقیقت تصور کیا ہے اسی باعث جب وہ سلسلۂ روز و شب کا ذکر کرتے ہیں تو اسے اصل حیات و ممات قرار دیتے ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقت اعتباری شے نہیں بلکہ حقیقی شے ہے، زمان و مکان یا وقت کے متعلق اقبال کا یہ نقطۂ نظر ان کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" میں موجود ہے ؎

سلسلۂ روز و شب، نقش گر کائنات سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا؟ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اقبال کے فلسفیانہ افکار کے ارتقائی مراحل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جرمن شاعر گوئٹے نے ان کو زیادہ متاثر کیا ہے، اسی باعث ان دونوں میں کافی مماثلت ہے، گوئٹے کو اقبال نے "حکیم حیات" کا خطاب دیا ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے

اسلامی روایات و احکام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، دراصل وہ مشرقی اور مغربی فلسفہ کے انہیں اثرات کو قبول کرتے ہیں جو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ہیں، وہ کسی بھی مکتب فکر کے تصورات و خیالات کو خوب پرکھنے کے بعد ہی مانتے ہیں، ان کا فلسفہ کسی مفکر یا حکیم کے نظریے سے ماخوذ نہیں ہے وہ اصلاً اسلامی فلسفہ کے قائل تھے اور اسے ہی انہوں نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب نے ان جواہر پاروں پر بھی اندھا دھند ہاتھ نہیں مارا ہے بلکہ ان میں تصرفات اور اضافے بھی کیے ہیں۔ اس لیے جہاں تک افکار کا تعلق ہے انہوں نے نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نیٹشے کا نہ برگساں کا اور کارل مارکس کا اور نہ لینن کا۔"[۸]

حوالہ جات

[۱] بحوالہ بکھرے خیالات: مترجم ڈاکٹر عبدالحق، جمال پریس جامع مسجد دہلی ۱۹۷۵ء ص ۱۰۱

[۲] فکر اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۶ء ص ۴۵۴

[۳] اقبال معاصرین کی نظر میں: مرتبہ وقار عظیم ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲ء ص ۲۵۰

[۴] بحوالہ بکھرے خیالات: مترجم ڈاکٹر عبدالحق، جمال پریس، جامع مسجد دہلی ۱۹۷۵ء ص ۴۳

[۵] نقش اقبال: پروفیسر اسلوب احمد انصاری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۳۴

[۶] فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۶ء ص ۲۴۳

[۷] ایضاً ص ۲۱۲ [۸] اقبال کامل: مولانا عبدالسلام ندوی، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۷۲ء ص ۳۱۹۔

وفیات

پروفیسر نور الحسن کی رحلت

ملک کے مشہور مورخ و عالم اور مغربی بنگال کے گورنر پروفیسر نور الحسن کی طبیعت عرصہ سے خراب تھی، وہ علاج کے لیے امریکہ جانے والے تھے کہ مرض میں شدت ہوگئی، اور ۱۶ر جون کو ایس۔ ایس۔ کے۔ ایم اسپتال کلکتہ میں داخل ہوئے جہاں ۱۲ر جولائی کو ۶۲ سال کی عمر میں رحلت فرماگئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

پروفیسر نور الحسن کا دادھیال اور ننھیال کو علمی، تعلیمی اور دنیاوی حیثیت سے بڑی وجاہت حاصل تھی، ان کا اصل آبائی وطن فیض آباد تھا، ان کے والد عبد الحسن مرحوم وہاں کے ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، حسن خدمت کی بنا پر برطانوی حکومت نے ان کو خان بہادر کا خطاب دیا۔ وہ صوبائی سکریٹریٹ کے مختلف شعبوں میں جوائنٹ سکریٹری بھی رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ریاست رام پور میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے، پھر شیعہ سنٹرل اوقاف بورڈ اترپردیش کے صدر مقرر ہوئے۔ نور الحسن مرحوم کا ننھیال جونپور میں تھا وہ سر وزیر حسن کے نواسے اور سید علی ظہیر اور سید سجاد ظہیر وغیرہ کے حقیقی بھانجے تھے، بعد میں ننھیالی اور ددھیالی عزیز لکھنؤ میں متوطن ہوگئے، یہیں ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو نور الحسن صاحب پیدا ہوئے تھے۔

ان کی تعلیم الٰہ آباد میں ہوئی، طالب علمی کے زمانے ہی سے تقریر میں وہ اپنا

جوہر دکھلانے لگے تھے، اکثر تقریری مقابلوں میں انہیں فرسٹ پرائز ملتی۔ بعد میں وہ بہت اچھے مقرر ہوئے، وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر اور الہ آباد یونیورسٹی یونین کے سکریٹری بھی رہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ گئے، ان کا خاص موضوع تاریخ تھا جس کے وہ ماہر و محقق تھے، ۱۹۵۰ء میں آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

مرحوم کی علمی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے ہوا، پہلے وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے پھر علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ سائنس اور صنعتی ریسرچ کی کونسل کے نائب صدر بھی رہے۔ جس کی صدر مسز اندرا گاندھی تھیں۔ کونسل کی جانب سے کئی بین الاقوامی سمینار ہوئے جس میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا کہ ہندوستان میں ۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک سائنس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

پروفیسر صاحب کی علمی لیاقت کی طرح انتظامی صلاحیت، حب لوطنی اور سیکولر پسندی بھی مسلم تھی، اس لیے حکومت کی نظر بھی انکی جانب اٹھی۔ وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، ۱۹۷۲ء میں تعلیم، سماجی بہبود و ثقافت کے مرکزی وزیر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء تک اس منصب پر فائز رہے، اس کے بعد تین سال تک سابق سوویت یونین میں ہندوستان کے سفیر رہے، ان کی کوششوں سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید استوار ہوئے اور اس عرصہ میں انھوں نے روسی جمہوری ریاستوں خاص طور پر مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا، دو مرتبہ ہندوستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنے ملک کی نمائندگی کی اور یونسکو کی جنرل کانفرنسوں میں انہیں ہندوستانی

وفد کی قیادت کرنے کا موقع بھی ملا۔ آخر میں وہ مغربی بنگال کے گورنر مقرر کیے گئے اور اس حیثیت سے بہت مقبول اور نیک نام رہے، اس منصب پر دو مرتبہ فائز کیے گئے، پہلے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک اور دوبارہ ۱۹۹۰ء میں پھر مغربی بنگال کے گورنر ہوئے اور مرنے کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے، درمیان میں تھوڑی مدت کے لیے اڑیسہ کے گورنر بنائے گئے مگر ان کا دل کلکتہ ہی میں اٹکا ہوا تھا اور غالب کی طرح انکی رگ و پے میں بھی اس کی محبت سرایت کیے ہوئے تھی۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے ان کے تعلقات اچھے تھے اور انہوں نے ان کو ٹکراؤ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کا اعتراف مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ مسٹر جیوتی باسو نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"وہ گورنر اور متعدد یونیورسٹیوں کے چانسلر کی حیثیت سے ہمارے لیے ایک دانش مند مشیر تھے۔"

وہ ریاست کے عوام میں گھل مل گئے تھے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے، عوام کے ہر طبقہ میں انہیں پسند کیا جاتا تھا، ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے مسائل اور خاص طور پر اپنی ریاست کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔

نورالحسن مرحوم کا میلان شروع میں کمیونزم کی جانب ہوگیا تھا، اس میں اسکا بھی اثر رہا ہوگا کہ وہ طالب علمی ہی کے زمانے میں جواہر لال نہرو کے گھر برابر جاتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے جب ان کا تعلق ہوا تو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ متعدد اشخاص وہاں موجود تھے جن میں ان کے ماموں سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس زمانے میں

یہاں سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کی حیثیت کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان کی تھی۔ اپنی عالی نسبی اور خاندانی امارت کے باوجود پارٹی سے ان کے اخلاص و تعلق کا یہ حال تھا کہ اخبار کی کاپیاں سائیکل کے ہینڈل پہ رکھ کر فروخت کرتے تھے۔

عرصہ تک اس تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود خاندانی شرافت و وضعداری گھر کی تربیت اور ماحول کے اثر سے ان میں مسلمان گھرانوں کی روایات اور اردو کی تہذیب و شائستگی کی خو بو ہمیشہ باقی رہی اور وہ اشتراکیت کو سیکولرازم اور رواداری کے قریب لانے کا کام بھی کرتے رہے اور آخر میں تو انھوں نے اس سے پوری طرح چھٹکارا پا ہی لیا تھا گویا ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

کلکتہ کے جسٹس خواجہ محمد یوسف ۲۲ جون کو ان کی عیادت کے لیے اسپتال گئے تو ان سے تنہائی میں فرمایا کہ میں آپ کو اپنا گواہ مقرر کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ میری طرف سے شہادت دے سکیں، میرے متعلق بہت سی باتیں اڑائی گئی ہیں کہ میں بدعقیدہ ہوں، یہ جھوٹ ہے، میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا، ہمیشہ مسلمان رہا، آج بھی مسلمان ہوں، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے اور انشاءاللہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہوں گا، اس کے بعد انھوں نے بآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ گواہ رہیں (آزاد ہند کلکتہ)

اردو زبان سے ان کو سچا عشق تھا، وہ اسی تہذیب کے پروردہ تھے، ملک میں اردو کا رواج کم ہونے سے بھی کڑھتے رہتے تھے، ان کے نزدیک یہ کسی خاص فرقہ و مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ ملک کی قدیم تہذیب و ثقافت سے جڑا ہوا ہے، اس لیے اردو کا خاتمہ دراصل اس مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہے۔

طلبہ کی موجودہ بے راہ روی اور بدعنوانی بھی ان کے اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں سے واقف تھے مگر اپنی مجبوری و بے بسی کو بھی سمجھتے تھے، اردو ہی نہیں فارسی کی تعلیم کو وہ اسی لیے ضروری خیال کرتے تھے کہ اسکے بغیر طلبہ میں شرافت، شائستگی، بھلمناہت، انسان دوستی اور اخلاقی اقدار پیدا نہیں ہو سکتیں، ایک مرتبہ ایک طالب علم کو خاص طور پر تاکید کی کہ "بیٹا فارسی ضرور پڑھنا کیونکہ فارسی پڑھے بغیر اخلاق نہیں آسکتا اور اخلاق ہی زندگی کا جوہر ہے"۔ اسی لیے علمی و تعلیمی مجلسوں اور اداروں کی تقریبات میں معذوری اور علالت کے باوجود شریک ہونے کی کوشش کرتے اور بڑی مناسب اور برمحل تقریریں کرتے، اس طرح کی تقریروں میں وہ کارکنوں کی ہمت افزائی بھی فرماتے اور ان کی توجہ ان گوشوں کی جانب مبذول کراتے جن کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

ان میں قوم و ملت کا درد تھا اس لیے ان کی زبوں حالی پر بے چین رہتے تھے خاص طور پر مسلمانوں کی علمی و اقتصادی پس ماندگی اور ان کے موجودہ ابتر حالات کا انہیں ملال رہتا تھا، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ملک کے دوسرے طبقوں کے دوش بدوش اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے اور وہ جس منصب پر فائز ہوں اسے محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مسلمان بڑے عہدوں کے اہل نہیں ہیں، ملک میں سیاست اور اخلاق کے گرتے ہوئے معیار سے وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر رہتے تھے، موجودہ سیاست کو وہ کوئلے کی دوکان کہتے تھے کہ جو اس میں گیا اس کے کالک لگ گئی، انہوں نے اپنے کو اس کی آلودگی سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔

پروفیسر نورالحسن مرحوم ایک باغ و بہار، خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش اخلاق شخص تھے۔ ہر شخص کے لیے ان کے دل میں شفقت و محبت کا جذبہ موجزن رہتا تھا، اپنے عمدہ برتاؤ اور اچھے سلوک سے وہ لوگوں کا دل جیت لیتے تھے اور کبھی کسی کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے، ان میں عجب و غرور اور خود نمائی نہ تھی، سچائی، خلوص، ایمانداری، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کو اپنا وطیرہ بنالیا تھا، وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اگر انہیں کسی سے اختلاف بھی ہوتا تو اس پر نہ ناگواری ظاہر کرتے اور نہ اس سے اپنی بات زبردستی منواتے، لیکن اپنی رائے وثوق و اعتماد سے ضرور بیان کر دیتے، لوگوں کی خوبیوں کی جہاں داد دیتے وہاں ان کی غلطیوں کی جانب بھی مناسب انداز میں اس کو متوجہ کر دیتے، ہر شخص سے نباہ کر لینے کا سلیقہ انہیں معلوم تھا، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے عزیزوں، اہل تعلق اور پڑوسیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جن میں امیر و غریب دونوں طرح کے لوگ ہوتے تھے، دراصل وہ بڑے شائستہ، وضعدار اور ملنسار شخص تھے اور ان کی زندگی لکھنوی نفاست و شرافت اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھی۔

مہمان نوازی میں ان کو لطف ملتا تھا، گورنر ہاؤس میں اکثر پُر تکلف دعوتیں کرتے، رمضان میں بالالتزام افطار پر لوگوں کو مدعو کرتے، گورنر ہاؤس کی بالائی منزل پر مغرب کی اذان و نماز کا اہتمام ہوتا، افطار میں وہاں کے مسلم ملازمین بھی سب کے ساتھ افطار کرتے، عیدالاضحیٰ کے دن خاص احباب کو قربانی کا گوشت بھجواتے، خود بھی کھانے کے شوقین تھے، ان کا خاص باورچی لکھنؤ کا تھا، کھانے کے انواع و اقسام

کے بارے میں ان کے معلومات وسیع تھے۔

ان میں عصبیت، تنگ نظری اور جانبداری نہ تھی، مسلمانوں کے اختلاف، تحزب اور فرقہ آرائی کو ناپسند کرتے تھے، خود شیعہ تھے لیکن سنیوں اور غیر مسلموں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور سب کا احترام کرتے تھے۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی سنیوں سے کی تھی۔

وہ ایک بڑے عالم اور اہل علم کے قدرداں تھے، ان کی تحقیق اور تلاش و جستجو اور علم کی طلب و تحصیل کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا، وہ ہمیشہ اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہی آدمی عالم ہے جو طلب علم میں مصروف رہے، انکی مجلس اہل علم و اصحاب کمال سے معمور ہوتی تھی، ان کی دعوتوں میں ان لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ علم سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب روس کے سفیر ہوئے تو مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانے کنگھالے، عہد وسطیٰ کے فارسی مسودوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے ساتھ ان کی فوٹو کاپیاں لائے، بعض کو ایڈٹ کرکے شایع بھی کرنا چاہتے تھے مگر سرکاری مشغولیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملا۔

صحت کی خرابی کے باوجود علمی پروگرام میں حصہ لیتے، ایران سوسایٹی کے سرپرست تھے، اس کی تقریبات میں موجود رہتے، ایشیاٹک سوسائٹی کو بہتر بنانے میں بھی دلچسپی لی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے خاص عقیدت تھی، مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے قیام کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔

موجودہ قحط الرجال میں ایسے عالم، مدبر اور منتظم شخص کا اٹھ جانا ایک قومی نقصان

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و شفقت کا معاملہ کرے۔

آہ! ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری

دارالمصنفین کی مجلس عاملہ و انتظامیہ کے رکن ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری بھی ۲۸ جولائی کو دہلی میں انتقال کر گئے، اور وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کا وطن اعظم گڈھ کا معروف گاؤں جیراج پور ہے، یہیں ۱۹۲۰ء میں وہ پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، تعلیمی، اور دینی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا مولانا سلامت اللہ جیراجپوری مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، وہ نواب صدیق حسن خاں کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے اور ریاست کے مدارس کے اہتمام کی خدمت پر مامور ہوئے، وہ جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل تھے ان کے اثر سے اعظم گڈھ میں اس مسلک کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ ڈاکٹر محمد معظم کے والد مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری انہی کے لائق فرزند اور ملک کے مشہور عالم و مصنف تھے جو مدۃ العمر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ اسلام و دینیات کے استاد رہے، ڈاکٹر محمد معظم کی تعلیم بھی جامعہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے طب کی تحصیل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اعظم گڈھ میں اپنا مطب کھولا۔ اپنی اصول پسندی، دیانت، پیشہ میں یکسوئی و انہماک اور مریضوں کے علاج میں نہایت دلسوزی کی وجہ سے بہت جلد کامیابی نے ان کے قدم چومے اور وہ پورے ضلع میں ایک اچھے معالج کی حیثیت سے مشہور ہو گئے، صبح و شام کو مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

علم و ادب اور شعر و سخن سے دلچسپی کی بنا پر شام کے وقت ان کے مطب میں ادیب و شاعر شبلی کالج کے اساتذہ اور دارالمصنفین کے رفقاء کی نشست ہوا کرتی تھی، بڑے باغ و بہار آدمی تھے اپنی دلچسپ اور پُر لطف باتوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اعظم گڈھ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہو کر اپنا کلام بھی سناتے تھے۔

شروع ہی سے دارالمصنفین سے ان کا ربط و ضبط تھا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے، راقم سے عزیزداری کا تعلق تھا اس لیے بڑی شفقت فرماتے تھے اور جب بھی ملاقات ہوتی تو دارالمصنفین ہی کے بارے میں گفتگو کرتے اور اس کی مشکلات کے حل کی صورتیں بتاتے۔

چند برس قبل قلبی دورہ پڑا جس کے بعد صحت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا، بالآخر وقت موعود آگیا، ادھر سال ڈیڑھ سال سے برابر دہلی ہی میں اپنی صاحبزادی کے پاس رہتے تھے، ان کی اہلیہ کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر محمد شمیم جیراجپوری علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں زوالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زوالوجیکل سروے آف انڈیا کے ایڈوائزر بھی رہے اور اپنے فن میں ماہر ہونے کی بنا پر یورپ کے ملکوں میں بھی ان کی شہرت ہے، چھوٹے صاحبزادے محمد سلیم جیراجپوری اعظم گڈھ کے ایک بڑے ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر محمد معظم کی زندگی خدمت خلق میں بسر ہوئی، وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے، اللہ تعالیٰ انکو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کے غم کو زائل کرے آمین

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

تحقیق مدیر ڈاکٹر نجم الاسلام، صفحات ۴۵۰، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، پتہ: شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، نیو کیمپس، جام شورو، قیمت ساٹھ روپیے۔

یہ شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا سالنامہ ہے جس کے پانچ شمارے اب تک شایع ہو چکے ہیں، متنوع مضامین پر مشتمل ہے، سندھ و کمران کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کے چند مآخذ (ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ) میں قاسم داؤد کے ترجمہ عوارف المعارف اور دوسری منظوم و منثور کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، حضرت مظہر جانجاناں کے خلیفہ مولوی نعیم اللہ بہرائچی کی خانقاہ میں دستیاب خطوط اور ان کے متعلق ضروری معلومات شایع کیے گئے ہیں، پھر ایک مضمون میں قدرت اللہ قدرت کے حالات و شاعرانہ کمالات پر گفتگو کی گئی ہے، ہندی ادب کی اصناف نظم بارہ ماسہ و تیرہ ماسہ کے ضمن میں مفتی الٰہی بخش کی بکٹ کہانی اور طالب شاہ کی مثنوی انوار العاشقین میں درج صوفیانہ نقطۂ نظر کا جائزہ لیا گیا ہے، اس شمارہ کا ایک دلچسپ مقالہ تذکرہ مخزن الغرائب و انیس العاشقین (مظہر محمود شیرانی) ہے جس میں ایک قدیم ادبی معرکہ کی داستان بیان کی گئی ہے، جس میں ضمناً حافظ محمود خاں شیرانی کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کا عکس دیا ہے، عبدالحق و نگینہ پروین کے مضمون میں خالص سائنٹفک انداز میں مذہب اور امن و آشتی کو بالکل ہم آہنگ بتایا گیا ہے، خواجہ حسن نظامی کے سفرنامہ ہندوستان اور سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات کی فہرست نے اس شمارہ کو مزید معیاری

اور قابل قدر بنا دیا ہے، یہ مجموعہ اہل علم کے لیے ایک علمی سوغات ہے۔

مجلہ ترجمان الاسلام (مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر) مدیر: اسیر ادروی،
صفحات ۳۰۳، کاغذ غنیمت، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: شعبۂ
نشر و اشاعت، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی موجودہ دور کے نامور عالم و محدث تھے، ترجمان الاسلام نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شایع کیا ہے اور یہ مولانا کے حالات اور کارناموں کا مرقع ہے، اس کی ابتدا حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات سے کی گئی ہے، اس نمبر کا بڑا مفید اور قیمتی مضمون مسند احمد بن حنبل کی تحقیق (مولانا اعجاز احمد اعظمی) ہے، اس میں مشہور مصری علامہ احمد محمود شاکر پر مولانا کے نقد و تعاقب کا جائزہ لیا گیا ہے، مصنف عبدالرزاق (اسیر ادروی) میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے درمیان ہونے والے ایک دلچسپ علمی مباحثہ کا ذکر ہے، نقوش و تاثرات (مولانا ظفیر الدین) میں مولانا اعظمی کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے تاثرات تحریر کیے گئے ہیں، اس ضمن میں ان بزرگوں سے مولانا کے تعلق کا ذکر بھی آگیا ہے، مولانا کی وفات کے بعد معارف اور دوسرے رسالوں میں ان کے تعلق سے جو تاثراتی مضامین شایع ہوئے ہیں ان کو بھی نقل کیا گیا ہے، مولانا محمد حنیف ملی کے مضمون میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے امارت شرعیہ کے قیام اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے اس کے امیر الہند منتخب کیے جانے کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے وہ نامناسب ہے، ص ۲۲۳ اور ص ۲۲۸ کے درمیانی صفحات غائب ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر اچھا ہے، جس کی

ترتیب واشاعت پر لائق مرتب ستایش کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ دارالعلوم الاحسان نمبر ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

صفحات ۲۴۰، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ: دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور۔

دارالعلوم ہندوستان اور ایشیا کی مشہور مذہبی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا ترجمان ہے، اس سے پہلے اس نے بابری مسجد پر بھی ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا، اس خاص نمبر میں احسان پر ممتاز اصحاب علم کے مقالات شامل کیے گئے ہیں، احسان کی تعبیر اب تصوف کے لفظ سے کی جاتی ہے، اس نمبر کے اجراء کا مقصد تصوف پر کیے جانے والے ناروا اعتراضات کا ازالہ ہے، پہلے مقالہ میں اکابر دیوبند بالخصوص مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالوں سے بعض مصطلحات تصوف کا عمدہ تعارف ہے، سلفی تصوف کے عنوان سے علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن القیمؒ کو بھی تصوف کا ہمنوا بتایا گیا ہے، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے احسان و سلوک کے ذکر میں بھی ایک عقیدت مندانہ مقالہ شامل اشاعت ہے، اخیر کے دو مقالے صوفیہ کے تذکروں پر مشتمل ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ "تصوف اور صوفیہ کا مقصد حیات" مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور پُرمغز ہے، مجموعی طور پر یہ خاص نمبر اچھا اور مفید ہے، لیکن اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس کے مقالوں میں مدلل گفتگو کی جاتی تاکہ کتاب وسنت سے بھی تصوف کی مطابقت اور ہم آہنگی پورے طور پر واضح ہو جاتی اور محض اشخاص و افراد کے حوالوں پر اکتفا نہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں جماعت دیوبند کے سرخیل اور مشہور عارف باللہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تحقیقی اور تجدیدی کام انجام دیا ہے

اس کو پیش کرنا زیادہ مفید ہوتا۔

ماہنامہ محدث، صحافت کانفرنس نمبر مرتبہ جناب عبدالوہاب حجازی،

صفحات ۱۲۰، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ روپیے، پتہ: دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۳ ریوڑی تالاب، وارانسی۔

جامعہ سلفیہ بنارس جمعیۃ اہل حدیث کی بڑی اور مرکزی درسگاہ ہے اس کے زیر اہتمام کانفرنس اور سیمینار بھی برابر ہوتے رہتے ہیں، گزشتہ سال نومبر میں وہاں ایک دو روزہ صحافت کانفرنس ہوئی تھی، جامعہ کے اردو ترجمان محدث نے اپنے اس خاص شمارہ میں کانفرنس کی روداد شایع کی ہے، مقالات، تجاویز اور کانفرنس کے متعلق اخبار اور رسالوں کے تاثرات شایع کیے ہیں۔

نخلستان، کل ہند اردو کنونینشن نمبر ایڈیٹر مختارالرحمن راہی، صفحات ۲۵۵، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، قیمت دس روپیے، پتہ: راجستھان اردو اکیڈمی، جے پور۔

راجستھان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۳ تا ۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو ایک کل ہند اردو کنونینشن ہوا تھا، اسکے افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کی تین نشستیں ہوئیں، اب اکیڈمی کے سہ ماہی مجلہ نے اسکی روداد شایع کی ہے کنونینشن کا بنیادی مقصد ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر آئین کی روشنی میں زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے مسائل پر غور و خوض تھا، اس میں تصوف اور بھگتی تحریک کے احیا پر بھی خاص زور دیا گیا، کنونینشن میں اردو ہندی اور ملک کی علاقائی زبانوں کے ارتباط پر بھی مقالے پڑھے گئے اور تکنیکی دور سے اردو کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا، اس میں کنونینشن کے موقع کی تصویریں بھی شایع کی گئی ہیں اور راجستھان اردو اکیڈمی کے ممبران کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

ع۔ ع۔

مطبوعات جدیدہ

انشائے ماجد یا لطائف ادب از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم،
متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۵۰۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ادارہ اشاعت ماجدی ۱۴۲/۲ بہاندرسرانی کلکتہ ۳۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے چند ادبی مقالات و نشریات اور منتخب مقدموں اور تبصروں اور تعزیتی مضامین کے دو مجموعے انشائے ماجد کے نام سے عرصہ ہوا لکھنؤ سے شایع ہوئے تھے، اب ادب اور انشا کے ان شہ پاروں کو زیر نظر کتاب میں مزید چار مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکجا کرکے شایع کیا گیا ہے، جن مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر پڑھا جانے والا علامہ شبلیؒ پر ان کا مشہور مضمون "شبلیؒ، انسان، مصنف، مصنف گر" اور خود جبلی سے متعلق صدق میں شایع شدہ ان کا ایک مضمون بھی شامل ہے، "لطائف ادب" کے اضافی نام کے ساتھ اس طبع جدید کی سب سے بڑی خوبی اس کی نہایت اعلیٰ طباعت قیمتی کاغذ، نفیس جلد اور خوبصورت اور پرمعنی گردپوش ہے، ادارہ اشاعت ماجدی کی مطبوعات خوب سے خوب تر کی جستجو کی بہترین مثال ہیں، انشائے ماجدی کے شیدائیوں کے لیے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

اردو سندھی کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۱۰، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مقتدرہ

قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان۔

اردو اور سندھی زبانوں کے لسانی اشتراک اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات کا یہ مفصل جائزہ فاضل مولف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں اس کے دو اڈیشن شایع ہو چکے تھے، اب مقتدرہ قومی زبان نے اس کا تیسرا اور جدید اڈیشن شایع کیا ہے، سندھی زبان کے تعارف اور اردو زبان کے حروف و حرکات اور صوتیات سے مماثلت، بعض صوتی تغیرات اور صرف و نحو کے قواعد اور مشترک ذخیرۂ الفاظ وغیرہ پر فاضل مصنف نے محنت و کاوش سے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، اس سے سندھی اور ابتدائی اردو کے متعلق گوناگوں معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ مگر ان کے اس خیال "جدید ہندی ہندوؤں کی لنگوا فرینکا ہے تو اردو مسلمانوں کی" سے اتفاق کرنا مشکل ہے، البتہ یہ درست ہے کہ "ہندی یا ہندوستانی جو اپنے عناصر ترکیبی کے لحاظ سے اردو اور ہندی کے بین بین ہے، وہ ہندو مسلم سب کی مشترکہ زبان ہے اور پورے برصغیر کی لنگوا فرینکا صرف وہی ہو سکتی ہے" کتاب تحقیق و محنت سے لکھی گئی ہے، لیکن کہیں کہیں انداز بیان میں اس طرح کی شوخی و رنگینی بھی پائی جاتی ہے مثلاً اردو و سندھی کے تعلقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک طرف سندھ کی وادی میں ان کا سنگم ہو رہا ہے تو دوسری طرف ہند کے میدانوں میں وہ گلے مل رہی ہیں اور عجب نہیں کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ مل ملا کر پھر ایک ہو جائیں"، انگریزی اقتباسات کے ترجمے نہیں دیے گئے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی، حیات اور ادبی خدمات از ڈاکٹر محمد تحسین خان

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

چودھری محمد علی رودولوی اودھ کی قصباتی زندگی کے دور آخر کے ان یادگار زمانہ لوگوں میں تھے جو زبان و ادب کے لذت شناس شرافت و رواداری کا نمونہ اور بڑے باغ و بہار شخص تھے، مہدی افادی کی طرح ان کا تحریری سرمایہ زیادہ نہیں تھا لیکن اپنے خاص طرز انشا کی وجہ سے ان کی انفرادی اور امتیازی شان تھی، اس کے باوجود اردو کے بعض مظلوم ادیبوں کی طرح ان کے فضل و کمال کا شایان شان اعتراف نہیں کیا گیا، خوشی ہے کہ ان کے ضلع کے ایک ہونہار نوجوان اہل قلم نے انکی شخصیت کو اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا موضوع بنایا اور محنت و سلیقہ اور اعتدال و توازن کے ساتھ ان کی علمی و ادبی خدمات کو پیش کیا، اور ان کی افسانہ نویسی، انشا پردازی، مزاح اور خاکہ نگاری اور خطوط نویسی کا عمدہ جائزہ لیا، مقالہ نگار نے چودھری صاحب کے خطوط کے متعلق لکھا کہ "چودھری صاحب کے خطوط میں تقریباً وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو غالب کے خطوط میں پائی جاتی ہیں"۔ چودھری صاحب کی تحریروں کے اقتباسات بھی قرینہ سے پیش کیے گئے ہیں اور حواشی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، تاہم بعض عبارتیں وضاحت طلب رہ گئی ہیں، مثلاً "مصنف (چودھری صاحب) کو سنیوں کے اس عقیدہ سے کہ حضرت عمرؓ فوق الانسان ہیں، اختلاف ہے"۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا فوق الانسان ہونا سنیوں کا عقیدہ نہیں ہے، اسی طرح ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "مصنف کے نزدیک حضرت عمرؓ کے دل پر قدیم نسلی حکومت کا بہت گہرا اثر تھا اور جس کی تطبیق وہ اسلامی اصول سے ہمیشہ کیا کیے"۔ یہاں قدیم نسلی حکومت کی وضاحت ضروری تھی،

رسالہ نقوش کو جریدہ کہا گیا ہے، جریدہ عموماً اخباروں کے لیے استعمال ہوتا ہے، نامانوس الفاظ کی فہرست میں باہم دبے ہم اور ہرج مرج کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری از جناب ڈاکٹر شفیق اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۰ قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

اردو ناول نویسی میں کرشن چندر کا نام ممتاز و نمایاں ہے، لیکن انکی افسانہ نگاری نے بھی ان کے قارئین اور نقادوں کو خاص طور پر متاثر کیا ہے، انسانی نفسیات، سماجی مسائل اور زمانہ کے سیاسی و معاشرتی انقلابات اور ہندوستان کے طبقاتی فرق و امتیاز پر کرشن چندر کی گہری نظر تھی، ان کے افسانوں کی زبان بھی عموماً معیاری اور شگفتہ ہوتی ہے، اسی لیے ان کے خاص ذہنی و فکری رجحان سے قطع نظر افسانہ نگاری میں ان کو قبول عام حاصل ہوا، زیر نظر کتاب میں انکی افسانہ نگاری کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب لائق مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر گورکھپور یونیورسٹی سے ان کو پی، ایچ، ڈی کی سند ملی، اس میں کرشن چندر کی رومانیت، ترقی پسندی اور زبان و اسلوب کے علاوہ خود اردو افسانہ کے تدریجی ارتقار پر بھی بحث کی گئی ہے، جس کے ضمن میں کرشن چندر سے پہلے کی افسانہ نویسی کا انہوں نے مفصل اور متوازن جائزہ لیا ہے، اقتباسات کے اخذ و انتخاب سے بھی خوش سلیقگی عیاں ہے، جس کے لیے مصنف لائق داد ہیں۔

ع۔ ص۔

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ـــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے

جلد ۱۵۲ ماہ ستمبر ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ عدد ۳

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۱۶۲-۱۶۴

مقالات

سیرت نگاران نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں) — جناب شیخ نذیر حسین صاحب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور — ۱۶۵-۱۸۲

فارسی ادبیات کے دو مورخ، پروفیسر براؤن اور علامہ شبلیؒ — جناب سید محمد طارق صاحب، ریڈر شعبۂ فارسی، ایم، یو علیگڑھ — ۱۸۳-۱۹۷

ذوق کی غزل — پروفیسر محمد ذاکر صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی — ۱۹۸-۲۱۶

مدراس کی ایک درسگاہ، مدرسۂ اعظم — جناب کاوش بدری صاحب، جی کے اسٹریٹ، آمبور، مدراس — ۲۱۷-۲۳۲

معارف کی ڈاک

مکتوب نابھا — جناب رام لعل نابھوی صاحب، نابھا، پنجاب — ۲۳۳-۲۳۴

اخبار علمیہ — ع۔ص — ۲۳۵-۲۳۶

مطبوعات جدیدہ — ع۔ص — ۲۳۷-۲۴۰

شذرات

۴ ستمبر کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ اس کے چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کی صدارت میں ہوا، جس میں یونیورسٹی کے موجودہ حالات و واقعات بھی زیر بحث آئے، پچھلے چند مہینوں سے یونیورسٹی میں نظم و نسق کی خرابی، داخلوں میں بے ضابطگی اور طلبہ و اساتذہ میں بے اطمینانی کی خبریں سننے میں آرہی تھیں، جن میں یقیناً بہت کچھ مبالغہ ہوگا تاہم کچھ نہ کچھ ان کی اصلیت بھی ہوگی، ان باتوں پر بہت سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ خوش گوار ماحول میں تبادلۂ خیال ہونا چاہیے تھا، شکایت کرنے والے نیک نیتی کے ساتھ اصلاح کے جذبہ سے خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرتے اور وہ جس حد تک بھی واقعی بجا ہوتیں تو یونیورسٹی کے ذمہ داران کو تسلیم کرکے انکی اصلاح و تلافی کی یقین دہانی کراتے۔

دراصل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بیش بہا اور بیش قیمت متاع ہے، ان کی ذہنی و دماغی تربیت اور قومی و سیاسی بیداری میں اس کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس گہوارۂ علم و فن سے ایسے ذہین، بیدار مغز اور قابل اشخاص پیدا ہوئے جنھوں نے قوم و ملک کی تعمیر و ترقی اور علم و ادب کے فروغ میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، اس لیے اس سب سے بڑے علمی، تعلیمی اور تہذیبی ادارے پر اگر کوئی آنچ آتی ہے تو سارے مسلمان تڑپ اٹھتے اور بیقرار ہوجاتے ہیں، اس کے معاملہ میں وہ نہایت حساس واقع ہوئے ہیں، یونیورسٹی کے کارپردازوں کو بھی مسلمانوں کے ان نازک احساسات و جذبات کو اچھی طرح محسوس کرنا چاہیے۔ اور اس کے بارے میں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہیے اور یونیورسٹی سے وابستہ لوگوں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے۔

یہ علمی، تعلیمی اور تہذیبی ادارہ ہندوستان کی بھی عظمت کا ہیکل اور اس کی جمہوریت اور سیکولرزم کا نشان ہے اس لیے حکومت ہند کا بھی فرض ہے کہ وہ یونیورسٹی کے بارے میں احتیاط اور دور اندیشی کا رویہ اختیار کرے، کئی برس پہلے جب اس نے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کرکے اس میں بیجا دخل اندازی شروع کی تو مسلمان چیخ اٹھے تھے، بالآخر ان کے احساسات کی نزاکت کو دیکھکر حکومت کو بھی اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑا اور وہ اپنی غلطی تسلیم کرکے یونیورسٹی کی آزادی و خود مختاری کو ختم کرنے کے ارادے سے باز آئی، لیکن اب اگر خود مسلمانوں ہی کی کوتاہی، بدتدبیری اور استحصال سے یونیورسٹی کی عظمت و وقار باقی نہ رہے تو یہ کس قدر افسوسناک امر ہے، اس پر ملت کے ذی شعور طبقے کو بڑی سنجیدگی اور نہایت دلسوزی اور دردمندی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

بات صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کی نہیں ہے، اس وقت مسلمانوں کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں اور دینی و مذہبی درسگاہوں کا حال نہایت ابتر ہے، خود غرضی، نفع اندوزی، استحصال اور عدم اخلاص کے جذبے نے تمام اداروں کو تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے، رشک و حسد، منافست، مفاد پسندی اور کنبہ پروری نے مسلمانوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے اور وہ باہمی کشمکش، آپس کی چپقلش، گروہ بندی، ادنیٰ اور حقیر مقاصد اور بہت معمولی فائدوں کی خاطر اپنے ہی ہاتھوں اپنے بزرگوں کی یادگاروں اور ملی و دینی شناخت کو باقی رکھنے والے اداروں کو ہر قسم کا ضرر پہنچا رہے ہیں، آخر مسلمانوں کا زوال و انحطاط کہاں جا کر رکے گا، ادبار کی گھٹائیں کب تک انکے سروں پر چھائی رہیں گی اور فلاکت کہانتک اپنا سماں دکھائے گی اور وہ کب تک حسرت سے یہ کہتے رہیں گے کہ

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

شعبۂ اسلامیات میں اسکے استاد ڈاکٹر احتشام بن حسن کی فرمایش پر راقم نے ۸ ستمبر کو تصریفات آیات

(قرآن مجید کا ایک اہم اسلوب) کے موضوع پر ایک مختصر لکچر دیا جس کی صدارت معاشیات کے فاضل پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی نے کی، شعبہ کے لکچرر ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی اور سربراہ پروفیسر محمد سالم قدوائی کی دلچسپی سے انکے شعبہ کے علاوہ عربی اور بعض دوسرے شعبوں کے حضرات بھی شریک ہوئے، راقم نے یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ قرآن مجید میں گو ایک ہی طرح کے مضامین مثلاً توحید، رسالت، آخرت اور انبیاء کے قصے بار بار بیان ہوئے ہیں، مگر ان کا اسلوب و انداز ہر جگہ نیا اور بدلا ہوا ہے، اس اسلوب کے فوائد و مصالح بھی بتائے گئے۔

گزشتہ ماہ دار العلوم ندوۃ العلما کے نائب ناظم مولانا قاضی معین اللہ ندوی نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور ضلع انجمن تعلیمات دین کے سکریٹری ڈاکٹر نفیس احمد کی ایک رپورٹ دکھائی جس میں علی گڑھ، آگرہ، ایٹہ، متھرا اور بھرت پور (راجستھان) کے دیہاتی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پسماندگی، معاشرت اور شادی کی رسوم میں غیر مسلموں سے مشابہت، ہندو مذہب قبول کرنے اور مرتد ہوجانے کی دردانگیز کیفیت کا تذکرہ تھا، سرکاری اسکولوں کے ماسٹر مسلم بچوں کے داخلے اور پٹواری اندراج کے وقت مسلمانوں کے نام یہ کہہ کر تبدیل کر دیتا ہے کہ "شبہ نہیں ہے"، مسلمان باپ کو رقم دیکر ان کی بیٹیوں کی شادی ہندوؤں سے کر دی جاتی ہے، بعض خوشحال مسلمان زیادہ جہیز کے لالچ میں ہندوؤں کے یہاں شادی کرتے اور اپنا مذہب بدل دیتے ہیں، کچھ مسلمان اس لیے بھی اپنا مذہب بدل دیتے ہیں کہ ہندو ساہوکار ان کے قرض معاف کر دیتا ہے یا مفت ہینڈ پمپ لگوا اور بورنگ کرا دیتا ہے، مسلمان بچے ششو بال مندر اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں ہندو مت کی تعلیم، دیوی دیوتاؤں کے قصے، اسلام اور مسلمانوں کی خرابیاں اور مسلمان بادشاہوں کے مظالم کے فرضی واقعات بیان کیے جاتے ہیں، کیا اس صورت حال کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ

ع عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

مقالات

سیرت نگارانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں)

از
جناب شیخ نذیر حسین صاحب، لاہور۔

(۲)

عباسی عہد تا ۴۳۰ھ

پہلی صدی ہجری کے اختتام پر فن سیرت و مغازی کی ترتیب و تدوین نے ترقی کے بہت سے مراحل جلدی سے طے کر لیے تھے، چنانچہ بنو امیہ کے آخری اور بنو عباس کے شروع زمانے میں مغازی کی جامع اور مفصل کتابیں لکھی گئیں۔ بنو امیہ کے عہد میں موسیٰ بن عقبہ نے کتاب المغازی لکھی جو نہایت جامع تھی۔ اس زمانے کے مؤلفین سب سے پہلے آفرینش عالم کے بیان کے علاوہ انبیائے سابقین اور صحف سماوی کا بھی ذکر کرتے ہیں اور پھر حیات مبارکہ کے واقعات لکھتے ہیں۔ اس طرزِ تالیف کی بہترین مثال ابن اسحاق کی کتاب المغازی ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ خلیفہ منصور العباسی نے ابن اسحاق سے فرمائش کی کہ تاریخ کی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں حضرت آدمؑ سے لے کر منصور کے زمانے تک واقعات مذکور ہوں۔ ابن اسحاق نے خلیفہ منصور کے حکم کی تعمیل میں ایک ضخیم کتاب لکھ دی پھر خلیفہ ہی کی فرمائش سے اس کا اختصار کیا (خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۲۲۱/۱) (بعض

اہل علم منصور کے بجائے خلیفہ المہدی کو اس فرمایش کا محرک قرار دیتے ہیں۔

آنے والی صدیوں میں مغازی کی بہت سی کتابیں تالیف یا تصنیف ہوئیں، حتیٰ کہ فقہی کتابوں میں بھی مغازی کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے۔ تاریخ عالم کی تدوین اور تالیف پر ابن اسحاق کی کتاب المغازی کا بھی اثر پڑا۔ الطبری بھی اس طرز تالیف سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۱۔ محمد بن اسحاق

ابو عبداللہ محمد بن اسحاق بن یسار ۸۵ھ/۷۰۴ء کے لگ بھگ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۵ھ/۷۳۳ء میں اسکندریہ جاکر یزید بن ابی حبیب (المتوفی ۱۲۸ھ/۷۴۵ء) کے درس حدیث میں شامل ہوئے۔ ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں مدینہ واپس آ گئے۔ یہاں مشہور محدث سفیان بن عینیہ سے استفادہ کیا پھر بغداد چلے آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ سے ان کی رسم و راہ نہ تھی جبکہ ان کے استاد امام زہری امویوں کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن اسحاق نے ۱۵۰ھ/۷۶۲ء میں بغداد میں وفات پائی۔ حالات کے ماخذ درج ذیل ہیں۔

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۷/۲/۶۷، مطبوعہ لائیڈن)؛ (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۴۷)؛ (۳) ابن الندیم (الفہرست، ص ۹۲) (۴) خطیب بغدادی (تاریخ بغداد، ۱/۲۱۴-۲۳۴)؛ (۵) ابن خلکان (وفیات الاعیان، ۱/۶۱۱-۶۱۲، بولاق)؛ (۶) الصفدی (الوافی بالوفیات، ۲/۱۸۸-۱۸۹)؛ (۷) الذہبی (میزان الاعتدال، ۳/۲۱-۲۴)؛ (۸) ابن حجر (التہذیب، ۹/۳۸-۴۶)؛ (۹) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ص ۲۷-۳۰)؛ (۱۰) الزرکلی (الاعلام، ۶/۲۵۲۔

مذکورہ بالا کتب حوالہ کے علاوہ یوسف ہارویز، گلیوم اور رابسن وغیرہم نے ابن اسحاق اور ان کی کتاب المغازی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین انگریزی میں لکھے ہیں۔

(۱) آثار طیبہ:۔ کتاب المغازی' تین حصوں میں منقسم ہے، المبتدا، المبعث اور المغازی۔ اس کے مختلف اجزا مختلف کتابخانوں میں منتشر ہیں (حال ہی میں اس کا کامل نسخہ یونس بن بکیر کا روایت کردہ مکتبہ القرویین (فاس) میں ملا ہے) کتاب المغازی کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ تفسیر طبری اور تاریخ الطبری اور کتاب الاغانی میں اس کے بہت سے اقتباسات شامل ہیں۔ ابن ہشام (المتوفی) نے سیرت ابن اسحاق کی ترتیب وتہذیب کی، انبیائے سابقین کے حالات حذف کر دیے، بالخصوص وہ حدیث جن کا سیرت طیبہ سے تعلق نہ تھا یا جن کا ذکر قرآن مجید میں نہ آیا تھا، انہوں نے بہت سے اضافے بھی کیے ہیں۔ الفریڈ گلیوم نے سیرت ابن اسحاق کا ترجمہ (قدرے اختصار کے ساتھ) انگریزی میں شایع کیا ہے (لنڈن ۱۹۵۵ء)۔

(۲) تاریخ الخلفاء:۔ مذکورہ بالا تاریخ کے چند اجزا، جو "مقتل عمر بن الخطاب اور الجنۃ الانتخاب" سے متعلق ہیں، عبدالعزیز الدوری نے شایع کیے ہیں (علم التاریخ، ص ۱۸۱۔ ۱۸۲)۔

(۳) کتاب الفتوح:۔ الواقدی کی کتاب "فتوح مصر"، "ارض ربیعۃ"، "الفرس" کا بنیادی ماخذ ابن اسحاق کی کتاب الفتوح ہے۔

(۴) اخبار کلیب و جساس' اس کا قلمی نسخہ بغداد میں ہے۔

(۵) کتاب حرب البسوس بین بکر و تغلب' طہران میں چند اجزا ہیں۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی ابن اسحاق سے منسوب ہیں۔

(۴) کتاب سیر العرب الاسبع ؛ (ب) حدیث الاسراء والمعراج (ج) اخبار صفین، لیکن ان کی نسبت ابھی تک تحقیق طلب ہے۔

۲۔ معمر بن راشد

ابو عروہ معمر بن راشد (بن عمرو الازدی ولادت کے اعتبار سے حرانی تھے، حرانی ازدیوں کی شاخ تھی۔ ۹۵ھ/۷۱۴ء میں پیدا ہوئے (ابن حجر: التہذیب ۱۰/۲۴۴) جوانی میں الزہری، ہمام بن منبہ سے حدیث کا سماع کیا، پھر صنعاء یمن کا سفر کیا، بصرہ کئی بار گئے اور ۱۵۴ھ/۷۷۰ء میں انتقال کیا۔ معمر بلند پایہ مورخ اور محدث تھے، اس کے علاوہ وہ مفسر قرآن بھی تھے۔ ان کی روایات کا مرجع امام زہری ہیں۔ انھوں نے کتاب المغازی موضوع کے اعتبار سے مرتب کی۔ ان کا شمار ابواب کے اعتبار سے مرتب کرنے والے ابتدائی محدثین میں ہے۔ عبدالرزاق بن ہمام (المتوفی ۲۱۱ھ/۸۲۶ء) ان کی بیشتر کتابوں کے راوی ہیں۔ حالات کے مآخذ:

(۱) ابن سعد (الطبقات ۵/۳۹۷، مطبوعہ لائیڈن ۲) البخاری (تاریخ الکبیر ۴/۱/۳۷۸۔۳۷۹) ؛ (۳) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۵۳) ؛ (۴) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل ۴/۱/۲۵۵۔۲۵۶) ؛ (۵) الجدی (فقہاء الیمن، ص ۶۶) ؛ (۶) النووی (التہذیب ۲/۱۰۶) ؛ (۷) الذہبی (تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۷۸) ؛ (۸) وہی مصنف (میزان الاعتدال ۳/۱۸۸) ؛ (۹) العینی (عمدۃ القاری ۱/۸) وغیرہ یوسف ہارویتز، روزنتال اور نبیہ عبود نے معمر بن راشد پر مضامین لکھے ہیں؛ نیز دیکھئے فواد سیزگین (مصادر البخاری، بمواضع کثیرہ)

(۱) کتاب المغازی:۔ مغازی کے علاوہ اس میں انبیائے سابقین کے حالات

بھی مذکور ہیں۔ تاریخ الطبری میں اس کے کئی اقتباسات ہیں۔

(۲) الجامع:۔ ابواب فقہ کے بجائے الجامع کی احادیث کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، اس میں علم حدیث کے بعض اہم مباحث بھی مذکور ہیں۔ الجامع کے راوی معمر بن راشد کے شاگرد امام عبدالرزاق ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب' مصنف کے تکملہ میں بہت سی احادیث کا اضافہ کر دیا ہے [مصنف عبدالرزاق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق و تعلیق سے بیروت سے آٹھ جلدوں میں شایع ہو چکی ہے]

(۳) تفسیر:۔ امام معمر بن راشد نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی تھی، جس کی تہذیب امام عبدالرزاق نے کی تھی، اس کا جزء اول ہم تک پہنچا ہے۔

۳۔ الحنیفی

ابو محمد عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عثمان الحنیفی مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے، ۹۰ھ/۷۰۸ء میں پیدا ہوئے، الزہری، عبداللہ بن ابی بکر بن حزم وغیرہ سے مغازی کی روایات بیان کیں' خود ان کے راوی الواقدی اور سعید بن مریم وغیرہ ہیں۔ اپنے زمانے میں سیرت کے مشہور عالم تھے، ۱۶۲ھ/۷۷۸ء میں وفات پائی، حالات کے مآخذ:۔

(۱) البخاری (تاریخ الکبیر، ۳/۱/ ۳۱۸ - ۳۱۹)؛ (۲) ابن ابی حاتم۔ (الجرح والتعدیل، ۲/۲/۲۶۰)؛ (۳) ابن ماکولا (الاکمال، ۳/۳)؛ (۴) ابن حجر (التہذیب، ۶/۲۲۰)

تصانیف:۔ الحنیفی کی کتاب السیرت واقدی کی کتاب کا بنیادی ماخذ ہے' تاریخ الطبری میں بھی اس کے اقتباسات ہیں (دیکھئے فہارس الطبری' ص ۳۴۹)۔

۴۔ ابو معشر السندی

ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندی ابن اسحاق کے ہم عصر تھے، اگرچہ عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ ان کا مرز بوم یمن تھا، لیکن ان کی زیادہ عمر مدینہ طیبہ میں گزری، پھر المہدی نے انہیں بغداد بلا لیا۔ ابو معشر نے محمد ابن کعب القرظی، سعید المقبری اور ہشام بن عروہ سے حدیث سُنی، ان سے ان کے بیٹے محمد یزید بن ہارون اور واقدی وغیرہ نے حدیث کی روایت کی۔ بطور مورخ ان کا پایہ ابن اسحاق سے بلند ہے[1] لیکن محدثین نے ان کی روایتوں کی تضعیف کی ہے۔ ان کی کتاب المغازی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے جملہ واقعات کو محیط ہے (ابن الندیم، ص، ۹۳) ابو معشر نے تاریخ الخلفاء بھی تصنیف کی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کی ترتیب زمانی اعتبار سے تھی اور یہ ابو معشر کی وفات یعنی ۱۷۰ھ/۷۸۶ء تک کے واقعات پر مشتمل تھی۔ الطبری نے اس کی بعض عبارتیں نقل کی ہیں، حالات کے مآخذ :

(۱) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۵۳)؛ (۲) الیعقوبی (التاریخ، ۲/۵۵۳)؛ (۳) خطیب بغدادی (تاریخ بغداد، ۱۳/۴۵۷ ـ ۴۶۲)؛ (۴) السمعانی (الانساب، ص ۳۱۳)؛ (۵) یاقوت (معجم البلدان، ۳/۱۶۶)؛ (۶) ابن حجر (التہذیب، ۱۰/۴۱۹ـ ۴۲۲)؛ (۷) الزرکلی (الاعلام، ۸/ ۲۲۸)۔

ابو معشر السندی کے حالات دسٹن فیلڈ، یوسف ہاروٹز اور روزنتال وغیرہ نے بھی لکھے ہیں۔

(۱) آثار علمیہ :۔ کتاب المغازی، کتاب الواقدی اور ابن سعد کے طبقات اور الطبری میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔

---

[1] (ابن حجر، التہذیب، ۱۰/۲۲۴)

(۲) تاریخ الخلفاء: الطبری نے تاریخ الخلفاء سے بہت استفادہ کیا تھا (دیکھیے نہارس تاریخ الطبری، ص ۱۳)۔

۵۔ الفزاری

ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن الحارث الفزاری کوفہ میں پیدا ہوئے پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد چلے آئے، آخر عمر میں المعیصہ میں اسلامی سرحد کی نگہبانی کرتے رہے اور ۱۸۸ھ/۸۰۴ء میں وفات پائی۔ الفزاری نامور مورخ اور محدث تھے۔ بعض لوگ الفلکی کو الفزاری سمجھ لیتے ہیں (دیکھیے ابن حجر، التہذیب، ۱/۱۵۳، الکحالہ، معجم المولفین، ۱/۹۰) حالات کے مصادر:۔

(۱) البخاری (التاریخ الکبیر ۱/۱/۳۲۱)؛ (۲) ابن الندیم (الفہرست، ص ۹۲) (۳) ابن عساکر (تاریخ مدینۂ دمشق، ۲/۲۵۲)؛ (۴) ابن کثیر (البدایۃ والنھایۃ، ۱۰/۲۰۰)؛ (۵) الزرکلی (الاعلام، ۱/۵۵؛ (۶) روزنتال (مسلمانوں کی تاریخ نویسی، ص ۳۲۳)۔

علمی آثار:۔ کتاب السیر فی الاخبار، مخطوطہ جامع القرویین (فاس) میں ہے، ایک ٹکڑا الاصابہ میں بھی شامل ہے (۱/۶۸۰، ۳/۴۰۸)۔

۶۔ ابو اسماعیل الازدی البصری

ابو اسماعیل محمد بن عبداللہ الازدی البصری نے دوسری صدی ہجری کے ربع آخر میں وفات پائی، دیکھیے السخاوی (الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۲۶)؛ الکحالہ (معجم المولفین، ۱۰/۱۹۹)۔

علمی آثار:۔ مختصر فتوح الشام، ناسولیس نے اسے کلکتہ سے ۱۸۵۴ء

میں شایع کیا تھا، فارسی اور اردو میں اس کے تراجم ہیں؛ اردو ترجمہ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے [؟]۔

۷۔ یحییٰ بن سعید الاموی

ابوایوب یحییٰ بن سعید بن الابان الاموی الکوفی ۱۱۴ھ/ ۷۳۲ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے، ہشام بن عروہ اور محمد بن اسحاق وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، اسکے بعد طرح اقامت بغداد میں ڈال دی اور ۱۹۴ھ/ ۸۰۹ء میں وفات پائی۔ مآخذ (۱) ابن سعد (طبقات، ۶/ ۲۹۸)؛ (۲) الذہبی (تذکرۃ الحفاظ، ص ۳۲۵-۳۲۶)؛ (۳) ابن حجر (التہذیب، ۱۱/ ۲۱۳-۲۱۴)۔

علمی آثار:۔ کتاب المغازی۔ اس کی ایک طویل عبارت امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں درج کی ہے (دیکھیے جامع الصحیح، ۵/ ۱۷-۱۷۹)؛ الطبری نے کثیر مواضع پر اس طرح کا حوالہ دیا ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی، دیکھیے مشیخۃ الظاہریہ، ۱۸/ ۲۶ اب)

۸۔ ابوالعباس الاموی

ابوالعباس الولید بن مسلم الاموی (مولیٰ) دمشقی ۱۱۹ھ/ ۷۳۷ء میں دمشق میں پیدا ہوئے اور الاوزاعی اور ابن جریج وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، بلند پایہ مورخ اور محدث تھے، ان کا لقب عالم شام تھا۔ ابوالعباس نے تقریباً ستر کتابیں تالیف کیں، جن میں کتاب المغازی اور کتاب السنن بھی شامل ہیں، انھوں نے حج سے واپسی پر ۱۹۵ھ/ ۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

حالات کے مآخذ: (۱) البخاری (تاریخ الکبیر، ۴/ ۲/ ۱۵۲-۱۵۳)؛ (۲) ابن الندیم

الفہرست، ص ۱۰۹، ۲۸۰)؛ (۳) الذہبی (میزان الاعتدال، ۳/ ۲۷۵ - ۲۷۶)؛ (۴) ابن حجر (التہذیب، ۱۱/ ۱۵۱ - ۱۵۵)؛ (۵) ابن العماد (شذرات الذہب، ۱/ ۲۴۴)؛ (۶) الزرکلی (الاعلام، ۹/ ۱۴۳)؛ (۷) الکحالہ (معجم المولفین، ۱۳/ ۱۷۳)۔

تصانیف :۔ ابو العباس کی کتاب المغازی کا ایک ٹکڑا امام بخاری نے صحیح البخاری (جلد پنجم، باب المغازی) میں نقل کیا ہے، دیکھئے سیزگین : بخاری کے مصادر، ص ۲۱ (۲۲۵ - ۲۲۳) نیز الطبری کی فہارس، ۶۲۹)۔

۹ - ابو حذیفہ

ابو حذیفہ اسحاق بن بشر بن محمد، البخاری، بلخ میں پیدا ہوئے، لیکن انہوں نے بخاری کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ انہوں نے محمد بن اسحاق، عبد الملک بن جریج، امام مالکؒ اور سفیان الثوری وغیرہ سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن یہ روایتیں ضعیف شمار کی گئی ہیں۔ ابن الندیم نے الفہرست، ص ۹۴ میں ان کی کتابوں کے یہ نام لکھے ہیں : کتاب المبتدا، کتاب الفتوح، کتاب الردۃ، کتاب الجمل، کتاب الالویہ، کتاب صفین اور کتاب حفر زمزم۔ ان کی کتابوں کے راوی اسماعیل بن العطار البغدادی (المتوفی ۲۳۲ھ/ ۸۴۷ء) ہیں (دیکھئے ابن ندیم: الفہرست، ص ۱۰۹) یہ کتنی عجیب بات ہے کہ استاد کی کتابیں ان کے شاگرد سے منسوب ہو گئیں، ابو حذیفہ نے ۲۰۶ھ / ۸۲۱ء میں بخاری میں وفات پائی۔ حالات کے مآخذ: (۱) الخطیب (تاریخ بغداد، ۶/ ۳۲۶ - ۳۲۸)۔ (۲) یاقوت (ارشاد الاریب، ۲/ ۲۳۰ - ۲۳۲)؛ (۳) ابن حجر (لسان المیزان، ۱/ ۳۵۴ - ۳۵۵) (۴) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/ ۱۵) (۵) الزرکلی (الاعلام، ۱/ ۲۸۶) (۶) الکحالہ (معجم المولفین، ۲/ ۲۳۱) (۷) روزنتال، تاریخ، ۱۳۳)۔

تصانیف :۔ (۱) کتاب المبتداء ۔ اس کا چوتھا اور پانچواں جزء جو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہے، پانچویں صدی ہجری کا لکھا ہوا کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہے، احادیث کے چند اجزاء بھی دریں ہیں۔

(۲) کتاب الفتوح ! یاقوت نے معجم البلدان میں اور ابن حجر نے الاصابہ میں کتاب الفتوح کے بے شمار حوالے دیے ہیں۔

(۳) المسند (دیکھئے ابن حجر، الاصابہ، ۲/۵۵۷)۔

۱۰۔ الواقدی

ابوعبداللہ، محمد بن عمر بن واقد مدینہ منورہ میں ۱۳۰ھ/۷۴۷ء میں پیدا ہوئے، ان کے دادا کا نام واقد تھا۔ اس لیے یہ بھی الواقدی کہلائے ۔ الواقدی ۱۸۰ھ/۷۹۶ء میں بغداد آئے، جہاں وزیر یحییٰ بن خالد البرمکی نے ان کا خوب استقبال کیا اور خلیفہ ہارون کی خدمت میں پیش کیا، جس نے انہیں بغداد آنے کی دعوت دی تھی (طبقات ابن سعد، ۵/۳۱۴۔ مطبوعہ لائیڈن) کہا جاتا ہے کہ وہ ہارون کے عہد میں مشرقی بغداد اور مامون کے زمانے میں عسکر المہدی کے قاضی رہے۔ الواقدی کا مورخین مدینہ میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ انہوں نے عمر کے آخری تیس سال بغداد میں گذارے ۔ سابقہ مصنفین جن سے الواقدی نے استفادہ کیا ان میں موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد اور ابومعشر ہیں، جنھوں نے خود کتب المغازی مرتب کی ہیں۔

الواقدی نے سب سے زیادہ اخذ و استفادہ اپنے پیشرو ابن اسحاق سے کیا ہے، اگرچہ اس نے اپنی کتاب المغازی میں ابن اسحاق کا ذکر نہیں کیا، لیکن ترتیب و تبویب میں ابن اسحاق کی پیروی کی ہے ۔ ولہاوسن اور یوسف ہارویز نے اس بحث پر خوب روشنی

ڈالی ہے، اب اسلامی دور میں تاریخ نویسی الواقدی کی ذات میں محدود ہو کر رہ گئی، جس کی شاہد اس کی کتابیں ہیں مثلاً امر الحبشہ والفیل، حرب الاوس والخزرج اور اخبار مکہ میں (دیکھئے ابن ندیم : الفہرست، ۲۹)۔ انھوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد کی تاریخیں بھی لکھی تھیں۔ ابراہیم الحربی کا خیال تھا کہ الواقدی اپنے زمانے میں سب سے بڑے تاریخ داں تھے لیکن زمانۂ جاہلیت سے زیادہ واقف نہ تھے (ابن حجر۔ التہذیب ۹/۳۶۵) ان کی عظمت کے لیے یہ کافی ہے کہ انھوں نے ہمارے لیے بہت تاریخی مواد جمع کر کے اس کی تدوین کر دی ہے۔

الواقدی کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ وہ تاریخی مواد کا آغاز حدَّثنا سے کرتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں براہ راست روایت نہیں پہنچی تھی، علاوہ ازیں وہ اپنے پیش رو مصنفین یا مولفین کی طرح روایت سے پہلے اسناد کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ صرف ہر فصل کے آغاز میں اپنے ماخذ کی اسناد لکھ دیتے ہیں، جس سے ہم مختلف ماخذ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ حالات کے ماخذ ملاحظہ ہوں۔

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/۴۲۵-۴۳۳)؛ (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۵۸)؛ (۳) ابن الندیم (الفہرست، ص ۹۸-۹۹)؛ (۴) الخطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۳/۳-۲۱)؛ (۵) السہمی (تاریخ جرجان، ص ۱۶۵)؛ (۶) یاقوت الحموی (ارشاد الاریب، ۱۸/۲۷۷-۲۸۲)؛ (۷) الصفدی (الوافی بالوفیات، ۴/۲۳۸-۲۴۰)؛ (۸) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/۱۸)؛ (۹) ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/۲۶۱)۔

یوسف ہارویز نے انگریزی میں ایک مقالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن (۱۹۲۸ء) میں لکھا تھا۔ مصادر سیرت کا ذکر کرتے ہوئے جونسن نے بھی ایک مقالہ لکھا ہے۔

تصانیف/تالیفات :- (۱) کتاب المغازی - اس کتاب کے قلمی نسخے بہت سے کتابخانوں میں پائے جاتے ہیں۔ کتاب المغازی کے بعض اجزاء کو فان کریمر نے کلکتہ سے شایع کرایا۔ (۱۸۵۶) ولہاؤسن نے ان اجزا کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ عباس الشربینی نے کتاب المغازی قاہرہ سے شایع کی (۱۹۴۶ء) اس کا عمدہ اور تحقیقی ایڈیشن مسٹر جونسن نے تین جلدوں میں لندن سے شایع کیا (۱۹۶۶ء) کتاب المغازی کا فارسی اور ترکی ترجمہ بھی ہے ، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا اختصار بھی کیا تھا، ان کا خود نوشت نسخہ دارالکتب قاہرہ میں ہے۔ ابوالحدید نے شرح نہج البلاغۃ میں اس کے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

(۲) مولد النبیؐ :- تیس اوراق کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں۔

(۳) کتاب الردہ [ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) کی علمی مساعی سے حال ہی میں شایع ہوئی ہے]۔

(۴) فتوح الشام :- مصر سے کئی بار چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

(۵) فتوح مصر :- قلمی نسخے مصر اور استانبول میں ہیں۔

(۶) فتوح البہنساء - (فی صعید مصر) قاہرہ میں چھپ چکی ہے، فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۷) واقدی سے فتوح افریقیہ، فتوح العراق اور فتوح آمد بھی منسوب ہیں۔

(۸) طعم النبیؐ :- اس کے اقتباسات ابن سعد نے دیے ہیں (۸/۴۸)، بیروت۔

(۹) مقتل الحسین :- ابن حجر نے الاصابہ میں اس کا حوالہ دیا ہے (۲/۷۷۹)

(۱۰) کتاب الصفین :- ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغۃ میں اس کے متعدد اقتباسات نقل کیے ہیں۔

(۱۱) التفسیر :- الثعالبی نے اپنی تفسیر الکشف والبیان میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

(۱۲) کتاب اخبار مکہ :- امام ازرقی نے اپنی کتاب میں اس سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔

(ابن الندیم : الفہرست، ص ۹۸)

(۱۳) کتاب الطبقات :۔ یہ طبقات کے سلسلے کی قدیم ترین کتاب ہے، ابن سعد کے طبقات اسی کتاب کی اساس پر مبنی ہیں۔ الطبری نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعات اسی کتاب سے نقل کیے ہیں (۱/ ۲۹۶۵ و ۳۰۶۰)۔ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ واقدی نے صحابۂ کرامؓ، ان کے بیٹوں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوفہ و بصرہ کے محدثین کے حالات سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے۔

(۱۴) کتاب ازواج النبیؐ :۔ طبقات ابن سعد میں اس کے بہت سے حوالے ملتے ہیں۔

۱۱۔ ابن ہشام الحمیری

ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری، مورخ، انساب کے عالم اور نحوی تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے، لیکن زندگی مصر میں گذاری اور فسطاط میں ۲۱۸ھ/۸۳۴ء یا ۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں۔

ابن خلکان (بولاق) ۱/ ۳۶۵)؛ (۲) السہیلی (الروض الانف، ۱/۵)؛ (۳) القفطی (انباہ الرواۃ، ۲/ ۲۱۱ - ۲۱۲)؛ (۴) السیوطی (بغیۃ الوعاۃ، ص ۳۱۵)؛ (۵) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/ ۴۵)؛ (۶) الزرکلی (الاعلام، ۴/ ۲۱۴)؛ (۷) الکحالہ (معجم المولفین، ۶/ ۱۹۲)۔

تصانیف :۔ سیرت محمد رسول اللہ، اس کے مخطوطات ایشیا اور یورپ کے بہت سے کتبخانوں میں پائے جاتے ہیں۔

سیرت ابن ہشام کے طبقات :۔ سب سے پہلے دستنفیلڈ نے سیرت کو ۱۸۵۸ء میں گوٹنگن (جرمنی) سے شایع کیا۔ وائل نے سیرت کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا (سٹٹ

گارٹ ۱۸۶۴ء)، محمد محی الدین عبدالحمید اور مصطفیٰ السقا اور ابراہیم الابیاری نے علی الترتیب ۱۹۳۷ء و ۱۹۵۵ء میں اس کے ایڈیشن قاہرہ سے شایع کیے۔

شروح سیرت ابن ہشام:۔ (۱) عبدالرحمٰن بن عبداللہ السہیلی (المتوفی ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء) نے سیرت کی شرح الروض الانف کے نام سے لکھی۔ اس کا عمدہ ایڈیشن عبدالرحمٰن الوکیل کی تحقیق اور تعلیق سے قاہرہ سے شایع ہوا ہے (۱۹۶۷۔۱۹۷۰ء)

(۲) سیرت کے مشکل الفاظ کی شرح ابوذر مصعب بن محمد بن مسعود الخشنی الجبانی(؟) (المتوفی ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء) نے لکھی، جو چھپ چکی ہے۔

(۳) فتح بن موسیٰ المغربی (المتوفی ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء) نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔

(۴) یوسف بن عبدالہادی (المتوفی ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء) نے اس کی شرح المیرۃ فی حل مشکل السیرت کے عنوان سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہے۔

مختصرات سیرت ابن ہشام (۱) احمد بن ابراہیم الواسطی (المتوفی ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء) نے اس کا اختصار کیا، جس کے قلمی نسخے لائیڈن، لندن اور استانبول میں ہیں۔

(ب) المؤید باللہ یحییٰ بن حمزہ بن علی (المتوفی ۷۴۹ھ/۱۳۴۹ء) نے اس کی تلخیص خلاصۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے کی، قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ میں ہے۔

(ج) محمد بن ابی بکر بن جماعہ (المتوفی ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء) نے سیرت کا خلاصہ مختصر السیر کے نام سے لکھا، کتابخانہ تیمور پاشا میں قلمی نسخہ ہے۔

(د) عبدالسلام محمد ہارون نے اس کی تہذیب 'تہذیب سیرت ابن ہشام' کے عنوان سے کی اور قاہرہ اور بیروت سے اس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

۲۔ التیجان لمعرفۃ ملوک الزمان فی اخبار قحطان، حیدرآباد دکن سے شایع ہو چکی ہے۔

۱۲۔ ابن سعد

ابو عبداللہ محمد بن سعد بن منیع البصری، الزہری، واقدی کے شاگرد تھے جو کاتب الواقدی کے نام سے مشہور ہیں، ۱۶۸ھ/۷۸۴ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے، زندگی مدینہ منورہ اور دوسرے شہروں میں گذاری، اگرچہ ابن سعد نے بہت سے علماء سے اخذ و استفادہ کیا تھا، لیکن الواقدی ہی ان کے اولین استاد شمار ہوتے ہیں، اس لیے سیرت النبی کی تالیف میں وہ واقدی کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ ہشام بن محمد الکلبی کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ابن سعد ابن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی سے بھی اخذ و استفادہ کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ واقدی کی کتاب "وفات النبی" بھی ان کے پیش نظر ہے۔ انساب الانصار کے لیے عبداللہ بن محمد بن عمارۃ (المتوفی ۲۰۰ھ/۸۱۵ء) کی کتاب "نسب الانصار" ان کا ماخذ ہے (دیکھیے خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۱/۷۲، اور مقدمہ زخاؤ بر جلد ثالث، طبقات ابن سعد، ص ۲۰)

حالات کے مصادر:۔

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۲/۲۶۴)؛ (۲) خطیب بغدادی (تاریخ بغداد، ۵/۳۲۱-۳۲۲)؛ (۳) ابن خلکان (وفیات الاعیان ۱/۶۴۱-۶۴۲)، (۴) الذہبی (میزان الاعتدال، ۳/۹۳)؛ (۵) وہی مصنف (طبقات الحفاظ، ۲/۱۲)، (۶) ابن حجر (التہذیب، ۹/۱۸۲-۱۸۳)؛ (۷) ابن تغری بردی (النجوم الزاہرہ، ۲/۲۵۸) (۸) براکلمان ۱/۱۳۶)، (۹) الزرکلی (الاعلام، ۷/۶) وغیرہ۔

تصنیف و تالیف:۔ (۱) کتاب الطبقات الکبیر۔ طبقات کی پہلی دو جلدیں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ہیں، لہذا ان کا نام "اخبار النبی" ہے باقی جلدیں صحابہ اور تابعین

کے حالات کے لیے وقف ہیں (۲۳۰ھ تک) یہ کتاب حارث بن محمد بن اسامہ التمیمی (المتوفی ۲۸۲ھ/۸۹۳ء) کی روایت سے ہم تک پہنچی ہے، طبقات کی مختلف جلدیں برلن، استانبول اور لندن کے کتابخانوں میں تھیں۔ جرمن مستشرقین کی علمی کاوش سے جن میں زخاؤ، یوسف ہارویز اور براکلمان وغیرہ شامل تھے، طبقات کی آٹھ جلدیں لائیڈن سے شایع ہوئیں ۱۹۰۴-۱۹۱۷ء۔ نویں جلد مختلف فہارس پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد طبقات کی آٹھ جلدیں بیروت سے چھپ کر شایع ہوئیں (۱۹۵۷ء-۱۹۶۰ء) افسوس ہے کہ ان میں اختلافات نسخ مذکور نہیں۔ طبقات ابن سعد کا فارسی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے [اردو ترجمہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کی علمی یادگار ہے]

(۲) قصیدہ حلوانیہ فی افتخار القحطانیین علی العدنانیین:- غازی بن یزید نے اس قصیدے کی شرح بھی لکھی تھی، قاہرہ میں چند اجزا ہیں۔

(۳) کتاب الطبقات الصغیر:- اس کے ۱۳۹ اوراق استانبول میں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب، الطبقات الکبیر سے پہلے لکھی گئی تھی۔ اس میں بعض مشاہیر کے حالات ہیں۔

۱۳- ابن عائذ

ابو عبداللہ، محمد بن عائذ بن احمد القرشی، ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں دمشق میں پیدا ہوئے اور الولید بن مسلم، یحیی بن حمزۃ الحضرمی، اسمٰعیل بن عیاش وغیرہم سے حدیث کی روایت کی جبکہ ابو داؤد، ابو زرعہ وغیرہم ان کے راوی ہیں، وہ انشا پرداز، مورخ اور ثقہ محدث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قدری تھے، انھوں نے ۲۳۳ھ/۸۴۷ء میں دمشق میں وفات پائی۔ حالات کے ماخذ ملاحظہ ہوں۔

(۱) البخاری (تاریخ الکبیر، ۱/۱/۲۰۷)، (۲) الذہبی (دول الاسلام، ۱/۱۰۲)؛

(۳) الصفدی (الوافی بالوفیات، ۳/۱۸۱)؛ (۴) ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ، ۱/۳۱۳)؛ (۵) ابن حجر (التہذیب، ۹/۲۴۱-۲۴۲)؛ (۶) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/۶۶)؛ (۷) الزرکلی (الاعلام، ۷/۴۸) وغیرہ۔

آثار علمیہ:۔ المغازی۔ ابن سید الناس کی کتاب "عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر" اہم اور سب سے بڑا ماخذ ابن عائذ کی کتاب المغازی ہے۔ اس کے علاوہ الاصابہ میں اسکے بے شمار اقتباس ہیں۔

۱۴۔ حماد بن اسحاق

ابو اسمٰعیل حماد بن اسحاق بن اسمٰعیل الازدی، ۱۹۹ھ/۸۱۵ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ساری زندگی بغداد میں گذاری جہاں وہ عہدۂ قضاء پر فائز تھے، مالکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور سوس (الاہواز) میں ۲۶۷ھ/۸۶۱ء میں وفات پائی۔ حالات کے مصادر۔

(۱) ابن الندیم (الفہرست، ص ۲۰۰)؛ خطیب بغدادی (تاریخ بغداد، ۸/۱۸۹)؛ (۲) ابن فرحون (الدیباج، ص ۱۰۷ و ۱۰۸)؛ (۳) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/۱۵۲-۱۵۳)، (۴) الکحالہ (معجم المولفین، ۴/۷۲)۔

تالیفات:۔ ترکۃ النبیؐ۔ اس کے راوی حماد بن اسحاق کے بیٹے ابو اسحاق ابراہیم بن حماد ہیں۔ کتاب کے چند اوراق کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں۔

۱۵۔ ابو زرعۃ

ابو زرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو بن عبداللہ الدمشقی نے ۲۸۰ھ/۸۹۳ء دمشق میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ:

(۱) ابن ابی یعلی (طبقات الحنابلہ، ۱/۲۰۵-۲۰۶)؛ (۲) السمعانی (الانساب، ص

۵۶۳)؛ (۳) ابن حجر (التہذیب، ۹/ ۳۳۶)؛ (۴) ابن العماد (شذرات الذہب، ۲/ ۱۷۷)؛ (۵) السخاوی (الاعلان، ص ۱۱۸)؛ (۶) الزرکلی (الاعلام، ص ۹۴) وغیرہ

(۱) آثار علمیہ: سیرۃ النبیؐ و تاریخ خلفاء الراشدین:۔ اس کے ۱۵۰ اوراق کتابخانہ الفاتح (استانبول) میں ہیں۔

(۲) الاحادیث والحکایات والعلل والسوالات:۔ چند اوراق کتابخانہ الظاہریہ میں ہیں۔

۱۶۔ ابن شعیب الانصاری

ابو علی محمد بن ہارون بن شعیب الانصاری، دمشق کے قریب پیدا ہوئے۔ طلب علم میں انھوں نے مصر، عراق اور اصفہان کا سفر کیا اور ۳۵۳ھ/ ۹۶۴ء میں وفات پائی۔

حالات کے مآخذ:

(۱) ابن حجر (لسان المیزان، ۵/ ۴۱۱)؛ (۲) ابن العماد (شذرات الذہب، ۳/ ۱۳)؛ (۳) الزرکلی (الاعلام، ۷/ ۳۵۲)۔

آثار علمیہ:۔ صفۃ النبیؐ۔ چند اوراق کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں۔

(تاریخ التراث العربی)

[مذکورہ بالا کتب مغازی سیرت طیبہ کے بنیادی مآخذ ہیں۔ بعد میں آنے والے مورخین نے ان کی شرح یا تلخیص کر دی ہے۔ متاخرین میں علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی (المتوفی ۹۴۲ھ) قابل ذکر ہیں، جن کی کتاب "سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" سیرۃ مطہرہ کا دائرۃ المعارف ہے۔ اس کی پانچ ضخیم جلدیں قاہرہ سے چھپ کر شایع ہو چکی ہیں اور ہنوز طباعت جاری ہے۔]

فارسی ادبیات کے دو مورخ
پروفیسر براؤن اور علامہ شبلیؒ

از جناب سید محمد طارق علیگڑھ

فارسی شعر و ادب کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن میں علامہ شبلیؒ اور پروفیسر براؤن کے نام آجاتے ہیں۔ تاریخ ادبیات ایران[1] اور شعر العجم، فارسی ادب کی تاریخ پر لکھی جانے والی سب سے ممتاز تصانیف ہیں گو تاریخ ادبیات سے پہلے یورپ کی بعض زبانوں میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ پر کسی قدر کام ہو چکا تھا اور اس کے بعد تو دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں لیکن جو اہمیت براؤن کی تاریخ ادبیات کو حاصل ہوئی اور جو شہرت و مقبولیت اسے نصیب ہوئی اس سے یہ سب محروم رہیں۔

شعر العجم تمام اسلامی زبانوں میں اس موضوع پر پہلی تصنیف تھی اور آج جبکہ اسکی آخری جلد چھپے ہوئے پون صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اور کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں لیکن شعر العجم کا طرز اور اس کی جیسی مقبولیت کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا سا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

---

[1] تاریخ ادبیات ایران سے مراد پروفیسر براؤن کی مشہور تصنیف A Literary History of Parsia ہے۔ اس مضمون میں جہاں کہیں تاریخ ادبیات یا تاریخ ادبیات ایران تحریر ہوگا اس سے یہی کتاب مراد ہوگی۔

ایضاً (۴)، ۵۶۳) ادب کی تاریخ کے سلسلے میں علامہ شبلیؒ اور پروفیسر براؤن کی ذات، ان کی تصانیف ـ تصنیفوں کے بارے میں ان کی تحقیقات اور رائیں اکثر زیر بحث آتی رہتی ہیں اس لیے ان دونوں کو موضوع مطالعہ بنانا مناسب معلوم ہوا۔

شیرانی صاحب کی تنقیدات شعرالعجم کے بعد اس کے بعض تاریخی اغلاط بھی لوگوں کے سامنے آئے۔ براؤن کی تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ کم ہی لوگوں نے کیا ہے۔ اسی لیے بعض اصحاب علم و نظر بھی شعرالعجم کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا فارسی ادب کی تاریخ کی حیثیت سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں براؤن کی تاریخ ادبیات کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے جیسے وہ کوئی آسمانی صحیفہ ہے جس سے بہتر تاریخ ادب نہ لکھی گئی اور نہ لکھی جانی ممکن ہے۔ کاش یہ حضرات براؤن کی تاریخ کے مقدمے اور پیش لفظ ہی کا مطالعہ کر لیتے تو معلوم ہوتا کہ شعرالعجم کے بہت سے معایب اس میں بھی موجود ہیں، اور اسی طرح موخرالذکر کے بہت سے محاسن سے بھی یہ تصنیف محروم ہے، پروفیسر براؤن کو اس بات کا احساس بھی ہے۔ تاریخی اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کچھ لکھے گا تو غلطیاں ضرور ہوں گی اور اگر کوئی شخص اغلاط سے پاک کتاب لکھنا چاہے گا تو وہ کبھی کچھ نہیں لکھ سکتا۔

"He who would write a Flawless book writes nothing."[1]

شعرالعجم اور لٹریری ہسٹری آف پرشیا دونوں ایک ہی زمانے میں لکھی گئیں اور دونوں کو ایک دوسرے پر تقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔ پروفیسر براؤن نے

---

[1] براؤن تاریخ ادبیات ایران جلد اول ص X I

اپنی تصنیف ۱۸۸۸ء میں شروع کی اور اس کی پہلی جلد ۱۹۰۲ء میں اور دوسری جلد ۱۹۰۶ء میں منظر عام پر آئیں۔ علامہ شبلیؒ کو ۱۸۹۴ء میں پروفیسر آرنلڈ نے اس طرف متوجہ کیا۔ لیکن وہ اس کام کی ابتدا ۱۹۰۷ء سے پہلے نہ کر سکے، پھر بھی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک شعرالعجم کی تمام جلدیں چھپ کر عام ہو چکی تھیں[1]۔ براؤن نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد ۱۹۲۰ء میں اور چوتھی جلد ۱۹۲۴ء میں مکمل کی ہے اس طرح کام کا آغاز پہلے پروفیسر براؤن نے کیا اور ان کی کتاب کی دو جلدیں بھی پہلے چھپیں لیکن کام کی تکمیل علامہ شبلیؒ پروفیسر براؤن سے پہلے کر چکے تھے۔

علامہ شبلیؒ اور پروفیسر براؤن دونوں کو اپنی اپنی تصانیف کے دوران دوسرے مصنف کی معلومات اور تحقیقات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے۔ شعرالعجم جلد اول کے مقدمہ میں اہل یورپ کے فارسی زبان کے ساتھ اعتنا کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

"سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر براؤن نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں، اس کتاب کے دو حصے شایع ہو چکے ہیں[2]۔ ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گذریں اور جن سے فائدہ اٹھا سکنا ممکن تھا میں نے فائدہ اٹھایا"[3]

پروفیسر براؤن سے علامہ شبلیؒ کا استفادہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ ادبیات کی پہلی دو جلدوں میں ان کے مطلب کی باتیں زیادہ تھیں ہی نہیں البتہ

---

[1] معارف: شعرالعجم کی دو جلدوں کی اشاعت کے سنین بہ ترتیب ذیل ہیں حصہ اول: ۱۹۰۸ء حصہ دوم: ۱۹۰۹ء حصہ سوم: ۱۹۱۰ء حصہ چہارم: ۱۹۱۲ء حصہ پنجم: دسمبر ۱۹۱۸ء [2] شعرالعجم حصہ اول (علی گڑھ) ص۲ [3] شعرالعجم حصہ اول ص۸

فردوسی کے حالات کے ضمن میں "محققین یورپ کی رائے" کے زیر عنوان پروفیسر نولدیکی کی تحقیقات کے اقتباسات جو براؤن نے اپنے یہاں درج کیے تھے، اس کے ضروری مقامات کا ترجمہ علامہ شبلیؒ نے اپنے یہاں شامل کر لیا ہے۔

رہا شعرالعجم سے پروفیسر براؤن کے استفادے کا معاملہ تو حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ادبیات کی تیسری اور چوتھی جلد مسلسل شعرالعجم کے اقتباسات کے ترجموں سے گرانبار ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شعرالعجم سے متعارف ہونے کے بعد ہی براؤن کو تیسری اور چوتھی جلد مکمل کرنے کا خیال آیا تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ انھوں نے خود ہی پہلی جلد کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ انکا منصوبہ یہ تھا کہ یہ کتاب ایک جلد میں مکمل کر دی جائے گی۔ جس میں شروع سے موجودہ زمانہ تک ایران اور اہل ایران کی تاریخ ہوگی لیکن جلد ہی اس میں تبدیلی آئی اور طے پایا کہ ایران پر مغلوں کے حملے اور زوال خلافت تک اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے کیونکہ یہ ایران کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ گویا کتاب دو جلدوں میں ہو، پہلی جلد آغاز سے عربوں کے حملے تک اور دوسری جلد عربوں کی ایران میں آمد سے منگولوں کے حملے تک۔ اس سے آگے کام بڑھانے کی دشواریوں سے براؤن واقف تھے۔ اسی لیے دوسری جلد کی تصنیف کے بعد بہت دنوں تک وہ تذبذب کا شکار رہے اور کام کو آگے بڑھانے کی ہمت نہ کر سکے۔ تاریخ ادبیات کی دوسری اور تیسری جلد کے درمیان ۱۴ سال کا فاصلہ بے وجہ نہیں ہے۔ اس دوران انہیں قلمی کتابوں کے کئی ذخیرے میسر ہو گئے اور خوش قسمتی سے انہیں ڈاکٹر محمد اقبال کے ذریعہ جو پروفیسر براؤن کے شاگرد تھے اور تاریخ ادبیات کی تصنیف میں ان کے معاون رہے ہیں، انہیں شعرالعجم سے واقفیت حاصل ہوئی اپنے موضوع

سے متعلق معلومات، تحقیقات اور خاص طور سے تنقیدات کا اتنا بڑا سرمایہ پاکر انھوں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں تاریخ ادبیات کی بقیہ دونوں جلدیں فارسی ادب کی تاریخ کے نام سے مکمل ہوئیں۔

تاریخ ادبیات کی تیسری جلد میں سلمان ساؤجی کے ذکر سے باقاعدہ شعرالعجم کے اقتباسات نظر آتے ہیں۔ صرف سلمان کے ذکر میں مکمل سات صفحے شبلیؒ سے ماخوذ ہیں۔ سلمان کے فوراً بعد حافظ کا ترجمہ شروع ہو جاتا ہے۔ براؤن ابتدائی چند سطریں لکھکر تحریر فرماتے ہیں[1]:

"مجموعی حیثیت سے حافظ پر بہترین اور جامع ترین تبصرہ جو میرے علم میں ہے علامہ شبلی نعمانیؒ کی اردو کتاب شعرالعجم میں درج ہے جو فارسی شاعری کی تاریخ پر ایک اہم تصنیف ہے اور اس باب میں اوپر بار بار اس کے حوالے آچکے ہیں، میرے خیال میں میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ اس تذکرے سے کم سے اس حصہ کا خلاصہ پیش کردوں جو شاعر کی زندگی سے بحث کرتا ہے اور اس کے ذاتی حالات اور معاصرین کے ساتھ تعلقات کی چند ایسی اطلاعات بہم پہنچاتا ہے جو اسکے اپنے کلام سے اخذ کی جاسکتی ہیں"۔

اس کے بعد ص ۲۷۳ سے ۲۹۸ تک مسلسل علامہ شبلیؒ کے اقوال، ان کی تحقیقات اور کلام حافظ پر ان کی رائیں شعرالعجم سے ترجمہ کردی گئی ہیں اور اقتباسات کا یہ سلسلہ یہ کہہ کر ختم کیا ہے:

"Shibli Nomani gives a great Number of other instances of Parallals, but The -

---

[1] A literary History of Persia جلد سوم ص ۲۸۳۔

specimen cited above suffice to establish The fact of Parallalism which so far I Know, has not been hitherto noticed which by any other European orientalist.

یعنی علامہ شبلیؒ نے اسی قسم کی متعدد متوازی مثالیں دی ہیں، لیکن اوپر جو نمونے نقل کیے گئے ہیں وہ اس تقابل کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جہانتک مجھے معلوم ہے آج تک کسی دوسرے یورپی مستشرق کی نظر ان پر نہیں پڑی ہے۔

سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اگر براؤن کی تیسری جلد کے صرف انڈکس ہی پر نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوگا کہ ابوطالب کلیم تک جہاں شعرالعجم کی تیسری جلد تمام ہوئی ہے جگہ جگہ براؤن محض علامہ شبلیؒ کے ترجمان ہیں۔

اثر آفرینی اور اثر پذیری کے فطری عمل سے قطع نظر دونوں کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے مصنفین نے شعر و ادب کی تاریخ کو موضوع بنایا ہے لیکن دونوں تصانیف کا مقصد اور مطمح نظر جداگانہ ہے۔

شعرالعجم کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ شبلیؒ رقمطراز ہیں:۔

" افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب پیدا ہوئی اور کن اسباب سے شروع ہوئی، کس طرح عہد بہ عہد بڑھی، کیا کیا انداز قائم ہوئے۔ کیا کیا

لے A literary History of Persia جلد سوم ص ۲۹۸۔

صورتیں بدلیں، ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کیے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا .... میں اس کو مدت سے محسوس کر رہا تھا اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا........ پچھلے سال پرانا خیال پھر تازہ ہوا اور ۶ر مارچ ۱۹۰۷ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا........ ستمبر ۱۹۰۸ء کی چھٹی تاریخ کو دور اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔[1]

گویا علامہ شبلیؒ کے ذہن میں ایک ایسی کتاب تھی جس میں شاعری کی تعریف، اس کی تاریخ، وہ کب شروع ہوئی اور کن اسباب سے شروع ہوئی، عہد بہ عہد ترقی، تبدیلیاں، ملکی حالات سے اثر پذیری اور اثر آفرینی کا بیان، نمایندہ شاعروں کے حالات تحقیق کے ساتھ لکھے جائیں، ان کی شاعری کی خصوصیات سے بحث کی جائے اور ان کے کلام کے بارے میں بلا رو رعایت رائے دی جائے اس مقصد کے لیے انھوں نے فارسی شاعروں کو تین ادوار پر تقسیم کیا قدما، متوسطین اور متاخرین، ان میں سے ہر دور کیلئے ایک جلد مخصوص کی۔ تینوں جلدوں میں پہلے متعلقہ دور کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس دور کی شاعری کی خصوصیات کو مورد بحث بنایا ہے۔ اسکے بعد مشاہیر شعرا کے شرح احوال اور ان کی فکر و طرز فکر اور روش شاعری کو علمی تنقید کے اصول پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے کلام کے محاسن و معایب کو پیش کیا ہے، چوتھی اور پانچویں جلد میں جن میں عام شاعری پر ریویو ہے، بقول علامہ شبلیؒ کتاب کی جان اور اس کی روح رواں ہیں۔

اس کے برخلاف براؤن کے پیش نظر تاریخ ادبیات ایران لکھتے وقت ایک

---

[1] شعر العجم حصہ اول ص ۲-۳۔

دوسرا ہی مقصد ہے، انہوں نے خود بتایا ہے کہ ان کی دیرینہ خواہش یہ تھی کہ گرین کی Sho-
-rt history of English People کے انداز پر وہ ایرانیوں کی ذہنی
ترقیوں کی تاریخ لکھیں۔ اتفاق سے انہیں دنوں انہیں ایک پیشکش ہوئی جس کی رو سے
انہیں literary history of Englihs People کے طرز پر ایران کی
ادبی تاریخ لکھنی تھی، ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا وقت آگیا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی
کتاب لکھنی شروع کی جو ان ہی کے بقول ایرانی لوگوں کی ذہنی تاریخ ہے نہ کہ ان شعرا و
ادبا کی تاریخ جو فارسی زبان کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں[1]۔ چنانچہ پروفیسر براؤن
نے "تاریخ ادبیات کی جلد اول کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا
ماحصل یہ ہے:

"یہ محض فارسی ادب کی تاریخ نہیں ہے کیونکہ ایک طرف تو اس سے ان لوگوں
کو خارج کر دیا گیا ہے جو اگرچہ فارسی زبان کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے
ہیں لیکن اصلاً ایرانی نہیں ہیں۔ دوسری طرف اس میں ان تمام تصانیف کو شامل
کیا گیا ہے جو ایرانیوں نے لکھی ہیں خواہ ان کا ذریعہ اظہار خیالات اپنی مادری زبان
(فارسی) کے علاوہ کسی دوسری زبان کو بنایا ہو، جیسے مثال کے طور پر ہندوستان
نے اگرچہ ایسے ادب کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا کیا ہے جس کی زبان فارسی ہے،
لیکن وہ بہرحال ایرانی ذہن کا عکاس نہیں ہے"[2]

گویا براؤن کا مقصد ایرانیوں کی ادبی تاریخ لکھنا ہے نہ کہ فارسی شعر و ادب کی
تاریخ مرتب کرنا، یہ اور بات ہے کہ فارسی ادب کے مطالعے کے بغیر اہل ایران کے ذہنی

۱- A literary history of Persia Page VII + VIII ۲- ایضاً Page VIII

ارتقا کی تاریخ سے واقفیت ممکن ہی نہیں، اس لیے ادبی تاریخ کی طرف بھی انہیں توجہ کرنی پڑی ہے، لیکن یہ ان کی اصل نہیں ثانوی غرض ہے، براؤن کی تاریخ ادبیات کی پہلی بلکہ دوسری جلد میں بھی یہ رنگ پوری طرح نمایاں ہے، یہاں براؤن خالص مورخ کے انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں جس کے پیش نظر سیاسی تاریخ ہے، مختلف ادوار میں جو زبانیں ایران میں رائج تھیں، ان کی تحقیق ہے، مختلف لہجوں کے بارے میں واقفیت بہم پہنچانا ہے، مسلمانوں سے پہلے ایرانی ادب اور اس کے بارے میں جو تاریکی و نیم تاریکی مواد ملتا ہے اس کی چھان پھٹک ہے، پھر عربوں کا حملہ، بنی امیہ کا دور، عباسی عہد سلطنت اور اسکی خصوصیات، اس زمانہ میں مذہب اور فلسفہ کی ترقی کا ذکر اور اس دور کے ادب کا بیان ہے۔

براؤن کا میدان بہت وسیع ہے، ان کے موضوع کی وسعت اس کی متقاضی ہے کہ ایک جماعت کے تعاون سے یہ کام انجام دیا جائے، گو ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن [illegible] موضوع اس سے زیادہ مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ خود براؤن کو اس بات کا احساس ہے، اسی لیے وہ بار بار اپنے بنیادی منصوبے میں تبدیلی کرتے ہیں، پہلی جلد میں معلومات کا دریا جس روانی کے ساتھ بہتا ہے، دوسری جلد میں اس میں کمی آجاتی ہے اور تیسری اور چوتھی جلدوں میں اگرچہ انھوں نے اپنا طرز کسی قدر تبدیل کیا ہے اور شعر العجم کی مدد سے تجزیہ و تنقید کا اضافہ کیا ہے، اس کے باوجود یہ جلدیں پہلے دونوں حصوں سے کمزور ہیں۔

براؤن بقول داؤد رہبر "مقدم طور پر ایک کامل مورخ ہیں، وہ اچھے سے اچھے شہ پارے میں بھی شہروں کے نام اور ممدوحوں کی فہرست ڈھونڈتے ہیں اور اسکی تاریخ تصنیف پر لمبی بحثیں لکھ جاتے ہیں"۔

براؤن کا تاریخ و عمرانیات کا مطالعہ علامہ شبلیؒ سے کہیں زیادہ ہے، وہ نہایت محققانہ انداز میں کسی دور کے تاریخی حقایق کا انبار لگا دیتے ہیں. لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان سیاسی اور تاریخی حالات کا ادب پر کیا اور کس طرح اثر پڑا۔ وہ تاریخ و ادب کے باہمی تعلق و ربط کے بارے میں بے باکانہ نتائج نہیں نکالتے ۔ وہ یہ مشاہدہ تو کرتے ہیں کہ ایران میں بدامنی کے زمانے میں ادب نے زیادہ ترقی کی ہے' وہ اس پر تعجب کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن اس کی کوئی نفسیاتی وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، براؤن کے یہاں عام طور پر یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے کسی دور کی سیاسی تاریخ کو بیان کر دیا جاتا ہے اس کے بعد اس دور کے ادب اور سیاسی حالات کے ادب پر اثر کا جاننا وہ قاری کا فرض سمجھتے ہیں. معلومات کے اعتبار سے تاریخ ادبیات ایران ایک دریائے بیکراں ہے جسے اس کتاب کے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے، اس میں یہ تو پتہ چلتا ہے کہ کس دور میں کیا ادب وجود میں آیا، لیکن یہ وضاحت نہیں ملتی کہ اس ادب کی نوعیت اور صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔

علامہ شبلیؒ کا موضوع محدود ہے وہ فارس کی تاریخ نہیں فارسی ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں پھر فارسی نثر کو بھی وہ اپنے مطالعے سے خارج کر دیتے ہیں اور محض فارسی شاعری کی تاریخ کو انھوں نے اپنا موضوع بحث قرار دیا ہے، یہ موضوع یقیناً محدود ہے، اس سے عہدہ برآ ہونے میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں انھوں نے اپنے موضوع کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی ہیں، اس کے لیے جس قدر مطالعے کی ضرورت تھی اور یہ موضوع جس صلاحیت و استعداد کا متقاضی تھا وہ ان میں موجود ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تصنیف کا

جو خاکہ شروع میں بنایا تھا ایک معینہ مدت میں پوری کامیابی کے ساتھ اسی کے مطابق انھوں نے اپنی تصنیف کو مکمل کر کے پیش کر دیا۔

علامہ شبلیؒ براؤن کے برخلاف مورخ بھی ہیں، ادیب بھی اور ساتھ ہی ایک قادرالکلام شاعر بھی۔ وہ ایک مورخ کی طرح تاریخی اور سیاسی حالات پیش کرتے ہیں، سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس سے کچھ ٹھوس نتائج اخذ کرتے ہیں، تاریخ و ادب کا کیا تعلق ہے، مختلف ادوار کے سیاسی اور سماجی حالات نے اس دور کی زبان و ادب کو کس طرح متاثر کیا ہے، اس پر رائے دیتے ہیں اور وضاحت کرتے ہیں کہ کس دور کے ادب کی صحیح قدر و قیمت اور نوعیت کیا ہے۔

ایک بہت بڑی خصوصیت جو علامہ شبلیؒ کو براؤن سے ممتاز کرتی ہے وہ انکی قوت تنقید ہے، ادبی تاریخ، تاریخ تو ضرور ہے لیکن اس کا مزاج سیاسی تاریخ سے یقیناً علٰحدہ ہوتا ہے۔ اس پر قلم اٹھانے کے لیے صرف مورخ ہونا کافی نہیں، اسکے لیے تاریخی شعور کے ساتھ ادبی ذوق ہونا بھی ضروری ہے، محاسن و معایب میں تمیز کی صلاحیت کے بغیر اس راہ میں ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا، علامہ شبلیؒ میں یہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں، وہ نہایت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہیں، شعرالعجم میں مختلف شعراء کے کلام کا جو بہترین انتخاب انھوں نے پیش کیا ہے وہ انکی ادبی خوش ذوقی کا ایک ادنی نمونہ ہے۔

جہانتک اچھے برے کی پرکھ اور تنقیدی صلاحیت کا تعلق ہے خود براؤن اس کے معترف ہیں اور اپنی تصنیف میں بار بار اس کا تذکرہ کرتے ہیں، سلمان اور حافظ کے سلسلے سے براؤن کے اقوال پیش کیے جا چکے ہیں۔ فارسی تنقید کے سلسلے میں

تاریخ ادبیات کی چوتھی جلد میں براؤن نے ایک پیراگراف لکھا ہے، جس میں شعر العجم کو تنقید کی سب سے اہم کتاب مانا ہے لکھتے ہیں:

"میری رائے میں آغاز سے سترہویں صدی کے اواخر تک کے مشاہیر شعرا پر سب سے بہتر اور سب سے جامع تبصرہ کیا گیا ہے اس کتاب میں جو انتہائی بدقسمتی سے اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی گئی یعنی شعر العجم جو مشہور عالم علامہ شبلیؒ کی تصنیف ہے[1]۔"

اس کے علاوہ براؤن نے خود جس طرح جگہ جگہ علامہ شبلیؒ کے تنقیدی اقوال کو اپنے یہاں جگہ دی ہے وہ اس میدان میں براؤن پر علامہ شبلیؒ کی عظمت و فوقیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

براؤن یقیناً ایک بلند پایہ مورخ ہیں لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اچھے ناقد نہیں ہیں بلکہ تنقید کے بارے میں غیر صحت مندانہ نظریہ کے حامل ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں ادبی تنقید محض وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جس میں اچھا ادب پیدا کرنے کی صلاحیت کبھی تھی ہی نہیں یا کم از کم اب نہیں رہ گئی ہے[2]۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ادبی تاریخ کے مصنف کے لیے اعلیٰ ادبی ذوق ضروری ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اچھے برے ادب میں تمیز کر سکے، ہم مضمون اشعار میں خوب و خوبتر کی پہچان رکھتا ہو، شاعر کے دیوان سے اس کا بہترین نمونہ کلام انتخاب کر سکتا ہو، مختلف مشاہیر کی خصوصیات کلام اور انداز بیان سے اس حد تک واقف ہو کہ اگر ایک ہی مفہوم کے دو شعر پیش کیے جائیں تو وہ کم از کم سعدی و حافظ

---

[1] A literary history of Persia Vol IV P.164 [2] ایضاً صفحہ ۱۹۳۔

کے کلام میں امتیاز کر سکے، افسوس ہے کہ تاریخ ادبیات کا عظیم مصنف ادبی ذوق کے معاملے میں کم پایہ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے نزدیک گذشتہ پانچ چھ صدیوں میں ایران کی کلاسیکل شاعری اس قدر رسمی اور غیر متبدل رہی ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی قصیدہ، غزل یا رباعی کو سُن کر یہ اندازہ کیا جا سکے کہ یہ جامی کے کسی معاصر کا نتیجہ فکر ہے یا بہت بعد کے کسی شاعر مثلاً خاقانی کی تصنیف، انکے نزدیک مضمون اور ہیت کی یگانگت کی وجہ سے جامی و قاآنی کے دور یا انکے رنگ کی شاعری میں امتیاز نہ کر پانا کچھ بھی پر خوش ذوقی یقیناً نہیں ہے۔

اسی طرح بہت سے شعرا جو ایران میں مقبول ہیں، براؤن ان کو پسند نہیں کرتے، لیکن وہ یہ بھی نہیں سمجھتے ہیں کہ آخر یہ لوگ اہل ایران کے نزدیک اتنے اہم اور پسندیدہ کیوں ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے وہ انگریزی یا زیادہ وسیع پیمانے پر یورپین زبانوں کے ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہوں، لیکن فارسی ادب کے رمز شناس یقیناً نہیں ہیں۔

علامہ شبلیؒ کی ایک اور خصوصیت ان کا بڑا اعتماد دروبیہ ہے، وہ فارسی زبان کو اپنی زبان سمجھتے ہیں، انہیں اس پر پوری قدرت حاصل ہے، وہ اس زبان کے اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں، وہ اس احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں کہ حافظ، سعدی یا فردوسی کے کلام کو وہ کسی ایرانی سے کم سمجھتے ہیں یا چونکہ وہ ایرانی نہیں ہیں اس لیے انہیں ایرانی شعرا پر تنقید کا حق نہیں ہے۔ شعر العجم کی تصنیف خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود کو ایرانی شاعری پر رائے زنی اور فارسی شعراء کے کلام پر تبصرہ و محاکمے کا اہل سمجھتے ہیں۔

علامہ شبلیؒ غایر مطالعے کے بعد ایک رائے قائم کرتے ہیں اور بہت اعتماد کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ جب فردوسی و نظامی کے تقابل میں سکندر نامہ کی بہترین مثالیں پیش کرکے ان محدود مقامات پر نظامی کی برتری ثابت کرتے ہیں تو نہایت بے خوفی سے کہتے ہیں:۔

" نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بندش، فقروں کے درو بست، الفاظ کے شکوہ کا یہ عالم ہے کہ گویا شیر گونج رہا ہے، اس کے مقابلے میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح کوئی پیراتم بڈھا پیرانہ لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا ہے"[1]

لیکن آخر میں جب محاکے کے طور پر فردوسی کی برتری نظامی پر ثابت کرتے ہیں تو بڑے اعتماد سے ایک جملے میں معاملہ طے کر دیتے ہیں:۔

" ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہے اور نظامی نظامی"[2]

اس کے برخلاف براؤن جرأت مند قسم کے نقاد نہیں ہیں بلکہ غیر ملکی ادب پر رائے زنی کرتے ہوئے ان کو بے اندازہ تامل ہوتا ہے، جس کا اعتراف انھوں نے دو ایک جگہ کیا ہے۔ وہ اکثر ایسے موقعوں پر اس قسم کے جملے لکھتے ہیں:۔

" اگر ایک غیر اہل زبان ناقد کو کچھ کہنے کی اجازت ہے تو میں یہ کہونگا.....

اس لیے اکثر ایرانی شعرا کے کلام پر خود رائے دینے کے بجائے وہ کبھی کسی دوسرے مستشرق کا قول نقل کر دیتے ہیں اور کبھی علامہ شبلیؒ کا سہارا لیتے ہیں، یہ بات بظاہر فارسی ادب پر انکے اعتماد کی کمی کا نتیجہ ہے۔

---

[1] شعر العجم حصہ اول ص ۲۸۹ [2] ایضاً ص ۳۵۶۔

اس مختصر موازنہ کا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ براؤن کی تاریخ ادبیات اس اہمیت اور قدر و قیمت کی حامل نہیں ہے جو اسے حاصل ہے۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ براؤن کے یہاں بھی بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں اور شعرالعجم میں بھی کئی ایسی خوبیاں ہیں جن سے تاریخ ادبیات کا دامن خالی ہے نیز یہ ثابت کرنا ہے کہ شعرالعجم براؤن کی تاریخ کی تنقید، تردید یا تنقیص نہیں کرتی بلکہ اس کی تکمیل کرتی ہے۔

براؤن کے کام کو لوگوں نے آگے بڑھایا ہے، ضرورت ہے کہ علامہ شبلیؒ کے کام کو بھی آگے بڑھایا جائے اور تاریخ ادبیات ایران اور شعرالعجم کو بنیاد بنا کر فارسی ادب کی ایسی تاریخ مرتب کی جائے جس میں ان دونوں کی خوبیاں جمع ہوں اور خامیاں دور ہو جائیں۔

شعرالعجم (علامہ شبلی نعمانیؒ)

شعرائے فارسی کا یہ تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

اسکی پہلی جلد میں فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد کی ترقیوں اور انکے اسباب و خصوصیات پر بحث اور مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی) تک کے تذکرے اور کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، دوسری اور تیسری جلد میں شعرائے متوسطین و متاخرین کا تذکرہ مع تنقید کلام ہے چوتھی میں تفصیل کیساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر ڈالا اور شاعری کی صنف مثنوی پر بسیط تبصرہ اور پانچویں میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔

ذوق کی غزل

از پروفیسر محمد ذاکر دہلی

محمد حسین آزاد کی سی عقیدت کوئی کہاں سے لائے کہ ذوق کی غزل پر آبِ حیات برسائے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر اس کی عظمت کا لاریب نقش بٹھائے۔

شیخ محمد ابراہیم کی پیدائش سنہ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں دلی میں ہوئی اور وفات بھی وہیں سنہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں ہوئی، ان کے سعادتمند شاگرد اور ممتاز تذکرہ نگار محمد حسین آزاد کہتے ہیں وہ سپاہی زادے تھے، گویا ان کے خاندان میں ان سے پہلے علم و فضل کا زیادہ چرچا نہیں تھا۔ علاوہ ازیں ذوق کا زمانہ بھی جاگیرداری اور طبقہ واریت کا تھا۔ اس بیسویں صدی کے اواخر میں جب کہ برابری اور مساوات کے پُر شور نعرے اور اعلان ہو رہے ہیں کتنوں کو برابری کے واقعی برابر مواقع حاصل ہیں، پھر اس زمانے کا تو ذکر ہی کیا۔ ہر شخص راہِ طریقت اختیار کر کے سجادہ نشین صوفی بھی نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ واقعی طمانیتِ قلب یا کسی ذاتی مصلحت کی وجہ سے اس کے آگے سر جھکا دیتے اور اس طرح اسے سماج میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ معمولی تجارت اتنا باعزت پیشہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لشکری یا فوجی پیادے کی توقیر کب رہی تھی، آخر آخر وہ احدی ہو چکا تھا اور اب احدی لفظ ہی سُست اور کاہل کا مترادف ہو چکا تھا۔ سماج میں اپنی منفرد و ممتاز جگہ بنانے کے لیے معمولی گھرانے کا آدمی کیا کر سکتا تھا۔ بجز اس کے کہ کسی صنعت و ہنر میں مہارت حاصل کرے

شاہان والاتبار یا صاحبانِ ذی شان واقتدار کی نگاہوں میں موقر ہونے کی کوشش کرتا۔ ہنرپروری کے لیے بہر حال فراغت وتمول درکار ہے۔ اس زمانے میں شاعری ایک ایسا ہی ہنر، ایک ایسی ہی صنعت تھی جس کے ذریعے اہل وقار اور شرفا ورؤسا کی ہمنشینی اور اس طرح سماج میں قدر و منزلت حاصل ہوسکتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ اُس زمانے یعنی انیسویں صدی کے وسط تک شاعری سے شغف کو، نمایاں طور پر اردو کے شہری معاشرے میں 'تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اس حد تک کہ ہر خاص و عام چاہے شعر نہ بھی کہے مگر شعر وسخن سے دلچسپی کے اظہار کو اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا، خواص کے ہاں مشاعرے عام تھے جن میں عام لوگ بھی ادب کے ساتھ مگر برابر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور دادِ سخن دیتے۔ چنانچہ مکتبی تعلیم کے دوران شیخ محمد ابراہیم شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ وہ بچپن میں دعائیں مانگتے تھے کہ مجھے شعر کہنا آجائے۔ مکتب کے استاد کا تخلص 'شوق' تھا، انھوں نے ذوق اختیار کر لیا۔ شاعری فن لطیف ہے اور شعر گوئی کی طرف یہ رغبت ذوق کے ذوق لطیف کی دلیل ہے۔ مگر انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی کو اپنی طبیعت کا غالب رجحان نہ بننے دیا جس سے ان کے فطری جذبۂ شعر گوئی کی شدت کی کمی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی کہ سچی شاعری بنیادی طور پر ایک طرح کا اندرونی جوشش، ایک فطری ابال، ایک شور انگیز جذبہ چاہتی ہے۔

ذوق نے اپنے شوق اور محنت سے نجوم و طب و تاریخ وغیرہ میں دستگاہ بہم پہنچائی جو اُن کی قصیدہ گوئی میں زیادہ کام آئی۔ فن شعر میں مشق و مزاولت نے

قصیدہ گوئی سے مل کر انھیں مغل دربارسے، جیسا بھی وہ تھا، "خاقانیٔ ہند" اور "ملک الشعرا" کے خطابات دلوائے اور انعام میں گاؤں بھی، مگر طبعاً ذوق زر و زمین اور مال و جاہ کے طلبگار نہ تھے۔ ایک شعر ان ہی کا انکے حسب حال ہے۔

ہے لوثِ حُبِّ زر سے یہ دامن ہمارا پاک گر چھینٹ بھی پڑے تو بحدِ درم نہیں

وہ تو بس مہذب رہتے ہوئے اپنے آپ کو دلی میں موقر و محترم دیکھنا چاہتے تھے۔ ان میں قناعت اور اپنے دیار سے محبت تھی۔ "اپنی گلیوں" سے پیار ہی تو تھا کہ باوجود مختلف درباروں کے بلاووں کے وہ "دلی چھوڑ کر" کہیں نہیں گئے۔ سادگی اتنی کہ کہتے ہیں ان کی املاک میں متعدد مکانات تھے مگر وہ خود عمر بھر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ اپنے عقیدہ میں وہ راسخ تھے، روایت یہ بھی کہتی ہے کہ ان کے مسودوں میں اکثر غزلوں پر "ھوالعلی" یا "یا علی مدد" ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ذوق کے مسلک پر اس شعر سے روشنی پڑتی ہے:

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت کیا کام تبرے کو محبت میں علی کی

جہانتک قد و قامت اور خط و خال کا تعلق ہے ذوق کو ہم میانہ قد کہہ سکتے ہیں۔ خوش شکل اور وجیہہ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ بچپن میں چیچک کے حملے سہہ چکے تھے۔ رنگت بھی کھلتی چمپئی نہ تھی البتہ آنکھیں تیز اور روشن تھیں اور آواز بلند اور خوش آیند۔ کھیل کود، تفریح سے رغبت کی شہادت بس اس قدر ملتی ہے کہ بچپن میں ایک پتنگ کے لیے وہ درخت پر چڑھے تھے اور گر پڑے تھے۔ کوئی روایت اب تک ایسی نہیں ملی جس سے پتہ چلتا ہو کہ انہیں کسی سے والہانہ لگاؤ ہوا ہو۔ اپنا مشاہرہ بڑھوانے کے لیے کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ دوسروں کے حق سے زیادہ کبھی اپنا حق نہیں جتایا،

اور نہ اپنی ضرورت یا کسی ذاتی شوق کے لیے مہاجن ساہوکار سے قرض لیا کہ جس کی ادائگی کی فکر ان کے لیے سوہانِ روح بن جاتی۔ زیادہ کی تمنا تو انھوں نے نہیں کی، البتہ قلعۂ معلی سے ملنے والے مشاہرے کی قلت کا احساس انہیں ضرور رہا ہوگا۔ غالباً اسی وجہ ایسا شعر انھوں نے کہا ہوگا۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ؛ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

مختصر یہ کہ ذوق زندگی سے کچھ زیادہ کے طلبگار نہیں تھے، نہ خدا سے شکوہ، نہ بندوں سے شکایت۔ وہ منکسر المزاج تھے، خدا ترس تھے، سب کا بھلا چاہنے والے دعا میں ہمسائے کے بیماروں کو بھی یاد رکھتے۔ طبیعت میں سلامت روی، سب کے لیے نیک خواہش، مرنجاں مرنج۔ بس ان کی عمر بھر کی ایک کمائی تھی: شعر گوئی اور اسی پر ان کو ناز تھا۔ مگر قسمت یہ کہ ان کا پورا کلام بھی ہم تک نہیں پہنچا۔ تحقیق کہتی ہے کہ ان کا کچھ نہ کچھ کلام تو ضرور بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام میں شامل ہو گیا۔ اور پورا کلام ہم تک پہنچتا بھی کیسے۔ غزل کے مسودے تکیے کے غلاف میں بھر دیتے، کبھی مٹکے ٹھلیا میں۔ وفات کے بعد شاگردوں نے کلام ترتیب دینا شروع کیا۔ کلام پورا نہ ہوا تھا کہ غدر ہو گیا۔

بہر حال شاعری ہی ان کا ذریعۂ معاش تھی، ذریعۂ عزت بھی اور وجہِ افتخار بھی۔ سوزِ آرزو اور بے تاب جذبے کا پُر جوش اہتزاز ان کی شاعری میں کم ہو تو ہو ان کی شعر گوئی کا محرک و مقصود یہی تھا اور انھوں نے اپنے لیے سماج میں جو جگہ بنائی وہ کسی خاندانی وجاہت و حشمت کی وجہ سے نہ تھی۔ نہ دنیا کے پیچھے پڑے رہنے سے بلکہ اپنے ذاتی علم و فضل، اپنی سلامت روی اور اپنی ریاضت و مشق کی بنیاد پر شعر گوئی کر کے اور اس میں کمال حاصل کر کے۔ اس کی وجہ سے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا۔ وہ

بادشاہِ وقت اور شہزادوں کے کلام کی اصلاح پر مامور ہوئے اور وظیفہ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ فن میں لیاقت اور کمال دیکھنے دکھانے کی بات آن پڑتی تو وہ سینہ سپر ہو جاتے، حد تو یہ ہے کہ اپنے استاد شاہ نصیر سے بھی وہ اس معاملے میں نہ چوکتے۔ یہی وجہ تھی کہ مغل شہزادے کا سہرا کہنے کے سلسلے میں مرزا غالب سے قلمی نوک جھونک بھی ہوئی تھی اور غالب کو اپنے مخصوص انداز میں معذرت یا غالب ہی کے الفاظ میں "احوالِ واقعی" پیش کرنا پڑا تھا۔

بہرحال، یہاں بات قصیدے اور سہرے کی نہیں بلکہ ان کی غزل کی کرنی ہے مگر ان سب باتوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کس طرح کے آدمی تھے۔

غزل کی صنف روایت در روایت ذوق تک پہنچی تھی۔ بنیادی طور پر اس کا ایمائی انداز اور اس کے رموز و علائم کی لچک ہی تھی کہ ہر دور میں ہر طرح کے مضامین کو یہ اپنے دامن میں سمیٹتی رہی اور اسے قبولِ عام حاصل رہا۔ بحور و اوزان سے صرفِ نظر کریں اور اس کے موضوعات و مضامین پر نظر رکھیں تو اس میں حسن و عشق کی باتوں کی فراوانی نظر آتی ہے، کہیں وصل کی مگر زیادہ تر محرومی اور ہجر کی، حسن کی بے التفاتی، بے رخی بلکہ سفاکی کی، کہیں عشقِ حقیقی کی اور کہیں رندی و ہوسناکی کی اور کہیں تصوف و اخلاق، وعظ و پند اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری اور انسانِ ضعیف البنیان کی مجبوری و لاچاری کی۔ اس میں تصویر کشی تھی، مناظر کی بھی، جذبات کی بھی خیالات کی بھی اور 'معاملات' کی بھی۔ ۱۸ ویں صدی کے نصف اول میں اس میں ایہام گوئی بھی در آئی تھی اور ہندوستانی بو باس بھی در آئی تھی۔

ذوق تک پہنچنے سے پہلے میر و درد نے غزل میں ایک خاص انداز پیدا کیا تھا جو

جذبے کے خلوص، احساس کی شدت اور بالعموم متین لہجے اور سیدھی سچی نرم نرم زبان کے برتنے سے عبارت تھا، اس میں مضمون کی اولیت، دل کی گداختگی اور بے تکلف اظہار شرطِ اول تھی۔ میرؔ کے یہاں تو بالخصوص شعر کی تاثیر ایک مستقل دھیمی دھیمی آنچ سی بن جاتی۔ مگر ذوقؔ سے پہلے ہی سوداؔ نے اس میں وہ خارجیت کی لَے بھی نمایاں کردی تھی جس میں دلی جذبات کی گرمی کم تھی اور جو ذوقؔ کے زمانے میں لکھنؤ میں زبان کی تراش خراش اور صفائی کے ساتھ مل کر ایک خاص نہج پر پہونچ رہی تھی اور وہاں ناسخؔ و آتشؔ کے ہاتھوں شعر کی زبان کے لیے ضابطے بھی بن رہے تھے۔ اس خارجیت کو آسانی کے لیے جذبے کی شدت اور دل کی تڑپ کے مقابلے میں کسی کیفیت کے بیان برائے بیان سے اور آگے بڑھ کر زبان میں صنعت کاری سے تعبیر کرسکتے ہیں اور آگے بڑھیں تو حسن کے بیان میں لوازماتِ حسن زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس خارجیت میں دلی جذبات کے بیساختہ متین اظہار کے مقابلے میں شعر کا ظاہری عیوب سے پاک ہونا شرط اول ٹھہرا تھا۔ شعر کی تاثیر اور دل نشینی سے اتنا سروکار نہ تھا جتنا الفاظ کی بندش اور اس کی چستی سے۔ جس میں مناسبتِ الفاظ سے بات آگے بڑھتی ہے اور لفظ کو لفظ سُجھانے لگتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مومنؔ اپنی نازک خیالی کے باوجود اپنے تخلص کی رعایت سے مقطع کہہ جاتے ہیں اور آتشؔ اپنے بانکپن کے باوجود اپنے تخلص کی رعایت سے "آب" کے تلازمے باندھنے لگتے ہیں۔ روایتی اور رسمی مضامین کی وجہ سے غزلگوئی ایک صناعی سی ہوگئی تھی، ایسی مرصع زیور سازی ہوگئی تھی جس میں ہر نیا غزلگو پرانے نمونے کی نقل کرتا۔ اگر مضمون سے اسکی طبیعت کی مطابقت نہ ہوتی یعنی جذبہ سچا یا خلوص نہ ہوتا تو شعر محض شعر رہ جاتا، پھسپھسا، کمزور،

یا محض بھرتی کا۔ مگر چونکہ انسانی جذبات تو ہمیشہ سے وہی ہیں اور دوسرے سننے والے اصل غذا سے مانوس ہوتے اس لیے اُس سے اتنے ہی محظوظ ہوتے جتنا باسی کھانے کو ذرا سا نمک مرچ لگا کر بھون کر کھانے سے۔ صاحبِ کمال بلکہ یہ کہیے کہ 'استاد' کہلانے کے لیے ضروری یہ تھا کہ اس کا کہا ہوا اصل سے مماثل ہو مگر ساتھ ہی کسی صنعت گری سے اس کا امتیاز بھی جھلکتا رہے۔ ظاہر ہے کہ فن شعر میں لیاقت اور اس فن سے متعلق کثیر کتابوں کا مطالعہ اور ان کے مطالب کو حافظے میں محفوظ رکھنا، شعر گوئی کا شوق بلکہ دھن اور پھر مشق و ریاضت کی فرصت وہ باتیں ہیں جن کی روایتی شاعری میں خصوصی اہمیت ہوتی ہے۔ اس میں یہ ضروری نہ تھا کہ بات دل سے نکلی ہو یعنی شاعر نے واقعی اپنے ذہنی تجربے اور احساس کو پیش کیا ہو۔ گویا ایک دائرہ تھا، اسی میں چکر لگاتے رہیے۔ عشقیہ شاعری کے حوالے سے یوں سمجھیے کہ بس ایک مرتبہ جھوٹے یا فرضی عاشق بن جائیے، ایک خیالی محبوب گھڑ لیجئے جو خوبصورت ہو اور ستم شعار بھی اور جی چاہے تو ایک خیالی رقیب بھی گھڑ لیجئے اور پھر خیالی کوچہ گردی کے ساتھ ساتھ قافیہ پیمائی کرتے رہیے اور اس میں بھی بنے بنائے رموز، کنائے، استعارے اور تشبیہیں پہلے سے رہبری کرنے کو موجود۔ اخلاقی اور واعظانہ مضامین کی بھی یہی صورت تھی۔ ذوق کی غزلیہ شاعری اسی دائرے کی شاعری ہے۔

اس بنے بنائے دائرے کی شاعری میں غزل حسن و عشق کی باتیں اور دوسرے مضامین بیان کرتی ہے۔ اس میں کسی بے بس غزال کی حیرت میں ڈالنے والی یا جان کو گھلا دینے والی پکار کی کیفیت یعنی دلی واردات کا پُر خلوص اظہار یا کسی حسین یاد میں تڑپ یا والہانہ سرشاری کی کیفیت کم ہو جاتی ہے بلکہ مقصد یہ ہو جاتا ہے کہ سچے جذبات کے

بے تکلف اظہار کے مقابلے میں روایتی طور پر سُنے ہوئے مضامین کو فنکارانہ جدت سے پیش کرکے استادی جتائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مجموعی غزل انفرادی جذبوں کے اظہار سے زیادہ لیاقت و صناعی کا اظہار بن جاتی ہے۔ اسی لیے اسے مجلس اور دیوان خانے کی چیز کہا جا سکتا ہے۔ شعر سُنانا اور سُننے والوں کے منھ سے بے اختیار نکل جانا "واہ استاد" یہی غزل کے شعر کی معراج تصور کی جانے لگتی ہے۔

اخلاقی اور ناصحانہ مضامین میں البتہ ذوق کے اشعار مقبول ہیں، اس وجہ سے کہ یہ مضامین ان کی افتادِ طبع کے قریب ہیں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ان کی زندگی ایچ پیچ، نشیب و فراز سے خالی تھی، کوئی والہانہ شوق نہ تھا، کسی قسم کی تشکیک کا کانٹا، کوئی اُمنگ، آرزو پوری نہ ہونے کی گھٹن، نہیں تھی۔ ان کی زندگی کی مثال ایک ایسی کشتی کی ہے جو ہلکے ہلکے بہاؤ کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ غزل کے بعد غزل پڑھتے جایئے وہی ایک ہمواری، یکساں خرامی، مانوس باتیں۔ ان کی غزل کا شعر تہہ دار اور کثیر المعانی نہیں ہوتا، نہ ہی گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ذوق انسانی ذہن کی کارکردگی کی امکانی حدوں کی توسیع نہیں کرتے۔ عام اخلاقی اور واعظانہ مضامین ہوں یا عاشقانہ وہ عام فہم زبان اور محاورہ و روزمرہ کے مطابق ادا کر دیتے ہیں۔ کوئی انوکھا تجربہ یا کسی جذبے کی شدت نہیں دکھاتے۔ ہاں زبان وہ ایسی استعمال کرتے ہیں جو دلی کے روزمرہ کے مطابق ہے اور سُننے والے کو کسی الجھن میں نہیں ڈالتی۔ جو بات ہے صاف، الفاظ ظاہر ہیں جو کچھ ہے وہی تامل کے باطن میں۔ ذوق کے زمانے میں عوام دوستی یا اسی قسم کے اور نعروں کا چلن یا فیشن نہیں تھا۔ اپنے آپ کو عوام کے قریب کر لینا اور لطف کا سامان پیدا کر دینے کو عوام دوستی ہی کہا جائے گا۔ ذوق غزل گوئی میں

یقیناً عوام کے شاعر ہیں۔ جو بات ذوق کی غزل کو سپاٹ ہونے سے بچا لیتی ہے وہ ہے کہیں کہیں تاثراتی اور اس سے زیادہ تمثیلیہ رنگ اور مضمون آفرینی۔ کہیں کہیں وہ قرآنی آیات کے حصے شعر کا جزو بنا لیتے ہیں ورنہ عام بول چال کی زبان میں ایسے چھینٹے بھی اڑا جاتے ہیں:

ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملّا ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

عام محاورے کے استعمال میں زور کی کیفیت دیکھئے جس سے مضمون کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے:

دیدۂ آبلہ پا کا یہی رونا ہے کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

ذوق کی یہ زبان خلا کی پیداوار نہ تھی۔ یوں تو میر سے پہلے اٹھارہویں صدی کے نصف اول کے دلی کے شعرا نے ایہام کے علی الرغم اپنی غزل میں دلی کی زبان و روزمرہ کو یعنی عام بولی کو شعوری طور پر برتا تھا۔ میر نے بھی عام بولی اور روزمرہ کو حسن و خوبی سے استعمال کیا تھا اور اپنے شاعرانہ جوہر کی جوت سے معمولی بول چال کے کتنے الفاظ کی معنویت کو روشن کر کے دل نشین بنا دیا تھا، سودا کے ہاں بھی عام بول چال کے الفاظ کی کمی نہیں ہے، انشا کی خوش طبعی کہیے یا ان کے مزاج کا کھلنڈرا پن، وہ زبان کی سطح پر بھی نمایاں ہو جاتا ہے، نظیر اکبر آبادی کے یہاں خصوصاً نظموں میں تو ٹھاٹھ ہی نیارا ہے۔ لفظوں کی چٹاخ پٹاخ، چٹک مٹک، اکھیڑ پچھاڑ، سب ہی کچھ نظر آتا ہے، وہ تو جس طرح چاہتے ہیں لفظ گھڑ بھی لیتے ہیں اور حسب خواہش کیفیت پیدا کر لیتے ہیں اور اکثر سمعیات سے بصریات تک کا سلسلہ ایک ہی جست میں طے کرا دیتے ہیں اور اس طرح زبان کی سطح پر بھی اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں۔ غالب کے ہاں ٹھیٹھ

بولی کے لفظ اور محاورے خال خال نظر آ ہی جاتے ہیں اگرچہ یہ ان کا امتیاز نہیں ہے۔ ذوق کے ہاں میر کی سی لفظ کی قدرآفرینی نہیں ہے، نہ نظیر کی قوتِ ایجاد۔ بس روز مرہ کا استعمال زبان کی سطح پر، یہی ان کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کی غزل میں روزمرہ و محاورہ کے صحیح استعمال کی مثالیں خوش اسلوبی سے محفوظ ہوگئی ہیں۔ وہ زبان ہی کے شاعر شمار کیے جائیں گے۔ قصیدہ گوئی کا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ ذوق کے سامنے سودا کی مثال تھی اور علمی فضیلت اور قدرتِ زبان کے اظہار کی بات تھی۔ سودا کے زمانے کو نصف صدی گزر گئی تھی اور زبان زیادہ ہموار ہوگئی تھی۔ اسی لیے باوجود سودا کی تقلید کے ذوق کے قصیدوں کی زبان زیادہ شستہ ہے۔ غزل میں زبان کی بالائی یا اوپری سطح کے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ میر کی ایک ڈگر پر ہیں، وہی میر جو جامع مسجد کی سیڑھیوں یا محاورۂ دہلی کو اپنے کلام کی سند سمجھتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے ہاں عشقیہ مضامین میں جرأت کے رنگ کی طرف جھکاؤ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی زبان ایسی ہی صفائی اور مخلوط زبان کے عناصر کی حامل ہے اور ظفر کے ذاتی غم کے اظہار کے ساتھ دلدوز کیفیت دکھاتی ہے۔ داغ نے غزل میں عشقِ ارضی کے بیان میں شوخی اور بے باکی سے اسی زبان کو کامیابی سے برتا، نکھارا اور مقبول ہوئے۔ اس شوخی اور بے باکی میں داغ کے ذاتی تجربوں یا کوائف کا دخل بہرحال تھا۔

کسی نے سوال اٹھایا تھا کہ ذوق کے بعد وہ زبان شاعری میں زیادہ دیر زندہ کیوں نہ رہی۔ ہمارے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغربی اثرات، زمانے کے نئے تقاضوں، سرسید کی اصلاحی تحریک، حالی کی شاعری اور بالخصوص روایتی عشقیہ شاعری پر ان کی تنقید اور اقبال کی خطابیہ اور غور و فکر کی دعوت دینے

والی شاعری کی وجہ سے خود شاعری بشمول غزل کے بارے میں اندازِ نظر بدلنے لگا تھا۔ اب شاعری محض پرانے طرز کی غزل سرائی اور محض درد و داغ کا بیان نہیں رہ سکتی تھی۔ اب نہ محاورہ بندی کام آسکتی تھی نہ زبان کا چونچلا۔ اب اسے فکری سطح پر تبدیل ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ بنیادی بات یہ بھی ہے کہ بذاتِ خود اردو پوری طرح تہذیبی زبان بن کر تعمیری کردار ادا کرنے کے قابل بن رہی تھی۔ زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہو رہا تھا ادب و شعر و زبان بھی اسی دور یعنی انیسویں صدی کے نصف آخر میں نثر نگاری کا فروغ اسی کا ثبوت ہے۔ اب ان سب کو تعمیری کردار ادا کرنا تھا، فکر اور مبسوط فکر کی ضرورت تھی۔ اسی لیے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی جدید نظم نگاری کو فروغ ہوا تھا۔ اس فضا میں غزل کی زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی لیے داغ اور امیر مینائی کے بعد بیسویں صدی کے غزلگو شعرا میں جن پر نظر ٹھہرتی ہے۔ اصغر، عزیز، صفی، فانی، حسرت، جگر، ان میں اصغر اور فانی اور صفی پر اس غالب ہی کا اثر نظر آتا ہے جس نے فکر کو غزل کی فضا کا نمایاں جزو بنا دیا تھا۔ ویسے میر کے انتخاب در انتخاب میں بھی انسانی فکر کو دعوت دینے والے مضامین کہیں زبان کی گھلاوٹ، کہیں قلندرانہ بےسرستی، کہیں کھردرے پن میں مل جاتے ہیں۔ حسرت کا بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے غزل کی تجدید کی۔ بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں، بڑھتی ہوئی غالب پسندی اور اقبال کی شاعری کی مقصدیت اور خطابت اور عجمی لَے اور غالب اور اقبال کے اثر سے غزل میں نمایاں فکری فضا کے علی الرغم حسرت نے غزل میں عشق ارضی کو تہذیب کی اس حد تک پہنچا دیا جہاں اسے میر لے گیا تھا۔ زبان کی سطح پر حسرت کے ہاں جو شیرینی ہے وہ ذوق کے روزمرہ و محاورہ اور

کھڑے لہجے سے الگ ہے۔ جگر آپنے آخری دور کی غزلوں میں خیال یا مضمون اور زبان دونوں کے اعتبار سے اس معیار کو چھو لیتے ہیں جسے میر نے 'انداز' کہا تھا، یعنی فکر و زبان کا ایسا میل جو زبان کی سطح پر نہ فارسیت سے بوجھل ہو نہ خوش خیالی سے عاری۔ غزل کی ایمائیت اور تڑپ کے پیشِ نظر یہ دو شعر دیکھئے:

برقِ حوادث اللہ اللہ — جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے — غم بھی جس کو راس نہ آئے

ایسے اشعار ہی جگر کی غزل کی دیرپا مقبولیت کے ضامن ہیں۔ دراصل دیرپا شاعری اور مقبول شاعری میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں عام فہم زبان سے بہت زیادہ مغائرت نہیں ہوتی، لیکن دیرپا شاعری میں اظہار کا حسن بھی ہوتا ہے اور فکر و نظر کی بلندی اور گہرائی بھی۔ اظہار یا ہیئت و صورت کا یہ حسن منجملہ اور باتوں کے خوش آہنگی، سُر حرفی، قافیہ و ردیف اور مصوّتی آوازوں کے "ہم آہنگ تنوع" سے پیدا ہوتا ہے جس کا اکتساب مشق و ریاضت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فکر و نظر کی بلندی خود شاعر کی شخصیت کی گہرائی سے پیدا ہوتی ہے۔ دیرپا شاعری کے لیے ایسی فکر یا مضمون درکار ہے جس کا ادراک دقت طلب نہ ہو اور اس کا انداز مانوس ہونے کے باوجود عامیانہ نہ ہو، جسے پڑھتے ہوئے یہ احساس نہ ہوتا ہو کہ بات محض سخن آرائی یا فنِ شعر میں مشق و مہارت دکھانے کے لیے کی گئی ہے۔ بہرحال فکر و مضمون ہو یا ہیئت و اظہار، مقبول و دیرپا ہونے کے باوجود دونوں میں خلوص کی ضرورت ہے۔ خلوص کی بنیاد پر مضمون و زبان میں رشتہ جتنا زیادہ مربوط ہوگا، چاہے اس میں کتنی ہی صنعت گری در آئے، اتنی ہی شاعری عظمت کی طرف بڑھتی جائے گی۔ خلوص دراصل

اُس احساس کی شدت کا اظہار ہے جس کا فوری اثر زائل ہو چکا ہو یعنی شاعر کی فکری شخصیت کا جزو وہ اس طرح بن گیا ہو کہ شاید خود شاعر بغیر تجزیہ کیے اس کی نشاندہی نہ کر سکے کہ اسکا اصل محرک کیا تھا اور اگر اس اظہار میں صنعت گری دخیل بھی ہو جائے تب بھی مضمون یا فکر کی اولیت قائم رہے۔ ظاہر ہے اس میں میرؔ کی زبان میں جان کھپ جاتی ہے' فیضؔ کی غزل کی مقبولیت اور دیرپا ہونے کا راز یہی خلوص ہے فکری سطح پر بھی اور زبان کی سطح پر بھی۔ اور اس مقبولیت میں ان کی غزل میں مانوس رموز و علائم کا بھی حصہ ہے جن کے لوچ و لچک نے نئی سماجی صورت حال یا حقائق اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنیت کو اپنے میں سمو لیا ہے۔ میرؔ اور فیضؔ میں یہ بات مشترک ہے کہ احساس اور اسکے اظہار میں خلوص کی وجہ سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ حالیؔ کی 'غزلِ قدیم' میں بھی اس کیفیت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ذوقؔ کے ہاں معاملہ یہ ہے کہ مضمون روایتی اور رسمی ہے یا تلاشِ بسیار کا پیدا کردہ مگر زبان کے استعمال میں خلوص ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہاں روزمرہ کا استعمال ہو یا محاورے کا، وہ بالقصد نہیں معلوم ہوتا، اس میں بے ساختگی کی شان ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ذوقؔ کے ہاں کچھ اخلاقی اور واعظانہ مضامین دیکھیے جو زبان زدِ عام رہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر عام تجربے اور مشاہدے اور عقیدے کی باتیں ہیں اور زبان وہی عام فہم سیدھی سادی؛

ہنسی کیسا تھی یاں رونا ہے مثلِ قُلقُلِ مینا ؛ کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا ؛ نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے ؛ اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا — چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

زبان زدِ عام ہونے ہی کے سلسلے میں کہاوتیں اور مجلسی زندگی میں سخن سازی کی باتیں بھی ہیں جو ذوق کی غزل میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ مجلسی زندگی کی سخن سازی کہیے یا مجلس آرائی کی باتیں اردو معاشرہ اب بھی پوری طرح بھولا نہیں ہے۔

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ — ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

جھوٹ ہی جانو کلام اس دشمنِ ایمان کا — پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

آخر گِل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی — پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مضمون آفرینی اور وضاحتی یا تمثیلیہ رنگ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کی بھی کچھ مثالیں دیکھیے۔ مضمون آفرینی ذوق کی غزل کا وہ پہلو ہے جس سے ان پر سودا کے اثر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک — اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر — جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ سنگ ہمارا — سر زیرِ گراں بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردوں کا منھ — شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

ہو پاکدامنوں کو خلش گر سے کیا خطر — کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

بے بدرقۂ مرگ توقف رہا ورنہ — عزمِ سفرِ جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

چاندنی نے جوبن رات روپ یہ دکھایا تھا — مجھ کو ماہتابی پہ دھوپ میں بٹھایا تھا

واعظانہ اور اخلاقی مضامین اور مجلسی زندگی میں سخن سازی یا مجلس آرائی کی باتوں سے

ہٹ کر حسن و عشق کے کوچے میں آیئے تو یہاں بھی روزمرہ کے استعمال اور بات سیدھے سادے طور پہ کہہ دینے پر زور ہے جو عوام سے قربت کا پتہ دیتا ہے۔ لفظی مناسبت کے شوق سے اردو معاشرہ اب بھی بالکل آزاد نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں وہ اس کا اس قدر شیفتہ نہ سہی مگر اسے غیر پسندیدہ اب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ذوق کے ہاں اس کی مثالیں نایاب نہیں۔ مضامین روایتی، اندازِ نظر یا رویہ بھی روایتی۔ کئی جگہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ نے لفظ سجھایا ہے۔ ان عشقیہ اشعار میں جرأت کی ارضی حسن سے لطف اندوزی کے اثرات موجود ہیں۔ کہیں کہیں داخلیت کی کارفرمائی البتہ نظر آتی ہے۔

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو پٹکتے ہیں   نہ دل چھوڑے ہے ہم کو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

جب کہا مرتا ہوں وہ بولے مرا سر کاٹ کر   جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی   چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کھچے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا   کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے   افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں   کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سرو چمن کے ساتھ

بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا   لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت عجب اک حب کا عمل ہے   لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

صاف اک آئینہ شفق آلود [illegible]   زلف اس کی شرخیٔ رخسار سے

تیر حلقی میں لیا اس نے پئے جانِ عدو   شوق کیا کیا میرے دل میں چٹکیاں لینے لگا[1]

---

[1] ذوق اور میر کی شخصیتوں کا موازنہ مقصود نہیں لیکن اسی مضمون کا ایک شعر میر کا یاد آگیا۔

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف   اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

آنا تو خفا آنا جانا تو رلا جانا — آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر — سو بھی آکر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

یہ شعر دیکھئے۔ اس میں مضمون آفرینی ہے مگر کنایہ میں ریاضت کی کیفیت ہے

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے — سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

لیکن اس شعر میں تشبیہ میں ندرت ہے اور تشبیہ کے عام مشاہدے کی بات پر مبنی ہونے کی وجہ سے شعر میں تاثیر ہے۔

عیاں ہے یوں مرے روزِ سیاہ میں خورشید — کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

پُرتاثیر مضمون آفرینی اس شعر میں بھی موجود ہے:

چلے ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم ؛ شکستِ توبہ لیے ارمغانِ مغاں کیلئے

سادگی میں پُرتاثیری کے یہ شعر بھی دیکھئے:

قصد کعبے کا تھا پھرے الٹے — چوم کر اس کے آستانے کو

اس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتیں

اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ — اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُرآب بنا

اب کچھ شعر استادانہ رنگ کے دیکھئے:

مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے انکا خیال — کیوں نہ فانوسِ خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں — سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے — مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

نہیں مژگاں کی دو صفیں گویا — اک بلا اک بلا سے لڑتی ہے

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے غم خانے میں
شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانے میں

دروازہ میکدے کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھوکے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں

اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام انکا
لکھتا کاغذ پہ ہوں تو حرف بگڑ جاتے ہیں

استادانہ حیثیت سے انھوں نے ایسی زمینوں میں بھی غزلیں کہیں جو زیادہ مقبول نہیں تھیں۔ ان میں بندشِ الفاظ کا سلیقہ اور عروضی پابندیوں کا خیال زیادہ ہے تاثیر کم ہے۔ ایک دو شعر ملاحظہ ہوں:

کتابِ محبت میں اے حضرت دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی لیے دستِ افسوس کے دو ورق ہو

پھر آیا لو وہ نگارِ خونیں اِدھر کو سرگرمِ جنگ ہو کر
کہ جس کے ہاتھوں سے اڑ گئے سر ہزاروں مہندی کا رنگ ہو کر

لبیک وا ذاں، ناقوس و جرس یا خندۂ قلقل، نالۂ نے
دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو پر ایک نوائے دلکش ہو

اخلاقی مضامین کی طرح عام تجربے اور مشاہدے کی بات بیشتر بے لاگ غیر جذباتی انداز سے کہنا ذوق کا وہ امتیاز ہے جو ان کی شخصیت کے عین مطابق ہے اور چونکہ ان کی زبان عام فہم سادہ اور روزمرہ کے مطابق ہوتی ہے اسی لیے انکے اشعار آج تک زبان زدِ عام ہیں۔ بالخصوص یہ شعر دیکھئے:

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

یہ شعر بھی ملاحظہ ہوں، کیسی خدا لگتی باتیں ہیں اور زبان میں کیسی برجستگی اور سادگی:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرا مقابل ہوتا

گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیٔ شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا

خلاصہ یہ کہ ذوق کی غزل کے اشعار اکہرے ہیں، لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم نہیں بنتا۔ سرمستی یا سپردگی یا والہانہ پن یا اُبال کی کیفیت ان کے ہاں نہیں ہے۔ میر کی طرح انھوں نے اپنی ذات کو تپِ غم سے سنوارا نہیں ہے کہ ان کے اشعار سننے والے کے دل کو پگھلا دیں۔ ان کے یہاں میر کی سی یاس انگیزی، الم آشنائی، جذبے کی تڑپ اور احساس کی شدت نہیں ہے۔ غالب کی طرح وہ نہ جہان کی

تنگی کا ذکر کرتے ہیں نہ تمنا کی بیکراں وسعتوں کا۔ اگر کبھی تنگیٔ جہاں کا خیال آتا ہے تو بس اتنا کہتے ہیں:

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے ۔۔۔ نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

غالب کی سی غور وفکر کی فضا یا مظاہر قدرت کے پیچھے جھانکنے یا اس کے اسرار وغوامض جاننے کی بے چینی بھی ان کے ہاں نہیں ہے۔ نہ ان کے ہاں لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کی کیفیت ہے، نہ نظیر اکبرآبادی کا دھوم دھڑکا، نہ جرأت کی کھلی ڈلی معاملہ بندی، نہ مومن کی مرصع خیالی اور ایجاز۔ ان کے ہاں عام واردات کو عام فہم زبان میں بیان کر دینے کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ جس میں محاورہ بندی کا رنگ نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتا، مگر اس محاورہ بندی میں ناسخ کی سی شدت نہیں ہے، بے ساختگی کا رنگ ہے۔ خارجی یا بے لاگ انداز میں سامنے کی باتیں ہیں، زبان کی صفائی قائم رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی غزل آورد کی چیز ہونے کے باوجود اپنی دل کشی اور انفرادیت قائم رکھتی ہے اور ان کے منتخب اشعار اب بھی زبان زد عام ہیں۔ عشقیہ اشعار ہوں یا ناصحانہ ان کے ہاں اعتدال ہے، ویسا ہی جیسا ان کی زندگی میں تھا، ویسا ہی جو اُن مہذب، قانون کی حدود میں رہنے والے عام آدمیوں کی زندگی میں اور انداز میں ہوتا ہے اور جن سے ادب آداب، شُستگی و شائستگی اور خوش اطواری کا بھرم قائم رہتا ہے جو زندگی اور اس کی مروجہ میزان و اقدار پر سوالیہ نشان نہیں لگاتے بلکہ انہیں اور انکی درجہ بندی کو حتمی مان کر اپنے آپ کو اُن سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مدراس کی ایک درسگاہ ـ مدرسۂ اعظم

از جناب کاوش بدری، قصبہ آمبور

مدرسۂ اعظم جو گورنمنٹ کالج کے نام سے موسوم ہوا، اس کی بنا و تاسیس بہت مبارک ہاتھوں سے ہوئی، اس کے بانی ملک العلما بحر العلوم مولانا مولوی عبد العلی فرنگی محلی ثم مدراسیؒ ہیں جو نواب محمد علی خاں والاجاہ کی دعوت پر لکھنؤ سے سنہ ۱۷۹۰ء میں اپنے خاندان کے ساتھ مدراس تشریف لے آئے، نواب والاجاہ نے انکا شاندار استقبال کیا اور جب محل پر انکی پالکی پہونچی تو خود آگے بڑھ کر اپنا کندھا دیا، یہاں مولانا بحر العلوم نے علوم اسلامیہ کی ترویج، رشد و ہدایت اور تعلیم ظاہری و باطنی کی اشاعت میں تقریباً اکیس سال گزارے، ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء کو انکا انتقال ہوا اور مسجد والاجاہی مدراس کے دائیں جانب واقع قبرستان میں ان کی درگاہ مرجع خلائق ہے انھوں نے مثنوی مولانا روم کی فارسی شرح لکھی تھی

نواب صاحب کا تخلص والاجاہ تھا اور وہ حضرت شاہ طاہر الدین محمد المتوفی ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء سے بیعت تھے۔

انہیں ٹیپو سلطان شہیدؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ دونوں کے درمیان جو خفیہ مراسلت ہوتی رہی اس کا انگریزی ترجمہ "The saringa Patam cor-respondence" کے نام سے ڈاکٹر سید محمد حسین نائنار کی مطبوعہ انگریزی کتاب

میں صفحہ ۱۱۰ تا ۱۳۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، محمد علی والا جاہ ایک صوفی شاعر بھی تھے[1]، ان کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے[2]۔

مدرسۂ کلاں یا مدرسۂ اعظم | مولانا مولوی سید علی محمد ذاکر المدنی اپنے مضمون مدرسۂ اعظم میں رقم طراز ہیں:

"اس مدرسے نے نواب والا جاہ محمد علی خان بہادر فرمانروائے خود مختار صوبہ کرناٹک کے بابرکت زمانے میں نشو و نما پائی۔ مولانا بحر العلوم اس کے صدر مدرس رہے۔ اولاً یہ مدرسہ چیپاک میں تھا جہاں صرف عربی فارسی کی کتب متداولہ کا درس دیا جاتا تھا۔ مولانا کے انتقال کے بعد آپ کے داماد حضرت مولوی علاء الدین صاحب مدرس اول رہے اور آپ کے بعد حضرت مولوی محمد شہاب الدین صاحب جو قاضی مبارک کی اولاد میں سے تھے صدر مدرس رہے۔ آپ کے مددگاروں میں مولوی حیات خاں صاحب، مولوی سید مرتضیٰ صاحب، مولوی حاجی امام الدین صاحب اور مولوی سید محمد حسین صاحب کے اسمائے گرامی سننے جاتے ہیں"[3]۔

افضل العلماء پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری مرحوم نے اپنی تالیف "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" میں اس کی مزید تفصیل لکھی ہے اور ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے "نواب اعظم و مثنوی اعظم نامہ" مطبوعہ ۱۹۸۶ء میں مدرسۂ اعظم کے بعض نئے گوشے نمایاں کیے ہیں۔

آج سے تقریباً تین سو سال پہلے کے علماء کو عربی فارسی دکنی اور ریختہ پر عبور تھا وہ

---

[1] ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال: مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما ص ۲۲۹ [2] تصوف و اخلاق [3] گورنمنٹ محمڈن کالج اردو سوسائٹی کا سہ ماہی رسالہ ج ۱ ص جولائی ۱۹۲۸ء۔

شوقین طلباء کو اپنی رہائش گاہوں پر عربی اور فارسی کی تعلیم مفت دیا کرتے تھے، صوبۂ کرناٹک (قدیم مدراس) کی سرکاری زبان فارسی تھی، اس کی وجہ سے قدیم تملناڈو میں فارسی زبان کا چلن عام تھا، یہاں تک کہ گھروں میں بول چال کی زبان بھی یہی تھی مگر فارسی کے تسلط کے باوجود عام لوگوں نے اپنی مذہبی زبان عربی کو کسی زمانے میں بھی نظر انداز نہیں کیا، چنانچہ فارسی کی طرح عربی میں بھی تصنیف و ترجمہ کا کام ہوتا تھا اور ان کے علاوہ دکنی، گجراتی اور اردو میں مشق سخن کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

حضرت مولانا عبدالعلی بحرالعلومؒ شروع میں اپنی قیام گاہ پر طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا قیام چیپاک مدراس کے محلہ ہی میں رہا۔ لیکن روزانہ کلس محل تشریف لیجانا معمول تھا جہاں "مشاعرۂ اعظم" کے نام سے نواب اعظم نے ایک بزم سخن ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں قائم کی تھی، اس کے زیر اہتمام ہفتہ وار تنقیدی شعری نشستیں ترتیب دی جاتی تھیں اس نوع کے مشاعرے کبھی دلی یا لکھنؤ اور رام پور وغیرہ میں بھی منعقد نہیں ہوئے۔ اس مشاعرہ میں شعراء کو ایک دوسرے پر سنجیدہ تنقید کرنے کا حق حاصل تھا۔ مولانا بحرالعلوم اور اظفری مرحوم کی توجہ سے یہاں کی دکنی شاعری نے اردو شاعری کے انداز اپنائے اور صوبۂ مدراس نہ صرف عربی و فارسی بلکہ اردو زبان و ادب کا مرکز بھی بن گیا۔

مولانا بحرالعلومؒ کی قیام گاہ جو درسگاہ کی حیثیت رکھتی تھی خود بخود ایک اسلامی سرکاری مدرسہ کی شکل اختیار کر گئی، جس کا نام "مدرسۂ کلاں" اس لیے رکھا گیا کہ موجودہ مسجد والاجاہی مدراس کا نام شروع میں "مسجدِ کلاں" مشہور تھا، یہی نام مولانا باقر آگاہ ویلوری اور دوسرے قدیم علمائے کرام کی تصنیفات میں درج ہے۔ مسجدِ والاجاہی

میں آج بھی ایک جگہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں مولانا بحرالعلومؒ درس دیا کرتے تھے۔
نواب والاجاہ نے حضرت مولانا بحرالعلومؒ کا ماہانہ مشاہرہ مقرر فرمادیا تھا۔ انکی رحلت کے بعد جب نواب عمدۃ الامراء نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو انھوں نے مولانا بحرالعلومؒ کے لیے ضلع چنگل پیٹھ میں چتورا اور جعفرا پیٹھ کے دو قریے بطور جاگیر عطا کیے اور والی کی حیثیت سے مولانا کو ملک العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کا بیان ہے کہ :

" جب حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے آپ کی کتاب " ارکان اربعہ" مطالعہ فرمائی جو کہ فن فقہ میں ہے تو آپ کو " بحرالعلوم" کے خطاب سے یاد فرمایا۔ اگرچہ "ملک العلما" کا خطاب ایک تخت نشین والی (نواب عمدۃ الامراء مدراسی) کا عطاکردہ ہے اور " بحرالعلوم" کا خطاب ایک بوریہ نشین "ولی" کا ارشاد ہے۔ لیکن جو مقبولیت ولی کے ارشاد کو ہوئی وہ والی کے خطاب کو نہ ہوئی "

ممتاز محقق مولوی نصیرالدین ہاشمی تحریر فرماتے ہیں :۔

" اعظم کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ مدرسۂ اعظم ہے۔ موصوف نے اس مدرسہ کی بنا ڈالی اور اپنے نام پر مدرسۂ اعظم موسوم کیا تھا۔ اس کے لیے جائداد وقف کی اور آمدنی کے ذرایع چھوڑے۔ محمڈن کالج سے موسوم اور مسلمانوں کی تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس مدرسے کے باعث مسلمانوں میں انگریزی اعلیٰ تعلیم کا شوق پیدا ہوا "[1]

مولانا بحرالعلومؒ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کے سامنے دستِ سوال

---

[1] دکنی کلچر ص۱۶۵ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء۔

کبھی دراز نہیں فرمایا حالانکہ عمدۃ الامراء کی عطا کردہ جاگیر ضبط ہوگئی تھی۔ ان کے بعد انکے داماد مولوی علاء الدین کو ملک العلماء کا خطاب دے کر صدر "مدرسہ کلاں" بنایا گیا۔ اس مدرسہ میں سلطان العلماء مولوی عبدالرب، قطب العلماء مولوی عبدالواحد بن مولوی عبدالاعلیٰ، مولوی شہاب الدین فرزند محمد ضمیر مرحوم، مولوی محمد حیات، مولانا حاجی امام الدین مولوی سید مرتضیٰ، مولوی سید محمود، حاجی غلام دستگیر، مولوی سید محمد حسین وغیرہ، قرآن مجید، زبان عربی، فقہ وعقاید، ریاضی اور زبان فارسی کے علاوہ منطق اور تصوف کی تعلیم دیتے تھے۔

نواب عمدۃ الامراء کی وفات کے بعد انگریزوں نے مدرسۂ کلاں کی طرف سے بے اعتنائی برتنی شروع کی، وہ کسی نہ کسی بہانے سے مدرسہ کی بیخ کنی کر دینا چاہتے تھے تاکہ صوبۂ کرناٹک میں عربی، فارسی کے علاوہ دینی تعلیم کے وسائل مفلوج ہوجائیں مگر اس بدنیتی اور شیطنت کو ختم کرنے کے لیے اللہ جل شانہٗ نے مدراس کے چپے چپے کے علماء صالحین، صوفیائے کرام اور اہلِ خیر کے دلوں میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم کو فروغ دینے کا جذبہ موجزن کر دیا۔ چنانچہ امیر الہند والاجاہ عمدۃ الامراء مختار الملک، عظیم الدولہ نواب محمد غوث خاں المتخلص بہ اعظم مدراسی بہادر شہامت جنگ نے مدراس میں علم وادب کی ترقی کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور علی الخصوص گورنمنٹ ایجنٹ ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کی درپردہ دشمنی کی وجہ سے اس اسلامی درسگاہ مدرسۂ اعظم کو حکومتِ وقت کی نئی تعلیمی پالیسی کو مجبوراً اختیار کرنا پڑا جس کی وجہ سے بعض اہلِ علم میں بددلی پیدا ہوئی اور انھوں نے مجلسِ نظما سے استعفا دیدیا۔ لیکن نواب اعظم نے اس

مدرسۂ کلاں کو اپنے تخلص سے موسوم کرکے ۱۸۵۹ء میں اس کا نام مدرسۂ اعظم رکھا اور اپنی جیب خاص سے اس کے لیے سالانہ بارہ ہزار روپیے اپنی پینشن سے منظور کیے، یہ مدرسہ لیلیٰ بیگم صاحبہ منکوحۂ نواب عظیم الدولہ بہادر کی حویلی واقع چیپاک میں منتقل ہوا، اُس زمانے کے لحاظ سے بارہ ہزار روپیے کی رقم بڑی اہمیت رکھتی تھی خود انگریز ایجنٹ ڈاکٹر بالفور نے جو اردو زبان روانی سے بول لینے پر قادر تھے اس عظیم علمی خدمت کا اعتراف اپنی ایک تقریر میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"حضور (یعنی نواب اعظم) اپنی عنایت و فیض رسانی سے تمہارے عالم بےعلمی و جہالت پر ترحم فرماکر مدرسہ کے اخراجات کے لیے ماہوار ایک ہزار روپیے مرحمت فرماتے ہیں .... انگریزی سرداران جو حاضرین مجلس ہیں اس بات سے واقف ہیں کہ تم تمام فرنگستان میں جستجو کریں تو کسی بادشاہ کو نہ پاؤگے جو اپنے ذاتی پیسوں سے ماہوار ہزار روپیے کسی مدرسے کے لیے دیتا ہے"[1]

انگریزوں کے اصرار پر نواب اعظم کو مجبوراً مدرسۂ اعظم کے نصاب تعلیم میں جو خالص درس نظامی پر مشتمل تھا ردوبدل کرنا پڑا مگر اس کے باوجود مسلمان طلبہ کے لیے علوم فقہ و عقاید اور عربی و فارسی کی جملہ اہم کتب کو پڑھنا لازمی اور نماز کی پابندی بھی ضروری تھی۔ لیکن یہ نظام تعلیم صرف دو سال ہی رائج رہا کیونکہ گورنمنٹ ایجنٹ بالفور مدرسۂ اعظم ہی کو ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مدرسۂ اعظم کے ملازمین کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے تنخواہیں ملیں اور وہ انگریزی سرکار کے غلام بن کر

---

[1] ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال: نواب اعظم و مثنوی اعظم نامہ بحوالہ روداد محفل تنظمائے مدرسہ اعظم مطبوعہ مدراس ۱۸۵۵ء۔

رہی۔ بالفور دینی تعلیم کا شدید مخالف تھا۔ اساتذۂ کرام کو ملازمین کی حیثیت سے گردانتا اس کا شعار تھا، مدرسۂ اعظم کی اس تشکیل و تجدید کے تین چار سال بعد ۱۸۵۵ء میں نواب اعظم نے رحلت فرمائی۔ سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "مارکوئیس آف ڈلہوزی" میں ان پر ان کے اہل خاندان اور اہل دربار پر جو الزام لگائے ہیں ان کا ذکر بھی خلافِ ادب ہے، مولوی صفی الدین ناظر مذہبی کتب درسیہ جامعہ عثمانیہ وغیرہ نے انگریز مورخین کی ان غلط بیانیوں کا مدلل جواب دیا ہے، ابتدا میں گورنمنٹ نے مدرسۂ اعظم کو اسی حال میں رکھا لیکن ایک سال کے بعد خاندانِ کرناٹک کے ایجنٹ نے روپیہ کی کمی کا بہانہ یا عذر کرکے اس کو بند کر دینے کی رپورٹ گورنمنٹ کے پاس روانہ کر دی مگر ناظم تعلیمات مسٹر ارتبھ ناٹ نے اس رپورٹ کو مسترد کر دیا اور مدرسۂ اعظم کے جاری رکھنے کی پُر زور سفارش کرکے مسلمانوں پر احسان کیا۔

بدقسمتی سے یکم مئی ۱۸۵۹ء کو مدرسۂ اعظم "گورنمنٹ مدرسۂ اعظم" یعنی سرکاری مدرسہ بن کر رہ گیا، اس بارے میں پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری مرحوم رقمطراز ہیں کہ:

> "مدراس بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمان علماء و فضلاء اور امراء میں سالار الملک بہادر پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی تعلیم کی حمایت اور سرپرستی کی۔ انھوں نے اس زمانے میں اس کی حمایت کی جب کہ سرسید احمد خاں مرحوم ابھی تک اس میدان میں گامزن بھی نہیں ہوئے تھے۔"[1]

جب مدرسۂ اعظم محمڈن کالج بنا تو ڈاکٹر اقبال کو اس کالج کے ایک عظیم الشان جلسہ میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

---

[1] خانوادہ قاضی بدر الدولہ ص ۳۴۳۔

"آج اس جلسہ میں اتنے مسلم طلبہ کو دیکھ کر مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ تو نہیں البتہ اپنی یونیورسٹی کا زمانہ ضرور یاد آ گیا۔ جب کہ میں اسی طرح کالج میں اپنے طلبہ سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔ آج میں اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں پندرہ سال پہلے کا سا پاتا ہوں۔ مجھے آپ کے خیالات سے بڑی خوشی ہوئی اور یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں مسٹر گرین سا ہمدرد پرنسپل اور دیگر لائق اساتذہ موجود ہیں جن سے آپ پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں"[1]

سند یافتہ اساتذۂ کرام کا تقرر ۱۸۷۲ء تک گورنمنٹ مدرسۂ اعظم کی یہی حالت رہی۔ اس دور میں کل سترہ دفعات پر مشتمل ایک قانون بنایا گیا تھا جس کو فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شایع کیا گیا، اس میں مدرسہ کی غرض و غایت یہ بتائی گئی تھی کہ یہاں کے باشندوں کو مہذب بنایا جائے اور وہ علوم متفرقہ اور انگریزی، تملی، تلگو اور دراوڑی زبانوں سے واقفیت اور دنیوی ضروریات کی خاطر اس مدرسہ میں داخلہ لیں۔ مسلمان اساتذۂ کرام اور طلبہ کے لیے چھٹی کا دن جمعہ اور عیسائی استادوں کے لیے اتوار مقرر ہوا، عربی اساتذہ پنجشنبہ کے دن مدرسہ کو نہیں جاتے تھے۔ سال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے ان کی عیدوں کے لیے مناسب چھٹیوں کی تاریخیں متعین کی گئیں۔ اس کے بعد گورنمنٹ نے مدرسۂ اعظم کے دو اعلیٰ درجات کو پریسیڈنسی کالج میں منتقل کر دیا۔ چنانچہ طلبہ میٹرک میں داخلہ کے لیے پریسیڈنسی کالج جانے لگے۔ ہمارے زمانے ۱۹۳۰ء میں بھی بی، اے کی جماعت والے مشرقی زبانوں کے طلبہ پریسیڈنسی کالج میں انگریزی تعلیم کے لیے جاتے تھے۔ مڈل

---

[1] گورنمنٹ محمڈن کالج اردو سوسایٹی کا سہ ماہی رسالہ سفینہ جنوری ۱۹۲۹ء سپاس نامہ کا جواب ص ۱۹

کلاس تک ہوجانے سے مدرسۂ اعظم کے طلبہ کی تعداد گھٹتی چلی گئی لہٰذا حکومت برطانیہ نے ۱۸۸۴-۸۶ء میں پریسیڈنسی کالج سے میٹریکیولیشن کی دو جماعتوں کو نکال کر پھر مدرسۂ اعظم ہی ختم کر دیا۔

مدرسۂ اعظم کی صدارت کے لیے غیر معمولی لیاقت کے حامل دانشور جناب محمد اعظم صاحب بہادر بی، اے مرحوم کو مامور کیا گیا اور علوم شرقیہ کے فضلاء کی بجائے مدراس یونیورسٹی کے سند یافتہ حضرات کا تقرر درس وتدریس کے لیے کیا جانے لگا۔ جن میں خواجہ خافی صاحب بی، اے، مولوی مولانا احمد حسین صاحب بی، اے۔ لیس محمد حسین صاحب بی، اے کے علاوہ شمس العلماء مولوی سید حسن رضا صاحب مدرس فارسیؔ میر طاہر علی صاحب، مولوی محمد شہاب الدین صاحب، غلام حسین صاحب، منشی محمد عبدالرحمٰن صاحب صدیقی قادری المتخلص بہ مسرور صدیقی اور سید شاہ ابوالحسن صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں، ابتداء میں ہندو مدرسین اور ان کے بعد محمد مخدوم کا تقرر ہوا۔ فنونِ لطیفہ میں ڈرائنگ کی تعلیم لازمی تھی جس کے لیے محمد ادریس ٹی جلال الدین صاحب اور قادر شریف صاحب مامور ہوئے پھر بعد میں شعبہ میں تراب خاں صاحب اور غلام دستگیر صاحب درس دینے لگے تھے۔

مدرسۂ اعظم کا خراب ماحول رفتہ رفتہ صدارت کے لیے انگریزوں کا تقرر عمل میں آیا جن میں فاولر، کومبس، بورجواسکاٹ، انس قابل ذکر ہیں، ان تبدیلیوں نے مدرسۂ اعظم کے کردار کو داغدار کر دیا، میٹریکیولیشن کے نتائج خراب ہونے لگے، طلبہ کی تعداد میں کمی واقع ہوگئی، درس وتدریس کی حالت بد سے بدتر ہوگئی اور اس کا ماحول بھی گندہ ہوگیا، اطراف واکناف میں اوباش، جاہل اور آوارہ منش لوگ آباد تھے۔

ان کی اور بازار کی قربت کی وجہ سے لوگوں کی ریل پیل رہتی، مغلظات اور گالم گلوچ سے طلبہ کے ذہن مسموم اور اخلاق بگڑنے لگے، ورزش، کرکٹ، فٹ بال اور کھیل کود کے لیے نہ کوئی کھلا میدان تھا اور نہ باشعور طلبہ کی علمی، فکری اور ذہنی نشو ونما کو فروغ دینے کا کوئی سامان تھا، ہمدردانِ قوم، مدیرانِ رسائل، بورڈ آف محمڈن ایجوکیشن سنٹرل محمڈن اسوسیشن نے مدرسۂ اعظم کے کردار کی بحالی اور اسے دوسرے پُرفضا اور وسیع میدان میں منتقل کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی مگر گورنمنٹ دس سال تک صرف تسلی دلاتی رہی اور ناظم تعلیمات مدرسہ کو منتقل کیے جانے کے جھوٹے وعدے کرتے رہے جس سے طلبہ کے والدین کے دل ٹوٹتے چلے گئے بالآخر ۱۸۹۶ء میں قوم کے اہلِ خیر حضرات نے آنریبل کرنل آئی ٹی سی ایس کا دامن پکڑا جو بورڈ آف ایجوکیشن کے صدر تھے۔ انکی سفارش کارگر ہوئی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس

۱۹۰۱ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس عبدالعزیز بادشاہ صاحب کے باغ "اسپرنگ گارڈن" مونٹ روڈ میں ہوا، اس کے دوران مدرسۂ اعظم کی تجدید و تشکیل کے لیے جن دانشوروں اور مذہب وملت کے ہمدردوں نے پُرجوش تقریریں کیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

(۱) حیدر شریف صاحب بی، اے بی ایل (۲) نواب محسن الملک بہادر (۳) سر شیخ محمد عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا (۴) سر تھیوڈر مارلیسن پرنسپل علی گڑھ کالج وغیرہ۔

نواب محسن الملک نے فرمایا: "بجائے اس کے کہ علحدہ کالج بناؤ یہ مناسب ہے کہ اس مدرسہ (مدرسۂ اعظم) کی اصلاح کرو اور ترقی دے کر اسی کو محمڈن کالج سمجھو"۔ سر شیخ محمد عبدالقادر مدیر "Observer" لاہور نے مسلمانوں کو اس

بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ اپنا کام خود کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ سر تھیوڈر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج نے کہا کہ مسلمانوں کی بورڈنگ کے لیے سرکاری ملازم، انگریز ہڈ ماسٹر موزوں اور مفید نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس میں مذہبی تعلیم اور مذہبی احکام کی پابندی کا انتظام ضروری ہے جس کو کوئی انگریز یا ہندو ایسے قابل طریقہ سے کر نہیں سکتا۔ جس طرح ایک مسلمان کرسکتا ہے۔

مدرسۂ اعظم کے لیے عمدہ باغ کی خریداری ہزایکسیلینسی لارڈ ہتھل صاحب بہادر گورنر مدراس بھی کانفرنس کے اجلاس میں رونق افروز تھے، انھوں نے نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے شکریہ کے جواب میں یہ خوش آیند اعلان فرمایا کہ "مدرسہ اعظم کے لیے عمدہ باغ کی خریداری عمل میں آئے گی"۔ اس پُر اثر کانفرنس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مدرسۂ اعظم کو عمدہ باغ میں منتقل کیا گیا۔ میر سلطان محی الدین صاحب بہادر بیرسٹرایٹ لا کے ذریعہ عمدہ باغ کی خوشنما بلڈنگ اور اس کا وسیع و عریض احاطہ ایک لاکھ روپیے میں ساہوکار دیوان بہادر لارڈ کشن داس بال مکنداس سے خریدا گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اسی احاطہ میں ایک مدت تک نواب محمد غوث خاں اعظم کی محل خاص خیر النسا بیگم فروکش رہ چکی تھیں اور انھوں نے یہیں میر محبوب علی خاں جیسے جلیل القدر بادشاہ دکن اور سر سید احمد خاں جیسے محسن قوم و ملت کی مہمان نوازی کی تھی۔ طویلہ (گھوڑوں کا اصطبل) توڑ کر مونٹ روڈ کے متصل (موجودہ کنی مورہ ہوٹل کے روبرو) چالیس طلبہ کی رہائش کے لیے ایک ہاسٹل تعمیر کیا گیا۔ عمدہ باغ کے پہلو میں صدر مدرس کی رہایش گاہ کے لیے دو وسیع دالان مع بالاخانہ بھی تعمیر کیے گئے، اسمٰعیل خاں بہادر (ایجنٹ نواب صاحب) کے دیوان خانہ پر بالاخانہ تیار کیا گیا۔ جس میں

ان کی وفات کے بعد افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم رہا کرتے تھے۔

فٹ بال اور کرکٹ کا میدان آج کل جو میدان متنازعہ فیہ بنا ہوا ہے اور موجودہ گورنمنٹ اسے موٹر پارکنگ بنانا اور طلبہ کے مخصوص پلے گراونڈ کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے، پہلے اس میں گنجان درخت تھے جن کو کاٹ کر فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے کے لیے کھلا میدان بنایا گیا، طلبہ کی ورزش، کھیل کود اور فوجی تعلیم کے لیے بھی سہولتیں فراہم کی گئیں فٹ بال ٹورنامنٹ میں مدرسۂ اعظم کے طلبہ نے اس قدر کامیابی حاصل کی کہ چامپین کا تمغۂ امتیازی انہی کے حصے میں آیا۔ اس عمدہ اور پُر فضا باغ میں مدرسۂ اعظم کے منتقل ہونے کے بعد طلبہ کو ہر طرح کی سہولت ہوئی اور انھوں نے اسپورٹ میں بھی ترقی کی۔

ایک غلط بیان وس ٹیبج آف اولڈ مدراس میں درج ہے کہ ۱۸۹۸ء کے سروے کے روسے اس عمارت کا بانی "کولا سنگا چٹی" نامی کوئی ہندو تھا اور نواب بیگم صاحبہ اس میں محض کرایہ دار کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ یہ بیان سراسر غلط ہے لغو ہے، تاریخی حقایق کو جھٹلانا اور مسخ کرنا انگریزوں کا شیوہ ہے، انھوں نے مسلمانوں کی سرزمین اور ان کی حکومت کو ہتھیانے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے کی بھیک خاندان والا جاہی سے مانگی، بے چارے مسلمان حکمراں ان کے داؤں میں آکر اپنی سلطنت ہی کھو بیٹھے۔

مدرسۂ اعظم کے احاطہ میں مسجد کی تعمیر اور مذہبی تعلیم ۱۹۵۹ء میں سرکار نے اہل خیر مسلمانوں کی اعانت سے احاطہ عمدہ باغ کے وسط میں نو مسجد تعمیر کرائی اور مدرسہ کے متعین اوقات کے بعد اس میں مذہبی تعلیم کا بندوبست بھی کیا۔ مدرسہ کی نظامت کے لیے مختلف انگریز افسر یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے۔ مختلف گورنروں نے

مدرسہ اعظم کا معائنہ کرنے کے بعد ایک بورڈ آف وزیٹر قائم کیا جس کے صدر آنریبل نواب رضا خاں بہادر اور آنریبل خان بہادر محمد عزیز الدین حسینی صاحب بہادر آنریبل جسٹس عبدالرحیم صاحب بہادر رہے۔ آنریبل خان بہادر محمد عزیز الدین صاحب بہادر سی۔ آئی۔ ای نے مدرسۂ اعظم میں کالج کی جماعتیں کھولنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی۔

مدرسۂ اعظم کے کالج کی شکل اختیار کرنے کی ابتدا

مسلمان طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت پر قوم کے ہمدردوں نے جو تقریریں کیں اور مضامین لکھے وہ موثر اور کارآمد ثابت ہوئے اور اس کے وسائل واسباب مہیا کرنے کے لیے گورنمنٹ بھی آمادہ ہوئی اور اس نے مدرسہ کے کارپردازوں کے مشورے سے یہ اعلان کیا کہ مدرسۂ اعظم میں انٹرمیڈیٹ کلاس کھولا جائے گا۔ الحمد للہ مدرسہ نے کالج کا معیار حاصل کرلیا۔ شروع شروع میں تقریباً ۹ طلبہ کا داخلہ انٹرمیڈیٹ میں ہوا جن میں افضل العلما مولوی محمد عبدالحق بھی تھے جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر اور گورنمنٹ آرٹس کالج کے پرنسپل اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسوقت مسٹر ڈگلس کو انگریزی کا اور مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب الہ آبادی کو عربی و فارسی کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور سید عبدالقادر ایم اے ایل ٹی منطق کے لکچرر ہوئے۔

مدرسۂ اعظم یا محمڈن کالج

خان بہادر محمد عبدالرحیم صاحب صدر مدرس تھے لیکن ناظم مدرسہ کو مدرسۂ اعظم (یعنی کالج) کو مزید فروغ دینے اور اس کا معیار بلند کرنے کے لیے علیگڑھ کالج کے کسی پروفیسر کو صدر مدرسی پر مامور کرنے کا خیال دامنگیر ہوا۔ لہذا مولوی محمد صاحب بہادر ایم اے ایل ایل بی (علیگ) مددگار پروفیسر انگلش لٹریچر دارالعلوم

علی گڑھ کو بڑے احترام کے ساتھ اس کے لیے مدعو کیا گیا۔ نان کو آپریشن کے نازک دور میں محمد صاحب بہادر اور مسٹر ڈگلسن کی دور اندیشی نے مدرسۂ اعظم (کالج) کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اس دور میں اس کے انٹرمیڈیٹ سے بہتر نتیجہ مدراس کے کسی کالج کا نہیں نکلا۔

۱۹۲۰ء میں مسٹر گرین پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے تو اردو، فارسی اور عربی میں بی اے (B. A) کی پہلی جماعت کا الحاق عمل میں آیا۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں جب پروفیسر مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ایم اے الٰہ آباد یونیورسٹی کالج میں فارسی کے لکچرر ہوئے تو اسی مدرسہ اعظم کے تعلیم یافتہ اور گریجویٹ افضل العلماء مولوی محمد عبدالحق (ایم اے ڈی فل آکسن) کا تقرر السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری پر ہوا۔ جن کی مساعی جمیلہ سے مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب کی قائم کردہ اردو سوسائٹی نے نمایاں ترقی کی، اسی سوسائٹی کی جانب سے علامہ سر محمد اقبال کو مدراس مدعو کیا گیا اور گورنمنٹ محمڈن کالج اردو سوسائٹی کا سہ ماہی رسالہ "سفینہ" اردو دنیا میں ماہنامہ "مصحف" عمر آباد کی طرح جس کے مدیر اعلیٰ علامہ غضنفر حسین شاکر نائطی تھے، منارۂ فکر و فن بن کر چمکا۔ سفینہ کی مجلس ادارت میں حسب ذیل افراد شامل تھے۔ افضل العلماء محمد عبدالحق پروفیسر عربی فارسی اردو (صدر) محمد عبدالجبار متعلم بی اے، غلام محمد متعلم بی اے (منیجر رسالہ) رشید محمود متعلم بی اے اور رحیم احمد فاروقی آزاد متعلم انٹرمیڈیٹ جو بعد میں افضل العلماء اور گورنمنٹ آرٹس کالج یعنی محمڈن کالج مدراس کے صدر شعبۂ عربی فارسی اردو ہوئے۔

انٹرمیڈیٹ اور بی اے کورس کو ختم کر دینے کی بہت ساری کوششیں ہوئیں مگر

رائگاں گئیں لیجسلیٹو کونسل نے مخالفین و معاندین کی تمام تجویزوں کو نظر انداز کر کے محمڈن کالج میں ۱۹۲۷ء میں بی اے کی جماعتوں میں تاریخ کے سکشن کا افتتاح کیا۔
رفتہ رفتہ کالج کی عمارت کے لیے بھی صورت نکل آئی، گورنمنٹ نے محمڈن کالج کے استحکام واستقلال کے لیے حکم نامہ جاری کر دیا اور ساتھ ہی منطق کے پروفیسر سید عبدالقادر اور تاریخ کے پروفیسر محمد قطب الدین کو مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے جانے کی تجویز بھی منظور ہوگئی، حضرت علامہ بحرالعلومؒ کی دعا اور نواب اعظم صاحب کی سعی پیہم، قوم و ملت کے ہمدردوں، مخیر حضرات اور تاجروں کی سعی بلیغ سے مدرسۂ اعظم بفضلہ تعالیٰ آج تک محفوظ ہے، جہاں صرف S. S. L. C تک تعلیم جاری ہے، محمڈن کالج کا نام بدل کر حکومت نے گورنمنٹ آرٹس کالج کر دیا اور محمدؐ کے نام کو نعوذ باللہ نکال دیا، جس کی علمی ادبی اور ثقافتی خدمات کے لیے ایک اور تفصیلی مضمون درکار ہے۔ یہاں صرف مدرسۂ اعظم کی ابتدا و فروغ پر روشنی ڈالی گئی ہے'
مدرسۂ اعظم کے قیام میں گورنمنٹ کی امداد و اعانت کا کوئی دخل نہیں تھا، مسلمانوں کے فنڈ، کرناٹک کے نظما خاندانِ والاجاہی، شہزادگان آرکاٹ اور اساتذہ وطلبہ کی بدولت اللہ جل شانہٗ نے اس کو آج تک زندہ و پائندہ رکھا۔ یہ مدرسہ تمام مسلمانوں کی محنت کا ثمرہ اور دعاؤں کا نتیجہ ہے، اس میں گورنمنٹ کا لفظ خاندان والاجاہی کی گورنمنٹ کی نسبت سے آیا ہے۔ اس کے قیام کا مقصد مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت ہے، اس لیے درس و تدریس کے علاوہ کسی اور دنیوی ضرورت کے لیے اسے استعمال کرنا قانوناً و شرعاً جائز نہیں ہے، اسلاف کی اس مقدس امانت کو محفوظ رکھنا نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کا فریضہ ہے، موجودہ

- حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی باقیات اور یادگاروں کو فروغ دے اور مدرسہ اعظم کو پھر محمڈن کالج بنادے۔

کتابیات

۱۔ مفتاح التقویم : از حبیب الرحمٰن خاں صابری، مطبوعہ ۱۹۷۷ء ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۲۔ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلد اول) از افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مرحوم مطبوعہ ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء ۳۔ Arbic & Persian in carnatic 710-1960 از افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مرحوم، مطبوعہ ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء ۴۔ "مدراس میں اردو ادب کی نشوونما" از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال چشتی قادری، مطبوعہ ۱۹۷۹ء ۵۔ "فورٹ سنیٹ جارج کالج مدراس" از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال چشتی قادری، مطبوعہ ۱۹۷۹ء

۶۔ نواب اعظم و مثنوی اعظم نامہ " " " مطبوعہ مئی ۱۹۸۷ء

۷۔ گورنمنٹ محمڈن کالج اردو سوسائیٹی، کا سہ ماہی رسالہ "سفینہ" مطبوعہ ماہ جولائی ۱۹۲۸ء

۸۔ تاریخ و آثار قدیمہ کا سہ ماہی رسالہ "تاریخ" مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری دیلوری ثم حیدرآبادی مطبوعہ ستمبر، دسمبر ۱۹۴۰ء ۹۔ Sources of the History of the Nawwabs of the carnatic۔ (مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز) مترجم و جنرل اڈیٹریس محمد حسین نائنار ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی۔ تزک والاجاہی برہان خاں ہانڈی (۱) مطبوعہ (پارٹ I) ۱۹۳۴ء (۲) مطبوعہ (پارٹ II) ۱۹۳۹ء (۳) محمد کریم ۱۹۴۰ء سوانحاتِ ممتاز (۴) محمد کریم ۱۹۴۴ء سوانحاتِ ممتاز (۵) غلام عبدالقادر ناظر ۱۹۵۰ء بہار اعظم جاہی۔

معارف کی ڈاک

مکتوب نابھا

نابھا، پنجاب

۲۵ اگست ۱۹۹۳ء

مکرمی ایڈیٹر صاحب "معارف" اعظم گڑھ۔ آداب

میرے مضمون "فارسی زبان کے ہندو انشا پرداز" مطبوعہ "معارف" اگست ۱۹۹۲ء میں آپنے اپنے نوٹ میں فارسی اور اردو زبانوں کے تئیں ہندوؤں کی شدید بیگانگی کا ذکر کیا ہے اور اسے ظلم و ناانصافی، تنگ نظری اور علم دشمنی بتایا ہے[1] مجھے آپکے نظریہ سے اختلاف ہے۔

صرف پنجاب میں فارسی ادب پڑھانے کے لیے پنجاب یونیورسٹی۔ پنجابی یونیورسٹی۔ گورونانک دیو یونیورسٹی اور شیر خاں انسٹی ٹیوٹ مالیر کوٹلہ سرکاری سطح پر قائم ہیں۔ پنجاب میں فارسی ادب پر آج تک کوئی سیمینار نہیں ہوا۔ کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ چاروں جگہوں پر سربراہ غیر ہندو ہیں۔

ملکی سطح پر فارسی زبان میں راماین۔ مہا بھارت۔ یوگ واشششٹ۔ گیتا۔ اپنشد وغیرہ کا تو کیا ذکر کسی بھی غیر مسلم فارسی داں کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ سب جگہوں پر سربراہ غیر ہندو ہیں۔

اب آئیے اردو کی طرف۔ ملک میں اردو اکاڈمیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بہت سے

---

[1] میرا اشارہ موجودہ دور کے لوگوں کی طرف تھا۔

پہنچ نکلتے ہیں۔ دوردرشن۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر باقاعدگی سے اردو کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ان میں "بزم"۔ دوردرشن دہلی۔ "اردو سروس"۔ "اردو مجلس آل انڈیا ریڈیو" نمایاں ہیں۔ آپ کو کتنے ہندوؤں کے مضامین ملیں گے۔ کتنے ہندوؤں کو دوردرشن پر اور ریڈیو اسٹیشنوں پر بلایا جاتا ہے، یہ سب کچھ آپکے سامنے ہے۔ اعداد و شمار جمع کر لیجیے[1]

"ایوانِ اردو" دہلی اردو اکاڈمی کا معتدر پرچہ ہے۔ اس میں خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہوا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ سلسلہ اسوقت بند ہوا جب میں نے ایڈیٹر کو لکھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان کبھی تھی ہی نہیں۔ زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ زبان اسکی ہے جو سیکھتا ہے اور سیکھنے پر کوئی پابندی نہیں[2] یہ خط چھپا بھی تھا۔

"ادبی دنیا" لاہور کے فروری ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں "اردو۔ فارسی کے شیدائی ہنود" کے عنوان سے ۱۲۰ معتدر اور مستند ہندوؤں کے نام درج ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو ان کا نام بھی آج جانتے ہیں۔ جب ذکر ہی نہیں ہوگا تو فکر کون کرے گا۔ یہ ایک سازش ہے۔ میں ثابت کرنے کے لیے حاضر ملوں گا۔

طوالت کے خوف سے بات یہیں ختم کرنے پر مجبور ہوں، میرا یہ خط شایع فرمائیں۔

نیازمند : رام لعل نابھوی

---

[1] آپکے تجزیہ سے اتفاق نہیں اسوقت اردو کے جو چند ممتاز ہندو اہل قلم ہیں انکو نظرانداز نہیں کیا جاتا بلکہ ان میں سے اکثر کو اردو کی نسبت سے فائدہ بھی پہنچ رہا ہے اور شہرت بھی ہو رہی ہے، انجمن ترقی اردو ہند کے موجودہ صدر جگن ناتھ آزاد صاحب ہیں اس سے پہلے مالک رام صاحب تھے۔ اس سے پہلے اتر پردیش میں فخرالدین علی احمد کمیٹی کے چیرمین آپکے ہم نام تھے، وہ اور ڈاکٹر گیان چند جین اتر پردیش اردو اکاڈمی کے وائس چیرمین بھی رہے۔ گذشتہ دور کے ہندوؤں کی اردو فارسی خدمات مسلم ہیں اسکا اعتراف مسلمان نہ کریں تو وہ ان کی تنگ نظری ہے۔ [2] لیکن اب کتنے ہندو اسے سیکھتے ہیں؟

اخبارِ علمیہ

مختلف مذاہب کی زیارت گاہوں میں ہندوؤں کا ایک مقدس تیرتھ استھان

اجودھیا بھی ہے جو اب عقیدت مندوں سے زیادہ ہندوستانی سیاست دانوں کی توجہ کا مرکز ہے اور دورِ حاضر میں اس کی شہرت وہاں کے مندروں اور گھاٹوں سے زیادہ بابری مسجد کی وجہ سے ہے، بابری مسجد کا ظاہری وجود تو مٹا دیا گیا لیکن اس کا عکس و تصور ہر سنجیدہ و ذی ہوش ہندوستانی کے قلب و ذہن میں مرتسم ہے، گذشتہ دنوں ٹائمز آف انڈیا میں ایک اسکالر اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ورلڈ کلچر جسے تھیوسوفی موومنٹ بھی کہا جاتا ہے کے سکریٹری رمیش چندر سرکار کا ایک مفصل انٹرویو شایع ہوا جس میں انھوں نے اجودھیا، رام چندر کی اصل جائے پیدائش اور ہندو مسلم منافرت کے اسباب پر گفتگو کی، انھوں نے تین اہم رامائنوں یعنی بالمیکی رامائن، تلسی داس کی رام چرت مانس اور تامل رامائن کا مطالعہ اصل زبانوں میں کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ "ان رامائنوں کو پڑھنے کے بعد ذہن' ماہ و سنین کے اعداد و شمار میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، مثلاً آج کا دور کلجگ ہے اور یہ پانچ ہزار سال قدیم ہندو جنتری کے مطابق ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مواقع نجوم کے لحاظ سے بالکل درست ہے، گو ماہرین آثار قدیمہ کے خیال میں یہ محض فرضی حساب ہے، لیکن اس خیال کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ یہ خیال دذہن میں جاگزیں ہے'

چنانچہ کلجگ سے پہلے دواپر یا یگ تھا جس کا اختتام مہابھارت کی جنگ اور شری کرشن کی موت پر ہوا، دواپر یا یگ ... ۸۶۴۰۰۰ برسوں پر محیط تھا، کلجگ کا زمانہ ... ۴۳۲۰۰۰ برس کا ہے، دواپر یا یگ سے پہلے تیترا یگ تھا، اسی یگ میں رام جی تھے، اس لحاظ سے اگر تریتا یگ کے بالکل اواخر میں رام جی تھے تو ہندو روایت کے مطابق اس عہد کو گزرے ۹ لاکھ سال ہوئے، ایسی صورت میں اب کسی جائے وقوع کے ثبوت میں آثار و قرائن کیسے پیش کیے جا سکتے ہیں، مراجع کہتے ہیں کہ رام کی ایودھیا دریائے سرجو کے کنارے تھی، یہاں اس کی ضمانت نہیں کہ ایودھیا ہی واقعی اس کا نام تھا کیونکہ ایودھیا کا مطلب ہے " حملہ سے محفوظ" اور یہ کسی بھی طاقتور راجہ کی راجدھانی کا نام ہو سکتا ہے، رام کی اصل جائے پیدائش دسرتھ کے محل کے ایک خاص کمرہ میں بتائی جاتی ہے، لیکن کسی کتاب میں اسکا کوئی تعین نہیں ملتا۔" تاریخی شواہد کو نظر انداز کر کے جذبات و میلانات کو دلیل بنانے کے بارہ میں رمیش سرکار نے کہا کہ " جذبات کا لحاظ پسندیدہ امر ہے لیکن کسی تاریخی حقیقت کے اثبات کے لیے محض جذبات کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا، ہندو مسلم منافرت میں بنیادی چیز مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور سمجھنا ہے، عوام کے ذہن میں خلافت بغداد کا ترقی یافتہ تمدن اور حاتم طائی کی سخاوت کی داستانوں کے بجائے چنگیز و تیمور کی خوفناک تصویریں ہیں، مغل حکمرانوں کو محض چنگیز و تیمور کے اخلاف کی حیثیت دی گئی، بت شکنی اور مندروں کی تاراجی کے جو بھی وقتی محرکات تھے انکے حدود کا تعین ضروری ہے ورنہ یہ عمل ہمیں کہاں تک پیچھے لے جائیگا؟ پھر یہ آوازیں بھی بلند ہونگی کہ آرین نے دراویڈوں کو محکوم بنا کر بستیوں سے بے دخل کیا تھا، اسلیے مکافات عمل کا اصول ان پر بھی جاری ہو، اتنے طویل عرصہ کے بعد اب یوپی کے کمزور مسلمانوں کے خلاف انتقام لینے کا کوئی جواز نہیں۔"

ع۔ ص۔

مطبوعات جدیدہ

اردو شاعری میں نعت (جلد دوم) از جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۴۴، قیمت ۸۰ روپیے، پتہ : نسیم بک ڈپو، ۲۵، جی بی مارگ، لکھنؤ ۲۶۰۰۱۸۔

اردو میں نعتیہ شاعری کی تاریخ پر کتابوں اور مضامین کا عمدہ ذخیرہ موجود ہے، زیر نظر کتاب بھی ادب عالیہ کے اسی پاکیزہ سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں مولانا حالی سے زیب غوری تک اہم شعراء کی نعت گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے نیز اردو کے غیر مسلم نعت گو شعراء پر علاحدہ باب میں بحث کی گئی ہے، لائق مولف نے رگ وید اتھر وید اور بودھ مت کی مذہبی کتابوں میں ظہور قدسی کی پیشین گوئیوں کا دلچسپ نتیجہ مطالعہ بھی پیش کیا ہے، ان کی محنت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی مختلف اصناف مثلاً مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، سلام، نظم اور غزل کے علاوہ اس کی مختلف ہیئتوں جیسے ترجیع بند، مثلث، مخمس، مسدس، مستزاد وغیرہ نیز گیت، ترانہ، ٹھمری اور دادرہ اصناف موسیقی میں نعت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، آخری باب میں نعت کی اہمیت اور اردو ادب میں اسکے مقام پر بھی سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص صرف ایک صنف سے شعر و شاعری کے تمام اشکال و ہئیات سے آگاہی چاہتا ہو تو اسکو

یہ آگاہی اسی صنف نعت سے حاصل ہو سکتی ہے"۔ لائق مولف کی محنت اور تلاش و جستجو قابل داد ہے، البتہ ان کی بعض باتوں میں تضاد کا احساس ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ ہے کہ "حالی کی مسدس میں قنوطیت اور ایک قسم کا ٹھہراؤ ہے" لیکن دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "مسدس حالی کے ہر مصرعے میں ایک جوش اور ولولہ ہے، تحریر میں بھی کہیں کہیں ناہمواری ہے جیسے "ظلم و استبداد کو مستاصل کر دیا" "نعت میں مطابقت پذیرائی کی بہترین صلاحیت ہے"۔ کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں، مسلک الختام صلعم اور بجائے سیدۂ پاک کے سید پاک چند مثالیں ہیں، اقبال سہیل کا ذکر ہے لیکن ان کے نام کی ذیلی سرخی نہیں، عبدالحمید عدم کی ذیلی سرخی ہے لیکن ذکر نازش پرتاب گڑھی کا ہے۔

تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو (جلد ششم) مرتبین جناب محمد اکبرالدین صدیقی و ڈاکٹر محمد علی اثر، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۳۶، قیمت ۷۰ روپیے، پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ اے پی ۴۰۰۰۵۔

حیدرآباد دکن کے اہم کتب خانوں میں ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ اپنے ذخیرۂ مخطوطات کی وجہ سے نمایاں ہے، ان مخطوطات کی فہرست پانچ جلدوں میں تقریباً ربع صدی قبل شایع ہوئی تھیں۔ زیر نظر چھٹی جلد ۱۹۸۳ء میں شایع ہوئی تھی مگر ہم کو تاخیر سے ملی، اس میں گذشتہ پانچ جلدوں کے مخطوطات کی اجمالی فہرست کے ساتھ مزید ڈھائی سو مخطوطات کا تعارف سلیقہ اور خوبی سے کرایا گیا ہے، بعض جگہ یہ تعارف خاصا مفصل ہے، ان مخطوطات میں کچھ نسخے قدیم ہیں۔

اور شاید ابھی تک طبع نہیں ہو سکے ہیں جیسے کتاب التکمیل فی بیان التنزیل فن تجوید میں ۲۸ صفحات کے اس رسالہ کی تاریخ کتابت ۱۰۵۲ھ ہے، حافظ میر شجاع الدین کی تفسیر پارہ عم مکتوبہ ۱۲۴۳ھ زیادہ قدیم نہیں تاہم اس کے اختتام کی عبارت دلچسپ ہے لکھتے ہیں کہ " تفسیر حسینی میں لکھے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف شروع کیا " ب " سے اور ختم کیا " س " یعنی بس مومنوں کو جو کچھ کہ اس میں ہے" ایک جگہ عربی مخطوطات میں بہار الدین الآملی کے رسالہ " نان وحلوہ " کا بھی ذکر ہے ؟

اجودھیا کے اسلامی آثار

از جناب مولانا حبیب الرحمن قاسمی

متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: شیخ الہند اکاڈمی، دارالعلوم دیوبند، یوپی۔

دوسرے ہندوستانی مذاہب کی اہم شخصیات کی طرح مسلمان علماء وصوفیہ بھی اجودھیا کی سرزمین کی خاک کا پیوند ہیں، اسی لیے اس کو مدینۃ الاولیاء بھی کہا گیا ہے، فاضل مولف نے اس شہر اولیاء کے بعض علماء ومشائخ کے حالات اور یہاں کے آثار اور مساجد ومقابر کا عمدہ جائزہ لیا ہے، مساجد کے ذکر میں مسجد اللہ جائی گھاٹ اور مسجد امیر الدولہ کا ذکر ہے، لیکن بڑا حصہ بابری مسجد کی تاریخ پر ہے جس میں خصوصیت سے دکھایا ہے کہ مسجد مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی ہے۔ اکیس اہم مقبروں میں حضرت شیث ؑ کے مزار کی بھی تفصیلات ہیں، معلوم نہیں یہ کس حد تک مستند ہے۔ شروع میں اجودھیا کی قدامت اور مذہبی حیثیت پر بھی معلومات ہیں۔

تاریخ کھگڑا، کھگڑا میلہ اور راجگان کھگڑا

از جناب اکمل یزدانی جامعی

صفحات ۲۵، قیمت درج نہیں، پتہ: سلیمان اکیڈمی، بہادر گنج، پورنیہ، بہار۔

کھگڑا، بہار کے ضلع پورنیہ کے شمال مشرق میں ایک چھوٹی سی مسلم ریاست تھی، ہمایوں کے عہد میں نوابان کھگڑا کے مورث اعلیٰ سید خاں ترمذی کو یہ جاگیر عطا ہوئی تھی، بعد میں یہاں کے حوصلہ مند نوابوں خصوصاً نواب سید عطا حسین نے اپنی فیاضی اور علم پروری سے ریاست کو مزید نیک نامی اور شہرت دی، انھوں نے متعدد علما، خصوصاً حافظِ حدیث مولانا قادر بخش سہسرامی شاگرد مولانا عبد الحی فرنگی محلی سے کئی عمدہ کتابیں لکھوائیں، لائق مولف نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے نیز راجگان کھگڑا کی رواداری اور عوام دوستی کی داستان بھی سنائی ہے، انھوں نے وہاں کے مشہور میلہ اور مشاعرہ کی تفصیلات بھی دی ہیں، قدیم کھگڑا کی تاریخی یادگاروں اور وہاں کے چند صوفیہ کا بھی ذکر ہے۔ اس مختصر کتاب میں عظمت رفتہ کے نقوش درسِ عبرت ہیں۔

رسائل مسیح الملک، حکیم محمد اجمل خاں مرحوم، ترجمہ از جناب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، قیمت ۳۵ روپیے، مصنف کے پتہ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے حاصل کیجا سکتی ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی کا نام نیک ان کی غیر معمولی طبی حذاقت اور قوم و ملت کے مسائل کی مسیحائی و گرہ کشائی کی بنا پر آج بھی زندہ ہے، اردو و فارسی کے علاوہ عربی میں تحریر و تقریر کا ملکہ بھی انہیں ودیعت ہوا تھا، عربی زبان میں انھوں نے شاعری بھی کی اور ان کا عربی کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے، زیر نظر کتاب فن طب میں انکے چند عربی رسائل کا ترجمہ ہے، جو انکے ابتدائی دور کی یادگار ہیں مگر مباحث کے انتخاب اور طرز و اسلوب سے پختگی صاف نمایاں ہے ترجمہ میں روانی اور صفائی ہے لیکن مصطلحات اور خالص فنی مباحث کیوجہ سے اس کتاب سے طلبۂ طب ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، شروع میں جناب حکیم سید ظل الرحمٰن کے قلم سے عالمانہ مقدمہ بھی ہے۔

ع۔ ص

اکتوبر ۱۹۹۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کر

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذ

نام سے بنوائیں :

RUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو ا

اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس ک

رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور د

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا —— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ ربیع الآخر ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۳ء عدد ۴

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

علامہ شبلی کی شعرفہمی اور شعرالعجم، ایک مطالعہ — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۴۵-۲۶۹

روضات شاہی اور اس کا مصنف — جناب سید خضر نوشاہی ہمدرد یونیورسٹی لائبریری، کراچی پاکستان — ۲۷۰-۲۷۸

استنبول کے کتب خانوں میں البیرونی کے مخطوطات — پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں کلکتہ — ۲۷۹-۲۸۷

ہندوؤں میں عربی — جناب رام لعل نابھوی صاحب نابھا، پنجاب۔ — ۲۸۸-۲۹۸

اخبار علمیہ — ع۔ ص۔ — ۲۹۹-۳۰۳

معارف کی ڈاک

مکتوب مدینہ منورہ — ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ — ۳۰۴-۳۰۵

مکتوب راجستھان — جناب ڈاکٹر عبدالرؤف خاں اودی کلاں سوائی مادھوپور راجستھان — ۳۰۶-۳۰۷

ادبیات

صلوٰۃ و سلام — پروفیسر اختر اقبال کمال کراچی — ۳۰۸-۳۰۹

غزل — جناب علی عرفان زیدی بدایونی محلہ کٹ کوئیاں۔ رامپور — ۳۱۰

باب التقریظ والانتقاد

موطاء امام محمد مع التعلیق الممجد — "ض" — ۳۱۱-۳۱۲

مطبوعات جدیدہ — " " " "

شذرات

فلسطینیوں اور عربوں کے علاقے میں مغربی ممالک کی سرپرستی میں اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی، وہ اتنا جری اور ڈھیٹ ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی پرواکیے بغیر توسیع پسندی کی پالیسی پر گامزن اور ہر قسم کی جارحیت کا مرتکب ہوتا رہا، اس نے عربوں کے مزید علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کرکے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر دیں اور مغربی ملکوں کی اسرائیل نوازی کی وجہ سے عربوں کو شکست پر شکست ہوتی رہی، اسرائیل نے مصر کو سینا اور غزہ پٹی سے بے دخل کیا، اردن سے دریائے اردن کا مغربی کنارہ اور مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس چھین لیا اور شام سے جنگی اہمیت والی گولان کی پہاڑیاں لے لیں، لبنان کو تباہ کر ڈالا اور فلسطینیوں کی قسمت میں دربدر کی ٹھوکر اور قتل عام آیا، ان کے خون سے جنوبی لبنان، جریکو کے نواحی علاقے اور غزہ پٹی کے ریگستان لالہ زار ہو گئے، اور جب دنیائے عرب بھی ان کے لیے تنگ ہو گئی تو تیونس کا دور دراز علاقہ آزادی فلسطین کی تحریک کا مرکز بنا۔

پچاس برس سے فلسطینیوں کی برات شاخ آہو پر تھی، اب ساقی مغرب کی تازہ روش لطف و ستم سے ۱۳ ستمبر کو ان کے اور اسرائیل کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے انہیں غزہ پٹی اور اریحا میں داخلی خود مختاری ملے گی اور اگر انھوں نے معاہدہ کی شرطوں کی پابندی کی تو کچھ ڈالروں کی سوغات اور بعض مزید رعایتیں بھی ملیں گی۔ اس طرح فلسطین کے آٹھ ہزار نو سو نوے (۸۹۹۰) مربع میل رقبہ سے صرف ایک سو چھیالیس (۱۴۶) مربع میل فلسطینیوں کو واپس ملے گا اور اس میں بھی یہودیوں کی نوآبادیاں موجود رہیں گی اور باقی حصوں پر اسرائیل کا قبضہ برقرار رہے گا جس پر آزادی فلسطین تنظیم کے لیڈر مسٹر یاسر عرفات بہت مگن ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ فلسطین کی مکمل آزادی اور یروشلم کی بازیابی کی طرف پہلا قدم ہے، پتہ نہیں یہ ان کی خود فریبی ہے یا وہ فلسطینیوں کو طفل تسلی دے رہے ہیں کیونکہ اسرائیلی وزیر اعظم نے کہا ہے کہ انہیں یروشلم اور

آزادیٔ فلسطین کو بھول جانا چاہیے اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کے اور مسٹر اسحاق کے درمیان یروشلم پر بنیادی اختلاف ہے، در اصل ان پر اسرائیل اور تثلیث کے فرزندوں کا جادو چل گیا ہے اور وہ ان کی سازش اور فریب کا شکار ہوئے ہیں اور فلسطینی معمولی مراعات کے نتیجہ میں جنگ کے بغیر ہی ہتھیار ڈال دینے کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں۔

جدوجہد، قربانی اور حسن عمل کبھی رائگاں نہیں جاتا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، لیکن فلسطینیوں کی اب تک کی عظیم الشان قربانیوں کو اس معاہدہ نے رائگاں کر دیا، عام اور ظاہر بیں نگاہوں کو تو ان کی قربانیاں پہلے ہی بے نتیجہ معلوم ہو رہی تھیں کیونکہ ان کا کوئی حاصل محسوس طور پر انہیں نظر نہیں آتا تھا بلکہ الٹے ان کی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں یہانتک کہ وہ اپنی جدوجہد میں بالکل تن تنہا رہ گئے تھے، مصر بہت پہلے ہی اسرائیل سے سمجھوتہ کر چکا تھا جسکے بعد وہ عرصہ تک عربوں میں مطعون رہا مگر اب اسی کے نقش قدم پر اردن، شام اور لبنان بھی گامزن ہیں، دوسرے مسلم ملکوں کو بھی جو امریکہ کے زیر اثر اور دباؤ میں ہیں اس معاہدہ کو ماننے اور اسرائیل کو تسلیم کرتے ہی بنے گی۔

مغرب کے شعبدہ بازوں نے عرب قومیت اور نیشنلزم کا صور پھونک کر مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے اور ان کی حکومتوں کے ٹکڑے کر کے انہیں کمزور اور بے دم بنا دیا ہے جن کی سرکوبی کے لیے اسرائیل کو پوری طرح مسلح اور مضبوط کر دیا ہے، یاسر عرفات جیسے سوشلسٹ اور سیکولر لیڈر کا اصل سہارا ماسکو تھا جو اب قصہ پارینہ بن چکا ہے ان حالات میں انھوں نے ساحر الموت کے برگ حشیش اور غریبوں کو دی جانے والی اہل ثروت کی زکوٰۃ کو بھی نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور چند کلیوں پر قناعت کر کے قبلۂ اول کی بازیابی کو خواب و خیال اور اسرائیل کو ایک تسلیم شدہ حقیقت بنا دیا، ان کے اس اقدام سے اسلام کے فدائی فلسطینیوں میں جن کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے شدید بے چینی پائی جاتی ہے اور اندیشہ ہے کہ اسرائیل کو نیست و نابود

کر دینے کا عہد کرنے والے کہیں خانہ جنگی میں پڑ کر خود کو نیست و نابود نہ کر ڈالیں۔

جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے انتقال سے اردو زبان اپنے ایک مخلص خادم اور زبردست شیدائی سے محروم ہوگئی وہ موجودہ بنگلہ دیش کے ضلع جیسور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی مگر کلکتہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا وہ عرصہ تک مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات سے اور کچھ عرصہ تک مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات سے بھی وابستہ رہے، جناب شانتی رنجن بنگالی اور اردو دونوں کے ماہر اور اردو کے ممتاز مصنف تھے۔ انھوں نے بنگلہ ادب کی تاریخ کے علاوہ بنگالی ناولوں کے ترجمے سے بھی اردو کے سرمایہ میں اضافہ کیا، وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے رکن بھی تھے، بنگال میں اردو کے فروغ اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے قیام میں ان کا بڑا دخل تھا، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں میر اکیڈمی لکھنؤ اور ساہتیہ اکیڈمی دہلی سے انہیں ایوارڈ بھی ملے، شانتی رنجن جی ہماری مشترکہ تہذیب کے عاشق اور صحیح معنوں میں سیکولر تھے، ہر شخص سے خوش اخلاقی اور گرم جوشی سے ملتے، راقم سے بھی دو بار ملاقات ہوئی تو اپنے خلوص و محبت کا نقش دل پر بیٹھا گئے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے دور میں ہمہ جہتی ترقی کی ہے ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اہم اور نادر مخطوطات پر متعدد جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار کراتے رہتے ہیں، اس سال نومبر کے آخر میں "ہندوستان اور وسط ایشیا کے تعلقات" کے موضوع پر جو اہم سمینار ہونے والا ہے اس کا افتتاح وزیراعظم کریں گے اور اس میں مختلف فنون کے فضلاء و ماہرین شرکت کریں گے۔

مقالات

علامہ شبلیؒ کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ[1]

از

ضیاء الدین اصلاحی

تاریخ، سوانح، ادب، تنقید، کلام اور فلسفہ غرض ہر میدان علامہ شبلیؒ کی جولان گاہ رہا ہے۔ تنوع یا رنگارنگی انکا طرۂ امتیاز ہے، نثر کے ساتھ نظم بھی انکی قلمرو میں داخل تھی، اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کے جوہر دکھائے ہیں، لیکن اردو غزلیں فارسی کی ٹکر کی نہیں ہیں، شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کا ملکہ تھا، نقدِ شعر میں بڑے دقیقہ بیں اور نہایت نکتہ سنج تھے اردو کے مشہور ادیب و انشاپرداز مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم رقمطراز ہیں:۔

"میں علامہ کے اور کمالات کا قائل تو تھا ہی لیکن انکی سخن فہمی کو اپنا جزءِ ایمان بنائے ہوئے تھا اور معمول کچھ ایسا تھا کہ جب کوئی شعر پسند آجاتا تو اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کے کان تک پہنچا دیتا، اب اگر کہیں انھوں نے داد دیدی یا میرے انتخاب پر صاد کر دیا تو جیسے مجھے سب کچھ مل گیا، لیکن اگر کہیں انھوں نے خاموشی یا بے رخی برتی تو معاً وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا تھا"۔ (معارف جلد ۹۵، عدد ۳، مارچ ۱۹۶۵ء ص۱۹۲)

شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کی اور خوبیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں ادب و بلاغت میں علامہ کی نکتہ دانی، شعر میں باریک بینی و ژرف نگاہی، نقدِ شعر میں بصیرت

---

[1] یہ مضمون بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سمینار میں پڑھا گیا جو ۲۴، ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ہوا تھا۔

اور سخن فہمی کے لحاظ سے بھی انکا شاہکار ہیں، مولانا دریابادی فرماتے ہیں :۔

"شبلی جس پایہ کے سخن گو تھے، اس سے بڑھکر سخن فہم تھے، تنقید کا فن جتنا بھی ترقی کر جائے، شبلی نے کلام فارسی پر جو بہترین تبصرے اپنی شعر العجم میں کر دیے اور اردو کی رزمیہ شاعری اور فن بلاغت سے متعلق جو مبصرانہ نکتے" موازنہ انیس و دبیر" میں لکھ دیے ہیں، ان سے کوئی طالب علم چاہے ادبیات فارسی کا ہو یا ادبیات اردو کا، شاید ہی مستغنی ہو سکے اور طالب علم تو خیر منتہی ہو جانے کے بعد بھی طالب علم ہی رہتا ہے، ان موضوعوں پر جو اچھے منجھے ہوئے اہل قلم ہیں، وہ بھی ان کتابوں سے روشنی ہی حاصل کرتے رہیں گے" (ایضاً ص ۲۰)

اس موقع پر موازنہ سے تعرض مقصود نہیں ہے، لیکن شعر العجم سے علامہ کی شاعرانہ نکتہ آرائیاں اور ناقدانہ و مبصرانہ تجزیے پیش کر کے ان کی شاعرانہ بصیرت اور شعر فہمی کے کمالات دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔ علامہ کی سخن فہمی اور شعری بصیرت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ واقعہ کافی ہے کہ

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے انہدام پر سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا تھا، اس سانحہ پر علامہ نے خوب خوب نظمیں لکھیں جو مدت تک سب کی زبانوں پر تھیں، وہ اس وقت بمبئی میں تھے، ان کی پہلی نظم یہ نکلی۔

پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں یہ زیور سید سجاد علی کی وراثت ہے

اس میں ایک جگہ پولیس کی گولیوں سے بوڑھوں اور بچوں کی شہادت کے مضمون کے ضمن میں ایک شعر اس طرح موزوں کیا تھا :

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں :: یہ لڑکے ہیں، بہت جلد ان کو سو جانے کی عادت ہے

اسی زمانہ میں ثاقب لکھنوی علامہ سے ملنے کے لیے آئے تو انھیں یہ نظم سنائی، انھوں نے مندرجہ بالا شعر کے متعلق کہا کہ دوسرے مصرعہ میں اگر دو لفظ بدل دیے جائیں تو مصرعہ اور چست ہو جائے، لڑکے کی جگہ بچے اور بہت جلد کی جگہ سویرے، اس ترمیم کے بعد مصرعہ یوں ہو گیا ع یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے۔

معاصرین کو کون خاطر میں لاتا ہے پھر ثاقب تو علامہ سے سن و سال ہی میں نہیں علم و فضل میں بھی کمتر تھے لیکن علامہ سخن فہم تھے اس لیے بلا تامل ثاقب کا مشورہ مان لیا جو انکے سخن فہم ہونے کے علاوہ بڑے عالی ظرف ہونے کا۔۔۔۔۔۔ ثبوت بھی ہے۔

شعر العجم علامہ کی سخن فہمی اور فن شعر میں ژرف نگاہی کا تماشا گاہ ہے، اس میں نقد شعر کی انکی قوت و بصیرت حد کمال پر دکھائی دیتی ہے جب وہ اشعار کی گرہیں کھولنے پر آتے ہیں اور بلاغت کے رموز بیان کرتے ہیں تو وجدان جھوم جھوم اٹھتا ہے، اشعار کا مطلب بیان کرنے میں دقیقہ سنجی اور نکتہ آرائی کرتے ہیں تو ذوق سلیم عش عش کرنے لگتا ہے، وہ شاعر کتنا خوش قسمت ہے جسکے شعر علامہ کے انتخاب میں آئے یا جن کی لطافتوں اور نزاکتوں کی جانب وہ متوجہ ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ جن شعروں سے عام اور سطحی لوگ سرسری گذر جاتے ہیں، علامہ کا شعر فہم اور نکتہ شناس ذہن ان کے حقایق و دقائق بیان کرکے ان کو کیا سے کیا بنا دیتا اور زمین سے آسمان پر پہنچا دیتا ہے، شعر العجم کے خورد گیروں اور نکتہ چینوں کو علامہ کی روح عالم بالا سے یہ صدا ضرور دیتی ہو گی۔

نوا سنجیوں نے تری اے انیس ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

علامہ شبلیؒ کی مزیت کے اسباب اور بھی ہیں، لیکن سخن شناسی اور سخن فہمی ان کی غیر معمولی خوبی اور بڑی نمایاں خصوصیت ہے، جس میں وہ علانیہ ممتاز ہیں۔

شعر کی حقیقت اور شاعر کی تعریف | شعر العجم کے مشمولات سے فارسی زبان وادب پر علامہ کے عبور اور اس میں ان کی نکتہ دانی اور سخن فہمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، شعر کی حقیقت و نوعیت پر جو بحث و گفتگو کی ہے وہی ان کے نکتہ سنج اور شعر فہم ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔ ارسطو کے بیان کے مطابق شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے لیکن علامہ کہتے ہیں مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے، مثلاً ایک شخص کا عزیز دوست جدا ہو رہا ہے اس حالت میں اس پر جو صدمے گذرتے ہیں اور دلدوز خیالات کا جو طوفان اس کے دل میں اٹھتا ہے، شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور ان کی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعے کھینچی تھی۔ دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج و غم، غیظ، غضب، جوش، محبت، افسوس، حسرت، خوشی ان اشیا کا اس طرح بیان کرنا کہ ان کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے۔

قدرت کے مظاہر خواہ مادی ہوں یا غیر مادی، ان کا اثر ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں، جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے بھی ادا کر سکتا ہو، وہی شاعر ہے، اس کے جذبات و احساسات فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ

متاثر ہو اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کر سکتا ہو وہی شاعر ہے، انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں، شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے، شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصہ یا استعجاب کے طاری ہو جانے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے اسی کا نام شاعری ہے[1]۔

علامہ کے نزدیک خدا کے بخشے ہوئے مختلف اعضا و قویٰ کے فرائض الگ الگ ہیں لیکن دو قوتیں تمام افعال و ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس، ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال و استنباط سے کام لینا ہے، ہر قسم کی ایجادات، تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائجِ عمل ہیں، احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا، کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے بلکہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے، غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے، یہی قوت جس کو احساس انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے اور یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ (شعر العجم ج ۴ ص ۲ و ۳ مطبع معارف ۱۹۵۱ء)

علامہ کے بیان کے مطابق حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو وہ مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، سانپ کا لہرانا اور بلبل کا ترانہ، اسی طرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں مثلاً طاؤس ناچنے لگتا ہے، سانپ

---

[1] شعر العجم ج ۱ ص ۱۱ تا ۱۳ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۰۶ء۔

جھومتا اور لہراتا ہے، اسی طرح انسان کو چونکہ نطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوا ہے، اس لیے موزوں الفاظ منھ سے نکلتے ہیں اور ساتھ ہی انسان غنغنانے بھی لگتا ہے اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہو جاتا ہے تو انسان ناچنے لگتا ہے، یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی شعر ہے[1]

شعر کی یہ حقیقت و خصوصیت وہی بیان کر سکتا ہے جو شعر کا نکتہ داں، اداشناس اور نہایت باریک بیں، دقیقہ سنج اور شعر فہم ہو۔ علامہ نے شعر کے اصلی عناصر اور اسکے عوارض و مستحسنات کی حقیقت و نوعیت الگ سے بھی بیان کی ہے اور شاعری کی مختلف اصناف اور شعرا کے حالات کے ضمن میں بھی جا بجا ان چیزوں کے نکات واضح کیے ہیں جن سے ان کے مذاق کی لطافت و بلندی، شاعرانہ مزاج شناسی اور شعر فہمی کا اندازہ کافی حد تک ہوتا ہے۔

علامہ کے نزدیک شاعری اصل میں دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخییل اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی اور اوصاف یعنی سلاست، روانی، صفائی، حسنِ بندش وغیرہ کو وہ شعر کے اجزائے اصلی کے بجائے عوارض و مستحسنات کا نام دیتے ہیں[2]

محاکات | علامہ کے نکتہ طراز قلم نے محاکات کی یہ حقیقت بتائی ہے کہ کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تصویر میں گو مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، چنانچہ عمدہ مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتا ہے کہ چہرے سے جذبات انسانی رنج، خوشی، تفکر،

---

[1] شعر العجم جلد اول ص ۱۳ و ۱۴ | [2] ایضاً ج ۴ ص ۶۔

حیرت، پریشانی اور بے تابی ظاہر ہو لیکن سینکڑوں اور گوناگوں واقعات، حالات اور واردات اس کی دسترس سے باہر ہیں، تا آنی بہار کا یہ سماں دکھاتا ہے۔

نرمک نرمک نسیم، زیر گلاں می خزد — غبغبِ ایں می لمد عارضِ آں می مزد

سنبلِ ایں می کشد گردنِ آں می گزد — گہ بہ چمن می چمد، گہ بہ سمن می وزد

گاہ بہ شاخِ درخت گہ بہ لبِ جوئبار

مولانا کے سحر طراز قلم نے ان اشعار کے ترجمے میں جو لطافت دکھائی ہے، وہ ان کی سخن فہمی کا آئینہ دار ہے:

"ہلکی ہلکی ہوا آئی، پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی، کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں سے ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی"۔

شاعرانہ لطافتوں سے معمور یہ ترجمہ کرنے کے بعد یہ سوال کرتے ہیں "اس سماں کو مصور تصویر میں کیونکر دکھا سکتا ہے؟"[1]

جب مادی اشیا کا یہ حال ہے تو وہ فرماتے ہیں کہ خیالات، جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے مثلاً

نسب نامۂ دولتِ کیقباد — ورق بر ورق ہر سوئے بردباد

شعر کا یہ خیال کہ "دادا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا" بتانے کے بعد وہ دریافت کرتے ہیں کہ "یہ تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟"[2]

ایک دوسری جگہ علامہ نے اسی شعر کو استعارات اور تشبیہات کی مثال میں

---

[1] شعرالعجم ج ۴ ص ، [2] ایضاً ص ،

نقل کر کے اس کی اس قدر بلیغ توضیح کی ہے کہ طبیعت بے اختیار وجد میں آجاتی ہے ملاحظہ ہو؛

"دارا سلسلۂ کیانی کا آخری فرماں روا تھا، اس کے مرنے سے گویا اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہہ نے کس قدر موثر اور بلند کر دیا دارا کو خاندان کیانی کا نسب نامہ کہا یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج ہوتے ہیں، دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس سب کی مجموعی عظمت و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہے، پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا کہ نسب نامۂ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا (ج ۱ ص ۲۷۶)

علامہ ہوس پیشہ عاشقوں کو اکثر پیش آنے والی اس واردات کا ذکر کرتے ہیں کہ کسی معشوق سے دل لگاتے ہیں چند روز بعد اس کی بے مہریوں اور کج ادائیوں سے تنگ آکر اسے چھوڑ کر کسی اور سے دل لگانا چاہتے ہیں، پھر رک جاتے ہیں کہ ایسا دلفریب معشوق کہاں ہاتھ آئے گا، گویا آپ ہی آپ روٹھتے اور منتے رہتے ہیں اور معشوق کو خبر تک نہیں ہوتی، اس حالت کو شاعر یوں ادا کرتا ہے۔

صد بار جنگ کردہ بہ او صلح کردہ ایم ادرا خبر نبودہ ز صلح و ز جنگ ما

علامہ نے بالکل بجا لکھا ہے کہ "اس حالت کو تصویر میں دکھانا ممکن نہیں ہے، مگر شاعرانہ مصوری ہر خیال، ہر واقعہ، ہر کیفیت کی مصوری کر سکتی ہے"[1] تصویر اور محاکات کے دو بڑے فرق بتا کر وہ اپنی ادب و بلاغت شناسی اور شاعرانہ نکتہ طرازی کا یہ ثبوت دیتے ہیں:۔

"کسی چیز کا ایک ایک خال و خط دکھانا تصویر کی اصل خوبی ہے ورنہ وہ ناتمام ا..

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۸۔

غیر مطابق ہو گی لیکن شاعر صرف جذبات پر اثر انداز ہونے والی چیزوں کو لیتا اور نمایاں کرتا ہے، باقی چیزوں کو چھوڑ دیتا یا دھندلا رکھتا ہے مثلاً پھول کی تصویر میں ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ کو دکھانا مصور کا کمال ہے لیکن شاعر ممکن ہے ان چیزوں کو اجمالاً یا غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دیگا جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے[1]

دونوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مصور تصویر سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر ہر جز نمایاں نہ کرنے کے باوجود اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے مثلاً سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے پیدا ہو سکتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا[2]

تخیل | محاکات کے بعد وہ تخیل کی حقیقت سمجھاتے ہیں اور ہنری لوئیس کی اس تعریف کو غیر جامع و مانع بتاتے ہیں کہ "وہ قوت جو ان اشیا کو جو غیر مرئی ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر کے سامنے کر دے" کیونکہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی، جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی ان کے خیال میں یہ قوت اختراع کا نام ہے، ان کے نزدیک فلسفہ اور شاعری میں قوت تخیل کی ضرورت یکساں ہوتی ہے، فلسفہ میں ایجاد و اکتشافِ مسائل کا کام دیتی ہے اور شعر میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے، دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف اور دونوں کی قوتِ استعمال کے طریقے الگ الگ ہیں، فلسفہ و سائنس میں علمی مسئلہ حل کرنے کے لیے قوتِ تخیل کا استعمال

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۸ [2] ایضاً۔

ہوتا ہے لیکن شاعری میں اس سے جذباتِ انسانی کو تحریک دینے کا کام لیا جاتا ہے، فلسفی کو واقع میں موجود سے غرض ہے اور شاعران موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں، فلسفہ کے دربار میں ہما، سیمرغ، گاؤ زمین، تختِ سلیمان کی مطلق قدر نہیں لیکن یہی چیزیں ایوانِ شاعری کے نقش و نگار ہیں، فلسفی کی زبان سے سیمرغ نذیں پر کا لفظ نکلنے پر ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا، لیکن شاعر کا عالم خیال اسی قسم کی فرضی مخلوقات سے آباد ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا۔

علامہ کی نکتہ آرائی دیکھئے فرماتے ہیں ایک پھول دیکھکر سائنسداں تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے، اس کی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے، اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے، لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں، پھول دیکھکر بے اختیار اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ؎ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری[1]

اسی طرح کی مثالیں دینے کے بعد وہ اشعار سے قوت تخیل کی حقیقت واضح کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ قوت تخیل کے ذریعہ شاعر نیا دعویٰ کرتا اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے، ممکن ہے منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے لیکن قوت تخیل کے ذریعہ اس نے جن کو اپنا معمول کر لیا ہے ان کو اسے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا مثلاً

دوش از برم چو رفتی آگہ نگشتم آرے　　　عمرے و رفتنِ عمر آوازِ پا نہ دارد

مطلب یہ ہے کہ معشوق جو گودی سے نکل کر چلا گیا تو مجھ کو خبر نہیں ہوئی کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے اور زندگی جانے کی آہٹ معلوم نہیں ہوتی۔ علامہ نے اس

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۹ و ۱۰۔

دلیل کے دو مقدمے بتائے ہیں ۔

۱۔ معشوق عاشق کی زندگی ہے ۲۔ زندگی کے جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی

اور سوال کیا ہے کہ ان میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو ؟[1]

آگے علامہ نے یہ نکتہ بیان کر کے بھی اپنے سخن شناس اور شعر فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ

گو تخییل و محاکات دونوں شعر کے عنصر ہیں مگر شاعری دراصل تخییل کا نام ہے، اسی سے محاکات میں جان آتی ہے، قوت محاکات جو کچھ دیکھتی یا سنتی ہے اس کو الفاظ کے ذریعہ بعینہ ادا کر دیتی ہے، ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا، تناسب اور توافق کو کام میں لانا، ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخییل کا کام ہے ۔

علامہ شبلی جیسا نکتہ دانِ ادب و بلاغت اور شعر فہم ہی قوت تخییل کے یہ کمالات بتا اور دکھا سکتا ہے، فرماتے ہیں قوت تخییل ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اسکو اس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے، پھول کو تم نے سیکڑوں بار دیکھا ہوگا اور ہر دفعہ تم نے صرف اس کے رنگ و بو سے لطف اٹھایا ہوگا لیکن شاعر قوت تخییل کے ذریعہ سے ہر بار نئے نئے پہلو سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ اس کو نیا عالم نظر آتا ہے، وہ اس کی خوشبو سے لطف اٹھاتا ہے تو بے ساختہ معشوق کی بوئے خوش یاد آجاتی ہے اور کہتا ہے ؏

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری　　اے پھول میں تجھ سے خوش ہوں، تجھ سے کسی کی خوشبو آرہی ہے ۔"

وہ دیکھتا ہے کہ دو ہی چار روز کے عرصہ میں پھول کا درخت اگا، کلی پھوٹی، پھول کھلا اور پھر خشک ہو کر گر پڑا۔ اس سے اس کو زمانہ کی بے وفائی کا خیال آتا ہے اور کہتا ہے

بے مہریٔ دہر بیں کہ در یک ہفتہ　　گل سر زد و غنچہ کرد و بشگفت و بریخت

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۱۱ ۔

(ترجمہ) زمانہ کی سرد مہری دیکھو کہ ایک ہی ہفتہ میں پھول نے سر نکالا، غنچہ ہوا، کھلا اور پھر گر پڑا۔

پھول پر شبنم دیکھتا ہے تو کہتا ہے:۔

نہ شبنم است چمن را بروے آتش ناک عرق ز روے تو کردہ است گل بدامن پاک

یعنی شبنم نہیں ہے بلکہ پھول نے اپنے دامن سے معشوق کے چہرہ کا پسینہ پونچھا ہے۔

ہری بھری ٹہنی میں پھول دیکھے تو خیال پیدا ہوا کہ شراب کے لال لال گلاس ہیں پھر یہ رشک ہوا کہ کاش میں بھی ایک ہاتھ میں اس قدر گلاس لے سکتا، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے:۔

دیدہ ام شاخ گلے برخویش می پیچم کہ کاش می توانستم بہ یک دست ایں قدر ساغر گرفت

(ترجمہ) میں نے ایک پھول کی شاخ دیکھی، مجھ کو رشک آتا ہے کہ کاش میں بھی ایک ہاتھ میں اتنے پیالے لے سکتا۔

پھول میں جو زیرے ہوتے ہیں ان کو زر گل کہتے ہیں، کلی جب کھلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرہ کھل رہی ہے، ان دونوں باتوں کے مجموعہ سے شاعر نے یہ خیال پیدا کیا:۔

در چمن باد سحر بوے تو سودا می کرد گل بکف داشت زر و غنچہ گرہ وا می کرد

(ترجمہ) باغ میں باد صبا معشوق کی خوشبو فروخت کر رہی تھی اسلیے اسکو خریدنے کو پھول کے ہاتھ میں زر تھا کلی گرہ کھول رہی تھی۔

اوچھے اور کم ظرف لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ہر شخص سے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے ہیں اور کھل کھیلتے ہیں لیکن باوقار لوگ جب کسی مجلس میں پہلے پہل شریک ہوتے ہیں تو لیے رکے رہتے ہیں، شاعر نے دیکھا کہ پھول جب نکلتا ہے تو غنچہ ہوتا ہے پھر کھل کر پھول بن جاتا ہے، اس سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ یہ وہی اصول ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

در مجلسے کہ تازہ درآئی گرفتہ باش اول بباغ غنچہ گرہ بر جبیں زند

علامہ گرفتہ کے معنی رکے رہنے کے بتاتے ہیں اور گرہ بر جبیں زدن کو بھی اسی کے

قریب بتایا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں پہلے پہل جاؤ تو خودداری کے ساتھ بیٹھو، غنچہ جب باغ میں آتا ہے تو اس کی پیشانی پر گرہ ہوتی ہے۔

پھول کے پتے کو ہوا میں اڑتے دیکھا تو خیال پیدا ہوا کہ باغ نے خط دیکر معشوق کے پاس قاصد بھیجا ہے۔

برگ گل را بکف باد صبا می بینم   باغ ہم جانب او نامہ برے پیدا کرد

(ترجمہ) باد صبا کے ہاتھ میں پھول کا پتہ نظر آتا ہے، غالباً باغ نے معشوق کے ہاں قاصد بھیجا ہے۔

سرخ سرخ پھول دیکھے تو خیال ہوا کہ باغ میں چراغاں کیا گیا ہے، اوپر بادل نظر پڑے تو سمجھا کہ یہ اسی کا دھواں ہے۔

ابر در صحن چمن دود چراغان گل است

اگلے زمانہ میں دستور تھا کہ جب کوئی کتاب یا کاغذ بے کار ہو جاتا تھا تو اس کو پانی سے دھو ڈالتے تھے، شاعر نے پھول کا پتہ پانی میں تیرتے ہوئے دیکھا تو خیال ہوا کہ

دفتر حسن بہارا ست کہ در عہد تو شست   برگ گل نیست کہ از باد در آب افتادہ ست

یعنی یہ پھول کا پتہ نہیں جو پانی میں نظر آرہا ہے بلکہ بہار نے معشوق کا حسن دیکھکر اپنے حسن کا دفتر پانی سے دھو ڈالا۔

کسی خوش رو حسین کے ہاتھ میں پھول دیکھا تو اس سے زیادہ خوشنما معلوم ہوا جتنا اسوقت معلوم ہوتا تھا جب وہ ٹہنی میں تھا، اس بنا پر کہتا ہے:۔

ز غارت چمنت، بر بہار منت ہا ست   کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

(ترجمہ) تونے باغ کو لوٹا، بہار پر احسان کیا کیونکہ تیرے ہاتھ میں پھول اس سے زیادہ خوشنما ہے جتنا پہلے تھا یعنی جب ٹہنی میں تھا۔

پو پھٹتے جو روشنی پھیل جاتی ہے اس کو شیر صبح کہتے ہیں، تبسم اور ہنسی کو شیریں باندھتے

ہیں، صبح کے وقت پھولوں کا کھلنا نہایت خوشگوار ہوتا ہے، ان باتوں سے شاعر کی قوت تخیل نے یہ خیال پیدا کیا:

شیرینیٔ تبسم ہر غنچہ را مپرس ۔۔۔ در شیر صبح خندۂ گل باشکر گذاشت

یعنی غنچہ کے تبسم میں جو شیرینی ہے اس کا بیان نہیں ہوسکتا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر صبح میں خندۂ گل نے شکر گھول دی ہے۔

اس قسم کے سیکڑوں خیالات ہیں جو قوت تخیل نے صرف ایک پھول سے پیدا کیے، اس سے اندازہ کر سکتے ہو کہ قوت تخیل کی موشگافیاں اور دقیقہ آفرینیاں کس حد تک ہیں[1]۔

قوت تخیل کی ان موشگافیوں اور دقیقہ آفرینیوں کے بیان سے خود علامہ کے نکتہ رس ذہن، باریک بیں طبیعت اور شعر فہمی کا اندازہ کرو کہ ان کی گل افشانی قلم نے شعرالعجم کے ورق ورق کو دامان باغبان و کف گل فروش بنا دیا ہے میر انیس کے بقول

ع اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں

شاعری کے عوارض علامہ کے گہر بار قلم نے محاکات اور تخیل کے بارے میں گوناگوں قسم کی نکتہ طرازیاں کی ہیں لیکن اب ہم شاعری کے عوارض کے متعلق ان کے قلم کی گلکاریوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں:۔

تشبیہ و استعارہ علامہ تشبیہ و استعارہ کو شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال بتاتے ہیں جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا، فرماتے ہیں کہ اکثر موقعوں پر تشبیہ یا استعارہ سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طریقہ سے نہیں پیدا ہو سکتا، مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت کثرت سے آدمی تھے یوں ادا کیا جائے کہ

---

[1] شعرالعجم ج ۴، ص ۳۳ تا ۳۵۔

"وہاں آدمیوں کا جنگل تھا" تو کلام کا زور اور بڑھ جائے گا، اس جملہ کی بلاغت کی توضیح میں جو نکتہ آرائی اور دقیقہ سنجی کی ہے اس سے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے، فارسی میں اس قسم کے خیال ادا کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے:

به برقعهٔ کنعاں که بود حسن آباد   به حجله گاه زلیخا که بود یوسف زار

ماہ کنعاں کے نقاب کی قسم جو کہ حسن آباد تھا، زلیخا کے خلوت کدہ کی قسم جو کہ یوسف زار تھا

ترجمہ ہی علامہ کی شعر فہمی کا کم ثبوت نہ تھا مگر اس پر قانع نہ ہو کر وہ اپنی شعر فہمی کا کمال اس طرح آشکارا کرتے ہیں:۔

"پہلے مصرعہ میں حضرت یوسف کے چہرہ کا حسن بیان کرنا تھا اس کو یوں ادا کیا کہ انکا نقاب حسن آباد تھا، حسن آباد کے معنیٰ وہ بستی جہاں حسن کی آبادی ہو، گویا حضرت یوسفؑ کا نقاب ایک بستی ہے جہاں حسن نے سکونت اختیار کی ہے، دوسرے مصرعہ میں یہ مضمون ادا کرنا تھا کہ حضرت یوسف کی وجہ سے زلیخا کا خلوت کدہ روشن ہو گیا تھا اس کو یوں ادا کیا کہ وہ یوسف زار ہو گیا تھا، گویا سینکڑوں ہزاروں یوسف بھر گئے تھے"[1]

فرماتے ہیں کہ بعض وقت شاعر کوئی غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے تو اس کو ممکن الوقوع ثابت کرنے کے لیے تشبیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

به سوز عشق شاہاں را چہ کار است   که سنگ لعل خالی از شرار است

علامہ کی کیف آفریں تشریح ملاحظہ ہو:۔

"شاعر کا دعویٰ ہے کہ بادشاہوں میں عشق و محبت کی جلن نہیں ہوتی، یہ بظاہر ایک غلط دعویٰ ہے کیونکہ بادشاہت اور عشق و محبت میں کوئی مخالفت نہیں ہے اس لیے

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۴۷ و ۴۸۔

شاعر اس کو تشبیہ کے ذریعہ سے ثابت کرتا ہے کہ ہر قسم کے پتھر میں شرر ہوتے ہیں یعنی ان پر چوٹ پڑے تو چنگاریاں چھوٹنے لگتی ہیں لیکن الماس اور لعل میں شرر نہیں ہوتے اور یہ ظاہر ہے کہ پتھر کے اقسام میں الماس گویا بادشاہ ہے۔

یہ شعر بھی اسی دعویٰ کے ثبوت میں ہے۔

زدردِ عشق شد بیگانہ باشد   کہ جائے گنج در ویرانہ باشد[1]

علامہ رقمطراز ہیں کہ کسی نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے اگر ان کو چھوا تو ان کو صدمہ پہنچ جائے گا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے، ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے، وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کر دیتا ہے، مثلاً نظیری کہتا ہے۔

ہمہ شب بر لب و رخسار و گیسو میزنم بوسہ   گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

(ترجمہ) میں معشوق کے لب اور رخسار اور گیسو کو تمام رات چومتا رہا، آج گل و نسرین و سنبل کے خرمن میں ہوا گھس آئی ہے۔

شعر کی یہ تشریح علامہ جیسا نکتہ دانِ شعر و بلاغت ہی کر سکتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

"لب و رخسار کی نزاکت اور ان کا نام اور لطیف بوسہ الفاظ کی برداشت کے قابل نہ تھا اس لیے شاعر نے اس کو اس حالت سے تشبیہ دی کہ گویا ہلکی ہلکی ہوا پھولوں کو چھو کر گزر جاتی ہے اور بار بار آکر چھوتی اور نکل جاتی ہے"[2]

تشبیہ ہی کی طرح تمثیل کو بھی شاعری کا ضروری جزو بتلاتے ہیں، شاعر کو دعویٰ کی دلیل میں اسے پیش کرنا پڑتا ہے، کبھی کسی چیز کی اچھائی یا برائی ثابت کرنا یا کسی چیز کی تصویر اور

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۹۴ [2] ایضاً۔

ہیئت کھینچنا ہوتا ہے تو اس کے بغیر چارہ نہیں ہوتا[1]

جدت ادا | جدت اور لطف ادا بھی شاعری کے عوارض و مستحسنات میں ہے، علامہ اسے اس کے لیے سب سے مقدم چیز بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعری، انشا پردازی، بلاغت تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدت ادا پر موقوف ہے، ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے، اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے، ایسی ذوقی چیز کی تعریف کو ناممکن بتاتے ہیں جس کا صحیح ادراک ذوق صحیح سے ہو سکتا ہے، اس کا پیرایہ ہر جگہ الگ ہے اور اس قدر غیر محصور ہے کہ نہ ان سب کا شمار ہو سکتا ہے نہ ان میں کوئی خاص قدر مشترک پیدا کیا جا سکتا ہے، تاہم اس کے مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے علامہ نے جو مثالیں پیش کی ہیں، ان میں سے بعض ملاحظہ ہوں۔

ساقی تو ئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر باور نمی کند کہ ملک مے گسار شد

اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ معشوق جب ساقی بنا تو فرشتوں یعنی فرشتہ خو لوگوں نے بھی شراب پینی شروع کر دی۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے کہ معشوق کو مخاطب کر کے کہتا ہے" واعظ کی حماقت دیکھتے ہو تم ساقی ہو اور اس کو یقین نہیں آتا کہ فرشتہ نے شراب خواری اختیار کی۔

جدت کے علاوہ علامہ اس طریقۂ ادا میں یہ بلاغت بتاتے ہیں کہ جب کوئی واقعہ واقعہ کی حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں شبہ ہو سکتا ہے اس لیے شاعر اسکو واقعہ کی حیثیت سے نہیں بیان کرتا بلکہ ایک مسلم واقعہ قرار دے کر واعظ کی

---

[1] شعر العجم ج ۱، ص ۱۹۹۔

حماقت پر تعجب کرتا ہے گویا اس کو فرشتہ کی معجزانہ بیان کرنی مقصود نہیں، نہ اس کے نزدیک یہ کوئی تعجب انگیز واقعہ ہے جو بیان کرنے کے قابل ہو، البتہ واعظ کی حماقت حیرت انگیز ہے، کہ اس کو ایسے بدیہی واقعہ کا یقین نہیں آتا۔

علامہ کی نکتہ طرازی اسی پر بس نہیں کرتی لکھتے ہیں کہ شاعر نے خود واعظ کو مخاطب نہیں کیا ورنہ خیال ہوتا کہ شاید یوں ہی واعظ کو چھیڑنے کے لیے کہا ہے، معشوق سے خطاب کرنے میں یہ بلاغت بھی ہے کہ اس کی ملک فریبی کی تعریف اس انداز سے کی ہے کہ تعریف مقصود نہیں صرف واعظ کی حماقت پر حیرت کا اظہار ہے۔[1]

ایک اور شعر ملاحظہ ہو :۔

اے کہ ہمراہ موافق بہ جہاں می طلبی آں قدر باش کہ عنقا ز سفر باز آید

اگر تم سچا دوست دنیا میں ڈھونڈ رہے ہو تو اتنا ٹھہر جاؤ کہ عنقا سفر سے واپس آجائے۔

یہ شعر کا سادہ ترجمہ تھا اب علامہ کی شعری موشگافی اور دقیقہ بینی دیکھو فرماتے ہیں یہ ایک پامال مضمون ہے کہ جب کسی چیز کو نایاب کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "عنقا ہے" شعر کا اصلی مطلب اس قدر ہے کہ ہمراہ موافق یعنی سچا دوست ملنا محال اور عنقا ہے، اس کو یوں کہتا ہے کہ اگر تم کو سچے دوست کی تلاش ہے تو اتنا ٹھہر جاؤ کہ عنقا جو سفر میں گیا ہے وہ واپس آجائے یعنی نہ عنقا واپس آسکتا ہے نہ سچا دوست مل سکتا ہے، اس میں بلاغت کا یہ پہلو ہے کہ پہلے امید دلائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچا دوست مل سکتا ہے البتہ ذرا انتظار کرنا پڑے گا پھر جس بات پر محول کیا ہے وہ بھی بظاہر ناممکن نہیں کیونکہ کسی کا سفر سے واپس آجانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ اس

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۵۴۔

حالت کے بعد جب نا امیدی طاری ہوتی ہے تو نا امیدی کا اثر زیادہ سخت اور رنج دہ ہوتا ہے گویا یہ دکھانا ہے کہ سچے دوست کی تلاش میں امید بھی ہو گی تو اسی قسم کی ہو گی کہ خاتمہ ناکامی پر ہو[1]

شاعری کی ان لطافتوں، ادب و بلاغت کے نکتوں اور جدت ادا کی دلفریبیوں کے لیے دنیا ہمیشہ علامہ شبلی کے زرنگار قلم کی مرہون منت رہے گی۔ جدت ادا ہی کو انھوں نے بدیع الاسلوبی کا نام بھی دیا ہے اور اس کے معنیٰ یہ بتائے ہیں کہ کسی خیال کو جدید اور اعجوبہ زا پیرایہ میں ادا کرنا، بہت سے اہل فن کے نزدیک اسی کا نام شاعری ہے، فارسی اس وصف میں علانیہ ممتاز ہے، علامہ نے متعدد اشعار پیش کر کے اس کی حقیقت ذہن نشین کرائی ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در معبدِ ما　　سبحۂ نیست کہ آں غیرتِ زنارِ تو نیست

علامہ فرماتے ہیں کہ کہنا یہ تھا کہ زاہد و عابد اس قدر ریا کار ہیں کہ ان کی تسبیح زنار سے بھی بدتر ہے، اس مضمون کا پیرایہ اس قدر بدل دیا ہے کہ ظاہر میں اس کی طرف خیال بھی نہیں جاتا، شعر کا ظاہری ماحصل یہ ہے کہ برہمن طعنہ دے رہا ہے کہ اسلام ہندوؤں کے مذہب کی برابری نہیں کر سکتا، شاعر جو مسلمان ہے جواب دیتا ہے کہ یہ طعنہ بیجا ہے، ہماری عبادت گاہ میں تو جتنی تسبیحیں ہیں ایسی ہیں کہ زنار کو ان پر رشک آتا ہے۔

اس میں بلاغت یہ ہے کہ یہ بات اگر مسلمانوں سے کہی جاتی تو برا مانتے اس لیے برہمن سے کہا ہے اور وہ بھی اس پیرایہ میں کہ اسلام کی توہین پیش نظر نہیں۔

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۵۵۔

اب ہم ان اشعار کو نقل کرتے ہیں جن کا ترجمہ، ترجمانی یا تشریح علامہ کے خامۂ رنگا رنگ کی رہین منت ہے، اس سے ان کی شعر فہمی کی خوبی اچھی طرح آشکارا ہو جائے گی، ان کے حسن انتخاب کا پتہ بھی چلے گا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ علامہ کے ترجمہ و تشریح سے شعر کس بلندی پر پہنچ گیا ہے، اس کی متعدد قسمیں ہیں، بعض کے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے لیکن وہ بھی بہت معنی خیز ہے، بعض کے الفاظ کی وضاحت کی ہے، کہیں کسی خاص لفظ کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کی وجہ سے شعر جادو ہو گیا ہے، کہیں بلاغت کے نکتے واضح کیے ہیں، کہیں جدت ادا کا کمال دکھایا ہے، کہیں تشبیہ و استعارہ کی خوبی کا ذکر ہے، کبھی لطافت کو نمایاں کیا ہے، کبھی کسی اور کرشمہ کا تذکرہ ہے، غرض ایسے ایسے پہلو اور گوشے زیر بحث آئے ہیں جن تک عام ذہنوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ پہلے چند اشعار کا ترجمہ دیکھیے۔

غزلیہ اور عشقیہ شاعری کے بیان میں رودکی کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:۔[1]

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس　　آساں بربائی دل و آساں ببری جاں

تو مشکل سے چہرہ دکھاتا ہے اور مشکل سے بوسہ دیتا ہے لیکن دل اور جان نہایت آسانی سے اڑا لیتا ہے۔

ببردہ نرگس تو آب جادوئے بابل　　کشادہ غنچۂ تو باب معجزہ عیسےٰ

تیری آنکھوں نے بابل کے جادو کی آبرو کھو دی، تیرے دہن نے معجزہ عیسوی کا دروازہ کھول دیا۔

دقیقی کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں:۔

دقیقی چار خصلت برگزیدہ است　　بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی

دقیقی نے دنیا کی تمام بری بھلی چیزوں میں سے چار چیزیں چن لی ہیں۔

لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ　　مے خوں رنگ و کیش زردہشتی

---

[1] شعر العجم ج ۵، ص ۳۵۔

یاقوت جیسے ہونٹ، چنگ کی آواز، شراب گلگوں اور زردشت کا مذہب[1]،

علم شریعت کے اسرار اور باب باطن کے ساتھ مخصوص ہیں خواجہ حافظ فرماتے ہیں:۔

شرحِ مجموعۂ گل مرغ سحر می داند و بس   کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

پھول کے نکات صرف بلبل جان سکتی ہے، یہ نہیں ہے کہ جس نے ایک آدھ ورق پڑھ لیا وہ معانی سے واقف ہو گیا[2]

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد   آنچہ خود داشت از بیگانہ تمنا می کرد

دل مجھ سے برسوں جام جم مانگا کیا، جو چیز اس کے پاس تھی، بیگانہ سے مانگتا تھا۔

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست   واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

میں نے عارف کو دیکھا ہنس رہا تھا، اس کے ہاتھ میں جام شراب تھا اور وہ اس میں طرح طرح کے جلوے دیکھ رہا تھا

گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم   گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

میں نے اس سے پوچھا کہ یہ جام جہاں حکیم نے تم کو کس دن عنایت کیا تھا، بولا جس دن آسمان بنا رہا تھا[3]

باخرابات نشیناں ز کرامات ملاف   ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

جو لوگ شراب خانہ میں رہتے ہیں ان کے سامنے کرامات کی شیخی نہیں بگھارنی چاہیے ہر بات کا الگ موقع ہوتا ہے اور وہ وہیں مناسب ہوتی ہے[4]

فردوسی کے شاہنامہ کے بعض اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

چنیں است رسم سرائے فریب   گہے بر فراز و گہے بر نشیب

فریب دینے والی دنیا کا یہی طریقہ ہے   کبھی بلند ہے کبھی پست

چنین بود تا بود گرداں سپہر   گہے جنگ زہر است وگہ نوش مہر

جب سے آسمان ہے یوں ہی ہوتا آیا ہے   لڑائی کبھی زہر ہے اور کبھی شہد[5]

---

[1] شعر العجم ج ۵، ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۴۲ [3] ایضاً ص ۴۱ [4] ایضاً ص ۴۵ [5] ایضاً ج ۴ ص ۲۵۶

یہ اشعار رستم کے خاقان کو شکست دینے کے وقت اسے کامیابی پر اترانے سے روکنے کے لیے کہے گئے تھے، آگے جو اشعار آ رہے ہیں وہ کیخسرو کے افراسیاب کے مقابلہ میں فوجیں روانہ کرنے کے وقت کے ہیں جن میں دشمن کے ملک میں برسرِ مقابلہ نہ آنے والوں کو کسی قسم کے گزند نہ پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے۔

نیازرد باید کسے را براہ   چنین است آئین و رسم کلاہ

راستے میں کسی کو ستانا نہیں چاہیے، حکومت کا یہی دستور ہے۔

نباید کہ بر دے وزد باد سرد   مکوشید جز باکسے ہم نبرد

ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے   لڑنے والوں کے سوا کسی سے نہ لڑنا[1]

حضرت سعدؓ بن وقاص نے یزدگرد کو دعوت اسلام کا خط بھیجا تو اس کی رگ مجوسیت پھڑک اٹھی اور آپے سے باہر ہو کر کہا:۔

زشیرِ شتر خوردن وسوسمار   عرب را بجائے رسید ست کار

اونٹ کا گوشت اور گوہ کھاتے کھاتے   اب عرب کو یہ دن لگے کہ

کہ تخت کیان را کنند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو[2]

کیانی تخت کی ہوس ہے۔   اور آسمان تجھ پر لعنت ہے اور پھر تف ہے۔

ان چند مثالوں سے ترجمہ کی خوبی، دلآویزی اور لطافت کا اندازہ کیجیے، یہ سلاست، شگفتگی، روانی، صفائی، بے تکلفی اور برجستگی کا نمونہ بھی ہیں جن سے فارسی شاعری پر علامہ کی دسترس اور شعر فہمی میں کمال کا پتہ چلتا ہے۔

زبان کی خصوصیات | زبان اور بلاغت کا یہ خاص اور اہم نکتہ ہے کہ اکثر چیزوں کے مختلف

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۲۶۱ [2] ایضاً ص ۲۲ و ۲۲۱۔

انواع ہوتے ہیں اور ہر نوع میں الگ الگ خصوصیت ہوتی ہے مثلاً آواز ایک عام چیز ہے، اس کی مختلف نوعیتیں ہیں پست، بلند، شیریں، کرخت، سریلی وغیرہ، دوتی چیزوں میں یہ فرق اور نازک ہوتا ہے مثلاً معشوق کی ادا ایک عام چیز ہے لیکن الگ الگ خصوصیتوں کی بنا پر ان کے جدا جدا نام ہیں یعنی ناز، عشوہ، غمزہ، شوخی، بیباکی، معشوق کی ان خاص خاص اداؤں کے لیے بہت سے الفاظ پیدا ہوئے مثلاً عشوہ، ناز، ادا، غمزہ، کم نگاہی۔ لیکن ایران کے شاعر کو اس پر بھی تسلی نہیں، اس کی نکتہ بیں عاشقانہ نگاہوں کو اور بھی بہت سی ادائیں نظر آتی جن کے لیے الفاظ نہیں ملتا اس لیے فغانی کہتا ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مناسب لفظ کا استعمال | جو زبانیں وسیع اور لطیف ہیں ان میں ان دقیق فرقوں کی بنا پر ہر چیز کے الگ الگ الفاظ پیدا ہو جاتے ہیں، اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں[1]

علامہ فرماتے ہیں میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:-

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را　　　اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے میں نے کہا کہ کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں، اس لیے شاعر اگر کند کے بجائے کشد کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا نہیں یہی لفظ کند شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا

---

[1] شعر العجم ج ۴، ص ۱۹۱ و جلد ۳، ص ۲۶ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء۔

ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنیٰ ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھدے یا اس کا نوکر اتار لے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لیے جاہیں یا نچوا لیے جائیں فارسی میں ان کے لیے دو مختلف لفظ ہیں جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے اس لیے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی[1]

علی قلی کا شعر ہے :۔

بگذشت زپیش من وغیرش بہ حکایت ۔۔۔ پیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

شعر کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا، اس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑکر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نگاہ پڑ جاتی) پیچید کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی[2]

سکندر نے دارا کو برابری کے دعویٰ سے خط لکھا، دارا کو سخت رنج اور حیرت ہوئی، نظامی کہتے ہیں :۔

بخندید و گفت اندراں زہرخند ۔۔۔ کہ افسوس بر کار چرخ بلند

فلک بیں چہ ظلم آشنا می کند ۔۔۔ کہ اسکندر آہنگ دارا کند

علامہ رقمطراز ہیں :۔

" جب کوئی کمینہ شخص کسی معزز آدمی سے برابری کا دعویٰ کرتا ہے تو بعض وقت

---

[1] شعر العجم ج ۴ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۲۰ء ص ۱۴ [2] ایضاً ص ۱۵۱۔

اس کو غصہ میں ہنسی آجاتی ہے، یہ ہنسی رنج، غصہ اور عبرت کا گویا مجموعہ ہوتی ہے،
فارسی میں اس ہنسی کو زہرخند کہتے ہیں، دارا پر سکندر کے خط سے جو حالت طاری
ہوئی وہ زہرخند کے لفظ کے سوا اور کسی طریقہ سے اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتی تھی"۔

ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں لیکن جب غور سے دیکھا جائے
تو ان الفاظ میں باہم فرق ہوتا ہے یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔
شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لیے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے
وہی استعمال کرے ورنہ شعر میں وہ اثر نہ پیدا ہوگا مثلاً فیضی کہتا ہے،

بانگِ قلم درین شبِ تار بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار

بانگ خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور فخامت ہو جو جگانے کے لیے موزوں ہو،
بانگ اور آواز اور صریر ہم معنی ہیں اس لیے بانگ قلم کے بجائے آواز قلم اور صریر قلم بھی کہہ سکتے
ہیں لیکن اس موقع کے لیے صرف بانگ موزوں ہے۔

قلم کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں لیکن قلم کے لفظ میں جو فخامت اور رعب ہے
اور لفظوں میں نہیں متکلم کے میم نے مل کر اس فخامت کو اور بڑھا دیا ہے، بانگ اور قلم کی ترکیب
نے لفظ کو زیادہ پُروزن کر دیا ہے۔

تار کو تیرہ اور تاریک بھی کہتے ہیں لیکن اس مصرع میں حسن صوت کے لحاظ سے تار ہی موزوں ہے۔
بس کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً بسیار، لختے، خیلے وغیرہ لیکن بس کے لفظ میں
کثرت کی جو توسیع ہے اور لفظوں میں نہیں ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرو تب یہ نکتہ معلوم ہوگا کہ اس شعر میں جو اثر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ
مضمون کی ایک ایک خصوصیت ظاہر کرنے کے لیے جو الفاظ درکار تھے اور جن کے بغیر وہ خصوصیت ادا نہیں
ہو سکتی تھی سب شاعر نے جمع کر دیے اور ان باتوں کے ساتھ اصل مضمون میں اصلیت اور طرز ادا میں جدت
اور ندرت پیدا کی ہے۔

روضاتِ شاہی اور اس کا مصنف

از جناب سید خضر نوشاہی، کراچی

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کا جو ذخیرۂ کتب و مخطوطات، ہمدرد یونیورسٹی لائبریری" بیت الحکمۃ" کراچی میں منتقل ہوا ہے، اس میں ایک قلمی نسخہ" روضات شاہی" کے نام سے موجود ہے۔ اس مخطوطے کے مطالعے سے کئی اہم پہلو سامنے آئے ہیں جو اہل تحقیق کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

ماہنامہ" معارف" اعظم گڈھ (ہند) بابت ماہ مئی ۱۹۹۳ء میں برادر عزیز جناب عارف نوشاہی صاحب کا ایک مضمون بعنوان" گیارہویں صدی ہجری کا ایک گمنام مصنف محمد بن جلال شاہی رضوی" شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے مصنف کی چار کتابوں کا تعارف کرایا ہے اور مصنف کے بارے میں لکھا ہے کہ" خود ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں"[1]۔

چنانچہ" روضات شاہی" کے حوالے سے چند اہم گوشے واضح کیے جاتے ہیں۔

الف۔ مصنف کا پورا نام" محمد جعفر بن سید جلال الدین محمد مقصود عالم شاہی رضوی"[2]

ب۔ روضات شاہی بھی اسی مصنف کی اہم تصنیف ہے۔

ج۔ احمد آباد گجرات (ہند) کے مشہور" عالم شاہی" خاندان سے نہ صرف انہیں عقیدت تھی بلکہ وہ اس خاندان سے نسبی تعلق بھی رکھتے تھے[3]۔

لہٰذا روضات شاہی کے حوالے سے ہم پہلے مصنف کا تفصیلی تعارف کراتے

اور پھر ان کی اس تصنیف کے بارے میں گفتگو کریں گے، تاکہ یہ گمنام مصنف واضح طور پر پہچانا جا سکے۔

روضات شاہی کا مصنف | روضات شاہی کے مقدمہ میں مصنف نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد جعفر بن سید جلال الدین محمد مقصود عالم شاہی رضوی کان اللہ تعالی لہ" صاحب تذکرہ علمائے ہند نے پورا نام یوں لکھا ہے" سید محمد جعفر بدر عالم احمد آبادی گجراتی"[۲۳]

یہ ۱۲ر شعبان ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کے مرید و خلیفہ تھے۔ علوم ظاہر و باطن میں کمال رکھتے تھے، خصوصاً حدیث و تفسیر میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ ان سے بہت سی تصنیفات یادگار ہیں، جن میں ایک "روضات شاہی" ہے جو چوبیس[۲۴] جلدوں پر مشتمل ہے۔ ۹ر ذی الحجہ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء کو رحلت فرمائی اور احمد آباد میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے[۲۵]

شجرۂ نسب مصنف | روضات شاہی کے آغاز سے قبل دو صفحات پر مصنف نے اپنا شجرۂ نسب بڑے عجیب انداز میں نقل کیا ہے، ہر نام سے قبل اسمائے الٰہی میں سے ایک نام لکھا ہے، دوسری سطر میں سورۂ قرآن کا نام اور اس کے ساتھ بطور حوالہ کسی تفسیر کا نام لکھا ہے اور تیسری سطر میں بزرگ کا نام تحریر کیا ہے، طوالت کے خوف سے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔ اصل نسخہ میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

مصنف کے باپ اور دادا کے مختصر حالات | **والد**:۔ ان کے والد سید جلال الدین مقصود عالم شب شنبہ ۱۵ر جمادی الثانی ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء کو پیدا ہوئے" وارث رسول" سے ان کی تاریخ ولادت نکالی گئی ہے۔ اپنے والد کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہجہاں بادشاہ کے عہد شاہی میں منصب شش ہزاری پر فائز تھے۔ ۸ر ربیع الثانی ۱۰۵۹ھ/

۱۶۴۹ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔ جسد خاکی احمد آباد گجرات (ہند) لے جایا گیا اور انہیں باپ کے مقبرہ میں دفن کیا گیا[8] مصنف نے اپنے والد کو مجدد الف ثانی قرار دیا ہے[8]

دادا:۔ مصنف کے دادا حضرت سید محمد مقبول عالم بن سید جلال الدین ابو محمد ماہ عالم گجرات دکن کے شیخ اور صوفی تھے۔ ۱۴ رجب المرجب ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء کو پیدا ہوئے، صوری و معنوی کمالات کے جامع اور ظاہری و باطنی علوم کے عالم تھے۔ اپنے والد سے خلافت پائی۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "جمعات شاہی" وہ معروف کتاب ہے جس سے صاحب روضات شاہی نے خاصا استفادہ کیا ہے۔ انکا انتقال ۱۲ رجب ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء کو ہوا۔ مزار احمد آباد میں ہے[9]

مصنف کی اولاد

بیٹا:۔ تذکرہ علمائے ہند میں ایک بیٹے کا ذکر ملتا ہے۔ جنکا نام سید محمد ابو المجد محبوب عالم تھا۔ ان کی ولادت ۲ ربیع الاول ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں ہوئی۔ باپ کی طرح کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ دو تفاسیر، ایک فارسی میں بروایت اہل بیت اور دوسری عربی میں جلالین کے انداز میں ہے۔ حدیث میں "زینۃ النکاۃ فی شرح مشکوٰۃ" ان کی یادگار ہے۔ ۱۹ جمادی الآخر ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء کو فوت ہوئے۔ مزار احمد آباد میں ہے[10]

پوتا:۔ صاحب روضات شاہی کے پوتے کا ذکر بھی تذکرہ علمائے ہند میں موجود ہے، ان کا نام سید جلال الدین حمید عالم بن سید محمد ابو المجد محبوب عالم تھا۔ یہ ۲ جمادی الاول ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ علم ظاہر و باطن اپنے والد سے حاصل کر کے درجۂ کمال کو پہنچے۔ تعبیر خواب میں "رسالہ مرأۃ الرؤیا" اور اعمال و اشغال میں "رسالہ مفتاح الحاجات"

ان سے یادگار ہیں۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۱۴ھ / ۳-۲-۱۷۰۳ء کو انتقال فرمایا، احمد آباد گجرات میں ان کا مدفن ہے[11]

سلسلۂ روایت حدیث سید محمد جعفر بدر عالم حدیث کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے روضات شاہی میں سولہ[12] محدثین کے احوال قلم بند کیے ہیں۔ ہرایک محدث کے حالات کے بعد اس محدث سے اپنے سلسلۂ روایت کی سند بیان کی ہے۔ تمام محدثین سے مصنف نے مختلف طریقوں سے اپنی سند روایت کو ملایا ہے۔ قاضی عیاض تک اپنی سند روایت کے دو طریقے بتائے ہیں لیکن یہ سب چیزیں عام قارئین کی دلچسپی کی نہیں ہیں۔ اس لیے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

تصانیف اب تک کی معلومات کے مطابق سید محمد جعفر بن سید جلال الدین شاہی رضوی کی مندرجہ ذیل پانچ تصانیف ہمارے علم میں آئی ہیں۔

۱۔ چہل حکایت، ۲۔ دین المریدین، ۳۔ سوال و جواب، ۴۔ احصار الاسماء، ۵۔ روضات شاہی۔

اول الذکر چار کتابوں کا تعارف تو برادرم سید عارف نوشاہی نے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ (ہند) بابت ماہ مئی ۱۹۹۳ء میں کرا دیا ہے۔ پانچویں تصنیف کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

روضات شاہی ہماری معلومات کے مطابق روضات شاہی کا یہ واحد نسخہ ہے جو ہمدرد لائبریری "بیت الحکمۃ" کراچی میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ بخط مولف ہے، نہایت عمدہ خط نسخ میں کتابت شدہ ہے۔ تاریخ کتابت و تالیف ۲۸ ذی الحجہ ۱۰۷۷ھ ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ ۲۲۵ اوراق

ہیں۔ ہر صفحہ پر ۱۹ سطریں ہیں۔ سائز اوراق ۲۶ × ۱۶ س م سائز متن ۱۸ × ۱۰ س م نسخہ کے آغاز میں فہرست تھی جس کا صرف ایک صفحہ اب کتاب کے ساتھ ہے تاہم فہرست مضامین دیباچہ میں بھی ہے، اس لیے نسخہ مکمل ہے۔ محتویات بیان کرنے سے قبل یہاں اس نسخہ کا آغاز و اختتام نقل کیا جاتا ہے۔

آغاز :- " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ خالق العباد، وساطح المهاد، ومسيل الوهاد، ومخصب النجاد، ليس لاوليتہ ابتداء ولا لازليتہ انقضاء، هو الاول لم يزل، والباقی بلا اجل، احمدہ علی عظیم احسانہ ونیّر برهانہ ... (۸ صفحات کے عربی خطبہ کے بعد) . . .
امابعد میگوید خانزاد اہل بیت نبوی خویدم حدیث مصطفوی محمد جعفر بن سید جلال الدین محمد مقصود عالم شاهی رضوی کان اللہ تعالیٰ لهما ولاولادهما كما كان لآبائهما واجدادهما این مجموعہ ایست مسمی بہ "روضات شاهی" در بیان احوال خاتم المحبوبین وارث اتم حضرت مقدسہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا سید محمد بن عبداللہ الملقب بہ شاہ عالم من عند اللہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ، مشتمل بر مقدمہ وپنج روضہ وخاتمہ "

اختتام :" فرغ من کتاب مولفہ اقل العبید الالهیہ کلیب العتبة العلیہ الشاهیہ خویدم الحدیث المصطفوی مملوک اهل البیت النبوی محمد جعفر ابن السید جلال الدین محمد مقصود عالم الشاهی الرضوی کان اللہ تعالیٰ لهما ولمن احبهما واحبهما وهذا الکتاب من الکتب

الاربعۃ والعشرین من الروضات الشاھیہ المسمی بکتاب الدین المبین فی شرح اصول الحدیث و بیان احوال الشاھیین من المحدثین و یتلو فی السفر الثانی الکتاب الثانی و ھو المسمی بکتاب المعجزات والآیات البینات و... فراغ من کتابۃ ھذا السفر ضحوۃ یوم الاحد السادس والعشرین من ذی الحجۃ من سنہ ۱۰۷۷ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ و السلام والبرکۃ والترحم والتحنن علی سید العالمین محمد وآلہ واصحابہ وازواجہ واحبائہ واولیاء امتہ و سایر حزبہ و عترتہ سیما شاہ عالم و مقصود عالم کان اللہ تعالیٰ لھما و لا ولادھما کما کان لاٰبائھما واجدادھما۔ آمین۔

محتویات مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک مقدمہ، پانچ " روضہ" اور خاتمہ پر مشتمل ہے اور مقدمہ و پانچ روضہ و خاتمہ کی تفصیلات بتانے کے بعد لکھا ہے کہ چونکہ یہ کتاب اپنے فوائد کثیرہ کے باعث کثیر الحجم ہوگئی تھی لہذا اسے چوبیس (۲۴) جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر جلد کا علیحدہ خطبہ اور جدا گانہ مضمون ہونے کے باعث ہر جلد خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور پھر ان چوبیس کتابوں کے نام تحریر کیے ہیں۔ پیش نظر کتاب روضات شاہی کی صرف پہلی کتاب (جلد) ہے۔

مصنف نے اپنے دیباچہ میں کتاب کے مشمولات اور مندرجات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

مقدمہ :۔ دراں چار فصل است۔

۱۔ دربیان معجزات حضرت مقدسہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
۲۔ دربیان آیات واحادیث کہ در فضیلت اصحاب ہدایت مآب علیہم رضوان اللہ الوہاب وارد واست۔
۳۔ دربیان آیات واحادیث کہ در فضیلت اہل بیت وارد واست۔
۴۔ دربیان احوال آبائے کرام حضرت شاہیہ علیہم التحیۃ۔

پنج روضہ:۔

۱۔ دراحوال پیش از ولادت باسعادت حضرت شاہیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ۔
۲۔ دربیان احوال بعد از ولادت تا بلوغ۔
۳۔ دراحوال بعد از بلوغ تا وصال حضرت قطبیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ۔
۴۔ بعد از وصال حضرت قطبیہ تا وصال حضرت شاہیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہا۔
۵۔ دراحوال بعد از وصال آن محبوب ذی الجلال تا ہنگام تالیف این مجموعہ بیان۔

خاتمہ:۔ وآن مشتمل است بر سہ فصل

۱۔ دربیان تفصیل اولاد امجاد حضرت شاہیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ۔
۲۔ دراحوال خلفاء حضرت شاہیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ۔
۳۔ دراحوال خدام حضرت شاہیہ ادام اللہ تعالیٰ جلالہ۔

۲۴ جلدوں (کتابوں) کے نام | ۱۔ کتاب الدین المبین فی شرح اصول الحدیث و بیان احوال المشاہیر من المحدثین و درین کتاب ذکر حضرت امام اہل حدیث و فقہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ، ذکر طبقات علمائے حنفیہ نیز آوردہ شدہ۔
۲۔ کتاب المعجزات والآیات البینات۔

۳۔ کتاب التفسیر الحدیم النظیر۔

۴۔ کتاب المستطاب فی بیان مناقب الاصحاب علیہم رضوان اللہ الوھاب۔

۵۔ کتاب الفطرۃ فی مناقب... علیہم المغفرۃ

۶۔ کتاب لطف الرب فی المناقب واحوال سید العرب کرم اللہ تعالیٰ وجھہ الوجیہ۔

۷۔ کتاب التوامین (رو) فی فضل الحسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

۸۔ کتاب الاغاثۃ لطالبی احوال الائمۃ الثلثۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

۹۔ کتاب احوال سادات الائمۃ الستۃ الباقیۃ من الائمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۱۰۔ کتاب موابلۃ العشرۃ فی احوال العشرۃ السادات الاوصیاء الذین ورثوا سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وعلیٰ سایر الانبیاء وسلم۔

۱۱۔ کتاب الخطاب المستطاب فی احوال الاربعۃ من الاقطاب علیہم رضوان اللہ الوھاب

۱۲۔ کتاب الصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔

۱۳۔ کتاب السعادۃ فی بیان ماقبل الولادۃ۔

۱۴۔ کتاب البلوغ فی احوال الولادۃ ومابعدھا الی البلوغ۔

۱۵۔ نعم الکتاب فی احوال الشباب۔

۱۶۔ کتاب استنارۃ الجوخۃ لطلوع شمس الشیوخۃ۔

۱۷۔ کتاب عبور اللبیب علیٰ حبس ایصال الحبیب الی الحبیب۔

۱۸۔ کتاب الارشاد الی بیان احوال الاولاد الامجاد۔

۱۹۔ کتاب الاھتداء الی احوال الخلفاء العظماء۔

۲۰۔ کتاب فہرس المخادیم۔

۲۱۔ کتاب مجمع الفوائد و مستجمع العوائد۔

۲۲۔ کتاب تحقیقات نجبا و تدقیقات نقبا۔

۲۳۔ کتاب مجمع الکمالات القدسیہ و مجموعۃ الفیوضات الندسیہ۔

۲۴۔ کتاب جلیس نفیس..... و انیس سلیس[۱۴]

روضات شاہی کے مآخذ مصنف نے تو دیباچہ میں اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم متن میں حسب موقع حوالے دیے گئے ہیں۔ صحاح ستہ کے علاوہ جن کتابوں کے نام بطور مآخذ ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔ مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داؤد، مؤطا امام مالک، کتاب الملاحم، الیواقیت والجواھر فی بیان اعتقاد الاکابر، زوال الترح وشرح منظومہ ابن فرح، فتوحات مکیہ، جمعات شاھی، تفسیر کشاف، تفسیر کبیر رازی، کتاب النوادر، طبقات الفقہا اور الجواہر المضیئیہ فی طبقات الحنفیہ وغیرہ۔

حواشی

[۱] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابت ماہ مئی ۱۹۹۳ء، ص ۳۳۹ [۲] روضات شاہی (قلمی)، ورق ۶ الف (مخزونہ بیت الحکمۃ، ہمدرد لائبریری، کراچی) [۳] دیکھیے اسی مضمون میں مصنف کا شجرۂ نسب [۴] روضات شاہی (قلمی) ورق ۶ الف [۵] رحمان علی، مولوی: تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۹۱۴، بار دوم، ص ۲۱۴ [۶] ایضاً [۷] ایضاً ص ۲۱۶ [۸] روضات شاہی (قلمی)، ورق ۹ الف سطر ۱۵ [۹] تذکرہ علمائے ہند مذکور، ص ۲۱۶ [۱۰] ایضاً ص ۲۱۵ [۱۱] ایضاً ص ۲۴ [۱۲] روضات شاہی (قلمی)، ورق ۲۲۴ ب (خود مصنف کے الفاظ، نقل بلفظہ) [۱۳] ایضاً ورق ۲۲۵ الف [۱۴] ایضاً ورق ۶ ب تا ۷ الف بلفظہ۔

استنبول کے کتبخانوں میں البیرونی کے مخطوطات

از پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں، کلکتہ

ستمبر ۱۹۸۹ء میں میں نے اتاترک کلچر مرکزی کی دعوت پر ایک بین الاقوامی سیمنار میں مقالہ پیش کرنے کے لیے انقرہ (ترکی) کا سفر کیا تھا۔ استنبول کے کتبخانوں کے بارے میں کافی سن چکا تھا اس لیے میں نے انقرہ سے استنبول کا سفر کیا اور وہاں دس روز قیام کیا۔ استنبول میں بے شمار کتب خانے ہیں۔ اس کے ڈائریکٹر جناب معمر الکرنے مجھے بتایا کہ صرف سلیمانیہ کتب خانے میں ایک لاکھ عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات ہیں۔ چونکہ وقت کم تھا اس لیے مجھے اس کے بہت اہم نوادرات ہی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے البیرونی[۱] جیسے نادر روزگار مصنف پہ تحقیقی کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ البیرونی (وفات ۴۴۲/ ۱۰۵۰) ایک عظیم مسلمان سائنسداں تھا۔ جو ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ وہ ایک بڑا عالم اور جامع کمالات شخص تھا، وہ نہ صرف ایک مورخ تھا بلکہ ایک سائنسداں، ریاضی داں اور علم الہیئۃ کا ماہر تھا۔ اس سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانے میں اسکی تصنیفات بہت اہم ہیں اور ان کے بہت سے اہم اور نادر مخطوطات استنبول کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۲]۔ اس لیے میں نے سب سے پہلے ان کا جائزہ لیا۔ مگر میرا قیام استنبول میں بہت کم رہا اس لیے میں البیرونی کے تمام مخطوطات کا جائزہ نہیں لے سکا، صرف پانچ کتابوں کے بارے میں ہی نوٹ لے سکا، اپنی یہی معلومات

اس مضمون میں پیش کر رہا ہوں کہ یہ بھی فائدہ سے خالی نہ ہوں گی۔

(۱) کتاب الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ :۔ یہ اصل میں کتبخانہ آیاصوفیا کا مخطوطہ ہے جو اس وقت سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کا نمبر ۲۹۴۷ ہے۔ یہ مجلد نسخہ بہت خوبصورت لکھا ہوا ہے اور ایک تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلطان محمود اول کا وقف کیا ہوا ہے۔ اس میں ایک سو چھپن اوراق ہیں اور ہر صفحے پر ۲۵ سطریں ہیں، سب ملاکر ۴۹ شکلیں موجود ہیں، یہ مخطوطہ سمرقند میں لکھا گیا تھا اور اس پر تاریخ کتابت ۸۳۹ ہجری مطابق ۱۴۳۵ء درج ہے۔ ہر صفحہ میں طلائی جدول ہیں اور بعض عنوانات اور الفاظ سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔

ابتداء :۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ المتعال عین الاضداد، الاشباہ والصلوٰۃ علی محمد المصطفٰی خیر الخلق وعلی آلہ ائمۃ الھدی والحق"۔

خاتمہ :۔ یعرف فی ای شھر یکون وعلی الایام الماضیۃ فی الشھر الموقع بالحمرۃ او السواد انشاء اللہ وحدہ وھو حسبی کافیا وبعدہ ھذہ الخاتمۃ تاتی عبارۃ التالیۃ۔ ... تم الکتاب فی سنۃ تسع وثلاثین وثمانمائۃ ببلدۃ سمرقند حفظھا اللہ من الآفات ۸۳۹ھ

البیرونی نے اس نادر اور اہم کتاب کو اپنے جرجان کے دوران قیام میں شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے لیے لکھا تھا اور یہ اقوام قدیمہ کی تقویم، تاریخ اور ان کے تہواروں کے موضوعات سے متعلق ہے۔ اس کا اصل عربی متن ۱۸۷۸ء میں ایڈورڈ زخاؤ نے شایع کیا تھا اور یہ دوسری مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شایع ہوا۔

اس کا انگریزی ترجمہ زخاؤ ہی نے لندن سے ۱۸۷۹ء میں شایع کیا تھا، جس کا نام The Chronology of Ancient Nation ہے یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں لاہور سے بھی دوبارہ شایع ہوئی ہے۔

(۲) کتاب استیعاب لوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاصطرلاب:۔ یہ بھی آیاصوفیا کتب خانے کا مخطوطہ ہے جو سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کا نمبر ۲۵۷۶ ہے اور یہ بھی ترکی کے سلطان محمود اول کا وقف ہے۔ یہ خط تعلیق میں لکھا ہوا ہے جس میں اکثر حروف پر نقطے نہیں ہیں۔ اس میں سب ملا کر ۸۱ اوراق ہیں اور ہر ورق پر ۱۹ سطریں اور اس میں بہت سے اشکال بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کو البیرونی نے ابی سہل عیسیٰ ابن یحییٰ الطبری سے معنون کیا تھا، یہ اصطرلاب پر البیرونی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ یہ وہ آلہ ہے جو علم الہیئۃ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ رسالہ کسی نے بھی ایڈٹ کرکے اب تک شایع نہیں کیا ہے اس کا ایک اہم مخطوطہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائیٹی میں بھی موجود ہے اور اسے جلد از جلد شایع ہونا چاہیے۔

ابتدا:۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ کتاب محمد بن احمد البیرونی فی استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاصطرلاب الّفہ لابی سہل عیسیٰ بن یحییٰ الطبری۔

خاتمہ:۔ واذ اقد (و) فینا ما وعدنا من امر ہیئۃ الافلاک وھیئۃ الارض وتمکن منھا الکتاب واللہ اعلم بالصواب کتبتہ لیکون ستورًا فی نسخ کتب الھیئۃ۔ تمت بعون اللہ وحسن التوفیق۔

اس کا جار اللہ کلکشن کا ایک مخطوطہ سلیمانیہ کتب خانے میں موجود ہے جس کا

نمبر ۴۵۱۷ ہے۔

(۳) تحدید نہایۃ الاماکن لتصحیح مسافات المساکن:۔ یہ مشہور مخطوطہ خود البیرونی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ فاتح سلطان کتب خانے کا نسخہ ہے جو سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے اور اس کا نمبر سلطان فاتح ۳۳۸۶ ہے۔ اس میں ایک سو اکہتر اوراق اور ایک سو اٹھارہ اشکال ہیں۔ ہر صفحے پر ۱۳ سطریں ہیں، مخطوطہ خط نسخ میں ہے، جس میں خط کوفی کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں اس کتاب کے مالکوں کی دو چھوٹی چھوٹی مہروں کے علاوہ ملکیت کے اور دو نوٹ بھی ہیں۔ ہر صفحے پر لکھائی کا رقبہ ۱۳×۱۳ ½ سینٹی میٹر ہے۔ حواشی میں کچھ نوٹس ہیں جو بدخطی کا نمونہ ہیں علم الہیئۃ کے بہت سے اشکال اس میں موجود ہیں جس میں سیاہ اور سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ ہر باب کا عنوان بھی سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ یہ مخطوطہ بھی ترکی کے سلطان محمود اول کے کتب خانے کا ہے۔

ابتدا:۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم: قال ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی فی تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن۔ لما کانت العقول محتاجۃ الی الاستمداد و النفوس غیر مستغنیۃ۔

خاتمہ:۔ واللہ تعالیٰ یعین علیٰ ما انا فیہ من تصحیح الحرکات السماویۃ۔ تم تحدید الاماکن لتصحیح مسافات المساکن فرغت منہ بغزنۃ سبع بقین من رجب سنۃ ست عشرۃ (ستۃ) واربع مائۃ ۴۱۶ھ۔

اس خاتمے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ خود البیرونی نے یہ مخطوطہ ۴۱۶ ہجری بمطابق ۱۰۲۵ عیسوی میں لکھا تھا۔ تاریخی طور پر بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سالوں

میں جن میں یہ مخطوطہ لکھا گیا تھا، البیرونی کا قیام غزنہ میں تھا، یہ کتاب ریاضیات اور
اور جغرافیہ سے متعلق ہے جو البیرونی کے محبوب موضوعات ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے
باب میں البیرونی نے لکھا ہے کہ اس نے اس کو ایک گاؤں جیفور Jayfier
جو کابل کے قریب ہے ۴۰۹ ہجری میں لکھنا شروع کیا تھا۔

اس کتاب کے دو ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر پی۔ بلغاکوف نے اس
مخطوطے کو عرب لیگ قاہرہ کے شعبۂ ثقافت کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں شایع کیا تھا
اس کا دوسرا ایڈیشن اسی سال محمد طاویت الطنجی نے انقرہ سے شایع کیا۔ اس کا
انگریزی ترجمہ The determination of tha Co Ordinatesof
Positionsfor the Correctiom of Distances Between
Cities ڈاکٹر جمیل علی نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی کی طرف سے شایع کیا تھا۔

(۴) کتاب القانون المسعودی :- یہ ریاضیات اور علم الہیئۃ پر
البیرونی کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس مخطوطے کا نمبر ہے ۴۹۸ ا یہ جار اللہ
کتب خانے کا مخطوطہ ہے جو سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے اس میں ہر صفحے پر ۲۵
سطریں ہیں اور سب ملا کر اس میں ۴۰۲ اوراق ہیں اس میں ۲۳۶ ہندسی اور
ریاضی اشکال موجود ہیں جن کا تعلق علم الہیئۃ سے ہے۔ حروف پر نقطے عام طور سے
نہیں دیے گئے ہیں۔ چند اوراق کرم خوردہ ہیں لیکن مخطوطہ بہت اچھی حالت میں
ہے۔ اس مخطوطے میں تاریخ کتابت آخر ربیع الاول ۵۳۱ھ (مطابق ۱۱۳۶ء)
درج ہے۔ لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ البیرونی کی وفات ۴۴۲ ہجری میں ہوئی تھی
تو یہ مخطوطہ اس کے انتقال کے صرف نواسی سال بعد لکھا گیا ہے۔ البیرونی کے

قول کے مطابق اس نے یہ کتاب سلطان محمود غزنوی کے جانشین سلطان ابن سعید مسعود غزنوی کے لیے لکھی تھی۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب حیدرآباد کے دائرۃ المعارف الاسلامیہ سے ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء میں تین جلدوں میں شایع ہو چکی ہے[۷]

ابتدا :- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : المسعود من سعد باللہ و تفرد بتائیدہ ایاہ من الاشکال والاشباہ فلا واضع لمن رفع ولا واجد لمن منع۔

خاتمہ :- الدعاء للملک الاجل السید المعظم ظہیر خلیفۃ اللہ و ناصر دین اللہ وحافظ عباد اللہ المنتقم من اعداء اللہ ابی سعید مسعود بن یمین الدولۃ و امین الملۃ محمود اطال اللہ بقائہ۔

البیرونی نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں اس کے مباحث اور موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں گیارہ مقالے ہیں اور ہر مقالے میں متعدد ابواب ہیں۔

اس کے اور دو نسخے ترکی کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ایک ولی الدین کی لائبریری میں جس کا نمبر ۲۷۹۲ ہے اور دوسرا مخطوطہ قونیہ کی یوسف آغا کی لائبریری میں ہے جس کا نمبر ۲۲۷۷ ہے۔ اس کتاب کے اور بھی مخطوطے لندن اور برلن کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

مشہور ترکی مورخ ذکی ولیدی طوغان نے اس کے جغرافیہ کا حصہ جو پانچویں مقالے کے انیسویں باب پر مشتمل ہے۔ اپنے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ نشر کیا ہے[۸] جیسا کہ انھوں نے اس کے اور دوسرے بابوں کو بھی ترجمہ کر کے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے اور تین اہم مخطوطات بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ، شاہی لائبریری برلن اور برٹش میوزیم

لائبریری لندن میں موجود ہیں۔

(۵) کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم :- یہ البیرونی کی علم نجوم کے موضوع پر مشہور کتاب کا مخطوطہ ہے۔ اس کے مخطوطات دنیا کی مختلف لائبریریوں میں ہیں۔ یہ فیض اللہ کلکشن کا مخطوطہ ہے جو فاتح ملت لائبریری استنبول میں محفوظ ہے۔ نمبر ۱۳۳۳، اس کے ۲۴۷ اوراق ہیں اور ہر صفحے پر ۱۳ سطریں ہیں، یہ سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے لیکن ستاروں کے نام سرخ روشنائی سے ہیں، بہت عمدہ کاغذ استعمال کیا گیا ہے اور اس مخطوطے کی حالت کافی اچھی ہے۔ سرورق پر صرف کتاب کا نام لکھا ہوا ہے، مصنف کا نام اور دوسری تحریریں دانستہ طور پر مٹا دی گئی ہیں۔ طلائی روشنائی سے دائرہ کی شکل میں تین مہریں موجود ہیں۔ جن میں الملک الناصر الملک العزیز اور صلاح الدنیا والدین ابو المظفر ابن سفیان کے نام موجود ہیں، سرورق کے بعد والے صفحے پر تحریر ہے کہ یہ کتاب البیرونی نے الحسن الخوارزمی کی دختر ریحانہ کے لیے لکھی تھی ایک گول مہر یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مخطوطہ شیخ الاسلام فیض اللہ آفندی کا وقف ہے۔ اس میں بہت سے اشکال بھی پائے جاتے ہیں۔

خاتمہ :- تم الکتاب ووقع الفراغ عنہ فی رمضان المبارک سنۃ ثمان واربعین وست مائۃ بمدینۃ دمشق المحروسۃ الحمد للہ صلی اللہ علی سیدنا محمد النبی ... وسلم تسلیما کثیرا۔

اس کا عربی متن اور انگریزی ترجمہ جس کی بنیاد برٹش میوزیم لندن کا مخطوطہ ۸۳۴۹ ہے آر۔ ریمزے رائٹ نے ۱۹۳۴ء میں لندن سے شایع کر دیا ہے۔

اس کا فارسی ترجمہ سید جلال ہمائی نے طہران سے ۱۹۴۰ء میں شایع کیا تھا۔

البیرونی کی ایک سو چوراسی کتابوں اور رسالوں کے نام مجھے معلوم ہوئے ہیں۔ مصر کے عیسائی محقق اور عالم ڈی۔ جے۔ بوالو مرحوم نے اپنی جامع ببلیوگرافی[۴۸] میں ان کی ایک سو اسی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

بنارس کے مشہور پنڈت اور علم الہیئۃ کے ماہر بیجائے نند کی کتاب کرنا تلکا کا عربی ترجمہ غرۃ الزیجات البیرونی نے کیا تھا[۴۹]۔ اس کا ایک مخطوط مل گیا ہے اور اس کا متن اور انگریزی ترجمہ بھی شایع ہو چکا ہے، اس کتاب کا علم مرحوم بوالو کو نہیں تھا۔

اس کے بعد اور کئی مختصر رسالے منظر عام پر آئے ہیں ایک رسالہ بنام کتاب الدرر فی سطح الاکر آکسفورڈ یونیورسٹی کے بوڈلین لائبریری میں دستیاب ہوا ہے[۵۰]۔ البیرونی کے بہت سے رسالے اور کتابیں اب تک منظر عام پر نہیں آئیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ان میں سے بعض دستیاب ہو سکیں گی اور یہ عین ممکن ہے کہ ان میں سے چند کے مخطوطات استنبول کے کتب خانوں ہی میں مل جائیں لیکن یہ بہت تلاش و تجسس کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

حواشی

[۱] دیکھئے ڈی۔ جے۔ بوالو' البیرونی Encyclopedia of Islam نیا ایڈیشن' جلد اول (۱۹۶۰ء) صفحات ۱۲۳۶ - ۱۲۳۸؛ ای۔ ایس۔ کینیڈی' البیرونی Dictionary of Scientific Biography جلد دوم (نیو یارک' ۱۹۷۰ء) صفحات ۱۴۷ - ۱۵۸؛ ایم۔ ایس۔ خان A Classified Bibliography of recent publicationson al biruni

۔ مسلم ورلڈ بک ریویو لیڈن جلد دہم، نمبر ۳ (۱۹۹۰ء) صفحات ۶۵ - ۶۵، ؎ رمضان ششن،
المخطوطات التركية ونشر فهارسها، کتاب اهمية المخطوطات الاسلامية
میں موسسة الفرقان للتراث الاسلامی، لندن (۱۹۹۲ء) صفحات ۱۰۵-۱۱۲۔
؎ دیکھئے الدکتور عبدالقادر قرہ خاں' ابوالریحان البیرونی مولفاته المخطوطات بمکتبات
استنبول' کتاب Al Biruni Commemorative Volume میں' ایڈیٹر
حکیم محمد سعید، کراچی، پاکستان (۱۹۷۹ء) صفحات' ۱۹-۴۲ ؎ البیرونی کی اس تحریر کے
عکس کے لیے دیکھئے' ایران سوسائٹی کی شایع کردہ کتاب Al Biruni Commemo
ration Volume (کلکتہ ۱۹۵۱ء) صفحہ بالمقابل سرورق ؎ دیکھئے جمیل علی کا یہ انگریزی
ترجمہ' بیروت' ۱۹۶۷ء، صفحات ۲۷۸ ؎ اس کے متن کی تیاری پر ان چاروں مخطوطات سے
استفادہ کیا گیا تھا، لیکن اس میں اصلاح و تصحیح کی گنجایش موجود ہے۔ اس کی اشاعت دائرۃ المعارف
کا ایک اہم کارنامہ ہے ؎ دیکھئے پروفیسر طوغان کا Biruni's picture of the
world;Memoirs of the Archeological Survey of India
no 53
؎ دیکھئے L' Oeurvve D' Al-Biruni رسالہ میڈیو (MIDEO) جلد دوم میں
(قاہرہ ۱۹۵۵ء) صفحات ۱۶۱-۲۵۶ اور اس کے دو تتمے جو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں
رسالہ مذکورہ میں شایع ہوئے ہیں ؎ اسکا متن پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شایع ہوا ہے، اسکا متن
انگریزی ترجمہ کے ساتھ پروفیسر این اے بلوچ نے سندھ یونیورسٹی پاکستان کی طرف سے شایع کیا ہے
Ghurral al Zijat or Karva Tilaka by Bijayanand of
Benaras 1973 عربی متن' صفحات ۴۹' مقدمہ اور انگریزی ترجمہ' صفحات ۴۴، ؎ ملاحظہ کیجیے'
فواد سزگین Geschichte Des Arabischain Schrifttums
جلد پنجم (لندن ۱۹۷۴ء) صفحات ۳۷۵-۳۸۳ اور جلد ششم (لندن ۱۹۷۸ء) صفحات' ۲۶۰-۲۶۹

ہندوؤں میں عربی[1]

جناب رام لعل نابھوی صاحب

زبان اس کی ہے جو زبان سیکھتا ہے۔ اس پر عبور حاصل کرتا ہے۔ پڑھتا ہے۔ لکھتا ہے۔ اور لوہا منواتا ہے۔ لوگوں کو مادری زبان بھی خواہ کوئی بھی زبان ہو سیکھنی پڑتی ہے۔ کسی زبان پر کسی مذہب کی اجارہ داری نہیں۔ زبان کسی دائرے میں قید نہیں کی جاسکتی۔ یہ کسی جکڑ بندی میں نہیں آتی۔ زبان ٹھاٹیں مارتا سمندر ہے جس میں اور زبانیں بھی گھس پیٹھ کرلیتی ہیں۔

عربی زبان عرب کے باشندوں کی ہے۔ اس زبان میں لکھی کتابیں غیر زبانوں میں منتقل ہوئیں۔ غیر زبانوں کی کتابیں عربی زبان میں ڈھالی گئیں۔ زبان کا سرمایہ بڑھتا گیا۔ عربی ملکوں ملکوں پھیلی۔ عرب کے تاجر ہندوستان آتے تھے۔ آہستہ آہستہ رابطہ کی زبان بن گئی۔ علم و ادب نے ترقی کی۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے فروغ دیا۔ ہندوؤں نے جنھیں زبانیں سیکھنے۔ جاننے کا شوق قدرت نے ودیعت کیا ہے، اردو۔ فارسی۔ عربی کو سیکھا۔

یہاں ایک بات کہنا ضروری ہے کہ عربی کی طرح سنسکرت کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ مسلمان بادشاہوں نے کافی حد تک اسے فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ غیر ممالک سے اسکالر ہندوستان سنسکرت سیکھنے کے لیے آتے۔ پچاسوں کتابیں

---

[1] معارف: غالباً مقالہ نگار نے سکھوں کو بھی ہندوؤں میں شامل کرلیا ہے، انکی فہرست کے بعض نام سکھ معلوم ہوتے ہیں۔

عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ یہاں سے عالم پنڈت بلائے جاتے اور سنسکرت زبان کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے مدد لی جاتی۔

عربی مشکل زبان ہے۔ ہندوستان میں یہ درباری زبان کبھی نہیں رہی۔ لیکن مکتبوں۔ مدرسوں اور مسجدوں میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندوؤں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔ مولوی عربی، فارسی پڑھاتے۔ جہاں مولوی عالم فاضل ہوتے تھے، وہاں بچے بھی بہت ذہین ہوتے تھے۔ پڑھائی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ مولوی محبت اور لگن سے پڑھاتے تھے۔ وہ اسے اسلامی فریضہ سمجھتے اور ثواب خیال کرتے تھے۔ بچے تختیاں ہاتھ میں قلم دوات اٹھائے خوش خطی سیکھتے۔ والدین قلم تراش دیتے۔ تختیاں تیار کرتے۔ سیاہی بناتے اور بچوں کا خط دیکھکر پھولے نہ سماتے۔ جن گھرانے میں عربی۔ فارسی نہیں جانی جاتی تھی اسے تہذیب یافتہ گھرانا سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ اس لیے عربی۔ فارسی چلن عام تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں :۔

> ایک زمانہ وہ تھا جب ہندو فارسی عربی کے عالم ہوا کرتے تھے۔" "اردو ادب کی ایک صدی"۔ صفحہ ۱۱۸ حاشیہ، کلر پرنٹنگ پریس، دہلی۔

عربی میں ہندوؤں کے کام پر کوئی کتاب۔ کوئی مضمون۔ کوئی مقالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ کوئی مذاکرہ۔ مباحثہ۔ نہیں سنا۔ ببلیوگرافیوں، تذکروں میں کہیں کہیں ہندو عربی دانوں کا ذکر ملتا ہے لیکن نہیں کے برابر۔ مثلاً تذکرہ گلزار ابراہیم میں ٹلک چند بہار مصنف "بہار عجم" کے بارے میں لکھا گیا ہے :۔

> "در عربی مناسبت و در فارسی مہارت دانسیت"

تلک چند بہار کی یہ لغت بہت ضخیم ہے، فارسی میں ہے۔ ایران میں اس لغت کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ وارستہ مل سیالکوٹی کی فارسی "مصطلحات شعراء" کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان علماء کو عربی لغت کا پتہ نہ ہو بلکہ عبور حاصل نہ ہو۔

منشی اندرمن مرادآبادی عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، ہندی کے بہت بڑے عالم تھے، جو کتاب انہیں گراں گزرتی اس کا جواب اسی زبان میں دیتے اور شایع کراتے مثلاً کسی نے فارسی نظم و نثر میں کچھ لکھا تو انھوں نے فارسی نظم و نثر میں جواب دیا۔ ان کا ذکر ایک آدھ جگہ بھی نہیں ملے گا حالانکہ وہ اپنی کتابوں میں عربی کتابوں کے حوالے دیتے تھے، میرے پاس ان کی بہت کتابیں ہیں، جو ضخیم ہیں۔

ساجد زیدپوری اپنی تصنیف "لچھمی نرائن شفیق" میں رقمطراز ہیں:۔

" الفت لکھنوی، عربی صرف و نحو سے کافی واقفیت تھی"۔ صفحہ ۳۶۔

"بسمل لکھنوی، عربی، فارسی، صرف و نحو میں مہارت تھی"۔

" لچھمی نرائن شفیق عربی، فارسی، اردو جانتے تھے، عربی قطعہ بھی لکھا ہے"۔

دیباچے کے تحت جو عبارت ہے اس کے نیچے عربی میں شعر درج ہے۔ صفحہ ۸۹

نریندر بہادر سریواستو اپنی تصنیف " نوابی عہد میں ہندوؤں کا فارسی میں یوگ دان" میں رقم طراز ہیں :۔

" الفت لکھنوی۔ عربی جانتے تھے"۔

" گوبند پرشاد فضا لکھنوی۔ عربی جانتے تھے"۔

میرا اندازہ ہے کہ لکھنؤ کا ہر فارسی اور اردو شاعر عربی جانتا تھا چند ولال زار ہوں۔ طوطا رام شایاں ہوں۔ رتن سنگھ زخمی ہوں یا کوئی اور۔ ادھر پنجاب میں

عربی جاننے والے بہت تھے۔ میرے مضمون "فارسی کے ہندو انشا پرداز" میں جن انشا پردازوں کا ذکر ہے وہ سب عربی جانتے تھے۔ نابھا میں دو ایسے فارسی داں تھے جن کی فارسی میں تصنیفات موجود ہیں۔ ایک تھے منشی گوبند رام اور دوسرے پنڈت کرتا رام۔ دونوں عربی سے واقف تھے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوآنہ کو قرآن شریف پر عبور حاصل تھا۔

بشیر ساجد لاہور۔ "اوراق" لاہور کے جون۔ جولائی ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں رقم طراز ہیں :-

" بہاری لال۔ عربی، فارسی میں کمال مہارت رکھتا تھا۔"

ڈاکٹر شیوراج چودھری دہلی یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔ انھوں نے عربی میں گیتا کا ترجمہ کیا۔ گوردوکل ہردوار میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں معلوم ہوا ویدوں کا ترجمہ عربی میں کر رہے ہیں۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ دنیا کو ہی چھوڑ کر چلے گئے۔

جناب ایس کے تلواڑ دہلی میں ہیں۔ عربی کے ایم اے ہیں اور اس زبان کا بیحد شوق ہے۔ شری ایس۔ کے۔ جاولے نے سردار گوردیال سنگھ مجذوب دہلی کی کتاب "بہا غفت غیتا" (گیتا) کا پیش لفظ عربی میں لکھا ہے۔

سیوارام جوہر کی کوئی عربی کی کتاب ہمیں دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی کتاب "جوہر التراکیب" میں جو فارسی میں منظوم کتاب ہے۔ اوزان مصادر عربی پر فارسی میں چار اشعار درج ہیں۔ اس سے ان کی عربی دانی کا پتہ چلتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:-

از ثلاثی مجرد مصدر آمد سی و پنج   قتل و فسق و شغل و کتیان باز حرمان و دوام

رحمت و نشدت صعوبت کدورت و غفران و طلب — محمدت مسحات مرجع و خل و دعوی حجام
ہم زہادت ہم ہدایت ہم بغایت ہم و میض — ہم کراہیت صغر قیلولہ و بشری دوام
ہم خنق ذکری صدیٰ وہم تطلیعت ہم دخول — غلبہ و نزوان و سرقہ خوان بحرکت میں لام
(ص۹)

رچی رام آریہ اپدیشک کی ایک کتاب "عرب میں سات سال" میرے پاس ہے ان کا کام آریہ سماج کا پرچار تھا، ظاہر ہے کہ انھوں نے عربی زبان سے ہی کام لیا ہوگا۔

مولوی مہیش پرشاد عربی کے عالم تھے۔ ان کے کام کی تلاش کی جا رہی ہے۔

لالہ مالک رام عربی جانتے تھے۔ ان کی کوئی تصنیف تو نہیں لیکن انھوں نے مجھے خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنے عربی جاننے والے دوستوں کو خط عربی میں ہی لکھتے تھے۔

سردار دیدار سنگھ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے عربی میں بیروت سے پی۔ ایچ ڈی کی تھی۔ معلومات حاصل کی جا رہی ہیں۔

دولت رام آریہ مسافر عربی دان تھے۔ وہ آریہ سماج کے پرچارک تھے۔ ٹکر لیتے رہتے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے عربی پڑھی تھی۔ دیکھئے فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۲۱۶۔

منشی گوبند لال صفا لکھنوی۔ آپ نے عربی میں اشعار کہے ہیں۔ دیکھئے نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی میں یوگ دان از ڈاکٹر سریواستو صفحہ ۱۳۸۔

ڈاکٹر سریواستو نے اسی کتاب میں بہادر سنگھ بھٹناگر۔ کندن لال اشکی۔ منولال فلسفی۔ لکشمی نرائن۔ عوض رائے حسرت۔ راجہ درگا پرشاد کی عربی دانی کا ذکر بھی کیا ہے۔

پنڈت ٹیکا رام آخون ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اونچے درجے کی پائی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عربی اور فارسی تعلیم کے لیے ایک مکتب قائم کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ از عبدالقادر سروری، صفحہ ۲۰۲۔

روپ بھوانی ۔ روپ بھوانی یا روپہ بھوانی کی تربیت ان کے والد نے کی تھی جو خود بھی ایک عارف تھے اور عربی اور فارسی میں دستگاہ رکھتے تھے (صفحہ ۲۵۵ ایضاً)

پنڈت کیلاش کول ۔ عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ صفحہ ۲۸۱ ایضاً

پنڈت ہری کول ہری۔ عربی میں صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ صفحہ ۳۰۸۔

یہ ایک سرسری تجزیہ ہے۔ تفتیش و تلاش جاری ہے۔

منسلکہ نقشہ ایسے ہندو عربی دانوں کا ہے جن کی عربی میں تصنیفات و تالیفات موجود ہیں۔

ہندوؤں کو عام شکایت ہے کہ عربی۔ فارسی۔ اردو میں ان کا کام نہیں بتایا جاتا، اسی طرح سنسکرت میں مسلمانوں کے کام کا بھی ذکر کم ہوتا ہے۔

نمبر شمار			
۱	یادگار راضی جلد اول	دیوان حافی بہاری لال واقفی۔ شاگرد غالب	۱۶۷ صفحات جاری سائز۔ شروع میں نظم عربی میں ہے۔ عربی کے علم صرف پر ہے۔ مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۴۷ ہجری۔ نابھوی کے پاس ہے
۲	الکیتا۔ (گیتا)	کنور ماکن لال	۲۴۳ صفحات۔ بڑا سائز ۱۹۵۱ء مطبع مجلس دائرۃ المعارف۔ نابھوی کے پاس ہے۔

۳ مہبط العرفان (ایشوا پنشد)

پنڈت کالی چرن شرما	۱۶ صفحات۔ ڈیمائی سائز۔ یونس پریس آگرہ۔ سال درج نہیں۔ نابھوی کے پاس ہے۔ اندازہ ہے کہ پنڈت کالی چرن شرما نے سبھی اپنشدوں کا ترجمہ عربی میں کیا ہوگا۔ تلاش جاری ہے۔

آگے چند عربی کتب و مخطوطات کا گوشوارہ ملاحظہ ہو:۔

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب عربی	سن طباعت	نام پریس	سائز	صفحات	کیفیت
۱	گوردیال سنگھ مجذوب	بہاغفت غیتا	۱۹۸۶	نازیہ آفسٹ پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی	ڈیمائی	۴۸	قیمت بارہ روپیہ پبلشر کاپا پبلیکیشنز، ۲۷۷/۱ پٹیل پارک بہادر گڑھ، ہریانہ۔
۲	"	الفرائد الفریدیة شیخ بابا فرید شکر گنج کے گورو گرنتھ صاحب درج ۱۳۰ اشلوکا کا ترجمہ	۱۹۸۴	نیو پبلک آفسٹ پریس لال کنواں دہلی۔	ڈیمائی	۴۸	قیمت چھ روپے پبلشر کاپا پبلیکیشنز، ہریانہ۔
۳	"	مرقاة العرفان جپ جی صاحب کا عربی ترجمہ	۱۹۸۶	نازیہ آفسٹ پرنٹنگ پریس روڈ گراں لال کنواں دہلی۔	ڈیمائی	۶۴	قیمت ۲۰ روپیے پبلشر مکتبہ انجمن ترقی اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔
۴	مترجم گوردیال سنگھ مجذوب	الصحافة ومبادیها الاساسیة	۱۹۸۰	جے۔کے آفسٹ پرنٹرز دہلی۔	ڈیمائی	۱۰۴	قیمت ۲۰ روپیے کاپا پبلیکیشنز، ۲۷۷/۱ پٹیل

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب عربی	سن طباعت	نام پریس	سائز	صفحات	کیفیت
		بلجیت سنگھ مطیر کی اردو کتاب خبار نویسی کے ابتدائی اصول کا عربی ترجمہ					پارک بہادرگڑھ ہریانہ۔
۵	گوردیال سنگھ مجذوب	انما ھو: درشنا بالذات ولیس الفلسفة پروفیسر خواجہ عبد الحئی صدر شعبہ فلسفہ دیال سنگھ کالج دہلی کے محققانہ انگریزی لیکچر کا عربی ترجمہ: موضوع سے کہ اصطلاح فلسفہ کی بجائے اصطلاح: درشنا ایک جامع اصطلاح ہے۔	سن اشاعت درج نہیں	لکشمی پرنٹنگ ورکس لال کنواں دہلی۔	ڈیمائی	۳۲	مکتبہ روشن ادب ۳۳۴۲، قاسم جان اسٹریٹ دہلی نے شایع کیا۔ قیمت درج نہیں۔
۶	گوردیال سنگھ مجذوب	المرأة فی الاسلام	۱۹۹۰	اردو پرنٹرز ۳۳۸۳/۱	ڈیمائی	۳۱۶	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، قیمت ۹۰ روپیے۔

نمبر شمار	نام مصنف	عربی کتاب کا نام	سن اشاعت	نام پریس	سائز	صفحات	کیفیت
		محقق وعالم جناب مالک رام صاحب کی کتاب: عورت اور اسلامی تعلیم کا اردو سے عربی میں ترجمہ		بھگوان پورہ کھیڑا لونی روڈ شاہدرہ دہلی۔			
۷	مترجم گوردیال سنگھ مجذوب مصنفہ ڈاکٹر راضیہ حامد صاحبہ کے تھیسس کا اردو سے عربی میں ترجمہ	النواب صدیق حسن خاں	زیر اشاعت	—	غالباً ڈیمائی ہوگا	مخطوطے کے صفحات ۳۰۰	مترجم معاوضہ لے چکا ہے اور کتاب مصنفہ کے رائلٹی کیوجہ سے ۱۹۸۷ء سے مولانا ابوالکلام عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان زیر اشاعت ہے۔ کتابت ہو چکی ہے۔
۸	گوردیال سنگھ مجذوب	تناغم المآسی	مخطوطہ	—		مخطوطے کے صفحات ۲۶۸	ہسٹری آف ہیومن ریسورسز

نمبر شمار	نام مصنف	عربی کتاب کا نام	سن اشاعت	نام پریس	سائز	صفحات	کیفیت
		انگریزی اردو وہندی کہانیوں کا عربی میں ترجمہ ہے۔ تمام المیہ افسانے ہیں					ڈویلپمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ساتھ طباعت میں مالی امداد کے لیے درخواست زیر غور ہے۔
۹	گوردیال سنگھ مجذوب	طمانینۃ النفس (سکھ منی صاحب کا عربی میں ترجمہ)	مخطوطہ			مخطوطہ کے صفحات ۱۳۴	اشاعت کا ارادہ نہیں۔ مذہبی کتاب کے سبب مالی امداد کا سوال حائل ہے۔
۱۰	گوردیال سنگھ مجذوب	تحفۂ نیل (عربی افسانوں کا اردو میں ترجمہ)	مخطوطہ			مخطوطہ کے صفحات قریباً اڑھائی سو ہیں	اشاعت کا ارادہ ہے کوئی پبلشر ملے کوشش جاری ہے۔
۱۱	گوردیال سنگھ مجذوب	ملفوظات قداسة المآب شانکس اشاریہ	مخطوطہ			مخطوطہ کے قریباً ڈیڑھ سو صفحات ہیں	زیر اشاعت ہو سکتا ہے۔
۱۲	مترجم گوردیال سنگھ مجذوب	الحیاۃ الناجحۃ	مخطوطہ			مخطوطہ محض ۳۲ صفحات	ایک ڈاکٹر صاحب اپنے خرچ

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب عربی	سن طباعت	نام پریس	سائز	صفحات	کیفیت
		اردو میں ایک طبی رسالہ کا عربی میں ترجمہ۔				تک شایع کیا جاچکا ہے سن اشاعت ۱۹۹۲ء	پر چھپوا رہے ہیں مترجم معاوضہ /۵۰۰ روپے حاصل کرچکا ہے۔
۱۳	مترجم گوردیال سنگھ مجذوب	تسلسل یوغا الصحی س قسم۳ فی معالجۃ مرض ذیابیطس	بکس فارآل دہلی نے انگریزی سے عربی میں ترجمہ کروایا ہے۔ سن ۱۹۹۲ء			مخطوطہ کے ۳۲ صفحات بغیر تصاویر ہیں۔	مترجم -/۵۶۰ روپے معاوضہ لے چکا ہے۔ اگر مسودہ منظور ہوا تو لبنان میں شایع ہوگا حسب اطلاع تحریر کیا جارہا ہے۔

اخبار علمیہ

حرمین شریفین اور حج بیت اللہ سے متعلق تحریریں اور تاثرات علوم اسلامیہ کا عظیم الشان اور بے مثال ذخیرہ ہیں، یہ محض احساسات و تاثرات کا مجموعہ ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخی و جغرافیائی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ادارہ دی آرکائیو انٹرنیشنل گروپ نے تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل دس ضخیم جلدوں کا ایک حج نامہ شایع کیا ہے جس میں قدیم اور مستند دستاویزیں، اہم ذمہ داروں کے تبصرے، انتظامی امور کی مفصل سالانہ روداد، اعداد و شمار، حج ہی سے متعلق حکمرانوں کی خط و کتابت کو عہد بعہد جمع کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ابن جبیر سے علی شریعتی تک مختلف اہم اشخاص کے ذاتی تاثرات و تجربات بھی یکجا کر دیے گئے ہیں، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعدد اہم تاریخی نقشے، مختلف دور کے کاروانِ حج کے راستے، مکہ کے قدیم خاندانوں مثلاً شریف مکہ وغیرہ کے نسب نامے بھی درج کیے گئے ہیں، ایک جلد حج کی روحانی اہمیت کے بیان اور ادعیہ حج پر مشتمل ہے، اس نہایت مفید اور جامع حج انسائیکلوپیڈیا کے مرتب ایلن رش ہیں اور اسکی قیمت ۴۹۵ ۱۲ اسٹرلنگ پاؤنڈ ہے۔

ہندوستان کے صاحب فکر و نظر تاریخ نگاروں میں رومیلا تھاپر کا نام نمایاں ہے، خصوصاً ہندوستان کی قدیم تاریخ پر انکی گہری نظر ہے، حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

نے ان کی کتاب inter prating early india شایع کی ہے،
اس میں انھوں نے اٹھارہویں صدی کے یوروپی خصوصاً جرمن اور انگریز مورخوں کے
وضع کردہ تاریخی معروضوں کا رد و ابطال کیا ہے، ان مورخوں نے اپنے مخصوص مقاصد
کے پیش نظر ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا ہے جن کی تقلید انیسویں صدی
کے اوائل کے بعض ہندوستانی قوم پرست تاریخ نویسوں نے بھی کی اور آریوں کی نسلی
برتری، ویدک تہذیب کی عظمت، قدیم ہندوستان کی یک جہتی اور ہندو قوم کی رواداری
اور عدم تشدد کے گیت گائے، لیکن رومیلا تھاپر نے ٹائمس آف انڈیا کے مبصر کے
الفاظ میں" ان معروضات کو ردی کی ٹوکری کے حوالہ کر دیا" انھوں نے ویدک کلچر سے
پہلے وادی سندھ کی تہذیب کا ثروت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ اس کا خاتمہ صرف
ویدک کلچر کی آمد سے نہیں ہوا بلکہ اس میں موسمی تغیرات جیسے سطح سمندر کا زیادہ اونچا
ہونا اور اس کے نتیجہ میں سیلاب آنا، پانی کا نمکین ہو جانا اور مرطوب کا خشک آب
و ہوا سے بدل جانا بھی شامل ہے، ان مورخین نے قومی تشخص کے نظریہ کو ماضی بعید کے
ہندوستان میں تلاش کیا تھا، رومیلا تھاپر نے اس نظریہ پر سخت گرفت کرتے ہوئے
سوال کیا ہے کہ کیا قدیم ہندوستان میں ہمیشہ یک رنگی اور یکسانی رہی جو سیاسی قوت
کے حصول کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے؟ انھوں نے خاص طور پر ہندو قومیت کو
اپنی بحث کا مرکز بنایا کہ یہی سب سے بڑی اور غالب قوم رہی ہے، ان کا حاصل
یہ ہے کہ یہ نام نہاد یکسانی قطعی غیر معتبر اور مکمل گڑھی ہوئی ہے، برہمنوں اور شرامنوں
کی مخاصمت سانپ اور نیولے سے کم نہیں، برہمنوں کو مذہبی رسوم کے مکمل اختیارات
حاصل تھے اور یہی ان کی قوت اور اثر و نفوذ کا سرچشمہ ہے، شرامنوں میں بودھ،

اجیوکا اور دوسرے طبقے شامل ہیں' انھوں نے ویدک سرتی اور بلیدان وغیرہ تصورات کی سخت مخالفت کی، رواداری اور عدم تشدد کا اگر وجود تھا تو ہندومت کے مخالف بدھوں اور جین مت میں تھا ورنہ کشمیر، تامل ناڈو جیسے علاقوں میں غیر برہمنوں پر جبر و تعذیب کی نئی مثالیں قائم کی گئیں اور چھوت چھات کا برہمنی نسخہ تو اس جبر کی سب سے بڑی مثال ہے، تھاپر نے اس نظریہ کا بھی ابطال کیا کہ ہند آریائی ایک متحدہ برتر نسل تھی جس نے مقامی dasyus کو ختم کرکے اپنی برتر ویدک تہذیب کو عام کیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق ویدک کلچر ایک تدریجی ارتقائی عمل تھا جس میں مقامی اثرات ضم ہوتے گئے" چنانچہ رگ وید جیسی ابتدائی کتابوں میں غیر آریوں کی بات چیت شامل ہے' انھوں نے لفظ آریہ کو نسل سے زیادہ زبان کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے' ایک باب میں انھوں نے پھر ہندو قومیت کے وجود پر بحث کرتے ہوئے دلچسپ سوال کیا کہ ہندو لفظ سب سے پہلی مرتبہ چندرہویں صدی میں استعمال کیا گیا اور ہندوستان کو جغرافیائی لحاظ سے الہند کیا گیا، یہ تو بعد میں سمجھا یا گیا کہ ہندو وہ ہے جو ہندوستان کا رہنے والا ہو لیکن وہ مسلمان اور عیسائی نہ ہو اور پھر سیاسی قوت کے حصول کے لیے برہمنیت نے ہندو قومیت کا نظریہ اختیار کیا اور مجبوراً اس دائرہ میں انھوں نے کم ذاتوں کو شامل کرکے ہندومت کو برہمنیت کے متبادل کی حیثیت سے وضع کیا، حالانکہ ماضی میں یہ برہمنیت بھی غیر ملکی ہی تھی۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں قدیم تاریخ ہند اور قرون وسطیٰ کے مسلم دور حکومت کی تاریخ کے مطالعہ و تجزیہ کی کوششیں دور رس اور زیادہ مفید ہیں۔

چنانچہ حال ہی میں چند اہم انگریزی کتابوں کی اشاعت کی خبر ملی ہے ان میں این سلی ایمبری کی ریلیجن اینڈ نیشنلزم ان ماڈرن انڈیا، ہربنس مکھیا کی پرسپکٹیو آف میڈیول ہسٹری اور ستیش چندر کی مغل ریلیجیس پالیسیز قابل ذکر ہیں، ایمبری نے گذشتہ تیس برسوں میں مذہب، سیاست اور قومیت پر کئی عمدہ مقالے لکھے، ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، انھوں نے بھی ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں ہندو رواداری کے دعوی کی حقیقت کا انکار کیا ہے، انھوں نے بھی رومیلا تھاپر کی طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات میں ہندو قومیت اور اس کے نظریہ رواداری کی تعبیر و تشریح کی نشاندہی کی ہے، ایمبری کے خیال میں ہندو مذہب، دوسرے مذاہب سے استفادہ کرنے میں فراخ دل ہے نہ دوسروں کو خود میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ وہ اپنے خول ہی میں محدود ہے، ایمبری نے ہندو فکر کے پانچ بنیادی ارکان، دہرمل، تجدید (اوتاریت) مذہب اور صداقت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ مسیحیت مختلف زمانے میں فلسفہ یونان سے مارکسی فلسفہ تک متعدد تہذیبی و ثقافتی لہروں سے متاثر ہوئی لیکن ہندو مت نے فی الواقعہ دوسری تہذیبوں سے کچھ نہ لیا، دوسری صداقتوں کے لیے اس نے بہت کیا تو ان کے لیے وہ جگہ یا سطح متعین کی جو اس کے احاطہ و دائرہ میں نہایت پست و حقیر تھی، ہربنس مکھیا نے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے سلسلہ میں بعض نہایت عمدہ اور فکر انگیز امور کی نشاندہی کی ہے، ان کا خیال ہے کہ قرون وسطیٰ کی تاریخ خالص سیاسی اور انتظامی کردار کی حامل ہے، اس کو مذہبی یا فرقہ وارانہ نظر سے اور تقلیدی اور مروجہ تاریخ نویسی کے اصولوں کی روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا، ستیش چندر کی کتاب راجپوتوں اور دکنی ریاستوں کے

متعلق مغلوں کی پالیسیوں کا مطالعہ پیش کرتی ہے' یہ کتاب ہر بنس مکھیا کے اصولوں کا بہترین نمونہ ہے جیسے انھوں نے یہ لکھا کہ جو لوگ شیواجی کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا نجات دہندہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں' جزیہ یا اسلامی ادعائیت جیسے عوامل صرف سیاسی ضرورتوں سے مشروط تھے' ورنہ ایک سیکولر اور غیر مذہبی ریاست کے قیام کی کوششوں کو اگر قدیم فکر کے حامل علما نے رد کیا تو راجپوت سرداروں نے بھی اسے مسترد کر دیا، جہانگیر شاہجہاں اور اورنگزیب کی اسلامی ریاست دوسری اسلامی حکومتوں کے طرز و مزاج سے عملاً جدا تھی، جزیہ کو عائد کرنا اور پھر اسے منسوخ کیا جانا اسی کی علامت ہے۔

حوصلہ مند اور مہم جو اشخاص کے ذوق جہانگیری اور شوق جہاں بانی کو مذہبی رنگ دیے جانے کے رویہ کو دیکھتے ہوئے شاید بمبئی سے کے' آر' این سوامی اور میرا دوی نے تخت طاؤس کی تاریخ کو دی پی کاک تھرونس آف دی ورلڈ کے نام سے مرتب کر کے شایع کیا ہے' اس میں مغل حکومت پر نادر شاہ کے حملہ' مسلم دلی کی بربادی اور محمد شاہ کے خزانہ کے لوٹنے کی تفصیلات کے علاوہ یورپی مورخین کی کتابوں کی مدد سے تخت طاؤس کی جامع تاریخ بھی بیان کی گئی ہے، آج کے اعتبار سے تخت طاؤس پچیس لاکھ اسٹرلنگ کی مالیت کا تھا، اس کے علاوہ نادر شاہ نے ہیرے جواہرات، سونا چاندی اور دوسری قیمتی اشیاء کی صورت میں قریباً ۱۲-۱۳ ملین پاؤنڈ کا خزانہ حاصل کیا، چند تاریخی مصادر سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نادر شاہ نے محمد شاہ سے جو دولت حاصل کی وہ دنیا کے اور بادشاہوں کے خزانوں سے سوگنا زیادہ تھی، بھارتیہ نیچر پبلیکیشنز پرائیوٹ لمیٹیڈ بمبئی کی شایع کردہ اس کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔

(ع - ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب مدینہ منورہ

مدینہ منورہ
۶ ربیع الآخر ۱۴۱۴ھ / ۲۲ ستمبر ۹۳ء

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اگست کا معارف چند روز قبل موصول ہوا، اس شمارے میں بیان الحق نیشاپوری کی تفسیر ایجاز البیان کے نسخۂ ٹونک پر حکیم سید محمد احمد ٹونکی کا ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ "اگر کسی صاحب کو اس تفسیر یا اس کے مرتب کے بارے میں واقفیت اور مزید معلومات ہوں تو وہ راقم کو ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ اشاعت کے موقع پر ان سے فائدہ اٹھا سکوں" یہ سطریں حکیم صاحب کے اسی استفسار کے جواب میں لکھی جارہی ہیں۔ اگر آپ ان تک پہنچا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

(۱) سب سے اہم اطلاع یہ ہے کہ نسخۂ ٹونک دنیا میں ایجاز البیان کا واحد نسخہ نہیں ہے جیسا کہ حکیم صاحب کا خیال ہے، دو نسخے اسی کتاب کے اور پائے جاتے ہیں۔ ایک مجلس شورائے ملی ایران کے کتب خانہ میں جس کا نمبر ۲۴۴۰ ہے، دوسرا اسکوریال میں جس کا ذکر بروکلمان نے کیا ہے۔

(۲) دوسری اطلاع یہ کہ کئی سال قبل جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں ایک طالبعلم اس کتاب پر کام کر رہے تھے اور توقع یہی ہے کہ ان کا کام اب تک پورا ہو چکا ہوگا۔ البتہ اشاعت کی خبر نہیں۔

(۳) تیسری اہم اطلاع یہ ہے کہ مصنف کی ایک کتاب "وضح البرھان فی مشکلات القرآن" کے نام سے ۱۴۱۰ھ میں دارالقلم دمشق سے شایع ہوچکی ہے۔ اس ایڈیشن کی بنیاد چسٹر بٹی لائبریری کے نسخہ پر ہے دوسرا نسخہ دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ ایجاز القرآن کے مقدمہ میں مذکور "باھر البرھان فی مشکلات القرآن" اسی مطبوعہ کتاب کا دوسرا نام ہوگا۔

(۴) "وضح البرھان" میں مصنف نے اپنی درج ذیل تین تصنیفات کا ذکر کیا ہے جن کا حوالہ کہیں اور نہیں ملتا ہے

۱۔ قطع الریاض فی بدع الاعتراض (۱: ۱۱۸)

۲۔ الخلالۃ فی مسألۃ الیمین علی شرب الماء من الکوز ولا ماء فی الکوز (۱: ۱۳۹)

۳۔ وضح البرھان کے شواہد کی شرح (۱: ۱۷۱)

(۵) "جمل الغرائب" کا موضوع غریب الحدیث یعنی حدیث کے مشکل الفاظ کی شرح ہے۔ اس کے کئی نسخے پائے جاتے ہیں۔ برادر عزیز محمد راشد اصلاحی نے اس کتاب کی تحقیق کا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔

(۶) مراجع میں بیان الحق کی حسب ذیل تین مزید کتابوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور ان میں سے ایک کا مخطوطہ بھی موجود ہے۔

۱۔ خلق الانسان، اس کا ذکر معجم الادباء اور بغیۃ الوعاۃ وغیرہ میں ہے اور اس کا قلمی نسخہ دارالکتب المصریۃ میں محفوظ ہے۔

۲۔ درر الکلمات علی غرر الآیات الموھمۃ للتعارض والشبہات (ایضاح المکنون ۲: ۵۸)

۳۔ التذکرۃ والتبصرۃ فی مسائل الفقہ (کشف الظنون ۱: ۳۹۳)

(۷) مصنف کے حالات کے مراجع میں داودی کی طبقات المفسرین اور بغدادی کی ہدیۃ العارفین کا اضافہ کرلیں اگرچہ حالات کے سلسلہ میں سب کا انحصار معجم الادباء پر ہے کسی نے ایک جملہ

بھی اس پر اضافہ نہیں کیا ہے۔

ان معلومات کی حیثیت ماحضر کی ہے۔ تحقیق و تفحص سے مزید باتیں خصوصاً تصنیفات کے بارے میں معلوم ہو سکتی ہیں۔

والسلام

خاکسار۔ محمد اجمل اصلاحی

مکتوب راجستھان

حمیدیہ لائبریری اردئی کلاں راجستھان

۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء

مخدوم و محترم جناب مولانا اصلاحی صاحب! مدظلکم العالی

اگست کا معارف ۲۴ر کو ملا تو اپنی مصروفیات کے سبب صرف شذرات اور وفیات کے صفحات پڑھ کر رہ گیا، مقالات کا مطالعہ آج کر سکا جن کے بارہ میں یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ نہایت وقعت و اہمیت کے حامل ہیں۔ راجستھان کا باشندہ ہونے کی وجہ سے مقالہ "حضرت شیخ احمد کھٹوی سرکھیجؒ" از حضرت مولانا محمد یوسف متالا صاحب مدظلہٗ (لندن) کو برائے مطالعہ ترجیح دی۔ صاحب مقالہ کے علمی و روحانی مرتبہ سے خاکسار کسی حد تک واقف ہے۔ اس لیے نہایت تامل کے ساتھ مذکورہ مقالہ کے چند امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

• ص ۱۰۵ و ۱۰۶ پر حضرت شیخ اسحاق مغربیؒ کے وصال کا جو قطعہ تاریخ مندرج ہے اس کے مصرعوں کی ترتیب قدرے معکوس ہو گئی ہے۔ اس گنجینۂ سروری ص ۱۳۱ پر یہ قطعہ اس طرح ملتا ہے:۔

سال تاریخ وصل بو اسحاق آنکہ مشہور جملہ آفاق است

"مہدی متقی امین اللہ" ۷۷۶ھ نیز "سردار عالم اسحاق" است ۷۷۶ھ

ہم باقوال بعضے از اخبار گفت سرور کہ "شاہ عشاق" است۔ ۱۲۰۰ھ [طبع دوم نومبر ۱۸۸۹ء]

ممکن ہے پہلے ایڈیشن میں وہی ترتیب ہو جو حضرت مولانا صاحب مدظلہٗ نے سپرد قلم فرمائی ہے۔

• صفحہ ۱۱۵ سطر ۴ پر شہر احمد آباد کی بنیاد کے مادہ "خیر و بخیر" میں صرف "بخیر" سے ہی ۸۱۲ھ برآمد ہوتے ہیں نہ کہ "خیر" سے بھی۔

• ص ۱۱۱ سطر ۹ پر حملۂ تیمور کے وقت (۱۳۹۸ء) سلطان دہلی شاہ محمود تغلق کو بتلایا ہے جو درست ہے مگر ص ۱۱۹ پر تحفۃ المجالس کے حوالہ سے بر وقت حملۂ تیمور سلطان فیروز کا نام آیا ہے۔ جس کا عہد حکومت ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء تھا۔

• ص ۱۲۲ پر حضرت شیخ احمد سرکھیجؒ کے سال ولادت کا تاریخی قطعہ ارقام فرمایا ہے۔ قیاساً عرض ہے کہ اس قطعہ کے آخری دو اشعار جو حضرت موصوفؒ کے سال وصال و مدت عمر کے مادوں پر مشتمل ہیں، محذوف ہو گئے ہیں، گنجینۂ سروری طبع دوم ص ۱۳۵ پر پورا قطعہ یوں درج ہے:۔

شیخ احمد بود مقبولِ خدا رہنمائے حق فقیر بے نظیر

"امجد آفاق احمد مجتبیٰ" ۷۳۸ھ۔ سرور از یں مصرع تولیدش بگیر [پورے مصرعۂ اولیٰ سے ایک تاریخ برآمد ہوتی ہے، نہ کہ دو]

وصل پاکش شد بیان "مرد خدا" ۸۴۹ھ شد عیاں "مہتاب عرفاں" از ضمیر ۸۴۹ھ

سال عمرش "سالک" و "عالی" بخواں ارتحالش "مقتدا احمد امیر" ۸۴۹ھ

کاش کہ جناب حکیم سید محمد احمد ٹونکی صاحب، مولانا آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے دیگر مخطوطات (خصوصاً تاریخی) کا تعارف بھی قارئین معارف کو اسی طرح فرماتے رہیں جیسا تفسیر ایجاز البیان کے مخطوطہ کا تعارف کرایا ہے۔ خدا کا شکر کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں" یہاں بھی"۔ ۱۲

دعاجو عبدالرؤف خاں

ادبیات

صلوٰۃ وسلام

از پروفیسر اختر اقبال کمالی، کراچی

زبان و دل ہیں ہم آہنگ سن کے ان کا نام
برائے پیش کش ہدیۂ صلوٰۃ وسلام

نوائے شوق کہ رونق فزائے ہستی ہے
مرے ضمیر کی گہرائیوں میں بستی ہے

یہ سیلِ نور جو الفاظ میں ابلتا ہے
کوئی چراغ ہے جو طاقِ دل میں جلتا ہے

اسی کے نور سے روشن ہے کائنات مری
اسی کے فیض سے پائندہ ہے حیات مری

یہ احترام و عقیدت کا کیف جاں پرور
یہ ایک رابطہ ہر رابطے سے بالاتر

اساسِ دیں سے یہی مایۂ یقیں ہے یہی
دل و نگاہ کا مقصودِ اولیں ہے یہی

جو ربط قلبِ مسلماں کو انکے نام سے ہے
وہ ربطِ خاص نمایاں مرے سلام سے ہے

نیازِ عشق کہ سرمایۂ دل و جاں ہے
خلوصِ قلب کہ ہر درد و غم کا درماں ہے

وہ جذب شوق جو دل کے سکوں کا ضامن ہے
وہ آرزو کہ امین صفائے باطن ہے

وہ بندگی کہ پرستش نہیں اطاعت ہے
وہ اتباع کہ پروردۂ محبت ہے

اسی سے ہے دلِ صدیقؓ کی حق آگاہی
اسی کا فیض ہے فاروقیؓ و یداللّٰہیؓ

اسی سے پایا ہے ہر جانِ دردمندنے چین
اسی سے خلقِ حسنؓ ہے اسی سے صبرِ حسینؓ

شگفتہ گلشن ایماں اسی کے دم سے ہے
بہار خون شہیداں اسی کے دم سے ہے

یہ نام پاک محمدؐ یہ ہدیۂ تسلیم
حقیقتاً ہے خود اپنے شعور کی تکریم

ضیائے مہر نے تصدیق کس سے چاہی ہے
یہ اپنے دیدۂ بینا پہ اک گواہی ہے

یہ اعتراف ہے روحِ بشر کی عظمت کا
یہ احترام ہے اقدارِ آدمیت کا

یہ ذوق و شوقِ مسلسل درود خوانی کا
بڑا وسیلہ ہے خالق کی ہم زبانی کا

سلام اس شرفِ دودمانِ آدم پہ
سلام دیدۂ حق بیں و قلبِ محرم پہ

سلام پاکیِ گوہر پہ جس کے دامن کو
کثافتوں کا تصور بھی چھو نہ سکتا ہو

سلام اس دلِ روشن کی حق اساسی پہ
سلام ان کے کمالِ خدا شناسی پہ

سلام حکمت و دانش پہ جسکا ہر ارشاد
بنا ہے قصرِ صلاح و فلاح کی بنیاد

سلام صدق و امانت کی شانِ عالی پہ
سلام خلق و مروت کی بے مثالی پہ

سلام اس نگہِ پاک کی طہارت پہ
فرشتے رشک کریں جس کی شانِ عصمت پہ

یقیں محکم و ایمانِ مستقل پہ سلام
خلوص و مہر و وفا و صفائے دل پہ سلام

سلام بخشش و احسان کے فیضِ جاری پہ
سلام شیوہ ایثار و غم گساری پہ

سلام چشمِ عنایت کی چارہ سازی پہ
سلام حسنِ تکلم کی دل نوازی پہ

کمالِ خلق کی ہر شانِ دل نشیں پہ سلام
جمالِ ذات کے آئینۂ حسین پہ سلام

یہ میرا نعرۂ مستانہ صلوٰۃ و درود
ہے اپنے عقدۂ دشوار زندگی کی کشود

یہ اک وسیلۂ اظہارِ مدعا بھی ہے
مرا سلام مرے دل کی التجا بھی ہے

گدائے راہ کا سلطانِ دو جہاں کو سلام
سلام تشنہ لبی چشمۂ حیات کے نام

سلام خاک کے ذرے کا مہرِ تاباں کو
سلام قطرۂ بے مایہ کا ابرِ نیساں کو

سلام خیرہ نگاہی کا نورِ کامل کو
سلام آبلہ پائی دلیلِ منزل کو

سلام جہل و ضلالت کا علم و عرفاں کو
سلام خارِ بیاباں کا بہارِ بستاں کو

سلام پیکرِ عصمت کو قلب مجرم کا
سلام عفو و عطا کو ضمیر نادم کا

سلام غرقِ معاصی صلاح و تقویٰ کو
سلام دیدۂ بے نور چشمِ بینا کو

فروغ صبحِ سعادت کو بندگی کا سلام
حضورِ دستِ کرم دامنِ تہی کا سلام

یہ پاسداریٔ رسمِ جہاں کی بات نہیں
یہ التزامِ رسومِ بیاں کی بات نہیں

دلِ حزیں کی یہ سب سے بڑی تمنا ہے
مرا سلام مری روح کا تقاضا ہے

قبول ہو تو سعادت نصیب ہو جائے
بھٹکنے والے سے منزل قریب ہو جائے

غزل

از جناب علی عرفان زیدی بدایونی (ایم اے)

جنھیں راہِ وفا میں رہبرِ کامل نہیں ملتا
انہیں منزل تو منزل جادۂ منزل نہیں ملتا

محبت قربتوں ہی سے جلا پاتی ہے دنیا میں
نہ ہوں جب تک نگاہیں چار دل سے دل نہیں ملتا

جو طوفاں سے گزر جانے کی ہمت چھوڑ دیتی ہے
وہ کشتی ڈوب جاتی ہے اسے ساحل نہیں ملتا

نہ ہو یوں بھی کنارہ کش کوئی گوشہ نشینوں سے
کسی محفل میں اب وہ رونقِ محفل نہیں ملتا

زمانہ محوِ حیرت ہے یہ بستی کیسی بستی ہے
یہاں ہر کوچہ مقتل ہے مگر قاتل نہیں ملتا

یہاں حدِ نظر تک منزلیں ہی منزلیں دیکھیں
مسافر کوئی بھی آسودۂ منزل نہیں ملتا

جو اوروں کا سکونِ زندگی برباد کرتے ہیں
انھیں عرفانؔ دنیا میں سکونِ دل نہیں ملتا

باب التقریظ والانتقاد

موطاء الامام مالک روایۃ محمد بن حسن الشیبانی مع التعلیق الممجد علی موطاء محمد (جلد اول، دوم، سوم)

تحقیق و تعلیق ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی، متوسط تقطیع، کتابت ٹائپ، کاغذ و طباعت نہایت عمدہ، مجلد، مجموعی صفحات دو ہزار، قیمت تحریر نہیں، پتے (۱) دارالسنۃ والسیرۃ، حلیمہ اپارٹمنٹس ونگ c - F روم ۲۰ ۹۵ مارلینڈ روڈ، بمبئی - (۲) دارالقلم پوسٹ بکس ۴۵۲۳ - حلونی دمشق (۳) پوسٹ بکس نمبر ۶۵۰۱ / ۱۱۳ بیروت۔

امام مالکؒ سے ان کے متعدد تلامذہ نے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف موطا کی روایت کی ہے، جن میں امام یحیٰی بن یحیٰی مصمودی کے نسخہ کو زیادہ شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، امام اعظمؒ کے ممتاز شاگرد امام محمدؒ بن حسن شیبانی نے بھی امام مالکؒ سے موطا کی روایت کی تھی مگر اسکی جانب کم اعتنا کیا گیا، اس لیے ہندوستان کے متبحر عالم مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ نے التعلیق الممجد کے نام سے اس کی شرح لکھ کر اس کمی کی تلافی کی مگر یہ مہتم بالشان شرح موطاء امام محمدؒ کے حواشی اور بین السطور میں فارسی رسم الخط میں بہت خفی اور لیتھو پر چھپی تھی اسلیے عرب فضلاء اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے اور وہ عموماً اس سے ناواقف بھی تھے۔

اس ضرورت کو محسوس کر کے ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی نے موطا امام محمدؒ اور اسکی شرح التعلیق الممجد کا یہ عمدہ نسخہ تین جلدوں میں شایع کیا ہے، ان کو فن حدیث سے جو شغف و اشتغال ہے اس کی بنا پر انھوں نے یہ کام بڑی خوبی اور سلیقہ سے انجام دیا ہے اور اس پر مفید تعلیقات کا اضافہ بھی کیا ہے، انھوں نے شرح کے متفرق حواشی

جمع کرکے ان کو مناسب جگہ پر رکھا، ان کے اغلاط کی نشاندہی کی، اگر کسی لفظ کے بارے میں شبہ ہوا تو شارح کے مراجع سے اس کی تصحیح کی اور اکثر جگہوں پر ایسی تعلیقات تحریر کیں جن سے شرح کا فائدہ بڑھ گیا، انھوں نے اس میں وارد آیات واحادیث کی تخریج کے علاوہ اس کے مجمل ماخذ و مراجع کی مفصل نشاندہی کی اور سات مختلف النوع فہرستیں بھی مرتب کیں۔

یوں تو ہر جلد کے آخر میں موضوعات کے اعتبار سے فہرست دی گئی ہے، لیکن تیسری جلد کے آخر میں مزید چھ فہرستیں ہیں، پہلے قولی وفعلی احادیث اور صحابہ وتابعین کے آثار کی تین فہرستیں حروف معجم کی ترتیب پر ہیں، احادیث وآثار کے رواۃ کے نام بھی جلدوں اور صفحات کی صراحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں، پھر جن اشخاص کا ترجمہ شرح میں مذکور ہے، ان کے ناموں کی فہرست جلد وصفحات کی تعیین کے ساتھ دی ہے اس کے بعد فقہی وحدیثی مسائل کے لحاظ سے ہر جلد کی الگ الگ دو فہرستیں ہیں، آخری فہرست خود محقق کے مراجع کی ہے۔

شروع میں شام کے مشہور فاضل اور مولانا عبدالحیؒ کے خاص عظمت شناس استاد عبدالفتاح ابوغدہ کے مبسوط مقدمہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تعارفی تحریر سے بھی یہ کتاب مزین ہے، استاد ابوغدہ نے موطا بروایت امام محمد کی اہمیت اور خوبی پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے اور امام محمدؒ پر بیجا اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے، ابتدا میں التعلیق الممجد کے قدیم مطبوعہ نسخہ کے ایک صفحہ کا عکس بھی دیا گیا ہے جس سے اُسکے اور موجودہ ایڈیشن کے نمایاں فرق کا پتہ چلتا ہے۔

لائق محقق نے اس کتاب کو شایع کرکے نئی زندگی دی ہے، وہ اس علمی ودینی خدمت پر اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

نقد ملفوظات از پروفیسر نثار احمد فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۶۲ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۶۵ روپے پتے (۱) مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی (۲) انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی (۳) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

تصوف لایق مصنف کا بہت محبوب موضوع ہے، انھوں نے اس کے لٹریچر کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا ہے، خصوصاً ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اکابر چشتی صوفیائے کرام کی کتابیں اور ملفوظات ان کی توجہ کا مرکز رہے ہیں، ہندوستان میں تصوف کے جو سلاسل رائج ہوئے ان میں سلسلۂ چشتیہ کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی، زیر نظر کتاب کے پہلے حصہ میں اس سلسلہ کی چار اہم اور مرکزی شخصیتوں حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (رحمہم اللہ) کے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں، پہلا مضمون حضرت خواجہ اجمیریؒ کے بارے میں ہے جس میں ان کے سلسلہ کی مقبولیت کے اسباب اور اس کی اہم خصوصیات بتائی ہیں، نیز ان کے حالات کے بعض قدیم اور اہم مآخذ کا ذکر کرکے ان کے بعض مندرجات کا جائزہ لیا ہے، دوسرے میں حضرت خواجہؒ کے سب سے ممتاز خلیفہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے بعض حالات و واقعات تلاش و تفحص سے لکھے ہیں، ایک مضمون میں چشتی سلسلہ کے مندرجۂ ذیل ملفوظات مجالس حسنہ، کشکول کلیمی، مکتوبات کلیمی، خلاصۃ الفوائد، انوار الصفی

کی مدد سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حالات و تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، دو مضامین میں حضرت خواجہ اولیاؒ اور حضرت بابا فریدؒ کے حالات کے دو اہم مآخذ احسن الاقوال اور درر نظامی کا تعارف کرایا ہے اور ان سے دونوں بزرگوں کی تعلیم سلوک، آداب درویشی اور سوانحی معلومات قلمبند کیے ہیں، سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے دو بزرگوں حضرت امیر خسرو اور حضرت شاہ عبدالہادی امروہوی پر بھی سیر حاصل مضامین دیے گئے ہیں، مصنف نے اس حصہ کے مضامین میں ملفوظات کے کئی مجموعوں پر بڑی فاضلانہ بحث و تبصرہ کرکے ان کا عطر کشید کیا ہے، ملفوظات کے اس جائزہ میں مصنف نے جوش کو ہوش پر اور عقیدت کو حقیقت پسندی پر غالب نہیں آنے دیا ہے، اسی لیے حضرت خواجہ قطب الدینؒ کی جانب فوائد السالکین کے انتساب کو جعلی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ نہ یہ قطب صاحب کے ملفوظات ہیں اور نہ ان کے جامع حضرت بابا فرید ہو سکتے ہیں، کئی جگہ انھوں نے مبالغہ آمیز حکایات و واقعات کو قبول کرنے میں تامل و تردد ظاہر کیا ہے، آخری حصہ میں تصوف پر پانچ نظری مضامین درج ہیں جو بڑے قیمتی اور مصنف کے مطالعۂ تصوف کا نچوڑ ہیں، ان میں تصوف پر عامیانہ اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور تصوف کی حقیقت و اہمیت اور دور حاضر میں اس کی ضرورت و معنویت اور دین سے اس کی ہم آہنگی بھی دکھائی ہے، ان کو موجودہ ارباب تصوف سے یہ بجا شکایت ہے کہ انھوں نے خانقاہوں کو درگاہوں میں تبدیل کرکے اپنی نگاہیں صرف آمدنی پر مرکوز کرلی ہیں، حالات صوفیہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں زیادہ اہمیت فوق العادت واقعات اور کشف و کرامات کو دی جاتی ہے اور ان بزرگوں کے سوانح حیات، ملفوظات، اصلاحی و تبلیغی خدمات کی طرف مطلق التفات نہیں کیا جاتا، اس لیے فاضل مصنف کی کوشش یہ ہے کہ اسلامی

تصوف کو تمام تعصبات سے بلند ہو کر پڑھا جائے اور اولیاء اللہ کی سیرت و سوانح و ملفوظات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تاکہ ان کی شخصیت اور زیادہ اجلی ہو کر نگاہوں کے سامنے آسکے، یہ کتنی مبارک کوشش ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بارآور کرے۔

شہر ستم از پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہت عمدہ، صفحات ۱۰۴، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۶۰ روپیے، پتے (۱) دانش محل امین آباد لکھنؤ، (۲) شہر ادب۔ سی۔ ۱۳۳۹۔ اندرا نگر لکھنؤ۔ ۱۶۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اردو زبان و ادب کے دیرینہ خادم اور مشہور ادیب و شاعر ہیں، یہ مجموعہ ان کی شاعری (نظم و غزل) کا انتخاب ہے، وہ بڑا دردمند اور حساس دل رکھتے ہیں:

عجیب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں ۔۔۔ کہیں ہو جلتا مکان اپنا گھر لگے ہے مجھے

مجموعہ کا موثر و بلیغ نام اپنے اندر جہان معانی لیے ہوئے ہے، اس سے ملک زادہ صاحب کے اچھے ذوق کے علاوہ ان کی بے قرار اور بے چین طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے شہر ستم کے دلدوز مناظر نے ان کی فکر کو زخمی اور دل کو لہولہان کر دیا ہے اس لیے انکی شاعری میں مقتل کے استعارے، کوچۂ قاتل کی تصویریں اور قاتلوں کے گھروں میں بھی عزاداری کا طرفہ تماشا دکھائی دیتا ہے، مگر شہر ستم کے خونچکاں واقعات اور اندھیری رات کی ہولناکیوں میں بھی انہیں امید کی کرن نظر آتی ہے اور وہ راہِ شوق کے ساتھیوں کو تیز گام ہونے اور اس کی دعوت دیتے ہیں۔

جلائیں دل کہ سمٹ جائے تیرگی شب کی ۔۔۔ نہ جانے کب ہو سحر، کون انتظار کرے

وہ شہر ستم کے جفا پیشہ دروں کو نشہ قوت کے خطرناک ہونے سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ تشنہ لبی

جب ذوق عمل دیتی ہے تو رندمیکدے کا ساقی بدل دیتے ہیں، شہر بے اماں نے انا میں گرفتاروں کے سر کچل دیے ہیں اور باد خزاں کی شہ پر کھلنے والے گلوں کو دست صبا نے مسل دیا ہے، معنویت سے پُر ہونے کے علاوہ یہ مجموعہ ظاہری نفاست میں بھی بے مثال ہے۔

دیدہ وشنیدہ (خود نوشت) مرتبہ جناب سید شہاب الدین دسنوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۳۶، قیمت ۳۵ روپیے، بیرون ملک سے ۴ ڈالر پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی اور اسکی شاخیں (۲) انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایو نیو نئی دہلی۔

یہ مصنف کے خود نوشت حالات ہیں جس کی ابتدا انھوں نے اپنے وطن دلیسنہ اور اسکی لائبریری کے پُر اثر تذکرہ سے کی ہے، پھر ان شہروں کا ذکر ہے جہاں انھوں نے تحصیل علم کی، اس ضمن میں بعض خاص اساتذہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اس کے بعد بمبئی کی انجمن اسلام اور صابو صدیق پالی ٹکنک کی جو ذمہ داریاں ان کو تفویض کی گئیں، ان کے سلسلے کے مشاغل کا بیان ہے، اس دوران میں وہ اسٹریلیا، پیرس، لندن، سوئٹزرلینڈ، امریکہ، ترکی، پاکستان گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، ان سب جگہوں کے بارے میں اہم اور مفید باتیں بتائی ہیں، وہ جن ممتاز اشخاص سے ملے اور جن تقریبات میں شریک ہوئے اور جو تقریریں کیں ان سب کی روداد تحریر کی ہے، ہمدرد نگر اور دار المصنفین سے تعلق اور پٹنہ میں بود و باش اختیار کرنے کا ذکر بھی کیا ہے، اس طرح یہ کتاب معلوماتی اور اس صدی کے بعض واقعات کی دستاویز ہے اور یہ آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی ہے، مصنف کی زندگی علمی و تعلیمی خدمت میں گزری ہے اور وہ متعدد علمی، تعلیمی، سماجی اور اصلاحی اداروں سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں، جن کے بارے میں ان کے معلومات، تجربات

اور مشاہدات وسیع اور گہرے ہیں، اس کتاب میں ان کا نچوڑ آگیا ہے، اس سے قومی اصلاحی علمی اور تعلیمی کام کرنے والوں کو مدد ملے گی، مصنف کی تحریر سادہ مگر حشو وزوائد اور تکلف وبناوٹ سے خالی ہے، اس کی بے ساختگی اور دردمندانہ لہجہ پرکشش اور موثر ہے، لیکن واقعات کو غیر مرتب لکھنے کی توجیہ سمجھ میں نہیں آئی، دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کا ذکر بھی رہ گیا ہے جس کی کامیابی کے لیے انھوں نے بمبئی میں منشی عبدالعزیز مرحوم کے تعاون سے پوری جدوجہد کی تھی، شروع میں میر کے مصرعے الٹ پلٹ گئے ہیں اور ص ۲۷ پر "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے سر میں ہے" غلط لکھا ہے، بسمل عظیم آبادی کی جانب اس کا انتساب بھی پوری طرح محقق نہیں ہے، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔ "ض"

اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ

از جناب ڈاکٹر جمال الدین عطیہ

متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت، بہترین، صفحات ۳۵۲، قیمت ۹۵ روپے، پتہ: اسلامک فقہ اکیڈمی، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۲۵۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ نے قطر یونیورسٹی کی کلیۃ الشریعہ میں چند خطبے دیے تھے، زیر نظر کتاب ان ہی کا مجموعہ ہے جو بارہ ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے، ان میں اسلامی شریعت کی خصوصیات، شریعت کے مقاصد و کلی قواعد، اس کے احکام کا محل، اقسام و مآخذ اور حکم شرعی کے شخصی زمانی و مکانی دائروں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے صاحب اجتہاد قاضی تک اور شریعت کی حکمرانی سے عالمی شریعت اور بین الاقوامی تعلقات تک متعدد اہم پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، فاضل مصنف کا دائرۂ فکر وسیع ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "عصر حاضر کی اصطلاح کے اعتبار سے قانون اور اخلاق کے دائروں کی حدبندی شریعت میں پائیدار اور ناقابل تغیر

چیز نہیں ہے بلکہ مصلحت عامہ کے تقاضوں کے مطابق یہ حد بندی لچک وار اور تغیر پذیر ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ "جب اخلاقی معیار بلند اور دینی محرک قوی ہوگا تو دنیوی جزا کا دائرہ انتہائی محدود ہوگا" اس سلسلہ میں انھوں نے شام اور تونس کی اس قانون سازی کا ذکر کیا ہے جس کی رو سے تین طلاقوں کے مسئلہ میں اور شوہر کے بغیر شرعی سبب کے بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں معاوضہ لازم کرنے کے اصول کو اپنایا گیا ہے لیکن ظاہر ہے یہ کوئی حجت تو نہیں ہے، اسلام کے صدر اول کے بعد فقہی مسالک کے ظہور کے زمانہ میں قاضیوں نے اپنے اپنے مسلک کی روشنی میں فیصلے دینے شروع کیے اس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ "زیادہ بہتر تھا کہ قاضی اپنے فیصلہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کرنے میں آزاد ہوتے" کتاب کے مترجم کا نام کہیں درج نہیں ہے، دقیق مباحث کے ترجمہ میں سلاست اور شگفتگی باقی رکھنا آسان نہیں چنانچہ جگہ جگہ ترجمہ پن کا احساس ہوتا ہے، بعض جگہ عبارتیں گنجلک ہوگئی ہیں جیسے یہ عبارت "مسئولیت کے بارہ میں اگرچہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ مسئولیت شخصی ہوتی ہے لیکن ایک ہی سوسائٹی کے افراد کے درمیان اجتماعی تعاون کے محرکات نے اجتماعی مسئولیت کی بعض صورتوں کو لازم کیا ہے اجتماعی مسئولیت کی یہ صورتیں مسئولیت کے بارہ میں اصل قاعدہ (یعنی مسئولیت کا شخصی اور انفرادی ہونا) سے استثناء کا درجہ رکھتی ہیں" لفظی ترجمہ کی ایک اور مثال" ......
اس کے برخلاف اصولی قیاس ایک جزئی حالت سے دوسری جزئی کی طرف منتقل ہوتا ہے، دقیق علمی تحقیق کے ذریعہ ان دونوں جزئیوں میں کوئی مشترک وصف پائے جانے کی وجہ سے" کہیں کہیں جملے اور عبارتیں عام اردو قارئین کے لیے عسیر الفہم ہیں جیسے ایک عام غیر متخصص تنقید کرنے والے، استقرادی تجربی منہج، اطراد کا قانون،

غالب اکثری، مقاصد حاجیہ، مقاصد تحسینیہ، سفیہ پر حجر کیا، امر حاجی اور یہ عبارت "تخلف کرنے والی جزئیات سے مل کر کوئی ایسی کلی نہیں بن رہی ہے جو اس ثابت شدہ کلی کے معارض ہو" ایک جگہ سورۂ بقرہ کی آیت میں واللہ غفور حلیم کے بجائے رحیم لکھدیا گیا ہے۔

عرفان آگہی از جناب ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت وطباعت بہتر، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۸۱، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

زیر نظر کتاب ڈاکٹر خورشید نعمانی کے گیارہ متنوع مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، تنوع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے سیاسی خیالات اور پنڈت نہرو کے تاریخی شعور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، نقوش سلیمانی کے علاوہ حجاز کے ادبی مرتبہ کی تعیین بھی ہے، سلوک اور اصطلاحاتِ سلوک پر بحث ہے تو کالی داس کی جامعیت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، اس تنوع کے باوجود لائق مولف نے اعتدال و توازن کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی محققانہ حیثیت اور کالیداس پر انکے مضامین جامع اور پُراز معلومات ہیں، البتہ ایک جگہ مغربی استعماریوں کے ساتھ مرہٹوں کی بغاوتوں کو بیرونی فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے، شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار کے سلسلہ میں بعض باتیں مزید وضاحت طلب تھیں، جیسے "جنگ پانی پت نے ہند کی تاریخ کا رخ بدل دیا" یا "شاہ صاحب کی پیشین گوئیوں اور بشارتوں سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ مترشح ہوتی ہے"۔ مولف نے کتاب کا انتساب اپنی اہلیہ کے نام کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "انکی شخصیت میں اقبال کے مرد مومن کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں"۔

اختر انصاری، دیدپس دید از جناب شمس بدایونی، متوسط تقطیع بہتر کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۴۰، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ، اردو بازار،

جامع مسجد، دہلی۔

اختر انصاری مرحوم نے اردو ادب، تنقید، افسانہ، شاعری اور فن تعلیم میں دیرپا اور قابل لحاظ نقوش چھوڑے ہیں، خاص طور پر انکے قطعات نے اردو شاعری کے سرمایہ میں بڑا اضافہ کیا، انکی بود و باش میں ایک خاص شائستگی اور آن تھی لیکن اس نجی زندگی کے اندرون میں تلخیاں بھی تھیں، ان کی زندگی کے آخری دور کو کتاب کے مولف نے قریب سے دیکھا اور ذاتی ڈائری کی صورت میں بعض اہم باتوں کو قلم بند بھی کیا، یادوں کے ان چراغوں کو انھوں نے کتابی شکل میں روشن کیا ہے، کتاب کا زیادہ حصہ اختر صاحب کے خطوط پر مشتمل ہے گو ان نجی مکاتیب سے ان کی ادبی اور ذاتی زندگی کے بعض اہم گوشے سامنے آتے ہیں مگر بعض خطوں میں ایسی باتیں بھی ہیں جن کا حذف کیا جانا ہی بہتر تھا، شروع میں ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کی تعارفی تحریریں بھی ہیں۔

تذکرۂ واجدی از جناب مولانا محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور نفیس کتابت و طباعت، صفحات ۷۴، قیمت ۳۰ روپیے، پتہ، مکتبہ اعظمی، ایم، این اسٹریٹ عمر آباد ۶۳۵۸۰۸۔

دارالسلام عمر آباد کے شیخ الحدیث مولانا عبدالواجد عمری مرحوم خطہ آرکاٹ مدراس کی مردم خیز سرزمین کے قابل فخر فرزند اور صاحب علم و فضل شخص تھے، شہرت سے نفور کے باعث بظاہر وہ گمنام رہے لیکن انکے فضل و کمال کا اعتراف ملک کے مشاہیر کو بھی تھا، زیر نظر کتاب کے مولف انکے لائق شاگرد ہیں، انھوں نے اپنے استاد گرامی پر خود بھی ایک پُر تاثر مضمون لکھا ہے اور متعدد اہل قلم کی تحریروں کو بھی جمع کیا ہے، اس طرح اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری اور مولانا محمد یوسف کوکن وغیرہ کے تاثرات بھی شامل ہیں، مولانا عبدالواجد عمری مرحوم کی چند تحریروں اور تقریروں سے بھی کتاب کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔

ع۔ ص۔

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ ۔ کر

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ؛
نام سے بنوائیں :

RUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو ا
اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے
رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور د
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائیگی۔
کمیشن ۲۵% ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۳ء عدد ۵

مضامین

شذرات ضیاء الدین اصلاحی ۳۲۲ - ۳۲۴

مقالات

علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم ایک مطالعہ ضیاء الدین اصلاحی ۳۲۵ - ۳۵۵

بریلی کے اہم اخبارات ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ۳۵۶ - ۳۷۵
پھول والان، بریلی

طبی عمرانیات کا اسلامی نقطہ نظر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی پروفیسر ۳۷۶ - ۳۸۴
و صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

اوراق متفرقہ در حدوث علم کلام جناب انور شاہ صاحب، ۳۸۵ - ۳۹۵
پروفیشنل اسسٹنٹ لائبریری
آف اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ ع۔ ص۔ ۳۹۶ - ۴۰۰

علامہ شبلی کی دو کتابوں کے نئے اڈیشن

الفاروق: بعض خود غرض اور طمع پسند ناشرین دار المصنفین کی اجازت کے بغیر ہی اس بیش قیمت کتاب کا معمولی اور سستا اڈیشن شایع کر کے فروخت کر رہے تھے۔ اب دار المصنفین نے نیا اور خوبصورت اڈیشن شایع کیا ہے۔ اندرونی صفحات میں مکمل اشتہار ملاحظہ ہو۔ قیمت ۹۵ روپیے

علم الکلام: یہ کتاب بھی عرصہ سے ختم ہوگئی تھی اس کا نیا اڈیشن بھی جلد طبع ہو جائے گا۔ اس کے دوسرے حصہ الکلام کی قیمت ۵۰ روپے ہے۔

شذرات

آنے والا وقت انسان کے درد والم کو زائل کر دیتا ہے اور ع رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج۔ لیل ونہار کی کروٹیں افراد ہی کی طرح اقوام کا بارِ غم بھی ہلکا اور انکے مصائب وآلام کو آسائشوں اور آسانیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں، لیکن تقسیم کے بعد مسلمانوں پر جو بحرانی اور آزمائشی دور آیا وہ ختم نہیں ہو رہا ہے بلکہ ہر نیا دن ایک نئی اور تازہ مصیبت لیکر طلوع ہوتا ہے، چالیس اور پچاس برس کے عرصہ میں گوناگوں تبدیلیاں ہوئیں اور متعدد انقلاب رونما ہوئے مگر مسلمانوں کی شب تاریک سحر نہ ہو سکی اور وہ حسرت سے یہی کہتے رہے ؎

سہیل اب پوچھنا ہے انقلابِ آسمانی سے
ہماری شامِ غم کی بھی کبھی ہوگی سحر پیدا

مصائب ومشکلات کا یہ سلسلۂ دراز اغیار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے زیادہ خود مسلمانوں کی غلط روی اور بد تدبیری کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر وہ کسی طرح اس بھنور سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں جس میں جا پھنسے ہیں کیونکہ جب کسی قوم کو خود اپنے حالات ومعاملات کی اصلاح اور اعمال وکردار کو درست کرنے کی فکر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر لطف وعنایت کی نظر نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین وایمان سے مسلمانوں کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور وہ خود ہی اپنی خصوصیات وامتیازات سے دستبردار ہوتے جارہے ہیں، اپنے عقیدہ ومذہب سے انکی اس بیگانہ وشی اور بے حسی نے دوسروں کو مزید گل کھلانے کا موقع دیدیا ہے اور انکے حوصلے اس قدر بڑھا دیے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی شناخت ہی مٹا دینا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو دین وایمان سے وابستہ رکھنے اور انکی خصوصیات وامتیازات کو باقی رکھنے کی جو کوششیں کی جاتی رہی ہیں ان کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ دینی وملی خدمت کرنے والی تحریکیں اور تنظیمیں یا تو عام مسلمانوں کی غفلت اور بے حسی کا شکار ہو گئیں یا انکے "خاص مہربانوں" کی کرم فرمائی سے قائدوں اور کارکنوں میں بد دلی، اختلاف ونفاق پیدا

ہوگیا جس کے بعد نہ ان میں دین و ملت کی خدمت کا ولولۂ صادق باقی رہا اور نہ مسلمانوں کی سربلندی کا جذبہ، بلکہ وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر ایسے متحارب گروہ بن گئے، جنھیں ایک دوسرے کی ہوا خیزی اور نیچا دکھانے کے سوا کسی اور چیز سے واسطہ ہی نہیں رہ گیا، جو تحریکیں سخت جان ثابت ہوئیں وہ بھی مسلمانوں کی بے پروائی اور عدم تعاون کی بنا پر اس قدر غیر موثر رہیں کہ انکا وجود و عدم برابر تھا۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کو انکے دینی و ثقافتی ورثے سے الگ کردینے کے لیے تعلیم کی راہ سے انکے بچوں کے خام ذہنوں میں دیومالائی تصورات راسخ کرنے اور ان پر مخصوص عقیدہ و مذہب کی چھاپ ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا جو دراصل معنوی ارتداد اور ذہنی و تہذیبی نسل کشی کے مترادف تھا اسکے تدارک اور مسلمانوں کی نسل کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے مشہور قوم پرور مسلمان رہنما قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے ۱۹۵۹ء میں اتر پردیش دینی تعلیمی کونسل قائم کی اور صوبہ کے گوشہ گوشہ میں دینی مکاتب کا جال بچھا کر وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی۔ گو اس تحریک کی شاخیں دوسرے صوبوں میں بھی قائم ہوگئی ہیں۔ لیکن اس کو اتار چڑھاؤ کے مراحل درپیش ہیں حالانکہ حالات پہلے سے زیادہ بدتر ہیں، تاریخ کو مسخ کرنے، ریاضی کو ویدک رنگ میں رنگنے اور اداروں کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہ کیے جانے کی کارروائی شروع ہوگئی ہے اس لیے اس تحریک کو فعال اور موثر بنانا ناگزیر دینی و ملی فریضہ ہے، چاہے اس کے لیے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے، وقت کے اس چیلنج کو نظر انداز کرکے غفلت، بے حسی، خود فراموشی اور عافیت کوشی میں پڑے رہنا قومی جرم ہے۔

اسی مقصد سے دینی تعلیمی کونسل کا کل ہند کنونشن دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۰ و ۱۱ نومبر کو ہوا جس میں اتر پردیش کے علاوہ دوسری ریاستوں کے نمایندے بھی شریک ہوئے، جناب سید حامد نے افتتاحی خطبے میں ملک کے خطرناک حالات و رجحانات سے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور انہیں متحد و منظم ہوکر تعلیمی پسماندگی دور کرنے اور دینی تعلیمی تحریک کو موثر بنانے پر زور دیا اور دینی مدارس کی قدر و قیمت بتاتے ہوئے ان کے نظم و نسق کو درست کرنے اور انکے نصاب میں عصری مضامین داخل

کرنے کی تلقین کی تاکہ علما موجودہ حالات سے باخبر ہوں، کونسل کے صدر محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں دینی تعلیمی تحریک کا پس منظر اور اسکی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس زمانے میں اور زیادہ اس کی ضرورت و اہمیت واضح کی کیونکہ ذہنی ارتداد اور تہذیبی نسل کشی کا سد باب اسی سے ہوسکتا ہے، پروفیسر اکبر رحمانی کا مفید مقالہ بھی پسند کیا گیا جس میں مہاراشٹر کے تعلیمی اداروں کے حالات کا مقابلہ اتر پردیش کے حالات سے کیا گیا تھا۔ اجلاس میں مفید تجویزیں بھی منظور کی گئیں اور تنظیم کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور سرکاری نصاب میں شامل مسموم مواد کے اخراج کی مناسب صورتوں پر بھی غور کیا گیا۔

شریعت و شعائر اسلامی کے بقا و تحفظ کے لیے ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کا قیام عمل میں آیا تھا، اس نے دین و ملت کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں، موجودہ سنگین صورتحال اور ملت اسلامیہ کو درپیش گوناگوں خطرات متقاضی ہیں کہ مسلمان بورڈ کے اہم اور مبارک مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کا مکمل تعاون کریں، گزشتہ ماہ ۹ و ۱۰ اکتوبر کو جامعۃ الہدایہ جے پور میں اس کا گیارہواں اجلاس منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی اکثر ریاستوں کے ممتاز علما و دانشور، سیاسی رہنما اور قانون کے ماہرین شریک ہوئے، اس میں مسلمانوں کے معاشرتی و عائلی قوانین اور دوسرے ضروری امور و مسائل کے بارے میں اہم اور مناسب فیصلے کیے گئے جن پر فرقہ پرست عناصر اور قومی پریس بلا وجہ چیخ و پکار مچائے ہوئے ہے۔

---

۳۱ اکتوبر کو آل انڈیا میرا کادمی لکھنؤ کا سالانہ جشن اور تقسیم اعزازات کا یادگار جلسہ ہوا جس میں ملک کے ہر حصہ کے ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ایوارڈ حاصل کیے، خواتین اہل قلم کو بھی اعزاز دیے گئے جن کا جلسہ علیحدہ زنانخانے میں ہوا، اول الذکر کی نظامت جناب نیاز قومی نے اور موخر الذکر کی قمر جہاں صاحبہ بنارس ہندو یونیورسٹی نے کی۔

مقالات

علامہ شبلیؒ کی شعرفہمی اور شعرالعجم کا ایک مطالعہ

از ضیاءالدین اصلاحی

(۲)

اب آیئے ان کی شعرفہمی کے کمال کا دوسری حیثیت سے جائزہ لیا جائے۔

ترکیبوں کے معنی اور وسیع خیال کا اختصار

علامہ نے اشعار کا ترجمہ اور تشریح کرنے کے ضمن میں اکثر ترکیبوں کے معنی بتائے ہیں اس سے شعر کی گرہیں بھی کھل جاتی ہیں اور دوسرے متعدد نکتے بھی ہاتھ لگتے ہیں، وہ فارسی زبان کی سیکڑوں ایسی ترکیبیں بتاتے ہیں جن کی بدولت انہیں بہت بڑے وسیع، نازک اور رنگین خیالات نہایت لطافت کے ساتھ ادا ہوئے ہیں، بعض جگہ اس طرح کی ترکیبوں کو لاکر شاعر نے ایک بہت وسیع خیال کو بہت اختصار کے ساتھ ادا کر دیا ہے مثلاً ارباب ہوس اکثر کسی معشوق سے دل لگاتے ہیں تاہم بہت ربط نہیں بڑھاتے کہ دنیا کے کاروبار سے جاتے رہیں، لیکن معشوق دلفریبی کے غرور میں مطمئن ہے کہ بچ کر کہاں جا سکتا ہے اس واردات کو ایک شاعر ادا کرتا ہے

به دورگردی من از غرور می خندد حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم

"دورگردی" کے معنی الگ الگ کتراتے پھرنے کے ہیں"سخت کمان" وہ شخص جس کا نشانہ دور تک جاتا ہے" درکمین بودن" کے معنی گھات میں بیٹھنے کے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں جو کترایا پھرتا ہوں تو معشوق ہنستا ہے کہ مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے، اس شعر میں

دور گردی اور سخت کمان نے ایک وسیع خیال کو اس اختصار کے ساتھ ادا کر دیا[1]

ہلاک طرز آں بیگانہ خوی آشنا رو یم — کہ با ایں بے وفائیہا وفادار است پنداری

"آشنا رو" وہ شخص جس کے دل میں محبت کا کچھ اثر نہ ہو لیکن چہرہ سے محبت ظاہر ہوتی ہو اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اس معشوق پر مرتا ہوں جس کی آشنا روئی کا اثر یہ ہے کہ واقع میں بیوفا ہے، لیکن دھوکا ہوتا ہے کہ باوفا ہے اس خیال کو "بیگانہ خو" اور "آشنا رو" ان دو الفاظ نے کس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے[2]

فغان از قاصدان بے تصرف — ز خود یک بار پیغامے نہ سازند

"بے تصرف" وہ قاصد جو اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے بڑھاتے نہیں، بلکہ جو کچھ سنا اس کو بے کم وکاست آکر ادا کر دیا، مطلب یہ ہے کہ میں بے تصرف قاصد سے نالاں ہوں، معشوق نے کوئی تسلی بخش بات نہیں کہی تھی تو قاصد کو چاہیے تھا کہ اپنے دل سے گھڑ کر کوئی بات بناتا کہ کسی طرح سے میرا دل خوش تو ہو جاتا[3]

چہ خوش ست با دو یک دل سر حرف باز کردن — گلہ گزشتہ گفتن سخن دراز کردن

اثر عتاب بیرون ز دل ہم اندک اندک — بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

علامہ فرماتے ہیں اعتراض کے جواب میں جھٹ پٹ بات گھڑ لینے کو "بدیہہ آفریدن" کہتے ہیں شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی کیا لطف کا موقع ہوتا ہے جب دو دوست اکٹھے ہوتے ہیں ایک پرانے گلے کر رہا ہے اور بات کو طول دیتا جاتا ہے، دوسرا اس ناراضی کو اس طرح آہستہ آہستہ دل سے مٹاتا ہے کہ ہر شکایت کے جواب میں جھٹ پٹ کوئی معقول عذر گھڑتا جاتا ہے[4]

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۹۱ و ۲۹۲ ج ۳ ص ۲۳ [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۹۲ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

قمریان پاس غلط کردۂ خود می دارند — ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

"پاس غلط کردہ داشتن" کے معنی ہیں کہ کوئی شخص ناواقفیت سے کوئی غلط بات کہہ جائے اور واقف ہونے کے بعد بھی اپنی بات کی پچ کرتا رہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمریوں نے غلطی سے کہہ دیا تھا کہ سرو معشوق کے قد کا ہمسر ہے، اب ان کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی لیکن بات کی پچ کرتی ہیں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی سرو معشوق کے اندام کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس شعر میں "پاس کردہ خود داشتن" نے ایک وسیع مضمون کو مختصر لفظوں میں ادا کردیا[1]

با آفتاب از آں ذرہ را درانداز ند — کہ عذر مردم کاہل بہ ناکسی نہ نہند

درانداختن لڑا دینا عذر نہادن معذور رکھنا، شعر کا مطلب یہ ہے کہ فطرت ذروں کو اس لیے آفتاب سے لڑاتی ہے کہ کوئی کاہل آدمی یہ عذر نہ پیش کرے کہ "میں ہیچ آدمی ہوں کیا کرسکتا ہوں کیونکہ ذرہ سے بڑھ کر کون ہیچ ہوگا لیکن وہ آفتاب سے کشتی لڑتا ہے، ذرے جو آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھتے ہیں، اس کو آفتاب سے لڑنا قرار دیا ہے، گویا وہ آفتاب کو اپنی چمک دمک دکھاتے ہیں اور درخشندگی میں آفتاب کا مقابلہ کرتے ہیں[2]

واقعہ کے بعض اجزا کو چھوڑ کر وسیع مضمون کو مختصر کردینا — علامہ کا نکتہ شناس اور شعر فہم ذہن کہیں اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ کسی شے کے تمام اجزا کی محاکات ہر جگہ ضروری نہیں، شاعر اکثر کوئی واقعہ یا سماں باندھتا ہے اور تمام حالات کا استقصا نہیں کرتا، لیکن چند ایسی خصوصیات کو جو نمایاں ہوتی ہیں ادا کردیتا ہے کہ پورا واقعہ یا پورا سماں

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۹۳ [2] ایضاً ص ۲۰۲۔

آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے مثلاً

بنفشہ طرۂ مفتولِ خود گرہ میزد صبا حکایت زلف تو در میاں انداخت

علامہ فرماتے ہیں کہ شعر کا اصل مطلب صرف اس قدر ہے کہ بنفشہ معشوق کی زلف کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا ہے کہ گویا بنفشہ ایک معشوق ہے، وہ اپنی زلفیں آراستہ کر رہی تھی اور اپنی اداؤں پر نازاں تھی کہ اتفاقاً کسی طرف سے صبا (جس کو ایک تماشائی عورت فرض کیا ہے) آنکلی اس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا، دفعتہً بنفشہ شرما کر رہ گئی۔

علامہ کہتے ہیں بنفشہ کا شرما جانا شعر میں مذکور نہیں اور اس تمام منظر میں وہی واقعہ کی جان ہے لیکن حالت کا سماں اس طرح کھینچا ہے کہ شرما جانا خود بخود لازمی نتیجہ کے طور پر پیش نظر ہو جاتا ہے[1]

فغانی کا شعر ہے:۔

اے کہ می گوئی چرا جامے بہ جانے می خری این سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

علامہ فرماتے ہیں کہ ایک بہت وسیع مضمون کو پیچ دیکر مختصر لفظوں میں ادا کیا ہے، واقعہ یہ فرض کیا ہے کہ ایک بادہ نوش نے شراب خانہ میں جا کر جان کے عوض میں جام شراب خریدا، کسی نے اعتراض کیا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ معترض کا اعتراض یہ تھا کہ شراب اس قدر گراں کیوں خریدی لیکن بادہ نوش یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ اس قدر ارزاں کیوں خریدی (یہ اس لحاظ سے کہ بادہ نوش کے نزدیک تو شراب کی قیمت جان سے بہت بڑھ کر ہے) اس بنا پر بادہ نوش نے جواب دیا کہ اس کو میں کیا کروں یہ تو ساقی

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۲۰

سے پوچھنے کی بات ہے کہ اس نے شراب کو اس قدر کیوں ارزاں کر دیا (شعر العجم ج ۵ ص ۵۹ و جلد ۳ ص ۲۶)

نغانی کا ایک شعر اور ہے جس میں ایک بڑے وسیع خیال کو مختصر لفظوں میں ادا کیا ہے۔

ساقی مدام بادہ بہ اندازہ می دہد ایں بیخودی گناہ دلِ زود مست ماست

علامہ رقمطراز ہیں شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب پی کر بدمست ہو گئے، اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ ساقی کا قصور ہے اس نے کیوں اعتدال سے زیادہ شراب پلا دی لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں، ساقی نے اعتدال ہی سے شراب پلائی تھی، تصور ہے تو ہمارے دل کا ہے جو بہت جلد مست ہو جاتا ہے، اس وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ادا کیا ہے اور مضمون کے متعدد ٹکڑے چھوٹ گئے ہیں (شعر العجم ج ۵ ص ۶۰)

مخالف پہلو دکھانا | علامہ ایک نکتہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات مخالف پہلو دکھانے سے محاکات کی تکمیل ہوتی ہے، اکثر کسی حالت کے زیادہ نمایاں کرنے میں یہ طریقہ کام دیتا ہے، مثلاً فردوسی کا شعر ہے۔

برہنہ دواں دخت افراسیاب بر رستم آمد دو دیدہ پر آب

ترجمہ یہ کیا ہے کہ افراسیاب کی بیٹی ننگی رستم کے پاس دوڑتی اور روتی آئی اور تشریح یہ کی ہے کہ منیژہ افراسیاب کی بیٹی تھی جو بیژن پر عاشق ہو گئی تھی اور اس جرم پر افراسیاب نے اس کو گھر سے نکال دیا تھا، جب اس نے رستم کا آنا سُنا تو اس کے پاس روتی ہوئی گئی اس موقع پر فردوسی کو منیژہ کی بیکسی اور غربت کی تصویر دکھانی ہے اس لیے ایک طرف تو اس کو دخت افراسیاب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے

تاکہ اس کی عزت اور حرمت کا تصور سامنے آئے، دوسری طرف کہتا ہے کہ وہ ننگی دوڑتی ہوئی آئی جس سے اس کی ذلت ثابت ہوتی ہے، ان دونوں پہلو کے دکھانے سے منیژہ کا بیکس اور قابل رحم ہونا مجسم بن کر سامنے آجاتا ہے[۱]

منیژہ منم دخت افراسیاب برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

میں افراسیاب کی بیٹی منیژہ ہوں، میرا جسم آفتاب نے بھی برہنہ نہیں دیکھا۔

برائے یکے بیژن شور بخت فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

کم بخت بیژن کے لیے میرا تاج اور تخت سب جاتا رہا۔

علامہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں شعر بھی اسی لیے موثر ہیں کہ دو متقابل حالتیں پیش کی ہیں یعنی جس کو آفتاب نے برہنہ نہیں دیکھا وہ ایک بدبخت کی وجہ سے اس حالت میں گرفتار ہے[۲]

واقعہ کے ذکر میں اجمال | علامہ ایک اور نکتہ یہ بیان کرتے ہیں کہ محاکات کا کمال یہ ہے کہ تصویر کے تمام جزئیات کا استقصا کیا جائے یا بعض جزئیات کو نمایاں کرکے دکھایا جائے لیکن بعض جگہ محاکات کے موثر ہونے کے لیے یہ ضرور ہے کہ تصویر ایسی دھندلی کھینچی جائے کہ اکثر حصے اچھی طرح نظر نہ آئیں چنانچہ بعض اوقات جب کسی چیز کی عظمت کی تصویر کھینچی مقصود ہوتی ہے تو تصویر کے حصے نمایاں نہیں کیے جاتے اور واقعہ کے تمام اجزا کا ذکر نہیں کرتے، مثال حسب ذیل ہے:-

گر شہ نداند کہ در روز جنگ چہ سرہا بریدم دراقصائے زنگ

بہ یک تاختن تا کحب تا ختم چہ گردن کشاں را سرانداختم

---

[۱] شعرالعجم جلد دوم ص ۱۲۱ [۲] ایضاً ص ۲۲۔

(ترجمہ) کیا بادشاہ نہیں جانتا کہ لڑائی کے دن میں نے حبش میں کتنے سر کاٹے، ایک حملہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا، کتنے گردن کشوں کے سر اڑا دیے۔

یہ وہ موقع ہے جہاں سکندر نے دارا کو خط لکھا ہے اور اپنے کارنامے بیان کرتا ہے، اگر اس موقع پر یہ بتا دیتا کہ وہ کہاں سے کہاں تک گیا تھا تو وہ بات نہ پیدا ہوتی جو اس اجمال سے پیدا ہوتی ہے ع بہ یک تاختن تا کجا تاختم[1]

تدر مشترک کا ذکر | علامہ ایک اور شاعرانہ حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ شاعر قوت تخییل سے تمام اشیا کو نہایت دقیق نظر سے دیکھتا ہے وہ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت، ایک ایک وصف پر نظر ڈالتا ہے پھر اور اور چیزوں سے ان کا مقابلہ کرتا ہے، ان کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتا ہے۔ ان کے مشترک اوصاف کو ڈھونڈھکر ان سب کو ایک سلسلہ میں مربوط کرتا ہے، کبھی اس کے برخلاف جو چیزیں یکساں اور متحد خیال کی جاتی ہیں ان کو زیادہ نکتہ سنجی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں فرق اور امتیاز کرتا ہے مثلاً

من آں نیم کہ حرام از حلال نشناسم شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

شراب اور پانی مختلف الحکم چیزیں ہیں یعنی شراب حرام ہے اور پانی حلال، شاعر کہتا ہے کہ در اصل دونوں کا ایک ہی حکم ہے، معشوق کے ساتھ پی جائے تو شراب اور پانی دونوں حلال ہیں اور معشوق کے بغیر پی جائے تو دونوں حرام ہیں، اس مضمون کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے، پہلے مصرعہ میں کہتا ہے کہ میں ایسا شخص نہیں کہ حرام اور حلال کی مجھ کو تمیز نہ ہو یعنی میں فقہ کے مسائل سے باخبر ہوں اور فقیہ ہوں پھر معشوق

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۲۲ و ۲۳۔

سے خطاب کر کے کہتا ہے تیرے ساتھ شراب پی جائے تو حلال ہے اور پانی تیرے بغیر پیا جائے تو حرام ہے' دونوں حالتوں میں دعویٰ کے ایک ایک جز کو چھوڑ دیا ہے کہ کہنے کی حاجت نہیں[1]

بہ تکلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ — می تواں برد بہ ہر شیوۂ دل آساں از من

گفتگو اور سکوت بالکل متضاد چیزیں ہیں لیکن چونکہ معشوق کا سکوت اور گفتگو دونوں دلربا ہیں اس لیے دلربائی کے وصف کے لحاظ سے دونوں یکساں ہیں، اس مضمون کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اول تو متناقض چیزوں کو اثر کے لحاظ سے یکساں ثابت کیا، حالانکہ مختلف چیزوں کا اثر مختلف ہونا چاہیے، اس کے ساتھ "بہ ہر شیوہ" سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ تکلم اور خموشی کی تخصیص نہیں بلکہ معشوق کی ہر ادا ہے دل کے چھیننے کے لیے کافی ہے "آساں" کے لفظ سے یہ ثابت کرنا ہے کہ دل فطرتاً درد آشنا ہے کہ ہر ادا پر فوراً لوٹ جاتا ہے[2]

خیال کی لطافت و نزاکت | علامہ کی نگاہ شعر کی لطافت و نزاکت اور خیالات کی باریکی پر پڑتی ہے تو اس میں گوناگوں پہلو ڈھونڈھ لیتی ہے' ان کے حافظہ میں خدا جانے اشعار کا کتنا ذخیرہ تھا کہ جب ان کو پیش کرنے پر آتے ہیں تو ختم ہی نہیں ہوتے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس شعر کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔

لطافت خیال کو وہ فارسی شاعری کا خاص اور امتیازی وصف بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عربی بلکہ شاید اور کسی زبان کو یہ لطافت خیال نصیب نہیں ہو سکتی مثالوں سے اندازہ کیجیے۔

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۳، [2] ایضاً۔

چشم چوں پر عشوہ کرد اول بسوی خویش دید   بادۂ خود خورد ساقی ساغر لبریز را

فرماتے ہیں اس شعر میں جو مضمون ادا کیا ہے مشکل سے کسی اور زبان میں ادا ہو سکتا تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معشوق جب بن ٹھن کر تیار ہوتے ہیں تو مزے میں آکر خود اپنی سج دھج کو دیکھنے لگتے ہیں، شاعر اس حالت کی تصویر کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ جب معشوق کی آنکھوں میں کرشمہ بھر گیا تو اس نے پہلے خود اپنے آپ پر نظر ڈالی گویا ساقی نے جب پیالہ بھرا تو پہلے تھوڑی سی خود بھی پی لی[1]

جائے مشام دیدہ کشودم ببوئے گل   پنداشتم کہ گرد رہ یار می رسد

یعنی پھولوں کی خوشبو آئی تو میں نے بجائے اس کے کہ شامہ سے کام لیتا، آنکھیں کھول دیں، میں سمجھا کہ معشوق کے راستہ کی گرد ہے اس لطافت خیال کو دیکھو کوچۂ معشوق کی گرد لطافت کی وجہ سے بوئے گل ہے، اس لیے پھولوں کی جو خوشبو آئی تو دھوکا ہوا کہ کوئے یار کی گرد ہے، علامہ بجا فرماتے ہیں کہ یہ خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تاب اظہار نہیں لا سکتے گویا حباب ہیں کہ چھونے سے ٹوٹ جاتے ہیں میں اردو میں ترجمہ کرتا ہوں اور افسوس آتا ہے کہ تمام لطافت خاک میں مل جاتی ہے[2]

فرماتے ہیں صحبت احباب کے لطف کو ایک شاعر اس لطافت کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

عادت بجمع بودن احباب کردہ ایم   ما بو نمی کنیم گلے را کہ دستہ نیست

جب تک احباب کا جمگھٹا نہ ہو مجھ کو صحبت کا لطف نہیں آتا پھول جب تک گلدستے میں نہ ہو میں اس کو نہیں سونگھتا[3]

پری رخ بہ شکر خندہ قتل مردم کرد   چو گفتمش کہ مرا ہم بکش تبسم کرد

شعر کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ایک پری رو نے خندۂ شیریں سے ہزاروں آدمیوں کو

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۹۴ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

قتل کر دیا میں نے کہا کہ مجھ کو بھی' یہ سن کر مسکرا دیا' اس مضمون کو کس لطافت سے ادا کیا ہے
عاشق کے قتل کی درخواست پر مسکرا دینا متعدد پہلو پیدا کرتا ہے جن میں ایک یہ بھی ہے
اور یہ سب سے کم لطیف ہے کہ معشوق نے شکر خندہ سے ہزاروں آدمی کو قتل کیا تھا
اب جو عاشق نے قتل کی درخواست کی تو وہ مسکرا دیا کہ ایک آدمی کے لیے اسی قدر
کافی ہے[1]

تاک را سیراب دار اے ابر نیساں در بہار　　　قطرہ تا مے تواند شد چرا گو ہر شود

تاک انگور کی بیل کو کہتے ہیں' ابر نیساں کی نسبت خیال ہے کہ اس کے قطرے سیپ
میں گرتے ہیں تو موتی بن جاتے ہیں' شاعر ابر نیساں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو انگور
کی بیل کو سیراب رکھ کیونکہ جب تک قطرہ شراب بن سکتا ہے موتی بننے کی کیا ضرورت
ہے' یعنی شراب کا قطرہ موتی سے زیادہ قیمتی ہے اس لیے بجائے اس کے کہ ابر نیساں موتی
تیار کرے یہ بہتر ہے کہ انگور پر برسے کہ شراب تیار ہو[2]

فیضے عجبے یافتم از صبح بہ بینید　　　ایں جادہ روشن رہ میخانہ نہ باشد

جادۂ روشن وہ راستہ جو صاف ہو اور بے تکلف منزل تک پہنچا دے، علامہ
فرماتے ہیں کہ اصل خیال یہ تھا کہ صبح کے سہانے وقت میں شراب زیادہ لطف دیتی
ہے اس لیے صبح کے آثار دیکھ کر شراب کو زیادہ جی چاہتا ہے اس کو یوں ادا کیا ہے کہ
صبح سے عجب فیض حاصل ہو رہا ہے دیکھنا یہ جادہ روشن شراب خانہ کا راستہ تو نہیں ہے[3]

در بوستان بہ یاد دہان تو غنچہ را　　　امسال باغباں ہمہ نشگفتہ چیدہ بود

علامہ لکھتے ہیں غنچہ کو دہن سے تشبیہ دیتے ہیں شعر کا مطلب یہ ہے کہ باغباں کو

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۰۵ [2] ایضاً [3] ایضاً

جو معشوق کا دہن یاد آیا تو اس نے اب کی سال پھول کے بجائے بن کھلی ہی کلیاں چن لیں۔[1]

از لبس زبیم خوے تو دزدیدہ ام نفس	یک پردہ پست تر ز خموشی ست نالہ ام

علامہ کی نکتہ آرائی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں جب سردی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ مقیاس الحرارۃ کا پارہ مطلق نہیں چڑھتا تو اس درجہ کو صفر کہتے ہیں اس سے بھی سردی بڑھ جائے تو اس کے بھی مدارج ہیں اور اس کو یوں ادا کرتے ہیں کہ صفر سے ایک درجہ نیچے۔ اس سے بھی بڑھے تو صفر کے درجوں کے عدد بڑھاتے جاتے ہیں اسی طرح آواز کی پستی و بلندی کے درجے ہیں لیکن جب مطلق آواز نہ ہو تو سکوت ہوگا، شاعر تخییل سے سکوت کے بھی مدارج قائم کرتا ہے اور کہتا ہے اے معشوق میں نے تیرے ڈر سے اس قدر خاموشی اختیار کی ہے کہ میرا نالہ سکوت سے بھی بقدر ایک پردہ کے پست ہے' اس قدر باریک خیال دوسری زبان میں اس لطافت کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا۔[2]

روزم تو برفروز و شبم را تو نور دہ	ایں کار تست کار مہ و آفتاب نیست

فرماتے ہیں اس خیال کو کہ معشوق کے بغیر عاشق کی آنکھوں میں سب اندھیرا ہے یوں ادا کیا ہے ہ معشوق سے کہتا ہے میرے دل کو تو روشن کر اور میری رات کو نور دے یہ تیرا کام ہے، آفتاب و ماہتاب کے بس کی چیز نہیں، بظاہر مبالغہ ہے کہ آفتاب و ماہتاب بھی دن کو روشن نہیں کر سکتے لیکن واقع میں بالکل سچ ہے دل خوش نہ ہو تو دن بھی اندھیرا معلوم ہوتا ہے "تو" اور کار کی تکرار نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔[3]

یا تو گستاخی است گفتن ترک بدخوئے نما	با دلِ خود گفتہ ام آئینہ را بے زنگ ساز

علامہ فرماتے ہیں کہنا یہ تھا کہ معشوق تو بدخوئی سے باز نہیں آ سکتا اس لیے اپنے ہی

---

[1] شعر العجم ج ۲ ص ۱۹۶ [2] ایضاً ص ۱۹۸ و ۱۹۹ [3] ایضاً ص ۱۹۷۔

دل کو ایسا بنا لینا چاہیے کہ معشوق کی بدخوئی سے رنج نہ ہو، اس کو یوں ادا کرتا ہے کہ معشوق سے یہ کہنا تو گستاخی ہے کہ بدخوئی چھوڑ دے اس لیے میں نے اپنے دل سے کہدیا ہے کہ اب کی آئینہ ایسا بنا نا کہ اس میں رنگ آنے ہی نہ پائے، صیغہ غائب کے بجائے خطاب نے اور زیادہ لطف پیدا کر دیا ہے[1]

نرنجم زیں کہ با ہر عاشقے میل سخن داری کہ تو حسن زیادہ از کار و بار عشق من داری

علامہ کے قلم سے اس کی دلآویز ترجمانی ملاحظہ ہو عشق کا اگرچہ یہی اقتضا ہے کہ معشوق کسی اور کی طرف ملتفت نہ ہونے پائے لیکن بعض وقت دل میں انصاف آتا ہے کہ آخر ساری دنیا کو اس کے حسن کے تمتع سے کیوں روکا جائے، اس خیال کو شعرا نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے ایک شاعر کہتا ہے ع بہ بلبلے نتواں داد یک گلستاں را

یعنی سارا باغ ایک بلبل کو نہیں دیا جا سکتا، اس شعر میں اس خیال کو نہایت لطافت سے ادا کیا ہے معشوق سے کہتا ہے کہ اگر تو ہر عاشق سے ملنا چاہتا ہے تو میں اسکا رنج نہیں کرتا کیونکہ تیرے حسن کی وسعت میرے عشق کے پھیلاؤ سے بہت زیادہ ہے، یعنی تیرے وسیع حسن کے لیے صرف ایک شخص کا عشق کافی نہیں ہو سکتا[2]

علامہ آخر میں لکھتے ہیں فارسی نے جو لطیف خیالات ادا کیے وہ عربی وغیرہ زبانوں کی دسترس سے باہر ہے[3]

دقت آفرینی و خیال بندی دقت آفرینی اور خیال بندی کا موجد ظہیر فاریابی کو بتایا ہے، اس کا شعر ہے۔

اندیشہ کہ گم شود از لطف در ضمیر گردوں بہ راز با کمرت در میاں نہاد

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۹۸ [2] ایضاً ص ۱۹۹ [3] ایضاً ص ۲۰۰۔

علامہ اس بات سے آگاہ کرنے کے بعد کہ متاخرین نے کمر کی تعریف میں جو دقت آفرینیاں کی ہیں ان سب کی اصل یہی ظہیر کا شعر ہے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ معشوق کی کمر ایک لطیف خیال ہے جس کو آسمان نے چپکے سے معشوق کے کمربند سے کہدیا ہے، افسوس ہے کہ راز درمیاں نہادن کا صحیح ترجمہ اردو میں نہیں ہو سکتا اسلئے فارسی میں جو لطافت ہے وہ ترجمہ میں جاتی رہی[1]

نقاشِ صنع پیکرِ مرغاں ستاں نہاد
در تنگ نائے بیضہ زتاثیرِ عدل او

علامہ نے "ستاں نہادن" کے معنی چت لٹانا بتایا ہے۔ نقاش صنع سے مراد قدرت بتایا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کے عدل کا یہ اثر ہے کہ قدرت نے ذراسے انڈے میں پرندوں کو چت لٹایا کہ آرام سے سوئیں، اسی صنعت کو فارسی میں حسن التعلیل کہتے ہیں[2]

نازک تشبیہیں | ظہیر کی نازک اور لطیف تشبیہوں کے ایجاد کرنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

چو شاہدان خط سبزش دمیدہ گردِ عذار
چمن ہنوز لب از شیرِ ابر ناشستہ

لکھتے ہیں" لب از شیر ناشستن" یعنی ابھی بچہ کا دودھ نہیں چھوٹا، شعر کا مطلب یہ ہے کہ باغ ابھی بچہ ہے یہانتک کہ ابھی اس کے ہونٹوں پر ابر باراں کا دودھ جما ہوا ہے، باوجود اس کے نوخطوں کی طرح اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا ہے[3]۔

علامہ قاآنی کے بڑے مداح ہیں اس کی تشبیہات کے متعلق فرماتے ہیں کہ اکثر نیچرل (فطری) ہوتی ہیں مثلاً

---

[1] شعرالعجم ج ۵ ص ۹۹ و ۱۰۰ [2] ایضاً ص ۱۰۱ [3] ایضاً ص ۱۱۰۔

دو زلف تابدار او بہ چشم اشکبار من
بہ چشمہ کہ اندر او، شنا کنند مارہا

اس کی زلفیں میری اشکبار آنکھوں میں اس طرح نظر آتی ہیں کہ گویا چشمہ میں سانپ تیر رہے ہیں[1]۔

ساق بالا زند اندر شمر آب کلنگ
ہمچو بلقیس کہ بر صرح سلیمان گذرد

یعنی تالاب میں کلنگ اس طرح پائینچے چڑھاتا ہے گویا بلقیس حضرت سلیمانؑ کے شیشہ والے حوض میں اتر رہی ہے[2]۔

اے خوشا وقت کہ غایت مستیش سخن
ہمچو سرما زدہ در کام بہ تکرار افتد

وہ بھی کیا لطف کا وقت ہوتا ہے کہ معشوق کی زبان سے مستی کی حالت میں ایک لفظ بار بار ادا ہوتا ہے جس طرح سردی کھایا ہوا شخص بولتا ہے[3]۔

دقت و مضمون آفرینی کے ضمن میں علامہ فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت سے اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا ان کے ایک قصیدہ کا شعر ہے۔

خاک کویش خود پسند افتادہ در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

علامہ فرماتے ہیں اصل مضمون صرف اس قدر ہے کہ میں حرم کے بجائے ممدوح کی خاک پر سجدہ کرتا ہوں، اس کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خاک کو کی شکایت کرتے ہیں کہ نہایت مغرور اور خود پسند ہے، چنانچہ میری پیشانی میں ایک سجدہ بھی حرم کے لیے نہ چھوڑا[4]، دوسرا شعر ہے :۔

عاجزم چوں در ثنائے دوست بارشکم چہ کار
میروم از خویش تا گیرد عطارد جائے من

مجھ سے ممدوح کی تعریف ادا نہیں ہو سکتی تو رشک سے کیا فائدہ، میں اس کام سے دستبردار ہو جاتا ہوں کہ عطارد اس کام کو انجام دے[5]۔

بلاغت کلام | علامہ کا نکتہ آرا قلم جابجا شعر کی بلاغت کے پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے،

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۹ و ۲۰ [3] ایضاً ص ۲۰ [4] ایضاً ص ۲۴ [5] ایضاً ص ۲۵۔

اس سے ان کے شعر فہم اور سخن شناس ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ معشوق کو جس طرح اپنے حسن و جمال پہ ناز ہوتا ہے، عاشق کو بھی اپنی وفاداری اور کمال عشق کا غرور ہوتا ہے۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:۔

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کہ اے معشوق بے ہمتا　　ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نہ خواہد شد

مطلب یہ ہے کہ ایک دن مجنوں نے لیلیٰ سے کہا کہ اے بے مثل معشوق! مجھ کو اس سے انکار نہیں کہ تیرے اور بھی عاشق ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے لیکن مجنوں نہیں پیدا ہو سکتا، علامہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ شعر سراپا بلاغت ہے، چونکہ اس قسم کا خیال ایک طرح پر معشوق کی توہین ہے، اس لیے آغاز کلام مدح سے کیا ہے یعنی اے بے مثل معشوق اس فقرے کے بجائے کہ میرا جیسا عاشق نہ پیدا ہوگا، یہ کہنا کہ "مجنوں نہ پیدا ہوگا" گویا یہ کہنا ہے کہ میرا سا جانباز، میرا سا جاں نثار، میرا سا وفادار، میرا سا خانماں برباد وغیرہ وغیرہ نہیں پیدا ہو سکتا، کیونکہ مجنوں کے نام کے ساتھ یہ تمام اوصاف خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں، اس سے ظاہر ہوگا کہ مجنوں کے لفظ میں جو بات ہے، صفحوں میں بھی نہیں ادا ہو سکتی اور اس لیے عاشقانہ غرور اور ناز کی کا اس سے بڑھ کر کوئی اسلوب نہیں ہو سکتا۔[1]

رندی کی عظمت، اس کا اعلان اور اس کی ترغیب اور تحریض خواجہ صاحب کا خاص میدان ہے علامہ فرماتے ہیں کہ اس میں آج تک کوئی ان کی گرد تک نہ پہنچ سکا، شعر ہے:۔

کہ بروبنبرد شاہاں زمن گدا پیامے　　کہ بکوئے میفروشاں دو ہزار جم بہ جامے

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۴۹۔

ترجمہ یہ ہے بادشاہوں کو مجھ فقیر کا یہ پیغام کون پہنچا دے گا کہ میفروشوں کی گلی میں دو ہزار جمشید ایک پیالے میں آتے ہیں،

علامہ اس شعر کی وجوہ بلاغت پر لحاظ کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اول تو بادشاہوں کو جو پیغام دینا چاہا ہے اس میں اپنے نام کے ساتھ گدا کا وصف بڑھایا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ میخانہ کے گدا بھی ایسے جری ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ عام لوگوں پر چوٹ ہے کہ لوگ اتنی جرات نہیں رکھتے کہ بادشاہوں تک پیغام پہنچا دیں اس لیے عام اعلان کے ذریعہ سے ایسے شخص کو ڈھونڈھتا ہے پھر میخانہ کے بجائے کوئے میفروشاں کہتا ہے یعنی میکدہ تو خیر بڑی درگاہ ہے۔ مے فروشوں کی گلی میں بھی بادشاہوں کی قدر نہیں، جمشید کی تخصیص اولاً تو اس لحاظ سے ہے کہ شوکت اور دبدبہ میں جمشید کا کوئی ہمسر نہیں ہوا، دوسرے یہ کہ شراب اور جام جمشید کی ایجاد ہیں تاہم شراب کے سامنے جب جمشید کی جاہ و شوکت کی کوئی حقیقت نہیں تو اور کسی کی کیا ہوگی[1]

فقیہ مدرسہ دی مست بود فتویٰ داد　　　　کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

علامہ کہتے ہیں اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مال وقف سے بہر حال اچھی ہے خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہے، اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ سچی بات کا اعتراف یوں کاہے کو کرتا، مست تھا، اس لیے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا[2]

کہیں کہیں علامہ کی بلاغت شناس طبیعت خاص خاص الفاظ کے نکتے بیان کرکے انکے وجوہ بلاغت کو بیان کرتی ہے مثلاً

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۳۰ [2] ایضاً ج ۲ ص ۲۲۹۔

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز بازخواست — نان حلال شیخ زآب حرام ما

مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی میرے آب حرام (شراب) سے بازی نہ لے جا سکے، علامہ کہتے ہیں جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے، ترسم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو بازخواست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے، نان حلال اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے میرے آب حرام سے بازی نہ لے جائے تو زاہد کے لیے کس قدر افسوس کا سبب ہو گا۔[۵]

کمند صید بہرامی، بیفگن جام مے بردار — کہ من پیمودم ایں صحرا بہرام است نے گورش

علامہ نے اس شعر کی جو تشریح کی ہے اس سے ان کی بلاغت و سخن شناسی اور شعر فہمی کا اندازہ کر دوہ رقمطراز ہیں:۔

"بہرام گورخر کا شکار کھیلا کرتا تھا اس بنا پر اس کو بہرام گور کہتے تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ بہرام کی کمند (جس سے وہ گورخر کو پکڑا کرتا تھا) پھینک دو اور جام مے ہاتھ میں لو، میں اس صحرا کو خوب ناپ چکا ہوں، نہ بہرام ہے، نہ گور، اس مضمون کے ادا کرنے کی خوبی کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ بہرام کی گمشدگی کو نہایت وسعت دی جائے یعنی کہیں اس کا پتہ نہیں لگتا نہ زمان میں نہ مکان میں، صحرا کا لفظ یہاں اس خوبی سے

---

۵ شعر العجم ج ۲۔ ص ۲۲۹۔

آیا ہے کہ زمان اور مکان دونوں پر حاوی ہو گیا ہے، زمانہ کے امتداد کو صحرا سے تعبیر کیا ہے یعنی زمانہ ایک صحرا ہے جس میں بہرام کا کہیں پتہ نہیں لگتا، گمشدگی کی ترقی دینے کے لیے بہرام کی چیزوں کا ذکر بھی ضروری ہے یعنی بہرام کے ساتھ اس کی کسی چیز کا پتہ نہیں، گور کا لفظ گورخر کے لیے بھی آتا ہے اور گور قبر کو بھی کہتے ہیں، یہاں دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں، یعنی بہرام کے گورخر کا پتہ نہیں یا بہرام کی قبر کا پتہ نہیں، اس لفظی اشتراک نے بھی ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے[1]

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش کہ تا لختے بیاسایم ز دنیا و از شر و شورش

علامہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص دنیا کے جھگڑے اور بکھیڑوں سے تنگ آکر کہتا ہے کہ مجھکو ذرا دنیا کے شور و شر سے ستانے دو اور چونکہ یہ مشکل ہے اس لیے کہ دنیا کے بکھیڑوں سے اس وقت نجات مل سکتی ہے جب کہ دولت و عزت، جاہ و منصب، نام و نمود، عزت و اقتدار سے ہاتھ اٹھا لیا جائے اس لیے کہتا ہے کہ شراب یعنی کوئی ایسی چیز دو جس کے نشہ میں یہ سب باتیں بھول جائیں اور چونکہ اس کے لیے نشہ کی ضرورت ہے اس لیے مرد افگن اور زور کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ایسی شراب جس کا نشہ بڑے بڑوں کو گرا دے[2]

خواجہ حافظ نے اس مضمون کو کہ دنیا جیسی چیز کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں نہایت موثر طریقوں سے ادا کیا ہے مثلاً

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است کلاہ دلکش است اما بدردسر نمی ارزد

یعنی شاہی تاج (جس کے ساتھ جان کا خوف لگا ہوا ہے) بے شک دلفریب تاج ہے۔

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۵۲ [2] ایضاً ص ۵۲ و ۵۳۔

لیکن دردِ سر کے قابل نہیں' علامہ اس کی بلاغت سے معمور شرح یوں کرتے ہیں تاج سلطانی کے رتبہ کو شکوہ کے لفظ سے ادا کیا ہے، لیکن ساتھ ہی بیم جان کا ذکر بھی کر دیا ہے کہ اس کی رغبت کم ہو جائے، دردِ سر کا لفظ نہایت جامع اور بلیغ لفظ ہے' وہ اہمیت اور بے حقیقی دونوں پر دلالت کرتا ہے' یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تاج سلطانی اس قابل بھی نہیں کہ اس کے لیے ذرا سا دردِ سر بھی گوارا کیا جائے اور یہ بھی کہ وہ اس قابل نہیں جس کیلئے جان جوکھوں برداشت کیا جائے[1]

اظہار جذبات و جوشِ بیان علامہ کے نزدیک شاعری کی اصلی حقیقت جذبات کا اظہار ہے یعنی شاعر پر کوئی جذبہ طاری ہو اور وہ ان جذبات کو اس طرح ادا کرے کہ دوسروں پر بھی وہی اثر چھا جائے خواجہ صاحب کے اظہار جذبات اور جوشِ بیان کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا جو علامہ کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہیں' ان کے پُر زور ترجمہ سے علامہ کی شعر و سخن شناسی بھی سامنے آئے گی۔

شراب و عشق نہاں چیست کار بے بنیاد
زویم بر صف رنداں و ہرچہ بادا باد

چھپ کر شراب پینا بے اصول کام ہے' میں رندوں کی صف پر ٹوٹ کر گرتا ہوں جو ہونا ہوگا ہوگا۔

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالہ میں ڈالیں
آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنیاد قائم کریں

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

اگر غم لشکر تیار کرے گا کہ ہمارا خون بہائے تو ہم اور ساقی مل کر اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔ علامہ فرماتے ہیں اس حوصلہ کو دیکھو ادھر غم کا سہارا لشکر ہے

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۵۳۔

ادھر صرف یہ اور ساقی، لیکن اس کے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کا دعویٰ ہے[1]

گدائے میکدہ ام، لیک وقت مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

گھر میں شراب خانہ کا گدا ہوں لیکن مستی کی حالت میں مجھکو دیکھو کہ آسمان سے ناز اور ستارہ پر حکومت کرتا ہوں۔

ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پر زمے — طامات تا بچند و خرافات تا بکے

ساقی آ، لالہ کا پیالہ شراب سے بھر چکا پرہیزگاری کہاں تک اور بک بک کب تک۔

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب — مارا ز جام بادۂ گلگوں خراب کن

اے ساقی اس کے قبل کہ یہ عالم فانی برباد ہو جائے ہم کو شراب کے پیالے سے برباد کردے۔

خوشتر از فکر مے و جام چہ خواہد بودن — چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

جب یہ نہیں معلوم کہ انجام کیا ہوگا تو مے و جام سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے۔

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمے افروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

ساری دنیا اس قابل نہیں ہے کہ اس کے لیے ایک لحظہ کا غم گوارا کیا جائے، ہمارا خرقہ شراب کیلئے بیچ ڈالو تو اس سے اچھے اس کے دام نہیں اٹھ سکتے[2]

شوخی و ظرافت | خواجہ صاحب کا کلام شوخی و ظرافت کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے انکی شوخی طبع کی لطافت اور علامہ کے ترجمہ کی دلآویزی کے لیے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند — قول ما نیز ہمیں است کہ او آدم نیست

واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں اس قدر تو ہم کو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے (باقی فرشتہ ہے یا شیطان اسکا فیصلہ ہوتا رہے گا۔)

گر ز مسجد بخرابات شدم عیب مگیر — مجلس وعظ دراز ست و زماں خواہد شد

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۵۴ تا ۵۶۔

یعنی میں اگر مسجد سے اٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا تو اعتراض کی کیا بات ہے وعظ تو ابھی تک ہوتا رہے گا، میں پی کے چلا آؤں گا۔

اس موقع پر علامہ نے قائم کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں[1]

خواجہ حافظ کے کلام میں جو گرمی و مستی ہے وہ علامہ کو بھی مست، بے خود اور سرشار کر دیتی ہے اس لیے وہ ان کا افسانہ بار بار لطف و لذت لے کر سناتے ہیں پھر بھی سیر نہیں ہوتے۔

تلمیحات | شعر فہمی کے لیے ان تلمیحات سے واقفیت ضروری ہے جو شعر میں آئیں، علامہ کو اس میں بھی کمال حاصل تھا، دو چار مثالوں سے ان کی اس با خبری کا اندازہ ہوگا۔

علامہ نے اکثر لوگوں کا حال یہ بتایا ہے کہ وہ کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب کامیاب نہیں ہوتے تو سمجھتے ہیں کہ مقصد ہی ناممکن الحصول تھا لیکن ان میں خود استقلال، جوش اور طلب صادق نہ تھی ورنہ سچا طالب محروم نہیں رہ سکتا خواجہ صاحب اس نکتہ کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

طالب لعل و گہر نیست وگر نہ خورشید ہمچناں در عمل معدن و کان ست کہ بود

علامہ فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ آفتاب کی روشنی متصل کئی سو برس تک جب کسی پتھر کے ٹکڑے پر پڑتی ہے تو وہ لعل بن جاتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ لعل و جواہرات کے طالب موجود نہیں ورنہ آفتاب تو اب بھی اسی طرح جواہرات بنانے میں مصروف ہے[2]۔

اکثر حکما کا خیال ہے کہ عالم کی حقیقت، اس کی غرض و غایت نہیں معلوم ہو سکتی۔

---

[1] شعر العجم ج ۲ ص ۲۶۳ و ۲۶۴ [2] ایضاً ج ۵ ص ۴۴۔

صرف اتنا معلوم ہے کہ کچھ ہے باقی یہ کہ کیا ہے، کیوں ہے، کیسا ہے معلوم نہیں، شعرا نے طرح طرح سے اس مضمون کو باندھا ہے مگر خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

کس نہ دانست کہ منزل گہہ مقصود کجا ست   ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

علامہ کی نکتہ آرائی ملاحظہ ہو، اگلے زمانہ میں دستور تھا کہ قافلہ چلتا تھا تو ایک اونٹ کی گردن میں گھنٹہ لٹکا دیتے تھے، مطلب یہ ہے کہ کسی کو معلوم نہیں کہ منزل مقصود کہاں ہے اور کہاں جاتا ہے، اتنی بات البتہ ہے کہ ایک گھنٹہ کی آواز آرہی ہے جرس کو تنکیر کے لفظ سے بیان کیا ہے یعنی گھنٹہ کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے کدھر ہے کس قسم کا ہے، بس ایک آواز سنائی دیتی ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید کوئی قافلہ ہے، اس مضمون کے ادا کرنے کی اصل خوبی یہ ہے کہ ہر چیز میں ابہام اور اشتباہ باقی رہے، اس شعر میں ابہام کو پورا قائم رکھا ہے[1] خواجہ حافظ دنیا کی بے اعتباری کو اس پُر اثر طریقہ سے بیان کرتے ہیں:۔

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدہ ست روزگار   چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

ترجمہ یہ ہے کہ ناز و غرور رہنے دو، زمانہ قیصر کی قبا کی شکن اور کیخسرو کے تاج کا خم دیکھ چکا ہے، علامہ فرماتے ہیں اگلے زمانہ میں امرا اور اہل جاہ قبا وغیرہ چنوا کر پہنتے تھے اور سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھتے تھے اس لیے یہ چیزیں جاہ و عظمت کا نشان تھیں اس بنا پر دنیاوی جاہ و عظمت کو ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے، ساتھ ہی یہ بلیغ پہلو ہے کہ دنیاوی عظمت کی بس اتنی حقیقت ہے جتنی کسی چیز کی شکن اور خم کی[2]

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۹۴ [2] ایضاً ص ۵۱۔

علامہ فرماتے ہیں قرآن شریف میں مذکور ہے کہ ہم نے اپنی امانت کو آسمان اور زمین پر پیش کیا، سب نے انکار کیا اور ڈر گئے لیکن آدمی نے اس بار کو اٹھا لیا، مقصد یہ ہے کہ زمین و آسمان تکلیفات شرعیہ کی قابلیت نہیں رکھتے تھے، یہ قابلیت صرف انسان کو عطا کی گئی کہ جائز، ناجائز، حلال، حرام، نیک و بد کی تمیز رکھتا ہے اور اسی بنا پر اس کے لیے شریعت کے احکام آتے ہیں، حضرات صوفیہ کے نزدیک امانت سے مراد عشق حقیقی ہے کہ انسان کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں بہرحال یہ شعر دونوں معنوں کے لحاظ سے صحیح ہے[1]

ہانا کہ خورشید رنگ رخش را — بدزدد کہ بخشد بہ یاقوت احمر

علامہ فرماتے ہیں عام خیال یہ ہے کہ آفتاب جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے تو وہ یاقوت بن جاتا ہے، عنصری کہتا ہے کہ آفتاب دراصل معشوق کے چہرے کا رنگ چراتا ہے اور یاقوت کو دیدیتا ہے (شعر العجم ج ۱ ص ۶۳)

اشعار کا تقابل | علامہ نے اکثر شعرا کے کلام کا باہمی موازنہ بھی کیا ہے جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں البتہ شاعرانہ نکتوں اور بلاغت کے رموز بیان کرتے ہوئے یا اشعار کی گرہیں کھولتے اور ان کا مفہوم واضح کرتے ہوئے انھوں نے دو شاعروں کے شعر کو نقل کرکے ان کا مقابلہ کیا ہے، اس طرح کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہزار بار قسم خوردہ ام کہ نام ترا — بہ لب نیاوردم الا قسم بنام تو بود

علامہ فرماتے ہیں یہ خیال اکثر شعرا نے ظاہر کیا ہے کہ عاشق معشوق کی رسوائی اور بدنامی کے ڈر سے لوگوں کے سامنے اس کا نام نہیں لینا چاہتا لیکن بے اختیار اسکا

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۴۰۔

نام زبان پر آہی جاتا ہے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے، معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے
کہ میں نے سینکڑوں دفعہ قسم کھائی کہ تیرا نام نہ لوں گا، لیکن قسم تیرے ہی نام کی تھی (یعنی یوں
تیرا نام آگیا) اس مضمون کو نظیری نے اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا، اس طرز ادا میں یہ
عیب تھا کہ قصداً نام لینا ثابت ہوتا ہے نظیری کہتا ہے۔

گرچہ می دانم قسم خوردن بجانت خوب نیست ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگندے دگر

یعنی گو میں جانتا ہوں کہ تیری جان کی قسم کھانا کچھ اچھی بات نہیں لیکن تیری ہی جان
کی قسم مجھکو اور کوئی قسم یاد نہیں، اس میں یہ خوبی ہے کہ معشوق کا نام لے لیا ہے لیکن جان کر
نہیں یعنی خود اس کو یہ نہیں خبر کہ معشوق کا نام زبان پر آگیا ہے[1]

علامہ کہتے ہیں لوگوں میں خصومت اور جنگ و جدال کا بڑا سبب مذہبی منافرت
ہے، دنیا میں لاکھوں کروڑوں جانیں اسی کی بدولت برباد ہوئی ہیں، خود ایک ہی
مذہب کے لوگوں میں ذرا ذرا سے اختلافات پر نہایت ناگوار نزاعیں قائم ہو جاتی
ہیں اور ایک دوسرے کو کافر اور مرتد کہتا ہے اور اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے،
اہل دل ان نزاعوں کو ناپسند کرتے ہیں اور جس قدر حقیقت پرستی اور عرفان شناسی
کا اثر زیادہ بڑھتا ہے اسی قدر یہ خیالات مٹتے جاتے ہیں اور نظر آتا ہے کہ سب اسی
ذات یکتا کے طالب ہیں، سب کو اسی کی تلاش ہے، سب اسی کے عشق میں چور ہیں،
اس نکتہ کو خواجہ صاحب نے متعدد پیرایوں میں ادا کیا ہے۔

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست ہمہ جا خانۂ عشق چہ مسجد چہ کنشت

در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب ہست

---

[1] شعر العجم ج ۳ ص ۲۰۲۔

علامہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو، سب یار کے طالب ہیں خواہ مست ہو خواہ ہشیار، ہر جگہ عشق کا گھر ہے، مسجد ہو یا بت خانہ، عشق میں خانقاہ اور شراب خانہ کی قید نہیں۔

عرفی نے اس مضمون کو تشبیہ کے ذریعہ سے بالکل بدیہی کر دیا ہے۔

عارف ہم از اسلام خراب ست و ہم از کفر — پروانہ چراغ دیر و حرم نہ داند[1]

معشوق کو کسی بہانہ اور حیلہ سے بلانا شعرا کا عام مضمون ہے، ایک شاعر کہتا ہے۔

امشب بیا تا در چمن، سازیم پُر پیمانہ را — تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

علامہ فرماتے ہیں کہ اس شعر میں بلانے کی تقریب اظہار کمال قرار دی ہے، شاعر معشوق سے کہتا ہے کہ تم آؤ تو ایک معرکہ قائم کیا جائے، ایک طرف تم اور شمع و گل اور ایک طرف میں اور پروانہ و بلبل اور چونکہ نتیجہ کا حال قطعاً معلوم ہے اس لیے کہتا ہے کہ تم شمع اور گل کو رشک سے جلانا اور میں پروانہ اور بلبل کو، خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند — اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

کہتے ہیں اور سب لوگ اپنے اپنے مطلوب کے ساتھ ہم بزم اور ہم نشیں ہیں، اے دوست آ اور میری تنہائی پر رحم کر۔

علامہ کی نکتہ آرائی اور بلاغت شناسی دیکھیے، لکھتے ہیں، اس میں اولاً تو بلانے کی تقریب رحم قرار دی ہے، جو فطرتاً ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے اس کے ساتھ ناکامیابی کا اس طرح اظہار کرنا کہ معشوق در کنار کوئی شخص بھی پاس نہیں پھر یہ بلاغت کہ بظاہر معشوق کو معشوق کی حیثیت سے نہیں بلاتے کہ اس کو شرم و لحاظ کی بنا پر کوئی تکلف ہو بلکہ اس غرض سے بلاتے ہیں کہ آکر ہماری تنہائی دیکھ جائے، پھر اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ جب اور معشوقوں کو دیکھے گا کہ اپنے عاشقوں کے ساتھ ہم صحبت ہیں تو اس کو بھی

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۳۴۔

ترغیب ہو گی۔[1]

دشنام معشوق کے لطف کو تمام شعرا نے باندھا ہے غزالی کہتے ہیں

دشنام دہی و برلب تو روح القدس آفریں نویسد

تو گالی دیتا ہے اور تیرے ہونٹوں پر جبریل آفریں لکھتے جاتے ہیں' خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔

قند آمیختہ باگل نہ علاجِ دلِ ماست بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

معشوق سے کہتے ہیں کہ پھول میں جو قند ملا لیتے ہیں (یعنی گلقند) یہ میرے دل کا علاج نہیں' علاج کرنا ہے تو گالیوں میں چند بوسے ملالو' علامہ فرماتے ہیں اس طرز ادا کی بلاغتوں پر لحاظ کرو اول تو کلام کا ایک بڑا حصہ غیر مذکور ہے، یعنی عاشق بیمار ہے معشوق کو معلوم ہوا کہ عاشق بیمار ہے اور دل کی بیماری ہے، اس بنا پر وہ گلقند لایا ہے اور عاشق کو دیتا ہے' یہ سب جملے غیر مذکور ہیں لیکن خود بخود سمجھ میں آتے ہیں پھر گلقند کو گل قند نہیں کہا بلکہ اس کی ترکیب بیان کی ہے، ان کو آمیختن کے لفظ سے بیان کیا ہے، اس سے اس قوت متخیلہ کا اظہار ہوتا ہے جو ہر چیز کو مجسم کرکے دکھا دیتی ہے، اسکے علاوہ چونکہ معشوق سے گل قند کی فرمایش ہے اس لیے وہی لفظ استعمال کیا ہے جو گلقند کے لیے کیا جاتا ہے، بوسہ اور دشنام دونوں کی ایک ہی مقدار بیان کی ہے یعنی چند جس سے یہ غرض ہے کہ اس گلقند کی ترکیب میں یہ ضرور ہے کہ دونوں اجزا ہم وزن ہوں' یعنی جتنی گالیاں ہوں اتنے ہی بوسے بھی ہوں[2]

فغانی کی خصوصیت علامہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے کسی بات کو زیادہ پیچ دیکر

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۴۰ [2] ایضاً ص ۴۸۔

کہنے کا طرز قائم کیا مثلاً

زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند — درماندہ صلاح و فساد یم الحذر

علامہ فرماتے ہیں کہ جو خیال اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے یہ ہے کہ حکما اور فلاسفہ نے خیر و شر کے اصول قائم کیے اور پھر ان میں باہم اختلاف ہے، ایک کے نزدیک جو چیز تمدن یا اخلاق کے خلاف ہے، وہی چیز دوسرے کے نزدیک عین تمدن و اخلاق ہے اس لیے عام لوگ سخت مشکل میں پڑ جاتے ہیں، ان کو خود اس جھگڑے کے فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں اور چونکہ دونوں رائیں باہم متناقض ہیں اس لیے دونوں ایک ساتھ تسلیم نہیں کی جا سکتیں، عرفی اسی خیال کو زیادہ بے باکی اور گستاخی سے ادا کرتا ہے۔

در بد آموزی ما مصلحت اندیش خود اند — کفر و دیں را بہ ببر از یاد کہ ایں فتنہ گراں

صلاح و فساد کے بجائے عرفی نے کفر و دیں کا لفظ استعمال کیا اور پھر صاف صاف دونوں کو فتنہ گر کہا، فغانی نے صرف یہ کہا تھا کہ عقلا نے جو اصول قائم کیے ہیں، انھوں نے ہم کو چکر میں ڈال دیا ہے، عرفی کہتا ہے یہ دونوں (کفر و دیں) ہم کو باہم لڑنا سکھاتے ہیں اور اس سے ان کی غرض یہ ہے کہ ان کی گرم بازاری قائم رہے؛ کیونکہ اختلاف و نزاع کے بغیر جوش و خروش، زور و شور، اور چہل پہل نہیں ہوتی[1]

اس بات کو کہ دنیا کا راز معلوم نہیں ہو سکتا خواجہ صاحب اس تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں ع

کہ کس نکشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معما را

یعنی دنیا ایک چیستاں ہے جو فلسفہ اور عقل سے نہیں حل ہو سکتا، فغانی اسی کو

---

[1] شعر العجم ج ۵ ص ۵۸ و ۵۹۔

یوں کہتے ہیں :۔

آں کہ ایں نامۂ سربستہ نوشت است نخست　　گرہے سخت بہ سررشتۂ مضمون زدہ است

یعنی جس شخص نے ابتدا میں یہ تحریر لکھی مضمون کے دھاگے میں ایک سخت گرہ بھی لگادی۔[1]

خیام کہتا ہے :۔

خاکے کہ بزیر پائے حیوانے است　　زلف صنمے و عارض جانانے است

ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے است　　انگشت وزیرے و سر سلطانے است

علامہ فرماتے ہیں شیخ سعدی نے اس مضمون کے لیے فرضی حکایتیں لکھی ہیں مثلاً کہتے ہیں :۔

شنیدم کہ یک بار در دجلۂ　　سخن گفت با عابدے کلۂ

کہ من فرفر ماندہی داشتم　　بہ سر بر کلاہ می داشتم

ایک دوسری جگہ اور بھی نہایت دردانگیز طریقہ سے اسی کو ادا کیا ہے۔ مگر علامہ فرماتے ہیں کہ سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں۔[2]

سعدی کا شعر ہے :۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　بایداول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

علامہ فرماتے ہیں یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی لیکن امیر خسرو نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی　　زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں۔[3]

---

[1] شعرالعجم ج ۵ ص ۹۹ و ۱۰۰ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۴ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۵۶ و ۱۵۷۔

" جائے تو باشد " " ایسائے تو باشد" کی طرح میں نظیری نے غزل لکھی، جائے کا قافیہ استادوں کی غزل میں اس پہلو سے بندھ چکا ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا مثلاً :۔

دو عالم را بیک بار از دل تنگ　　　برون کردیم تا جائے تو باشد

مگر نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے پہلو سے باندھا،

نیازارم ز خود ہرگز دلے را　　　کہ می ترسم درو جائے تو باشد

علامہ نے اسی قافیہ میں ایک اور استاد کا یہ شعر تحریر کیا ہے :۔

جہانے مختصر خواہم کہ دروے　　　ہمیں جائے من و جائے تو باشد[1]

فغانی کا مشہور مطلع ہے :۔

بہ نوبت صبحدم، نالاں بگلگشت چمن رفتم　　　نہادم روے بر روے گل واز خویشتن رفتم

میرزا صائب نے اس کو یوں بدل دیا :۔

بنوبت صبحدم گریاں چو شبنم در چمن رفتم　　　نہادم روے بر روے گل واز خویشتن رفتم

علامہ فرماتے ہیں کہ " شبنم کی تشبیہ نے شعر میں جان ڈال دی اور دعوے کو پورا ثابت کر دیا[2]

عیب و قبح کی نشاندہی | علامہ جس طرح کلام کے محاسن اور خوبیوں کو دلکشی و دلآویزی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اسی طرح اس کے عیوب و اسقام بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتے تھے جو ان کی سخن شناسی اور شعر فہمی کا ایک بڑا ثبوت ہے، اس کی تفصیل اوپر کی مثالوں میں آچکی ہے تاہم یہاں بطور خاص اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

علامہ ارشاد فرماتے ہیں کہ محاکات کے کمال کے لیے عام کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا

---

[1] شعر العجم ج ۳ ص ۱۲۰ [2] ایضاً ص ۱۷۸۔

مطالعہ کرنا ضروری ہے، شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے، کبھی جذبات انسانی کا عالم دکھاتا ہے کبھی شاہی درباروں کا جاہ و حشم بیان کرتا ہے، کبھی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں کی سیر کراتا ہے، اس حالت میں اگر اس نے عالم کائنات کا مشاہدہ نہ کیا ہو اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابل انتخاب باتوں کو دقت آفرینی سے نہ دیکھا ہو تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کر سکتا ہے شیکسپیر تمام دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، اس شرط کی کمی کی وجہ سے بڑے بڑے شعرا کے کلام میں علانیہ رخنے نظر آتے ہیں، نظامی خدائے سخن ہیں تاہم دارا کے خط میں جو سکندر کے نام تھا لکھتے ہیں :-

دگر نہ خیانت دہم گوشش پیچ   کہ دانی تو ہیچی و کمتر ز ہیچ

ورنہ میں تیرے ایسے کان ملوں گا کہ تو جان جائے کہ ناچیز سے بھی ناچیز ہے۔

علامہ لکھتے ہیں نظامی گوشہ نشین شخص تھے شاہی درباروں میں آنے جانے کا کم اتفاق ہوا تھا، شاہانہ ادب اور طریق گفتگو سے واقف نہ تھے اس لیے وہی عام بازاری لفظ گوشش پیچ (کان اینٹھنا) لکھ گئے اس نقص کی وجہ سے واقعہ کی صحیح تصویر نہ اتر سکی[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں شعر کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخیل کا بیجا استعمال کیا جائے، طبیعیات کے متعلق جس طرح یونانی حکما کی قوتیں بے کار گئیں اور آج تک ان کے ہیرو ہیولا اور صورۃ کی فضول بحثوں میں الجھ کر کائنات کا ایک عقدہ بھی حل نہ کر سکے۔ بعینہ ہمارے متاخرین شعرا کا یہی حال ہوا، ان کی قوت تخیل قدما سے زیادہ ہے لیکن

---

[1] شعر العجم ج ۴ ص ۱۶۔

افسوس بالکل رائگاں صرف کی گئی، ایک شاعر کہتا ہے:۔

گوشہا را آشیاں مرغ آتش خوارہ کرد　　　برق عالم سوز یعنی غوغائے من

علامہ اس شعر کو سمجھنے کے لیے امور ذیل کو پہلے ذہن نشین کراتے ہیں:۔

(۱) مرغ آتشخوارہ ایک پرند ہے جو آگ کھاتا ہے۔

(۲) آہ و فریاد میں چونکہ گرمی ہوتی ہے اس لیے آہ اور فریاد کو شعلہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

(۳) مرغ آتشخوارہ وہاں رہتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری فریاد میں اس قدر گرمی ہے کہ کانوں میں پہنچی تو وہاں آگ پیدا ہوگئی اس بنا پر مرغ آتشخوارہ نے لوگوں کے کانوں میں جا کر گھونسلے بنا لیے ہیں کہ یہاں آگ نصیب ہوگی۔

علامہ فرماتے ہیں متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ قوت تخیل کا استعمال بیجا طور سے ہوا ہے[۱]۔ آگے کئی صفحات تک اسی طرح کی تخیل کی بے اعتدالیوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے[۲]۔

علامہ نے ایران اور فارسی زبان کی اہمیت و خصوصیت جابجا بتائی ہے، شعرا کے کلام پر تبصرے اور ان کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے زبان اور محاوروں پر عالمانہ بحثیں کی ہیں، فارسی زبان کے ادوار بیان کر کے ہر دور کی زبان کی خصوصیت دکھائی ہیں، مروج و متروک الفاظ پر گفتگو کی ہے، ان سب سے فارسی زبان پر ان کے عبور اور شعر فہمی کے کمال کا پتہ چلتا ہے، غرض مصنف شعر العجم کی شعر فہمی کے پہلو اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک ہی مضمون میں ان کا احاطہ مشکل ہے۔

---

[۱] شعر العجم ج ۴ ص ۴۰ و ۴۱ [۲] ایضاً ص ۴۱ تا ۴۶۔

بریلی کے اہم اخبارات

از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلی

بریلی میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شعر و شاعری کے غیر معمولی فروغ کے ساتھ لٹریری سوسایٹی اور مطابع قائم ہوئے اور اخبارات و گلدستوں کا اجرا ہوا۔ جو اخبارات ہمارے علم میں آئے، ان کا تعارف مندرجہ ذیل ہے۔

عمدۃ الاخبار | ہمارے پیش نظر عمدۃ الاخبار بریلی کے تین حوالے ہیں:۔

(۱) گارساں دی تاسی نے اپنے ایک مقالے میں (۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۳ء) تحریر کیا "عمدۃ الاخبار۔ یہ اخبار بھوپال سے شایع ہوتا ہے۔ اس نام کے دو اخبار ایک مدراس سے اور ایک بریلی سے شایع ہوتے ہیں۔" (مقالات گارساں دی تاسی۔ ص ۲۱۸)

(۲) سید بدرالدین علوی نے اپنے مضمون "حضرت مفتی عنایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بریلی کا کتب خانہ" مطبوعہ معارف اعظم گڈھ بابت مارچ ۱۹۵۲ء میں اطلاع دی کہ "بریلی سے ایک اردو اخبار عمدۃ الاخبار نامی قدیم زمانہ میں باہتمام منشی لچھمن پرشاد نکلتا تھا" (ص ۲۳۱) اسکے بعد علوی صاحب نے عمدۃ الاخبار بریلی کے یکم جنوری ۱۸۵۵ء سے پانچ مارچ ۱۸۵۵ء کے شماروں کا حوالہ دے کر یہ اطلاع دی کہ کتب خانہ بریلی کا افتتاح یکم مارچ ۱۸۵۵ء کو ہوا۔

(۳) قاسم سبحن لال نے ہسٹاریکل ریکارڈ میں کمیشن جے پور کے اجلاس منعقدہ ۱۹۴۵ء میں ایک انگریزی مقالہ "دی عمدۃ الاخبار بریلی" پیش کیا۔ قاسم سبحن لال کے پیش نظر عمدۃ الاخبار

بریلی کے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک کے شمارے تھے (روداد کمیشن مذکورہ بالا۔ ص ۱۰۰) اسی سلسلے میں ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، رامپور رضا لائبریری رامپور نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۹۱ء میں مجھے تحریر کیا کہ "بریلی کے عمدۃ الاخبار کے کچھ شمارے قاسم علی سجن لال کے ذخیرے میں محفوظ ہیں، جو عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے"۔ گویا قاسم سجن لال نے عمدۃ الاخبار کے جن شماروں کو سامنے رکھ کر جے پور کے اجلاس میں جو مقالہ پڑھا وہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد میں موجود ہیں۔

قاسم سجن لال کے مذکورہ مقالے سے معلوم ہوا کہ عمدۃ الاخبار بریلی کا اجرا ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ اس کا مدیر لچھمن پرشاد تھا۔ جب لچھمن پرشاد نے مدرسۂ بریلی (موجودہ بریلی کالج بریلی ملحقہ روہیلکھنڈ یونیورسٹی بریلی) میں مدرسی اختیار کی تو ۱۱ اگست ۱۸۵۳ء کو لالہ کلیان رائے عمدۃ الاخبار بریلی کا مدیر مقرر ہوا۔ اس کے بعد ۱۰ جون ۱۸۵۵ء کو ماتھو لال نے ادارت کا بار سنبھالا۔ عمدۃ الاخبار کے ہر شمارے میں بارہ صفحات ہوتے تھے اور ہر صفحہ دو کالمی تھا، وہ ہفتہ وار تھا اور ہر دو شنبہ کو شایع ہوتا تھا۔ بعض شماروں میں سائنس کے موضوعات پہ مضامین شایع ہوئے جن کی وضاحت خاکوں اور نقشوں کے ذریعہ کی گئی۔ تین یا چار صفحات آگرہ گزٹ کے لیے مخصوص تھے۔ آخری صفحہ پر خریداروں کی فہرست شایع ہوتی تھی اور اسکے ساتھ ہی ان خریداروں کے اسما بھی جن پر رقوم بقایا تھیں۔ فہرست خریداران میں ہندو مسلمان نوابین اور امرا کے نام ملتے ہیں۔ شمالی مغربی صوبہ کی حکومت چھ کاپیاں خریدتی تھی۔ عمدۃ الاخبار کی اشاعت کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس عہد کے سماجی، تعلیمی اور ثقافتی خیالات کو مشتہر کیا جائے (ص ۱۰۰) اس اخبار میں پورے ہندوستان میں واقع ہونے والے اہم معاملات کی خبریں چھپتی تھیں اور بعض بین الاقوامی واقعات جیسے روس اور ترکی کی لڑائی، افغانستان کے

حالات، نواب واجد علی شاہ کی معزولی وغیرہ پر تبصرے شایع ہوئے (ص ۱۰۱) انگریز حکام جو فلاحی کام کرتے تھے، اس کو نمایاں طور پر شایع کرکے اس کی تعریف کی جاتی تھی (ص ۱۰۲) گورنمنٹ نے سرکاری مدارس میں جو رقم خرچ کی اس کا بھی جائزہ لیا گیا اور معلوم ہوا کہ سرکار نے ایک طالب علم کی تعلیم پر سات سو اتالیس روپے نو آنے خرچ کیے۔ (ص ۱۰۳)

روس اور ترکی کی جنگ میں جو سپاہی مارے گئے ان کی بیواؤں اور یتیموں کے لیے امدادی رقوم کا نقشہ شایع ہوا۔ اسی طرح جن اشخاص کو حکومت نے بطور صلۂ خدمت انعامات عطا کیے، ان کے اسما بھی اس اخبار میں شایع ہوئے۔ اس اخبار میں آبادی کے اعداد و شمار بھی شایع ہوئے (ص ۱۰۴) عمدۃ الاخبار میں جن اخباروں کے اشارات شایع ہوئے ان کے یہ نام ہیں۔ (۱) سفیر آگرہ۔ ہفتہ وار۔ صفحات چھ۔ مدیر ناگرمل (۲) مطلع الانوار۔ ہفتہ وار۔ مدیر شیخ عمر گجراتی (۳) مفید خلائق۔ ہفتہ وار۔ تعداد صفحات چھ۔ اردو اور ہندی میں۔ مدیر شونرائن آگرہ (۴) آگرہ اخبار۔ ہفتہ وار۔ اردو اور ہندی میں۔ مدیر کنہیا لال (۵) سحر سامری۔ ہفتہ وار۔ مدیر پنڈت بیجناتھ لکھنؤ (۶) نور علیٰ نور بل تجلی طور۔ ماہانہ میگزین۔ چشمۂ فیض پریس۔ مدیر منشی دیوان چند۔ چندہ سالانہ چار روپے (ص ۱۰۵)

عمدۃ الاخبار کا اجرا ۱۸۴۶ء میں ہوا تھا۔ گارساں دی تاسی کے مقالے کی روشنی میں اس کا ۱۸۵۳ء تک جاری رہنا ثابت ہے۔ وہ کن حالات میں اور کب بند ہوا ہنوز تحقیق طلب ہے۔

مخزن العلوم | اس اخبار کے متعلق گارساں دی تاسی نے اپنے ایک مقالے میں تحریر کیا۔ "یہ رسالہ بریلی سے نکلتا ہے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ادب ہندی و ہندوستانی کی تاریخ (جلد ۳۔ ص ۱۳۲) میں ذکر کیا ہے۔" (مقالات گارساں دی تاسی ص ۹۱)

مخزن العلوم بریلی کے جنوری ۱۸۵۲ء سے دسمبر ۱۸۵۲ء تک کے بارہ شماروں پر مشتمل

ایک جلد نمبر ۸ میرے پیش نظر ہے۔ اس رسالے کے متعلق اہم معلومات اس طور پر ہیں:۔

ماہنامہ۔ تعداد صفحات ۵۲۔ ورق کا سائز لمبائی ½ ۲۲ سینٹی میٹر چوڑائی ۱۵ سینٹی میٹر مسطر ۱۵ سطری۔ کتابت جلی۔ کاغذ سفید چکنا ولایتی۔ سرورق پر طغرائی حاشیہ۔ مدیر یا مرتب کا نام نہیں ملتا۔ من جانب "روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی"۔ "مطبع سوسائٹی میں چھپا" ۱۸۷۲ء میں روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی بریلی کے دو سکریٹریوں کے نام ملتے ہیں۔ جون ۱۸۷۲ء کے شمارے میں منشی گنگا پرشاد ڈپٹی کلکٹر کا نام ملتا ہے (ص ۲۲) اور اکتوبر ۱۸۷۲ء کے شمارے میں لالہ لچھمی نرائن رئیس بریلی کا نام ملتا ہے (ص ۲۲) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخزن العلوم کی نشر و اشاعت کا انتظام روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی کی جانب سے سکریٹری سوسائٹی ہذا کے ہی سپرد تھا اور کوئی علیحدہ سے مدیر مقرر نہیں تھا۔ ان شماروں کو دیکھ کر کتابت و طباعت کی سادگی کا احساس ہوتا ہے۔

چونکہ مخزن العلوم بریلی کے ۱۸۷۲ء کے شماروں پر جلد ۸ مرقوم ہے، معلوم ہوا کہ اس کا اجراء ۱۸۶۵ء میں ہوا۔

مخزن العلوم بریلی میں جو مضامین شایع ہوئے ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر مضامین تاریخی۔ جغرافیائی۔ تعلیمی۔ زراعتی۔ قانونی طبی اور مذہبی موضوعات پر شایع ہوئے۔ مخزن العلوم بریلی میں منظومات و غزلیات وغیرہ بالکل شایع نہیں ہوئیں اور ادبی موضوعات پر جو چند مضامین شایع ہوئے ان کا موضوع لسانیات۔ اخلاقیات اور سماجیات تھا۔ اس عہد کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ادبی مضامین معلوماتی اور دانشورانہ ہیں۔ مثلاً جولائی ۱۸۷۲ء کے شمارے میں ایک مضمون کا عنوان ہے "تحقیق عوارض"۔ اس مضمون میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے" بتاؤ کیا کیا عرض پڑتے ہیں جس سے ایک زبان کا لفظ

دوسری زبان میں آکر بگڑ جاتا ہے۔" مضمون نگار نے اس سلسلے میں دس منقول اور دس معقول عوارض بیان کیے" جو بطور اصل کے چند شعبوں سے منتخب ہو سکتے ہیں"۔ یہ عالمانہ تحقیقی اور افادی مضمون ہے جو اردو اخبار دہلی سے منقول ہوا۔ (ص ۳۵) اخلاقیات کے متعلق دو انشائیے اہم ہیں۔ مئی ۱۸۶۲ء کے شمارے میں مولوی ہدایت علی مہتمم مطبع روہیلکھنڈ سوسائٹی بریلی کا مضمون بعنوان "شرافت و رذالت" اور دوسرا مضمون "شرافت" مولفہ منشی ذکاء اللہ ہیڈ ماسٹر نورمل اسکول دہلی جو مارچ ۱۸۶۲ء کے شمارے میں شایع ہوا (ص ۳۱) اور جس کو اخبار نجم الاخبار سے نقل کیا گیا۔ اس مضمون میں اس شعوری کشمکش کا عکس ملتا ہے جو انگریزی اثرات کی اشاعت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ منشی ذکاء اللہ نے تحریر کیا:

> " ہندوستان میں کئی قسم کی شرافت ہے۔ ایک مخصوص ہنود کے ساتھ۔ دوم مخصوص اہل اسلام کے ساتھ۔ تیسرے جو اہل اسلام اور ہنود کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوئی۔ چوتھے جو انگریزی سلطنت اور تعلیم کے سبب سے"۔ (ص ۳۳)

اس کے بعد منشی ذکاء اللہ نے انگریزی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا:

> " عوام الناس کا یہ قول ہے کہ انگریزی تہذیب اور شائستگی سے تین باتیں ہندوستانیوں میں پیدا ہوئیں۔ ایک بگی دوسری براندی تیسری زناکاری..... (ص ۳۴)

> " میرے نزدیک جن باتوں میں ہمارے باپ دادا شرافت جانتے تھے وہ انگریزی سلطنت اور عدالت کے موافق کبھی قائم نہیں رہ سکتی اس لیے انگریزی عملداری میں کیتلی میں پانی گرم ہوا نیچے کی کدورت اوپر چڑھی جو نیچے کے درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے وہ سیڑھیوں پر بتدریج چڑھ کر گئے اور پہنچ گئے اور جو درجہ اعلیٰ میں بیٹھے ہوئے تھے وہ دھڑام دیسی سے نیچے گر پڑے"۔ (ص ۱۴)

ایسے ادبی مضامین جن میں "مفید عام" گفتگو کی گئی اور بعض عصری سماجی باتوں کو پیش نظر رکھا گیا۔ ان میں مندرجۂ ذیل مضامین کافی دلچسپ ہیں:

۱۔ "اخبار کی آزادی کے فائدے اور نقصان" منقول از نورالابصار۔ (فروری ۱۸۷۲ء۔ ص ۴۴)

۲۔ "مضمون در باب تدارک انسداد فضول خرچی شادی" مؤلفہ منشی اجودھیا پرشاد ہیڈ ماسٹر مدرسہ انگلس گنج، دبریلی (اپریل ۱۸۷۲ء۔ ص ۱۴)

۳۔ "درہو ہمجنسی" مولفہ منشی اجودھیا پرشاد۔ (جولائی ۱۸۷۲ء۔ ص ۲۶)

اس مضمون میں انسانی رشتے پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

۴۔ "ہندوستانیوں کو سرکاری ملازمت کا نہ ملنا"۔ مولف کا نام نہیں ملتا۔ اگست ۱۸۷۲ء (ص ۳۷)

مخزن العلوم بریلی کے جولائی ۱۸۷۲ء کے شمارے میں مولوی محمد عثمان خاں صاحب بہادر مدارالمہام ریاست رامپور کے مرتب کردہ دیوان بدر چاچ کا ریویو شایع ہوا (ص ۴۲) جو اس وجہ سے اہم ہے کہ اس وقت کتابوں کے اشتہار تو شایع ہوتے تھے لیکن ایسے ریویو کی اشاعت شاذ تھی۔

تاریخی مضامین کے سلسلے میں ایک مسلسل مضمون عمارات دہلی پر شایع ہوا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا، اس کا تعین نہیں کیا جا سکا کیونکہ ۱۸۷۲ء سے پہلے کے شمارے فراہم نہیں ہوئے۔ یہ سلسلہ اکتوبر ۱۸۷۲ء میں بند ہوا اور ایک سو چونتیس عمارتوں پہ مضامین قلمبند ہوئے۔ مضمون نگار کا نام نہیں ملتا۔ مضمون نگار نے آخری مضمون میں مسجد روشن الدولہ۔ باغ ناظر۔ مجر محمد شاہ بادشاہ۔ قدسیہ باغ۔ چوبی مسجد۔ سنہری مسجد۔ مقبرہ منصور یا صفدر جنگ۔

کالکا۔ لال بنگلہ۔ مقبرہ نجف خاں۔ جنیوں کا بڑا مندر۔ گرجا گھر۔ جوگ بابا جینیوں کا چھوٹا مندر۔ کوٹھی جہان نما۔ مجمر مرزا جہانگیر۔ ظفر محل یا جل محل۔ ہیرا محل۔ کوٹھی دلکشا۔ باؤلی حضرت قطب شاہ۔ آہنی پل ہیڈن۔ لال ڈگی۔ پل جدید نکمبود پر مختصر تعارفی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان مضامین میں کتبات تاریخ اور طرز تعمیر کو فراموش نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس سلسل مضمون کے علاوہ "کلمبس کا بیان" (مارچ ۱۸۷۲ء)۔ "یادداشت روایات تاریخی بابت کٹھیروں ضلع مرادآباد"۔ "ہندوستان کی مختصر کیفیت" اور بنگال کا حال قدیم" معلوماتی مضامین ہیں جو جون، اگست، دسمبر ۱۸۷۲ء کے شماروں میں علی الترتیب شایع ہوئے۔

تاریخی مضامین میں جغرافیہ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "جغرافیہ زمانۂ قدیم" اس لحاظ سے ایک دلچسپ مضمون ہے کہ اس میں ابی زید، یاقوت، ابن بطوطہ وغیرہ کے سفرناموں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون دسمبر ۱۸۷۲ء کے شمارے میں شایع ہوا اور مضمون نگار کا نام نہیں ملتا۔

ایسے مضامین جن کا تعلق تعلیم کے موضوع پر ہے اچھی تعداد میں شایع ہوئے۔ ان مضامین سے بریلی کالج بریلی (سال تاسیس ۱۸۳۷ء) کی تعلیمی ترقی اور مجموعی طور پر صوبہ شمالی و مغربی (یعنی اتر پردیش) کے صیغہ تعلیم سے وابستہ اعداد و شمار ملتے ہیں۔ "اہل فرانس کی رائے نسبت تعلیم ہند" (اگست ۱۸۷۲ء)۔ "تدبیر ترقی تعلیم نسواں ہند" (اکتوبر ۱۸۷۲ء)۔ "تعلیم عوام الناس پر رائے" (نومبر ۱۸۷۲ء) اس عہد کے حالات کے مطابق تو اچھے شعورانہ مضامین ہیں۔

چند مضامین زراعت کے موضوع پر ملتے ہیں اور مضمون نگاروں کا منشا ترقی

زراعت ہے۔ یہ مضامین ان پڑھ کاشتکاروں کے مقابلے میں زمینداروں کے مفید مطلب ہیں۔

فروری ۱۸۷۰ء کے شمارے میں تین مضامین " مسودہ قانون مجریہ اہل برہم سماج پر رائے دینے کے باب" میں ہیں۔ ان مضامین میں مذکورہ مسودہ قانون اور اس پر رائے کا متن جو روسائے شہر بریلی نے ایک کمیٹی تشکیل کرکے گورنمنٹ کو بھیجی تھی شایع ہوئی۔ اسی شمارے میں ایک مضمون حکیم بدرالدین خاں صاحب دہلوی کا " اسباب کثرحدوث سل اور دق کے بیان میں" (ص ۴۹) شایع ہوا۔

جنوری ۱۸۷۱ء کے شمارے میں ایک مضمون " عبادات" پر ہے۔ مضمون نگار ویدک دھرم کا ماننے والا معلوم ہوتا ہے اور اس کو فارسی ادب و تصوف سے بھی واقفیت میسر ہے۔ اس نے اس مضمون میں، دیگر مذاہب سے تقابل کرتے ہوئے، معرفت الٰہی اور نجات کا ویدک تصور پیش کیا ہے۔ زیادہ دلچسپ بات اس مضمون کا طرز بیان ہے جو فارسی اشعار صوفیانہ اصطلاحات اور ہندی الفاظ کی آمیزش سے ایک دلکش اسلوب کا مظہر بنتا ہے۔ مثلاً:

> " اور ہم بتائے دیتے ہیں کہ اوس پرمشیر کی رضا مندی کی راہ بید کی ہدایت ہے اور ذریعہ مغفرت کا اوس کا دھرم ہے اور پرمشیر کا دھرم وہی ہے جو عام اور بے قید اور قدیم ہے اور اس صفت کا دھرم سوائے ہندو دھرم قدیم کے اور کوئی پایا نہیں جاتا" (ص ۵۵)

مخزن العلوم بریلی کے مذکورہ شماروں میں جن ہمعصر اخبارات کے حوالے ملتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

لارنس گزٹ میرٹھ۔ اخبار انجمن پنجاب۔ اردو اخبار دہلی۔ لکھنؤ ٹائمس۔ اسٹیٹسمین۔

گنجینۂ علوم۔ نجم الاخبار۔ نورالابصار۔ اودھ اخبار۔ اخبار عالم۔ اردو گائیڈ۔ کوہ نور۔ پنجابی اخبار پٹیالہ۔ اکمل الاخبار۔ دہلی اخبار۔ سررشتہ تعلیم اودھ۔ مخبر صادق۔ تہذیب الاخلاق۔ نورالانوار۔ دبدبۂ سکندری۔ اخبار سین ٹیفک۔

مخزن العلوم میں جن علمی مجلسوں کے نام ملتے ہیں، وہ یہ ہیں:

سوسیٹی علی گڑھ۔ سوسیٹی مرزاپور۔ انسٹی ٹیوٹ نینی تال۔ دہلی سوسیٹی۔ سوسیٹی عرب سرائے دہلی۔ ڈبیٹنگ سوسیٹی میرٹھ۔ انجمن لاہور۔ ایسوسی ایشن بنگالہ۔ ایسوسی ایشن مرادآباد۔ روہیلکھنڈ لٹریری سوسیٹی بریلی۔

مخزن العلوم بریلی کے مطالعے سے مندرجہ ذیل باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں:

(۱) ۱۸۵۷ء کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اور انگریزی زبان و ادب، انگریزوں کی علمی و صنعتی ترقی اور ان کی تہذیب و معاشرت کے اثرات پڑنا شروع ہوئے اور مشرق میں ان اثرات کے احساس مطالعے تفکر اور ردعمل کی وجہ سے جو میلانات وجود میں آئے، ان کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصلاحی رجحان تھا اور اصلاح کا تصور یہ تھا کہ تقلید و روایت پرستی کے مقابلے میں آزادروی اختیار کی جائے اور ترقی کے لیے نئے نئے علوم کا مطالعہ کر کے ان سے استفادہ کیا جائے۔ تاہم اپنی تہذیبی و تاریخی روایات سے ناطہ قائم رکھا جائے اور جو امور قابل اصلاح ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔

(۲) اردو زبان بدستور ذریعہ ابلاغ بنی رہی۔ اردو صحافت کے وسیلے سے نئے علوم اور نئے میلانات کی اشاعت ہوئی۔ اخبارات نے جس اردو نثر کی ہمت افزائی کی وہ عام فہم تھی۔

(۳) عمدۃ الاخبار بریلی اور مخزن العلوم بریلی نے ہندوستان کی صحافتی ترقی میں

حصہ لیا اور خود بریلی میں اردو اخبارات کے فروغ کے لیے راہ ہموار کی۔

مخزن العلوم بریلی حالانکہ ماہنامہ تھا لیکن اس عہد کے اخبارات کی طرح اس کی پالیسی اور طریقہ کار ترویج علوم، جدید رجحانات کی اشاعت، مفید اور نئی معلومات کی تبلیغ اور عصری مسائل پر اظہار رائے ہی تھا۔ اس میں نہ غزلیات شایع ہوئیں اور نہ ادبیات اردو پر تنقیدی مضامین۔ اخبارات کی طرح اس کا دائرہ کار مخصوص اور محدود تھا۔

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مخزن العلوم بریلی کب تک جاری رہا۔ مخزن العلوم بریلی کے بعد دو اخباروں کے حوالے راجہ عنایت سنگھ عنایتؔ کے مطبوعہ دیوان میں ملتے ہیں جن کے نام ہیں اخبار دبدبۂ قیصری بریلی اور اخبار مہر منیر بریلی۔ اخبار دبدبۂ قیصری بریلی کا اجرا ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ اس کا مدیر شو برت لال ورمن تھا۔ اخبار مہر منیر کا اجرا ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ یہ دونوں اخبار دستیاب نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان پر مزید گفتگو سر دست ممکن نہیں ہے۔

روہیلکھنڈ گزٹ | یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ چونکہ اخباروں کو ردی کے مول بیچنے کا عام رواج ہے، یہ اخبار بھی دستیاب نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان کے زیر اثر کافی علمی و ادبی سرمایہ ردی کے مول فروخت ہوا یا پھر انتقال مکانی کی وجہ سے دسترس کے باہر ہو گیا۔ محض حسن اتفاق کہ سید عابد مہدی مرحوم (م ۱۹۵۳ء) زمیندار، وکیل فوجداری اور ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول بریلی کے یہاں روہیلکھنڈ گزٹ بریلی شمارہ ۸ مارچ ۱۹۳۰ء مطابق ۶ شوال المکرم ۱۳۴۸ھ کے سرورق کا بالائی نصف حصہ دستیاب ہوا جو ہمارے پیش نظر ہے اور جس سے مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی گئی ہیں:

ورق کی لمبائی اکیاون سینٹی میٹر۔ چوڑائی تینتیس سینٹی میٹر۔ چار کالماں کاغذ سفید چکنا۔ کتابت عمدہ اور جلی۔ سرورق پر جلی قلم سے یہ تحریر ملتی ہے۔

" روہیلکھنڈ کے صدر مقام شہر بریلی کا مشہور آزاد و دلچسپ ہفتہ وار اخبار جو چالیس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے"

اس تحریر سے یہ مستفاد ہوا کہ روہیلکھنڈ گزٹ بریلی ۱۹۰۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے علاوہ شرح قیمت جو سرورق پر شایع ہوئی اس کی چار قسمیں ہیں یعنی والیان ریاست، روسا، وحکام، عام اصحاب اور طلبا سے شرح قیمت علیحدہ علیحدہ مقرر کی گئی۔ شرح قیمت کے طور سے معلوم ہوتا ہے کہ روہیلکھنڈ گزٹ اس عہد کی ریاستوں اور روسا و حکام میں بھی باریاب تھا۔ چونکہ والیان ریاست، امرا اور حکام برٹش راج سے موافقت رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روہیلکھنڈ گزٹ نے معتدل پالیسی پر عمل کیا اور جانبداری ٹکراؤ کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہی اس کی آزاد پالیسی تھی۔

اس ہفتہ وار کے سرورق کے مطابق پروپرائٹر، پرنٹر اور پبلشر کا نام محمد عبدالحمید اور ایڈیٹر کا نام مرزا اثر چغتائی تھا۔

محمد عبدالحمید کا تعلق پنجابیان کی شمسی برادری سے تھا اور وہ مہر الٰہی کلیم مدیر روزنامہ اخبار بریلی کا برادر کلاں تھا۔ شمسی برادری میں ان دونوں بھائیوں کو "بڑے ایڈیٹر" اور "چھوٹے ایڈیٹر" کہا جاتا تھا۔ دونوں نے ہی صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا تھا اور دونوں ہی اپنے پیشے میں کامیاب ہوئے۔

مرزا اثر چغتائی کا نام نوشہ علی بیگ تھا لیکن وہ مشہور اپنے تخلص سے ہوا۔ اس کا مکان محلہ اعظم نگر بریلی میں تھا۔ شاعر۔ ڈرامہ نگار اور مصور تھا۔ اپنے تحریر کردہ ڈرامے خود ہی اسٹیج کرتا اور پردے بھی خود ہی تیار کرتا تھا۔ اس کا تمام سرمایۂ شاعری۔ ڈرامے اور پردے ضایع ہو گئے۔ اس کی وفات ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ ایک ایسے صاحب ذوق کی

ایڈیٹری کسی بھی اخبار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

روہیلکھنڈ گزٹ کے مذکورہ نصف ورق پر جو مضامین اور خبریں شایع ہوئیں انکے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

"شام کے آثار قدیمہ" از سید حفیظ الدین ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا۔ دہلی۔

"زمینداروں کو گول میز کانفرنس میں نمایاں نمائیدگی دی جائے۔ جائداد کی ضبطی کے متعلق کوئی قانون پاس نہ کیا جائے۔"

"گاندھی جی نے ایک انگریز کے ہاتھ اپنا ہوشربا الٹی میٹم روانہ کر دیا۔ آٹھ دن کی مہلت عنایت کی گئی ہے۔ دو ہفتے کے بعد سول نافرمانی کی دھمکی۔"

"گاندھی جی کا الٹی میٹم لاپرواہی کی ٹوکری میں۔ الٹی میٹم کی شرائط منظور کرنا تو درکنار گورنمنٹ گاندھی جی کو مطمئن کرنے کی بھی کوشش نہ کرے گی۔ وائسرائے اور ایگزیکیوٹو کونسل میں مشورے۔"

"سول نافرمانی کس طرح شروع کی جائے گی؟ تین تین والنٹیروں کے جتھے ساحل پر جاکر نمک تیار کریں گے۔"

"شنواریوں نے بغاوت شروع کر دی۔ پشاور کی سنسنی خیز اطلاعیں"۔

"تامبی کے ایک جنگل میں شیر جنگ کی گرفتاری۔ باپ کے کہنے پر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔"

ان خبروں سے جہاں روہیلکھنڈ گزٹ بریلی کی زمینداروں کے مفاد سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے وہاں کانگریس کی تحریک آزادی سے ہمدردی کا بھی احساس ہوتا ہے۔

یہ خبریں بھی کل ہند سطح کی ہیں۔ "شام کے آثار قدیمہ" پر مضمون کی اشاعت سے روہیلکھنڈ گزٹ بریلی اور اس کے قارئین کے اعلی معیار کا ثبوت ملتا ہے۔ خبروں کی سرخیوں کا طور مدیر کی صحافی صلاحیت کا غماز ہے۔

روہیلکھنڈ گزٹ بریلی اور اس کا مطبع تقسیم وطن کے بعد ختم ہوگیا۔ عبدالرشید خاں نے اپنے رشید المطابع۔ نینیتی تال روڈ۔ بریلی سے روہیلکھنڈ گزٹ تقسیم وطن کے بعد ضرور جاری کیا لیکن اخبار اور مطبع دونوں ہی ختم ہو گئے۔ اس وقت یہ طے کرنا مشکل ہے کہ محمد عبدالحمید کے روہیلکھنڈ گزٹ اور عبدالرشید خاں کے روہیلکھنڈ گزٹ میں کیا تعلق تھا۔ دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھے یا دونوں علحدہ علحدہ حیثیت رکھتے تھے، معلوم نہیں۔

آریہ پتر | بریلی میں آریہ سماج کی شاخ ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ آریہ پتر بریلی آریہ سماج بریلی کا ہفتہ وار اخبار تھا جس کا اجرا ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ اس ہفتہ وار نے آریہ سماج کا پرچار کیا، مذہبی اور فلاحی کاموں میں دلچسپی لی اور اردو شاعری کو فروغ بخشا۔ بریلی کے ہندو شعرا جن میں بعض کا شمار صفِ اساتذہ میں کیا جاتا ہے، آریہ سماج سے وابستہ تھے۔ ان شعراء کو نام و نمود دینے میں آریہ پتر بریلی کا بڑا ہاتھ ہے۔ آریہ پتر نے اہلِ ہنود میں اردو شاعری کو مقبول بنایا۔ مثلاً بلدیو پرشاد سوزاںؔ بریلی (م ۱۹۶۴ء) بریلی کے بیشتر ہندو شعراء کے استاذ تھے اور استاذ و تلامذہ سب ہی آریہ سماجی تھے۔

یہ بہت ہی تکلیف دہ اتفاق ہے کہ آریہ پتر بریلی کے فائل محفوظ نہیں ہیں۔ مجھے کوشش بسیار کے بعد صرف ۱۴ جنوری ۱۹۳۲ء کا ایک شمارہ دفتر آریہ سماج بریلی سے فراہم ہوا جو اس وقت پیش نظر ہے۔[۲]

آریہ پتر بریلی کے ساتھ شوبرت لال ورمن (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۳۹ء) کا نام وابستہ ہے۔

جن کی حیات اور تصنیفات پر ایک کل ہند سیمینار ۱۸ اور ۱۹ اگست ۱۹۹۱ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہو چکا ہے۔ شوبرت لال ورمن عین جوانی میں بریلی تشریف لائے اور ہفتہ وار دبدبۂ قیصری (۱۸۸۰ء) کا اجراء کیا۔ اس کے بعد انھوں نے آریہ سماج میں شامل ہو کر ۱۸۹۵ء میں آریہ پتر کا اجرا کیا۔ انھوں نے ہی فروری ۱۹۰۳ء میں بریلی سے "زمانہ" جاری کیا جو بعد کو کانپور سے شایع ہو کر مقبول ہوا۔

ہفتہ وار آریہ پتر بریلی کے ۱۶ جنوری ۱۹۳۲ء کے شمارے میں چھ اوراق تین رنگوں میں ہیں، سفید، ہرا اور گلابی یعنی دو اوراق ایک رنگ کے۔ ورق کی لمبائی چونتیس ۳۴ سینٹی میٹر اور چوڑائی چھبیس ۲۶ سینٹی میٹر ہے۔ ہر ورق میں تین کالم ہیں اور ہر کالم کا مسطر چھتیس ۳۶ سطری ہے۔ کتابت خفی اور طباعت اوسط درجے کی ہے۔ کاغذ چکنا اور ولایتی ہے۔ اس کے منیجر، پرنٹر اور پبلشر کا نام بابو اودھم سنگھ اور مطبع کا نام آریہ اناتھ آلہ پریس زیر کتب خانہ بریلی ہے۔ آریہ پتر بریلی کے سرورق کی تحریر کے مطابق آریہ ساج اناتھالیہ بریلی کا آرگن تھا۔ قیمت سالانہ ۲/۸ (دو روپیہ آٹھ آنہ۔ موجودہ دو روپیہ پچاس پیسے) قیمت ششماہی ۱/۸ (ایک روپیہ آٹھ آنے موجودہ ایک روپیہ پچاس پیسے)۔ سرورق پر آریہ پتر بہ قلم خفی ناگری رسم الخط میں بھی تحریر ہے۔ سرورق پر ہی سوامی دیانند کی وصیت (۱) اناتھ پکار (۲) شانتی اور دھرم کا پرچار مندرجہ ذیل شعر کے ساتھ درج کی گئی ہے ؎

راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں کوئی راہبر آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر آریہ پتر بریلی کے ہر شمارے میں سرورق پر طبع ہوتا تھا۔ اس شعر کے علاوہ مذکورہ شمارے میں کلام نظم نہیں ہے۔ اس وقت یہ طے کرنا کہ کلام نظم صرف مذکورہ شمارے میں نہیں شایع ہوا یا اس سے کچھ پہلے اور کچھ بعد کو

بھی شایع نہیں ہوا، مشکل بات ہے کیونکہ پورا فائل پیش نظر نہیں ہے۔

مذکورہ شمارے سے اس کے مقاصد اشاعت دریافت کیے جا سکتے ہیں جو واضح طور پر دو ہیں۔ (۱) آریہ دھرم کا پرچار (۲) ہندوستان کی تحریک آزادی میں کانگریس پارٹی کی حمایت۔ اس ہفتہ وار میں مقصد اول یعنی آریہ دھرم کے پرچار کے سلسلے میں جو طریقے اختیار کیے گئے ان کا اختصار یہ ہے:

۱۔ ایک کالم میں وید منتر سنسکرت میں شایع ہوا جس کا ارتھ یعنی مطلب اردو رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کالم مستقل معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ وید منتر دعائیہ ہے۔ عمدہ اوصاف حاصل کرنے کی آرزو کی گئی ہے۔

۲۔ آریہ سماج کی کارکردگی کا تذکرہ اور اسی سلسلے میں سات فروری سے نو فروری ۱۹۳۲ء کو بریلی میں ہونے والے کل ہند آریہ سماج اجلاس کے لیے ہم خیال افراد سے معاونت کی اپیل۔ اخبار کا اداریہ بھی اسی موضوع پر ہے۔

۳۔ آریہ سماج اناتھ آلہ بریلی کا سنگ بنیاد ۱۹۰۳ء میں رکھا گیا تھا جس کے ذمے آج بھی ہندو اناتھ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام ہے۔ چونکہ یہ اخبار اسی اناتھ آلہ کا آرگن تھا، اس کے کئی کالم اناتھ آلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک اشتہار میں اناتھ آلہ میں داخلے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دوسرے اشتہار میں شادی کے لایق اناتھ لڑکیوں کے رشتے کی ضرورت شایع کی۔ چندہ دہندگان اور معطیان کی فہرست چار کالموں میں شایع کی۔ پردھان اناتھ آلہ بریلی نے ایک نوٹ آریہ سماج اناتھ آلہ بریلی کی مدد کے لیے شایع کرایا۔

اس اخبار کا سیاسی مقصد یعنی ہندوستان کی تحریک آزادی میں کانگریس پارٹی

کی حمایت کا رویہ اس کی خبروں کے کالم سے واضح ہوتا ہے۔ خبروں کا تعلق کانگریس پارٹی کی جدوجہد آزادی اور اس کی مخالفت میں انگریزوں کی طرف سے کیے ہوئے اقدامات جیسے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، پریس کی ضبطی گرفتاریاں اور سزاؤں وغیرہ سے ہے۔ بریلی کی خبریں زیادہ سطروں میں ہیں کیونکہ اس شمارے میں میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ بریلی کے انتخاب عہدیداران کی رپورٹ بھی شایع ہوئی ہے۔ اخبار کے پانچ کالموں میں "سیاسی صورت حال کے متعلق گورنمنٹ ہند کا بیان" "ناظرین کی دلچسپی کے لیے" شایع کیا گیا، جس کی اس وقت حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ بعض خبریں جیسے "گول میز کانفرنس کی کیٹیاں"، "برما کا مستقبل"۔ "مہاتما جی کو کسی پہاڑی مقام پر تبدیل کرنے کی تجویز" وغیرہ کچھ تفصیلی ہیں۔ ایک مضمون منشی سیتارام کا بعنوان "گورنمنٹ اور اخبارات" شایع ہوا۔

مذہبی اور سیاسی خبروں کے علاوہ عام دلچسپی کی خبریں بھی شایع ہوئیں۔ تجارتی اشتہارات اور عدالتی سمن بھی شایع ہوئے جن کی تعداد بہت افزا ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہفتہ وار خود کفیل اور مقبول تھا۔

آریہ پتر بریلی کے مطالعے کے بعد ایک دلچسپ بات جو سامنے آئی وہ اس کی زبان ہے جس کے تین اطوار ہیں۔ خالص ہندی۔ خالص اردو اور ہندوستانی۔ خالص ہندی سنسکرت آمیز ہے اور مروجہ ہندی کے مقابلے میں سخت اور مشکل۔ اس کو بھی اردو رسم الخط میں شایع کیا گیا ہے۔ مثلاً وید منتر کے ارتھ کا مندرجہ ذیل اقتباس:

"ہے اننت سمن سروپ! آپ متر امتر سمن۔ ڈشٹ سبھاو جن کی ہر پکار کی چیشٹاوں کو سہن کرتے ہو۔ مجھ میں بھی آپ سہن سامرتھ دھارن کراؤ۔ میں بھی سہن شیل ہوں… ہے پتا! شریر۔ اندریہ۔ من اور آتما۔ ان کے تیج آدی گن کبھی

دور نہ ہوں ۔ میں آپ کی بھکتی کا استمرا نوشتھان کروں اور آپ کی انوگرہ سے سنسار میں ساری آیو سکھی رہوں۔" (ص ۲۔ کالم ۱)

خالص ہندی کا ایک اور نمونہ مندرجہ ذیل ہے :

"آریہ جنتا جس مہا سمیلن کے لیے اتسک ہو رہی تھی وہ اب سمیپ ہی آگیا ہے سمیلن کی کیا اویشکتا ہے اس میں ایکترت ہو کر آریہ جن کیا کریں گے ورتمان آرتھک سنکٹ کے سمے بھی اس مہا سمیلن کے کرنے کی کیوں آویشکتا ہوئی کیا واستو میں آریہ سماج سنکٹ میں ہے کیا دیش کی پراستھتی کو لکش میں رکھتے ہوئے ہم سمیلن دوارا کچھ لابھ اٹھا سکیں گے اتیادی پرشنوں پر پرکاش ڈالنے کے نمت کچھ وچار آپ کے سامنے پرستت کیے جاتے ہیں۔" (ص ۸۔ کالم ۱)

اس اخبار میں خالص اردو کے دو نمونے ملتے ہیں۔ ایک وہ نمونہ جو خبروں میں ملتا ہے اور دوسرا وہ ادبی نمونہ جس کا اظہار مضامین میں ہوا۔ اول الذکر نمونے کی مثال یہ ہے :

"لکھنؤ۔ نواب چھتاری ۱۲ر جنوری کو اپنے جدید عہدے کا چارج لے لیں گے۔ خبر ہے سر نظام اللہ خاں ہوم ممبر یوپی مقرر ہوئے ہیں۔ نیز یہ بھی خبر ہے کہ گورنمنٹ کی مالی مشکلات کے باعث تیسرے منسٹر کا تقرر نہ ہوگا" (ص ۱۔ کالم ۲)

"جرمنی کے چانسلر ڈاکٹر برنگ نے ایک اسٹیٹمنٹ نکال کر مشتہری کر دی کہ جرمنی قرضہ ادا کرنے میں بالکل مجبور ہے۔ اس سے یورپ میں سخت ہلچل مچ گئی ہے۔" (ص ۱۔ کالم ۳)

خالص اردو کے ادبی نمونے کی مثال یہ ہے :

"اکثر لوگ از روئے کم فہمی اخبارات کو بدیں سبب کہ جو مضامین اخبارات میں شائع

ہوتے ہیں وہ گورنمنٹ عالیہ کی نظرِ کیمیا اثر کے شرفِ ملاحظہ سے محروم رہتے ہیں وقعت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ بازیچۂ اطفال تصور کرتے ہیں۔ ہم ایسے کوتاہ اندیشوں اور کج فہموں کو آگاہ کرنے کے واسطے کہتے ہیں کہ گورنمنٹ رطب و یابس مضامین مندرجۂ اخبار کو نہیں سنتی بلکہ گورنمنٹ کے ملاحظہ میں ان مضامین کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو پولیٹیکل پیرایے سے مزیّن ہوتے ہیں یا جن میں رعایا کی بہبودی اور بہتری کی تدابیر بتائی جاتی ہیں......" (ص ۲۔ کالم ۳)

اردو ہندی مخلوط زبان کے بھی دو نمونے ملتے ہیں۔ پہلا نمونہ اس تحریر کا ہے جو اپنے طور میں اردو ہے لیکن اس میں ہندی الفاظ شامل کیے گئے۔ مثلاً:

" شری پوجیہ سوامی شردھانندجی مہاراج کی شہادت کے بعد بھی ہم نے یہ پرتگیا کی تھی۔

جو آج بھارت پہ قربان سوامی ہمیں بچہ بچہ کٹانا پڑے گا

دھرم ویر آریہ مسافر شری پنڈت لیکھ رام بلیدان ہو جانے پر بھی اس قسم کے بھاؤ آریہ سجنوں نے پرگھٹ کیے تھے۔ کیا آریہ سجن اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قول کو عملی جامہ پہنایا....." (ص ۳۔ کالم ۲)

دوسرا نمونہ اس تحریر کا ہے جس میں اردو اور ہندی کے اختلاط سے ایک اسلوب کی جھلک پیدا ہوئی جس کو ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

اب میں آریہ جگت کے ان سنیاسی مہاتماؤں نیز عالم مہوپدیشکوں سے بھی گذارش دست بستہ کرنا چاہتا ہوں کہ وے براہِ مہربانی ان ضروری لازمی امور کو جو کہ سدھانت روپ میں اختلاف رکھتے ہوں نیز چھاپہ خانہ کی غلطیوں سے جو آئے دن خوفناک شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں جس کے باعث آریہ ودوان کو مشکلات کا

سامنا شاسترارتھ اور مباحثہ کے وقت کرنا پڑتا ہے اس کو کس طرح سد معاشت
کے مطابق لایا جاوے اس کے متعلق بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنا فرض
ادا کریں.....؟ (ص ۶۔ کالم ۱)

ہفتہ وار آریہ پتر بریلی میں زبان کے ان نمونوں سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی مذہبی اصلاحی اور فلاحی تحریکات میں اردو نے مثبت کردار ادا کیا اور وہ ایک کامیاب وسیلۂ ابلاغ بنی رہی۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ جب ہماری قومی زندگی کے ان عناصر نے جن سے قومیت کی تشکیل ہوئی تھی اپنی اپنی علٰیحدہ پہچان بنانی چاہی تو اس رویہ سے اردو بھی متاثر ہوئی اور وہ جملہ قومی اوصاف سے مزین ہونے کے باوجود بھی اپنی اس ناگزیر حیثیت سے محروم ہو گئی جس کے تحت آریہ سماج کے اخبارات اردو میں شایع ہوتے تھے اور وید منتروں کا ارتھ اردو میں پیش کیا جاتا تھا۔

ہفتہ وار آریہ پتر بریلی ۱۹۴۰ء میں بند ہوا[۴]۔ اس وقت اس کے سرپرست ڈاکٹر شیام سروپ تھے[۵]۔ (باقی)

حواشی

[۱] مرزا نوشہ علی بیگ اثر چغتائی نے گمنامی میں وفات پائی۔ مجھے ان کے حالات ان کے داماد مرزا ایوذ بیگ انور چغتائی ساکنہ مولا نگر بریلی سے بدست ہوئے [۲] مجھے ڈاکٹر شعائر اللہ خاں رامپوری نے اپنے خط مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۹۳ء کے ذریعہ یہ اطلاع دی کہ" مجھے بھی آریہ پتر کا ایک شمارہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دیکھنے کو ملا جو مارچ ۱۹۱۶ء کا شمارہ ہے اور اس پر جلد ۲۰ شمارہ ۳ درج ہے۔ یہ ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے"۔ [۳] آریہ سماج انا تھ آلہ بریلی کے متعلق معلومات دفتر آریہ سماج بہاری پور بریلی سے حاصل کی گئی ہیں [۴] ہمارے استفسار پر جناب

پرتاب چند آزاد بریلوی نے اپنے خط مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۹۳ء کے ذریعہ آریہ پتر بریلی کے بند ہونے کی بابت تحریر کیا کہ وہ ۱۹۴۰ء میں بند ہوا۔ جناب پرتاپ چند آزاد بریلوی آریہ سماج بریلی سے وابستہ ہیں اور رامپور باغ بریلی میں سکونت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر شیام سروپ باعتبار پیشہ فزیشین اور سرجن تھے ۔ انھوں نے ترک و تیاگ میں زندگی بسر کی ۔ لباس بھی بقدر ضرورت زیب تن کرتے تھے ۔ ان کی کا ٹکا پانا فورڈ ماڈل بھی ترک و تیاگ کا نمونہ تھا ۔ ان کو فوت ہوئے چار دہوں سے زیادہ کی مدت گزر چکی ۔

الفاروق (حصہ اول و دوم)

یہ کتاب دو حصوں میں ہے اس میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی اور طرز حکومت کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے حضرت عمرؓ کے روحانی تقدس اور مذہبی عظمت کا ذکر عموماً ہر کتاب میں ملتا ہے لیکن انکے مدبرانہ دماغ نے نظام حکومت کے جو اصول و آئین مرتب کیے تھے اور جو وسیع نظام سلطنت قائم کیا تھا اسکے مختلف شعبوں اور جزئیات صیغۂ محاصل محکمۂ آبپاشی صیغۂ عدالت محکمۂ قضاء، دا افتاء فوجداری اور پولیس بیت المال محکمۂ پبلک ورکس صیغۂ فوج، صیغۂ تعلیم وغیرہ کو علامہ شبلیؒ نے اس کتاب میں بڑی تفصیل اور صحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس طرح یہ کتاب حضرت عمرؓ کی سیرت و اخلاق، فتوحات، حکومت و فرمانروائی کے جاہ و جلال، مساوات و آزادی اور عدل و انصاف کا پورا مرقع ہے ۔

افسوس ہے کہ یہ مایۂ ناز تصنیف عرصہ سے ختم ہو گئی تھی اور بعض خود غرض اور غیر مجاز ناشرین اسے بلا اجازت مسخ شدہ صورت میں معمولی اور ردی کاغذ پر چھاپ کر فروخت کر رہے تھے اسی لیے اہل نظر کو اسکے عمدہ اور اعلیٰ ایڈیشن کا بے چینی سے انتظار تھا الحمدللہ اب دارالمصنفین نے اس کا نیا عکسی ایڈیشن بہت خوبصورت شایع کیا ہے جس کو دیکھکر اہل نظر خوش ہونگے ۔

قیمت: ۹۵ روپیے

طبی عمرانیات کا اسلامی نقطۂ نظر

از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دہلی

اسلامی طبی عمرانیات کی بنیاد فطرتِ سلیم کی تعمیر پر ہے جس کا حصول اخلاقی ضابطوں کو عادتِ ثانیہ بنانے بغیر ممکن نہیں اور اخلاقی ضابطے وہ معتبر نہیں ہو سکتے جو ہمارے سماجی تجربات نے بنائے ہوں یا جن کا مصدر فلسفۂ عمرانیات ہو۔ اسلامی اخلاقیات کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اس لیے اسلام میں سب سے اعلیٰ، اکمل اور دلکش نمونہ سیرتِ طیبہ ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب ۳۳ : ۲۱) اسوۂ حسنہ کے مکمل اتباع ہی میں اسلامی طبی عمرانیات (MEDICAL SOCIOLOGY) کی بنیاد بھی مل جاتی ہے۔

صحت جسمانی کے لیے اعضاء و جوارح کی ظاہری پاکیزگی مطلوب ہے جو طہارتِ باطنی کا زینہ اور قلب سلیم کی ضمانت ہے: "يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ" (الشعراء ۲۶ : ۸۹) بہت سی جسمانی بیماریاں اخلاقی کمزوریوں سے پیدا ہوتی ہیں اور اخلاقی عیوب جسمانی نجاست سے وجود میں آتے ہیں جو خیالات کی پراگندگی اور قلب و دماغ کی سراسیمگی کا باعث ہوتے ہیں۔ نماز کا فائدہ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ "إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ" (العنکبوت ۲۹ : ۴۵) فحشاء، منکر، اور تنہیٰ ان لفظوں نے انفرادی اور

اجتماعی اخلاق کا پورا احاطہ کر لیا ہے۔ زنا کو قرآن نے فحشاء میں شمار کیا ہے: "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا" (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۲)
اس زمانے میں جنسی بیماری ایڈز (AIDS) نے ساری مغربی دنیا میں جو دہشت پھیلا رکھی ہے وہ اسی "فحشاء" کے فروغ کا ثمرہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ساری بشریت کے لیے بہترین نمونہ (مثل اعلیٰ) ہے اور اس میں ایسی جامعیت کبریٰ ہے جس سے امیر، غریب، تاجر، سپاہی، معلم، صناع، اہل حرفہ غرض ہر سالک طریق کو روزمرہ کی زندگی میں ہدایت مل سکتی ہے۔ آپؐ کی زندگی افراد ہی کے لیے نمونہ نہیں ہے اس میں ہماری زندگی کے معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کے لیے بھی رہنمائی موجود ہے: "هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (الجمعۃ ۶۲: ۲) اسوۂ حسنہ میں ہمارے نفوس کا تزکیہ بھی ہے، علم و حکمت کی روشنی بھی، جس سے اعتماد و یقین کی دولت حاصل ہوتی ہے، جسے قرآن مجید اپنی اصطلاح میں "اطمینانِ قلب" کہتا ہے: "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (الرعد ۱۳: ۲۸) یہ اطمینانِ قلب ذہنی اور جسمانی صحت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی عقائد، اعمال و عبادات ہی طبی عمرانیات کی بنیاد بھی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بہترین زندگی وہ ہے جو راہِ حق سے منہ نہ موڑے اور حق پر ثابت قدم رہنے کے لیے صبر کا دامن نہ چھوڑے۔ صبر جہاد و اجتہاد کا طالب ہے، استقامت کی ان شرائط کو پورا کرنے والے ہی صراطِ مستقیم یا جادۂ اعتدال

کے سالک کہے جا سکتے ہیں۔ صحت جسمانی کی اساس تو اعتدال ہی ہے افراط اور تفریط دونوں ہی عناصر کے اعتدال کو درہم برہم کرتی ہیں اور اسی کا نام بیماری ہے اسلام کا پورا فکری نظام فلسفۂ اعتدال پر مبنی ہے اور اسلامی اخلاق کے اتباع سے ہمیں راہِ اعتدال میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔ اگر عقائد اور اعمال میں صفتِ اعتدال موجود ہو تو نظام جسمانی اور اعضاء و جوارح بھی اعتدال کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اتباع کرنے والے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کے حالات و کوائف کتب سیر و تواریخ میں محفوظ ہیں ان میں صدہا وہ حضرات ہیں جنھوں نے سخت ترین مجاہدوں اور ریاضتوں سے بھری زندگی گزاری ہے۔ ہمارے صوفیہ تو قلت کلام، قلت طعام، قلت منام اور قلت الصحبۃ مع الانام کو راہ درویشی کے رہبر اصول بتاتے ہیں، یعنی صوفی کو چاہیے بے ضرورت اور فضول گفتگو نہ کرے، طبی اعتبار سے گفتگو کے دوران ہمارے جسم میں روشنی کے بہت چھوٹے ذرہ (CELLS) خرچ ہوتے ہیں ان کو بچا کر رکھنا تزکیہ و جلائے باطن کیلئے ضروری ہے۔ امراضِ جسمانی سے بچاؤ کی کوئی تدبیر ظاہر ہے کہ "قلتِ طعام" سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ اکثر بیماریاں غذا کی بے اعتدالی اور پُر خوری و شکم پروری ہی سے جنم لیتی ہیں کسی طبیب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا مطب نہ چلنے کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "ہمارے لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک خوب بھوک نہیں لگتی کھانا نہیں کھاتے اور تھوڑی سی بھوک باقی رہتی ہے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں" طبیب نے کہا کہ یہی ان کی صحت کا راز ہے۔ قلت طعام کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز جو بھوک کے عالم میں کھائی جاتی ہے تو ہضم ہو کر جزو بدن بھی بنتی ہے اور اللہ کی دی

ہوئی ہر نعمت کو پورے لطف و لذت کے ساتھ کھایا جاتا ہے، طبی تحقیق سیکڑوں سال پہلے سے اس نتیجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ پُرخوری سے جسم کا وزن اور فضلات غیر متناسب طور پر بڑھتے ہیں اور سبک جسم والوں کی بہ نسبت فربہ اور بھاری جسم والوں کی شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔

"قلّتِ منام" یعنی کم سونے کے طبی فوائد بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ کم سونے والے طویل عمر پاتے ہیں، صوفیہ کہتے ہیں کہ اس فائدہ کو تو معمولی سا حساب جاننے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایک شخص مثلاً دس گھنٹے روزانہ سوتا ہے، دوسرا شب زندہ دار ہے اور مجموعی طور پر پانچ گھنٹے روزانہ سوتا ہے، زندگی وہی ہے جو عالم شعور و بیداری میں گزرتی ہے اس اعتبار سے پانچ گھنٹے سونے والے کی عمر اس شخص سے دوگنی ہوئی جو دس گھنٹے روز سوتا رہا ہے۔"

قلۃ الصحبۃ مع الانام یعنی کم با خلق پیوستن یا "با ہمہ و بے ہمہ" ہونا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ غیر ضروری سماجی روابط نہ بڑھائے جس سے ذہنی الجھن بڑھتی ہے، اعصابی تناؤ (HYPER TENSION) پیدا ہوتا ہے اور انسان ضروری خلوت (PRIVACY) سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ زیادہ بڑھے ہوئے سماجی روابط حرص و ہوس پیدا کرتے ہیں، ذہنی مرکزیت (CONCENTSATION) کا فقدان ہوتا ہے اور اس سے کتنے ہی ذہنی امراض یا نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ اہلِ تصوف کے یہ اصول خود ساختہ نہیں ہیں، قرآن و سنت سے ہی ماخوذ ہیں۔ دوسرے فوائد سے قطع نظر ان کی طبی حکمتیں بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اکثر زہاد، صلحاء، درویش اور سنتِ نبویؐ و اخلاق اسلامی پر کاربند رہنے والی شخصیات عمر طبیعی تک پہنچی ہیں، ان میں شاذ

ہی ایسے لوگ ملیں گے جو کسی موذی یا متعدی مرض میں گرفتار رہے ہوں، ان میں اکثریت ایسے حضرات کی ملے گی جنھوں نے کبھی دوا کا استعمال نہیں کیا، یا بہت ہی اضطرار کے عالم میں کیا۔ مسلسل طبی نگرانی یا دوائی علاج اور پرہیز وغیرہ کا تو بہتوں نے تصور بھی نہیں کیا۔ صوفیہ کی جن مجلسوں کا حال قلم بند کیا گیا ہے ان میں طبیب شاذ و نادر ہی ملتا ہے، بعد کی صدیوں میں کچھ صوفیہ نے نسخے بطور یادداشت لکھنے کی روایت قائم کی ہے۔ سولھویں صدی کے بعد بعض صوفیہ علم طب سے واقف بھی ملتے ہیں۔

اسلام جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے اس کا شعار حکمت ہی ہے اسلیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الحکمۃ ضالۃ المومن" (حکمت و دانائی مومن کا گمشدہ مال ہے) اسلام کا معاشرتی اخلاق صرف فلسفیانہ نظریات سے نہیں، عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان کے مدارج اقرار باللسان، عمل بالجوارح اور تصدیق بالقلب تک وسیع کر دیے گئے ہیں۔ جو نور ایمان قلب کے ریشوں تک پہنچ گیا ہو وہ ہمارے نظریۂ حیات و کائنات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور یہی اسلامی فکر کے آفاقی ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔

معاشرہ افراد سے بنتا ہے، جہاں افراد صالح ہوں معاشرہ لامحالہ متوازن ہوگا۔ اسلام فرد کی اصلاح سے معاشرہ کی تعمیر کا آغاز کرتا ہے۔ فرد کی اصلاح کے لیے نفسانی خواہشوں پر قابو پانا ضروری ہے اس لیے قلب کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ صوفیہ نے قلب کی مسلسل نگرانی کے لیے "مراقبہ" اور توجہ باطنی کا طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ وہ قلب سے گزرتے ہوئے خیالات و خواہشات کی رو (جسے عربی میں "خواطر" کہا جاتا ہے) کا احتساب کرتے رہیں۔ خواہشات پر قابو پانے کی ایک

صوفیانہ تاویل یہ بھی ہے کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے: "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (التوبۃ ۹ : ۱۱۱) بائع کے لیے اس چیز کا مالک ہونا ضروری ہے جسے وہ فروخت کر رہا ہے۔ مجاہدات کے ذریعہ نفس کو قابو میں رکھنے کا یہی جواز ہے۔

لیکن طبی اعتبار سے بھی ضبط نفس' احتساب' خواہشوں پر قابو یا نفس کشی کی بڑی اہمیت ہے' صدہا بیماریاں وہ ہیں جو بیمار خیالات سے پیدا ہوتی ہیں جنھیں اب نفسیاتی معالج (PSYCHIATRIST) خیالات ہی کو رو براہ کر کے ٹھیک کرتے ہیں۔

اسلام وسائلِ حیات کو اجتماعی ملکیت سمجھتا ہے' ساری کائنات قانون فطرت کی تابع ہے اور قانون فطرت میں تغیر و تلون نہیں ہے (فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا" فاطر ۳۵ : ۴۳)

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند	تا تو نانی بکف آری و بغفلت نخوری
چوں ہمہ گشتہ مسخر پئے فرمانِ تو اند	شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات چرند' پرند' حشرات الارض اور آبی جانور جو فطری اصول سے قریب تر زندگی گزارتے ہیں ان کے روزمرہ کے معمولات حتیٰ کہ توالد و تناسل کے اصول بھی کچھ فطری ضابطوں کے پابند ہیں اس لیے ان میں وہ سیکڑوں بیماریاں نہیں پائی جاتیں جو انسان کے پیچیدہ تہذیبی معاشرہ کی پیداوار ہیں۔ وہی حیوان زیادہ بیمار ہوتے ہیں جو انسان کے مصنوعی غیر فطری معاشرہ سے قریب تر رہتے ہیں۔ اسی طرح انسانی معاشرہ میں ایسی بہت سی اخلاقی بیماریاں ہیں جن سے عالمِ حیوانات

قطعاً آشنا نہیں۔ اسلام نے ایسی اخلاقی بیماریوں کی سختی سے مخالفت کی ہے مثلاً شراب خوری، زنا کاری، قمار بازی، ہم جنس پرستی، سود خواری وغیرہ، یہ معائب بہر حال مسلمانوں کے معاشرہ میں ان اقوام کی بہ نسبت کمتر ہیں جن کو اس کے لیے مذہبی رخصت بھی حاصل ہے۔

اسلام نے معاشرہ کے لیے جو لازمی اصول وضع کیے ہیں وہ تمام تر طبی حکمت پر مبنی ہیں اور ان کی پابندی کرنے والے اشخاص میں غیر معمولی روحانی قوت اور مدافعت پیدا ہوتی ہے جو ہر قسم کے خبائث کو دور رکھتی ہے۔ علم طب کا مقصد بھی محض فرد کی صحت کی نگہداشت کرنا نہیں ہے یہ ہمارے معاشرہ کی بقا، صحت و سلامتی اور اس میں فطری اعتدال و توازن کے قیام کی ضمانت دیتا ہے اس لیے علم طب کے دائرۂ اثر میں ہماری زندگی کا ہر شعبہ آجاتا ہے۔ علم طب سے ہمارا تعلق مضغۂ جسم میں نفوذ روح سے بھی پہلے سے قائم ہوتا ہے اور یہ مرنے کے بعد آخری رسوم ادا ہونے تک قائم رہتا ہے۔ چنانچہ طب کو جہاں اس سے تعلق ہے کہ بچہ صحت مند، توانا اور خوش شکل پیدا ہو وہیں وہ اس کی نگرانی بھی کرتی ہے کہ جسد مردہ کو کس طرح طبی اصول کے تحت دفن کیا جائے کہ وہ جسد بھی مفاسد سے محفوظ رہے اور اس کے سبب سے ماحول میں بھی عفونت اور آلودگی پیدا نہ ہو۔

اسلام کی طرح علم طب بھی صحت مند معاشرہ کی تعمیر کے لیے افراد کا صحت مند ہونا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے شراب اور زنا کو بدترین جرم قرار دیا ہے اور اس کی سزا بھی سخت عبرت انگیز رکھی ہے۔ اس کو اسلامی طبی عمرانیات اور گہرے حکیمانہ معاشرتی و اخلاقی شعور ہی کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ حال ہی میں واشنگٹن کے

دماغی صحت پر ریسرچ کرنے والے قومی ادارہ کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ امریکا میں ۲۰% فی صد آبادی دماغی خلل کا شکار ہے اور اس کا سب سے بڑا سبب شراب ہے جس کا اثر بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما پر پڑتا ہے۔ دماغی امراض کی ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر کیرول سی اینڈ لسن کا کہنا ہے کہ امریکا میں تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ اسکولی بچے کسی نہ کسی قسم کے ذہنی خلل کا شکار رہیں۔ اس کا سبب اعصابی تناؤ، جنسی بے راہ روی، طلاقوں کی کثرت اور نشیلی ادویہ کا استعمال ہے۔ پچھلے سال "آل چائنا ومن فیڈریشن" نے اپنی سالانہ روداد میں کہا تھا کہ چینی عدالتوں میں پیش ہونے والے طلاق کے مقدموں میں ۲۵ فی صد کا سبب زناکاری کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ چینی قانون میں زناکاری قابل تعزیر جرم نہیں ہے۔

اسلام کے حکیمانہ تمدن کی گرفت جنسی زندگی کے لمحۂ اولین سے شروع ہوتی ہے اور مرنے کے بعد تجہیز و تکفین تک ہی نافذ نہیں رہتی بلکہ یہاں آخرت کا تصور بھی ہے جس میں تمام اعمال کا محاسبہ ہوتا ہے۔ فن طب اور اسلام کا دائرۂ اثر خاصے طویل زمانے تک مشترک اور متوازی رہتا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ اسلام جن معاشرتی قوانین کو وحی الٰہی سے اخذ کر کے نافذ کرتا ہے علم طب انہیں فطری اصولِ حیات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

اس کائنات میں فطرت کی تمام نعمتیں عام اور ارزاں ہیں۔ زندگی سب انسانوں بلکہ ہر ذی روح کو یکساں اصولِ فطرت کے تحت ملی ہے، سب کی جبلتیں یکساں ہیں، ضرورتیں ایک سی ہیں، جو غیر صحت مند عناصر ہم دیکھتے ہیں وہ ہمارے تصورات اور طرزِ فکر سے اپجتے ہیں۔

یہ تصورات خواہ حیات و کائنات کے بارہ میں ہوں یا زندگی اور اخلاقیات کے رشتے سے تعلق رکھتے ہوں۔ انہیں سے ہمارے معاشروں میں اختلاف پیدا ہوا ہے اور ان اختلافات نے وسائلِ حیات سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی مختلف کر دیے ہیں اس سے طرز بود و ماند میں ناہمواری پیدا ہوئی ہے، کچھ عیوب و اسقام وسائل کی افراط سے اور کچھ ان کی تفریط سے پیدا ہوتے ہیں، اسلام کا نظریۂ طبی عمرانیات کسی غیر متوازن اور ناہموار معاشرہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

جسمانی صحت اسی وقت مکمل سمجھی جائے گی جب ذہن پوری طرح بالیدہ ہو اور ایک بالیدہ ذہن تعمیر پسند اور متوازن ہوگا وہ زندگی میں حقیقی مسرت اور مصنوعی مسرت کے فرق کو بھی جانتا ہوگا۔ اسلامی تعلیمات کا ارتکاز ہی ذہن کی نشو و نما کرنے پر ہے۔ اسلام میں فرد کے لیے سب سے پہلی تاکید طہارت جسمانی کی ہے جو طہارت باطنی کا زینہ ہے۔ فقہ اسلامی کی کتابوں میں غسل و طہارت کے احکام پوری جزئیات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، ایک ایسے ملک (جزیرۃ العرب) میں جہاں بعض علاقوں میں پانی گوہرِ نایاب کا حکم رکھتا تھا، غسل و طہارت کے مسائل پر اتنا زور دینا خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام ایک حکیمانہ تمدن کی بنیاد رکھ رہا ہے۔

طہارت جسمانی کے بعد نماز کی ظاہری شکل میں بھی جسم انسانی کے لیے ایسی بنیادی ورزش موجود ہے جو اس کے اعصابی تناؤ کو کم رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

روزہ کی طبی افادیت پر تو دلیلیں دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ جدید علم طب بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ جسم کی سمیت کو زائل کرنے اور طبیعت مدبرۂ بدن کو توانائی پہنچانے کے لیے روزہ سے زیادہ مفید اور موثر کوئی اور عمل نہیں ہو سکتا۔ ماہِ رمضان قمری

تقویم سے آتا ہے اس لیے ہر سال اس کا موسم اور درجۂ حرارت بھی بدلتا رہتا ہے اور ہر موسم کے منفی اثرات کا ازالہ اور جسم کا تنقیہ ممکن ہو جاتا ہے۔ روزہ کے احکام میں بڑی حکمت طبی ہی رکھی گئی ہے تاکہ معاشرہ صالح اور صحت مند رہے ورنہ ظاہر ہے کسی کے فاقہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " أغْزُوا تَغْنَمُوْا وَصُومُوْا تَصِحُّوا (رواہ الطبرانی) یعنی جہاد کرو تاکہ تم مالدار ہو جاؤ اور روزہ رکھو تاکہ تمہاری صحت بنی رہے۔

روزہ کی ابتدا کے لیے صبح صادق سے پہلے بیدار ہونا اور عام دنوں میں بھی نماز فجر کے لیے علی الصباح بیدار ہونا بھی طبی حکمت سے خالی نہیں ہے اور اس پر عمل کرنے والے ہی بنفشی شعاعوں (ULTRAVIOLET RAYS) سے تمتع حاصل کر سکتے ہیں۔ سحر خیزی کی تاکید میں جو کچھ قرآن کریم اور احادیث میں وارد ہوا ہے اس کو ہم اسلام کے نظریۂ طبی عمرانیات کی روشنی میں بھی مطالعہ کر سکتے ہیں

اوراق متفرقہ در حدوث علم کلام

از جناب انور شاہ صاحب علی گڑھ

اس عنوان سے مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں ایک رسالہ ہے۔ اس کا نمبر حوالہ یونیورسٹی کلکشن اردو مخطوطات نمبر ۲۸۴ ہے۔ مصنف کا نام رسالہ کے متن کتاب میں تو کہیں مرقوم نہیں ہے۔ نہ رسالہ کے آخر میں کوئی ترقیمہ ہے جس سے اس کا پتہ چل سکے۔ لیکن فہرست مخطوطات میں محمد رضا دیا ہوا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مولانا سید محمد رضا ترمذی کی تصنیف ہے ان کا وطن قنوج ضلع فرخ آباد تھا۔ وہ اور ان کے بھائی مولانا سید علی نقی صاحب مدرس کیننگ کالج لکھنؤ اپنے وقت کے ممتاز مدرسین میں تھے۔ مصنف شمس العلماء مفتی سید محمد عباس (م ۱۳۰۶ھ) کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس مجموعہ کے علاوہ ان کی مزید تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) زینۃ المجالس (۲) در نجف (۳) روضۃ الادب (۴) کشف الزاھیہ شرح زیارت ناصیہ (۵) شرح زیارت مضجعہ۔

زیر نظر مجموعہ میں حسب ذیل رسائل شامل ہیں۔

(۱) اوراق متفرقہ در حدوث علم کلام (۲) رسالہ بنیاد اسلام۔ (۳) جواب امہات المومنین (۴) رسالہ در بطلان در عقد ام کلثوم۔

اوراق متفرقہ درحدیث علم کلام پندرہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں نو ۹ سطریں ہیں۔
اس مخطوطہ کا سائز ۵ × ۱۰ اور ۷ × ۷ ہے اور تحریر کا سائز ۵ × ۸ و ۵ × ۵ ہے۔
سن تصنیف وکتابت بھی معلوم نہیں، البتہ مصنف نے ایک جگہ غفران مآب کی "عماد الاسلام" کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"جو بالفعل چھاپہ ہو رہی ہے۔"

اور چونکہ عماد الاسلام کا سنہ طباعت ۱۳۰۲ھ ہے۔ اس وجہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس رسالہ کا سن تصنیف نیز سن کتابت بھی تقریباً یہی ہوگا۔

رسالہ کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے علم کلام کی ابتدا و ارتقاء کی تفصیل ہے۔ بدقسمتی سے ہماری نئی نسل کا رشتہ اپنے ماضی سے اس درجہ منقطع ہو چکا ہے کہ اپنے اسلاف کی جگر کاویاں اس کے لیے بھولی بسری داستانیں بن چکی ہیں۔ اس لیے وہ علم کلام کی حقیقت سے بالکل ہی ناآشنا ہے اور جو لوگ اس سے کسی قدر واقف ہیں، ان کا اشتغال محض فضول اور لایعنی بحثوں سے رہ گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ علم اسلامی ثقافت کا شاندار کارنامہ تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد دینی تعلیمات کی عقلی توجیہ تھا۔ جیسا کہ اس رسالہ کے مصنف نے لکھا ہے:

"ہر علم کا شرف موضوع علم کے شرف پر مبنی ہوتا ہے، علم کلام کا موضوع نوامیس شرعیہ ہیں، جن کا پورا پورا تعلق نفوس بشریہ سے ہے جو اشرف مخلوقات ہیں، جس طرح علم طب کا موضوع ابدان بشری ہیں۔ اس بنا پر صناعت طب کا شرف اس کے موضوع کی شرافت کی وجہ سے ہے۔ علم کلام کا موضوع نفوس بشری کے امراض کا علاج و تداوی ہے۔"

ظاہر ہے جب اصل علم ہی کی حقیقت معلوم نہ ہو تو پھر اس کے آغاز و ارتقا کا حال کیسے معلوم ہو۔ علاوہ ازیں اس سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے۔ قدیم عربی کتابوں میں متکلمین کے تذکرے ضرور ملتے ہیں، مگر علم کلام کا کوئی منظم جائزہ نہیں ملتا۔ صرف اس فن کی بعض مطوّلات اور تاریخ کی کتابوں میں جستہ جستہ حوالے ملتے ہیں۔ مگر انہیں مربوط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس موضوع پر یورپی مستشرقین کی "تحقیقات انیقہ" کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

اردو زبان میں علم کلام کی پیدائش اور اس کے تدریجی ارتقا پر باقاعدہ کتاب کی تصنیف کا شرف اولیت مولانا شبلی نعمانی کو پہونچتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں مولانا شبیر احمد خاں غوری نے اس موضوع پر بڑے تحقیقی مقالے لکھے جو برصغیر کے مختلف رسائل و جرائد معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، ثقافت لاہور، فکر و نظر اسلام آباد، اسلام اور عصر جدید دہلی، میں چھپے لیکن ان میں جس تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے اس سے اس فن کے طلبہ و ماہرین ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے یہ زیادہ مفید نہیں ہیں۔

پیش نظر رسالہ کے مصنف نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ علم کلام میں بعض متنازع فیہ مسائل ایسے ہیں جہاں لکھنے والے کے لیے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ خلافت جس کی نزاع نے چودہ سو سال سے امت کو دو متحارب فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جن کے مفسدہ سے بیزار ہو کر مولانا روم فرماتے ہیں:

سرّ حق کے بر تو گردد منجلی　　　اے گرفتار ابوبکر و علی

اور پھر اسی سلسلہ میں پہلے تین خلفائے ثلثہ کی خلافت کی صحت و عدم صحت کی نزاع آتی ہے۔ مگر مصنف نے جس خوش اسلوبی سے اس مسئلہ کو سلجھایا ہے اسے دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ایک بڑی جماعت کا سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوکر استحقاق خلافت کے مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرنا جبکہ ایک دوسری جماعت کے ارکان سرور کائنات کی تجہیز و تکفین کے فریضہ کی ادائیگی میں منہمک تھے اس کے متعلق مصنف رقمطراز ہیں :۔

"جب سنہ ۱۱ھ میں دور نبوت کا ختم ہوا اور آفتاب رسالت افق وصال حقیقی الٰہی میں غروب فرما گیا ابھی نوبت غسل و کفن آنحضرت کی نہیں آئی تھی کہ علم خلافت اسلام کا سقیفہ بنی ساعدہ میں (جو ندوہ تھا انصار کا) سربلند ہوا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اعلان کو ایک اثنا عشری صاحب قلم کا یہ لکھنا کہ "علم خلافت اسلام کا .... سربلند ہوا"

اسکی سلامت روی کی دلیل ہے اور اس سے زیادہ پہلے تین خلفائے راشدین کے دور خلافت کو یہ کہنا کہ :۔

"سنہ ۱۱ھ سے سنہ ۳۵ھ تک برابر چوبیس سال اس کا پھریرا اور پرچم دست بدست از خلافت اول تا خلافت سوم عالم کے اکناف میں لہرایا گیا"

مصنف کے کمال بے تعصبی کا مظہر ہے۔

اس رسالے کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے :۔

"دین اسلام دین برحق ہے۔ جس کی بنیاد عقل و نقل پر ہے۔ اس کی اصول و فروع

اور اس کی مسائل و احکام سب کے سب مبنی عقل و نقل پر ہیں۔"

آگے چل کر وہ کفار کی سختیوں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اہل طائف نے اہل مکہ سے زیادہ سختیاں کیں مجروح کیا۔ جفاؤں کے ساتھ طائف سے عود کیا۔ پھر مکہ میں آئے۔ بعد چندی اہل مکہ کو آمادہ قتل دیکھ کر مدینہ کو ہجرت کی۔ سال اول ہجرت ساتھ خیر و عافیت کے گذرا۔ سال دوم ہجرت سے جنگ و جدال و حرب و قتال شروع ہو گیا۔ متواتر غزوات و سرایا کی نوبت آئی۔ سال نو ہجری تک فتوحات کی بدولت اسلام نے نمو دار ترقی کی۔ مورخین نے ترقی کی حد یہ لکھی ہے کہ آنحضرت نے نو برس کے عرصہ میں ہدایت کی فرمانیں علاوہ شاہ حبش و ہند وغیرہ کے اپنے دو ہمسایہ شہنشاہ قیصر روم و ایران کے نام نافذ کیے۔ جنکی حدود ممالک شاہنشاہی حدود عرب سے ملی ہوئی تھی اور ایک ذرہ بھر بھی ان دونوں کے افواج قاہرہ کا خیال نہ کیا۔"

آگے چل کر خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے دور میں علوم و حکمت میں جو ترقیاں ہوئیں ان پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:-

"دولت بنی امیہ و بنی عباس یکی بعد دیگری مستحکم ہوئے اور ہر امر میں مسلمانوں نے ترقی شروع کی خالد بن معاویہ بن ابی سفیان نے پہلے پہل حکمت فلاسفہ یونان کا ترجمہ عربی زبان میں عبری زبان سے شروع ہو گیا اور اس حکمت کی براہین قیاسی اور دلائل جدلی اہل اسلام کو پسند آنے لگی تھی۔ زیادہ تر دولت بنی عباس میں کتب حکمیہ کا ترجمہ ہوا۔ مقاصد نظریات فلسفہ کی بدولت مسلمانوں میں اوہام و شکوک

معارف ربانی اور حقائق ایمانی میں بکثرت پیدا ہوئے۔"

علم کلام میں جب مسلمانوں کی دلچسپی بڑھی اور انھوں نے اس میں کمال پیدا کیا تو بہت سے طبقات پیدا ہوئے۔ لکھتے ہیں :-

"علم کلام اہل اسلام کی ترقی کا یادگار ہے۔ ہر ایک علم کا شرف موضوع علم کی شرف سے ہوتا ہے۔ موضوع علم کلام نوامیس شرعیہ الہیہ ہیں اور غایت وضع علم کلام حفاظت اوضاع واصول وفروع دین اسلام ہیں اور مسائل اس کی ضروریات دین اور احکام شرع متین ہیں۔ اس کا موضوع اور غایت وضع اور اس کی اصول و فروع اور اوس مسائل مغائر اور مخالف حکمت فلاسفہ مشائین ہیں۔ اسلام میں علم کلام مقابل حکمت مشائین کے وضع اور ایجاد ہوا ہے۔ اس علم کے واضعین نے کتب رد میں حکمت مشائین کے تصنیف کی ہیں اور نام انکا تہافتہ الفلاسفہ رکھا ہے۔ خیالات فلاسفہ کا تہافت دلایل فلسفی اور براہین حد سے کیا ہے۔ فلسفہ مجموعہ ہے خیالات حکما اور فلاسفہ کا جن کے معلم عقل ہے جس میں خطا ممکن الوقوع ہے اور حکما الہیہ کا معلم خالق عقول عشرہ ہے جو بالذات علیم حکیم ہے۔"

ان فرقوں کے باہمی خیالات کے تضاد نے عجیب فتنہ کھڑا کر دیا اور ہر گروہ نے خود کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہوئے اپنے عقائد اور نظریات کو کامل و اکمل خیال کرنا شروع کر دیا۔ مصنف لکھتے ہیں :-

"سوفسطائیہ سے زیادہ بی عقلی کی دلیل ہے۔ جو محسوس و معقول کے قائل نہیں ہیں۔ علم تصوف یہ علم مقابل حکمت اشراقین اسلام میں وضع ہوا ہے۔ موجد حکمت اشراق افلاطون الٰہی ہے۔ اس حکیم نامور نے خیال کیا جاتا ہے کہ حکمائے ہند سے جنکو

براہمہ کہتے ہیں (براہمہ جمع برہمن ہے جو پنڈت کہلاتے ہیں) اور موجد جوعلم جوگ کے ہیں یہ علم حاصل کیا اور اس کا نام حکمت اشراق رکھا اور اہل اسلام نے علم تصوف کہا ہے۔ اس علم کی مذمت عقلاً و نقلاً ثابت ہے۔ اس کی غایت وضع وحدتِ موجود ہے اور موضوع اس کا ذات مقدس واجب الوجود ہے اس کا حلول اور اتحاد ممکن الوجود سے وحدت موجود ہے۔ شہاب الدین مقتول سہروردی مترجم اور موجد حکمت اشراق ہیں اس حکمت اشراقی نے اولیاء اللہ کا گروہ اسلام میں ظاہر کر دیا ہے۔"

آگے چل کر علم کلام کے سلسلہ میں جو کچھ غفران مآب نے کہا ہے ان کی تائید اور انکے قول کو حتمی مان کر ان کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں :۔

"حضرت غفران مآب حجۃ الاسلام اعلی اللہ مقامہ نے کتاب عماد الاسلام میں جو بالفعل چھاپہ ہو رہی ہے اس میں محققانہ طور سے ثابت کر دیا ہے کہ علم کلام ممدوح و مقبول ایمہ اسلام علیہ السلام تھا اور بہرکیف علم کلام کی دلائل و براہین مرکب ہوتی ہیں۔ مقدمات یقینیات اور مسلمات اور مشہورات سے جتنے مقاصد و مطالب و مسایل کلامیہ ثابت کی جاتی ہیں۔"

علم کلام کی ابتدا کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"کتب سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جب اسلام میں فلاسفہ کی حکمت شایع ذائع ہوئی اور اس کا خراب اثر نوامیس الہامی اور احکام الٰہی پر پڑنے لگا حامیان دین اسلام کے ذی عقل گروہ نے علم کلام کو ایجاد کیا۔"

معتزلہ کی حقیقت اور ان کے عقائد کے بارے میں بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :۔

" منجملہ ان تلامذہ کے واصل بن عطا تھا۔ ایک دن واصل نے حسن بصری سے سوال کیا کہ مرتکب کبیرہ کا نہ مومن ہے نہ کافر۔ ضرور اس کے لیے ایک درجہ ہوگا درمیان درجات مومن اور کافر کے۔ کیونکہ مومن ہونا مدح وصف ہے اور کافر مستحق مدح نہیں ہے۔ پس ارتکاب کرنے والا گناہان کبیرہ کا نہ مومن ہو سکتا ہے اور نہ وہ بوجہ اقرار شہادتین (بغیر کلمہ توحید و رسالت) اور سائر اعمال خیر کافر کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا شخص بلا توبہ و انابت مرجاوے جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔ اس لیے کہ آخرت میں دو فریق ہونگے۔ ایک فریق بہشت میں ہوگا اور دوسرا دوزخ میں ہوگا مگر ساتھ تخفیفِ عذاب پس اس کا مقام بالاتر مقام کفار سے ہوگا۔ . . . اے واصل ہم سے تو اعتزال اور گوشہ نشینی اختیار کر۔ اس وقت سے واصل نے اسی مسجد کے دوسرے ستون کے پاس جداگانہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور شاگرد و استاد میں مخالفت کا ہنگامہ ترقی پذیر ہوا اور تصنیف کتب اور تدوین اصول و قوانین کی نوبت آئی اور انہیں اصول اور قوانین کا نام علم کلام رکھا گیا اور واصل اور پیروان واصل کو معتزلہ کا لقب ملا۔"

آگے اشاعرہ اور ان کے مذہب اور عقائد کا ذکر تفصیل کے ساتھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

" تین بھائیوں میں ایک ان میں سے مطیع و فرمانبردار اور دوسرا عاصی اور گنہگار اور تیسرا صغیر اور کمسن مرا۔ کہا فرمانبردار ساتھ بہشت کے مثاب ہوگا اور عاصی ساتھ آتش دوزخ کے معذّب ہوگا اور صغیر نہ مثاب نہ معذّب ہوگا۔ اشعری نے کہا کہ اگر صغیر و نابالغ خدا سے کہے کہ اے خدا اگر تو مجھ کو باقی رکھتا یہاں تک کہ میں بڑا ہوتا۔ ساتھ تیرے میں ایمان لاتا اور تیرا اطاعت کرتا اور بہشت میں داخل

ہوتا۔ اس وقت خدا کیا جواب دے گا جبائی نے کہا کہ خدا کہے گا کہ میں بڑا جاننے والا ہوں تجھ سے۔ اگر تو بالغ ہوتا تو البتہ میرا عصیان کرتا اور داخل دوزخ ہوتا۔ اشعری نے کہا کہ اگر دوسرا بھائی کہے کہ اے خدا تو نے کم سنی میں کیوں مار ڈالا تا کہ میں تیری نافرمانی نہیں کرتا تو خدا جواب دے گا جبائی چپ ہوگیا۔ اشعری نے ترک مذہب اعتزال کیا۔ مورخین نے کہا ہے کہ اشعری نے جداگانہ مذہب قائم کیا اور نام مذہب کا اشعریت ہوا"۔

حضور اکرمؐ نے فرق اسلام کی کثرت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" ایک اہل سنت والجماعت دوسرا شیعہ تیسرا معتزلہ چوتھا اشاعرہ رفتہ رفتہ تہتر (۷۳) فرقے پیدا ہو گئے اور خوارج بھی جن کو مارقین کا لقب ملا تھا مع ناکثین وقاسطین کہ اول صدی میں ظاہر ہوئے جملہ سات فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرقہ قدریہ کے متعلق پیشین گوئی ساتھ مذمت کے فرمائی ہے اور ارشاد کیا ہے کہ مجوس اس امت کا فرقہ قدریہ ہے۔ شرح مواقف میں ہے۔ قیل القدریہ ہم المعتزلہ لاستنادا فعالہم الی قدرتہم (کہا گیا ہے کہ قدریہ معتزلہ ہیں استناد افعال عباد طرف قدرت عباد کے کرتے ہیں) اور فرقہ جبریہ استناد افعال عباد حق تعالیٰ کی جانب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندہ مجبور ہے۔ خیر و شر خدا کی جانب سے ہے۔ جس طرح معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ فاعل مختار ہے۔ اس جبریہ فرقہ کی مذمت کی۔ پس معتقدات معتزلہ قدریہ اور اشاعرہ جبریہ سراسر خلاف عقل ہیں۔ معتزلہ مفوضہ کا یہ مقولہ کہ عباد کو

فاعل مختار پاناکہ امور خیر و شر تفویض کردی ہیں۔ قادر مطلق کا بے کار اور معطل ہونا ثابت کرتا ہے اور مقولہ اشاعرہ جبریہ سے خدا کا ظالم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ محققین اسلام نے اس اختلاف بے عقل کا فیصلہ بدیں تفصیل کیا ہے۔ لا جبر و لا تفویض بل امر بین امرین۔ (نہ جبر ہے نہ تفویض ہے بلکہ امر درمیان میں جبر تفویض کے ہے) جس سے مراد ان کی یہ ہے کہ افعال عباد در بندۂ مخلوق عباد میں بے واسطہ اور مخلوقِ خدا میں بواسطہ مانند سائر موجودات عالم کی از روئے نظر و بصائر اسباب موجودات پس وہ اسباب موت و حیات و رزق وغیرہ وغیرہ ہیں، جو بواسطہ خالق ہوتے ہیں۔"

اس رسالے میں مصنف نے جا بجا اپنے خیالات اور عقائد بھی پیش کیے ہیں اور اسلامی فرقوں خصوصاً معتزلہ اور اشاعرہ کے عقائد تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس سے مصنف کی نظر کی گہرائی اور گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ گو رسالے کی زبان قدیم و متروک اور بیان میں بھی کسی قدر بے ترتیبی ہے تاہم اس کی علمی اہمیت ہے۔

الکلام

علامہ شبلیؒ کی یہ مشہور تصنیف ہے جس میں عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیا ہے اور ملاحدہ اور منکرین کے دلائل کا رد کیا ہے اور عقائد و اصول اسلامی کی فلسفیانہ تشریح کی ہے۔ اس حصہ کی قیمت ۵۰ روپے ہے۔

اس کا پہلا حصہ جو علم الکلام کے نام سے موسوم ہے اور اس میں مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ اس کی عہد بعہد کی ترقیاں اور علمائے متکلمین کے نظریات اور مسائل پر بحث کی گئی ہے، اس کا نیا ایڈیشن جلد چھپ جائیگا۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن فہمی آسان راستہ (حصہ دوم): مرتبہ ڈاکٹر حسن الدین احمد تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۸۰، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: عزیز باغ، عزیز جنگ روڈ، سلطانپورہ، حیدرآباد۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی۔ اے۔ ایس اردو کے اچھے مصنف و مترجم ہیں، اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز رہنے کے باوجود انھوں نے علم و فن سے بھی اشتغال قائم رکھا اور متعدد مفید کتابیں لکھیں، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ قرآن مجید کے مطالعہ و تحقیق کا کام انجام دے رہے ہیں، ان کی کتاب قرآن فہمی (حصہ اول) کا تذکرہ ان صفحات میں پہلے ہو چکا ہے اب اس کا یہ دوسرا حصہ شایع ہوا ہے، اس میں اصلاً قرآن مجید کی اصطلاحات و الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے، پہلے ۳۰ اصطلاحات اللہ، ایمان اور ملائکہ وغیرہ کی مختصر تشریح کی ہے پھر ۵۶ الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے جیسے طاعت، جنت، حکمت روح اور شیطان وغیرہ، آخر میں قرآن مجید کے منتخب جواہر پارے ترجمہ کے ساتھ دیے گئے ہیں، شروع میں ایک مقدمہ ہے اس میں قرآن مجید کی حفاظت، صوتی آہنگ، اصطلاحات اور ضرب الامثال وغیرہ پر اچھی بحث کی ہے مصنف کی تمام باتوں سے چاہے اتفاق نہ کیا جائے تاہم انھوں نے اپنے انداز میں قرآن مجید کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے جس سے قرآن فہمی کی راہ ہموار ہو گی، آسان زبان اور سہل پیرایہ میں ہونے کی وجہ سے اس کتاب سے ہر مذاق و استعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ "ض"

ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریقہ کار، از پروفیسر عبدالستار دلوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۵۶، قیمت ۴۰ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اردو زبان و ادب میں تحقیق و خصوصی مطالعہ کی رفتار اطمینان بخش ہے اور رطب و یابس کے باوجود اس کا مجموعی سرمایہ کم نہیں ہے اس فن کے ماہرین نے وقتاً فوقتاً تحقیقی کام انجام دینے والوں کے لیے جو رہبر اصول و ضوابط مرتب کیے ہیں ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کرکے شایع کیا جاتا، یہ کتاب اسی غرض سے مرتب کی گئی ہے، اس میں لایق مرتب نے ایسے سترہ مضامین کا انتخاب کیا ہے جن میں تحقیق کے اصول و طریقہ کار، حوالہ، صحت متن، مواد کی فراہمی، کتب خانہ کا استعمال، ببلیوگرافی وغیرہ کے علاوہ آزادی سے پہلے اور بعد کی تحقیق وغیرہ پر عمدہ بحث ہے، خاص طور پر قاضی عبدالودود، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور ڈاکٹر سید عبداللہ اور خود فاضل مولف کے دو مضامین نہایت مفید اور کارآمد ہیں، یہ قابل قدر کتاب بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی پیشکش ہے، دیباچہ میں اس شعبہ کی اور کارگزاریوں کا بھی ذکر ہے، اس کی اشاعت پر فاضل مرتب کے ساتھ یہ شعبہ بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔

نگارشات از جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۲۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: مجلس علمی، بی ۱۲۱، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی ۲۵۔

یہ کتاب مولانا عبداللہ عباس ندوی کے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو ان کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالہ "ذکر و فکر" میں شایع ہوتے رہے ہیں۔

مولانا کی تحریر کا خاص جوہر فکر کی لطافت و پاکیزگی اور ذکر کی حلاوت و رعنائی ہے، یہ جوہر زیر نظر مجموعہ میں اور نمایاں ہے، مضامین کو علمی و تحقیقی مقالات، اسلامی ادب، عالم اسلام، افکار و احساسات اور وفیات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے، توس قزح کے رنگوں کی مانند ان متنوع تحریروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر، تفسیر ماجدی اور مدیح خیر المرسلین محسن کاکوروی کا مطالعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا آزاد کی تفسیر کے متعلق اگر ایک طرف انھوں نے یہ لکھا ہے کہ "زبان و بیان اور استدلال کی منطقیت کے لحاظ سے اس درجہ کی ہے کہ کوئی اردو تفسیر، ترجمہ (شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور مولانا تھانویؒ کے علاوہ) اس کی ہمسری نہیں کر سکتی" تو دوسری طرف انھوں نے مولانا مرحوم کے تصور الٰہ اور وحدت ادیان کے متعلق ان کے مابہ النزاع مسلک کی غلطی بھی ظاہر کی ہے۔ کتاب ظاہری حسن و نفاست سے بھی پوری طرح آراستہ ہے۔

جوش ملسیانی مع انتخاب کلام از جناب کالیداس گپتا رضا،

بہترین کاغذ اور عمدہ کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۵، قیمت ۹۵ روپے، پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمٹیڈ، جولی بھون ۱۰، نیو میرین لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

علم و تحقیق کے گلشن میں جناب کالیداس رضا گپتا برابر گلہائے رنگا رنگ کا اضافہ کر رہے ہیں، غالبیات ان کا خاص و محبوب موضوع ہے، چکبست اور جناب جوش ملسیانی پر بھی ان کے قلم سے کئی کتابیں نکل چکی ہیں، جوش ملسیانی محض ان کے استاذ ہی نہیں بلکہ ان کی نظر میں "وہ انیسویں اور بیسویں صدیوں کے اساتذہ کی آبرو اور ان کی اعلیٰ اقدار کے محافظ تھے، ان کا کلام، ان کی صاف، سادہ، نیک، مطمئن

وضع دار اور ٹکسالی زندگی کا آئینہ دار ہے" اس لیے ایک لائق اور سعادت مند شاگرد کی طرح انھوں نے اپنے استاد کی یادوں کے چراغ روشن کیے ہیں اور بطور تبرک ان کی ایک تحریر، منتخب کلام اور بعض متفرق اور غیر مطبوعہ اشعار بھی شامل کیے ہیں، ایک مضمون میں فاضل مولف کے ابتدائی کلام پر جوش صاحب کی اصلاحوں کا ذکر ہے جو اہل فن کیلئے دلچسپ ہیں، عرصہ ہوا جوش ملسیانی کے شاگردوں پر ان کی اصلاحوں کے متعلق ایک کتاب 'آئینہ اصلاح' شایع ہوئی تھی، اس میں جناب رضا گپتا کا ذکر رہ گیا تھا، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی، لائق مولف کا یہ خیال درست ہے کہ الوالفصاحت پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

مشورے اور گزارشیں از جناب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مرتب جناب نعیم الرحمٰن صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۹، قیمت ۳۰ روپیے، پتہ: صدق بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشہور جریدہ 'صدق' کا ایک مستقل کالم 'مشورے اور گزارشیں' بھی تھا اور یہ خود مولانا مرحوم کی نظر میں سب سے زیادہ پسندیدہ تھا، علمی وادبی، دینی و سیاسی مسائل کے علاوہ قارئین صدق اپنے نجی معاملات اور خانگی الجھنوں کو بھی مدیر صدق کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اس سلسلہ کے اصلاحی مربیانہ اور حکیمانہ و مخلصانہ مشوروں کو عام افادہ کی غرض سے صدق میں شایع بھی کیا جاتا تھا، یہ جواہر پارے صدق کی فائلوں میں بکھرے ہوئے تھے، خوشی ہے کہ ان کو یکجا کرنے کی صلاحیت مولانا کے پر نواسے کے حصہ میں آئی۔ انھوں نے سلیقہ سے مختلف عنوانوں کی لڑی میں حکمت و بصیرت کے ان موتیوں کو پرو دیا ہے۔

احسن الحدیث از جناب عزیز احمد صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ جار الحق، بی ۱۴/۴، ناظم آباد، کراچی ۱۸۔

یہ قرآن مجید کے ابتدائی دس پاروں کا اردو ترجمہ ہے جو اصل عربی عبارت کے بغیر ہے، اسکی نوعیت و مقصد کا اندازہ اس تحریر سے ہوتا ہے "شروع کے سو سالوں میں قران مجید مسلمانوں کے معاشی، معاشرتی، سیاسی و مذہبی، علمی و ادبی و سائنسی ضروریات کا کفیل تھا" مگر سو سال کے بعد عرب مخلوط النسل ہو گئے، حکومت بظاہر انکے پاس رہی مگر اصل قیادت انکے ننھیال میں چلی گئی، یہود و مجوس عربی سیکھ کر عالم فاضل ہو گئے اور انہوں نے "علم تفسیر اور حدیث سازی کو فروغ دیا، علم تاویل، علم تجوید اور علوم اہل بیت ایجاد کیے تو عربوں کی کتاب محض مردے بخشوانے اور برکت کے فرشتے بلانے کے کام کی رہ گئی" آخر کتاب میں چند حواشی بصائر کے عنوان سے دیے گئے ہیں، ان سے بھی مصنف کے ذہن و فکر کی بے اعتدالی نمایاں ہے مثلاً "مسلمانوں نے تیس پاروں میں تقسیم کر کے مضامین کو بے ربط بنا دیا جیسے یہ سورۂ بقرہ ڈھائی پاروں میں بٹ گئی تو ہزار سال تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں گائے کا ذکر ہے یا بیل کا" ترجمہ کا وصف ملاحظہ ہو: الذین یقیمون الصلوٰۃ کا ترجمہ کیا ہے کہ "مل جل کر اس کی صلات کرتے ہیں"۔

خلیجی جنگ، تحلیل و تجزیہ از جناب ڈاکٹر محمد یونس نگرامی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مسلم انٹلیکچول فورم، سی ۲۰/۴۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳۔

سنہ ۹۰ء میں عراق و کویت کی آویزش نے عرب کے علاوہ اور ملکوں اور خاص طور پر ہندوستان میں بھی معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر لی تھی، اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک سیمینار میں اس جنگ کے اسباب و عواقب کا سنجیدہ اور غیر جذباتی انداز میں جائزہ لیا گیا، اس میں چند عمدہ مقالات و خطبات بھی پیش کیے گئے جنکو اس سیمینار کے کنوینر نے زیر نظر کتاب میں یکجا کر دیا ہے گو یہ تحریریں ایک وقتی مسئلہ سے متعلق ہیں لیکن مسلمانوں کے سیاسی شعور کی بالیدگی کیلئے انکا مطالعہ آج بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

ع - ص -

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے　　فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے

جلد ۱۵۲ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء عدد ۶

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۴۰۲ - ۴۰۴

مقالات

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ — مولانا محمد یوسف متالا، ہال کامب ہال لندن۔ — ۴۰۵ - ۴۱۹

بریلی کے اہم اخبارات — ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، بھنوی دالان، بریلی۔ — ۴۲۰ - ۴۳۹

استاذ الاساتذہ ملا عبدالسلام اعظمی دیویؒ — ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ — ۴۴۰ - ۴۵۳

ہندوستان کی فارسی شاعری میں آزادی کے بعد توصیفِ دیوتاں — ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، دارودہ — ۴۵۴ - ۴۶۶

اخبارِ علمیہ — ع۔ ص۔ — ۴۶۷ - ۴۷۰

معارف کی ڈاک

(۱) جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ — ۴۷۱

(۲) ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، شعبۂ علوم اسلامیہ علیگڑھ — ۴۷۲ - ۴۷۶

(۳) جناب اے وشاکرہ صاحبہ، جہانگیر کالونی حیدرآباد — ۴۷۶

مطبوعات جدیدہ — ع۔ ص۔ — ۴۷۷ - ۴۸۰

شذرات

اس سال دسمبر کا مہینہ مسلمانوں کے لیے ماہ محرم بن کر آیا ہے، گذشتہ برس ۶ر دسمبر کو ان کی مجبوری وبیکسی کا فائدہ اٹھا کر حکومت واقتدار کے نشہ میں دُھت لوگوں نے ان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا تھا اور جب اس پر بھی انہیں تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے مسلمانوں کے لہو سے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے ان کا قتل عام شروع کر دیا، امن وآشتی اور اہنسا کی یہ سرزمین ابھی تک مسلمانوں کے خون ناحق کے چھینٹوں سے رنگین ہے، ظالموں اور سفاکوں نے بابری مسجد کو شہید کر کے ملک کی شہرت وعزت میں بٹہ لگایا اور اپنی وحشت و درندگی سے ساری دنیا میں ہندوستان کو ذلیل ورسوا کیا، جس پر وہ بے شرمی اور ڈھٹائی سے فخر و گھمنڈ کر رہے ہیں اور اپنی بہیمانہ حرکت کو بہادری سمجھ رہے ہیں، ایک طرف پوری دنیا میں اس بزدلانہ اور گھناؤنے کام کی مذمت ہو رہی ہے، دوسری طرف آئین وقانون سے اپنے کو بالاتر سمجھنے اور جمہوریت وسیکولرزم کے پرخچے اڑانے والا یہ چھوٹا سا گروہ اسے اپنا شاندار کارنامہ سمجھ کر اترا رہا ہے۔

ع خلقے بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

گریہ وزاری کی ایک حد ہوتی ہے، نوحہ وماتم زندہ اور بیدار قوموں کا شیوہ نہیں ہے بلکہ حوادث اور ٹھوکریں ان کے لیے تازیانہ عبرت ہوتی ہیں ؎

لذت شناس غم کو ہے اظہار غم حرام — روتا ہوں اور دامن مژگاں بھی تر نہیں

بابری مسجد کا سانحہ چاہے کتنا ہی دردناک کیوں نہ ہو لیکن یہ غیر محدود نالہ وشیون اور کسی نئے محرم کی دعوت نہیں ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ درس وپیام مضمر ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کریں، اپنے حالات ومعاملات کو درست کریں، اپنی دینی واخلاقی زندگی کو سنواریں، اپنا انتشار اور پراگندگی دور کریں اور وہ رویہ اختیار کریں جو خدا کو پسند ہو تاکہ وہ اس کی رحمت ونصرت کے سزاوار ہوں، انکا ایمان وعقیدہ تو یہ ہے کہ یہ پوری کائنات خدا کے

حکم اللہ اس کی قدرت سے قائم ہے، اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے، وہ نہ عدل و قسط کے نظام کی پامالی و بربادی کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ نظامِ عدل و قسط کے دشمنوں کو برپا ہونے دے سکتا ہے۔

حالات کو سنگین بنانے اور بابری مسجد کے مسئلے کو الجھانے کی ذمہ داری خود مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے، انھوں نے اس کے نام پر اپنی قیادت کی دوکان چمکائی اور ہندوتوا کا احیا کیا جس کے نتیجہ میں بابری مسجد شہید کر دی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکے، اب اگر مسلمانوں کے شور و شغب سے ٹھنڈی فضا گرم اور مسموم ہوئی اور ان کے لیڈروں کی بے سود تقریروں اور اشتعال انگیز نعروں سے ان میں خواہ مخواہ کا جوش و اشتعال پیدا ہوا تو ان کے مخالفوں کو پھر کھل کھیلنے کا موقع ملے گا اور وہ تشدد، فرقہ پرستی اور نفرت و عناد کا وہ طوفان برپا کریں گے جو مسلمانوں کی مزید تباہی و بربادی کا موجب ہوگا، یہ وقت بڑے صبر و ضبط اور آزمائش کا ہے، اس میں پوری ہوشمندی اور بیدار مغزی سے کام لینے کی ضرورت ہے، جو لوگ مسجد کا تحفظ نہیں کر سکے، انہیں اس کی شہادت کی یادگار اور برسی منانے کا کیا حق ہے۔ آخر ان کی بے تدبیری سے سادہ لوح مسلمانوں کا خون خرابہ کب تک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ خیر مطلق ہے، وہ شر اور فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا، اس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسی لیے اسے ایک خاص اور محدود دائرے میں آزادی و اختیار بھی بخشا ہے لیکن جب انسان خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا غلط استعمال کرتا ہے تو دنیا شر و فساد سے معمور ہو جاتی ہے، اتر پردیش میں کچھ لوگوں کو حکومت کیا ملی کہ انھوں نے ملک کو تہ و بالا کر دیا، جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادیں ہلا دیں، اللہ کے بندوں پر مظالم ڈھائے، مساجد و معابد مسمار کیے، نصابِ تعلیم تبدیل کیا، تاریخ بدل دی، ملک کے دستور و آئین کا مذاق اڑایا، قانون کی بالاتری ختم کر دی، عدالتوں کی توہین کی اور ۶ دسمبر ۹۳ء کو اجودھیا میں بڑے پیمانے پر ہندوتوا شکتی کا مظاہرہ کر کے بابری مسجد کی جگہ مندر بنانے کی تمام رکاوٹیں دور کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ کی مشیت و مرضی کے سامنے انکی کچھ نہ چلی اور بابری مسجد ڈھانے والوں کو عبرتناک سزا مل کر رہی،

اور دسمبر کے پہلے ہی اترپردیش اور بعض دوسری ریاستوں کو انکے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا مل گیا، قرآن مجید میں ہے کہ "اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرے تو صومعے، گرجے، عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت ذکر ہوتا ہے ڈھادی جائیں"۔ (حج۔ ۴۰)

اترپردیش کے نئے وزیراعلیٰ ملائم سنگھ یادو کی سیکولر پسندی اور مظلوم اور کمزور طبقوں سے ہمدردی اور دلچسپی کی شہرت ہے، انہیں موقع ملا تو وہ ایک صاف ستھری حکومت قائم کرکے اپنی نیک نامی میں اضافہ کریں گے، اب بابری مسجد کا مسئلہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں چلا گیا ہے جس کی گومگو پالیسی نے اسے اور خود کانگریس کی تصویر کو بگاڑا ہے، اس نے مسجد ڈھائے جانے کے بعد اس کی اور اس سے ملحق آراضی کو بحق سرکار ضبط کرکے مسجد و مندر بنانے کے لیے مذہبی لوگوں کے دو ٹرسٹ بنانے کا اعلان کیا ہے اور مسجد و مندر کی جگہوں کے تعین کے لیے سپریم کورٹ کی رائے طلب کی ہے، لیکن اس طرح نہ یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور نہ فریقین اس پر راضی ہوسکتے ہیں، اب مسلمانوں کو سیکولر جماعتوں کی تائید و حمایت سے مرکزی حکومت کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ سے اپنا ریفرنس زیر دفعہ ۱۴۳ واپس لے کر دستور کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ کو فیصلے کے لیے بھیج دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی کی جائے، آئینی و قانونی جدوجہد کے بجائے پرانے زخموں کو کریدنا مسئلے کو مزید خراب کرنا ہے۔

نصف صدی سے اترپردیش میں اردو کی حق تلفی کا سلسلہ جاری ہے، ہم کو نئے وزیراعلیٰ کی انصاف پسندی سے توقع ہے کہ وہ اردو کے معاملے میں بے تعصبی اور فراخ دلی سے کام لے کر اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کریں گے اور اسے پھلنے پھولنے کی آئینی و قانونی ضمانت دیں گے اس سلسلہ میں اردو کو دوسری زبان بنائے جانے کے علاوہ آٹھویں درجے تک اس کی تعلیم کا بندوبست بھی ضروری ہے۔

مقالات

شیخ محمد غوث گوالیاری

از مولانا یوسف متالا۔ لندن

* مولانا یوسف متالا صاحب دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدرداں ہیں وہ گجرات کے علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصے انھوں نے ازراہ عنایت معارف کے لیے بھیج دیے ہیں اس سلسلے کے بعض مضامین پہلے چھپے تھے اور بعض آئندہ بھی شایع ہوں گے، زیر نظر مقالہ کی ترتیب کچھ بدل دی گئی ہے اور بعض جگہ حوالوں کی تصحیح بھی کی گئی ہے ممکن ہے اب بھی بعض حوالوں کی تصحیح رہ گئی ہو۔ "ض"

شیخ محمد بن خطیرالدین بن عبداللطیف بن معین الدین بن خطیرالدین بن ابو زید بن شیخ فریدالدین عطار شطاری گوالیاری مشہور بہ شیخ محمد غوث[1] کی عمر جب بارہ سال کی ہوئی تو طلب خدا میں سرگرداں پھرتے ہوئے جونپور تشریف لائے اور قاضی صدر جہاں کے مکان پر قیام کیا قیام کے دوران تحصیل علم میں مصروف رہے، کافیہ وغیرہ تک عبور حاصل کیا پھر اسی کو کافی سمجھ کر علم باطنی کی تلاش میں مصروف ہو گئے، شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت میں فیض روحانی حاصل کیا پھر ان ہی کی ہدایت پر حاجی حمیدالدین حضور کی خدمت میں گئے موصوف نے انہیں سلسلۂ شطاریہ میں بیعت فرمایا، ان کے ساتھ ان کے برادر بزرگ شیخ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۹۳۔

پھول[1] (م ۹۴۵ھ) بھی تھے، حاجی حمید الدین حضور نے ان دونوں بھائیوں کو اپنی فرزندی میں لیا اور تعلیم و تلقین کے بعد شیخ کو اپنے ہمراہ لے کر صوبہ بہار کی طرف روانہ ہوگئے اور شیخ محمد غوث کو مزید فیضان کے لیے کوہستان چنار میں ریاضت کے لیے چھوڑ دیا، شیخ محمد غوث تیرہ[13] سال چند مہینے عبادت و ریاضت میں رہے، درختوں کے پتے کھاکر یاد الٰہی کی (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴) اس کے بعد جب حاجی حمید الدین حضور واپس ہوئے تو مرید کو بامراد پایا، اسی عرصہ میں اپنی مشہور تصنیف "جواہر خمسہ" لکھی، حاجی حمید الدین حضور نے تمام منازل سلوک طے کرائے اور خرقۂ خلافت عطا کیا۔

مولانا محمد حسن غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ محمد غوث روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے انھوں نے جس کو قبول کر لیا اس کے سر کی اور دل کی آنکھوں کو مشاہدہ اور معائنہ کا نور حاصل ہوگیا اور اس میں حقیقت بینی کی قوت آگئی[2]، صاحب خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں کہ وہ چودہ سلسلہائے تصوف کے مقتدا تھے (ج ۲ ص ۳۳۳ مطبع ثمر ہند لکھنؤ ۱۸۷۳ء)

شاہ محمد غوث گوالیاری نے اپنے شیخ طریقت حاجی حمید الدین حضور[3]

---

[1] معارف: مقالہ نگار نے یہاں شاہ محمد غوث کے برادر بزرگ کا نام پھول لکھا ہے اور آگے چل کر بہلول لکھا ہے، ان کا ماخذ غالباً پروفیسر محمد مسعود احمد حیدرآباد سندھ کا وہ مقالہ ہے جو معارف جولائی تا ستمبر ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا ہے اس میں بھی ان کا نام شیخ پھول ہی لکھا ہے لیکن ان کے مراجع منتخب التواریخ بدایونی (ج ۳ ص ۴) اور خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور (ج ۲ ص ۴۳۲) میں بہلول لکھا ہے اس لیے پھول یقیناً غلط ہے اور غالباً یہ کاتب کی غلطی ہوگی، تعجب ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے اس کی تصحیح کیوں نہیں کی [2] اذکار ابرار ص ۲۸۹ [3]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷ پر)

(متوفی ۹۳۰ھ) سے مستقل قیام کے لیے استفسار کیا تو موصوف نے فرمایا کُل جہاں تمہارا ہے جہاں مزاج چاہے رہو اس میں تم کو اختیار دیا گیا ہے لیکن چونکہ زمانۂ ریاضت ہی میں قلعۂ گوالیار میں قیام کا اشارہ ہو گیا تھا اس لیے وہ گوالیار تشریف لائے اور یہاں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا صاحب مناقب غوثیہ لکھتے ہیں:

"الغرض جب حضرت غوث اللہ ...... رخصت ہو کر گوالیار پہونچے اور وہاں اقامت کی تو بانگِ درویشی و صدائے عظمت وولایت موروثی عالم میں پھیلی، عالم

(بقیہ ص ۴۰۷ حاشیہ) یہ شاہ قاذن سرقاضن کے مرید تھے جن کے پیرو مرشد شیخ عبداللہ شطاری تھے انھوں نے خوب سیاحت کی اپنے ساتھ صراحی کے برابر ایک لوٹا رکھتے تھے ہاتھ میں عصا کندھے پر جانماز ڈال کر پھرتے تھے اور جسمانی اعتبار سے بہت کمزور تھے شیخ محمد جن کا لقب غوث تھا اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر آپ سے بیعت ہوئے کہتے ہیں کہ جب شیخ محمد غوث بیعت ہونے کیلیے آئے تو یہ اٹھ کر ان سے بغلگیر ہوئے اور فرمایا غوث! آجاؤ۔ جب حاضرین نے دریافت کیا کہ بغیر کسی کمال کے آپ نے انہیں غوث کیوں کہا تو جواب میں فرمایا اس میں کیا حرج ہے باپ اپنے بیٹے کا نام شاہ عالم رکھتا ہے وہ حقیقتاً شاہ قاذن سرقاضن کے خلیفہ تھے لیکن یہ دیکھکر کہ انکی طرف رجحان کی وجہ سے مرشد کے صاحبزادہ شیخ ابوالفتح کو تکلیف ہوتی ہے وہ ان کے پاس پہنچ گئے اور ان سے مرید ہو کر خلافت حاصل کی شیخ محمد غوث اپنے شجرۂ ارادت میں شیخ ابوالفتح کا نام نہیں لکھتے تھے جس سے ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، نصیرالدین محمد ہمایوں بادشاہ بھی شیخ حاجی حمید کا معتقد ہو گیا تھا ۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء میں ان کی وفات ہوئی، مزار گوالیار میں ہے، ان کی کتاب معراج نامہ بہت مشہور ہے جس میں علمائے گجرات کے انکار کے قصے درج ہیں اور حقیقت حال اللہ ہی زیادہ جانتا ہے (ماخوذ از اخبار الاخیار ص ۱۵۴ و خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۲۳)

و عالمیاں ملوک و سلاطین وقت مطیع و منقاد ہوئے مگران کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص مجلس عالی میں دنیا کا نام نہ لے سکتا تھا، گوالیار میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا کہ مرض خیارک میں مبتلا ہو گئے اور چھ مہینے تک صاحب فراش رہے۔[1]

صحتیاب ہونے کے بعد قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش کو حاجی حمید الدین کی خدمت میں روانہ کیا جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو حاجی حمید الدین بہت مسرور ہوئے اور اسی وقت جبہ و دستار طلب کر کے اپنے دست مبارک سے دونوں حضرات کے سپرد کیا اور اپنی جانب سے شاہ محمد غوث (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء) کے نام ایک فرمان لکھوا کر دستخط فرما کر قاضی رکن الدین کے حوالے کیا، صاحب مناقب غوثیہ نے فرمان مذکورہ کا یہ مضمون لکھا ہے :۔

"صحیح فی الدنیا والآخرہ بندگی حضرت شیخ المشائخ میاں محمد غوث متع اللہ المسلین بطول بقائہ از ظہور شمس النصاری المقدسی مطالعہ فرمانید تمام احوال قابل شکر ہیں، "قل الحمد للہ دائما" معلوم و روشن ہو کہ اس درویش کو بھی بیس رمضان سے ران کا درد ہوا تھا اور جو کچھ حال و احوال اور اقوال اس فقیر کا ظاہر و باطن تھا آں فرزند کو سونپ کر اپنا قائم مقام کیا بلکہ قالب کا حکم بھی تم شیخ المشائخ کے ہاتھ میں دیا چنانچہ اپنی موجودگی میں صندوق تیار کرا کر حاضران مجلس کو (تمہارے) آدمیوں کی موجودگی میں نصیحت کر دی ہے کہ ہم کو امانت رکھو قالب کا اختیار بھی فرزندم میاں غوث کو دیا۔ جس جگہ وہ قابل سمجھیں لے جائیں دوسرے یہ کہ آں فرزند کو اپنا قائم مقام کر کے جملہ خلفاء و مریدین کو حوالہ کیا جس کو آں فرزند

---

[1] مناقب غوثیہ اردو ص ۵۲ بحوالہ معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۱۱۰۔

قبول کرے مقبول، اور جس کو مردود کرے مردود۔ اور جبہ و دستار اپنے حضور تمہارے آدمیوں کے سپرد کر دیا یقین کر لو کہ جو کچھ رنج و مشقت اس فقیر نے اٹھایا اور درگاہ حق میں توکل پر ثابت رہا وہ سب آن فرزند کے واسطے تھا، یہ فقیر درخت کے سایے میں مرقد کرے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور جو اس فقیر کے سفر کے بعد ہوگا وہ شیخ سکندر کی کتابت سے معلوم ہوگا۔ (مناقب غوثیہ اردو ص ۵۳-۵۴۔)

حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شیخ سکندر نے جو مکتوب شاہ محمد غوث کے نام ارسال کیا تھا اور اس میں جو چشم دید واقعات بیان کیے تھے اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حاجی حمید الدین نے اپنی وفات کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا حرف بہ حرف ثابت ہوا، مکتوب مذکور کے آخر میں شیخ سکندر تحریر فرماتے ہیں:

"اکیس[۲۱] ذی الحجہ کو ایک پاس شب باقی تھی کہ یکایک فرمایا "یارو اٹھو رحمت کا وقت ہے، اس درویش کو پھر حکم ہوتا ہے کہ آج چوتھا روز ہے کہ تمام انبیاء و اولیا تمہاری ملاقات کے منتظر ہیں شتاب آؤ"۔ اور اس وقت چوڈول پر سوار ہو کر باہر آئے اور اپنے حضور میں قبر درست کرائی بعدہ اس چوڈول درخت کے سایے کے نیچے لائے جو کوئی اپنا حال عرض کرتا فرماتے فرزندم میاں محمد غوث کے حوالہ کیا، یہانتک کہ صبح صادق چمکی اور آپ سر سے پا تک چادر اوڑھ کر شغل مع اللہ کے ساتھ دار الفنا سے دار البقا کو رحلت فرما گئے۔ دیگر معروض کہ اس خاکروب آستانہ کو خاک روبی آستانہ کی خدمت پہ نواز کر جامۂ خلافت عطا فرمایا ہے لیکن ثابت جب ہی ہو سکے گا جب آنحضرت قبول فرمائیں گے"۔ (مناقب غوثیہ اردو، ص ۵۵ بحوالہ معارف ج ۹۰ عدد ۲۔

غرض حاجی حمید الدین حضور کی وفات کے بعد شاہ محمد غوث گوالیاری مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور گوالیار میں قیام کر کے دور و نزدیک فیض رسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

خواجہ خانوں شاہ محمد غوث گوالیاری کے زمانے میں گوالیار میں ایک اور بزرگ بھی قیام پذیر تھے جن کو خواجہ خانوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا صاحب فیضان ولایت کی ایک تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ خانوں اور شاہ محمد غوث زندگی میں نہیں مل سکے، موصوف نے لکھا ہے:

"۹۴۰ھ میں مورخہ یکم جمادی الاول کو انھوں نے اپنے بڑے فرزند حضرت خواجہ بندگی احمد قدس اللہ سرہم سے ارشاد فرمایا کہ میں اب تم سے رخصت ہوتا ہوں بعد وفات میری تجہیز و تکفین حضرت محمد غوث گوالیاری کریں گے میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ملاقات ان کی ہماری اس وقت پر منحصر ہے"[1]

آخری جملے سے ظاہر ہے کہ زندگی میں دونوں بزرگوں کی ملاقات نہیں ہوئی اور خواجہ خانوں کے وصال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شاہ محمد غوث گوالیاری تشریف لائے اور خواجہ مرحوم کے صاحبزادگان کے ساتھ غسل دیا، تجہیز و تکفین فرمائی اس کے بعد نماز جنازہ بھی پڑھائی ۹۴۰ھ دوم جمادی الاول وقت چاشت تدفین سے فارغ ہوئے۔

شیخ غوث نے طریقہ شطاریہ میں حاجی معمر حمید بن ظہیر شطاری کی خدمت میں برسوں باریاب رہ کر تربیت حاصل کی اور منصب مشیخت پر فائز ہوئے، بابر اور ہمایوں دونوں سے بہت اعتقاد تھا، شیر شاہ سوری نے تخت سنبھالنے کے بعد ہمایوں کے مصاحبوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، ان میں شیخ محمد غوث بھی تھے، شیخ غوث کو جب اس کا

---

[1] معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۱۱۶ بحوالہ فیضان ولایت ص ۱۸۔

علم ہوا تو آپ گجرات روانہ ہو گئے اور احمد آباد پہونچکر سارنگ پور نامی علاقہ میں رہنے لگے[1]
شیخ کا قیام گجرات میں اٹھارہ سال رہا اس مدت میں کچھ وقت چانپانیر اور کچھ بھروچ
میں بھی گذرا۔

شیخ کی تکفیر کا واقعہ گجرات آکر ایک رسالہ "معراجیہ" لکھا جس میں اپنی معراج کا ذکر کیا۔
جس کی بنیاد پر بہت سے علماء ان کے مخالف ہو گئے جن میں شیخ علی متقی پیش پیش تھے
ان علماء نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا، یہ سلطان محمود گجراتی کا زمانہ تھا محمود نے گجرات کے
بڑے عالم شیخ وجیہہ الدین علوی سے اس فتوے کے سلسلے میں رائے معلوم کی، شیخ
وجیہہ الدین شیخ غوث الدین کی روحانیت سے پہلے[2] ہی متاثر ہو چکے تھے اور ان کے مرید
ہو گئے تھے چنانچہ جب سلطان محمود شیخ وجیہہ الدین کی خدمت میں شیخ علی متقی کے فتوے
کو لے کر حاضر ہوئے تو شیخ وجیہہ الدین نے فتویٰ پڑھ کر پھاڑ دیا اور فرمایا کہ معراج نامہ میں
جتنے واقعات درج کئے گئے ہیں وہ تو عالم خواب کے واقعات ہیں اور وہ لغو اور بے بنیاد
ہیں عام لوگ انکا درجہ کیا جانیں وہ ایسے بڑے درویش ہیں کہ ان تک رسائی مشکل ہے
وہ صاحبِ نسبت اور صاحبِ کشف و کرامات ہیں ان کا شمار اہل حال اور اہل قال
میں ہے۔

شیخ وجیہہ الدین نے نہ صرف فتویٰ کی مخالفت کی بلکہ ایک رسالہ لکھ کر مخفی کتابوں

---

[1] تاریخ صوفیائے گجرات [2] ملا عبدالقادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ
وجیہہ الدین شیخ متقی کے فتویٰ کی وجہ سے پہلی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انکو
دیکھکر ایسا متاثر ہوئے کہ فتویٰ چاک کر دیا (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴۴) اس لیے مقالہ نگار کا یہ بیان کہ شیخ
وجیہہ الدین شیخ غوث کی روحانیت سے پہلے ہی سے متاثر تھے لغزش قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

سے مسئلہ تکفیر پر روشنی ڈالی پھر صوفیائے کرام کے احوال سے بحث کی کہ حالت سکر میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں وہ قابل مواخذہ نہیں، شیخ وجیہ الدین فرماتے تھے کہ کسی شخص کی ننانوے باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ہو تو اس کو مومن سمجھو اور کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہ کہو[1]

اس کے باوجود محققین کی رائے یہ ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے افکار و معتقدات میں اور خصوصاً روحانی مجاہدات میں انکا واسطہ جوگیوں سے پڑا، ان کی کتاب جواہر خمسہ کے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے احوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں" جوہر دوم" میں اسمائے اکبریہ خاص شیخ کے جمع کیے ہوئے ہیں جن میں فرشتوں کے عبرانی و سریانی نام ہیں اور حرف ندا سے ان کو خطاب کیا گیا ہے جس سے استعانت بغیر اللہ کا شبہہ ہوتا ہے ایک دعائے شیخ بھی آتی ہے جس میں عبرانی و سریانی اسماً حرف ندا کے ساتھ ہیں ساری کتاب کی بنیاد دعوت اسماء پر ہے ان اسماء کے موکل مانے گئے ہیں جو اس کی اصل ماہیت سے واقف ہیں حروف تہجی اور ان کے

---

[1] معارف:۔ مقالہ نگار نے یہاں تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم کا حوالہ دیا ہے دوسری کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے لیکن انھوں نے جو تفصیل لکھی ہے اس کے بعض حصوں کا ذکر تاریخ دعوت و عزیمت اور دوسرے مراجع میں نہیں ہے۔

موکلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے[1]

مریدین | شیخ محمد غوث کے سلسلۂ شطاریہ میں منسلک ہونے والوں میں علامہ وجیہ الدین کے علاوہ شیخ صدرالدین ذاکر، شیخ لشکر محمد، شیخ ولی محمد، شیخ علی شیر اور شیخ صبغۃ اللہ بھروچی جیسی عظیم شخصیات بھی ہیں جنھوں نے گجرات اور دکن میں اس سلسلہ کو خوب پھیلایا بلکہ شیخ صبغۃ اللہ تو اس سلسلہ کو لے کر مدینہ منورہ پہونچے اور بڑے بڑے مشائخ مدینہ نے ان سے اس کو حاصل کیا[2]

خلفاء | ذیل میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کے خلفائے کرام اور ان کے وطن کا نام درج کیا جاتا ہے۔

نام	وطن	نام	وطن
۱۔ شیخ عبداللہ بن محمد غوث گوالیاری	گوالیار	۱۰۔ شیخ محمد شمس ذاکر	بڑودہ
۲۔ شیخ مبارک	"	۱۱۔ حبیب شطاری	"
۳۔ شیخ بدیع الزماں سمرقندی	"	۱۲۔ شیخ محمد ادریس بن شاہ محمد غوث گوالیاری	احمدآباد
۴۔ شیخ نورالدین ضیاء اللہ بن شاہ محمد غوث	اکبرآباد	۱۳۔ شیخ اسمٰعیل " " "	"
۵۔ شیخ عبداللہ صوفی	"	۱۴۔ محمد عاشق	سنبھل
۶۔ شیخ اکمل الدین برہان	برہانپور	۱۵۔ مولانا عبدالفتاح ناگوری	اجمیر
۷۔ شیخ لشکر محمد عارف	"	۱۶۔ شیخ محمد جمالی	سرہند
۸۔ شیخ سراج محمد بنیانی	"	۱۷۔ شیخ جلال واصل	کالپی
۹۔ شیخ صدرالدین	بڑودہ	۱۸۔ شیخ جیوہ عبدالحی	بدولی

۱؎ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم ص ۲۴۴ - ۲۴۵ ۲؎ تاریخ گجرات، تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ سفینۃ الاولیاء۔

۱۹۔ شیخ شمس الدین شیرازی بیجاپور
۲۰۔ شیخ احمد متوکل (اجین) مالوہ
۲۱۔ شیخ عالم " "
۲۲۔ شیخ منجھن سارنگ پور
۲۳۔ شیخ عمر سارنگ پور
۲۴، ۲۵۔ شیخ وجیہہ الدین علوی اور شیخ علی شیر بنگالی اعاظم خلفاء میں سے تھے[1]

شطاری سلسلہ حضرت شیخ بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہے[2]۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سلوک و تصوف میں دوسرے سلسلوں کے بزرگوں کے مقابلہ میں اس سلسلہ کے بزرگ زیادہ تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں۔ یہ حضرات جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کرتے تھے، ان کی طرف غیر معمولی افعال و تصرفات منسوب کیے جاتے تھے[3]۔

۹۶۳ھ میں شیخ محمد غوث گوالیار تشریف لے گئے یہاں کچھ مدت قیام کے بعد اکبر کے زمانے میں آگرہ آئے مگر یہاں بھی علماء نے آپ کی مخالفت کی آخر آزردہ دل ہوکر واپس گوالیار تشریف لے گئے۔

تصانیف رسالہ معراجیہ کے علاوہ ان سے جواہر خمسہ، کلید مخازن، ضمائر و بصائر، کنز الوحدۃ، بحر الحیوۃ بھی یادگار ہیں۔

کنز الوحدۃ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اہل ذوق کے نزدیک ایمان کی پانچ قسمیں ہیں، اول تکلیفی۔ یہ سب قسموں سے عام ہے اور کافر و مومن سب کو شامل ہے، دوم تقلیدی جو عام ہے اور ہر مومن میں پائی جائے گی چاہے وہ مقلد ہو یا محقق ہو۔ سوم استدلالی یہ قسم خاص ہے جو علمائے مومنین میں پائی جائے گی۔ چہارم حقیقی یہ اخص ہے اور یہ صرف

---

[1] گلزار ابرار۔ معارف فروری ۱۹۸۲ء ص ۱۱۳ [2] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۴ [3] رود کوثر ص ۳۰۸، نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۲۹۵۔

اولیاء میں پائی جاتی ہے، پنجم عینی یہ قسم اس شخص میں پائی جاتی ہے جو ولایت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو اور اپنی آنکھوں سے احدیت مطلقہ کو دیکھتا ہو۔

دربار مغلیہ سے تعلق | مغلیہ دربار سے بھی شیخ غوث گوالیاری کے گہرے تعلقات رہے، تزک بابری میں ۹۳۶ھ / ۱۵۲۹ء کے واقعات میں لکھا ہے کہ:

"محرم کی تیسری کو گوالیار سے شہاب الدین خسرو کے ساتھ شیخ محمد معظم گوالیری رحیم داد کی سفارش کرنے آئے، شیخ ممدوح ایک درویش و معظم آدمی تھے ان کے فرمانے سے رحیم داد کی خطا معاف کر دی گئی"[1]

جلال الدین محمد اکبر بھی اپنے والد نصیر الدین محمد ہمایوں اور دادا ظہیر الدین محمد بابر کی طرح شاہ محمد غوث سے خاص ربط خاطر رکھتا تھا چنانچہ جب شاہ محمد غوث اکبرآباد تشریف لائے اور بیرم خاں و شیخ گدائی کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہوکر واپس گوالیار گئے تو اکبر بادشاہ بیرم خاں سے آزردہ ہو گیا اس ربط خاص کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیرم خاں کی شہادت کے بعد وہ پھر اکبرآباد تشریف لے آئے اور یہیں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے"[2]

نورالدین جہانگیر بادشاہ بھی شاہ محمد غوث گوالیاری کے علوئے مرتبت کا قائل تھا، بارہویں جشن نوروز کے ذیل میں جو حالات لکھے ہیں اس میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (م ۹۹۸ھ / ۱۵۸۹ء) کے روضہ کی زیارت کے تاثرات کے ضمن میں شاہ محمد غوث گوالیاری کا بھی ذکر آگیا ہے کہ:

---

[1] بحوالہ ظہیر الدین محمد بابر مسلمان وہندو مورخین کی نظر میں ص ۴۹۳ [2] معارف ۱۰۷ عدد ۲ ص ۱۲۳۔

"شیخ وجیہہ الدین شیخ محمد غوث گوالیاری کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے اور جن کا ارادت خود شیخ محمد غوث کی بزرگی پہ دلیل ہے۔"[1]

شیخ غوث کے ایک بھائی بہلول بھی صاحب ارشاد وکرامت بزرگ تھے، ہمایوں کو ان سے عقیدت تھی مگر مرزا ہنڈال نے ان کو شہید کر دیا تھا۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ وہ اہل محل کے ساتھ بیانہ کا قلعہ دیکھنے گئے شہنشاہ ہمایوں کے بخشی محمد نے جو انکے عہد حکومت میں اس قلعے کے قلعدار تھے وہاں صحرا کے رخ پر ایک عمارت تعمیر کی ہے جو نہایت بلند اور ہوادار ہے شیخ بہلول کا مزار بھی اس کے متصل ہے اور یہ مزار فیض وبرکت سے خالی نہیں ہے۔ شیخ بہلول شیخ محمد غوث کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں کے مختلف اثرات کے علم میں مہارت حاصل تھی، شہنشاہ ہمایوں ان سے نہایت درجہ کا ربط خاطر اور انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔

جس زمانے میں ہمایوں نے بنگال کو فتح کر کے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا تھا اسوقت ہندال مرزا شاہی حکم کے مطابق آگرے میں مقیم تھا اس نے بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے اپنے نام کا خطبہ جاری کیا جس کی اطلاع مختلف لوگوں کی عرضداشتوں کے ذریعہ شہنشاہ کو ملی اس نے اسے سمجھانے اور نصیحت کرنے کے لیے شیخ بہلول کو بھیجا تاکہ وہ اس کے باطل ارادے کو دور کر کے اسے خلوص واتفاق کی شاہراہ پر لے آئیں چونکہ بدخواہ فسادیوں نے مرزا پر سلطنت کا افسوں پڑھ کر پھونکا تھا اس لیے وہ اپنے باطل ارادوں سے دستبردار ہونے پر راضی اور دوبارہ اطاعت اختیار کرنے کی طرف راغب نہ ہوا بلکہ فسادیوں کی انگیخت پر شیخ بہلول کو چار باغ میں جو فردوس مکانی شہنشاہ بابر نے

---

[1] تزک جہانگیری اردو لاہور ج ۱ ص ۴۰۶۔

دریائے جمنا کے کنارے تعمیر کرایا ہے انہیں تہ تیغ کر دیا۔

محمد بخشی کو چونکہ شیخ سے عقیدت و ارادت تھی اس لیے ان کی میت کو قلعہ بیانہ میں لاکر دفن کر دیا[1]

وفات شیخ محمد غوث کی وفات[2] ۱۵ رمضان سنہ ۹۷۰ھ / ۱۵۶۳ء میں آگرہ میں ہوئی تھی جہاں سے ان کے جسد خاکی کو گوالیار لے جاکر دفن کیا گیا، یہیں مزار پُر انوار ہے۔

محمد غوث سید قطب عالم ۔۔۔ چو در وصل خدا گردید موصول

بتاریخ وصالش گفت سرور ۔۔۔ محمد متقی سلطان مقبول[3]

طہارت و نظافت کا خیال شیخ میاں غوث محمد گوالیاری کو طہارت کا بڑا خیال رہتا تھا پانی کی پاکی میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس کا برتن نہایت صاف رکھتے تھے ایسی احتیاط کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا گیا انہیں غصہ بھی بہت آتا تھا چنانچہ شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم شیخ حسین کے ہمراہ میاں غوث سے ملنے گئے انھوں نے ان کے مٹکے سے ایک آبخورے میں پانی لے کر پیا اور پھر اسے زمین پر رکھدیا یہ دیکھکر میاں غوث کو سخت غصہ آیا اور بلند آواز سے کہا ہائے ہائے تم نے آبخورے کو نجس کر دیا انکا اتنا کہنا ہی تھا کہ شیخ حسین نے آبخورہ زمین پر دے مارا اور کہا کہ اگر یہ ناپاک ہو گیا ہے تو اسے توڑ دینا ہی اچھا ہے یہ سُن کر میاں غوث مسکراتے ہوئے شیخ حسین کی طرف بڑھے اور ان کو گلے لگا لیا۔ اس پر حاضرین میں سے کسی کو یہ خیال آیا کہ شیخ حسین نے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۸۵ [2] معارف خزینۃ الاصفیاء میں یہی تاریخ درج ہے مگر پروفیسر محمد مسعود احمد نے کئی حوالوں سے ۱۴ رمضان تاریخ وفات لکھی ہے (معارف ج ۹۰ عدد ۲ ص ۹۱، ۱۹۶۲) [3] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۱۸۔

آبخورہ توڑکر اسراف کیا ہے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اس شبہہ کو دور کرنے کے لیے شیخ حسین نے فرمایا امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ مٹی کا برتن اگر ناپاک ہو جائے تو اس کو پاک کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے اس کا علاج توڑ دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے[1]

[1] شیخ حسین مذکور شیخ عبدالوہاب کے دوستوں اور عزیزوں میں سے تھے شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ یہ عجیب حالت اور بلند ہمت کے مالک تھے معمولی چیزیں بھی خریدتے تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ سب بیچنے والے کو دیدیتے خواہ وہ مظفری ہوتا یا روپیہ اور کبھی نہ سودا چکاتے اور نہ اسکی قیمت کا حساب کرتے۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دریائے نربدا کو عبور کرنا چاہتے تھے لیکن دریا کے بیچ میں ایک شیر اپنی کچھار میں بیٹھ گیا تھا اس کی وجہ سے لوگ دریا میں آنے جانے سے پرہیز کر رہے تھے اور کنارے پر بڑی بھیڑ ہو گئی تھی یہ دیکھ کر شیخ حسین اپنے ایک ہاتھ میں چاقو لیکر اور دوسرے پر ایک چادر لپیٹ کر کچھار کے اندر گھس گئے اور شیر کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے لوگوں کے آنے جانے کا راستہ کھولدیا۔

ایک مرتبہ ایک آدمی اونچی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوا وسوسہ کی وجہ سے اس نے نیت کے الفاظ اتنی بار دہرائے کہ مقتدی پریشان ہو گئے اس پر شیخ حسین نے اس زور سے اس امام کے سینے پر ہاتھ مارا کہ وہ برابر کے پانی میں گر پڑا اور پھر اس کے دل میں کوئی وسوسہ باقی نہیں رہا، ایک مرتبہ ان سے ایک طالب علم احیاء العلوم پڑھ رہا تھا جسکی زبان میں سخت لکنت تھی عبارت پڑھتے وقت وہ عاجز اور مضطرب ہو جاتا تھا، شیخ عبدالوہاب کہتے ہیں کہ اس طالب علم کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جو شیخ حسین نے اس (بقیہ حاشیہ ص ۴۱۹)

غوثیہ کتبخانہ حضرت غوث محمد گوالیاری کی اولاد احمد آباد میں آکر آباد ہوئی تو اپنے ساتھ بزرگوں کے بہت سے تبرکات بھی لائی۔ جن میں کتابیں بھی تھیں ان میں ایک بزرگ فضل علی عرف بارک اللہ بڑے صاحب ذوق تھے، ان کے پاس ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا جب تک اس خاندان میں علمی ذوق رہا کتب خانہ بھی تھا اس کے بعد برباد ہوگیا۔[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۸) امام کے دلی وساوس دور کرنے کے لیے کیا تھا لیکن میں اس وجہ سے خاموش رہا کہ شاید اس کی ہمت رفتہ رفتہ شیخ حسین کے اثرات قبول کرلے گی (اخبار الاخیار ص ۲۲) [1] گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۲۴۹۔

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموری سے پہلے کے صوفیائے کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور حضرت عبد الحق توشہ ردولوی کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کیے گئے ہیں، ان بزرگان دین نے اپنے عہد میں مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا۔ اسکی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ آخری ایڈیشن میں دو مفید ضمیموں (ملفوظات خواجگان چشت، ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ پر ایک نظر) کا اضافہ بھی ہے جس کا مطالعہ تصوف کا مطالعہ کرنیوالوں کیلئے ضروری ہے۔

از سید صباح الدین عبد الرحمن صفحہ ۲۲۳۔ قیمت ۱۱۵ روپیے

بریلی کے اہم اخبارات

از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، بریلی

(۲)

روزانہ اخبار مجھے قاضی عاشق حسین عاشق بریلوی (م ۱۹۴۹ء) زمیندار موضع لکھن پرگنہ شاہی ضلع بریلی۔ سکنہ صوفی ٹولہ۔ شہر کہنہ بریلی کے یہاں سے ہفتہ وار اڈیشن روزانہ اخبار بریلی کے وہ اوراق فراہم ہوئے جن میں ان کا کلام شعر شایع ہوا تھا۔ ان اوراق کی تفصیل مندرجۂ ذیل ہے:۔

۱۔ شمارہ نمبر ۲۹۔ جلد ۱۱۔ یہ سرورق ہے۔ جگہ بہ جگہ دریدہ۔ ماہ و سالِ اشاعت دریدگی کی نذر ہو گئے۔ ٹائیٹل کے نیچے جو عبارت ملتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ "اخبار روزانہ اخبار ہفتہ وار ایڈیشن ہر انگریزی ماہ میں چار بار ۷، ۱۴، ۲۱، ۲۸ کو شایع ہوتا ہے"۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ روزانہ اخبار کے علاوہ ہفتہ وار ایڈیشن بھی شایع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جلد نمبر شمارہ نمبر اور معینہ تاریخہائے اشاعت کو سامنے رکھ کر شمار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شمارے کی تاریخِ اشاعت ۲۱ نومبر ۱۹۲۵ء ہونی چاہیے۔

سرورق پر ایڈیٹر کا نام کرم الٰہی کلیم اور مقام اشاعت فراشی اسٹریٹ بریلی ملتا ہے۔

۲۔ شمارہ نمبر ۵۔ جلد نمبر ۲۶۔ مطبوعہ ۷ فروری ۱۹۴۳ء۔ یہ آخری ورق ہے یعنی صفحہ گیارہ ۱۱ اور صفحہ بارہ ۱۲۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزانہ اخبار کا ہفتہ وار ایڈیشن بارہ ۱۲ صفحات پر مشتمل تھا

۳۔ شمارہ نمبر ۲۹۔ جلد ۲۷۔ مطبوعہ ۷ اگست ۱۹۴۴ء۔ یہ سرورق ہے جس پر انگریزی حروف میں ایک مہر لگی ہے۔ مہر کا مضمون ہے "روزانہ اخبار آفس نینی تال روڈ بریلی یو پی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزانہ اخبار کا دفتر فراشی اسٹریٹ سے نینی تال روڈ پر منتقل ہو گیا تھا۔

مذکورہ اوراق کے مشمولات اور مزید جستجو کے بعد جو باتیں سامنے آئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

روزانہ اخبار اور اس کا ہفتہ وار ایڈیشن بریلی سے ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک اور مدیر کا نام کرم الٰہی کلیم تھا جس کا تعلق پنجابیان کی شمسی برادری سے تھا۔ وہ خوش صورت، خوش لباس، باشرع اور عمر دراز فرد تھا۔ روزانہ اخبار کا پہلا دفتر محلہ فراشی ٹولہ بریلی میں تھا بعد کو روزانہ اخبار کا دفتر محلہ عقب کوتوال نینی تال روڈ بریلی میں اس مکان میں منتقل ہوا جو مشہور صحافی۔ مورخ اور ماہر تعلیم سید الطاف علی بریلوی (م ۱۹۸۵ء) کی ملکیت تھا۔ مکان کے زیریں حصے میں روزانہ اخبار کا دفتر اور پریس تھا۔ کار کتابت کرم الٰہی کلیم کے فرزند مہر الٰہی کے سپرد تھا اور مشین مین کا نام نبی جان شمسی تھا جس کو داستان امیر حمزہ حفظ تھی اور اس حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ روزانہ اخبار کو منور حسین سکنہ شیش محل محلہ خواجہ قطب بریلی فروخت کرتا تھا۔ اس کی زبان کی طراری اور خبروں کی ڈرامائی طور پر ادائیگی مجمع لگا لیتی تھی۔ اسی وجہ سے کسی ستم ظریف نے اس کا نام "چناں چہ مرچنٹ" رکھ دیا۔ روزانہ اخبار کی مقبولیت میں "چناں چہ مرچنٹ" کی خدمت اپنی جگہ اہم تھی۔[۶]

روزانہ اخبار کے مذکورہ بالا شماروں میں جلد ۱۱ اور جلد ۲۶ کے شماروں کے صفحے کی لمبائی ۳۴ ½ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۲۳ ½ سینٹی میٹر ہے۔ جلد ۲۷ کے شمارے کی لمبائی ۳۷ ½ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۲۵ ½ سینٹی میٹر ہے۔ جلد ۱۱ اور جلد ۲۷ کے شمارے چار کالمی ہیں۔

جلد ۲ ۲۱ کا شمارہ ۲۰ ڈوکالماں ہے۔ اس شمارے کا ورق گلابی رنگ کا ہے۔ صرف جلد ۲ کے شمارے کا ورق چکنا نہیں ہے جو شاید جنگ عظیم دوم کے زمانے میں کاغذ کی قلت اور معمولی کاغذ پر طباعت کی وجہ سے تھا۔ مذکورہ تینوں شماروں کی کتابت اور طباعت معمولی ہے۔ زیادہ مواد کو محدود صفحات میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

روزانہ اخبار بریلی کے جن شماروں کے اوراق میرے پیش نظر ہیں انکا اشاریہ مندرجہ ذیل ہے:۔

شمارہ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۸ء

نصف سرورق پر چار کالموں میں قاضی عاشق حسین عاشق بریلوی کی ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ایک نظم بعنوان "خان بہادر محمد محبوب علی خاں صاحب مرحوم اور کونسل صوبہ متحدہ کی ممبری" ملتی ہے۔ اس نظم میں خان بہادر محمد محبوب علی خاں' رئیس اعظم آنولہ بریلی' کی نینی تال میں وفات پر اظہار تعزیت اور ان کے بھائی المعروف بہ مکہ میاں کو ان کی جگہ ممبر بنانے کی اپیل کی گئی ہے۔ صفحہ ۲ پر پہلے تین کالموں کا عنوان ہے "مراسلات" اور ضمنی سرخیاں ہیں "زراعت ہند" "انگریزی ترجمۃ القرآن مولفہ حضرت مولانا محمد علی صاحب لاہوری" اور سر میلکم ہیلی گورنر یو پی کی ایک تقریر کا خلاصہ ملتا ہے۔ مضمون "زراعت ہند" جو لارڈ ارون وائسرائے ہند کی تقریر کا خلاصہ ہے' اس کے خلاصہ نگار کے نام کی جگہ قوسین میں "نکتہ سنج" شایع ہوا ہے۔

شمارہ مورخہ ۷ فروری ۱۹۴۳ء

اس شمارے کے صفحہ گیارہ اور صفحہ بارہ پر میونسپل بورڈ بریلی کے پاس شدہ ۱۳ ریزولیوشنوں کی نقل منجانب چیرمین میونسپل بورڈ بریلی شایع ہوئی۔ ان میں ریزولیوشن

نمبر ۱۵ بزبان انگریزی سر سکندر حیات کی وفات پر تعزیت کے سلسلے میں ہے۔ صفحہ بارہ پر پہلے کالم میں عاشق حسین عاشق بریلوی کی نظم ملتی ہے جس کا عنوان بوجہ دریدگی ورق پڑھنے میں نہیں آیا لیکن اشعار کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں چھوٹی رقوم کے سکے ناپید ہونے کی وجہ سے غرباء کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور حکومت نے چھوٹے سکے رائج کر کے اس پریشانی کو دور کیا۔ شاعر نے اس پہلو کو سامنے رکھ کر حکومت کی تعریف کی۔ اسی کالم میں یہ خبر شایع ہوئی "سندھ نے یوپی سے چار لاکھ من گڑ خریدا۔" خبر کے مطابق گڑ کا نرخ پونے پانچ آنے فی سیر تھا گویا موجودہ شرح میں تیئس پیسے فی کلو!

کالم دو میں خبریں شایع ہوئیں جن کی سرخیاں مندرجہ ذیل ہیں:

کلکتہ کے دفاعی انتظامات بہت مستحکم ہیں۔ لوگوں کا حوصلہ بلند۔ ترکی وفد کے قائد ایم اتائی کا بیان۔

مسٹر چرچل کے لیے چاندی کا سگرٹ کیس۔

پنجاب کے شہروں میں جلوس نکالنے کی ممانعت۔ ڈیفنس قانون میں ایک سال کیلئے مزید توسیع کر دی گئی۔

سرکاری ملازموں کو مزید الاؤنس۔

آٹھ لاکھ اسّی ہزار ٹن کے جہاز امریکہ نے جنوری میں تیار کیے۔

پولیس کی وردیوں میں ڈاکہ۔ گیہوں کی پڑتال کرنے کا بہانہ۔

ڈھائی سو بوری گیہوں پکڑا گیا۔

یہ خبریں کل ہند نوعیت کی اور دلچسپ ہیں۔ سرخیاں ذہانت سے تیار کی گئی ہیں۔

شمارہ مورخہ ۷ / اگست ۱۹۴۲ء

سرورق۔ چار کالم۔ دو کالموں میں قاضی محمد عاشق حسین عاشق بریلوی کی نظم "فیشن کی ہوا"۔ اس نظم میں انتیس ۲۹ اشعار ہیں۔ شاعر نے مردوں اور عورتوں میں فیشن کی ہوا کی مذمت اس بنیاد پر کی کہ فیشن کرنے سے خرچ زیادہ ہوتا ہے جب کہ ذاتی آمدنی کا تناسب کم ہوتا ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ ؎

قیمتی اشیا ء سے فیشن کے مناسب ہے حذر
چاہتے ہو گر بڑھانا کچھ وقارِ زندگی

کالم تین کا عنوان ہے "لوکل" اس عنوان کے تحت میونسپل بورڈ بریلی کے ہونے والے انتخاب کے سلسلے میں بعض ناموں کی سفارش کی گئی ہے۔ کالم چار میں تین خبریں ہیں

۱۔ "بریلی ہندو مہا سبھا کا ایک مختصر جلسہ"۔ یہ جلسہ گاندھی جناح ملاقات کے خلاف ہوا تھا۔

۲۔ "مہتر یونین بریلی"۔ اس خبر میں مہتروں کو موسم برسات کے اختتام تک ہڑتال سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

۳۔ "مدرسہ اشاعت العلوم سرائے خام کے جلسہ ہائے سالانہ"۔ اس خبر میں جلسوں کی کارروائی کے علاوہ یہ بھی اطلاع دی گئی کہ ولایتی آتشبازی کے نہ ملنے کی وجہ سے بریلی کے مسلمانوں نے شب برات کے موقع پر آتش بازی میں حصہ نہیں لیا۔

صفحہ دو بھی چار کالم ہے اور ان میں جنگ عظیم دوم کی مفصل خبریں ملتی ہیں لیکن خبر رساں ایجنسی کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ خبروں کے عنوانات ہیں "جنگ کی رفتار"۔ "روسی فتوحات"۔ مغربی اور جنوبی محاذ"۔ "مشرق بعید" اور "برما اور جاپان"۔

مذکورہ اخبار کے شماروں سے جو قلیل معلومات ہدست ہوئیں ان سے یہی اندا

ہوا کہ اس کی پالیسی صلح کن تھی اور اس نے شہری وکل ہند سطح پر خود کو کسی دھڑے سے وابستہ نہیں کیا اور تجارتی اطوار پر ہی اس کو جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے لگاتار تینتیس برس عوام کی خدمت کی اور ۱۹۴۹۔۵۰ء کے پُر آشوب ماحول میں اس کے مدیر کے ترک وطن کی وجہ سے اس کی اشاعت بند ہوئی۔

عرش | مجھے ہفتہ وار عرش بریلی کا صرف ایک شمارہ بابت مئی ۱۹۳۶ء فراہم ہوا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد آٹھ۔ ورق کی لمبائی ½ ۳۴ سینٹی میٹر چوڑائی ½ ۲۵ سینٹی میٹر۔ کالموں کی تعداد تین اور مسطر ۴۴ سطری ہے۔ مقام اشاعت عرش پریس بڑا بازار بریلی اور کتابت وطباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ چکنا۔ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر رئیس الدین رئیس بریلوی۔ جوائنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد شریف خاں۔ صرف سرورق اور آخری صفحہ سرخ روشنائی سے۔ سرورق پر یہ شعر ملتا ہے ؎

فرش پر عرش کی تجلی ہے — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

سرورق پر ہی عاشق حسین سیماب اکبرآبادی (م ۱۹۵۱ء) کی نظم "اساس کائنات" جس کا مطلع ہے ؎

ہے محبت ہی سے پردہ داری راز حیات — بے خودی میں کل کسی آشنا نے کہدی یہ بات

صفحہ ۲ سے صفحہ ۸ تک جو مواد شایع ہوا، وہ اشتہارات اور عدالتی سمن کے علاوہ مندرجہ ذیل نوعیت کا ہے :-

۱۔ تاریخی مضمون "جھانسی کی رانی" مضمون نگار کا نام نہیں ملتا۔ (ص ۲)

۲۔ میونسپل بورڈ بریلی کے متعلق ایسی خبریں جو نکتہ چینی پر مبنی ہیں جیسے "مسلم مدارس میں ٹیچرس کی حق تلفی"۔ "ڈبلو آئی ایم ہائی اسکول بریلی"۔ "زعفرانیات" (ص ۳)

۳۔ سیاسی تبصرے اور خبریں مثلاً "دہشت انگیزی اور گورنمنٹ (ص ۴)، "اچھوت کانفرنس اور علمائے اسلام" (ص ۳)، "شہنشاہ حبش جیفہ میں (ص ۳)، "غازی انور پاشا کا آخری مکتوب" (ص ۵)۔

۴۔ مقامی سیاسی رہنماؤں اور انتخاب پر تبصرہ۔ جیسے "انتخاب لیجسلیٹو اسمبلی یو پی اور مولوی عزیز احمد خاں صاحب ایڈووکیٹ"۔

۵۔ ادبی مضمون مثلاً "کلمات" جس میں عورت و مرد کے احساسات و افعال کا تجزیہ کرکے عورت کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

۶۔ لطائف۔

ان مضامین کو پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ مدیر نے اخبار کے معیار کو اونچا کرنے کی سعی کی اور عوامی دلچسپی کا خیال رکھا لیکن ان مضامین کو پڑھنے کے بعد جن کا تعلق میونسپل بورڈ بریلی کی کارکردگی سے ہے اور جن کا تعلق مقامی سیاسی رہنماؤں سے ہے، یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اخبار کا بنیادی مقصد میونسپل بورڈ بریلی اور بریلی کے سیاسی رہنماؤں پر نکتہ چینی کرنا تھا اور دیگر مضامین بطور زیب داستان ہیں۔ تاہم نکتہ چینی کا رویہ ادبی اسلوب میں ہے اور پیرایۂ بیان مزاحیہ اور ظریفانہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "عرش" کے عہد تک بریلی کے تقریباً چورانوے برس کو محیط تاریخ صحافت میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مدیر کا منھ بند کرنے کے لیے اس کو اور اس کے اہل خاندان کو ملازمت دی گئی۔ خان بہادر شاکر داد خاں چیرمین میونسپل بورڈ بریلی نے مدیر "عرش" کے بیٹا اور خورد کو اکٹرا ے انسپکٹر کی جگہ دی۔ خود مدیر "عرش" کو جو ہائی اسکول کا امتحان بھی پاس نہیں تھا، اکٹرا ے انسپکٹر بنایا (۱۹۴۳ء) مدیر "عرش" کے سب سے چھوٹے

بھائی کو خاں صاحب معین خاں ممبر میونسپل بورڈ بریلی و اسسٹنٹ کنٹرولر آف اسٹورس اوفی ریلوے آئزٹ نگر بریلی نے اپنے محکمے میں ملازمت دی۔ اس طرح "عرش" اپنے اعلیٰ معیار کے باوجود شخصی مفاد سے وابستہ ہوگیا۔ یہ آغاز اتنا غلط تھا کہ ظریفانہ نکتہ چینی نے الزام واتہام تراشی کی جگہ لی اور رفتہ رفتہ معیار صحافت گرتا چلا گیا۔

ہفتہ وار "عرش" بریلی کا اپنا پریس تھا۔ مالی حالت بھی مضبوط تھی مدیر عرش کو اختر مرزا بسولوی (م۔ ۱۹۶۰ء) جیسے صاحب قلم قوم پرست صحافی کا تعاون بھی میسر تھا۔ مجموعی طور پر اخبار معیاری اور دیدہ زیب تھا لیکن خان بہادر شاکر داد خاں نے بالآخر مدیر عرش کو ملازمت دے کر اس کو ۱۹۴۳ء میں بند کرادیا۔ مدیر "عرش" جناب رئیس الدین ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۴ء (م ۸ جنوری ۱۹۵۴ء) نے اپنا تمام وقت میونسپل بورڈ بریلی کی ملازمت اور سیاست میں صرف کیا۔ "عرش پریس" ختم ہوگیا اور شعر و شاعری کی محفل جو رئیس الدین کے یہاں جمی رہتی تھی اور جس میں شکیل احمد شکیل بدایونی (م۔ ۱۹۷۰ء) شاہد عزیز روش صدیقی (م ۱۹۷۱ء) احمد بخش آبر گنوری (م ۱۹۷۳ء) سید علی احسن مارہروی (م ۱۹۵۹ء) عاشق حسین سیماب اکبرآبادی (م ۱۹۵۱ء) قمر الحسن قمر بدایونی (م ۱۹۴۱ء) اور سردار احمد خاں بہزاد لکھنوی (م ۱۹۵۱ء) نے شرکت کی اور ہفتوں قیام کیا، اجڑ گئی۔ رئیس الدین کے دم سے ہی شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی، محمد صمد یار خاں ساغر نظامی، محمد حفیظ حفیظ جالندھری، محمد اصغر شعری بھوپالی اور احسان الحق احسان دانش جیسے نامور شعراء بریلی آئے، مشاعروں میں شرکت کی اور بریلی کی محفل سخن کو چکا چوند کیا۔ عرش پریس بریلی سے ہی بہزاد لکھنوی کا مجموعہ کلام "نقوش بہزاد" شایع ہوا۔ یہ حق ہے کہ رئیس الدین کی میزبانی اور سخن پروری سے کم سے کم اس صدی میں بریلی میں اتنی کثرت

سے اساتذہ سخن کی مسلسل آمد نہیں ہوئی۔ صد حیف کہ میونسپل بورڈ بریلی کی سیاست نے جہاں "عرش" کو راہ سے ہٹایا وہاں اس کے مدیر کی سخن پروری کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

ہفتہ وار "عرش" بریلی کے ۱۹۴۳ء میں بند ہونے کے بعد اختر مرزا بسولوی نے "العرش" بریلی جاری کیا اور اس کے بند ہونے کے بعد "العرش جدید" کا اجرا کیا۔ ممکن ہے رئیس الدین کے ایما پر یہ اخبارات جاری ہوئے ہوں۔ لیکن اختر مرزا بسولوی کے تعاقب میں برٹش سرکار کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری رہتے تھے۔ ان کی کتاب "محشر لکھنؤ" بھی ضبط کیا جا چکی تھی۔ ان حالات میں اختر مرزا بسولوی اخبار کیا چلاتے، گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو جاتے تھے۔ اسی سلسلے کی آخری کڑی اختر مرزا بسولوی اور سید ابراہیم حسن رتسا بریلوی کا ہفتہ وار "ندرت" بریلی تھا جس کا تعارف آئندہ پیش کیا جائے گا۔

روہیلکھنڈ اخبار اسی نام کے اخبار کا حوالہ مقالات محارساں دی تاسی جلد اول میں ملتا ہے (ص ۹۲) گویا روہیلکھنڈ اخبار بریلی سے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء کی مدت میں جاری ہوا۔ زیر نظر روہیلکھنڈ اخبار بریلی ۱۹۴۰ء میں جاری ہوا تھا۔ ایک ہی نام کے دو اخباروں میں کیا باہمی تعلق تھا، اس کی وضاحت سردست ممکن نہیں ہے۔

میرے پاس زیر نظر روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے مندرجہ ذیل شماروں کے صفحات محفوظ ہیں:

۷ر جنوری ۱۹۷۷ء - ۱۴ر جنوری ۱۹۷۷ء - ۲۱ر جنوری ۱۹۷۷ء - ۲۶ر جنوری ۱۹۷۷ء - ۴/۱۱ر فروری ۱۹۷۷ء - ۴/۱۱ر مارچ ۱۹۷۷ء - ۱۱/۱۸ر مارچ ۱۹۷۷ء۔

مذکورۂ بالا شماروں کے ورق کی لمبائی ½ ۳۸ سینٹی میٹر اور چوڑائی ½ ۲۵ سینٹی میٹر ہے۔ تعداد صفحات آٹھ اور ہر صفحہ چار کالماں ہے۔ کتابت اور طباعت معمولی۔ کاغذ سفید

اور معمولی۔ پرنٹر پبلشر پروپرائٹر ایڈیٹر تیج بہادر سنہا ایم اے۔ ایل ایل بی، مشیر قانونی۔ رجسٹرڈ آفس کنور ہر نرائن بھون۔ اوگریز پیلس۔ ۱۲۵ دروزی چوک بریلی۔ نام مطبع بریلی الیکٹرک پریس بریلی۔

ہفتہ وار روہیلکھنڈ اخبار بریلی کا روزانہ ہندی ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ روزانہ ہندی اڈیشن کب تک جاری رہا اور کب بند ہوا۔

روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے مذکورہ بالا شماروں میں جملہ اہم مضامین انگریزی زبان میں ہیں جن کو تیج بہادر سنہا نے تحریر کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیج بہادر سنہا نے روہیلکھنڈ اخبار کو جاری رکھنے کے لیے اس کو اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی شایع کیا اور اس کے زیادہ تر مضامین بھی خود ہی تحریر کیے۔

تیج بہادر سنہا کا انتقال ۱۲ ستمبر ۱۹۷۰ء کو ہوا اور ہفتہ وار روہیلکھنڈ اخبار بریلی ان کی وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔

روہیلکھنڈ اخبار کے مالک اور مدیر تیج بہادر سنہا ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد دادا اور پردادا سب ہی زمیندار تھے۔ بریلی سے شاہ جہاں پور جانے والی سڑک کے کنارے بریلی سے دس کلومیٹر دور پرآناس۔ پرسونا اور ٹھریا نجابت خاں نام کے مواضعات ان کی زمینداری میں شامل تھے۔ شہری جائداد اس کے علاوہ تھی۔ ان کے خاندان میں انگریزی تعلیم اور انگریز حکام سے تعلقات کی دیرینہ روایت تھی۔ ان کے دادا لال بہادر سنگھ (م ۱۹۲۶ء) نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے ۱۸۸۰ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا اور دوران تعلیم ان کا قیام سر سید احمد خاں

(م، ۱۹۸۹ء) کی کوٹھی میں ہی ہوا تھا۔ شیخ بہادر سنہا نے تمام عمر گھر کے باہر جاتے وقت مغربی لباس زیب تن کیا۔ ان کی علمی استعداد بہت زیادہ تھی اور وہ خود بھی بہت ذہین انسان تھے۔ ان کا مزاج کچھ اس طرح کا تھا کہ اگر وہ کسی سے متاثر ہو جاتے تو اس کی بہت تعریف کرتے تھے اور اگر ناراض ہو جاتے تھے تو نظر انداز کرنے والے شخصی نقائص کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ ان کو اس رویے سے داد تو نہیں ملی البتہ انہیں بے داد کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کی اس مزاجی کیفیت کا اظہار ان کی تحریرات سے ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی (م، ۱۹۷۷ء) کی وفات پر ایک عمدہ تعزیتی مضمون قلم بند کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی تحریر میں جو بازپرسی کا رویہ اختیار کیا وہ مناسب نہیں تھا۔

"پروفیسر نورالحسن نے جو آج کل حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہیں ایک مرتبہ ملک کے جلیل القدر رہنماؤں میں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی شامل تھے اور بڑے بڑے عالموں میں جن میں ڈاکٹر تارا چند۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد بھی شریک تھے اور ملک کے نامور سیاست دانوں میں جن میں خود ان کے شعبۂ ریاضی کے صدر ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ سر شانتی سروپ بھٹناگر اور سر سی وی رمن بھی تھے۔ یہ اعلان کیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی انقلاب فرانس کے زمانے کے انسائیکلوپیڈیائی عالموں کی برابری نہیں کر سکتا۔ اب میں ان سے براہ راست خطاب کر کے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے علم کا حساب پیش کرتا ہوں اور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اٹھارویں صدی کی معلومات کے محدود احاطہ میں جن علماء نے تمام معلومات اور علوم کا احاطہ کر لیا تھا کیا ان کی معلومات

اس دریائے علوم سے بھی بلند و بالا تھیں .... اب صدق جدید کی اہمیت کا
اندازہ لگائیے۔ اس کی ہر ہفتہ وار اشاعت کا تمام ہندوستان اور پاکستان میں
بڑی بے تابی سے انتظار رہتا تھا۔ دونوں ملکوں میں تمام اردو اخبارات اور
رسائل ہر ہفتہ صدق جدید کی سچی باتیں اور شذرات شیر مادر کی طرح اپنا حق سمجھ کر
پوری کی پوری نگل جاتے تھے اور اس کے لیے کسی اجازت یا رسید کی ضرورت نہیں
سمجھی گئی ...... کیسی ذہنیت ہے علم و ادب کے تاجروں کی۔ بقول حضرت دلاور
نگار بدایونی ایسا لگتا ہے کہ ع کتوں کو سر راہ ادب چھوڑ دیا ہے۔
حضرت مولانا کے علم و فضل کا اعتراف سرزمین ہند پر کبھی نہ ہو سکا۔ اس کا ذمہ دار
وہ ماحول تھا جس میں علم کی سرپرستی کی تمامتر ذمہ داری ان ادب نما اور ادب خور
عملے پر ڈال دی گئی تھی جو ان کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد دے رہا تھا۔"

(روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء۔ ص ۶۔ ص ۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیج بہادر سنہا اپنی انا کے خول میں بند رہے اور اپنی انا کی
تسکین کے لیے اور اپنے خاندانی وقار کی صدائے بازگشت کے لیے قدآور شخصیتوں میں بھی
نقائص کے پہلو تلاش کرتے رہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان قدآور شخصیتوں کے
علمی و ادبی گوشوارے میں ان کے محاسن کا اعتراف کرنے کے بعد ان کے کسی نقص کا اظہار
نرم اور ہمدردانہ لہجے میں کرتے۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں
جن میں مدیر کے بازپرسی اور اتہام تراشی کے رویے کا شکار معروف شخصیتیں ہوئیں۔
یہاں صرف ایک مثال نواب مرزا داغ کے متعلق پیش کی جاتی ہے کہ مدیر نے کس طرح
حقائق سے چشم پوشی کی اور اپنے نانا ڈاکٹر بھولا ناتھ (۱۸۴۸ء تا ۱۹۱۱ء) کے تعلق سے

نواب مرزا داغ کے تئیں سبک رویہ اختیار کیا۔ اس نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۷ر جنوری ۱۹۶۶ء میں تحریر کیا :۔

" At Rampur he also became a poch with a strange takhallus, Doctor. I have preserved a very long ghazal of his own with corrections made in red ink by Hazrat Ameer Meenai; its last line is غزل پیش کرنے کے قابل یہی ہے۔
Ghazal Pesh Karne KeQabil Ehi Hai
When the great poet Dagh (حضرت داغ) was called by the Nawab, he wrote

لائے دہلی سے ایک مشکی کو آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

Dagh left for Delhi immediately"

حقیقت یہ ہے کہ نواب مرزا داغ بہ زمانۂ نواب یوسف علی خاں ناظم (م ۱۸۶۵ء) رامپور تشریف لائے، انھوں نے چوبیس سال رامپور میں قیام کیا اور نواب کلب علی خاں کی وفات (۱۸۸۷ء) کے بعد رامپور سے کوچ کیا۔ داغ کو داروغۂ اصطبل مقرر کیا گیا تھا۔ داغ کا رنگ مشکی تھا اور اصطبل میں گھوڑوں کو داغنے کا رواج تھا۔ ریاست رامپور کے اصطبل میں ہی ایک ماہر ہنرل گو مجرو رامپوری ملازم تھا۔ اسی نے داغ کی آمد پر یہ شعر کہا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کے ورود رامپور کے وقت ڈاکٹر بھولا ناتھ کی عمر تقریباً چودہ برس کی تھی۔
لہذا اس عمر میں ان کی ریاست رامپور میں ملازمت تو درکنار تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہوگی۔[9]
ڈاکٹر بھولا ناتھ کے متعلق جستجو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا تخلص ڈاکٹر تھا اور
وہ تیج بہادر سنہا کی محولہ بالا تحریر کی روشنی میں امیر مینائی (م ۱۹۰۰ء) کا شاگرد تھا۔ لیکن
امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں اس کا ترجمہ نہیں دیا ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے
کہ ڈاکٹر بھولا ناتھ کی ملازمت اور تلمذ کا زمانہ انتخاب یادگار (۱۸۷۳ء) کے بعد کا ہے۔
البتہ ڈاکٹر بھولا ناتھ کا ذکر خمخانۂ جاوید (جلد ۳۔ ص ۲۲۳) میں اس طور پر ملتا ہے:

"ڈاکٹر رامپوری۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ۔ ۱۸۹۹ء میں ریاست رامپور میں ملازم تھے۔
جدت کلام زود گوئی خوش کلامی اچھی زبان اور شوخ طبیعت آپ کے کلام کے جوہر ہیں ؎

یاد مژگاں کی جو ہے بادیہ پیمائی میں — خوب کانٹوں کے مزے آبلہ پا لیتے ہیں
تو نے اے چرخ کبھی چین سے رہنے نہ دیا — کٹ گیا دن تو بلائے شب فرقت آئی
بھولی صورت پہ یہ غصہ یہ ستم یہ شوخی — ڈھل کے کیا حسن کے سانچے میں قیامت آئی"

تیج بہادر سنہا کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے نانا کی شاعری کو متعارف کراتے اور ان کی شخصیت
کے محاسن بیان کرتے لیکن انھوں نے یہ طور اختیار نہ کر کے داغ کے تئیں سبک رویہ اختیار
کیا جس سے ان کی صحافی ذمہ داری مجروح ہوئی۔

تیج بہادر سنہا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ انھوں نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے
کی سند حاصل کی تھی۔ وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اجداد بھی تعلیم یافتہ تھے۔ مطالعہ
وسیع تھا۔ لیتھوگرافی کا فن ان کو ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے دفتر زمانہ کانپور میں صحافت
کا تجربہ حاصل کیا تھا۔[10] ان کی کمزوری ان کی انا تھی ورنہ ان میں اچھائیوں کی کمی نہیں تھی۔

انھوں نے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے تہذیبی اثرات کا جائزہ لیا اور مثبت رائے پیش کی۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مضامین تحریر کیے اور روہیلکھنڈ کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات بھی قلم بند کرنا شروع کر دی تھی جو نا تمام رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی کے ذریعے بڑا کام انجام دیا۔ ان کے مضامین کے ذریعہ روہیلکھنڈ اخبار بریلی کو کل ہند شہرت ملی اور اسکے مضامین دیگر اخبارات میں بھی شایع ہوئے۔ تیج بہادر سنہا نے تاریخی اور ادبی موضوعات پر لکھنے کی ترغیب پیدا کی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

تیج بہادر سنہا ایک ذہین سیاسی مبصر بھی تھے۔ انھوں نے آزاد ہندوستان کے مسائل جیسے خاندانی منصوبہ بندی، پچھڑے طبقے کی سرکاری ملازمتوں میں حصہ رسانی، جمہوریت اور الیکشن، سیاسی پارٹیاں، فرقہ واریت، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے قرض لینے وغیرہ کی پالیسی پر دانشورانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ انھوں نے "بنیادی فرائض" کا نظریہ پیش کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ جملہ مذاہب کے ایسے فرائض کو جو آپس میں یکساں ہیں اور قریب تر ہیں یکجا کر کے قومی سطح پر رائج کیا جائے تاکہ باہمی فاصلے دور ہوں اور نزدیکیاں پیدا ہوں۔ ان کے سیاسی تبصرے پسند کیے جاتے تھے اور ان کے اخبار کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی نے بریلی کے دیگر اخباروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ شہرت پائی اور اس کی کل ہند سطح پر پذیرائی ہوئی۔

چونکہ تیج بہادر سنہا ایک خاص انداز کے انسان تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے تعلقات اپنے اعزا اور احباب سے زیادہ دن قائم رہتے۔ عمر کے آخری ایام میں انکی اہلیہ کی وفات ہوئی، خود ان پر عارضہ قلب کا حملہ ہوا لیکن انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار کی اشاعت

جاری رکھی اور تن تنہا جملہ کام خود کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اخبار کو اپنی تحریرات سے بھرا اور بہ تخلص کیفؔ اپنا کلام بھی شایع کیا۔ ان کے کلام شعر میں الیکشن اور نیا دور آئے جس کی وجہ سے ان کی غزلیات سیاست اور تغزل کا معجون مرکب بن گئیں۔ انکے اشعار میں نہ کیف ہے اور نہ کیفیت۔ ان کے اشعار کو زیادہ سے زیادہ ظریفانہ کہا جاسکتا ہے۔

تاہم روہیلکھنڈ اخبار بریلی نے جو معیار صحافت پیش کیا اور جس استقلال سے تیج بہادر سنہا نے اس کو مرتے دم تک جاری رکھا اس کی داد نہ دینا غیر منصفانہ فعل ہوگا۔ روہیلکھنڈ اخبار بریلی سینتیس ۳۷ برس جاری رہکر ۱۹۰۰ء میں بند ہوا۔

ندرت سید ابراہیم حسن رسؔا بریلوی (م ۱۹۸۰ء) تلمیذ ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہاں پوری (م ۱۹۵۸ء) اختر مرزا بسولوی کے دست راست کی حیثیت سے ان کے ہفتہ وار "العرش" بریلی اور "عرش" بریلی کے لیے کام کرتے تھے۔ جب مذکورہ اخبارات بند ہو گئے، تو سید ابراہیم حسن رسؔا نے اختر مرزا بسولوی کے تعاون سے ۱۹۴۲ء میں "ندرت" کا اجرا کیا۔ "ندرت" کا دفتر ابراہیم حسن رسؔا کے رہائشی مکان واقع محلہ شاہ آباد کے ایک گوشے میں تھا اور شاہی پریس جس میں اس کی طباعت ہوتی تھی، نینی تال روڈ بریلی کے کنارے چھوٹے پل کے نیچے ایک بوسیدہ اور تاریک دوکان میں تھا۔ ابتدا میں شاہی پریس گلی خیر اللہ بازار دوزی چوک میں قائم ہوا تھا۔ برٹش سرکار کے وارنٹ اختر مرزا بسولوی اور شاہی پریس کا تعاقب کرتے تھے۔ جب اختر مرزا بسولوی، جو انٹی برٹش اشتہار لکھنے اور ان کو شاہی پریس میں طبع کرا کے مشتہر کرنے کیوجہ سے روپوش ہو جاتے، تو شاہی پریس بھی اپنی جگہ بدل دیتا تھا۔ شاہی پریس گلی خیر اللہ سے منتقل ہو کر محلہ

عقب کوتوالی میں قائم ہوا۔ وہاں سے بھی انٹی برٹش اشتہار شایع ہوئے۔ بالآخر شاہی پریس نینی تال روڈ پر چھوٹے پل کے نیچے منتقل ہوا۔ وہ ایسی محفوظ جگہ تھی جس کی نشاندہی مخبری کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ شاہی پریس آزادئ وطن کے بعد اور "ندرت" کے اجراء کے وقت اسی جگہ قائم تھا۔ بریلی میں انٹی برٹش کارروائیوں کے سلسلے میں جن محبان وطن نے مصائب کا سامنا کیا ان میں اختر مرزا بسولوی اور ابراہیم حسن رسّا ناقابل فراموش افراد ہیں۔

میرے پیش نظر "ندرت" کا شمارہ ۱۱/۱۲ جلد نمبر ۱۷ مورخہ ۲۱/۲۸ مارچ ۱۹۶۵ء ہے۔ یہ چار صفحات کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ ورق کی لمبائی ½ ۳۸ سینٹی میٹر اور چوڑائی ½ ۲۵ سینٹی میٹر ہے۔ کاغذ سفید معمولی۔ چار کالماں۔ کتابت خفی لیکن صاف۔ بین السطور مناسب فاصلہ۔ طباعت اعلیٰ۔ سرورق پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے ؎

ندرت مجھے کہتے ہیں شہرت ہے بہت میری
اس دور کشاکش میں خدمت ہے بہت میری

اس شمارے کا اشاریہ مندرجہ ذیل ہے:

صفحہ ایک درمیانی دو کالم میں "مصور فطرت حضرت عبرت صدیقی بریلوی" کی غزل بعنوان "خرام بہار"۔ اس کے بعد ایک خبر بعنوان "انصاف کا تقاضہ کیا کہتا ہے"۔ اس خبر میں چیرمین میونسپل بورڈ بریلی پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ کالم تین۳ اور کالم چار۴ کا عنوان ہے "بریلی میونسپل بورڈ کی خبریں۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے"۔ اس تحریر میں بھی چیرمین میونسپل بورڈ بریلی کی نکتہ چینی کی گئی ہے۔ کالم چار میں ہی یہ عنوان ملتا ہے "انکروچمنٹ ایک بدنما داغ ہے" جس کے ذیل میں میونسپل بورڈ بریلی کی آراضی پر ناجائز قبضے کی نشاندہی کی گئی ہے اور ساتھ ہی میونسپل بورڈ بریلی کی حرف گیری۔ صفحہ دو۲ پر ساڑھے تین ½۳ کالم میں اداریہ بعنوان "وطن کی آبرو خطرہ میں ہے" ملتا ہے۔ پورا اداریہ حرف نکتہ چینی اور حرف گیری کا

نمونہ ہے۔ اسی کالم کے باقی ماندہ حصے میں تجارتی اشتہارات ہیں جن میں ایک اشتہار خود "ندرت" کا ہے۔ صفحہ تین پر پونے چار کالموں میں "شاندار مشاعرے" کی روداد چھپی ہے جو ۲۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو مرزا انور بیگ چغتائی المتخلص بہ انور چغتائی کے مکان واقع مولانگر بریلی میں مولوی محمد حسین وکیل ایم ایل اے کی صدارت میں ہوا تھا۔ کالم چار کے آخر میں یہ خبر شایع ہوئی "ژالہ باری اور باد و باراں" جس کا تعلق ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو بریلی میں ژالہ باری اور باد و باراں کے نتیجے میں ہوئے نقصان سے ہے۔ صفحہ چار پر ہر کالم میں عدالتی سمن ملتے ہیں۔

اس اشاریے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) ہفتہ وار "ندرت" ایک مقامی اخبار تھا (۲) "ندرت" کا نشانہ میونسپل بورڈ بریلی تھا (۳) "ندرت" کی تحریر میں ناراضگی جھلاہٹ اور بیزاری کا اسلوب تھا۔ (۴) "ندرت" شاعری اور شاعر نواز تھا۔

دراصل رئیس الدین مدیر "عرش" بریلی نے میونسپل بورڈ بریلی پر جس نکتہ چینی کا آغاز کیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رویے کی توسیع "ندرت" میں ہوئی کیونکہ اختر مرزا البسولوی "عرش" سے "ندرت" تک ایک قلم بردار فرد مشترک تھے۔

سید ابراہیم حسن رسا کو آزادئ وطن کے بعد بھی چین نہیں ملا۔ وہ کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہوتے رہے۔ منشائے ایزدی، ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ایسے میں "ندرت" کیا چلتا۔ اس کو بند کرنا پڑا۔ انھوں نے "ندرت" کو ماہانہ چلانے کی کوشش کی اور چھ سات شمارے شایع بھی کیے لیکن اس کو بھی بند کرنا پڑا۔ عمر آخر میں وہ اپنے فرزند کے پاس دہلی گئے، اور دہلی میں ہی ان کی وفات ہوئی۔[12]

بریلی کا سفر صحافت جو ۱۸۴۶ء میں عمدۃ الاخبار کے اجراء سے شروع ہوا تھا۔ خود اردو صحافت کے ارتقائی منازل کی شناخت کراتا ہے۔ یہ سفر تعلیمی و اصلاحی رجحان سے شروع ہوکر بازپرسانہ صحافت تک پہنچا۔ یہ سفر اب بھی جاری ہے۔ اس دور کشاکش میں اس کی حیثیت مقامی بن چکی ہے۔

حواشی

۱۱ میری ننھیالی حویلی محلہ عقب کوتوالی بریلی میں تھی۔ سید الطاف علی بریلوی میرے حقیقی ماموں تھے جن کے دو منزلہ مکان میں روزانہ اخبار بریلی کا مطبع اور دفتر تھا۔ لہذا میں نے یہ تحریر اپنی ذاتی واقفیت پر تحریر کی ہے۔ ۱۲ ویسٹرن انگلس میموریل ہائی اسکول بریلی۔ اس کی بنیاد کلکٹر بریلی انگلس نے ۱۸۶۱ء میں رکھی تھی۔ ابتدا میں اس کا نام مدرسۂ انگلس گنج تھا۔ اپنے زمانے کا شہرت یافتہ اسکول ہے۔ اسی کلکٹر نے شہر کہنہ بریلی میں ایسٹرن انگلس میموریل اسکول کا آغاز کیا۔ اب یہ انٹر کالج ہے۔ اول الذکر کا نام تلک انٹر کالج ہے اور بعد الذکر کا مولانا آزاد انٹر کالج بریلی۔

۱۳ یہ معلومات تیج بہادر سنہا کے خود نوشت سوانحی حالات پر مبنی ہیں جو انھوں نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی میں مورخہ ۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو بزبان انگریزی شایع کیے۔ سنہا صاحب سے میری بھی یاد اللہ تھی۔ ۱۴ ہم نے اس شعر کے متعلق تفتیش کی۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ رامپوری نے اپنے خطوط مورخہ ۲ جولائی اور ۷ جولائی ۱۹۹۳ء میں تحریر کیا کہ مذکورہ شعر مجروؔ رامپوری کا ہے جو بہترین ہزل گو اور ریاست کے اصطبل میں ملازم تھا۔ اس کی بیاض شاعری اب نہیں ملتی۔ چونکہ وہ ملازم ریاست تھا لہذا اس کا نام پوشیدہ رہا اور روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔

۱۵ تیج بہادر سنہا نے روہیلکھنڈ اخبار بریلی مورخہ ۲ جنوری ۱۹۷۰ء میں تحریر کیا کہ:

"۱۹۳۸ء میں مجھے منشی دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" اور "آزاد" کے دفتر میں ستاون

دن کام کرنے کی سعادت حاصل تھی۔"

تیج بہادر سنہا نے اسی اخبار کی ۶ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں تحریر کیا تھا کہ:

"لیتھوگرافی کا فن میرے خاندان کی چار پیڑیوں سے مجھے براہ راست پہنچا ہے۔"

۱۱ یہ مشاعرہ تبارک علی صدیقی المتخلص بہ عبرت کے کراچی منتقل ہونے پر منعقد ہوا تھا۔ عبرت صدیقی اپنے عمدہ اخلاق اور شاعری کی وجہ سے بریلی میں مقبول تھے اور ان کے تلامذہ بھی بہتر شاعر تھے۔ انور چغتائی ان کے ہی شاگرد ہیں۔ عبرت صدیقی نے ۱۹۹۰ء میں کراچی میں وفات پائی۔ ۱۲ ہم نے سید ابراہیم رسا کے عمر آخر کے حالات ان کے چھوٹے بھائی سید عابد حسن کلیم سے معلوم کرکے تحریر کیے ہیں۔

حوالجات

مقالات گارساں دی تاسی۔ جلد اول۔ مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں و پروفیسر عزیز احمد۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ ۱۹۴۳ء۔

روداد ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن جے پور ۱۹۴۲ء۔ مخزونہ مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یادگاری مجلہ کل ہند سیمینار شیو برت لال برمن۔ شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ دیوان راجہ عنایت سنگھ عنایت۔ ناقص الاول۔ مطبوعہ ۱۹۰۰ء۔

خمخانۂ جاوید۔ سری رام۔ جلد سوم۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔

مقالہ "حضرت مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بریلی کا کتب خانہ" مولفہ سید بدرالدین علوی، استاد شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۵۲ء۔

استاذ الاساتذہ ملا عبدالسلام اعظمی دیوی

از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

ہندوستان میں معقولات اور علم کلام کی زیادہ ترقی و اشاعت جلال الدین محقق دوانی (د ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲ء) کے تلامذہ سے ہوئی۔ ان کے ارشد تلامذہ میں خواجہ جمال الدین محمود تھے جن کا دیرپا سلسلۂ تلمذ ان کے دو شاگردوں میرزا جان شیرازی اور امیر فتح اللہ شیرازی (د ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء) سے چلا۔ موخر الذکر جب بیجاپور سے اکبری دربار میں آئے تو شہرت و ناموری کے اوج پر پہنچے اور پورے ملک میں علوم عقلیہ کی ترویج و اشاعت زور و شور سے شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں بلند پایہ علمائے معقولات پیدا ہوئے۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (د ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء) ملا عبدالسلام لاہوری (د ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء) ملا عبدالسلام دیوی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (د ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶ء) ملا کمال الدین کشمیری، ملا عصمت اللہ سہارنپوری (د ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۳۰ء) ملا محمود جونپوری (۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء) اور ملا عبدالحلیم سہالوی جیسے بے شمار علماء اپنے اپنے عہد میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے سامنے جن فضلا نے زانوے تلمذ تہ کیا یا جنھوں نے ان کے تلامذہ سے اکتسابِ فیض کیا وہ بھی اپنے زمانے کے ائمہ معقولات ہوئے اس سلسلہ میں اودھ کے علماء نمایاں ہیں۔

امیر فتح اللہ شیرازی (د ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء) کے شاگرد رشید ملا عبدالسلام

لاہوری کے شاگرد ملا عبدالسلام دیوی اور ان کے ملا عبدالحلیم سہالوی ہوئے۔ ملا عبدالحلیم سہالوی کے ارشد تلامذہ میں انکے بیٹے ملا قطب الدین شہید (۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) اور انکے شاگرد اور فرزند ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) ہیں۔ ملا کمال الدین سہالوی (۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) نے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اپنے استاد ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) سے کی اور اس طرح وہ خیرآبادی خاندان کے مورثِ اعلیٰ ہوئے کہ علامہ فضل امام خیرآبادی (۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء) وغیرہ کا سلسلۂ تلمذ ان ہی کے واسطے سے ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تک پہنچتا ہے۔

ملا عبدالسلام دیوی اعظمی اپنے عہد کے امام معقولات اور استاذالاساتذہ ہیں لیکن اکثر ہندوستانی مشاہیر کی طرح ان کے حالات زندگی بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ راقم السطور کو باوجود تلاش و تفحص کے ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہوسکے یہانتک کہ ان کی ولادت و وفات کے سنین کی صراحت بھی کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گذری۔ ان کے معاصر تذکروں، شاہجہاں نامہ، طبقات شاہجہانی، عمل صالح وغیرہ اور بعد کے تذکروں، مآثر الکرام، بحر زخار وغیرہ میں بھی ان کا ذکر نہایت مختصر ہے۔ ان کے تفصیلی حالات کا سب سے اہم ماخذ شیخ خیرالزماں لکھنوی کی "باغ بہار" ہے۔ دوسرا اہم ثانوی ماخذ مولانا حافظ شاہ علی حیدر قلندر کاکوروی کی "تذکرۂ مشاہیر کاکوروی" ہے۔ علاوہ ازیں کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری، مولفہ مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی و نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد ملا عبدالکریم مولفہ منشی امیر احمد علوی کاکوروی (ڈپٹی کلکٹر) میں بھی ان کے بارہ میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ انھی تذکروں کی مدد سے اس افضل اجل اور استاذالاساتذہ کے بارے میں یہ سطور قلم بند کی جارہی ہیں۔

خلاصۂ آداب و قوانین المعروف بہ اسم تاریخی باغ بہار (۱۲۱۱ھ) کے مولف علی غنی عرف شیخ محمد خیر الزماں لکھنوی (۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) بن محمد وجیہ الزماں اعظمی نقوی، ملا صاحب مذکور کے احفاد میں ہیں۔ ان کے تذکرہ کی بنیاد بعض خاندانی بیاضوں اور آبائی شجروں پر ہے۔ اس کے تین نسخے راقم احقر کے علم میں ہیں۔ اول الذکر نسخہ کتب خانہ انوریہ۔ خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں ہے۔ دوسرا فرنگی محل لکھنؤ میں ابوالاحیار مولانا محمد نعیم انصاری فرنگی محلی (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ تیسرا نسخہ شعبۂ فزیالوجی۔ میڈیکل کالج، مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر سید وجیہ الحسن صاحب مرحوم کی ملک تھا۔ اول الذکر دونوں نسخے کسی کم علم کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

ملا سید عبدالسلام اعظمی دیوی شاہجہانی عہد کے سربرآوردہ اور ذی علم شخص تھے۔ آبائی وطن دیوہ ضلع بارہ بنکی تھا، ننہال کاکوری (ضلع لکھنؤ) تھا چنانچہ اپنے نانا حضرت مخدوم ملا عبدالکریم علوی (۱۰۳۹ھ/ ۱۶۲۹ء) نبیرۂ حضرت مخدوم قاری شیخ نظام الدین بھکاری (۹۸۱ھ/ ۱۵۷۴ء)[1] کے پاس رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں لاہور جاکر ملا عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء) سے اکتساب کیا۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ملا عبدالسلام دیوی چونکہ حضرت مخدوم سید اعظم ثانی لکھنوی[2] کی اولاد میں تھے۔ جیسا کہ ان کے نسب نامہ سے اندازہ ہو جائیگا۔

---

[1] موصوف کے حالات کے لیے راقم کا مقالہ معارف۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ جولائی۔ اگست ۱۹۸۰ء نیز اسکی کتاب "کواکب" ملاحظہ ہوں [2] حضرت سید مخدوم شیخ اعظم ثانی اپنے عہد کے ایک متبحر عالم، علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور فقہ حنفی میں ممتاز تھے۔ عرب و عجم میں اپنی علمی لیاقت، فضل و کمال اور تصنیفات کی وجہ سے مشہور تھے۔ ۲۱ رشوال ۸۰۰ھ/ ۱۴۶۶ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

اس واسطے وہ اپنے نام کے ساتھ اعظمی لکھتے تھے، لیکن مولانا عبدالقدوس صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ وہ دیوہ (ضلع اعظم گڈھ) کے رہنے والے تھے[۱]

سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ملا سید عبدالسلام (۱) ابن مولوی ابوسعید (۲) ابن مولوی محب اللہ برخوردار (۳) ابن مولوی عبدالرحیم فیاض (۴) ابن مولوی احمد فیاض (۵) ابن حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی لکھنوی (۶) ابن شاہ ابوالبقا (۷) ابن محمد موسیٰ (۸) ابن شاہ ضیاء الدین (۹) ابن شاہ شجاع کرمانی (۱۰) ابن امیر مبارز الدین (۱۱) ابن امیر مظفر (۱۲) ابن خواجہ غیاث الدین (۱۳) ابن امیر محمود (۱۴) ابن امیر علی (۱۵) ابن امیر احمد علی (۱۶) ابن امیر جعفر (۱۷) ابن امیر عبداللہ (۱۸) ابن سید علی اصغر (۱۹) ابن امام محمد تقی (۲۰) ابن امام موسیٰ رضا (۲۱) ابن موسیٰ کاظم (۲۲) ابن امام جعفر صادق (۲۳) ابن امام محمد باقر (۲۴) ابن امام زین العابدین (۲۵) ابن امام حسینؓ (۲۶) ابن حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

قیاس یہ ہے کہ حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی سمرقند سے ہجرت کر کے وارد ہندوستان ہوئے۔ بعد میں لکھنؤ آکر مقیم ہو گئے اور یہیں وفات پائی۔

مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء) اپنے جد حضرت ملا عبدالکریم کاکوروی (۱۰۳۹ھ/ ۱۶۲۹ء) کی اولاد کے حال میں رقمطراز ہیں:

"ملا عبدالکریم کی شادی سید محمدی فیاض خلیفہ بندگی نظام الدین امیٹھوی کی بیٹی سے امیٹھی قصبہ میں ہوئی تھی۔ ان بی بی سے دو بیٹیاں اور تین بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلی بیٹی

---

[۱] تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۱۲/ ۲۹۹۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور [۲] باغ بہار مصدر سابق۔ کتبخانہ انوریہ۔ کاکوری۔

محمد اشرف ابن شیخ عبدالقادر جو آنجناب کے بھتیجے تھے کو بیاہی گئیں ......

دوسری بیٹی کی شادی دیوہ میں مولوی ابوسعید ابن مولوی محب اللہ جو حضرت مخدوم شیخ اعظم ثانی لکھنوی کی اولاد میں تھے کے ہمراہ ہوئی۔ ان سے ملا عبدالسلام وغیرہ چار بیٹے پیدا ہوئے۔ ملا عبدالکریم صاحب نے خود سب کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت فرمائی۔[1]

ملا عبدالسلام مرحوم مخدوم شیخ عبدالکریم کے شاگرد اور ان کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء۔ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے عہد میں پہلے لاہور کے مدرسہ میں استاد اور بعد میں شاہی لشکر کے مفتی ہوگئے۔ اس وقت کے بڑے علماء میں تھے۔ ان کی تصانیف میں انشراحات معالیہ ہے۔ قصبہ دیوہ کے حاجی محلہ میں ایک حویلی میں رہتے تھے۔ یہ حویلی بعد میں انھوں نے اپنی بیٹی کو دیدی تھی۔[2]

درس و افادہ | ملا صاحب موصوف اپنے استاد ملا عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء) سے بقیہ علوم کی تکمیل کرکے ان کے نقش ثانی بنے۔ "مآثر الکرام" کے مولف نے اسکی صراحت اس طرح کی ہے کہ:

چنانچہ اتحاد اسمی متحقق بود نسبت فضیلت نیز مرتبہ مساوات بہم رسانند[3]	ہمنام ہونا تو ثابت ہے ہی بلکہ فضیلت کی نسبت اور مساوات کا مرتبہ بھی ایک ہی تھا۔

استاد کی وفات کے بعد لاہور میں ان کے قائم کردہ مدرسہ میں ان کی جگہ مدرس

---

[1] "کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری" ص: ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۳۶ [3] مآثر الکرام۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ۱: ۲۳۶ - ۲۳۵۔

بھی رہے یہیں ملا عبدالحلیم سہالوی جد ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) ملا دانیال چوراسی اور ملا عبدالقادر فاروقی جیسے مشاہیران کے ارشد تلامذہ بنے۔ ملا صاحب عہد شاہجہانی میں کچھ روز دہلی کے قاضی بھی رہے۔ اس کے بعد شاہجہاں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء - ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے مفتی لشکر ہو گئے۔ "بادشاہ نامہ" کے مولف لکھتے ہیں:

> "کچھ دنوں تک انھوں نے طالب علمی کا زمانہ گزارا، اپنی بیدار بختی کی سعادت سے اپنے کو دربار کے خاقانوں کی ڈیوڑھی تک پہنچایا اور خلق کو پناہ دینے والی درگاہ کے ملازموں کی لڑی میں خود کو شامل کر لیا۔ کچھ دنوں تک انھوں نے نائب فوج کی خدمت انجام دی۔ اب عمر کی زیادتی کی وجہ سے حواس میں اختلال اور اعصابی سستی آگئی ہے حکم کے مطابق اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ لشکر شاہی میں علوم متداولہ کی تدریس اور بادشاہ سلامت کے لیے دعائے خیر میں وقت گزارتے ہیں۔"[1]

"عمل صالح" سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اخیر وقت تک انھوں نے درس و افادہ میں اپنے کو مشغول رکھا۔[2]

صاف گوئی | ملا صاحب اپنے فضل و کمال اور تبحر نیز استغنا کی بنا پر کبھی جلالت شاہی سے مرعوب نہ ہوئے۔ برسر دربار حق بات کہتے اور اس میں نہ کسی مصلحت کی پروا کرتے اور نہ کسی کی رو رعایت کرتے۔ "باغ بہار" کے مولف نے اس سلسلہ میں کئی واقعات درج کیے ہیں:

---

[1] بادشاہ نامہ۔ عبدالحمید لاہوری، کلکتہ ۱۸۶۸ء ۲: ۳۴۳-۳۴۴ [2] عمل صالح۔ محمد صالح کنبوہ لاہوری ۳: ۳۹۰

"اپنے زمانہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاہجہاں ان کی استادی اور علمی تبحر کی بنا پر ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور دربار میں اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ اردوئے معلیٰ (لشکر شاہی) کے افتا کی سند بھی ایک طویل عرصہ تک آنجناب موصوف سے متعلق رہی۔ اتفاقاً ایک روز شاہ جہاں قلعہ معلیٰ (دہلی) کی تعمیر ملاحظہ کرنے اسکی فصیل پر آئے تھے۔ ملا صاحب کو بھی وہاں حاضر نہ ہوسکنے کا کوئی معقول عذر نہ ملا۔ (چنانچہ وہ بھی وہاں آئے) دیوار پر چلنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے انکے پیر ذرا لڑکھڑا گئے۔ بادشاہ نے (یہ دیکھ کر) کہا ارے آپ اس قدر موت سے ڈرتے ہیں کہ فصیل پر چل نہیں سکتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں کیوں نہ ڈروں اس لیے کہ چرخ اگر ہزار سال بھی پھرے تو بھی میرا جیسا پیدا نہ ہوگا اور بادشاہ سلامت جیسے بہت سے پیدا ہو جانے ممکن ہیں۔ بادشاہ نے اس (جسارت و بیباکی) کا برا نہ مانا بلکہ مسکرا دیے۔"

ایک دوسری جگہ ملا صاحب کی جسارت، مزاج کے تیکھے پن اور حق گوئی کا بیان اس طرح کرتے ہیں :

" شاہ جہاں کے ولی عہد دارا شکوہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ بادشاہ سلامت سایۂ الٰہی اور خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ آپ کے مرتبہ و منزلت کو پہچان کر آپ کی تعظیم و تکریم بجا لائے، اس بنا پر حضور عالی کے تمام غلام آداب شاہی سے مطلق روگردانی نہیں کرتے مگر ملا عبدالسلام جو قرآن و حدیث سے پوری طرح باخبر ہیں، اس امر کی پروا نہیں کرتے حالانکہ وہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ (اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اور تم میں جو صاحبان اقتدار (اولی الامر) ہوں ان کی فرمانبرداری کرو) کے معنی و مفہوم خوب جانتے ہیں مگر (پھر بھی) اس پر عمل نہیں کرتے۔ بادشاہ نے فرمایا جب ملا صاحب آئیں تو ان سے اس آیت کے معنی پوچھنا اور (تب) ان کو ملزم ٹھہرانا۔ داراشکوہ نے جب ملا صاحب دربار میں موجود تھے ان سے اس آیت کے معنی پوچھے ملا صاحب نے جواب دیا کہ ظاہر ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان کی جو ان کے جانشین ہوں۔ داراشکوہ نے (پھر) پوچھا کہ نائبین کا اطلاق کن پر ہوتا ہے۔ ملا صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے جیسے (علمائے حق) نائبین رسولؐ ہیں جو مخلوق کو دین حق کی راہ پر چلاتے ہیں۔ اس وجہ سے بادشاہ کے لیے لازم ہے کہ ہماری اطاعت کرے۔ داراشکوہ خاموش ہو گئے اور شاہ جہاں مسکرا دیے اور کہا بیٹا! ملا صاحب کا جواب سن لیا، اس گفتگو سے ملا صاحب کی شخصیت و مزاج کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

"طبقات شاہجہانی"[1] سے بھی جو ملا صاحب موصوف کی حیات میں مرتب کی گئی یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ جہاں نے ان کو اردوئے معلیٰ کے افتا کی خدمت تفویض کی تھی۔ دہلی کے قیام کے دوران انھوں نے حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے۔

ملا صاحب کو نہ بحث و مناظرہ کی عادت تھی اور نہ وہ فروعات میں پڑتے تھے۔ طبقات شاہجہانی کے مولف لکھتے ہیں:۔

---

[1] طبقات شاہجہانی۔ ان آٹھ سو اکہتر مشاہیر کا ایک اہم تذکرہ ہے جو تیمور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں گزرے ہیں۔ اس کے مولف محمد صادق ہمدانی ہیں جنھوں نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں اس کو مرتب کر کے شاہ جہاں (م ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء) کو معنون کیا تھا۔

"ہندوستان کے مشہور علماء و دانشوروں میں سے ہیں فقہ، اصول فقہ اور معانی و بیان میں ایک عجیب ملکہ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اصول فقہ میں کوئی کتاب لکھی ہے جو تلویح کی ہم پایہ ہے، وہ بادشاہ سلامت کے پاس حاضر ہوئے آنجناب کو ان کا طریقہ پسند آیا چنانچہ لشکر شاہی کے مفتی کی خدمت سپرد فرمائی .... مزاج درویشانہ ہے، طالب علموں کی طرح بحث و مباحثہ سے سروکار نہیں رکھتے۔ جب تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو چند روز قطب وقت حضرت خواجہ محمد باقی کی خدمت میں رہے۔ یہ معنی ان ہی کی صحبت کی برکت سے حاصل کیے۔ ان کی عمر دراز ہو"[1]

وفات ملا صاحب موصوف کی ولادت و وفات کے سنین اب تک متحقق نہ ہو سکے۔ وفات کے سنہ میں کافی اختلاف ہے۔

"عمل صالح": مولفہ محمد صالح کنبولا ہوری کا سن تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء)[2] ہے۔ اس کے مولف لکھتے ہیں:

آخر کار در وقت موعود رخت ہستی بر بست[3] (بالآخر وقت مقررہ پر زندگی کے سامان کو لپیٹ دیا (وفات پائی)

عم محترم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مرحوم و مغفور نے اپنے مقالہ[4] "ملا قطب الدین شہید" میں مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) کی بیاض کے حوالہ سے لکھا کہ "ملا عبدالسلام دیوی کا سال وفات افضل العلماء سے نکلتا ہے (۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء) اور دوسرا مادۂ تاریخ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل ہے۔ رسالہ قطبیہ اور دو ایک تذکروں میں ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء ہے۔

---

[1] طبقات شاہجہانی۔ محمد صادق ہمدانی۔ ۲۲۷ فارسیہ اخبار یونیورسٹی کلکشن۔ علی گڑھ ص ۶۱۷ [2] ملاحظہ ہو MUGHALS IN INDIA BY D.N. MARSHAL — [3] عمل صالح جلد ۳ ص ۳۹ [4] فکر و نظر۔ دہلی۔ جلد ۸ شمارہ ۱۔

راقم السطور کی نظر میں دونوں سنین محلِ نظر ہیں۔ "عمل صالح" کی تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے وقت ملا صاحب موصوف کی وفات ہو چکی تھی۔ ۱۰۴۲ھ/۳۳-۱۶۳۲ء بھی اس لیے درست نہیں ہے کہ اس کے تقریباً ۴ سال بعد جب "طبقات شاہجہانی" مرتب کی گئی تو اس میں ان کی درازیٔ عمر کی یوں دعا کی گئی (ان کی عمر دراز ہو[1])۔ مزید برآں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ذخیرۂ فرنگی محل میں موجود "ہدایہ اخیرین" پر ترقیمہ سے اس بات کی توثیق ہو جاتی ہے کہ وہ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰-۱ء میں نہ صرف بہ قید حیات تھے بلکہ درس بھی دیتے تھے۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے دادا ملا عبدالحلیم سہالوی لکھتے ہیں:

"کتاب ہدایہ کا نصف آخر عبد ضعیف اپنے غنی و بزرگ و برتر رب کا رحمت کا محتاج عبدالحلیم بن عبدالکریم انصاری سہالوی کے ہاتھوں تمام ہوا (ہدایہ کی نقل) کے پڑھنے کا سلسلہ بھی علمائے عصر کے ان استاد کی خدمت میں ہوتا رہا جو زمانہ کے فقہا کے مرجع و ماوی معقولات و منقولات خصوصاً فقہ و اصول فقہ میں اکابر فضلاء کی حجت حضرت شیخ عبدالسلام الاعظمی ہیں۔ سہ شنبہ ۱۸ ارمضان المبارک سنہ ۱۰۵۰ھ بوقت عصر بہ مقام پایۂ تخت لاہور۔

میں نے یہ کتاب اس وجہ سے لکھی تاکہ یہ قیامت کے روز میرے گناہوں کی سفارش کرے، بندہ کے جسم کی فنا کا تو علم ہے کہ وہ فنا ہو جائے گا مگر دنیا میں اس کی یہ تحریر بطور نشانی رہ جائے گی۔"

خلاصہ یہ ہے کہ ملا عبدالسلام دیوی شاہ جہاں کے عہد ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء)

---

[1] طبقات شاہجہانی ص ۲۱۷۔

تک بقید حیات تھے۔ عمل صالح کی تکمیل (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے وقت ان کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی وفات ان ہی دو برسوں میں کسی سال میں ہوئی۔ ان کا مزار قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں ہے۔

خاندان | ملا صاحب موصوف کے چار بھائی تھے۔ ایک بھائی لاولد فوت ہوئے اور دو بھائیوں سراج الدین و محمد یسین نے غیر کفو میں شادیاں کر لیں جس کی وجہ سے ملا صاحب نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کی شادیاں ان کی اولادوں (بھتیجوں و بھتیجیوں) کے ساتھ نہ کیں۔ چنانچہ اپنی ایک بیٹی کی شادی بھی کاکوری ہی میں خاندان میں کی[1]۔ خود ملا صاحب کے چار بیٹے اور ایک بیٹی[2] تھی۔

۱۔ ملا ضیاء الدین ۲۔ ملا عبد الوالی ۳۔ ملا عبد الباقی ۴۔ ملا ابو المعالی[3]

اول الذکر تینوں بیٹوں سے اولادیں ہوئیں جنھوں نے فضل و کمال میں شہرت حاصل کی۔ مولانا نور الہدیٰ، ملا نظام الدین احمد، ملا سید عبد الحفیظ، حضرت شاہ ابو المنعم قادری گنج المعرفت صاحب ولایت قصبہ دیوہ، مولانا ذوالفقار علی، مولانا برہان الدین، ملا عبد الباقی شارح مثنوی مولانا روم موسومہ بہ کشف مثنوی معنوی اور ملا عبد الصمد مفسر صاحبان جیسے بکثرت مشاہیر ان کے اخلاف کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کے چاروں صاحبزادگان علم و فضل میں اپنے والد کے نقش ثانی تھے۔ ملا ابو المعالی اپنے والد کے سامنے لاولد فوت ہوئے۔ ملا صاحب موصوف نے بیٹے کے دوران درس ان کے واسطے

---

[1] باغ بہار۔ مصدر سابق [2] یہ بیٹی شیخ سیف الدین نبیرۂ حضرت مخدوم ملا عبد الکریم علوی کی بیوی تھیں۔ ۱۲ منہ [3] مزید تفصیلات اور خاندانی شجرہ کے لیے "نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد ملا عبد الکریم مولفہ منشی امیر احمد علوی کاکوروی (ڈپٹی کلکٹر) ملاحظہ ہو۔

"الانشراحات المعالیہ" تصنیف فرمائی۔ چنانچہ وہ "انشراحات معالیہ" میں رقمطراز ہیں :

" ولما کان الداعی الی ہذہ التحریر الولد المغفور المعروف بابو المعالی
وکان التحریر مفید الانشراح خاطرہ سمیتہ بالانشراحات المعالیۃ"

اس کا ایک عمدہ نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری میں بھی محفوظ ہے۔

تصانیف | راقم کے علم میں ملا صاحب موصوف کی دو تصانیف موجود ہیں۔ ۱۔ انشراحات المعالیہ ۲۔ شرح تہذیب المنطق والکلام۔

۱۔ الانشراحات المعالیہ: "المنار" اصول فقہ کا مشہور متن ہے۔ اس کے مصنف امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد معروف بہ حافظ الدین نسفی (۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) ہیں۔ مصنف نے بھی اپنے اس عمدہ متن کی شرح "کشف الاسرار" کے نام سے کی تھی۔ ہندوستان میں منار کی سب سے پہلی شرح غالباً مولانا سید یوسف بن جمال حسینی، مدرس مدرسہ فیروز شاہی کی توجیہ الافکار ہے پھر جن بہ کثرت علماء و فضلاء نے اس متن کی شرح اپنے اپنے انداز میں کی ان میں سعدالدین ابوالفضائل دہلوی (۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء) کی "افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار"، ناصرالدین ابن الربوۃ دمشقی (۷۶۴ھ/۱۳۶۳ء) کی "قدس الاسرار"، شیخ شجاع الدین ہبۃ اللہ ترکستانی (۷۳۳ھ/۱۳۳۲ء) کی تبصرۃ الاسرار فی شرح المنار"، شیخ جمال الدین یوسف کی "اقتباس الانوار" اور جلال الدین ابن احمد رومی فقیہ حنفی (۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) کی شرح ہیں۔ ہندوستان میں ملا احمد جیون امیٹھوی (۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء) کی شرح نورالانوار درس نظامی میں داخل رہی ہے۔ ملا نظام الدین فرنگی محلی (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) نے "الصبح الصادق" کے نام سے اسکی شرح لکھی ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب "عربی ادب میں اودھ کا حصہ" ص ۹۵۔

"الانشراحات المعالیہ" یا "شرح علی المنار" کے دو نسخوں کا علم ابھی تک راقم کو ہوا ہے۔ اول الذکر نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری میں محفوظ ہے اور دوسرا نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرۂ مخطوطات (ایچ۔ ایل ۱۴۸۷) میں موجود ہے۔ موخرالذکر نسخہ ناقص الاول ہے۔ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کا نسخہ مکمل ہے یہ متوسط تقطیع میں پانچسو آٹھ صفحات پر مشتمل بخط نستعلیق و خفی ہے۔ حمد و ثنا کے بعد اس کی ابتدا اس طرح ہے:

"الحمد للہ الذی دل علیٰ وجودہ بتکوین المخلوقات مع خطاب کن القدیم وخص من بینھا الانسان بالدلالۃ علیہ بافعالہ واقوالہ بلطفہ العمیم حتیٰ صار مثل نور اللہ فی اظہار احوال العلویات والسفلیات والجسمانیات والروحانیات" الخ

بعدازاں منازل الاصول کی شرح کے سلسلہ میں تمہیدی کلمات کے بعد ان سطور کو لکھنے کے داعی یعنی اپنے مرحوم بیٹے ابوالمعالی کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب پر جابجا مفید حواشی ہیں اور منار کی مختصر عبارتوں کو لکھنے کے بعد انکی تفصیل و تشریح اور تفسیر کی ہے۔ دونوں نسخوں پر ترقیمہ کی عبارت میں سن کتابت درج نہیں ہے۔

خدابخش لائبریری کے نسخے کا خط کافی جلی ہے اس کی ابتدا اس طرح ہے:

" اعلم ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ صفات ثمانیۃ قدیمۃ الحیٰوۃ والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر والعلم والکلام والتکوین اثبتہ قوم من علماء ماوراء النھر وفی بعض الکتب اثبتہ الحنیفہ وھی لیست عین الذات ولا غیرھا۔" الخ

۲۔ شرح تہذیب المنطق والکلام۔ علامہ سعدالدین مسعود بن عمر تفتازانی (۷۹۲ھ/۱۳۹۱ء)

نے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں اپنے بیٹے کے واسطے منطق و کلام میں ایک اہم متن "تہذیب المنطق والکلام" کے نام سے مرتب کرکے دو اقسام پر منقسم کیا۔ ان کی اس تصنیف کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور وہ مدرسین کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئی۔ علامہ جلال الدین محمد بن اسعد صدیقی دوانی (۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء) نے اس کی شرح لکھی جو باوجود نا تمام رہ جانے کے بہت مشہور و متداول ہوئی پھر امیر ابو الفتح سعیدی (۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء) نے اس پر ایک حاشیہ لکھا اور دوانی کے کام پر تکملہ کیا۔ شیخ مصلح الدین لاری (۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) نے بھی اس پر ایک حاشیہ لکھا تھا۔ فاضل حسین خلخالی (۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء) بھی اس کے محشیوں میں ہیں۔ تہذیب کی شروح میں شیخ الاسلام احمد بن محمد (۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء) کی شرح التہذیب، زین الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر معروف بہ عینی (۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء) کی جہد المقل اور مظفر الدین علی بن محمد شیرازی (۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء) نیز ملا عبد اللہ یزدی کی شروح مشہور ہیں۔

ملا عبد السلامؒ نے اسی تہذیب المنطق والکلام کی شرح اپنے انداز میں کی۔ راقم احقر کی نظر سے اس کا صرف ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ لائبریری کے ذخیرہ حبیب گنج ۱۸۹/۲۵ میں گزرا ہے یہ نسخہ ۱۰۰ اوراق پر مشتمل خط نستعلیق میں متوسط تقطیع پر ہے۔ ابتدا میں وجہ تالیف وغیرہ کا بیان نہیں ہے بلکہ براہ راست بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد تہذیب المنطق کی عبارتیں لکھ کر تشریح و تفسیر کی ہے اور اس ضمن میں متقدمین کے اقوال بھی بعض جگہ درج کیے ہیں۔

مذکورہ بالا نسخوں کی طرح اس میں بھی ترقیمہ کی عبارت میں کسی سن کتابت یا سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے البتہ خاتمہ پر اسقدر عبارت درج ہے:

"اللهم اجعلنا عليين بالاسم معرضين عن الفضول بالقول من العمل واعصمنا من الخطاء والخطل تمت شرح التهذيب صنفه الحبر الكامل عبد السلام الديوى الاعظمى يوم الجمعة قبل صلوتها۔ فالحمد لله اوله وآخره۔"

ہندوستان کی فارسی شاعری میں آزادی کے بعد توصیف دیوتاں

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط دارود

ادیان اور مذاہب کی ترویج و تبلیغ اور توسیع و ترقی میں زبان و ادب کا حصہ بہت اہم رہا ہے۔ حامیانِ مذہب نے انہیں بطور وسیلے کے استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ہی ہند میں فارسی نے بھی اس فریضہ کو ادا کرنے میں اہم خدمات پیش کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مروجہ مذاہب اور ان کے مختلف فرقوں کی تعلیمات پر مشتمل اعلیٰ مذہبی ادب فارسی کتابوں میں جگہ پا چکا ہے۔ فارسی ادب کے نثر و نظم ہر دو اصناف میں اسکی وافر مقدار موجود ہے۔

سنسکرت کی طرح فارسی زبان کسی دور میں بھی عوامی زبان نہیں رہی لیکن سنسکرت ہی کی طرح اسے بھی شاہی محافظت نصیب ہوتی رہی اور امورِ سلطنت میں اس کے استعمال کو فوقیت دی گئی، شاہی فرامین فارسی میں لکھے گئے۔ گویا دورِ وسطیٰ کے ہندوستان میں درباری زبان فارسی ہی رہی تھی۔ بنا بریں عوام سے تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص ادبا و شعرا نے اپنی نگارشات کو پیش کرنے کے لیے اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا لیکن عنانِ حکومت جب انگریزوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی تو بجائے فارسی کے اردو کا استعمال ہونے لگا اور آزادی کے بعد اردو کی جگہ ہندی نے لے لی۔ اس طرح فارسی اور اردو شاہی سرپرستی سے محروم

ہوتی چلی گئیں اور جب آزادی کے بعد اردو ہی کس مپرسی کے عالم میں ہوگئی تو فارسی کی کیا بساط،
لیکن دراصل زبان اپنی اثر آفرینی کی بدولت زندہ رہتی ہے۔ فارسی بھی اپنی صفت کیوجہ
سے ایسی "منہ لگی" تھی کہ ہمارے ادباء و شعراء نے غربت میں بھی اس سے نباہ کیا اور
اپنی قلمی کاوشیں فارسی میں پیش کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں آزادی کے بعد "سبھیتا" اور
"سنسکرتی" کی بنیاد پر بعض جیالوں نے "ودیشی" بھاشا (فارسی) میں اپنے دیوتاؤں کی توصیف
و ثنا کے ترانے گائے ہیں۔

یہ سخت جان لیکن نرم و نازک اندام فارسی زبان اپنی شیریں بیانی کی وجہ سے
آج بھی پسند کی جاتی ہے۔ اس کے چاہنے والوں میں ہندو مسلم کی تفریق و تخصیص نہیں اور
نہ ان میں لسانی تعصب اور مذہبی عناد ہے، اسی لیے تو حمد و نعت کے ساتھ ہی دیوتاؤں
کی توصیف و ستائش کے نغمے بھی فارسی میں ملتے ہیں۔ کرشن کی بانسری، شنکر کے ڈمرو
اور سرسوتی کے ستار کی دھنوں سے معمور فارسی شاعری میں مہاکالی کی تلوار کی جھنکار
اور رام کے تیروں کی نشا نش کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے تو فرقہ بندی کے ماحول میں
رام۔ رحیم کی دوئی مٹا کر یگانگت پیدا کرنے والی اور امن و آشتی کا رس کانوں میں گھولنے والی
فارسی ہمیشہ سے اتحاد و یکجہتی کی خوگر رہی ہے ؎

تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی

جناب رام لعل نابھوی نے اس سلسلے میں ایک بہت ہی وقیع کام کا بیڑا اٹھایا ہے
وہ عربی۔ فارسی۔ اردو میں ہندوؤں کی خدمات اور ان کے تہذیبی اثرات کا جائزہ
لے رہے ہیں۔ اس موضوع پر "معارف" اعظم گڈھ میں ان کے مضامین کا سلسلہ بھی شروع
ہوا ہے۔ اپنے ایک خط مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی میں وہ رقمطراز ہیں:

" خالصہ[1] بک سیلرز ..... کی تازہ فہرست کتب میں جو سنسکرت کتب کے فارسی تراجم ملتے ہیں ان میں اقبال یغمائی کی مختصر رامائن۔ یغمائی ہی کی مکمل ۷ جلدوں میں مہابھارت، چار جلدوں میں یوگ واشسٹھ اوپنشد وغیرہ درج ہیں۔ اکیلے مہابھارت کی قیمت ۹۵۰ روپے۔ یہ تو وہ کام ہے جس کا پتہ لگ گیا ہے، اللہ جانے اور کیا ہو رہا ہے اور کہاں ہو رہا ہے۔"

انھوں نے عارف نوشاہی ایڈیٹر "دانش" اسلام آباد (پاکستان) کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

" پاکستان میں اس موقع پر ذخیرے دستیاب ہوئے ہیں، اس کا ثبوت ہے وہ ضخیم ۱۵ جلدیں جن میں فہرست مخطوطات فارسی درج ہیں"[2]

بہرحال، فارسی زبان میں ہند و پاک میں آزادی کے بعد بھی ادبی کام ہو رہا ہے۔ اردو کے بعد بھی اک زبان ایسی ہے جس کے ادب میں "اتحاد و اتفاق" کی فضا ہموار کی جا رہی ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس میں "رحیم" کے ساتھ "رام" کو بھی یاد کیا جا رہا ہے اور پیغمبروں کے ساتھ دیوی۔ دیوتاؤں کی ستائش کے نغمے الاپے گئے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کے معبود اعلیٰ شیو جی کی توصیف میں مسلم شاعر عبدالرحمٰن بن عبدالرسول چشتی کی مندرجۂ ذیل کتابیں مخطوطات کی شکل میں، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہیں۔

(۱) شری مہادیو کا ارشاد پاروتی کے نام (۲) شری مہادیو کا ارشاد شری کرشن کے نام (۳) کشف الانوار وغیرہ۔

مذکورہ بالا سارے مخطوطات فارسی میں ہیں اور صرف ایک ادیب کے تحریر کردہ

---

[1] غالباً خالصہ ہے، مکتوب نگار نے بمبئی کے متعلق لکھا ہے [2] ہماری زبان دہلی یکم نومبر ۱۹۹۰ء

ہیں۔ ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں اور بھی مخطوطات و کتابیں ہوں گی جن میں خاصتاً دیوی۔ دیوتاؤں کی معلومات یا ان کی ستائش و توصیف کی گئی ہو اور یہ عمل آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ ذیل کی نظم میرے خیال پر دال ہے۔ اس نظم میں "مہادیو" (معبود اعلیٰ) کی بڑائی بیان ہوئی ہے۔

اے مہیش از بسکہ عاصی و گنہگاریم ما — مستحق لطف و بخشش را سزاواریم ما

اے شری گنگا بفرقت مغفرت بخش جہاں — مار در گردن کہ قلبش رام ہے گرد و عیاں

بر جبین نور افشاں ماہتابی چوں کماں — جسم پاکت ہمچو آتش زیر خاکستر نہاں

مشول در دست مبارک جعد بہ بالائے سر — زہر داری در گلو مسند ز چرم شیر نر

جسم انور در ضیا رغیرت دہ شمس و قمر — نام شیو شنکر کند در کام جاں کار شکر

پنج رخ، سہ چشم داری ہامہ ہا زیب گلو — با اما ام زمانہ زر نشستہ رو بہ رو

ہیئت در درویشی و سلطانِ شاہان ست شیو — صد ہزاراں تاج بر جعد تو قربان ست شیو

جملہ عالم تن بود تو اندر آں جان ست شیو — فیض و علم تو ہمہ بخشش و ہمہ دان ست شیو

بر فلک بر ہما بجانِ دل شدہ جویانِ تو — ہم جنابِ وشنو در زیر زمیں خواہانِ تو[1]

اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اے مہیش! ہم بہت گنہگار ہیں۔ آپ کی بخشش اور مہربانی کے ہم حقدار ہیں۔ اے شیو! مقدس گنگا آپ کے سر پر ہے، جس میں نہانے سے مغفرت ہو جاتی ہے۔ آپ کی گردن میں سانپ حائل ہیں اور آپ کے دل میں "رام" کا ذکر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ آپ کی پیشانی پر ہلال چمکتا ہے اور آپ کا جسم انگارے کی طرح راکھ کے نیچے چھپا ہے۔ آپ کے دستِ مبارک میں ترشول (نیزہ) ہے اور سر پر جٹائیں

---

[1] اچھر ورام: شیو استوتر (शिव स्तोत्र) مشمولہ "شکتی" دہلی مارچ ۱۹۵۷ء۔

(لمبے بال) ہیں، آپ کے گلے میں زہر ہے اور پوستین شیر نر آپ کا مسند ہے۔ آپ کے جسم کا نور چاند اور سورج سے بڑھ کر ہے۔ آپ کا نام شیو شنکر ہے جو روحانی چین کے لیے شیرینی کا کام کرتا ہے۔

آپ کے پانچ منہ، تین آنکھیں اور گلے میں کاسۂ سر کی مالا ہے۔ جگدمبا اما آپ کے روبرو بیٹھی ہیں۔ آپ صورت سے درویش دکھائی دینے کے باوجود شاہوں کے سلطان ہیں۔ آپ کی جٹاؤں پر ہزاروں تاج قربان۔ ساری کائنات اگر جسم کی مانند ہو تو آپ اس میں جان (روح) ہیں۔ آپ علوم و فیوض کی بخشش کرنے والے ہر ایک راز سے واقف ہیں۔ برہما آسمان پر اور وشنو زیر زمیں (تحت الثریٰ) آپ کے متلاشی اور خواہاں ہیں۔

برادرانِ وطن کے یہاں شیو جی کو شنکر، مہیش (معبود اعلیٰ) شیو (مبارک) بھیم (طاقتور) ترلوچن (سہ چشمی) بھیرو (بھیانک) نیل کنٹھ (نیلے گلے والا) مہادیو (معبود اکبر) بھولے ناتھ (سادہ لوح والی) وغیرہ کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے ماننے والے "شیو" کہلاتے ہیں۔ شنکر جی اگرچہ "بھولے ناتھ" ہیں لیکن تخریبی قوت کے دیوتا بھی یہی ہیں۔ رگ وید کے "رودر" دیوتا شنکر کے پیش رو مانے جاتے ہیں بھیرو کی شکل میں شنکر کے گلے میں کاسۂ سر کی مالا، ہاتھ میں ترشول، گلے میں لپٹا ہوا سانپ پیشانی پر ہلال اور شیر کے چمڑے کی تہہ بند میں ڈمرو کی تال پر نہایت غضبناک حالت میں ناچتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ شنکر کو جلالی روپ میں "نٹ راج" کہا جاتا ہے۔ رقص کا یہ عمل ہندوؤں کے نزدیک کائنات کی حرکت (COSMIC RHYTHEM) کی طرف اشارہ ہے۔

ہندوؤں کے تین معبودانِ اعظم برہما، وشنو اور مہیش بالترتیب تخلیق، تنظیم اور

تخریب کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ برہما نے کائنات کی تخلیق مکمل کر لی ہے، اب ان کے ذمہ کوئی کام نہیں۔ شاید اسی لیے ان کی باقاعدہ پوجا پاٹ کرنے کے لیے کوئی مندر بھی نہیں ہے۔ پورے ہندوستان میں صرف اجمیر کے قریب پشکر نامی گاؤں میں برہما کا ایک مندر ہے لیکن مقامی شیو مندروں کے درمیان اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ وشنو نے دنیا کے نظم و نسق اور بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے ابھی تک نو بار مختلف شکلوں میں روے زمین پر نزول کیا ہے اور پرلیہ (قیامت) سے قبل "نویں اوتار" (گوتم بدھ) کے تخمیناً ۴۲۵۰۰۰ (سوا چار لاکھ سال) بعد روے زمین پر آخری بار کالکی کی شکل میں نزول کریں گے۔ ابھی تک وشنو نے (۱) متسیہ اوتار (مچھلی کی صورت میں) (۲) کورم اوتار (بصورت کچھوا) (۳) وراہا اوتار (بصورت سور) (۴) نرسنگھ اوتار (آدمی اور شیر کی مرکب شکل میں) (۵) وامن اوتار (بصورت بونا) (۶) پرشو رام اوتار (بشکل شجیع) (۷) رام اوتار (۸) کرشن اوتار اور (۹) بدھا اوتار (بصورت گوتم) وغیرہ روپ لے کر زمین پر نزول کیا ہے۔ ایسا ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔

وشنو کا ذکر ویدوں میں بھی آیا ہے اور "معبود شمس" کی صورت میں اس کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ تصویر میں وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں۔ پہلے میں سنکھ، دوسرے میں گدا (گرز) تیسرے میں چکر اور چوتھے میں کمل (کنول) کا پھول ہوتا ہے۔ اس کی بیوی لکشمی اور بحر ظلمات (شیر ساگر) میں اننت ناگ (کشتی کی شکل میں) ان کا مسند ہے۔ ان کی ناف سے اُگے ہوئے کنول کے پھول پر برہما کو مسند نشین دکھایا جاتا ہے۔ وشنو ہندوؤں کے یہاں رحیم و شفیق دیوتا ہیں اور رام و کرشن کی شکل میں وہ کم و بیش سارے ہندوستان میں پوجے جاتے ہیں۔ رام کا پیدائشی مقام اجودھیا اور کرشن کا

متھرا سے قریب گوکل مانا جاتا ہے۔ رام کے واقعات رامائن میں درج ہیں جو سنسکرت میں والمیکی اور ہندی میں تلسی داس نے لکھی ہے۔ کرشن کے واقعات مہابھارت میں درج ہیں اس کا ایک جزو "گیتا" کہلاتا ہے جو کرشن کی تعلیمات پر مشتمل ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ گیتا کے کئی منثور و منظوم تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوئے ہیں۔

فارسی میں فیضی کی ترجمۂ بھگوت گیتائے منظوم، مراۃ الحقائق از عبدالرحمن چشتی، ترجمۂ گیتا از کنور بدری کرشن فروغ۔ ان کے علاوہ کرشن کی تعریف و توصیف میں کئی منظوم و منثور تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔ رام چندر جی کی زندگی پر بھی فارسی میں کتابیں دستیاب ہیں اور پر فارسی میں رامائن کے ترجمہ کا ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ رسالۂ اطوار (گفتگوئے بشسشت رشی و شری رام چندر جی) از عبدالرحمن، ترجمۂ والمیکی رامائن از ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ سعداللہ کی مثنوی "رام و سیتا" گودھر داس کی "مثنوی رامائن، چندر من بیدل کا نسخہ کا منظوم و منثور ترجمۂ رامائن، امر سنگھ کا "امر پرکاش" وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ امانت رائے لال پوری، مصر رام داس قابل، جگل کشور حسن فیروزآبادی، منشی ہرلال رسوا، لکھمن لال ظفر وغیرہم نے بھی رامائن کے تراجم اور واقعاتِ رام پر قلم اٹھا کر فارسی ادب میں ہندو مذہب پر اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں آزادی کے بعد بھی رام و کرشن کی مدح سرائی میں فارسی ادب وجود میں آرہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ذیل میں آزادی کے بعد کرشن کی مدح سرائی میں لکھی گئیں چند فارسی نظموں پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک کرشن، وشنو کے آٹھویں اوتار ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متھرا کے راجہ کونس کو نجومیوں نے بتایا تھا کہ دیوکی کا آٹھواں بچہ تیری سلطنت

کو چھین کر تجھے ختم کردے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی چچازاد بہن دیوکی اور اس کے شوہر وسودیو کو قید خانے میں ڈالدیا۔ انہیں جب بھی کوئی اولاد پیدا ہوتی کونس بلا کسی تحقیق و مروت کے اسے مروا دیتا۔ اس طرح اس نے دیوکی کے سات بچوں کو مروا ڈالا۔ اسے جب پتہ چلا کہ آٹھواں بچہ پیدا ہونے والا ہے تو اس نے قید کے بندوبست میں مزید اضافہ کر دیا۔ وقت معینہ سے پہلے دیوکی کا آٹھواں بچہ پیدا ہوا تو وسودیو نے اس طوفانی بارش کی رات میں اس نوزائیدہ کو ایک ٹوکری میں رکھ کر نہایت خاموشی کے ساتھ جمنا ندی کے دوسرے کنارے آباد گوکل میں یشودھا نامی عورت کے یہاں چھوڑ آیا اور اسی رات جنمی یشودھا کی لڑکی کو قید خانے میں لے آیا۔ صبح جب کونس کو بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا قید خانے پہنچا اور اس نوزائیدہ کو دیوکی کی گود سے چھین کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ زمین پہ گرتے ہی نور کی شکل میں آسمان پر چلی گئی اور اسے بددعا دی کہ تیرا دشمن تو پیدا ہو گیا ہے وہ جب تجھے مار ڈالے گا تو میں اس وقت زمین پہ اتر کر تیرا خون پیونگی۔ یہ سن کر کونس بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔

گوکل میں یشودھا اس بچے کو پالنے لگی۔ وہ بچہ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت رکھتا تھا۔ جتنا وہ ہوشیار اور چالاک تھا اتنا ہی نٹ کھٹ بھی۔ اس کی شرارتوں سے گوالنیں تنگ آ گئی تھیں۔ اس لیے بار بار یشودھا سے شکایتیں کرتیں۔ گوالنوں کے گھروں میں گھس کر دہی۔ دودھ چرا کر کھانا اس کا معمول تھا۔

وقت گذرتا گیا اور کرشن نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ بانسری بجانا اس کا مشغلہ تھا۔ اب کرشن کی چھیڑ چھاڑ کی نوعیت بھی بدل گئی تھی۔ وہ جمنا پہ نہانے والیوں کو ستاتا۔ ان کے کپڑے چرا کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ ایسی شرارتوں سے تنگ آنے کے باوجود

ان عورتوں کے دلوں میں کرشن کی محبت برابر پروان چڑھتی رہی۔ اسی دور میں کرشن نے جمنا میں رہنے والے ایک خطرناک اژدھے کو مار کر گوکل والوں کو اس سے نجات دلائی تھی۔ طوفانی بارش میں اس نے ان کی مدد کی۔ رفتہ رفتہ عوام میں کرشن مقبول ہوتے گئے اور پھر انہیں وشنو کا اوتار مان لیا گیا۔ رادھا نامی گوالن کرشن پر عاشق ہوگئی تھی۔ کرشن لیلاؤں سے متعلق کتابوں میں ان کی عشقیہ وارداتوں کو نہایت موثر اور ہیجان انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر کیف! کرشن بالآخر کونس کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور خود متھرا کے راجہ بن جاتے ہیں۔ بعد میں وہ علاقۂ گجرات میں دوارکا نامی شہر بساتے ہیں اور اسے اپنا دار السلطنت بنا لیتے ہیں۔

اسی اثناء میں کرشن کے پھوپھی زاد بھائیوں کورو اور پانڈو میں حکومت کے لیے جنگ چھڑ جاتی ہے تو کرشن پانڈوؤں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لڑائی ہندوستان کی نیم تاریخی و مذہبی روایت میں "مہابھارت" کے نام سے مشہور ہے۔ عین لڑائی کے وقت پانڈو کے بھائی ارجن کو میدان کارزار میں کرشن نے جو تلقین کی تھی وہ گیتا میں موجود ہے جو "مہابھارت" نامی کتاب ہی کا ایک جزو اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ گھمسان کی لڑائی میں بالآخر پانڈو فتح یاب ہوتے ہیں اور کوروؤں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لڑائی کے بعد کرشن جنگل کی سمت نکل جاتے ہیں جہاں شکاری کے تیر سے ان کا پیر زخمی ہو جاتا ہے اور یہی زخم انکی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

کرشن کی اس مہتم بالشان شخصیت کو وشنو اوتار سمجھ کر برادرانِ وطن ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ وہ آج ہندوؤں کے نہایت اہم دیوتا مانے جاتے ہیں۔ انکی تعریف و توصیف میں فارسی میں کئی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ آزادی کے پہلے بھی اور آزادی کے بعد

بھی۔ دیکھیے! ایک عقیدتمند شاعر کرشن لیلاؤں میں مست ہو کر نہایت وارفتگی کے عالم میں انکی ثنا یوں بیان کرتا ہے :۔

جلوہ ہائے کرشن مضمونِ دقیق — در زبان فارسی تحریر کن
گر بیناز کرشن داری مدعا — داستانِ کرشن پر تنویر کن
سخت گیر ایں سلسلۂ عشق را — دل را یکسر حلقۂ زنجیر کن
خاک کوئے عاشقاں بر سر بنہ — تا رسی با منزلت تدبیر کن
محرم اسرار باشد عاشقے — تو قلوبِ عاشقاں تسخیر کن
تو چہ دانی راہ و رسم عشق را — تو نہ ایں راہم چنیں تنکیر کن
ذکر نام پاک کن لیل و نہار — فکر او در دل ہمیں تقریر کن
آں رخ زیبائے کرشن بے مثال — تو ہمیں خاطر نشاں تصویر کن
تا ترا قرب صنم حاصل شود — اے صفی صبح و مسا تدبیر کن[1]

گیتا میں کرشن کی تلقین اور پورے "مہابھارت" میں ان کے کارہائے نمایاں سے ان کی شخصیت ایک مدبر و منتظم کی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علی الرغم کرشن۔ لیلاؤں کے بیان میں جو کتابیں سپرد قلم کی گئی ہیں وہ نہایت عامیانہ ہیں اور ان میں کرشن کی شخصیت بڑی داغدار دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص گوالنوں سے چھیڑ چھاڑ کے قصے اور عشق و سرمستی کی وارداتیں بعض شعرا نے اس انداز میں پیش کی ہیں کہ ان میں عقیدت سے زیادہ تلذذِ جنسی کی کیفیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ لیکن سنت مہاتماؤں نے ایسے عشق مجازی کو زینۂ عشق حقیقی کہہ کر استیلائے عشق و محبت کو روا رکھنے میں

---

[1] صفی بندرابنی: مضمون دقیق، مشمولہ رسالہ "آدم" دہلی ۱۹۵۵ء ص ۴۴۔

کوئی قباحت محسوس نہیں کی بلکہ اس کی افادیت و اہمیت میں مبالغہ آرائی سے کام لے کر دلیری۔ دیوتاؤں سے اس کا رشتہ جوڑا اور "سلوک الی اللہ" میں اسے ایک منزل گردانا ہے۔ صفی نے مذکورہ نظم میں کرشن کو یاد کرکے ان کے بھگتوں کو عشق کی اہمیت بتلائی ہے اور یہ تلقین کی ہے کہ "اگر کرشن ہی تیری نیاز ہے، تیرا مقصود ہے تو عشق کی زنجیر کا حلقہ بن جا اور "خاک کوئے عاشقاں" سر پر ڈال کہ یہی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ ہے۔ صفی اس بات سے بھی خبردار کرتے ہیں کہ رہ عشق میں قدم رکھنا معمولی کام نہیں اور نہ یہ ہر ایک کے بس کا کام ہے اس لیے دن رات اس معشوق حقیقی (کرشن) کے ذکر سے اپنے دل و زبان کو تر و تازہ رکھ اور اس کا تصور کرتا رہ کہ اسی میں نجات ہے۔ صفیؔ "نام کرشن" میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ذکر کن شام و سحر تو ذکر کن   تو ہمیں ہر لحظہ، ہر دم فکر کن
ورد کن نام مبارک صبح و شام   تا بباشی اے صفیؔ تو شاد کام[1]

کرشن کی گوکل کی زندگی بڑی عجیب تھی۔ جنگل میں گائیں چرانا، جمنا کے کنارے شور و شغب اور دھوم مچانا ساتھ ہی دلفریب دھن میں بانسری بجانا ان کا معمول تھا کرشن بھگتوں کو 'بال کرشن' کا یہ روپ بھی موہ لیتا ہے، ان کے تصور سے بھگتوں کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے تو شاعر کہتا ہے۔

کرشن سے نماید بوالعجب   پر تلطف گاہ باشد پر غضب
کودکے از حد جمیل و نیل فام   برلب آب جمن محو خرام
گاہ رقصاں نے نوازی می کند   گاہ با یاران بازی می کند

---

[1] "اوم" دہلی جولائی ۱۹۵۹ء ص ۳۲۔

خوش خرامے دلربائے ساحرے آں کریم بے مثال ہم تا ہرے
آں بگند ور در نام پاک او دور گرویم او، ہر باک او
خواہش قربش بداری گر صفیؔ
کن خیال خویشتن یکسر نفی[1]

کرشن کی محبوبہ رادھا اگرچہ دیویوں کے زمرے میں نہیں آتی، پھر بھی کرشن۔ مندروں میں کرشن کے ساتھ رادھا کی مورتی بھی رکھی جاتی ہے اور اس کی پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی کے پیشِ نظر جگن ناتھ کھنہ نے اپنی نظم "پیغام کرشن" میں کرشن کے ساتھ رادھا کی بھی توصیف کی ہے۔ ستائش کا یہ انداز اگرچہ ستائش معشوق سا ہے لیکن نظم کے آخر میں کرشن کی زبان ہی سے کہدیا گیا ہے کہ رادھا کی یاد میں بھگت (سالک) کا محو رہنا قرب کرشن ہی نہیں حصولِ کرشن کا ذریعہ ہے۔

شاعر رادھا کا سراپا بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں جمنا کے کنارے محوخرام تھا تو اچانک مجھے بانسری کی دھن سنائی دی۔ جس کے سننے میں میرا استغراق بڑھتا گیا اور میں مدہوش و بے خود ہوکر ریت میں گر پڑا۔ ہوش آنے پر میں نے جب آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ؎

چشم وا کردم چوں دیدم مہرنے گل اندامے، شوخ چشمے، گل رخے
آں پری پیکر ہمہ تن نور بود ایستادہ از حقیرم دور بود
شوخ چوں بر من نظر اندوختہ سربسر مسرور و بیخود ساختہ
منظرِ دلکش عجب پیدا شدہ جانِ من بر شوخ آں شیدا شدہ

---

[1] "ادم" دہلی ستمبر ۱۹۵۰ء ص ۹۔

سر بسر گشتم فدائے روئے او | ہم چناں محو ضیائے روئے او
سوئے من دیدہ بخندیدآں حسیں | دردلم تبدیلئے آمد ازیں

اس شوخ رو حسینہ کے متعلق شاعر کرشن کی زبان سے کہلواتا ہے ؎

من فرستادم بنوایں مہ لقا | ہمہ تن حُسنم و نورم ، سرتا پا
مے درخشند کہکشاں از نور ایں | مہر و ماہ تابندہ گردند از ہمیں
من مبارکباد را ہیہ کنیم | از کرم پیش تو داں اے عاشقیم
یافتی دیدار را دھا سربسر | تاکنی یادش صفّی شام و سحر
عاشقاں یابند ایں دیدار را | خوب فہمند آں ایں اسرار را
ہرکہ را دھا را تصور می کند | حجرۂ دل را منور می کند[1]

ان چند مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی (جہاں اردو کے لالے پڑے ہوئے تھے تو فارسی کی کیا بساط) فارسی کے چاہنے والوں نے اپنے دیوتاؤں کی توصیف و تعریف کے لیے اس کلاسیکل زبان کو اپنایا اور نہایت اخلاص سے دیوتاؤں کے ساتھ ہی اسس زبان کی بھگتی کو اپنا شعارِ حیات بنالیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی شیرینی اور اثر آفرینی کی بدولت زندہ رہنے والی زبان کو تعصب کی آگ اور آندھیاں مٹاکر خاکستر نہیں کرسکتیں اور کرخت و بے اثر زبان کو لاکھ سنوارنے، بڑھانے، ترقی دینے کی کوششیں کی جائیں وہ بارآور نہیں ہوسکتی۔ کاش برادرانِ وطن لسانی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ہر زبان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرنے کی سعی کرتے رہیں تو امن کا گلشن کھل اٹھے گا۔

---

[1] رسالہ" اوم" دہلی ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۲۱-۲۲۔

اخبار علمیہ

تفسیر، حدیث اور فقہ ہی نہیں جملہ علوم اسلامیہ میں ممتاز امام اور تقریباً چھ سو کتابوں کے مصنف و مولف امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی کا انتقال پانچ سو برس پہلے ۹۱۱ھ میں ہوا تھا، ان پانچ صدیوں سے ان کا فیضان جاری ہے، اب دمشق کی المجمع العلمی کے مجلہ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے علمی اداروں نے اس موقع پر یادگار تقریبات کا اہتمام کیا، خود مجلہ نے امام سیوطی کے متعلق اپنا ایک عمدہ و بلند پایہ خاص شمارہ شایع کیا، وہاں کے اہل علم کی یہ خواہش بھی اب پوری ہوتی نظر آتی ہے کہ امام صاحب کی جو کتابیں مخطوطہ ہیں ان کی اشاعت اور مطبوعہ تصانیف کے طبع جدید کے لیے ایک خاص ادارہ قائم کیا جائے مجلہ کے ایک مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام سیوطی کے ایک شاگرد عبدالقادر شاذلی نے اپنے استاد کے سوانح "بہجۃ العابدین بترجمہ حافظ العصر جلال الدین" کے نام سے مرتب کیے تھے، اب اس مخطوطہ کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کا وقت بھی آگیا ہے۔

گذشتہ دنوں فرینکفرٹ جرمنی میں کتابوں کا پینتالیسواں عالمی میلہ ہوا، اس میں چھیانوے (۹۶) ملکوں کے آٹھ ہزار چار سو تین (۸۴۰۳) ناشرین کتب نے شرکت کی، اس مرتبہ شائقین کے علاوہ نئے مضامین کی کمی بھی خاص طور پر محسوس کی گئی، تاہم ناشرین کی نظر میں تجارتی اعتبار سے یہ میلہ کامیاب ہی رہا، ۱۹۹۲ء میں اسی فرینکفرٹ کے میلہ کا خاص موضوع جنسیات تھا، اس سال ناولوں کی گرم بازاری رہی، تین کتابیں خبروں اور

سر بسر گشتم فدائے روئے او — ہم چناں محو ضیائے روئے او
سوئے من دیدہ بخندید آں حسیں — در دلم تبدیلئے آمد ازیں

اس شوخ رو حسینہ کے متعلق شاعر کرشن کی زبان سے کہلواتا ہے سہ

من فرستادم بنزایں مہ لقا — ہمہ تن حسنم و نورم، سر تا پا
مے درخشند کہکشاں از نور ایں — مہر و ماہ تابندہ گردند از ہمیں
من مبارکباد را ہیہ کنیم — از کرم پیش تو داں اے عاشقیم
یافتی دیدار را دھا سربسر — تاکنی یادش صفی شام و سحر
عاشقاں یابند ایں دیدار را — خوب فہمند آں ایں اسرار را
ہر کہ را دھا را تصور می کند — حجرۂ دل را منور می کند [1]

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی (جہاں اردو کے لالے پڑے ہوئے تھے تو فارسی کی کیا بساط) فارسی کے چاہنے والوں نے اپنے دیوتاؤں کی توصیف و تعریف کے لیے اس کلاسیکل زبان کو اپنایا اور نہایت اخلاص سے دیوتاؤں کے ساتھ ہی اس زبان کی بھکتی کو اپنا شعار حیات بنا لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی شیرینی اور اثر آفرینی کی بدولت زندہ رہنے والی زبان کو تعصب کی آگ اور آندھیاں مٹا کر خاکستر نہیں کر سکتیں اور کرخت و بے اثر زبان کو لاکھ سنوارنے، بڑھانے، ترقی دینے کی کوششیں کی جائیں وہ بارآور نہیں ہو سکتی۔ کاش برادرانِ وطن لسانی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ہر زبان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرنے کی سعی کرتے رہیں تو امن کا گلشن کھل اٹھے گا۔

---

[1] رسالہ "اوم" دہلی ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۲۱-۲۲۔

اخبار علمیہ

تفسیر، حدیث اور فقہ ہی نہیں جملہ علوم اسلامیہ میں ممتاز امام اور تقریباً چھ سو کتابوں کے مصنف و مولف امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی کا انتقال پانچ سو برس پہلے ۹۱۱ھ میں ہوا تھا، ان پانچ صدیوں سے ان کا فیضان جاری ہے، اب دمشق کی المجمع العلمی کے مجلہ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے علمی اداروں نے اس موقع پر یادگار تقریبات کا اہتمام کیا، خود مجلہ نے امام سیوطی کے متعلق اپنا ایک عمدہ و بلند پایہ خاص شمارہ شایع کیا، وہاں کے اہل علم کی یہ خواہش بھی اب پوری ہوتی نظر آتی ہے کہ امام صاحب کی جو کتابیں مخطوطہ ہیں ان کی اشاعت اور مطبوعہ تصانیف کے طبع جدید کے لیے ایک خاص ادارہ قائم کیا جائے مجلہ کے ایک مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام سیوطی کے ایک شاگرد عبدالقادر شاذلی نے اپنے استاد کے سوانح "بهجۃ العابدین بترجمۃ حافظ العصر جلال الدین" کے نام سے مرتب کیے تھے، اب اس مخطوطہ کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کا وقت بھی آگیا ہے۔

گذشتہ دنوں، فرینکفرٹ جرمنی میں کتابوں کا پینتالیسواں عالمی میلہ ہوا، اس میں چھیانوے ملکوں کے آٹھ ہزار چار سو تین ناشرین کتب نے شرکت کی، اس مرتبہ شائقین کے علاوہ نئے مضامین کی کمی بھی خاص طور پر محسوس کی گئی، تاہم ناشرین کی نظر میں تجارتی اعتبار سے یہ میلہ کامیاب ہی رہا، ۱۹۹۲ء میں اسی فرینکفرٹ کے میلہ کا خاص موضوع جنسیات تھا، اس سال ناولوں کی گرم بازاری رہی، تین کتابیں خبروں اور

گفتگو کا مرکز رہیں ان میں ایک برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کی کتاب 'دی ڈاؤننگ اسٹریٹ یرس' ہے۔ دو لاکھ کی تعداد میں چھپنے والی کتاب اس لیے بھی موضوع بحث رہی کہ ناشر نے انتہائی رازداری اور شب و روز کے پہرہ کے ساتھ اسکی اشاعت کا اہتمام کیا اور بازار میں جانے سے پہلے اس کے اولین چار نسخوں میں ایک مارگریٹ تھیچر کو، دوسرا سنڈے ٹائمز کو اور بقیہ دو پبلشر کو ملے تھے، لیکن اس کے باوجود جب برطانیہ کے ایک اہم اخبار ڈیلی مرر نے اس کے مسودہ کے بعض حصوں کو شائع کرکے اور چند اور ابواب کو چھاپنے کا اعلان بھی کر دیا تو یہ قضیہ جب عدالت میں پہنچا تو اس نے بھی پابندی عائد کرنے سے انکار کر دیا، دوسری کتاب جو سب سے زیادہ موضوع گفتگو رہی وہ کسی گمنام کے ناول 'گرلس' کا مسودہ تھا، اس کے حقوق اشاعت خریدنے والوں میں شدید مسابقت کا جذبہ دیکھنے میں آیا، بڑی کرید کے بعد پتہ لگا کہ یہ ایک نہایت مشہور اداکارہ کی قلمی کاوش کا ثمرہ ہے، تیسری کتاب برطانیہ کے شاہی خاندان کے مقبول صحافی آرتھر ایڈورڈ کی I WILL TELL THE JOKES ARTHUR : DIANA, THE ROYAL FAMILY AND ME تھی اس میں شاہی خاندان خصوصاً شہزادی ڈیانا کی ذاتی زندگی کے احوال و اسرار کی پردہ کشائی کی گئی ہے، اس میلہ کی مقبول ترین کتابوں میں خلیجی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول THE FIST OF GOD بھی ہے، دی ڈے آف دی جیکال اور دی ڈاگس آف وار جیسی کلاسیکل تحیر انگیز کہانیوں کے لکھنے والے فریڈرک فورستھ کے اس ناول کو بھی سب سے زیادہ جذباتی اور موثر کاوش قرار دیا گیا۔

ویدک ادب خصوصاً رگ وید کی قدامت اور اس کا زمانۂ تالیف محققین کا پرانا دلچسپ موضوع ہے، یوروپی محققین کا عام خیال ہے کہ ہندوستان آنے کے بعد آریوں نے مناجاتوں

کا یہ مجموعہ پندرہ سو سال قبل مسیح میں مرتب کیا تھا، آریائی خانہ بدوش بعض مظاہر قدرت مثلاً ہوا، آگ اور برسات سے ان مناجاتوں میں مدد کی درخواست کرتے تھے تاکہ انکی پیداوار اور بہتر ہو اور ہندوستان کے اصل باشندوں سے جنگ و مقابلہ میں ان کی فتح ہو۔ اب محققین نے ان دعاؤں میں فلکیات و نجوم کے اشاروں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان سے رگ وید کی اعلیٰ درجہ کی سائنسی روشن خیالی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ویدک ادب کا عہد دس ہزار سال قبل مسیح کا ہو سکتا ہے اور یہ ایک بہتر تعلیم یافتہ طبقہ اور ایسے خاندانی زمینداروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو فلکیاتی جزئیات کے ماہر تھے، اس خیال کی تائید حال ہی میں ترکی کے علاقہ نیوالی کوری کی وادی میں کھدائی سے برآمد ہونے والے ان آثار سے ہوتی ہے جو صاف طور پر ترقی یافتہ زمیندارانہ ویدی تہذیب کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کا زمانہ سات ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے' اس حیرت ناک دریافت نے اس پرانے مفروضہ کو رد کر دیا ہے کہ اس عہد میں زمین اپنے برفیلے عہد کے اواخر سے گذر رہی تھی اور اس وقت تک کسی باضابطہ تمدن کا وجود نہیں تھا، اس وادی میں بے عیب شہری ترتیب و سلیقہ کے علاوہ اینٹ، پتھر اور چونے کا استعمال اور کئی بڑے پتھروں کی تعمیرات کے آثار بھی ملے ہیں جن میں ایک مندر بھی شامل ہے' اس کے علاوہ ایک چونے کے پتھر والی مورتی بھی ملی ہے جس سے یہاں ویدی اثرات کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ کے علاوہ قرون وسطیٰ کی ہندی تاریخ کے مطالعہ اور تجزیہ کی کوششیں بھی تیز تر ہیں، اس سلسلہ کی بعض اہم کتابوں کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں' ایسی ہی ایک کتاب "کاسٹ' ریلیجن اینڈ کنٹری' اے ویو آف انیشنٹ اینڈ میڈیول

انڈیا' کا ذکر ہندوستان ٹائمز کے کتابوں کے کالم میں نظر سے گزرا، ایس وی ڈیسی کاچر S.V. DESIKACHAR کی اس کتاب میں بقول مبصر ہندو مذہب' ذات پات، اسلام اور انگریزوں کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ ہندویت کی اصلاح بہت بعد کی ہے یہ ہندوستان کے مزاج میں ڈھلی بعض رسوم کے مجموعہ کا نام ہے کیونکہ ہندویت میں نہ کوئی ایک ہادی و معلم ہے نہ کوئی ایک ایسا عقیدہ' نقطۂ نظر یا جامع اصول ہے جس میں ہندویت کا ارتکاز ہو' مصنف نے بقول ہندوستان ٹائمز بجا طور پر مسلمان حکمراں طبقہ یا مسلم دور حکومت کو غیر ملکی سمجھنے کو درست نہیں قرار دیا ہے"۔ ان کی نظر میں "عام آدمی کے لیے یہ محض اقتدار کی منتقلی کا عمل تھا" اور قوم پرستی کا جو مفہوم آج ہے' شروع کے دور میں اس کا وجود نہیں تھا لیکن وہ دوسری جانب اس مفروضہ کے بھی قائل ہیں کہ ہندوؤں میں ویدک عہد سے وحدت دیک جہتی کا احساس شمال سے جنوب تک رہا، ان کی دنیا میں کسی جدا مذہب اور معاشرہ کا تصور نہیں تھا، آغاز میں حملہ آور اور مہاجرین اس سماج میں ضم ہوتے گئے، اس صورتحال کو مسلمانوں کی آمد نے بدلا، مسلمان غیر ملکی تو نہیں کہے جا سکتے لیکن ان کی حکومت ایک خاص نسل کے اقتدار کی نمائندہ تھی، اس کا موازنہ آج جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی قوت و غلبہ سے کیا جا سکتا ہے" تضاد بیانی کے باوجود مصنف نے بعض مفید نتائج بھی پیش کیے ہیں مثلاً قدیم ترین زمانہ سے اختلافات کے باوجود ایک ہندوستان کا تصور صرف نظریہ ہی نہیں ایک مقصد بھی تھا لیکن مسلمانوں کی آمد تک کوئی بامقصد اہم اور نتیجہ خیز تحریک سامنے نہیں آئی تھی، اسلام کی آمد نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔

(ع۔ ص)

معارف کی ڈاک

شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ لاہور

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء

(۱)

فاضل گرامی قدر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ پرسوں آپ کا خط ملا تھا۔ حسب الحکم اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی پانچ جلدیں (۱۸ و ۲۰ تا ۲۳) بذریعہ رجسٹرڈ بک پیکٹ تین علحدہ پیکٹوں میں روانہ خدمت ہیں۔ جلد نمبر ۱۹ ختم ہے، دیکھئے دوبارہ کب چھپتی ہے۔ بھیجنے میں دیر کی کچھ وجہ الیکشن کا جھمیلہ اور پھر میری بیماری تھی۔ جلدیں ملنے پر اطلاع دیں۔

دیگر مضامین کے علاوہ جلد نمبر ۲۰ و نمبر ۲۱، میرے دو مقالات (مدارس اور مصر) قابل ملاحظہ ہیں۔ مدارس (جلد نمبر ۲۰) ص ۱۶۱ تا ۱۹۴ میں، میں نے تمام عالم اسلام کے عربی مدارس کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان کے مدارس کے ضمن میں مدرسۃ الاصلاح کا بھی ذکر خیر ہے، مصر (جلد نمبر ۲۱) ص ۱۸۶ تا ۲۲۶ میں مصر کے سیاسی حالات کے علاوہ وہاں کی علمی، ادبی تاریخ بھی لکھ دی ہے جو آپ کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہوگی، ایک تکملہ کی ترتیب بھی زیر نظر ہے، اس میں مولانا حمید الدین فراہیؒ اور دوسرے ہندوستانی مشاہیر کا ذکر ہوگا۔

فقط والسلام نیازمند

(شیخ) نذیر حسین

(۲)

شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۷؍۱۱؍۹۳ء

مخدومی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، مرسلہ خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا، شاہ ولی اللہؒ کے مقدمہ فتح الرحمٰنؒ کے سلسلہ میں مزید استفسارات کے جواب میں عرض ہے کہ اس کے علحدہ کتابی صورت میں اشاعت کی اطلاع مجھے ایک صاحب کی زبانی ملی تھی لیکن تلاش بسیار کے باوجود نہ تو یہ مطبوعہ نسخہ یہاں دستیاب ہو سکا اور نہ کسی کتاب یا کتابیات میں اس کی اشاعت کا ذکر مل سکا۔

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں "مقدمہ فی قوانین الترجمۃ" کا جو مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کی فوٹو کاپی ادارہ علوم القرآن (سرسید نگر، علی گڑھ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ میں نے اس کا مقابلہ برہان اکتوبر و نومبر ۱۹۴۵ء میں شایع شدہ مقدمہ ترجمۃ القرآن (مع اردو ترجمہ) کے متن سے کیا تو یہ یقین ہو گیا کہ دونوں ایک ہی ہیں، برہان میں بھی اندر متن میں اس کا نام "مقدمہ فی قوانین الترجمہ" دیا ہوا ہے، البتہ دونوں کے متن میں

لہ شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا تھا اس کا ایک مقدمہ بھی لکھا تھا جو ترجمہ کے ساتھ چھپتا رہا ہے اور جیسا کہ مکتوب نگار نے لکھا ہے یہ علحدہ بھی شایع ہوا ہے، اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے ایک رسالہ مقدمہ فی قوانین الترجمہ بھی لکھا تھا، مجھے اشتباہ ہو گیا تھا کہ یہ اور مقدمہ ترجمہ ایک ہی چیز ہے، لیکن اس خط سے پہلے ہی اشتباہ دور ہو چکا تھا، قوانین الترجمہ کا اردو ترجمہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند کے قلم سے برہان میں چھپا تھا۔ دونوں مقدمات کا موضوع ایک ہے لیکن مشمولات جدا ہیں" (ض)

کہیں کہیں الفاظ کا فرق ملتا ہے جسے نسخوں کا اختلاف یا نقل کرنے والوں کی مسامحت یا بعض لفظوں کو صحیح نہ پڑھنے کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔

جب میں نے ان دونوں کا مقابلہ شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ قرآن "فتح الرحمٰن" کے ساتھ شایع شدہ مقدمہ سے کیا تو یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ یہ مقدمہ اور مذکورہ مقدمہ فی قوانین الترجمہ دونوں دو چیزیں ہیں، دونوں کے مواد میں کافی فرق پایا جاتا ہے، ترجمہ کے شایع شدہ مقدمہ میں ترجمہ کے فن و اصول پر انھوں نے مختصراً روشنی ڈالی ہے اور خاص طور سے اپنے فارسی ترجمہ کا پس منظر اور اس کی خصوصیات بیان کی ہیں، اس وقت میرے پیش نظر تاج کمپنی، لمیٹڈ، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شایع شدہ فتح الرحمٰن کا نسخہ ہے۔

مجھے توقع ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کے اس مقدمہ پر نئے سرے سے کچھ لکھتے وقت ششماہی علوم القرآن کو ضرور یاد رکھیں گے، اس طرح یہ اس مجلہ کے جنوری۔ جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شایع شدہ آپ کے مضمون "مقدمہ فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن کا تجزیاتی مطالعہ" کا تکملہ ہو جائے گا۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان یا مسلم دور حکومت کی تاریخ کا ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۹۳ء کے معارف میں اخبار علمیہ کا کالم میرے لیے دلچسپی کا باعث بنا، برادر مکرم جناب عمیر الصدیق صاحب نے بڑے اچھے انداز و موثر اسلوب میں اس زمانہ کی تاریخ کے کچھ اہم موضوعات پر انگریزی کی بعض نئی کتابوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں، موجودہ صورتحال میں جب کہ اس عہد کی تاریخ مسخ کرکے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکانے کی مہم زور و شور سے جاری ہے، ایسی کتابیں یا تحریریں یقیناً قابل قدر و لائق تحسین ہیں جو غیر جانبدارانہ مطالعۂ تاریخ اور

مذہبی یا فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کے بجائے خالص سیکولر انداز اور سیاسی و انتظامی ضروریات کی روشنی میں تاریخی واقعات کے تجزیہ پر مشتمل ہوں، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ ترقی پسند مورخین و اہلِ قلم اپنی زبردست علمی و تحقیقی خدمت سے زہر آلود تحریروں کے اثرات کم کرنے میں ممد و معاون بنتے ہیں جس کے لیے ان کی تائید و حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے لیکن ان کی کتابوں یا ان کی تاریخ نگاری کے منہج کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا اور وہ یہ کہ یہ مورخین اس عہد کی تاریخ سے مذہب یا مذہبی تقاضوں کے عمل دخل کو یکسر خارج از امکان قرار دیتے ہیں اور تاریخی واقعات یا حکمرانوں کے جملہ اقدامات کی سیاسی و انتظامی یا معاشی توجیہ پیش کرتے ہیں، ان کی کتابیں پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلم حکمرانوں کو مذہب و مذہبی امور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اگر کسی کو تھی بھی تو اس پر سیاسی یا وقتی مصلحت غالب تھی، ان حکمرانوں سے شعوری یا غیر شعوری طور پر نہ دین کی کوئی خدمت انجام پائی اور نہ ہی ان کے کسی سیاسی عمل یا انتظامی اقدام میں دینی جذبہ یا شریعت کی پابندی کا خیال کارفرما تھا۔

گو اس عہد میں نظامِ حکومت بادشاہی تھا جس میں تیموری و ایرانی اصول جہانبانی کے اثرات بھی پائے جاتے تھے نیز اس وقت کے مسلم حکمرانوں کے سیاسی، آئینی یا انتظامی اقدامات تمام تر اسلام کے اصولِ حکمرانی اور شریعت کے ضوابط کے مطابق نہ تھے تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ وہ مذہب اور اس کے تقاضوں سے قطعاً بے تعلق تھے اور ان کی حکومت کے اقدامات میں خالصتہً سیاسی یا معاشی عوامل ہی کارفرما رہے ہیں اور ایک حکمراں کی حیثیت سے ان کے کسی عمل میں بھی دین و شریعت کی پاسداری کا جذبہ کارفرما نہیں رہا، میرے خیال میں ان حکمرانوں کے خلافِ شریعت انتظامی ضوابط و اقدامات کی کفالت

کردینے اور انہیں غلط قرار دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے لیکن انکے عمل میں کسی مذہبی تقاضے کی تکمیل یا شریعت کے کسی قانون کی پابندی واضح طور پر نظر آتی ہو انہیں نظر انداز کر دینا یا انکی کوئی اور تعبیر پیش کرنا حقائق کی غلط ترجمانی کے مترادف ہوگا اسکی ایک واضح مثال جزیہ ہے جس کے بارے میں بعض مورخین کی یہ رائے ہے کہ اورنگزیب یا بعض دوسرے مسلم حکمرانوں کے عہد میں سیاسی تقاضوں یا معاشی ضرورتوں کے تحت اسکا نفاذ عمل میں آیا حالانکہ اس قسم کی کسی تاویل یا توجیہ کے بجائے اسے شریعت کے ایک قانون کا نفاذ تسلیم کیا جانا بہتر اور مناسب ہوگا ضرورت ہے کہ اس قانون کی اصل غرض و غایت واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ شریعت کے مطابق اسکے نفاذ کے بعد مسلم حکومت میں ایک غیر مسلم شہری کو کیا حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں اور کس طرح اس سے سماجی و معاشی تحفظ فراہم ہوتا ہے۔

مزید براں اگر اس عہد کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس دور میں جو سیاسی اصول و ضوابط جاری ہوئے اور نظم و نسق کے جو شعبے قائم ہوئے وہ کافی حد تک مرکزی ایشیا کی مسلم حکومتوں سے مستعار تھے۔ دیوان خراج، قضا، احتساب، افتار وغیرہ کے شعبے اور نظم و نسق کے دائرہ بالخصوص شعبۂ مالیات میں زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشور، عشری و خراجی مزارعت و مضاربت، بیت المال وغیرہ جیسی اصطلاحات ایشیا و افریقہ کے مختلف علاقوں میں پہلے کی مسلم حکومتوں میں مروج تھیں، اسی عہد کی تاریخ کے ضمن میں یہ بات بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ دیگر علوم و فنون کے علاوہ تفسیر، حدیث و فقہ کے میدان میں اس زمانہ میں ایسی نمایاں خدمات انجام پائیں کہ انکے نقوش آج بھی زندہ و تابندہ ہیں ان خدمات میں اہل علم و فن کی اپنی دلچسپیوں و کوششوں کے علاوہ سلاطین و امراء کی معارف پروری اور علمی سرپرستی کا بھی معتدبہ حصہ رہا ہے، ان سب کے علاوہ اس عہد سے متعلق ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس پہلو کو بھی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کہ ان حکمرانوں نے اس زمانہ کے مزاج و حالات کے

مطابق سیاسی و انتظامی، سماجی و اقتصادی، علمی و تمدنی ہر میدان میں جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ اس ملک کی تعمیر و ترقی کیلئے بہت مفید ثابت ہوئیں، اس طرح عہد وسطی کا ہندوستان نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے بلکہ اس ملک کی سیاسی و سماجی اور علمی و تمدنی تاریخ کا بھی ایک نمایاں ورق ہے، برادرم عمیر صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں گے،

محترم اشتیاق بھائی اور پروفیسر یٰسین مظہر صاحب کی جانب سے سلام قبول فرمائیں۔

والسلام ظفر الاسلام اصلاحی

(۳)

دوجیا نگر کالونی۔ حیدر آباد ۴ر نومبر ۱۹۹۳ء

مکرم و محترم۔ سلام مسنون

جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی بمبئی کے ایک ممتاز لائبریرین اور اردو کے لائق محقق ہیں انکا ایک مقالہ "احوال قادر ولی عرف شاہ میراں" فروری تا اپریل ۱۹۹۱ء کے معارف میں شایع ہوا تھا اسمیں موصوف نے اردو کی ایک قدیم مثنوی کا تعارف کرایا تھا انکے پیش نظر مثنوی کا جو نسخہ تھا اسکے آخری صفحات غائب تھے اتفاق سے انہی دنوں مثنوی کے مصنف کے بارے میں کچھ تفصیلات میری نظر سے گذریں جنکو میں نے معارف میں اشاعت کیلئے بھیجدیا۔ چند ہفتے قبل محترم و مکرم اکبر الدین صدیقی صاحب کی بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے میرا پتہ معلوم کر کے اطلاع دی کہ بمبئی کے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب نے میرے لیے صدیقی صاحب کے پاس ایک کتاب روانہ کی ہے میرے لیے کتاب کے تحفہ کی اطلاع ایک خوشخبری تھی، چنانچہ میں فوراً ہی اسے لینے کیلئے صدیقی صاحب کے یہاں پہنچ گئی، میرے تعجب و خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک بڑے محقق کی کتاب "اردو کی چند نایاب مثنویاں" میں اپنا وہ مضمون دیکھا جو قادر ولی کے بارے میں معارف میں شایع ہوا تھا۔ ندوی صاحب چاہتے تو میری فراہم کردہ معلومات کو بلا حوالہ یا حوالہ کیساتھ اپنے مضمون اور کتاب میں شامل کر سکتے تھے مگر انھوں نے یہ مکمل مضمون میرے نام ہی سے اپنی کتاب میں شامل کر دیا، ایسی ادبی دیانت داری کی مثال اب بہت کم ملے گی، ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں جناب اکبر الدین صاحب صدیقی کا ایک خط بھی شامل کیا ہے جو اس مثنوی کے نام اور مصنف کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ میں نے اس ضمن میں جناب ندوی صاحب کو جب شکریہ کا خط لکھا تو انہوں نے فوراً یہ جواب عنایت فرمایا جو انکے عالمانہ انکسار کی مثال ہے:

> تیس نام آپکا استدراک کو اپنے مضمون میں شامل کر کے در اصل اپنے مضمون کی کمی کو پورا کیا ہے آپ پر احسان نہیں کیا کیونکہ معلومات تو تھیں
> میرے ہی اظہار تشکر کو معارف میں جگہ مل جائے تو ادبی دیانتداری کی یہ مثال اسکے صفحات میں محفوظ ہو جائے گی۔ شاکرہ۔

مطبوعات جدیدہ

اشراف عرب از جناب سید محمد نجم الحسن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۴۰۰، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتہ: جاجنیری اکیڈمی آستانۂ سادات سانحہ، ۸۰۱۱ سی جہانگیر روڈ غربی، کراچی ۷۴۸۰۰۔

علم انساب اور شجرہ انساب کے حفظ و ورد کا شوق دلچسپ اور مفید ہونے کے باوجود پہلے کی طرح اب زیادہ اہم نہیں رہ گیا ہے، لیکن تاریخ اقوام اور تذکرہ و سوانح کے ضمن میں اس سے صرف نظر آج بھی ممکن نہیں ہے، زیر نظر کتاب اسی علم قدیم کی جدید کڑی ہے جس میں حضرت آدمؑ سے دور حاضر تک کے بعض خاندانوں کی کڑیاں مرتب کی گئی ہیں، کتاب کے تعارف میں سید مصباح الدین دسنوی نے لکھا ہے کہ "مرتب کا یہ کارنامہ دنیا کے تمام خاندانوں پر محیط ہے" یہ اس حد تک درست ہے کہ اس میں حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ایک معروف شجرہ نقل کیا گیا ہے ورنہ کتاب کا اکثر حصہ ہندوستان کے سادات و شیوخ اور بعض ترک و افغان خاندانوں کے شجرۂ نسب پر مشتمل ہے اور اس میں بھی زیادہ حصہ سرزمین بہار کے خانوادوں کے لیے خاص ہے، فاضل مولف کا تعلق بھی سانحہ مونگیر کے جاجنیری سادات سے ہے اس لیے طبعاً اس خطہ کے خاندانی شجروں کے متعلق انکا دائرۂ معلومات زیادہ وسیع ہے، اسلاف کا ذکر عموماً فخر و مباہات سے خالی نہیں ہوتا اسکا اثر غیر شعوری طور پر ہی سہی ظاہر ہو کر رہتا ہے خوشی ہے کہ فاضل مولف نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شروع میں صاف لکھ دیا کہ "اگرچہ خاندانی اعزاز اور شرافت انسانی ایک طرۂ امتیاز ہے مگر فخر و مباہات فرومایہ کے سرمایہ ہیں، فضیلت کا معیار تو تقویٰ

کی اقدار پر ہے"۔ کتاب میں محض شجروں کے شمار و بیان پر اکتفا نہیں ہے بلکہ اہم شخصیتوں کا مختصر لیکن جامع تعارف بھی ہے اور اس سے گویا ہندوستان خصوصاً عہد اسلامی کی تاریخ کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے اور بعض دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں مثلاً بہار کے شیلوخ میں ۱۸۰۵ء کے حضرت مومن عارف صوفی یمنی کے ذکر میں لکھا گیا ہے کہ یہ عربی النسل بزرگ منیر شریف تشریف لائے انکے گیارہ بیٹے تھے جنھوں نے پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کیا ان کی اولاد بہار میں مومن انصار کہلاتی ہے، اسی طرح شاہ نعمت اللہ ولی کے تذکرہ میں انکی پیشینگوئیوں پر مشتمل مثنوی کے بعض دلچسپ اشعار نقل کیے گئے ہیں، سادات حسنی کے بیان میں پاکستان میں عراق کے سابق سفیر شیخ کمال الدین کو چشم و چراغ غوثیت اور سفیر دستگیر کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے لیکن تعجب ہے کہ انکا شجرہ تو در کنار انکے والد کے نام کا بھی ذکر نہیں۔ ایک جگہ سادات واسطی پر تبصرہ کرتے ہوئے انکی پشتوں کی مدت کا تعین بھی کم دلچسپ نہیں، مولف کے خیال میں دور جدید میں نسل انسانی ۲۵ سال کی سمجھی جاتی ہے دور قدیم میں اس کا اوسط ۳۶ سال کا تھا اس لیے انھوں نے ۲۵ اور ۳۶ کو جمع کر کے ۲ سے تقسیم کیا تو ۳۰ سال کا اوسط نکلا پھر ۱۴۱۰ھ کو ۳۰ سے تقسیم کیا تو خارج قسمت ۴۷ آیا اس طرح سن مذکور کی نسل حضرت علیؓ کی سینتالیسویں پشت قرار پائی، بعض تسامحات بھی ہیں جیسے خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی جائے پیدائش اودھ کے متعلق لکھا کہ اسے اجودھیا یا بارہ بنکی کہتے ہیں، حالانکہ یہ دو جگہیں ہیں جنکا فاصلہ خاصا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ذکر میں انھوں نے سیرۃ النبیؐ کو چھ جلدوں پر مشتمل بتایا ہے حالانکہ اب یہ سات جلدوں میں ہو گئی ہے بعض جگہ عوامی روایتوں کو قطعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جیسے "سردار قائم خاں راجپوت تھے، یہ خانوادہ حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد ہے"۔ یا حضرت طالوت افغان قوم کے مورث اعلیٰ تھے۔ اشراف عرب کے ذکر میں بخت نصر، سکندر اعظم،

رستم و سہراب اور راجہ رام نرائن موزوں کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں لیکن کتاب کی ضخامت دیکھتے ہوئے یہ زیادہ نہیں ہیں۔

اسداللہ خاں غالب مرد از جناب کالیداس رضا گپتا، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۸، قیمت ۸۰ روپیے پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، جولی بھون نمبر ۱، ۱۰ نیو مرین لائنز، بمبئی ۲۰۰۰۰۴۔

غالبیات سے جناب کالیداس رضا گپتا کے غیر معمولی شغف بلکہ عشق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انکی فہرست مولفات میں تقریباً ۱۶ کا تعلق مرزا غالب سے ہے، زیر نظر مجموعۂ مضامین بھی اسی میں شامل ہے، ان میں غالبیات کے مختلف گوشوں مثلاً وفات غالب، بیدل، دالی لوہارو اور تصانیف شیفتہ کے علاوہ مالک رام کی فسانۂ غالب پر تبصرہ اور ادلیات مالک رام کا تذکرہ بھی ہے، ایک مضمون میں حیات غالب کے نام سے شایع ہونے والی چند کتابوں کا تعارف دلچسپ ہے سید محمد مرزا موج کی حیات غالب کے متعلق کئی محققین کا خیال ہے کہ اس کا بڑا ماخذ آب حیات ہے لیکن فاضل مولف نے نواب شفیع خاں نیر فرید آبادی کے ایک مضمون کی نشاندہی کرکے دکھایا ہے کہ وہ بھی اس کتاب کا اہم ماخذ ہے اور بعض بعض عبارتیں تو ہو بہو نقل کر دی گئی ہیں ایک مضمون میں غالب کے بعض خطوط سے دکھایا ہے کہ غالب کو اپنے نام اور پتہ کی شہرت کا کتنا خیال تھا اسکو مولف نے 'غالب کی انا کو کھل کھیلنے' سے تعبیر کیا ہے، ایک تحریر میں غالب، ناسخ اور اقبال کے غیر متداول کلام کی نشاندہی ہے اور ایک باب میں مولف کے قیام افریقہ کی یادوں میں غالب و اقبال کے اثر کا ذکر ہے، سخن فہم غالب کے شیدائیوں کے لیے یہ کتاب پرکشش ہے۔

دلوں کی خیر از جناب اکرام اللہ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۱۰۰ روپیے پتہ: اودھ بک سینٹر، ۹۶/۱۳۰ گنیش گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

اس کتاب کا موضوع دور جدید کی سائنسی ترقی اور خلا اور کائنات کے سربستہ رازوں

کی پردہ کشائی کے باوجود انسانیت کی شب تاریک کی ظلمتوں کا بیان ہے اور یہی شاید اس کتاب کے صوفیانہ عنوان کا محرک بھی ہے، لائق مولف نے ایک جانب ترقی یافتہ ملکوں کی اسلحہ سازی، مہلک ترین ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی، فوجی مصارف، نیوکلیائی اور کیمیاوی جنگوں کے خطرات بیان کیے ہیں تو دوسری جانب انہوں نے عالمی افلاس، جہالت پانی اور خوراک کی کمی اور دوا علاج کی ناکافی سہولتوں کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیا ہے اردو میں اس قسم کی کتابیں کم ہیں، حالانکہ انکی ضرورت واہمیت میں کلام نہیں، اس سے پہلے فرنگی تہذیب کے اخلاقی و معاشرتی پہلوؤں کا جائزہ لائق مولف نے ' فریب تمدن ' نامی کتاب میں لیا تھا، اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی، یہ کتاب بھی عالمی مسائل سے انکی باخبری کا نتیجہ ہے جو قبول عام کی بجا طور پر حقدار ہے۔

مولانا محمد سلمان خاں مرحوم نقوش و تاثرات مرتبہ جناب سلیم الرحمٰن ندوی و جناب کلیم الرحمٰن ندوی،

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مولوی عبید الرحمٰن ندوی، مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال، ایم۔ پی۔

مولانا محمد سلمان خاں ندوی مرحوم بھوپال کے ایک ممتاز مذہبی و علمی خانوادہ کے فرزند مولانا محمد عمران خاں ندوی کے برادر خورد اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے، کم سخن اور نام و نمود سے نفور کے باوجود مولانا کی صلاحیتیں خصوصاً انکی تنظیمی و تعمیری خوبیاں انکی عظمت و اولو العزمی کی گویا تھیں، ایشیا کی عظیم مسجد اور بھوپال کے لیے سرمایہ فخر و ناز تاج المساجد کے نامکمل خاکہ کی تکمیل اور اسکی تعمیر جدید میں بڑا عملی حصہ مولانا مرحوم کی شب و روز کی جانفشانی کا رہا، جسکا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے تاج المساجد کی تعمیر میں انکی سرگرمیاں دیکھی ہیں انکی زندگی مرد مومن کی زندگی کا صحیح آئینہ تھی، انھوں نے اپنے تمام فرزندوں کو حفظ قرآن اور علم دین کی دولت سے مالا مال کیا انکی وفات کے بعد انکے لائق فرزندوں نے اپنے والد ماجد کی یادوں اور سبق آموز زندگی کو اس کتاب میں محفوظ کردیا تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی رہنمائی ملے۔

ع۔ ص۔

معارف اعظم گڈھ
کی
۱۵۲ ویں جلد
ماہ جولائی ۱۹۹۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبرشمار	مضمون نگار	صفحات	نمبرشمار	مضمون نگار	صفحات
۱	پروفیسر اختر اقبال کمال کراچی	۳۰۸	۸	ضیاء الدین اصلاحی	۲، ۸۳، ۱۴۴، ۱۵۱، ۱۶۲، ۲۴۲، ۲۴۵، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۲۲، ۳۲۵، ۴۰۶
۲	ڈاکٹر آفاق فاخری، لکچرر اشرفیہ کالج ماہل اعظم گڈھ۔	۱۳۳			
۳	جناب انور شاہ صاحب، پروفیشنل اسسٹنٹ لائبریری آف اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔	۳۸۵	۹	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، شعبۂ علوم اسلامیہ، علی گڈھ	۲۷۲
			۱۰	ڈاکٹر عبد الرؤف خاں، اودئی کلاں، سوائی مادھوپور، راجستھان	۳۰۶
۴	جناب اے، و شاکرہ صاحبہ، وجیا نگر کالونی، حیدرآباد۔	۴۷۶			
			۱۱	جناب علی عرفان زیدی، بدایونی، محلہ کٹ کوئیاں، رامپور	۳۱۰
۵	پروفیسر جگن ناتھ آزاد، گاندھی نگر جموں توی۔	۴۷			
			۱۲	عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین۔	۵۸، ۷۶، ۱۵۷، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۹۹، ۳۱۳، ۳۹۶، ۴۶۷، ۴۷۷
۶	جناب خضر نوشاہی، ہمدرد یونیورسٹی لائبریری کراچی، پاکستان۔	۲۷۰			
۷	جناب رام لعل نابھوی صاحب، نابھا، پنجاب۔	۲۴۳، ۲۸۰	۱۳	جناب مولانا غلام محمد صاحب، برار سوسائٹی کراچی، پاکستان۔	۵

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۴	جناب کاوش بدری صاحب، جی ٹی کے اسٹریٹ، آمبور، مدراس۔	۲۱۷	۲۲	جناب سید محمد طارق صاحب ریڈر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۸۳
۱۵	کلیم صفات اصلاحی، ناظر کتبخانہ دارالمصنفین۔	۶۲	۲۳	محمد عارف عمری اعظمی، رفیق دارالمصنفین۔	۱۵۳،۳۵
۱۶	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، پھول والان بریلی	۴۲۰،۳۵۶	۲۴	جناب مولانا محمد یوسف صاحب متالا، لندن۔	۴۰۵،۱۰۵
۱۷	ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب۔ استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ	۳۰۴	۲۵	ڈاکٹر حافظ محمود اختر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔	۲۶
۱۸	جناب حکیم سید محمد احمد ٹونکی، ٹونک، راجستھان۔	۱۲۵	۲۶	ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۴۰
۱۹	جناب محمد بدیع الزماں صاحب، پھلواری شریف، پٹنہ۔	۴۹	۲۷	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، پروفیسر و صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی	۳۷۶
۲۰	پروفیسر محمد ذاکر صاحب، جامعہ اسلامیہ، دہلی۔	۱۹۸	۲۸	جناب شیخ نذیر حسین صاحب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور	
۲۱	پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر خاں، کلکتہ۔	۲۷۹	۲۹	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط۔ دارووہ۔	۸۵،۴۲ ۴۱۰،۱۶۵ ۴۵۴

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۲

ماہ جولائی ۱۹۹۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	شذرات	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲
	مقالات	
۱	استاذ الاساتذہ ملا عبدالسلام اعظمی دیوی۔	۴۰۳
۲	استنبول کے کتبخانہ میں البیرونی کے مخطوطات۔	۲۷۹
۳	اقبال کے فلسفیانہ افکار کا ارتقار۔	۱۳۳
۴	اوراق متفرقہ در حدوث علم کلام	۳۸۵
۵	بریلی کے اہم اخبارات	۴۲۰،۳۵۶
۶	حضرت شیخ احمد کھتوی سرکھیجی	۱۰۵
۷	حفظان صحت کے اسلامی اصول اور جدید تحقیقات۔	۲۶
۸	"خون جگر" اور اقبال۔	۹۴
۹	ذوق کی غزل۔	۱۹۸
۱۰	روضات شاہی اور اسکا مصنف	۲۷۰
۱۱	سیرت نگاران نبویؐ (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں)	۱۶۵،۸۵
۱۲	شیخ محمد غوث گوالیاری	۴۰۵
۱۳	طبی عمرانیات کا اسلامی نقطۂ نظر	۳۷۶
۱۴	علامہ شبلیؒ کی شعرفہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ۔	۳۲۵،۲۴۵
۱۵	علم تفسیر کی اہمیت اور تفسیر ایجاز البیان کا ایک نادر مخطوطہ	۱۲۵

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۱۶	فارسی ادبیات کے دو مورخ پروفیسر براؤن اور علامہ شبلیؒ	۱۸۳
۱۷	مدراس کی ایک عظیم درسگاہ مدرسۂ اعظم	۲۱۷
۱۸	مسلک سلیمانی	۵
۱۹	مشرقی یورپ کی ایک مظلوم ریاست (بوسنیا وہرزیگووینا)	۳۵
۲۰	ہندوستان کی فارسی شاعری میں آزادی کے بعد توصیف دیوتاں	۴۵۴
۲۱	ہندوؤں میں عربی	۲۸۸
	تلخیص و تبصرہ	
۱	آذربائیجان	۶۲
	معارف کی ڈاک	
۱	مکتوب حیدرآباد	۴۷۶
۲	مکتوب راجستھان	۳۰۶
۳	مکتوب علی گڑھ	۴۷۲

نمبر شمار	مضمون	صفحات
۴	مکتوب لاہور	۴۱۷،۲
۵	مکتوب مدینہ منورہ	۳۰۴
۶	مکتوب نابھا	۲۳۵
	اخبار علمیہ	۵۸، ۲۹۹، ۴۶۷
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	رسالوں کے خاص نمبر	۲۵۳
۲	موطا امام محمد مع التعلیق الممجد	۳۱۱
	وفیات	
۱	پروفیسر نورالحسن کی رحلت	۱۴۴
۲	ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری	۱۵۱
	ادبیات	
۱	صلوٰۃ وسلام	۳۸۰
۲	غزل	۳۱۰
۳	نماز عصر (کربلا کے معرکۂ حق وباطل میں)	۷۴
	مطبوعات جدیدہ	۷۶، ۱۵۷، ۲۳۷، ۳۱۲، ۳۹۶، ۴۷۰